محدّث

مرکزی دارالعلوم بنارس کا دینی علمی اور ادبی ماہنامہ

★

ادارۃ البحوث الاسلامیۃ والدعوۃ والافتاء بالجامعۃ السلفیۃ

بنارس - الہند

★

عدد مسلسل ۲۴ — ربیع الاول و ربیع الآخر ۱۴۰۴ھ — جنوری ۱۹۸۴ء

برگ وبار

صفحہ

جامعہ سلفیہ کا علمی ادبی اور اصلاحی رسالہ

ماہنامہ

محدث

بنارس

ربیع الاول و ربیع الآخر ۱۴۰۴ھ

جنوری ۱۹۸۴ء

جلد: ۳ شمارہ: ۱

ترتیب

صفی الرحمن مبارکپوری

بدل اشتراک

- سالانہ : ۲۵ روپئے
- ششماہی: ۱۳ روپئے
- فی پرچہ: ۲/۵۰ روپئے
- بیرون ملک سے سالانہ: ۱۵ ڈالر

(۵)

تزئین وکتابت
قاری زبیر احمد
انور جمال

● ناشر: جامعہ سلفیہ بنارس ● طابع: عبدالوحید ● مطبع: سلفیہ پریس بنارس

پتہ

خط وکتابت کے لیے : ایڈیٹر محدث، جامعہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس

بدل اشتراک کے لیے : مکتبہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، بنارس

MAKTABA "SALAFIA" REORI TALAB, VARANASI.221010

ٹیلی گرام: "دارالعلوم" وارانسی ● ٹیلی فون: ۶۳۵۷۷

تہنیتِ سالِ نو

مولانا مشتاق احمد صاحب شوق اعظمی

جامِ جہاں نما ہے محدث کا ہر ورق
کھلتے ہیں سطر سطر سے اسرارِ نُہ طبق

ہر لفظ سے رموزِ حقیقت ہیں آشکار
کرتا ہے حل مسائلِ پیچیدہ و ادق

پھیلا رہا ہے دہر میں وحدت کی روشنی
دیتا ہے ہم کو سنت و قرآن کا سبق

سینہ سپر ہے لشکرِ باطل کے سامنے
لیکر اٹھا ہے دستِ توانا میں تیغِ حق

یہ چاک اس کے نوکِ خامہ سے الحاد کا جگر
زورِ قلم سے اہلِ ہوا کے قلوب شق

اس پیکرِ ھدیٰ کی ترقی کو دیکھ کر
بدعات کو ہے رنج تو الحاد کو قلق

رکھا ہے سالِ نو میں قدم عزمِ نو کے ساتھ
توصیف اس کو زیبا ہے تعریف اسکا حق

ایسا جری رسالہ محدث کہ آج تک
اے شوق ہم نے دیکھا نہیں زیرِ نہ طبق

افتتاحیہ جلد سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقش راہ

الحمد للہ الذی لہ ما فی السموات وما فی الارض ولہ الحمد فی الاٰخرۃ وھو الحکیم الخبیر. یعلم ما یلج فی الارض وما یخرج منھا وما ینزل من السماء وما یعرج فیھا وھو الرحیم الغفور.

اللہ تعالیٰ کا بے پایاں شکر و سپاس ہے کہ محض اس کے فضل و کرم اور لطف و عنایت سے محدّث کی دو جلدیں مرحلۂ تکمیل کو پہنچ گئیں اور اب موجودہ شمارے سے اس کی تیسری جلد کا آغاز ہو رہا ہے اس موقع پر ایک بار پھر ہم اپنے قارئین کو ان بنیادی امور کی طرف ملتفت کر دینا چاہتے ہیں جن کو مدنظر رکھ کر اس رسالے کا اجراء کیا گیا ہے۔

ایک شخص قرآن و حدیث کی ہدایتوں اور رہنمائیوں پر ٹھیک ٹھیک نظر ڈالنے کے بعد امت مسلمہ کے کردار و عمل رسم و رواج اور ظروف و احوال کا جائزہ لے تو دونوں میں بڑا تفاوت بلکہ بہت سے امور میں صراحۃً ٹکراؤ اور تضاد پائے گا۔

عقائد اور اس کے تقاضے سے وجود میں آنے والے اعمال پر نظر ڈالئے تو ایسا محسوس ہوگا کہ اسلامی عقائد اور اسلامی شریعت کے متوازی بالکل ایک دوسرا ہی باب عقائد اور ایک دوسری ہی شریعت ایجاد کر لی گئی ہے اور جن باتوں کو اسلام نے گمراہی اور اسباب ہلاکت قرار دیا تھا ٹھیک انہیں کو ہدایت اور ذریعۂ فوز و فلاح تصور کر لیا گیا ہے۔

شخصیت پرستی کے جادو نے فہم وشعور کے قویٰ کو اس طرح مسحور کر رکھا ہے کہ اس خول سے باہر نکل کر کوئی بڑا سے بڑا عالم کچھ سوچنے سمجھنے کے لئے تیار ہی نہیں ہے۔ دنیا کی مادی ترقیات اور سہولتوں نے آج خالص اسلامی تحقیقات کے سیکڑوں بند دروازے کھول دئے ہیں۔ تفسیر وحدیث اور ان سے متعلقہ فنون پر ہزار ہا ہزار قیمتی اور نادر مخطوطے جو دنیا کے مختلف کتب خانوں میں بکھرے پڑے تھے اور جن کا صرف پتہ لگانا ہی بڑی مشکل مہم تھی اور پتہ لگانے کے بعد ان تک رسائی کے امکانات انتہائی محدود تھے۔ اور رسائی کے بعد استفادے کی اس کے سوا کوئی شکل نہ تھی کہ اسے ایک طویل وقت صرف کرکے نقل کیا جائے اب موجودہ ترقیات نے یہ ساری مہمیں سر کر کے ان سے استفادہ بالکل آسان کر دیا ہے۔ اب صرف یہی نہیں کہ بیشتر نوادرات کی فہرست دستیاب ہے بلکہ ان کے فوٹو اور مائیکروفلم دنیا کے بیشتر قابل ذکر کتب خانوں میں موجود اور دستیاب ہیں۔ اگر اہل علم قلب ونظر میں وسعت پیدا کر کے ان قیمتی ذخیرے سے فیضیاب ہونے کی کوشش کریں تو شریعت کے کتنے ہی اختلافی مسائل ہیں جن کے بارے میں صاحب شریعت جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم اور منشا علم الیقین کی حد تک معلوم ہو سکتا ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کتب تفسیر وحدیث میں سے آج جو کچھ مطبوعہ شکل میں ہمارے درمیان متداول ہے وہی ساری مشکلات حل کرنے کے لئے کافی ووافی ہے۔ مگر تنگ نظری اور ضیق قلبی کا یہ عالم ہے کہ جن شخصیات سے اپنے آپ کو چپکا لیا گیا ہے ان کے ارشادات فیصلوں اور فتوؤں سے ہٹ کر قرآن وحدیث کی صریح اور دو ٹوک نصوص قبول کرنے کے لئے بھی دل میں گنجائش نہیں رہ گئی ہے۔

علماء کی اس تنگ نظری اور اسلامی شریعت کے بارے میں اس ناہموار انداز فکر نے امت کے مختلف طبقوں میں بڑی وسیع خلیج پیدا کر رکھی ہے۔ علماء اور عوام دونوں مختلف خانوں میں تقسیم ہو کر رہ گئے ہیں جن پر اسلامی اخوت اور باہمی تعاون وتناصر کے بجائے باہمی کشاکش ورضرر رسانی وایذا رسانی کے جذبات غالب ہیں اور مختلف مصائب ومشکلات کی شکل میں آئے دن ان کا نمود وظہور ہوتا رہتا ہے۔

"اسلام" کی تبلیغ واشاعت بلکہ "احیاء وتجدید" کے لئے غیر "فرقہ وارانہ" بنیادوں پر مختلف اسلامی تنظیمیں اور جمعیتیں بھی وجود میں آئی ہیں۔ مگر انہوں نے اپنے طرز فکر اور طریق کار کو اتنی اہمیت دے رکھی ہے کہ اپنے آپ کو اسلام کا مکمل اجارہ دار سمجھ لیا ہے اس لئے دوسری تنظیمات اور جمعیتوں کے ساتھ ربط وتعلق اور تعاون وتناصر کے بجائے انہیں اندھیرے اجالے ڈنک مارنا اور نک پہنچانا ہی اسلام کی سب سے بڑی خدمت تصور

کر لی گئی ہے۔

مفاد پرستوں کے کئی ٹولے ایسے ہیں جنہوں نے اسلام کی بنیاد ڈھانے کی گویا قسم کھا رکھی ہے وہ اپنے آپ کو مسلم بتا کر اور اسلام کے بنیادی مآخذ کا حوالہ دے کے پورے اسلام ہی کو دریا برد کر دینے کی سازش میں لگے ہوئے ہیں۔

امت مسلمہ عملی میدان میں جس طرح کی بے حسی اور بے دلی کا شکار ہے وہ عیاں ہے۔ بنیادی اسلامی فرائض سے نہایت محدود افراد کا محدود سا تعلق باقی رہ گیا ہے اس کے بجائے ساری دلچسپیاں اور اصل تعلق خاطر ان رسوم ورواج سے ہے جن کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔

عالمی پیمانے پر امت کے خلاف خارجی حملوں کا بھی سلسلہ قائم ہے، مشرق ومغرب کی ساری دنیا اپنی مسلسل سازشوں کے ذریعہ اس امت کو تباہ وبرباد بلکہ نیست ونابود کرنے کے لئے کوشاں ہے۔ حق وانصاف کے پردے میں بدترین ظلم وستم اور جبر واستبداد کا سلسلہ چل رہا ہے اور انسانی حقوق کے قیام اور انسانی "آدرشوں" کی بحالی کے نام پر ہر طرح کی وحشت وبربریت اور درندگی روا رکھی گئی ہے۔

غرض امت داخلی اور خارجی دونوں طرف سے پیچ در پیچ مشکلات ومصائب کا شکار ہے اندرونی کل پرزے بھی ڈھیلے پڑ چکے بلکہ جگہ جگہ سے ٹوٹ چکے ہیں اور بیرونی قبا بھی تار تار ہے۔ قلب ونظر کی وسعت بھی معدوم ہے اور زمین کی پہنائی بھی تنگ۔ نیر تاباں بھی افق سے پرے ہے اور ستارے بھی تنک تاب۔ تاہم ہمیں مایوسی نہیں ہے رہروان حق کا ایک قافلہ ہے جو اس "بحر ظلمات" میں گھوڑے دوڑا رہا ہے اور ستاروں کی تنک تابی کو "صبح روشن" کی دلیل سمجھ کر امت کی شب دیجور کی قبائے تیرہ وتار کو چاک کرنے کیلئے اپنی صلاحیتیں وقف کئے ہوئے ہے۔

محدث کا مقصد وجود یہی ہے کہ وہ اس کاروان حق میں شامل ہو کر دامن تار تار کی رفوگری میں لگ جائے اسی لئے آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے کسی ورق کا رخ عقائد کی طرف ہے تو کسی کا احکام ومسائل کی طرف۔ کہیں قرآن وحدیث کے مطلوبہ ایمان کی توضیح ہے تو کہیں عملی کمزوریوں کے نتائج کی نشاندہی کسی صفحے میں مسلمانوں کے تمدنی اور اجتماعی مسائل کا تحلیل وتجزیہ ہے تو کسی صفحے میں عالم اسلام کی سیاست کے نشیب وفراز کا تذکرہ ہے کہیں اسلام میں پیوند کاری پر نکیر ہے تو کہیں اسلام کے اساسی مصادر ومآخذ سے بغاوت وبے نیازی پر گرفت۔ کہیں حق پر ڈٹے رہنے کا حوصلہ ہے تو کہیں باطل کی زنجیریں توڑ کر میدان رستخیز میں اترنے کا ولولہ کہیں شخصیت پرستی کے غلو پر نکیر ہے تو کہیں عظمت اسلام کے مناروں کا تذکرہ۔ غرض یہ ہیں وہ مقاصد جس کے لئے اس رسالے کا اجراء ہوا ہے اور اب تک حسب توفیق قدم اٹھایا گیا ہے۔ واللہ ولی التوفیق۔

آیات و انوار

افادات: اکابر مفسرین ہند

ترتیب: امین مدینی شنکرنگری گونڈوی

سورہ فاتحہ

اہمیت اور خصوصیات

یہ قرآن پاک کی سب سے پہلی اور مکمل صورت ہے، اس کا نام الفاتحہ، اس کے مضمون کی مناسبت سے ہے۔ "فاتحہ" اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی مضمون یا کتاب یا کسی شے کا افتتاح ہو۔ بالفاظ دیگر یہ نام دیباچہ اور آغاز کلام کا ہم معنی ہے۔

جو بات سب سے زیادہ اہم اور وزن دار ہوتی ہے، قدرتی طور پر نمایاں جگہ پاتی ہے۔ یہ سورت قرآن کی تمام سورتوں میں ایک خاص اہمیت رکھتی ہے اس لیے اس کی موزوں جگہ قرآن کے صفحۂ اول میں ہی ہوسکتی تھی۔ قرآن فرقان نے اس کا ذکر ایسے الفاظ میں کیا ہے جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ اے رسول ہم نے آپ کو سات دہرائی جانے والی شے عنایت کی ہے اور قرآن عظیم۔

احادیث و آثار سے یہ بات ثابت ہے کہ اس آیت میں سات دہرائی جانے والی چیز سے مراد سورہ فاتحہ ہے کیونکہ یہ سورہ سات آیات کا گلدستہ ہیں، جو سدا نماز میں دہرائی جاتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس کو السبع المثانی بھی کہتے ہیں۔ (بخاری بروایت ابوسعید بن ملی و طبری بروایت حضرت عمرؓ و علیؓ و ابن عباسؓ) ۔ اس سورت کے دیگر نام بھی ہیں جیسے ام القرآن، الکافیہ، الکنز، اساس القرآن وغیرہ۔ عربی زبان میں ام کا اطلاق تمام ایسی چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک طرح کی جامعیت کی حامل ہوں، یا بہت سی چیزوں میں مقدم ہوں یا اوپر کی ایسی چیز ہو جس کے نیچے اس کے توابع ہوں۔ چنانچہ سر کے درمیانی حصہ کو ام الراس کہتے ہیں کیونکہ وہ مرکز دماغ ہے۔ فوج کے جھنڈے کو ام کہتے ہیں کیوں کہ پوری فوج اس کے نیچے جمع ہوتی ہے۔ مکہ کو ام القریٰ کہتے ہیں کیوں کہ خانہ کعبہ حج کی وجہ سے دنیائے اسلام کے جمع ہونے کی جگہ ہے، پس اس کو ام القرآن کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ایسی سورت ہے، جس میں مطالب قرآنی کی جامعیت اور مرکزیت ہے۔

اساس القرآن کا معنی ہے قرآن کی بنیاد۔ الکافیہ کا معنی ہے کفایت کرنے والی چیز۔ اور الکنز خزانہ کو کہتے ہیں۔

امام ترمذی نے آنحضرتؐ سے روایت کی ہے کہ اس سورت جیسا بابرکت کلام نہ تو تورات میں ہے نہ انجیل میں اور نہ کسی آسمانی کتاب میں۔ ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرتؐ نے ابی بن کعب کو یہ سورت بتائی اور فرمایا کہ اس جیسی کوئی سورت نہیں۔ ایک روایت میں اسے سب سے پہلی سب سے عظیم اور سب سے بہتر سورت بھی فرمایا گیا ہے۔ (مالک، ترمذی اور حاکم عن ابی ہریرہؓ)

اس کو سورۃ الصلوٰۃ بھی کہتے ہیں، جیسا کہ حدیث قدسی قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی میں آیا ہے۔ یہاں "الصلوٰۃ" سے مراد بالاتفاق سورہ فاتحہ ہے اور یہی وہ مبارک ترین سورت ہے جس کی اہمیت اس درجہ ہے کہ اس کے بغیر نماز نہ ہوگی۔ فرمایا۔ لاَ صلوٰۃَ لمن لم یقرء بفاتحۃ الکتاب۔ (بخاری ج ۱ ص ۱۷۸)

جس نے فاتحۃ الکتاب نہ پڑھی اس کی نماز نہیں۔

سورہ مبارکہ میں دین متین اور خداپرستی کے مقاصد کا خلاصہ موجود ہے

اس سورت پر نظر ڈالیے تو یہ بات ہویدا ہوجاتی ہے کہ اس میں اور قرآن کے باقی حصوں میں اجمال وتفصیل کا سا تعلق ہے اور جب اس پہلو پر غور کیا جائے کہ سورت کا پیرایہ دعائیہ ہے اور اسے روزانہ عبادت کا ایک لازمی جز قرار دیا گیا ہے تو اس کی یہ خصوصیت اور زیادہ الم نشرح ہوجاتی ہے اور واضح ہوجاتا ہے کہ اس اجمال وتفصیل میں بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے، سورہ فاتحہ ایک دعا ہے بندے کی جانب سے اور قرآن اس کا جواب ہے خدا کی جانب سے۔ بندہ دعا کرتا ہے کہ پروردگار! میری رہنمائی فرما۔ جواب میں پروردگار پورا قرآن پیش کردیتا ہے کہ یہ ہے وہ ہدایت ورہنمائی جس کی درخواست تو نے مجھ سے کی ہے

دین حق کا تمام تر ماحصل کیا ہے؟ جس قدر قارئین غور وفکر کریں گے۔ ان چار باتوں سے باہر کوئی بات دکھائی نہ دے گی۔

۱۔ خدائے بزرگ وبرتر کی صفات کا ٹھیک ٹھیک تصور۔ کیوں کہ انسان کو خداپرستی کی راہ میں جس قدر ٹھوکریں لگی ہیں، صفات ہی کے تصور میں لگی ہیں۔

۲۔ قانون مجازات کا اعتقاد۔ یعنی جس طرح دنیا میں ہر چیز کا ایک خاصہ اور قدرتی تاثیر ہے، اسی طرح انسانی اعمال کے بھی معنوی خواص اور نتائج ہیں۔ نیک عمل کا انجام اچھا ہے اور برے کا برا ہے۔

۳۔ معاد کا یقین۔ یعنی انسانی زندگی اسی دنیا میں ختم نہیں ہوجاتی ہے۔ اس کے بعد بھی زندگی ہے اور جزا وسزا کا معاملہ

پیش آنے والا ہے ۔

۴ ۔ فلاح و بہبود کی راہ اور اس کی پہچان ۔

غور کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ ان کے معانی سے پوری وضاحت اور دلنشینی پیدا ہوگئی ہے ، ساتھ ہی بیحد سیدھا سادہ بیان کہ نہ کسی طرح کا کوئی پیچ و خم ہے نہ کسی طرح کا کوئی الجھاؤ ۔

جہاں تک اولاد آدم کی خدا پرستی اور خدا پرستی کے تصورات کا تعلق ہے ، اس سے زیادہ سیدھی سادی باتیں اور کیا ہو سکتی ہیں جو سورۂ فاتحہ میں بیان کی گئی ہیں اور پھر اس سے زیادہ آسان و دلنشیں اسلوب بیان کیا ہو سکتا ہے ۔ سات چھوٹے چھوٹے بول ہیں اور ہر بول چار پانچ لفظوں پر مشتمل ہے ۔ اور ہر لفظ صاف اور دلنشیں معارف کا گنجینہ و نگینہ ہے جو اس انگوٹھی میں جڑ دیا گیا ہے خدا پرستی انسانی فطرت کا خمیر ہے ۔ اس لیے خدا پرستی کی کوئی سچی بات نسل انسانی کے لیے انوکھی بات ہو ہی نہیں سکتی ۔ اس کی فطرت کے لیے سب سے زیادہ جانی بوجھی بات یہی ہے کہ اللہ رب العالمین کا اقرار کرے ۔ پس سورۂ فاتحہ کی ندرت صرف اس کے معانی ہی میں نہیں بلکہ معانی کی تعبیر میں بھی تلاش کرنی چاہیے ۔ خدا پرستی کا جذبہ انسان میں پہلے بھی موجود تھا ، اس کی ربوبیت اور رحمت کے جلوے کبھی اس کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہوئے ۔ جزا اور سزا کا اعتقاد مدتوں سے بھی پرانا ہے ۔ صراط مستقیم کی طلب نہ فقط انسان میں بلکہ کیڑوں مکوڑوں تک میں موجود ہے ۔

دنیا میں جب کبھی وحی الٰہی کی ہدایت نمودار ہوتی ہے تو اس نے یہ نہیں کیا کہ انسان کو نئی باتوں کی تعلیم دی ہو خدا پرستی کے بارے میں کسی انوکھی بات کی تعلیم دی ہی نہیں جا سکتی ۔ اس کا کام صرف یہ رہا ہے کہ انسان کے وجدانی عقائد کو علم و اعتراف کی ٹھیک اور صحیح تعبیر بتلا دے اور یہی اس مبارک سورہ کی خصوصیت ہے ۔ اس سورت نے نوع انسانی کے وجدانی تصورات ایک ایسی چیز سے سنوار دیے کہ ہر عقیدہ ہر فکر ہر جذبہ اپنی حقیقی شکل میں نمودار ہو گیا اور چونکہ یہ تعبیر حقیقت حال کی سچی تعبیر ہے ، اس لیے جب کبھی ایک انسان راست بازی کے ساتھ اس پر غور کرے گا تو بے اختیار پکار اٹھے گا کہ اس کا ہر بول ہر لفظ اس کے دل و دماغ کی قدرتی آواز ہے ۔

پھر دیکھو کہ اپنی نوعیت میں وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ ایک خدا پرست انسان کی سیدھی سادی دعا ہے لیکن کس طرح اس کے ہر لفظ اور ہر اسلوب سے دین حق کا کوئی نہ کوئی اہم مقصد واضح ہوتا ہے اور کس طرح اس کے الفاظ نہایت اہم معانی و دقائق کی نگرانی کرتے ہیں ۔ خدائی تصور کے بارے میں انسان کی بنیادی غلطی یہ تھی کہ اس تصور کو الفت کی جگہ دہشت کی چیز بنا لیا تھا ، وہ خدا سے خوف کھاتا تھا ، لیکن اس سے محبت کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا ۔ سورہ فاتحہ

کے سب سے پہلے لفظ نے اسی بنیادی گمراہی کا ازالہ کیا۔ اس کی ابتدا حمد کے اعتراف سے ہوتی ہے۔ حمد ثنائے جمیل کو کہتے ہیں یعنی اچھی صفتوں کی تعریف کرنے کو۔ ثنائے جمیل اسی کی جاتی ہے جس میں خوبی اور جمال ہو۔ پس حمد کے ساتھ خوف کا تصور جمع نہیں ہو سکتا۔ جو ذات محمود ہوگی وہ خوفناک نہیں ہو سکتی۔

پھر حمد کے بعد صفات الٰہی میں سے ربوبیت اور رحمت کا ذکر کیا ہے اور اس طرح نوع انسانی کی اس عالمگیر غلطی کا ازالہ کر دیا ہے کہ وہ خدا کو صرف اس کی صفاتِ قہر و جلال ہی میں دیکھتی تھی، اس کی رحمت و جمال کی تماشائی نہ تھی۔ اس اسلوبِ بیان نے واضح کر دیا کہ خدا کا صحیح تصور وہی ہو سکتا ہے جو سراسر حسن و جمال اور رحمت و رضوان کا تصور ہو۔

رب العالمین میں خدا کی عالمگیر اور بے تخصیص و بے امتیاز ربوبیت کا اقرار ہے جو ہر فرد، ہر جماعت، ہر قوم ہر ملک اور ہر گوشۂ وجود کے لیے ہے اور یہ اعتراف ان تمام تنگ نظریوں کا خاتمہ کر دیتا ہے جو کائنات کی مختلف قوموں اور نسلوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ اور ہر قوم اپنی جگہ سمجھنے لگی تھی کہ خدا کی رحمتیں و برکتیں صرف اسی کے لیے ہیں دنیا کی کسی دوسری قوم کا اس میں حصہ نہیں ہو سکتا۔

مالک یوم الدین میں «الدین» کا لفظ جزا و سزا کا اعتراف ہے اور جزا و سزا کو دین کے لفظ سے تعبیر کر کے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ جزا و سزا انسانی اعمال کے قدرتی نتائج ہیں، یہ بات نہیں ہے کہ خدا کا غضب و انتقام بندوں کو عذاب دینا چاہتا ہو، کیونکہ الدین کا معنی بدلہ و مکافات ہے ربوبیت و رحمت کے بعد مالک یوم الدین کے وصف نے یہ حقیقت بھی واشگاف کر دی کہ اگر کائناتِ ہستی میں صفاتِ رحمت و جمال کے ساتھ قہر و جلال بھی اپنی نمود رکھتے ہے تو یہ اس لیے نہیں کہ اللہ تعالیٰ میں غضب و انتقام ہے بلکہ اس لیے ہے کہ وہ عادل ہے اور اس کی حکمت نے ہر چیز کے لیے اس کا ایک خاصہ اور نتیجہ مقرر کر دیا ہے۔ عدل منافی رحمت نہیں ہے بلکہ عین رحمت ہے۔

عبادت کے لیے یہ نہیں کہا کہ نعبدک بلکہ کہا ایاک نعبد۔ یعنی یہ نہیں کہا کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں بلکہ حصر کے ساتھ کہا ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور پھر اس کے ساتھ ایاک نستعین کہکر استعانت کو بھی اسی کے ساتھ خاص کر دیا۔ یعنی ہم تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ اس اسلوب بیان نے توحید کے تمام مقاصد پورے کر دیے اور شرک کی ساری راہیں مسدود کر دیں۔

سعادت و فلاح کی راہ کو صراطِ مستقیم سے تعبیر کیا جس سے زیادہ بہتر اور قدرتی تعبیر نہیں ہو سکتی، کیوں کہ کوئی نہیں جو سیدھی راہ اور ٹیڑھی راہ میں امتیاز نہ رکھتا ہو۔ اور پہلی راہ کا خواہش مند نہ ہو۔

پھر اس کے لیے ایک ایسی سیدھی سادی اور جانی پہچانی شناخت بتلادی جس کا اذعان قدرتی طور پر ہر انسان کے اندر موجود ہے، اور جو محض ذہنی تعریف ہونے کی جگہ ایک موجود و مشہود حقیقت نمایاں کر دیتی ہے، کوئی ملک کوئی قوم یا کوئی زمانہ اور کوئی فرد ہو، انسان ہمیشہ دیکھتا اور جانتا ہے کہ زندگی اور معیشت کی دو راہیں ہیں، ایک کامیاب لوگوں کی راہ اور دوسری ناکام اور گم کردہ انسانوں کی راہ۔ پس ایک واضح اور آشکارا بات کے لیے سب سے عمدہ علامت یہی ہو سکتی ہے کہ اس کی طرف انگلی اٹھا دی جائے، اس سے زائد کچھ کہنا ایک معلوم بات کو مجہول بنا دینا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ اس سورت کے لیے دعا کا پیرایہ اختیار کیا گیا، کیونکہ اگر تعلیم و امر کا پیرایہ اختیار کیا جاتا تو اس نوعیت کی ساری تاثیر ختم ہو جاتی۔ دعائیہ اسلوب ہم کو بتلاتا ہے کہ ہر راست باز انسان کی جو خدا پرستی کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے صدائے حال کیا ہوتی ہے اور کیا ہونی چاہیے۔ یہ گویا خدا پرستی کے فکر و وجدان کا سر جوش ہے جو ایک طالب صادق کی زبان پر بے اختیار ابل پڑتا ہے۔ ●●●

بقیہ رابطہ عالم اسلامی

- وکیل الندوۃ العالمیۃ للشباب الاسلامی (ریاض)
- ۱۹۷۶ء میں اسلامی اقتصادیات کی پہلی کانفرنس میں شریک ہوئے ● اسلامی تعلیم کی عالمی کانفرنس کی تنظیمی کمیٹی کے نائب صدر، اور کانفرنس منعقدہ ۱۹۷۷ء بمقام مکہ کی سب کمیٹی کے نائب صدر، دوسری عالمی کانفرنس منعقدہ مارچ ۱۹۸۰ء اسلام آباد (پاکستان) اور تیسری منعقدہ ۱۹۸۱ء ڈھاکہ (بنگلہ دیش) کے ممبر۔
- ماہرین ارضیات کے ادارہ (لندن) کے رفیق ● فیصل اسلامی بینک کی نگران کمیٹی کے رفیق۔
- اسلامک یونیورسٹی (پاکستان) کے منصوبہ بندی و ترقی کمیشن کے رکن ● جامعۃ الشرق والغرب (شکاگو) امریکہ کی مجلس افتاء کے صدر ● عالمی کمیٹی برائے مسلم اقلیات کے رکن۔
- معہد الدراسات السیاسیہ (اسلام آباد) کے ممبر۔

مولفات: اسلام اور اشتراکیت ● علم و شریعت اور تعلیم ● سائنس اور علوم عامہ کی تدریس میں ایمان اور اسلامی تعلیمات کا رول ● اتحاد اسلامی کا فروغ ● ماہر علم طبقات الارض کی حیثیت سے جیولوجی پر بھی آپ کی متعدد تصانیف ہیں۔ ●●

ثمراتِ ایمان

شیخ عبدالمعید

گزشتہ شمارہ میں صحیح ایمان کے شرائط کی وضاحت کی گئی تھی۔ مذکورہ شرائط کو پورا کرنے کے بعد بندۂ مومن کی یہ حیثیت ہوتی ہے کہ وہ افراط و تفریط کی ساری گمراہیوں سے بچ کر اعتدال و توازن حق و انصاف (قسط) کی ڈگر پر لگ جاتا ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ (آل عمران: ۱۸)

اللہ نے خود گواہی دی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود برحق نہیں اور فرشتوں نے بھی اور تمام اہلِ علم حق و انصاف کے ساتھ اس پر گواہ ہیں۔

بندۂ مومن جب صراطِ مستقیم پر چل پڑتا ہے تو پھر اس پر فتوحاتِ ربانی کے دروازے کھل جاتے ہیں، اس کا ایمان اسے اللہ سے چمٹا دیتا ہے، وہ درِ کبریا کو چھوڑ کر اپنی جبینِ عقیدت کو آوارگی سے بچا لیتا ہے۔ دین کے فہم و شعور کا معاملہ ہو، دین پر کاربندی کا مسئلہ ہو۔ احتیاجات مانگنے کا مسئلہ ہو کسی مسئلہ میں وہ اللہ کی چوکھٹ کو چھوڑ کر انسان کے دامنِ تنگ میں پناہ لینا گوارا نہیں کرتا، اس فداکاری کے جذبے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے سایۂ رحمت میں آجاتا ہے اور فضلِ ربانی سے شادکام ہوتا ہے، اسے اللہ کی یافت نصیب ہوتی ہے۔ اس کی صراطِ مستقیم اور منزلِ مقصود کی راہ نمائی کی جاتی ہے۔ وہ پھر ادھر اُدھر بھٹک نہیں سکتا۔

زندگی کے فتنوں سے بچنے کے لیے کامیاب نسخہ اللہ سے چمٹ جانا ہے، اللہ سے چمٹنے کا مطلب ہے کتاب و سنت کا دامن مضبوطی سے تھام لینا یہی تمام مشکلات کا علاج ہے۔ یہی نسخہ صحابہ کرام کو رسول اکرم نے بتلایا تھا۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کو چھوڑ کر جب لوگ علماء و مشائخ، مفکرین اور دانشوروں کی طرف رجوع کرنے لگے تو نئے نئے مسائل اُٹھ کھڑے ہوئے اور اسلام کو کچھ سے کچھ بنا ڈالا گیا۔ کامل اور صحیح ایمان کا تقاضا ہے کہ اللہ سے چمٹ کر اس کی رحمت کا سزاوار بنا جائے۔

فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَاعْتَصَمُوا بِهِ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِي رَحْمَةٍ مِنْهُ وَفَضْلٍ وَيَهْدِيهِمْ إِلَيْهِ صِرَاطًا مُسْتَقِيمًا۔ (النساء: ۱۷۵)

جو لوگ اللہ پر ایمان لائے اور اس سے چمٹ گئے اللہ انھیں فضل ورحمت میں داخل کرے گا اور انھیں اپنا سیدھا راستہ دکھلائے گا۔

صحیح ایمان کا تقاضا ہے استقامت، مومن کامل کو استقامت نصیب ہوتی ہے وہ اپنے عقیدہ میں ایسا پختہ ہو جاتا ہے کہ گرداب حوادث، موج فتن، شیطانی فتنہ سامانیاں، ہوا و ہوس کی جلوہ طرازیاں اسے راہ حق سے ہٹا نہیں سکتیں۔ عقیدہ میں استقامت ایمان کی ایسی عظیم منزل ہے کہ اس منزل میں فرشتے مومن کے لیے سامان تسلی ونصرت بن کر اترتے ہیں اس کے حزن وملال اور خوف ودہشت کا مداوا بن جاتے ہیں، مومن کا احساس ضعف وناتوانی کافور ہو جاتا ہے اسے جنت کی بشارت ملتی ہے۔ دنیا وآخرت میں فرشتے اس کے دوست بن جاتے ہیں، غم حیات برداشت کرنے کا صلہ اسے اللہ کی مہمانی نصیب ہوتی ہے اور اپنی من پسند نعمتوں سے شادکام ہوتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللَّهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ أَلَّا تَخَافُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَبْشِرُوا بِالْجَنَّةِ الَّتِي كُنْتُمْ تُوعَدُونَ نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَشْتَهِي أَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ نُزُلًا مِنْ غَفُورٍ رَحِيمٍ۔ (۳۳: حم السجدہ)

جنھوں نے کہدیا ہمارا رب اللہ ہے، پھر جم گئے۔ ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں (اور فرماتے ہیں) نہ ڈرو نہ غمگین ہو، اس جنت کی بشارت لو جس کا تمھیں وعدہ تھا، ہم دنیا وآخرت میں تمھارے دوست ہیں تمھیں جنت میں وہ سب کچھ ملے گا جس کی تمھاری طبیعت خواہشمند ہوگی اور جنت کے اندر وہ سب تمھارا ہوگا جو تم چاہوگے، بطور ضیافت خطابخش وکرم فرما ذات کی طرف سے۔

استقامت کا مطلب صرف یہی نہیں ہے حق پر قائم رہنا بلکہ استقامت میں یہ بھی داخل ہے کہ بیان حق میں قرآن وسنت کا جو طریقہ ہے اس سے بھی سر مو تجاوز نہ کیا جائے ورنہ پھر لوگوں کے ذوقیات اسالیب منطق کی آمیزش حق میں ہو جائے گی۔ پھر حق نہ واضح وخالص رہے گا نہ حق پر استقامت ممکن ہوگا۔

ایمان کامل جب دلوں میں انگڑائی لیتا ہے تو ان سارے رشتوں کو توڑ کر اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے معراج کمال پر جا پہنچتا ہے اگر ایک مومن اپنے ایمان میں اس بلند مرتبے تک نہ پہنچ سکے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کا ایمان صحیح نہیں ابھی اس کے ایمان میں فتور ہے ایمان کامل کا مطالبہ یہ ہے کہ دنیا کے سارے رشتے محبت اللہ اور

رسول پر قربان کر دیے جائیں :

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ ۔ (التوبہ : ۲۴)

آپ کہدیں اگر تمھارے باپ تمھارے بیٹے، تمھارے بھائی تمھاری بیویاں تمھارا خاندان تمھارے حاصل کردہ اموال تمھاری تجارت جس کے خسارے کا تمھیں ڈر ہے تمھاری پسندیدہ رہائش گاہیں اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو اس وقت کا انتظار کرو، جب اللہ اپنا فیصلہ نافذ کر دے، اور اللہ فاسق قوم کو ہدایت نہیں دیتا۔

یہ ہے کامل ایمان کا مطالبہ، اگر یہ مطالبہ پورا نہیں ہوتا تو پھر ایسا صاحب ایمان مومن نہیں بلکہ وہ فسق کرتا ہے۔ دنیا کی محبوب ترین چیزیں رشتہ ناطہ، خاندان، مال، دولت، کوٹھیاں ہیں، یہ ساری محبوب ترین چیزیں مومن کی قوت ایمانی کے سامنے بے وقعت ہوتی ہیں، اس کے ایمان وعقیدہ کی طاقت محبت الٰہی کو تمام محبتوں پہ غالب کردیتی ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ ۔ (البقرہ:۱۶۵) جو لوگ ایمان لائے انھیں اللہ سے سب سے زیادہ محبت ہے۔

صحیح ایمان جب مومن کے اندر رچ بس جاتا ہے تو اس کے دل ودماغ کو ذکر الٰہی کی بھوک لگتی ہے، جب اس کی زبان اللہ کی یاد سے زمزمہ سنج ہوتی ہے اور اس کے ریشے ریشے میں یاد الٰہی کی خنکی اتر جاتی ہے تو مومن کو اطمینان وسکون نصیب ہوتا ہے، وہ تعلق باللہ سے فیض یاب ہوتا ہے تو اسے قرار آتا ہے۔ اس کی زندگی کی ضرورتوں کی رصد گاہ یاد الٰہی ہے۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوبُهُمْ بِذِكْرِ اللَّهِ ۗ أَلَا بِذِكْرِ اللَّهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ (الرعد : ۲۸)

جو لوگ کہ ایمان لائے ان کے دل میں یاد الٰہی سے مطمئن ہوتے ہیں اور آگاہ رہو دل یاد الٰہی سے مطمئن ہوتے ہیں۔

اطمینان قلب ایمان کا ثمرہ ہے۔ صحیح ایمان سے اطمینان نصیب ہو سکتا ہے۔ اطمینان قلب قابل تشریح مسئلہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک حسیاتی تجربہ کی چیز ہے، اطمینان قلب کی خاطر تصوف کا ڈھونگ رچایا گیا۔

اور پوری تاریخ بشریت میں بے شمار انسانوں نے دنیا تج دی ۔ اطمینانِ قلب دل سے پرکھا جاسکتا ہے ۔ دل اتنا صحیح ہو کہ معمولی گناہ اس کے میزان میں فرد تر کو متحرک کردے اور انسان ایمان میں اتنا کامل ہوجائے کہ اس میزان میں خیر ہی خیر تلیس اور نور کی ایسی دنیا دل میں آباد ہوجائے کہ ظلمات کافور ہوجائیں اس وقت اطمینانِ قلب کامل طور پر مل جاتا ہے ، پھر جو جس قدر شر سے بچتا جائے گا اسی قدر اسے اطمینان ملے گا اور اگر عصیان کی سیاہ تہ دل پر جم جائے پھر اطمینانِ قلب کا ایک شمہ انسان کو نصیب نہیں ہوسکتا ۔ جب کسی کو اطمینانِ قلب نصیب ہوجاتا ہے تو اس کے سامنے ساری دنیا کی زیب و زینت ہیچ معلوم ہوتی ہے ۔

جب ایمان کی چنگاری چمکتی ہے تو خار وخس عصیان کو خاکستر کردیتی ہے ۔

الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔ (آل عمران) (بندگانِ رب) کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم ایمان لائے ہمارے گناہوں کو بخش دے اور ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا ۔

ایمان کامل اللہ پر توکل کا درس دیتا ہے (تغابن : ۱۳) ایمان صبر و شکر تفریع خشیت تقدس اقنات انابت اخبات کا منبع ہے ۔ (آل عمران : ۱۴۳) ۔ ایمان و عقیدہ مومن کو زمین کی بھی حکمرانی عطا کردیتا ہے ۔ مومن جب صاحب اقتدار ہوجاتا ہے تو اسلام کا کام اقامت صلوٰۃ وایتاء زکوٰۃ ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرتا ہے ۔ جب بندۂ مومن ایمان کی صفت سے سرفراز ہوجاتا ہے رب پاک اسے اقامتِ صلوٰۃ کا حکم دیتے ہیں ۔ (ابراہیم : ۳۱)

صحیح ایمان و خالص عقیدہ یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ صاحب عقیدہ ملل باطلہ اور باطل پرستوں سے دوستی گانٹھے خیر و شر ہر چیز میں ان کی ہمنوائی نہیں کرتا ۔ اللہ سے پیمانِ محبت باندھ کر ملت کے ساتھ غداری کا مرتکب نہیں ہوتا ۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اہل ایمان باہم دگر محبت رکھیں اور دلدار صرف اپنے لوگوں کے لیے خاص رکھیں ۔ (المائدہ) (۸۱)

ایمان کا فیض جب جاری ہوتا ہے تو مومن ہر ایک کے ساتھ انصاف کرتا ہے ۔ انصاف سے اسے اس کی ذات اعزاز و اقربا حتی کہ والدین بھی باز نہیں رکھ سکتے ، کیوں کہ انصاف اس کے عقیدہ و ایمان کا تقاضا ہے ۔ (مائدہ)

بندۂ مومن کا عقیدہ سرچشمۂ حیات ہے ۔ انسان کے سارے اعمال اس کے عقیدہ و ایمان سے سیراب ہوتے ہیں جب ایمان کا سرچشمہ پھوٹتا ہے مومن مسجدیں اپنی جبینِ عقیدت سے آباد کردیتا ہے ۔ (توبہ : ۱۸) ۔ سجدے اس کی پیشانی میں تڑپنے لگتے ہیں ، اس کے قدم مسجد کی طرف بھاگنے لگتے ہیں ، اس کا دل مسجد میں اٹکا رہتا ہے ، وہ مسجد میں پہنچ کر رب پاک سے ملاقات کرکے اپنی عبدیت کا تعلق استوار کرتا رہتا ہے ۔

ایمان چند حقائق کو نظری طور پر مان لینے کا نام نہیں ہے۔ عقیدہ و ایمان کو نظری حقائق ماننے کے سبب لوگوں کا ایمان جمود پسند اور بے اثر ہو گیا ہے اور پھر اس سے بڑی غلطی یہ کی جاتی ہے کہ عقیدہ کی اہمیت گھٹا کر عقل کی بارگاہ میں اپنی ذلت و ادبار کا رونا رو کر نت نئے نظریات، افکار مطالعات پیش کیے جاتے ہیں۔

ایمان کی قوت کا یہ حال ہے کہ مومن جب جان فروشی و فداکاری کے لیے موقع نہیں پاتا ہے تو اپنی بدنصیبی سمجھتا ہے، اس کی آنکھیں ہوئے اشک بہاتی ہیں اس کا دل کڑھ کے رہ جاتا ہے۔ (۱۲: توبہ)۔ اس کا قلب گداز آیات الٰہی سن کر پگھل جاتا ہے اور آنکھوں سے آنسو بن کر بہ نکلتا ہے وہ اپنے آپ کو رب پاک کے سامنے ڈال دیتا ہے اور چلا اٹھتا ہے۔ یا رب ہم تیری وحدانیت کی گواہی دیتے ہیں۔

وَإِذَا سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ يَقُولُونَ رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ۔ (المائدہ: ۸۳)

جب وہ رسول پر نازل کردہ آیات سنتے ہیں تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھیں آنسو سے بہ پڑتی ہیں کیوں کہ انھیں حق کا عرفان ملا ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں اے ہمارے کارساز! ہم ایمان لائے، ہمیں شہادت دینے والوں میں لکھ لے۔

مومن و صاحب عقیدہ کا دل یاد الٰہی سے دہل جاتا ہے، اس کا تار ذکر و شعور جھنجھنا اٹھتا ہے اسے یہ احساس ستانے لگتا ہے کہ حد رب پاک نے اسے اس کی تمام ضروریات عطا کی ہیں ایک سانس بھی اس کے فضل کے بغیر اندر آسکتی ہے نہ باہر جاسکتی ہے، اللہ کا ذکر سنتے ہی اسے اپنی حقیقت اور مالک کی عظمت کا احساس ہو جاتا ہے، یوں اس کا سارا وجود کانپنے لگتا ہے جو مومن کے ساتھ بارگاہ رب میں اپنی خوف و محبت کا نذرانہ پیش کرتا ہے۔

انما المومنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم (انفال: ۲)

مومن وہ لوگ ہیں جن کے دل ذکر الٰہی کے وقت دہل جاتے ہیں

اہل ایمان و اصحاب عقیدہ عاجزانہ روش اختیار کرتے ہیں وہ الٰہی کا ذکر سن کے خوف زدہ ہو جاتے ہیں، مصائب میں صبر کرتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور صدقہ و خیرات کرتے ہیں (الحج: ۳۵) یہ سارے اعمال براہ راست نتیجہ ہیں عقیدہ کے ان تمام اعمال کی تعمیر عقیدہ کی اساس پر ہوتی ہے۔

مومن ہوش و بصیرت رکھتا ہے، فیاض ازل نے اسے ایمان عطا کر کے خرد کا وافر حصہ عطا کر دیا ہے اس کے دل و نگاہ اسے سامان عبرت فراہم کرتے رہتے ہیں (آل عمران: ۱۹۰-۱۹۱) اس کا حساس دل کھرے کھوٹے

کو برکھتا ہے اور اس کے ایمان میں اضافہ کرتا رہتا ہے، ایمان چند حقائق کو نظری طور پر تسلیم کرنے کا نام نہیں ہے، نہ چند کلمات کو زبان سے کہہ لینے کا نام ایمان ایک شعورِ ذات ہے، ایمان حدت ہے جس کی گرمی ریشے ریشے میں سما جاتی ہے ایمان ایک درخت ہے جو زندگی کی کڑی دھوپ میں انسان کو سایہ عطا کرتا ہے، ایمان کبھی دار پر چڑھا دیتا ہے کبھی تخت و تاج تاراج کر دیتا ہے۔ جامد اور بے حقیقت نظری ایمان مومن کا ایمان نہیں ہے صحیح ایمان اور خالص عقیدہ کے حامل انسان کا ایمان ترقی پذیر ہوتا ہے۔

وَإِذَا مَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِ إِيمَانًا فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ (التوبہ: ۱۲۴)

جب کوئی سورہ نازل کی جاتی ہے تو کچھ لوگ کہتے ہیں اس سورہ نے کس کے ایمان میں اضافہ کیا ہے، پس جو لوگ ایمان لائے، اس نے ان کے ایمان کو بڑھا دیا پھر وہ خوش ہو جاتے ہیں۔

عقیدہ و ایمان کا انتہائی درجہ یہ ہے کہ بندۂ مومن منزلیں طے کرتا اس آخری سرحد کو چھو لیتا ہے جہاں سے اس کا کام محض تسلیم و رضا رہ جاتا ہے وہ اپنی تمام خواہشات سے دست بردار ہو جاتا ہے اور حدیثِ رسول کی تعبیر میں ربِ پاک اس کا کان اس کی آنکھ اس کے ہاتھ بن جاتا ہے جن سے وہ سنتا ہے دیکھتا ہے اور پکڑتا ہے۔ اس مرحلۂ عرفان کا نام قرآن نے اشترائے نفس و مال رکھا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ وَالْقُرْآنِ وَمَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ (التوبہ: ۱۱۱)

اللہ نے مومنوں سے ان کی جان و مال کا اس پر سودا کر لیا ہے کہ ان کے لیے جنت ہے وہ راہِ الٰہی میں لڑتے ہیں پھر مارتے ہیں یا مارے جاتے ہیں۔ یہ توریت، انجیل اور قرآن میں برحق وعدۂ الٰہی ہے اور اللہ سے زیادہ کون وعدہ کا پابند ہوگا، تم اپنے اس سودے پر خوش ہو جاؤ جس کا سودا کیا ہے۔ یہ عظیم کامرانی ہے۔

عبد و معبود کے درمیان یہاں جس بیع کا معاہدہ ہوا ہے وہ یہ ہے کہ بندہ اپنی جان و مال دے کر اللہ سے جنت خرید لے، جنت کا خریدار بننے کے بعد اسے اپنی جان و مال کا اختیار نہیں رہا، ان میں وہ تصرف نہیں کر سکتا، جان و مال اللہ کی ملکیت ٹھہرے اُن میں تصرف ربِ پاک کے حسبِ خواہش ہی ہو سکتا ہے۔

عقیدہ وایمان میں پختہ کاری کا ثمرہ یہ بھی ہے کہ ایسے ایمان کا حامل صدیق بن جاتا ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ أُولَٰئِكَ هُمُ الصِّدِّيقُونَ ۔ (الحدید: ۱۹) جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لے آئے وہی صدیق ہیں۔

صدیق کا رتبہ معمولی نہیں انبیاء کے بعد صدیقین ہی کا درجہ ہے

فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ مِنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ (النساء ٦٩) وہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام کیا ہے یعنی انبیاء، صدیقین شہداء اور نیک لوگ۔

عقیدہ کو لوگوں نے بس جنتر منتر سمجھ لیا ہے، بغیر عقیدہ کے کوئی کام مستند و مقبول نہیں، عقیدہ درست نہ ہو تو عمل میں جان آہی نہیں سکتی۔ عبدیت کے سارے سرچشمے عقیدہ کے اندر پوشیدہ ہیں۔

انسان بشر ہے، بشریت کا تقاضہ ہے کہ اس سے گناہ سرزد ہو جائے، بھول چوک ہو جائے لیکن عقیدہ وایمان اس کو راہ راست پر لے آتا ہے۔ اُسے اس کے گناہ کی بھٹی میں تپاتا ہے اور کندن بنا کر نکالتا ہے

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وہ جب کوئی غلط کام کر بیٹھتے ہیں یا کوئی زیادتی اپنے اوپر کر ڈالتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی چاہتے ہیں۔

عقیدہ کے ثمرات کے یہ مختصر نمونے عرض کیے گئے خلاصہ یہ کہ عقیدہ کے بغیر نہ عمل مستند ہو سکتا ہے نہ عمل کے اندر جان آسکتی ہے نہ انسان اپنی حقیقت پہچان سکتا ہے نہ اسے مراحل حیات میں حسب حالات روشنی مل سکتی ہے پختہ وخالص عقیدہ زندگی کے ہر ہر گوشے پر اپنی کرنیں بکھیرتا ہے۔

●●●

مخلصانہ اپیل!

قارئین کرام سے گذارش ہے کہ برصغیر ہند و پاک کے علمائے اہل حدیث کی جن تصنیفات کا ان کو علم ہو یا ان کے پاس موجود ہوں، ان سے راقم کو مطلع فرمائیں تاکہ فہرست سازی کے علمی کام کو مفید تر اور مکمل صورت میں انجام دینے میں سہولت ہو سکے۔ — محمد مستقیم سلفی جامعہ سلفیہ ریوڑی تالاب، بنارس

مولانا ابوالعاص وحیدی مدرس مدرسہ اسلامیہ بستی

قسط (۱)

اسلام کی صحیح تعبیر

عقیدۂ توحید میں اس تعبیر کی ایک جھلک

ماہنامہ محدّث کا موقف روز اول ہی سے یہ رہا ہے کہ وہ امت مسلمہ کی گروہ بندیوں سے علیحدہ اور بالاتر ہو کر خالص اسلامی تعلیم پیش کرے۔ اور اسلام کے اصل سرچشموں یعنی کتاب وسنت سے عقائد واحکام کے سلسلے میں جو کچھ ثابت ہے اسے وضاحت اور ثبوت کے ساتھ کسی گروہ، جماعت یا فرقے کی جانب داری کے بغیر پیش کر دے اس طرح ممکن ہے کہ مسلمان اپنی شریعت کے اصل سرچشمے یعنی کتاب وسنت سے اپنے عقائد و احکام اور مسائل زندگی جاننے اور سمجھنے کے عادی بنیں۔ اور فرقہ وارانہ عصبیت میں کمی پیدا ہو۔ اسی لئے ہم نے مختلف اسلامی فرقوں کے مناقشات کو اپنے رسالے میں جگہ نہیں دی۔ برادر گرامی مولانا ابوالعاص وحیدی سلمہ نے اسلام کے بنیادی عقائد اور امت کے موجودہ حالات کے سلسلے میں صحیح اسلامی موقف سے متعلق ایک مفید تحریر سپرد قلم کی ہے۔ اور خوش قسمتی سے انہوں نے ہمیں اس میں ترمیم کا بھی اختیار دے دیا ہے۔ ہم کسی قدر حک واضافے اور ترمیم کے ذریعہ اسے زیادہ سے زیادہ محدث کے مزاج کے مطابق ڈھال کر موصوف کے شکریے کے ساتھ ہدیۂ قارئین کر رہے ہیں۔ اور توقع رکھتے ہیں کہ ہمارے جملہ اسلامی برادران سنجیدگی کے ساتھ استفادے کی کوشش کریں گے۔

"مدیر"

مذہب انسان کی ایک عظیم ترین ضرورت ہے۔ مذہب کے بغیر دنیا میں انسانیت، تہذیب اور شرافت

جود محال ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لئے تاریخ انسانی کے آغاز ہی میں جس طرح بہت سی مادی چیزوں کا
ام کیا اسی طرح ان کی انفرادی و اجتماعی صلاح و فلاح کے لئے صحیح طریقۂ زندگی کی رہنمائی بھی کی، اسی کو دین و مذہب
جاتا ہے، دنیا میں بہت سے آسمانی ادیان و مذاہب پائے جاتے ہیں جیسے یہودیت، عیسائیت وغیرہ، مگر یہ تمام مذاہب
ت گذرنے کے ساتھ ساتھ محرف اور مسخ ہوتے گئے۔ آخر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے دین "اسلام" کی
ی تعلیمات لے کر آئے جو ہمیشہ کے لئے تبدیلی و تحریف سے محفوظ رہیں گی۔ اس لئے اب یہی دین ہر زمان و مکان کے
ہے یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

ہب اسلام ایک فطری اور آسان دین

مذہب اسلام ایک فطری اور آسان دین ہے جس کی تعلیمات فطرت انسانی کے تقاضوں
طابق ہیں، اور جس کے عقائد و احکام اور اوامر و نواہی میں کسی قسم کی دشواری و پیچیدگی نہیں، مختلف
ادیث میں اس عظیم حقیقت کا تذکرہ بڑی وضاحت و صراحت سے کیا گیا ہے۔

ن ھذا الدین یسر (صحیح مسلم) بیشک یہ دین آسان ہے۔

نت بالحنیفیۃ السمحۃ (مسند احمد) میں آسان دین حنیف کے ساتھ بھیجا گیا ہوں۔

مذہب اسلام کا آسان ہونا عمل کرنے اور سمجھنے دونوں اعتبار سے ہے۔ جو لوگ عقل سلیم، قلب سلیم اور فطرت
لیمہ رکھتے ہیں ان کے لئے دین اسلام کے عقائد و احکام تقاضائے فطرت معلوم ہوتے ہیں اور جو لوگ کج فطری
شکار ہیں ان کے لئے دین کی ہر چیز خلاف عقل و فطرت معلوم ہوتی ہے۔

دین اسلام کے آسان اور فطری ہونے کا اندازہ قرآن و حدیث کے مطالعہ سے بخوبی ہو جاتا ہے، قرآن و حدیث
سلوب بہت ہی سادہ، واضح اور فطری ہے، اس وجہ سے اسلام کا مزاج عقائد کے بارے میں فلسفیانہ و متکلمانہ
ریکیوں اور فقہیات کے بارے میں فقہائے اہل الرائے کی موشگافیوں اور نصوص کتاب و سنت کی دور ازکار تاویلات
برداشت نہیں کرتا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب بھی اسلامی عقائد و احکام، فلاسفہ، معتزلہ اور فقہائے اہل الرائے
پیدگیوں، موشگافیوں اور بے اعتدالیوں سے دوچار ہوئے تو اسلام ایک دشوار اور غیر فطری دین معلوم ہونے لگا
رکے محققین ائمہ وعلماء نے اس دردناک حقیقت کا اعتراف کیا ہے اور ہر وہ شخص جس نے کتاب و سنت
ر جانبدارانہ اور گہرا مطالعہ کیا ہو اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔

یہ حقیقت اچھی طرح معلوم ہے کہ دین کے حاملین اولین اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے براہ راست مخاطب صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے اس لئے دین کے سلسلے میں اس امت کے سب سے اہم ذمہ داریہی تھے ان سے جس خلوص وگرمجوشی اور جذبۂ عمل کے ساتھ تابعین نے اور تابعین سے تبع تابعین نے دین سیکھا ہے بعد کے ادوار میں اس کی اکا دکا انفرادی مثالیں تو شاید مل جائیں لیکن اجتماعی طور پر ایسی مثال نہیں لائی جاسکتی۔ غالبًا اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں ان مبارک زمانوں کو سب سے بہتر قرار دیا ہے، ارشاد ہے۔

خیر امتی قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم۔ رواہ البخاری ومسلم وغیرہ عن عمران بن حصین۔ (مشکوٰۃ ص۵۵۳)

سب سے بہتر ہمارے زمانے کے لوگ ہیں اس کے بعد وہ لوگ جو ان سے متصل ہیں اور پھر وہ لوگ جو ان سے متصل ہیں۔

یہ حدیث صاف بتارہی ہے کہ صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے مبارک زمانے تمام ادوار سے بہتر تھے تاریخ بھی اس کی شہادت دیتی ہے کہ وہ تینوں زمانے عقیدہ وعمل، تہذیب وتمدن، اخلاق ومعاشرت، اقتصادیات واجتماعیات اور حکومت وسیاست ہر اعتبار سے بہتر تھے۔ لہٰذا یہ تینوں زمانے امت مسلمہ کے لئے رہنما زمانے ہوئے پس امت کی کامیابی اسی میں ہے کہ وہ ان تینوں زمانوں کے اعتقادی وفقہی، اخلاقی ومعاشرتی اور اجتماعی واقتصادی مزاج کو اپنائے، امام دار الہجرۃ حضرت امام مالک رحمہ اللہ اسی عظیم نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

لا یصلح اٰخر ھٰذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا۔

اس امت کے بعد کے لوگوں کی صلاح و فلاح پہلے لوگوں (یعنی سلف صالح) کے طریقوں پر چلنے ہی سے ہو سکتی ہے۔

صحابہ تابعین اور تبع تابعین کے دور کا جو دینی مزاج تھا وہ کسی لمبی چوڑی تشریح وتوضیح کا محتاج نہیں۔ یہ لوگ دین اسلام کی فطری سادگی پر علمی اور عملی دونوں انداز سے قائم تھے ان کے یہاں نہ عقائد کے سلسلے میں فلسفیانہ اور متکلمانہ پیچیدگیاں تھیں۔ اور نہ احکام کے سلسلے میں فقہاء کرام کی موشگافیاں پس کتاب وسنت کے اندر جو کچھ موجود ہوتا اور جس شکل میں موجود ہوتا بلا چون وچرا تسلیم کرلیتے اور اس پر عمل پیرا ہو جاتے۔ یہ لوگ اہل زبان تھے اس لئے جو کچھ ان کے سامنے آتا تھا اس کے معنی اور مطلب سے خوب اچھی طرح آگاہ ہوتے تھے۔ لیکن انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس میں عقل ورائے کو کہاں دخیل بنانے کی گنجائش ہے اور کس حد تک گنجائش ہے اور کون سے امور اور دائرے ایسے ہیں جو عقل وقیاس کی رسائی سے بالاتر ہیں۔ یا جہاں عقل کی دخل اندازی کا نتیجہ مفید کے بجائے خطرناک ہے۔ اس حقیقت کو دل نشین رکھنے کی بنا پر ان کا

قدم کبھی جادۂ اعتدال سے نہ ہٹا۔ اور نہ اسلام کی سادگی پر ان کے ذریعہ کبھی آنچ آنے پائی۔

لیکن دینی عقائد و مسائل میں عقلی در اندازیوں اور موشگافیوں کا سلسلہ متاخرین صحابہ کی موجودگی ہی میں شروع ہو گیا جس نے رفتہ رفتہ ترقی کی اور آگے چل کر اس قدر زور پکڑا کہ دین کے نام پر طرح طرح کے اندھے بہرے فتنے پیدا ہو گئے۔ امت مسلمہ گروہوں، فرقوں اور ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی طرح طرح کی بے اعتدالیاں انتہاپسندیاں اور انحرافات وجود میں آ گئے ان حالات میں ائمۂ محدثین کا گروہ ایسا تھا جو عہد صحابہ، عہد تابعین و تبع تابعین کے اعتقادی و فقہی مزاج پر قائم اور اس کا داعی رہا، اور تاریخ کے ہر دور میں ہمیشہ ایسے لوگ موجود رہے جو ان تینوں مبارک زمانوں کے دینی مزاج کے علم بردار رہے اور ان شاء اللہ قیامت تک یہ حق پرست گروہ موجود رہے گا، اسی گروہ کو اہلحدیث اہل اثر، اصحاب الحدیث اور سلفی وغیرہ کہا جاتا ہے۔

محدثین کا مسلک اسلام کی صحیح تعبیر

حقیقت یہ ہے کہ محدثین کا یہ انداز فکر و عمل جسے ہم مسلک اہلحدیث کہتے ہیں یہی دین اسلام کی معتدل اور صحیح تشریح و تعبیر ہے جو ہر طرح کے اعتقادی و فقہی افراط و تفریط سے محفوظ ہے اور جس میں اسلام کی سادگی اور فطری مزاج کا ہر طور لحاظ رکھا گیا ہے یہ مسلک عقیدہ و احکام ہر معاملہ میں نصوص کتاب و سنت، دلائل کتاب و سنت اور اسلوب کتاب و سنت کو اختیار کرتا ہے اور اسی کی دعوت دیتا ہے بمسئلہ توحید اور خصوصًا خدا کی ذات و صفات کے مسئلہ میں اسلوب قرآن و حدیث سے ایک سر مو انحراف کا قائل نہیں۔ اسی طرح یہ مسلک رسالت محمدی کو ٹھیک اس کے مقام پر رکھتا ہے اور حدیث و سنت کو اس کی صحیح آئینی حیثیت اور تشریعی اہمیت عطا کرتا ہے جماعت اہلحدیث چونکہ محدثین کے اسی مسلک پر قائم ہے۔ اور اس کا مسلک انہی کے انداز فکر کے تسلسل سے عبارت ہے اس لئے یہ جماعت دلائل کی پیروی کی خوگر، صحیح اتباع رسول کی شیدائی اور تقلید و شخصیت پرستی سے کنارہ کش ہے۔

اس جماعت کا عقیدہ ہے کہ تمام بدعات و خرافات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے حسب ارشاد شر الامور یعنی سب سے بری چیز ہیں۔ اس لئے ان سے خود بھی اجتناب کیا جائے اور پوری امت کو بھی بچایا جائے وسیع پیمانہ پر امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا اہتمام کیا جائے اور دعوت و تبلیغ کا وہ فطری اور تدریجی انداز و اسلوب اختیار کیا جائے جو سید الانبیاء والامام اعظم محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اختیار کیا تھا۔

صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کا یہی اعتقادی، فقہی اور دعوتی و تبلیغی مزاج تھا۔ جماعت اہلحدیث

عہد نبوی، عہد صحابہ، اور عہد تابعین و تبع تابعین کے اعتقادی و فقہی ذوق کی تجدید و احیاء کرنا چاہتی ہے۔
اس لئے بیجا نہ ہوگا کہ عقائد و احکام کے معاملے میں ہم اس سلفی مسلک و منہج کی حامل جماعت اہلحدیث کے انداز و اسلوب کا خاکہ پیش کریں اور تمام مسلمانوں کو ان پر غور و فکر کی دعوت بھی دیں۔

توحید خالص توحید دین اسلام کی اصل بنیاد ہے، جس پر رسالت، دوسرے دینی عقائد، اور تمام دینی تعلیمات قائم ہیں، توحید ایسا سرچشمہ قوت ہے جس سے انسانوں کو ایمان و یقین ثبات و استقامت اور جوش و حوصلہ ملتا ہے، اور توحید وہ عظیم ترین حقیقت ہے جس پر زمین و آسمان، شجر و حجر، بحر و بر، شمس و قمر، انجم و کہکشاں اور کائنات کے ذرے ذرے گواہی دے رہے ہیں۔

وَ فِیْ کُلِّ شَیْئٍ لَـهٗ اٰیَـةٌ تَـدُلُّ عَلٰی اَنَّـهٗ وَاحِـدٌ

کائنات کی ہر شئے میں ایک ایسی نشانی ہے جو اللہ کے ایک ہونے کو بتا رہی ہے۔

مگر حیرت ہے توحید جیسی عظیم حقیقت مشرکین اور ملحدین کے احاطۂ عقل و خرد میں نہ آسکی اور افسوس ہے کہ بعض اعتبار سے توحید کے رخ زیبا کو فلسفیانہ، متکلمانہ اور مبتدعانہ گرد و غبار نے بھی داغدار کیا ہے۔ جماعت اہلحدیث خالص اور کامل توحید پر ایمان رکھتی ہے، وہ توحید جو وضاحت و صراحت کے ساتھ آیات قرآنی و احادیث نبوی سے ثابت ہے۔

لغت میں توحید کا معنی ہے یہ جاننا کہ فلاں شئے ایک ہے اور قرآن و حدیث کی اصطلاح میں توحید کا مطلب ہے یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ اپنی ملکیت اور افعال میں ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اپنی ذات و صفات میں ایک ہے کوئی اس کا نظیر نہیں۔ اور اپنی عبادت و الوہیت میں ایک ہے کوئی اس کا مماثل نہیں۔ اس طرح توحید کی تین قسمیں ہو جاتی ہیں، پہلی قسم کو توحید ربوبیت و ملکیت کہا جاتا ہے۔ دوسری قسم کو توحید اسماء و صفات اور تیسری قسم کو توحید الوہیت و عبادت۔ توحید کی یہی تینوں قسمیں انبیاء و رسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی دعوت کا اصلی محور ہیں۔ اور یہ تینوں ایک دوسرے کو لازم ہیں اور مومن ہونے کے لئے ان تینوں پر ایمان لانا ضروری ہے، لہٰذا جو شخص توحید کی ایک قسم پر ایمان لاتا ہے اور دوسری قسم پر ایمان نہیں لاتا وہ مومن نہیں۔ چونکہ اسلام کی بنیاد توحید پر ہے اس لئے دین اسلام کو دین توحید بھی کہا جاتا ہے، توحید کی یہ تقسیم و تشریح بڑی وضاحت اور بسط کے ساتھ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیمؒ وغیرہ نے کی ہے۔

(تیسیر العزیز الحمید فی شرح کتاب التوحید ص۳۳)

ہم اختصار کے ساتھ کتاب وسنت کی روشنی میں توحید کی تینوں قسموں کی توضیح وتشریح کر رہے ہیں۔ بحث میں ہم سب سے پہلے توحید ربوبیت وملکیت کو لیں گے، پھر توحید الوہیت وعبادت، پھر توحید اسماء وصفات۔

توحید ربوبیت وملکیت

توحید ربوبیت وملکیت کا مطلب ہے یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر چیز کا رب، مالک، خالق اور رازق ہے، وہی زندگی اور موت دینے والا، وہی نفع اور نقصان پہونچانے والا، اور اضطرار کے وقت دعا قبول کرنے والا ہے۔ اسی کو ہر طرح کا اختیار ہے اور اسی کے ہاتھ میں ہر طرح کا خیر ہے، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے، ان تمام چیزوں میں کوئی بھی اللہ کا شریک نہیں، نیز توحید ربوبیت میں تقدیر پر ایمان لانا بھی داخل ہے، یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے تمام چیزوں کا ٹھیک ٹھیک حساب کر لیا ہے اور اسے پہلے ہی سے علم ہے کہ فلاں چیز کب اور کس طرح واقع ہوگی لہٰذا تمام چیزیں اللہ کے مقررہ حساب اور علم کے مطابق واقع ہونگی۔ (تیسیر العزیز الحمید فی شرح کتاب التوحید ص۳۳)

مشرکین مکہ توحید ربوبیت کے قائل تھے، مندرجہ ذیل قرآنی آیات اس حقیقت پر بڑی وضاحت سے روشنی ڈالتی ہیں۔

(۱) ولئن سألتهم من خلق السموات والارض ليقولن الله قل الحمد لله بل اكثرهم لا يعلمون۔ (لقمان ۲۵)

اور اگر آپ ان (مشرکین) سے پوچھیں کہ آسمانوں اور زمین کو کس نے پیدا کیا ہے تو ضرور وہ یہی کہیں گے کہ اللہ نے آپ کہئے کہ تعریف اللہ کے لئے ہے بلکہ ان میں اکثر نہیں جانتے۔

(۲) قل من يرزقكم من السماء والارض امن يملك السمع والابصار ومن يخرج الحي من الميت ويخرج الميت من الحي ومن يدبر الامر فسيقولون الله فقل افلا تتقون۔ (یونس ۳۱)

آپ ان سے کہئے کہ وہ کون ہے جو تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے وہ کون ہے جو کان اور آنکھ کا مالک ہے وہ کون ہے جو جاندار کو بیجان سے اور بیجان کو جاندار سے نکالتا ہے اور وہ کون ہے جو تمام کاموں کی تدبیر کرتا ہے وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ ہے تو ان سے کہئے کہ (شرک سے) کیوں نہیں بچتے۔

(۳) ولئن سألتهم من خلقهم ليقولن

اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ان کو کس نے پیدا کیا ہے

الله ۔ (الزخرف ۸۸) — تو وہ کہیں گے کہ اللہ نے ۔

(۴) ولئن سالتھم من نزّل من السّماء ماء فاحیا به الارض من بعد موتها لیقولن الله۔ (العنکبوت ، ۶۴) — اگر آپ ان سے پوچھیں کہ آسمان سے بارش کس نے نازل کی، پھر زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد زندگی دی تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔

(۵) امن یجیب المضطر اذا دعاه و یکشف السوء و یجعلکم خلفاء الارض أالٰه مع الله قلیلا ما تذکرون (النمل ۶۲) — وہ کون ہے جو پریشان حال کی دعا سنتا ہے اور پریشانی دور کرتا ہے اور تم کو زمین میں یکے بعد دیگرے آباد کرتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی شریک ہے تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو۔

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ مشرکین بھی اللہ تعالیٰ کے بارے میں یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ آسمان و زمین کا خالق و مالک روزی رساں ہے اور اسباب رزق یعنی بارش برسانے اور سبزہ اگانے پر قدرت صرف وہی رکھتا ہے کوئی دوسرا نہیں اور خود ان مشرکین کا پیدا کرنے والا بھی وہی ہے کوئی اور نہیں ۔ آنکھ اور کان کا مالک بھی وہی ہے ، اور وہی ہے جو مردے کو زندہ سے اور زندہ کو مردے سے نکالتا ہے۔ کوئی اور نہیں ۔ وہی ہے جو آسمان و زمین کے نظام کی تدبیر کرتا ہے۔ کوئی اور نہیں ہے۔ وہی ہے جو مضطر و بدحال کی دعا و پکار سنتا ہے کوئی اور نہیں ۔ مشرکین یہ سب کچھ مانتے تھے ۔

قرآن مجید میں اس معنی کی آیات اور مفصل طور سے توحید ربوبیت پر دلالت کرنے والے ارشادات بہت ہیں۔ پوری انسانی تاریخ میں خدا کی ربوبیت کا انکار حقیقتاً یا تو پچھلے بعض ملحدوں نے کیا ہے یا موجودہ دور کے کمیونسٹوں نے ، یا کائنات کے پورے سلسلۂ وجود اور سلسلۂ نشو ونما کو محض اتفاقات کا نتیجہ ماننے والے سائنس دانوں نے ۔ دوسری طرف کچھ کلمہ گو حضرات رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو مختار کل مانتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کی ربوبیت میں محمد رسول اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں اور اس طرح شرک کے معاملے میں مشرکین مکہ سے بھی چند قدم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کیونکہ مشرکین مکہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت میں کسی کو شریک نہیں مانتے تھے ۔

توحید الوہیت وعبادت

توحید الوہیت و عبادت کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کی عبادت کو اللہ کے لئے خالص کر لیا جائے ۔ عبادت میں بہت سی چیزیں داخل ہیں جیسے محبت ، توکل ، خوف ، امید ، نماز ، رکوع ، سجود ، دعا ، ذبح ، نذر ، طواف ، حج ، توبہ ، استعاذہ (پناہ مانگنا) استعانہ (مدد چاہنا) اور ان کے علاوہ عبادت کی وہ تمام انواع و اقسام جن کو اللہ نے قرآن میں مشروع قرار دیا ہے یا جنہیں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی قولی اور عملی سنت صحیحہ سے مشروع کیا ہے۔ (تیسیر العزیز الحمید فی شرح کتاب التوحید ص۳۶)

ہم ذیل میں ترتیب کے ساتھ ان قرآنی آیات کا ذکر کر رہے ہیں جن سے الوہیت و عبادت کی مذکورہ انواع و اقسام پر بڑی وضاحت سے روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ فرمائیں!

(۱) ومن الناس من یتخذ من دون اللہ اندادا یحبونھم کحب اللہ۔ (البقرۃ ۱۶۶)
کچھ لوگ غیر اللہ کو اللہ کا ہمسر بناتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں اللہ سے محبت کرنے کی طرح۔

(۲) وعلی اللہ فتوکلوا ان کنتم مؤمنین۔ (المائدہ ۲۷)
اللہ ہی پر بھروسہ کرو اگر تم لوگ مومن ہو۔

(۳) فلا تخشوا الناس واخشونی۔ (المائدہ ۴۸)
لوگوں سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو۔

(۴) ان الذین اٰمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ اولئک یرجون رحمۃ اللہ۔ (البقرہ ۲۱۹)
جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا، یہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔

(۵) فصل لربک وانحر۔ (الکوثر)
اپنے رب کے لئے نماز پڑھو اور قربانی کرو۔

(۶) یایھا الذین اٰمنوا ارکعوا واسجدوا واعبدوا ربکم۔ (الحج ۷۸)
اے ایمان لانے والو اپنے رب کے لئے سجدہ کرو۔ رکوع کرو اور عبادت کرو!

(۷) ولا تدع من دون اللہ ما لا ینفعک ولا یضرک فان فعلت فانک اذا من الظالمین (یونس ۱۰۷)
اللہ کے علاوہ ایسے کو نہ پکارو جو تم کو نہ نفع دے سکے اور نہ نقصان، اگر ایسا کروگے تو ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

(۸) قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لا شریک لہ۔ (الانعام ۱۶۳)
آپ کہہ دیجئے میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور موت اللہ رب العالمین ہی کے لئے ہے کوئی اس کا شریک نہیں۔

(۹) ولیوفوا نذورھم ولیطوفوا بالبیت العتیق۔ (الحج ۳۰)
چاہئے کہ وہ (اللہ سے کی ہوئی) نذریں پوری کریں اور اللہ ہی کے گھر کا چکر لگائیں۔

(۱۰) ومن یغفر الذنوب الا اللہ۔ (آل عمران ۱۳۶)
اللہ کے علاوہ کون گناہوں کو معاف کرسکتا ہے۔

(۱۱) قل اعوذ برب الناس۔ (الناس)
آپ کہہ دیجئے میں اللہ ہی کی پناہ مانگتا ہوں

(۱۲) اذ تستغیثون ربکم فاستجاب لکم۔ (الانفال ۱۰)
جب تم اللہ سے مدد طلب کر رہے تھے تو اس نے تمہاری پکار سن لی۔

قرآن مجید میں اس معنی کی آیات بیشمار ہیں چونکہ یہی توحید دین اسلام کی اصل حقیقت ہے مشرکین اسی توحید کے منکر تھے اس لئے قرآن مجید نے مختلف اسالیب سے توحید الوہیت وعبادت کو واضح کیا ہے اور عبادت کی تمام انواع واقسام کو اللہ کے لئے خاص قرار دیا ہے۔

مندرجہ بالا آیات سے روز روشن کی طرح عیاں ہوجاتا ہے کہ عبادت کیا کیا ہے۔ اور چونکہ اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت کرنا شرک ہے اس لئے کسی زندہ یا مردہ کو سجدہ کرنا یا غیر اللہ کے لئے نذر چڑھانا یا ان کے لئے جانور ذبح کرنا یا درختوں اور چشموں پر چڑھاوا چڑھانا یا کسی نبی یا ولی کی قبر کا طواف کرنا یا ان قبر والوں سے مشکلات کے وقت فریاد طلب کرنا یا غیر اللہ سے وہ چیزیں مانگنا جنہیں دینے پر صرف اللہ قادر ہے یہ سارا کام شرک ہوگا۔ اور جو شخص ان تمام افعال کا یا ان میں سے کسی ایک فعل کا مرتکب ہوگا وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک اکبر کا مرتکب ہوگا۔

توحید اسماء وصفات

اسماء وصفات کی توحید کا مطلب یہ ہے کہ آدمی یہ پختہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں اپنے اوصاف عالیہ واسماء حسنیٰ کا جو ذکر فرمایا ہے۔ نیز احادیث صحیحہ سے اللہ کے اسماء وصفات کے بارے میں جو کچھ ثابت ہے وہ سب کا سب اللہ کے جلال وعظمت وکبریائی کے عین مطابق ہے اور صرف اسی کے لئے لائق وزیبا ہے، لہٰذا ان تمام اسماء وصفات پر بلا تمثیل وتاویل اور بلا تعطیل وتکییف ایمان لانا ضروری ہے مشرکین مکہ اس توحید کے بھی قائل تھے، البتہ بعض کفار ومشرکین سے جہالت یا عناد کی وجہ سے جزئی انکار ملتا ہے۔

(تطہیر الجنان والارکان عن درن الشرک والکفران)

قرآن مجید اور احادیث میں بڑی تفصیل کے ساتھ اللہ کے اسماء حسنیٰ واوصاف عالیہ کا ذکر کیا گیا ہے۔ جیسے حیات علم، ارادہ، قدرت، سننا اور دیکھنا، بات کرنا، رحمت ومحبت، ہاتھوں کا ہونا، چہرہ کا ہونا، آسمان میں ہونا عرش پر مستوی ہونا، اترنا وغیرہ اللہ کے ان اسماء وصفات پر ایمان لانے سے عقیدے کی تکمیل کے علاوہ اللہ کی عظمت وجلال اور اس کی رحمت ورافت وغیرہ صفات کا انسان کے ارادوں اور اس کی عملی زندگی پر اچھا اثر بھی پڑتا ہے وہ غلط قدم اٹھانے سے بچتا ہے۔ مشکلات میں حوصلے نہیں ہارتا۔ اور اللہ کے بھروسہ پر بڑے اہم اقدامات کر ڈالتا ہے مایوس کن حالات میں اس کا آسرا نہیں ٹوٹتا۔ وغیرہ وغیرہ

مندرجہ ذیل آیات واحادیث میں اللہ کے مذکورہ بالا اوصاف کا تذکرہ ہے۔

(۱) اللہ لا الٰہ الا ھو الحی القیوم (آل عمران: ۲) اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے۔

(۲) ولا یحیطون بشیٔ من علمہ ۔ (البقرۃ ۲۵۵)

لوگ اللہ کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کرسکتے ۔

(۳) انما امرہ اذا اراد شیئًا ان یقول لہ کن فیکون ۔ (یٰسین ۸۲)

اس کی شان یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہہ دیتا ہے ۔ ہوجا بس وہ ہوجاتی ہے ۔

(۴) وکان اللہ علی کل شیٔ قدیرا (الفتح)

اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۔

(۵) وکلم اللہ موسیٰ تکلیما ۔ (النساء ۱۶۴)

اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا ۔

(۶) وکان اللہ سمیعًا بصیرا ۔ (النساء ۱۳۴)

اور اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے ۔

(۷) بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔

اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے ۔

(۸) مامنعک ان تسجد لما خلقت بیدی (ص ۷۵)

اے ابلیس ! تجھ کو کس چیز نے روکا کہ تو اس کا سجدہ کرے جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ۔

(۹) ویبقٰی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام (الرحمٰن ۲۷)

اور تیرے رب کا چہرہ باقی رہے گا جو عظمت اور بزرگی والا !

(۱۰) یحبھم ویحبونہ ۔ (المائدہ ۵۴)

اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں ۔

(۱۱) أأمنتم من فی السماء ان یخسف بکم الارض فاذا ھی تمور ۔ (الملک ۱۶)

کیا تم اس ذات سے بے خوف ہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تم کو زمین میں دھنسا دے تو زمین ڈگمگانے لگے ۔

(۱۲) الرحمٰن علی العرش استویٰ (طٰہٰ)

رحمٰن عرش پر مستوی ہوا ۔

(۱) ینزل ربنا کل لیلۃ الی السماء الدنیا ۔ (الحدیث)

ہمارا رب ہر رات آسمان دنیا کی طرف نازل ہوتا ہے (اترتا ہے)

کتاب اللہ اور احادیث صحیحہ میں اس طرح کی جتنی صفات اور اسماء وارد ہیں ان کے بارے میں صحیح اسلامی موقف یہ ہے کہ ان سب کو ثابت مانا جائے ، نہ ان میں تمثیل وتکییف کا راستہ اپنایا جائے اور نہ تاویل وتعطیل کا یعنی نہ تو یہ کہا جائے کہ اللہ کی صفات مخلوق کی صفات کی طرح ہیں نہ ان کی کیفیت بیان کی جائے ۔ اسی طرح نہ ان کی دور از کار تاویل کی جائے کہ ان کا معنی ہی بدل جائے اور نہ ان کا انکار کیا جائے ۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ان دونوں پہلوؤں کی تردید کی ہے ، ارشاد ہے ۔ لیس کمثلہ شیٔ وھو السمیع البصیر (الشوریٰ ۱۱) اللہ کی طرح کوئی چیز نہیں اور وہ دیکھتا سنتا ہے ۔ اس آیت کے پہلے جملے نے تمثیل وتکییف کا رد کیا ہے اور دوسرے جملے نے تاویل وتعطیل کی تردید کی ہے ، اسی لئے سلف صالحین نے خدا کی ذات وصفات کے مسئلہ میں تفویض کا راستہ اختیار کیا ہے یعنی عہد سلف اور لغت عرب سے صفات الٰہی کا جو معنی معلوم ہوتا ہے اس پر بغیر "کیوں" اور

کیسے ،، کے ایمان لانا اور اصل حقیقت کا علم اللہ تعالےٰ کے حوالہ کر دینا ، عقیدۂ تفویض ہی باب عقائد میں فکری سلامتی کا راستہ ہے ، کیونکہ اللہ کی صفات میں کلام کرنا دراصل اس کی ذات میں کلام کرنے کی شاخ ہے ۔ اور اللہ کی ذات کی حقیقت اور کنہ تک انسانی عقل کی رسائی ممکن نہیں ۔ پس ذات کی حقیقت کو جانے بغیر کسی صفت کے محال اور ممکن وغیرہ ہونے کی بات اٹھانا بالکل فضول اور غیر معقول بات ہے ۔

علامہ شیخ احمد بن حجر آل بوطامی حفظہ اللہ لکھتے ہیں کہ مسئلہ صفات کے بارے میں اسی معتدل عقیدہ تفویض پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا عہد مبارک تھا ، صحابہ ، تابعین ، تبع تابعین اور ائمہ دین مثلاً امام ابوحنیفہؒ امام مالکؒ ، امام شافعیؒ ، امام احمد بن حنبلؒ ، امام بخاریؒ ، امام مسلمؒ ، امام ترمذیؒ ، امام نسائیؒ ، امام ابوداؤدؒ سفیان ثوریؒ ، ابن عیینہؒ اور ان کے علاوہ دوسرے محدثین ، فقہائے کرام ، حق پرست صوفیاء جیسے جنید ، جیلانی ابونعیم ، محققین اہل لغت مثلاً خلیل بن احمد اور ثعلب وغیرہ اسی عقیدہ پر تھے ۔

(تطہیر الجنان والارکان عن درن الشرک والکفران ،، بحث توحید اسماء و صفات)

ہم پورے اعتماد و اطمینان کے ساتھ عرض پرداز ہیں کہ جماعت اہلحدیث بھی ٹھیک اسی عقیدے پر قائم ہے ۔ وہ اسلوب قرآن و حدیث سے ایک سر مو تجاوز نہیں کرتی اور نہ ہی ان صفات کی تاویل کرتی ہے جو قرآن و حدیث میں وارد ہیں ۔ جیسا کہ اشعریہ ، جہمیہ ، معتزلہ ، اور خوارج وغیرہ نے تاویلات کی ہیں ، کہ " ید ،، سے مراد نعمت ہے ۔ " آسمان میں ہونے ،، کا مطلب یہ ہے کہ اس کی حکمرانی آسمان میں ہے ۔ " استواء ،، سے مراد " استیلاء ،، یعنی غلبہ حاصل کرنا ہے " وجہ ،، کا معنی ذات ہے " رحمت ،، کا مطلب فضل کرنا ہے ، اور " نزول ،، کا مطلب اس کی رحمت یا حکم کا نزول ہے یا فرشتوں کا نزول مراد ہے ، یہ اور اس طرح کی تمام فاسد فلسفیانہ و متکلمانہ تاویلات سے جماعت اہلحدیث مکمل اجتناب کرتی ہے اس لئے کہ اس طرح کی تاویلات دین و شریعت کو باطل پرستوں کے ہاتھ میں کھلونا بنا دیتی ہیں ، یعنی باطل پرست جب بھی کسی عقیدہ یا حکم شرعی کا انکار کرنا چاہے تو وہ انکار کے بجائے تاویل کی راہ اختیار کر سکتا ہے ۔ اللہ ہمیں ہر طرح کی کجی اور گمراہی سے محفوظ رکھے ۔ آمین ۔

نوٹ : یہ مضمون ایک اور رسالے کو دیا گیا تھا ، مگر اس نے ایک درمیانی ٹکڑا مسخ شدہ شکل میں شائع کیا ۔ اس لیے مکمل اور منقح اشاعت کے لیے محدث کو منتخب کیا گیا ۔ (باقی بحث آئندہ قسطوں میں ملاحظ فرمائیں ۔)

مولانا حافظ محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹیؒ اور ان کی تصنیفی خدمات

مولانا محمد مستقیم صاحب سلفی

مولانا حافظ محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹیؒ متحدہ ہند کے صوبہ پنجاب کے ایک مایۂ ناز عالم و محدث تھے۔ آپ کا شمار وقت کے عظیم ترین علماء میں ہوتا ہے آپ مشہور شہر سیالکوٹ میں سن[1] ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء مطابق ۱۲۹۵ یا ۱۲۹۶ھ میں پیدا ہوئے۔

سیالکوٹ ہی وہ شہر ہے جس میں شیخ محمد افضل صاحبؒ سیالکوٹیؒ کی مسندِ درس بچھی تھی اور جوق در جوق طالبانِ حدیث مشرق و مغرب سے ان کی درس گاہ کا رُخ کرتے تھے۔ ان کی درس گاہ سے جو نامور نکلے، ان میں سے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت مرزا مظہر جانِ جاناں رحمہما اللہ کی ذات با برکات قابلِ ذکر ہیں۔ (القول الجمیل للشاہ ولی اللہؒ)

مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹیؒ کے اساتذہ میں مولانا حافظ عبدالمنان صاحب محدث وزیرآبادی اور شیخ الکل فی الکل میاں نذیر حسین صاحب محدث دہلوی رحمہما اللہ جیسے اکابر ہیں۔ فراغت کے بعد قدیم روایت کے مطابق اپنی مسجد میں قرآن و حدیث کا درس شروع کیا جب مدرسہ دارالحدیث رحمانیہ دہلی قائم ہوا تو وہاں چند ماہ تک کتب علوم و حدیث و تفسیر کا درس دیا۔ اس کے بعد اپنے آبائی وطن سیالکوٹ واپس چلے گئے۔ خدا نے آپ کو تصنیف و تالیف کا پاکیزہ ذوق بخشا تھا جس کے ذریعہ

---

[1] مولانا کا یہ سن ولادت آپ کی کتاب "برکاتِ محمدیہ" ص ۱۲ (جس کی تاریخ تصنیف ۱۷ اپریل ۱۹۳۸ء مطابق ۱۷ صفر ۱۳۵۷ھ ہے) کی مندرجہ ذیل عبارت سے سمجھا جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں: خدا کا شکر ہے کہ مجھے آغازِ شباب سے اس وقت تک (کہ ناکارہ عمر ۶۲/۶۳ کو پہنچ گئی ہے) ہمیشہ تہجد کی نسبت تہجد کی نماز زیادہ پیاری رہی ہے۔"

. . . . آپ امت کے خلاف اٹھنے والے منظم فتنوں جیسے قادیانیت، بریلویت، انکارِ حدیث، بہائیت اور عیسائی مشن کا بھرپور مقابلہ کرتے رہے آخرکار ۱۲ر جنوری ۱۹۵۶ء مطابق ۲۰ رجمادی الاولیٰ ۱۳۷۵ھ بروز جمعرات علومِ اسلامیہ کا یہ درخشاں آفتاب ہمیشہ کے لیے سیالکوٹ کی سرزمین میں غروب ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا نے جو گرانقدر تحریری خدمات انجام دیں ان کا مختصر تعارف ہدیۂ ناظرین کیا جارہا ہے، ان میں صرف انہی کتابوں کا تذکرہ ہے جو میری نظر سے گزری ہیں۔

واضح البیان فی تفسیر ام القرآن

ج اول (اردو) صفحات ۴۸۸ طبع مطبع

یہ جلد صرف سورۂ فاتحہ کی تفسیر پر مبنی ہے، لیکن حقیقت میں سارے قرآن مجید کے مقاصد مبہم پر حاوی ہے جس کے ضمن میں صدہا دیگر آیات کی تفسیر بھی آگئی ہے اور صدہا نادر نکتے بیان کیے گئے ہیں اور بڑے بڑے معرکہ آرا مسائل حل کیے گئے ہیں۔

(۲) مترجم پنج سورہ

(اردو) صفحات ۳۲ طبع شعبان ۱۲۰۳ھ مطبع مجتبائی دہلی۔

یہ کتاب سورہ یٰس، فتح، نبا، واقعہ اور ملک کے ترجمہ وحواشی پر مشتمل ہے اور کتاب کے اخیر میں مذکورہ سورتوں کے فضائل پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۳) ریاض الحسنات

(اردو) صفحات ۸۰ سن تصنیف ذی الحجہ ۱۳۶۴ھ مطابق نومبر ۱۹۴۵ء طبع اول ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۶ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

اس کتاب میں اولاً قرآن مجید کی پانچ سورتیں یعنی سورہ سجدہ، یٰس، ملک، نوح اور مزمل ہیں پھر اسمائے حسنیٰ اس کے بعد بعض اذکارِ مسنونہ ہیں یہ سب مع ترجمہ وحواشی کے لکھے گئے ہیں۔

(۴) تائید القرآن بجواب تاویل القرآن

(اردو) صفحات ۲۹۹ طبع اول ۱۹۰۵ء مطبع پنجاب پریس سیالکوٹ

یہ مضمون پرچہ "الہادی" سیالکوٹ جلد ۲ تا ۴ سے نقل کرکے کتابی شکل میں کر دیا گیا ہے۔ پادری ڈاکٹر محمد اکبر مسیح کی ایک کتاب "تاویل القرآن" ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کتب سابقہ توریت

زبور انجیل کا ضمیمہ ہے اور موجودہ قرآن محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ قرآن کا کچھ حصہ ہے۔

اس کتاب میں مولانا نے اس کا بھرپور جواب دیتے ہوئے عبداللہ چکڑالوی (اہل قرآن) اور مرزا غلام احمد قادیانی کے ان اعتراضات و غلط بیانیوں کا بھی قلع قمع کیا ہے جو ان حضرات نے قرآن و حدیث پر کی ہیں۔

(۵) سلم العلوم الی اسرار الرسول (اردو)

صفحات ۴۸ طبع اول فروری ۱۹۰۵ء
مطبع پنجاب پریس سیالکوٹ

مرزا غلام احمد قادیانی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج جسمانی کا انکار حضرت مسیح علیہ السلام کے انکار رفع الی السماء کے ضمن میں کیا ہے، مذکورہ کتاب اسی کے جواب پر مشتمل ہے۔

اس کتاب میں ایک مقدمہ ایک وصل اور دو فصلیں ہیں۔ مقدمہ میں اس امر کا بیان ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور اکابر اولیاء قوائے جسمانیہ و روحانیہ میں خلقت و استعداد کے لحاظ سے دیگر افراد بنی آدم سے ممتاز ہوتے ہیں، وصل میں آیت: ولن تجد لسنتنا تحویلا، کی توضیح و تفسیر کی گئی ہے، فصل اول میں قرآن و حدیث اور اقوال علمائے سلف سے معراج جسمانی کو ثابت کیا گیا ہے اور فصل ثانی میں منکرین معراج کے شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے۔

(۶) احکام المرام باحیاء ماثر علماء الاسلام (اردو)

صفحات ۱۵۲ طبع اول ۱۹۰۶ء
مطبع پنجاب پریس سیالکوٹ،

اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ امت محمدیہ کے صاحب کمال لوگ چار طرح کے ہیں اول فقہاء و محدثین دوم متکلمین سوم صوفیاء چہارم خلفاء و مجاہدین

مذکورہ کتاب کو تین ابواب میں تقسیم کر کے اول میں فقہاء و محدثین ثانی میں متکلمین و شعراء علم و ادب کے کامل استادوں کا ذکر بھی اسی ضمن میں ہے) اور باب سوم میں صوفیاء کے حالات قلم بند کیے گئے ہیں اور خلفاء و مجاہدین کے حالات کو ایک مستقل کتاب "غزوات نبویہ اور فتوحات اسلامیہ" میں بیان کیا گیا ہے۔

(۷) اعجاز القرآن (اردو)

صفحات ۱۴۸ طبع اول ۱۹۰۸ء مطبع المنیر پریس سیالکوٹ،

مسٹر محمد اکبر مسیح کی ایک کتاب "تنویر الاذہان فی فصاحۃ القرآن" ہے جس میں پادری صاحب نے یہ بیان کیا ہے کہ مسلمانوں کا قرآن مجید فصاحت و بلاغت سے یکسر خالی ہے۔ مذکورہ کتاب اسی کے جواب میں ہے۔ اس کے شروع میں علم بلاغت و فصاحت کو بیان کیا گیا ہے اس کے بعد پادری صاحب کے تمام اعتراضات

کا جواب نہایت عمدہ پیرایہ میں دیا گیا ہے ۔

صفحات ۵۰ طبع اول ۶ر جولائی ۱۹۳۲ء

(۸) انارۃ المصابیح لاداء صلوٰۃ التراویح (اردو) مطبع برقی ثنائی پریس امرتسر

اس رسالہ میں خطبۂ رمضان اور فضائل ومسائل رمضان پر مفصل بحث کرتے ہوئے مسئلہ تراویح کے متعلق احادیثِ رسول (ص) واقوال ائمہ وعلمائے احناف سے ثابت کیا گیا ہے کہ سنت صرف گیارہ رکعت مع وتر ہے، ویسے مستحب اکتالیس رکعت تک ہے ۔ بیس کی کوئی تخصیص نہیں بلکہ بیس کو لازم کر لینا بدعت ہے ۔

صفحات ۱۲ طبع اول ۱۹۹۲ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

(۹) عصمۃُ النبی (اردو) یہ رسالہ عیسائیوں کے ان اعتراضات کے جواب میں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیے گئے تھے ، یعنی قصۃ الغرانیق العلی ، جس میں غلط طور سے یہ بتایا گیا ہے کہ ایک مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتوں کی تعریف کی تھی ۔

صفحات ۱۲ طبع اول ۱۹۳۲ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

(۱۰) فرقہ ناجیہ (اردو) اس رسالہ میں مولانا نے حدیث " تفترق امتی علیٰ ثلث وسبعین ملۃ کلھم فی النار الا ملۃ واحدۃ " کے بموجب فرقۂ ناجیہ پر بحث کی ہے ۔ اور احادیث واقوالِ ائمہ اور تاریخ کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ فرقہ ناجیہ جماعت اہلحدیث ہے ۔

صفحات ۱۶ طبع اول ۱۹۳۳ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

(۱۱) کسر الصلیب (اردو) حضرت مسیح علیہ السلام کی نسبت واقعۂ صلیب کے سلسلہ میں بعض نادان مسلمان قرآن شریف کی تصریح اور مسلمانوں کے اجماعی عقیدے کے برخلاف حضرت مسیح کے مصلوب ہونے کے قائل ہو گئے، جس کے جواب میں یہ تحقیقی رسالہ قلمبند کیا گیا ہے ۔

سلہ یہ رسالہ متعدد بار شائع ہو چکا ہے، اس کے چوتھے ایڈیشن میں (جو ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا ہے) اخبار العدل گجرانوالہ بابت ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۲ء کا ایک مضمون بعنوان "امام ابو حنیفہ امام ابراہیم نخعی کے مقلد تھے" کا جواب بھی شامل کر دیا گیا ہے ۔ چوتھے ایڈیشن کے صفحات ۴۸ ہیں ۔

صفحات ۲۴ طبع اول شعبان/نومبر ۱۳۵۴ھ/۱۹۳۵ء مطبع ثنائی پریس امرتسر

(۱۲) **اربعین نبویہ** (اردو) اس رسالہ میں صحیحین کی چالیس حدیثیں اکٹھا کی گئی ہیں جو مختلف موضوع سے تعلق رکھتی ہیں، زیادہ تر ایمان سے متعلق ہیں۔

صفحات ۱۶ طبع اول ۱۹۳۷ء/۱۳۵۶ھ مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

(۱۳) **قنوت نوازل** (اردو) اس رسالہ میں قنوتِ نوازل کو تحریر کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ جب اہلِ اسلام پر کوئی عام مصیبت نازل ہو تو نمازِ فجر میں خصوصاً اور دیگر نمازوں میں عموماً اہلِ اسلام کی خیر خواہی اور ان کا انجام بخیر ہونے کی دعائیں کی جائیں۔

صفحات ۱۶ طبع اول اکتوبر/شعبان/۱۹۳۷ء/۱۳۵۶ھ مطبع ثنائی پریس امرتسر

(۱۴) **اسوۂ حسنہ** (اردو) اس رسالہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لیے لازم کر لینے پر زور دیا گیا ہے اور قرآن کی آیات و احادیث نبویہ سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ہر موقع پر اور خصوصاً مصیبت و پریشانی کے وقت اس پر ضرور عمل کرنا چاہیے۔

صفحات ۳۲ طبع اول ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء مطبع ممتاز برقی پریس سیالکوٹ

(۱۵) **برکات الصلوٰۃ** (اردو) یہ رسالہ صلوٰۃ استخارہ، صلوٰۃ تسبیح، صلوٰۃ توبہ، صلوٰۃ تہجد وغیرہ کے بیان پر مشتمل ہے۔

صفحات ۲۰ طبع اول ذی الحجہ/فروری، ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۸ء

(۱۶) **فلسفہ ارکان اسلام** (اردو) مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

اس رسالہ میں ارکانِ اسلام کا فلسفہ نہایت ہی احسن طریق پر بیان کیا گیا ہے جو بھی اس رسالہ کو پڑھے گا اس کو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی اہمیت کا صحیح طور پر پتہ چل جائے گا، نیز یہ معلوم ہو جائے گا کہ اسلام نے مسلمانوں کو کیسی بہترین حکیمانہ تعلیم دی ہے۔

صفحات ۱۶ طبع اول ۱۹۳۸ء مطبع ثنائی برقی پریس ہال بازار امرتسر

(۱۷) **برکاتِ محمدیہ** (اردو) اس رسالہ کی ابتدا میں کچھ دعائیں قلمبند کی گئی ہیں۔ اس کے بعد نمازِ تہجد کے فضائل بتاتے ہوئے اس پر ہمیشگی کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔

صفحات ۱۶ طبع اول ۱۹۳۸ء مطبع ثنائی برقی پریس ہال بازار امرتسر

(۱۸) فضائلِ شعبان (اردو) اس رسالہ میں ماہِ رمضان کی فضیلت بیان کرتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نصف شعبان کے روزہ رکھنے والی روایت میں ایک راوی "ابن ابی سبرہ" ہے جو وضاعین حدیث میں سے ہے۔ اس لیے یہ روایت قابلِ قبول نہیں۔

صفحات ۱۲ طبع اول ۱۹۳۸ء مطبع ثنائی پریس ہال بازار امرتسر

(۱۹) نمازِ تہجد (اردو) اس رسالہ میں نمازِ تہجد کے فضائل اور اس کے پڑھنے کے طریقے بتلاتے ہوئے اس بات کو بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ وتر تین رکعت یا پانچ رکعت کی نیت کرکے کوئی پڑھے تو اس میں صرف آخری رکعت میں قعدہ کرے اور تشہد پڑھے۔ درمیان میں دوسری یا چوتھی رکعت میں قعدہ نہ کرے۔

صفحات ۳۲ طبع اول ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۸ء

(۲۰) نمازۂ رنمائب برائے جنازہ برنمائب (اردو) مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

اس رسالہ کے شروع میں مصطفیٰ کمال پاشا کی مختصر تاریخ ہے اور نمازِ جنازہ غائبانہ پڑھنے کا ثبوت اور احناف کے دلائل کی تردید احادیث نبویہ اور اقوالِ ائمہ سے اچھی طرح کر دی گئی ہے۔

صفحات ۱۶ طبع اول ۱۹۳۸ء/۱۳۵۶ھ

(۲۱) توحیدِ الٰہی اور مسنون زندگی (اردو) مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

یہ رسالہ مولانا کی اس تقریر پر مشتمل ہے جو آپ نے جنوری ۱۹۳۷ء میں سکندر آباد دکن میں کی تھی، اس میں بتایا گیا ہے کہ توحید اور رسالت مسنونہ میں وہ تعلق ہے جو کلمہ طیبہ میں ہے، یعنی جب ہم خدائے تعالیٰ کی وحدانیت کے قائل ہوئے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اب زندگی دنیا میں کس نہج پر گزاریں کہ اس کی رضا حاصل کر سکیں۔ مذکورہ کتاب میں اس کا جواب عمدہ پیرایہ میں دیا گیا ہے۔

صفحات ۲۲ طبع اول ۱۹۳۹ء/ ۱۳۵۸ھ

(۲۲) انہتر خصائلِ ایمان (اردو) مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

اس رسالہ میں ایمان کی انہتر شاخوں کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے کہ انسان کے جملہ افعال واقوال تین چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ دل، زبان، اعضاء اور ان تینوں کے اعمال ملاکر انہتر ہو جاتے ہیں۔

صفحات ۴۴ | طبع اول محرم ۱۳۵۸ھ

(۲۳) العجالۃ الخضریہ فی جمع الرسالۃ والبشریہ (اردو) مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پیشتر رسالت و نبوت سے متعلق چار قسم کے خیالات لوگوں میں پائے جاتے تھے (۱) بشر سرے سے رسول ہو ہی نہیں سکتا (۲) خدا کے پیغمبر خدا کی طرف سے تمام عالم میں متصرف اور تمام کلیات و جزئیات سے بدرجہ اتم واقف ہوتے ہیں (۳) دعوئے نبوت خلل دماغ کا نتیجہ ہے۔ (۴) کاہنوں اور راماموں کی طرح نبوت بھی ایک ذریعہ معاش ہے۔ بالکل اسی طرح آج بھی لوگوں کا خیال ہے حالانکہ اللہ نے ان سب اوہام کی ضمنی طور پر تردید کر دی ہے۔

صفحات ۱۱۰ طبع اول ۱۳۵۷ھ/۱۹۳۹ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

(۲۴) رسائل ثلاثہ (اردو) یہ کتاب تین مضامین کا مجموعہ ہے (۱) امام زماں (۲) مہدی منتظر، (۳) مجدد دوراں۔ یہ تینوں مضامین انتہائی تحقیق و تدقیق کے ساتھ لکھے گئے ہیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی اور سر سید احمد خان کے دعاوی کی حقیقت کھولنے کے لیے خصوصاً اور دیگر ذی بحث و یا مدعیانِ امامت و امارت کے لیے عموماً آئینہ کا کام دیتی ہے۔ یہ کتاب قادیانی اور سرسید کے عقائد سمجھنے کے لیے بہت ہی مفید ہے۔

صفحات ۶۶ طبع اول رمضان ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء

(۲۵) حلاوۃ الایمان بتلاوۃ القرآن (اردو) مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

اس رسالہ میں قرآن مجید پڑھنے کا طریقہ اور اس کے فوائد بتائے گئے ہیں اور اخیر میں مخارج حروف، آیات سجدہ کے مقامات اور وہ آیات جن کے جوابات نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے یا بعض صحابہ سے ان کے مضمون کے مطابق منقول ہیں، ان کو بتایا گیا ہے۔

صفحات ۶۴ | طبع اول ۱۹۴۴ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

(۲۶) سیرۃ المصطفیٰ جلد اوّل (اردو) اس کتاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائل و خصائل اور سیاسی و تاریخی واقعات کے ساتھ اشاعتِ اسلام اور اس کے مناسب حال آیاتِ قرآنیہ کا نزول، سب کچھ موجود ہے گویا یہ کتاب ضمناً ایک حیثیت سے قرآن مجید کے بعض مقامات کی تفسیر کا کام بھی دے گی۔ جیسا کہ سیرۃ ابن ہشام اور زاد المعاد وغیرہ میں ہے۔

صفحات ۴۸ طبع اول ۱۹۴۲ء طبع ثانی (مع اضافہ) ۱۹۵۲ء

(۲۷) زاد المتقین (اردو) مطبع مقبول عام پریس لاہور

اس کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ اور آپ کی رضاعی ماؤں اور آپ کی ازواج مطہرات کے حالات و اخلاق و تقوی و طہارت وغیرہ پر بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات ۴۴۸ طبع اول ۱۹۵۳ء، مطبع پبلشنگ لاہور

(۲۸) تاریخ اہلحدیث (اردو) یہ کتاب مذہب اہلحدیث کی مکمل تاریخ ہے اس میں ثابت کیا گیا ہے کہ دور نبوی سے لے کر آج تک دنیا میں مذہب اہلحدیث کے ماننے والے رہے ہیں نیز اس میں مذہب اہلحدیث کے اصول بیان کیے گئے ہیں اور تقلیدی مذاہب سے مذہب اہلحدیث کا تقابل بھی کیا گیا ہے۔

صفحات ۱۶ طبع اول ۱۹۵۵ء/۱۳۷۵ھ، مطبع طور پرنٹنگ پریس سیالکوٹ

(۲۹) گلدستۂ سنت (اردو) اس رسالہ میں امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کا ثبوت دیتے ہوئے مخالفین کے اعتراضات کے جوابات برعایت اصول و قواعد علمیہ مع حوالجات کتب معتبرہ دیے گئے ہیں۔

صفحات ۱۶، طبع اول ۱۳۷۵ھ/۱۹۵۵ء مطبع

(۳۰) نعم الرقیم فی مولد النبی الکریم (اردو) پرنٹنگ پریس سیالکوٹ۔

اس رسالہ میں بارہ وفات اور مروجہ میلاد کی تردید کی گئی ہے رسالہ ہی ساتھ تاریخی حیثیت سے اس کے بانی اور مقصد کو بھی واضح کیا گیا ہے۔

صفحات ۲۲۸ طبع اول ۱۳۲۱ھ طبع ثانی[1] ۱۳۳۰ھ

(۳۱) شہادۃ القرآن حصہ اول (اردو) طبع ثالث ۱۳۴۶ھ مطبع برقی پریس روزبازار ہال امرتسر

صفحات ۱۰۸ طبع اول ۱۳۲۳ھ طبع ثانی[1] ۱۳۴۰ھ

(۳۲) شہادۃ القرآن حصہ دوم (اردو) مطبع پنجاب پریس سیالکوٹ۔

مرزا غلام احمد قادیانی کی عام عادت تھی کہ اپنے مریدوں کو مطمئن کرنے اور قائم رکھنے کے لیے اپنے مسیح موعود

---

[1] دونوں جلدوں کے طبع ثانی میں حاشیہ کا اضافہ ہے جس میں آیات کی توجیہ منطقی حیثیت سے کی گئی ہے، مثلاً: "قد خلت من قبلہ الرسل" کی توجیہ یوں کی گئی ہے کہ "مشککین کا قول سالبہ کلیہ ہے کہ کوئی نبی مر نہیں سکتا، خدا کو اس کی ←

ہونے کے دعویٰ کی تائید میں کبھی موضوع و منکر روایتیں پیش کرتے اور کبھی قرآن مجید کی آیات میں لفظی و معنوی تصرف کرکے لوگوں کو دھوکا دیتے تھے، مولانا سیالکوٹی نے اس کتاب میں مرزا صاحب کی قلعی کھول دی ہے اور حضرت مسیح کا بجسدہٖ العنصری آسمان پر اٹھایا جانا بغایت تحقیق و نہایت تدقیق معقولاً و منقولاً ثابت کیا ہے۔ کتاب انتہائی دلچسپ و بلند پایہ ہے

صفحات ۴۴ تاریخ تصنیف ۱۳۲۵ھ

(۳۳) الخبر الصحیح عن قبر المسیح (اردو) مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

اس رسالہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی قبر اور آپ کے مدفن مقدس کے متعلق قرآنی آیات و احادیث نبویہ اور اقوال سلف سے مدلل بحث کرکے مرزا غلام احمد قادیانی کے اس قول کی کہ "حضرت عیسیٰ کی قبر کشمیر کے شہر سری نگر میں ہے اور اس آیت سے استدلال کہ "واوینھما الی ربوۃ (مومنون پ۱۸) کی بھرپور تردید کردی گئی ہے تاکہ مرزا صاحب اپنی اصلی رنگت میں لوگوں کو نظر آئیں اور لوگ دھوکے سے بچ جائیں۔

صفحات ۸، مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

(۳۴) ختم نبوت اور مرزائے قادیان (اردو) مرزا غلام احمد قادیانی نے سورہ فاتحہ کی آیت

"صراط الذین انعمت علیہم" سے آنحضرت صلعم کے بعد بھی نبوت جاری رہنے کی دلیل پکڑی ہے اور اس آیت سے عجیب طرح استنباط کیا ہے۔ یہ مختصر رسالہ اسی کے رد میں ہے۔

صفحات ۴۲ مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

(۳۵) سیرت محمدیہ (اردو) جزیرہ جاوا کے شہر سوابیہ سے ایک انگریزی تحریر جو ایک سو سطر پر مشتمل تھی شائع

ہوکر ہندوستان پہنچی۔ اس میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی تھی و دین اسلام کے قائم کرنے سے آنحضرت (ص) کا

ﮯ تردید منظور ہے اور معلوم ہے کہ سالبہ کلیہ کی نقیض موجبہ جزئیہ ہوتی ہے نہ کہ موجبہ کلیہ پس الف لام الرسل کا استغراق کے لیے نہ ہوا بلکہ تعریف جنس کے لیے ہوا اور چونکہ الرسل کلی ہے اور اس پر کوئی کلمۂ خاص نہیں اس لیے "قد خلت من قبلہ الرسل" قضیۂ مہملہ ہوا اور معلوم ہے کہ مہملہ قوت جزئیہ میں ہوتا ہے لہٰذا آیت کے معنی ہوئے "تحقیق گزر چکے ہیں پیشتر اس کے کئی رسول"۔ پس الف لام استغراقی نہ ہونے کے سبب سب رسول فوت شدہ ثابت نہ ہوئے بلکہ بعض رسول، لہٰذا یہ آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وفات قبل النزول کی دلیل نہ ہوسکی۔

مقصد (معاذ اللہ) صرف یہ تھا کہ جائز و ناجائز وسائل کی تمیز کو نظر انداز کر کے مال و دولت جمع کریں اور اپنی زندگی کے ایام خوش حالی میں گزاریں۔

مولانا سیالکوٹی نے اپنے اس مختصر جوابی رسالہ میں مضمون نویس کی غلط بیانیاں ظاہر کر کے اور باطل کا پردہ چاک کر کے حقیقت امر کو منکشف کیا ہے اور اس بات کی وضاحت فرمائی ہے کہ مضمون نویس نے اپنے اس بیان میں اپنی کم علمی، کج فہمی یا بدنیتی کی وجہ سے سخت ٹھوکر کھائی ہے اور دنیا کو غلطی میں ڈالنا چاہا ہے۔

صفحات ۳۲ مطبع اسٹیم پریس امرتسر

(۳۶) **قوم و مذہب** (اردو) اس رسالہ میں مصنف نے قوم و مذہب کی لغوی و اصطلاحی تعریف کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ جس قوم کا کوئی مذہب نہ ہو وہ قوم کہلائے جانے کے قابل نہیں۔

صفحات ۴۴

(۳۷) **نزول الملائکہ والروح علی الارض** (اردو) مرزا غلام احمد قادیانی کے ان عقائد کی تردید کی گئی ہے جو نزولِ ملائکہ سے متعلق ہیں۔

صفحات ۱۵۲ مطبع پنجاب پریس سیالکوٹ

(۳۸) **تعلیم القرآن** (اردو) اس کتاب میں قرآن شریف کی تعلیم کے لطائف بیان کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ آج دنیا میں صرف یہی ایک کتاب ہے جس پر عمل کر کے فطرتِ انسانی اپنے حال پر رہ سکتی ہے۔

صفحات ۱۶ مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

(۳۹) **نماز مسنون** (اردو) اس رسالہ میں نماز کے اندر اور نماز کے بعد کے اذکار مسنونہ اور اوراد و وظائف ذکر کیے گئے ہیں اور ان سب کا ترجمہ بھی کر دیا گیا ہے تاکہ لوگ ان کو یاد کر کے سنت کے مطابق نماز ادا کر سکیں۔ اور ان کے موقع و محل اور مقصد و مراد کو بھی سمجھ سکیں۔

صفحات ۸۴ مطبع پنجاب پریس سیالکوٹ

(۴۰) **المحقق** (اردو) اس کتاب میں علوم وید پر محققانہ بحث کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ وید الہامی نہیں ہے کتاب کے اخیر میں مرزا غلام احمد قادیانی کی بدکلامیوں کا جواب بھی ملحق ہے جو آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ کتاب نہایت دلچسپ ہے۔

صفحات ۱۲۰ مطبع پنجاب پریس سیالکوٹ ۔ عیسائیوں کا ایک رسالہ

(۴۱) **عصمتِ انبیا** (اردو) "بیگناہ نبی" ہے جس میں سب نبیوں کو بالخصوص حضرت آدم حضرت نوح حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ اور حضرت محمد صلوات اللہ علیہم وسلامہ کو گنہ گار لکھا ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بے گناہ قرار دیا ہے یہ کتاب اسی کا مدلل جواب ہے ۔

صفحات ۵۲ مطبع پنجاب پریس سیال کوٹ ۔

(۴۲) **تاریخ نبوی** (اردو) اس کتاب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت سے لے کر وفات تک کے حالات قلمبند کیے گئے ہیں

صفحات ۱۲۶

(۴۳) **اخلاق محمدی** (اردو) یہ کتاب دو مقدموں اور ایک باب پر مشتمل ہے پہلے مقدمہ میں مراتب سعادت اور دوسرے مقدمہ میں روایت علم حدیث پر فاضلانہ بحث کی گئی ہے ۔ اور باب میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا عبادات و تعظیم الٰہی میں کامل طور پر قائم ہونا ظاہر کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں عبادات بدنی ومالی اور تفکر روحانی و ذکر قلبی کی بڑی دلنشیں وضاحت کی گئی ہے ۔

صفحات ۱۳۰ سن تصنیف ۱۳۵۵ھ طبع اول ۱۳۵۹ھ/۱۹۳۹ء

(۴۴) **تفسیر سورہ کہف** (اردو) مطبع ثنائی پریس امرتسر

یہ کتاب مکمل سورہ کہف کی تفسیر پر مشتمل ہے، ابتدا میں سورہ کہف کے فضائل پر روشنی ڈالی گئی ہے ہر آیات کی تشریح و شان نزول بیان کرتے ہوئے اصحاب کہف کے سلسلہ میں مخالفین اسلام کے اعتراضات کو نقل کیا گیا ہے اس کے بعد ہر ایک کا مفصل جواب دیا گیا ہے ۔

نوٹ : مولانا کی چند اور کتابیں ہیں جو مجھے دستیاب نہ ہوسکیں جیسے (۱) اصلاح عرب (۲) ثبوت معراج جسمانی و نزول الملائکہ (۳) علمائے اسلام (۴) بشارات محمدیہ وغیرہ ۔ (حوالہ اخلاق محمدی)

فتویٰ

تاریک بدعت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

محترم ایڈیٹر صاحب! سلام مسنون۔

سوال گزارش ہے کہ یہاں کی جامع مسجد میں کبھی کبھی کسی صاحب کی طرف سے بعد نماز عشاء آیت کریمہ لا الٰہ الا انت سبحانک.... کا ورد سوا لاکھ بار کیا جاتا ہے کثیر تعداد میں لوگ شرکت کرتے ہیں، چائے نوش کرتے ہیں۔ بعد ختم حلوہ یا لڈو تقسیم ہوتے ہیں۔ اکثر یہ ورد بیمار کی شفا یا مقدمہ کی کامیابی کے لئے کیا جاتا ہے۔ اور کبھی پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ ورد کیوں کرایا جا رہا ہے۔ یہاں کے مولوی صاحب کہتے ہیں یہ ورد نص سے ثابت ہے۔ کبھی کہتے ہیں یہ مستحب ہے۔ یہ کار ثواب ہے۔

مجھ جیسا نالائق اسے بدعت سمجھتا ہے میرے شرکت نہ کرنے پر لوگ ملامت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ براہ کرم محدث میں شائع فرمائیں کہ یہ ورد شرعاً جائز ہے یا نہیں۔ مفصل تحریر فرمائیں اللہ آپ کو جزائے خیر عطا فرمائے

فقط والسلام

خیر اندیش ماسٹر محمد سلیمان ۲/۴ ناگوری محلہ مہدی پورہ ضلع اوجین ۱۸۳/۱۳۱۲

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

جواب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے سوال کے جواب میں کبار صحابہ کے عہد کا ایک واقعہ نقل کر دیا جائے جس سے مذکورہ بالا عمل کی شرعی حیثیت پر بڑی جامع روشنی پڑتی ہے۔ یہ واقعہ عمر بن یحیٰ نے اپنے والد سے اور ان کے والد نے اپنے والد سے روایت کیا ہے۔ وہ بیان کرتے ہیں۔

کنا نجلس علیٰ باب عبد اللہ بن مسعود ہم لوگ فجر کی نماز سے پہلے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی

قبل صلوٰة الغداة فاذا خرج مشينا معه الى المسجد فجاءنا ابوموسى الاشعري فقال اخرج اليكم ابو عبد الرحمٰن بعد؟ فقلنا لا، فجلس معنا حتى خرج فلما خرج قمنا اليه جميعًا فقال له ابوموسى يا ابا عبد الرحمٰن انى رأيت فى المسجد انفا امرًا انكرته ولم ار والحمد لله الا خيرًا ور فى الطبرانى ولقد ذعرنى وانه لخير قال فماهو؟ فقال ان عشت فستراه، قال رأيت فى المسجد قومًا حلقًا جلوسًا ينتظرون الصلوٰة، فى كل حلقة رجل وفى ايديهم حصًا فيقول كبروا مائة فيكبرون مائة ويقول هللوا مائة. فيهللون مائة ويقول سبحوا مائة فيسبحون مائة. قال: فماذا قلت لهم؟

قال ما قلت لهم شيئًا انتظار رايك او انتظار امرك قال افلا امرتهم ان يعدوا سيئاتهم وضمنت لهم ان

کے دروازے پر بیٹھے رہتے تھے جب وہ نکلتے تو ان کے ساتھ مسجد جاتے (ایک روز) ہمارے پاس حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ آئے انہوں نے کہا کیا آپ لوگوں کی طرف ابوعبدالرحمٰن (عبداللہ بن مسعود) نکل چکے ہیں۔ ہم نے کہا نہیں۔ اس پر وہ بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گئے۔ یہاں تک کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ برآمد ہوئے اور جب وہ نکلے ہم سب ان کی طرف اٹھ پڑے پھر ان سے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نے کہا۔ اے ابوعبدالرحمٰن! میں نے ابھی مسجد میں ایک منکر کام دیکھا ہے۔ میں نے الحمد للہ بھلی ہی چیز دیکھی ہے۔ لیکن بھلی ہونے کے باوجود اس سے کانپ گیا ہوں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے پوچھا وہ کیا ہے؟ حضرت ابوموسیٰ اشعری نے کہا اگر آپ زندہ رہے تو آپ بھی ابھی دیکھ لیں گے (اس کے بعد) انہوں نے کہا میں نے دیکھا مسجد میں کچھ لوگ حلقے باندھ باندھ کر بیٹھے نماز کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہر حلقے میں ایک آدمی ہے لوگوں کے ہاتھوں میں کنکریاں ہیں۔ وہ آدمی کہتا ہے کہ سو مرتبہ اللہ اکبر کہو تو لوگ سو مرتبہ اللہ اکبر کہتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ سو مرتبہ لا الٰہ الا اللہ کہو تو لوگ سو مرتبہ لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں وہ کہتا ہے کہ سو مرتبہ سبحان اللہ کہو، تو لوگ سو مرتبہ سبحان اللہ کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے حضرت ابوموسیٰ اشعری سے کہا کہ آپ نے ان سے کیا کہا؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے آپ کی رائے یا حکم کے انتظار میں کچھ نہیں کہا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا آپ

لا يضيع شيء من حسناتهم
ثم مضى ومضينا معه حتّٰى
اتٰى حلقة من تلك الحلق
ووقف عليهم فقال ما هٰذا
الذى اراكم تصنعون؟ قالوا
يا ابا عبد الرحمن حصا نعد
به التكبير والتهليل والتسبيح
فقال فعدّوا سيئاتكم فانا
ضامن ان لا يضيع من حسناتكم
شيء، ويحكم يا امة محمد!
ما اسرع هلكتكم هٰؤلاء صحابة
نبيكم متوافرون وهذه ثيابه
لم تبل وآنيته لم تكسر
والذى نفسى بيده انكم لعلى
ملة هى اهدىٰ من ملة محمد
او مفتتحو باب ضلالة قالوا
والله يا ابا عبد الرحمن! ما
اردنا الا الخير قال وكم من
مريد للخير لم يصيبه ان
رسول الله صلى الله عليه و
سلم حدثنا ان قومًا يقرؤن
القرآن لا يجاوز تراقيهم

نے ان سے یہ کیوں نہیں کہا کہ وہ اپنے گناہ شمار کریں اور آپ انہیں اس بات کی ضمانت دیدیتے کہ ان کی نیکیاں کچھ بھی ضائع نہ ہوں گی۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تشریف لے گئے اور ہم بھی ان کے ساتھ گئے یہاں تک کہ ایک حلقے کے پاس جاکر رکے اور بولے یہ کیا حرکت ہے جو میں تمہیں کرتے ہوئے دیکھ رہا ہوں انہوں نے کہا کہ اے ابوعبدالرحمٰن! یہ کنکریاں ہیں جن پر ہم اللہ اکبر، لا الٰہ الا اللہ اور سبحان اللہ کے کلمات گن رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا! اچھا تو اب تم لوگ اپنے گناہوں کو گنو اور میں ضمانت دیتا ہوں کہ تمہاری کوئی بھی نیکی ضائع نہیں ہوگی۔ تم پر افسوس اے امت محمد! تمہاری تباہی کس قدر جلد آگئی۔ حالانکہ یہ تمہارے نبی کے صحابہ ابھی بکثرت موجود ہیں اور یہ آپ کے کپڑے ہیں جو ابھی بوسیدہ نہیں ہوئے اور یہ آپ کے برتن ہیں جو ابھی ٹوٹے نہیں — اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم لوگ یا تو ایسی ملت پر ہو جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ملت سے زیادہ ہدایت یافتہ ہے یا پھر تم لوگوں نے گمراہی کا دروازہ کھول رکھا ہے۔ ان لوگوں نے کہا۔ اے ابوعبدالرحمٰن! خدا کی قسم ہم لوگوں نے تو محض نیکی کے ارادے سے ایسا کیا ہے۔ انہوں نے کہا کتنے ہی نیکی کے ارادہ کرنے والے ایسے ہیں جو نیکی تک نہ پہنچ سکے (سنو!) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیان فرمایا ہے کہ

وایم الله ما ادری لعل اکثرهم منکم ثم تولی عنهم فقال عمرو بن سلمة رأینا عامة اولئک الحلق یطاعنونا یوم النهروان مع الخوارج ۔ (مسند دارمی ۱/۶۸، ۶۹ نیز دیکھئے مصنف عبدالرزاق ۳/۲۲۱، ۲۲۲ حدیث ۵۴۰۹ ۵ معجم کبیر طبرانی ۹/۱۳۳ تا ۱۳۷ احادیث ۸۶۲۳ تا ۸۶۳۹ ۔ مجمع الزوائد ۱/۱۸۱) ۔

کچھ لوگ قرآن پڑھیں گے لیکن ان کی حلق سے نیچے نہ اترے گا اور خدا کی قسم میں نہیں جانتا غالباً ان میں سے اکثر تم ہی میں سے ہوں گے اس کے بعد وہ رُخ پھیر کر چلے گئے ۔ حضرت عمرو بن سلمہ کہتے ہیں کہ (بعد میں) ہم نے ان میں سے عام لوگوں کو دیکھا کہ نہروان کی جنگ میں خارجیوں کے ساتھ یہ لوگ ہم پر نیزے چلا رہے تھے ۔

.. ..

طبرانی کی روایات کے اور الفاظ سننے کے لائق ہیں ایک روایت میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ان سے کہا ۔

انکم متمسکون بذنب ضلالة او انکم لاهدی من اصحاب محمد صلی الله علیه وسلم (۹/تا۱۳۴)

یعنی تم لوگوں نے گمراہی کی پونچھ پکڑ رکھی ہے یا پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے بھی بڑھ کر ہدایت یافتہ ہوگئے ہو

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں ۔

لقد جئتم ببدعة ظلماء او لقد فضلتم اصحاب محمد صلی الله علیه وسلم علما (۹/۱۳۴، ۱۳۵)

تم لوگ ایک تاریک بدعت لائے ہو یا پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے بڑھ کر علم والے ہو گئے ہو ۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں ۔

انما یکفی المسجد محدث واحد فانما هلک من کان قبلکم بالتباغی (۹/۱۳۵)

پوری مسجد کے لئے ایک ہی بدعتی بہت ہے ۔ تم سے پہلے کے لوگ حد سے بڑھ جانے ہی کی وجہ سے ہلاک ہوئے تھے ۔

ایک روایت میں ہے ۔

لقد ابتدعتم بدعة ضلالة او انکم لاهدی من محمد صلی الله علیه وسلم و اصحابه (۹/۱۳۷)

تم لوگوں نے ایک گمراہ بدعت ایجاد کی ہے یا پھر تم لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے بڑھ کر ہدایت یافتہ ہو

ایک اور روایت میں ہے ۔

انتم اهدی ام اصحاب محمد صلی الله علیه

تم لوگ زیادہ ہدایت یافتہ ہو یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ؟

وسلم انکم متمسکون بطرف ضلالۃ (۱۳۷/۹) ۔۔۔ یاد رکھو کہ تم لوگوں نے گمراہی کا دامن تھام رکھا ہے۔

یہ واقعہ آپ کے سوال کا کافی وشافی جواب ہے شریعت میں ورد پڑھنا یقیناً ثابت ہے لیکن کسی ورد کو کسی اجتماع اور شیرینی کے اہتمام کے بغیر آدمی تنہا اپنے طور پر کسی وقت پڑھے یہ بالکل الگ چیز ہے اور اجتماع اور حلقہ بندی کے ساتھ پڑھے یہ بالکل الگ ہے۔ پہلی صورت کے مشروع ہونے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ دوسری صورت بھی جائز ہو۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ اللہ اکبر، لا الہ الا اللہ اور سبحان اللہ جیسے کلمات کہنے اور پڑھنے کو کون شخص غلط اور خلاف شرع کہہ سکتا ہے لیکن جب یہی کام حلقہ باندھ کر اجتماعی شکل میں کرنے کا اہتمام کیا گیا تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر، فقیہ النفس عظیم المرتبت اور اسلامی شریعت کے درو بست سے واقف صحابی رسول نے کتنے صاف اور دوٹوک لفظوں میں اسے اندھیری بدعت ہلاکت کا سبب اور گمراہی کا دروازہ بتلایا۔ باوجودیکہ نیت محض حصول ثواب کی تھی پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ آپ کے یہاں جس ورد کا سلسلہ جاری کیا گیا ہے وہ بدعت اور خلاف شریعت ہے اور حدیث کے اندر ذکر کئے گئے واقعے سے کہیں زیادہ سنگین ہے کہ اس میں اجتماع اور حلقہ بندی کے علاوہ محض حصول ثواب کی نیت کے بجائے مریض کی شفاء اور مقدمے کی کامیابی جیسے خودساختہ مقاصد اور چائے نوشی و تقسیم شیرینی جیسی لغو رسم کا بھی اضافہ ہے۔ ھذا ما عندی واللہ اعلم

صفی الرحمن المبارکفوری ۔ ۲۶ محرم الحرام ۱۴۰۴ھ

بقیہ اسحٰق شامیر:

یہ تفصیلات نیویارک کے اخبار ڈیلی نیوز نے شائع کی ہیں۔ ایک دوسرے اخبار سٹائن ایلانڈ اڈوانس نے شامیر اور اس کے دہشت گرد گروپ سٹیرن کی دہشت گردیوں، اعصابی جنگوں، قتل و خونریزی اور توڑ پھوڑ کے مزید واقعات لکھے ہیں پھر اخیر میں لکھا ہے کہ ان سب سے زیادہ بری بات یہ ہے کہ شامیر اور اس کا گروہ خود یہودیوں کے درمیان بھی اچھوت شمار ہوتا ہے۔ لیکن اس گروپ کے خاتمے کی جو کوشش انگریزوں نے کی اسے ناکام بنانے میں یہودیوں نے جم کر حصہ لیا۔

اس وقت تاریخ نے اپنے آپ کو پھر دہرایا ہے جب ۱۹۴۲ء میں انتہا پسند صہیونی شاعر سٹیرن کا انتقال ہوا تو شامیر اس کے دہشت پسند گروہ کی قیادت کے لئے اس کا جانشین ہوا۔ اور اب سفاک و خون آشام مناحیم بیگن کے قویٰ جواب دے گئے تو اسرائیلی وزارت عظمیٰ کے لئے شامیر اس کا جانشین ہوا ہے۔ (البلاغ کویت ۱۵ر صفر ۱۴۰۴ھ)

بزم طلبہ

توفیق احمد (عالمیت دوم) جامعہ سلفیہ بنارس

اللہ اور اس کی توحید

توحید کے معنی ہیں خدا کو ایک جاننا اور یہ سمجھنا کہ خدا ہی کی وہ تنِ تنہا ذات ہے جس کی پوجا و پرستش کی جاسکتی ہے اور اس کے ماسوا کے آگے سر ٹیکنا جائز نہیں ہے۔

یہی وہ توحید ہے جس کی دعوت رہبر کامل جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے بھی انبیائے کرام جلوہ افروز ہوئے سب سے پہلے دی ۔ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْا اِلَّآ اِیَّاہُ اللہ کے سوا کسی کی عبادت مت کرو۔ آسمانی تعلیمات کا یہی وہ نقطہ ہے جس کو ہر نبی اور ہر رسول کی دعوت میں اصل الاصول اور مقصد المقاصد کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

حضرت شعیب علیہ السلام اور حضرت ہود علیہ السلام نے جب اپنی اپنی قوم کو پکارا تو سب سے پہلے اسی کی آواز دی " یاقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ " اے میری قوم تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام جب اپنی قوم کی طرف مبعوث ہوئے تو ان کا اولین پیغام یہی تھا " ان اعبدوا اللہ واتقوہ واطیعون " اللہ کی عبادت کرو اسی سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب قید خانے میں تبلیغ دین کا موقع ملا تو جیل کے ساتھیوں کو انہوں نے سب سے پہلے جو حیات افروز درس دیا وہ یہی تھا کہ یاصاحبی السجن ءارباب متفرقون خیر ام اللہ الواحد القہار۔ اے قید کے دونوں ساتھیو! کیا متفرق رب بہتر ہیں یا اللہ واحد قہار؟ یہ وہ لازوال حقیقت ہے جسے اجاگر کرنے کے لئے انبیائے کرام کی بعثت ہوئی اور یہ وہ غیر فانی حقیقت ہے جو انسان کی فطرت میں ودیعت کردی گئی ہے۔ چند گنے چنے افراد کے سوا ہر دور میں خدا کا تصور انسان کا عقیدہ رہا ہے دنیا بہت کچھ بھولتی رہی شرم وحیا فراموش کرگئی۔ انسانیت کا بنیادی جوہر ہاتھ سے دے بیٹھی لیکن خدا کا خیال اور اللہ پر اعتماد اس کے دل ودماغ سے محو نہ ہوسکا یہ بات

صحیح ہے کہ ہر دور میں ملحدین و منکرین کا سلسلہ بھی رہا ہے۔ لیکن توحید کو اس کے باوجود فطرت کی لازوال حقیقت اس لئے کہا گیا ہے کہ چند سرپھرے حضرات کے انکار کی وجہ سے سورج کی طرح روشن اور تابناک سچائی جھٹلائی نہیں جاسکتی چند بیمار اگر اپنے منہ کی کڑواہٹ اور ذائقہ کی خرابی کے باعث ایک لذیذ کھانے کو بدمزہ سمجھنے لگیں تو ہم کھانے کی لذت کا انکار کرنے کے بجائے ان کو مریض جان کر درخور اعتنا نہیں سمجھیں گے۔

بعینہٖ اسی طرح آج کے دور کے روحانی مریض اگر خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں تو بات خود ان کے بطلان کی واضح دلیل ہے اس سے عقیدۂ توحید کی صداقت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔

اور یہ بات کہ توحید انسانی فطرت کی آواز ہے قرآن مجید کے اس بیان کردہ واقعہ سے بھی ثابت ہوتی ہے کہ روز ازل وحدہٗ لاشریک نے انسان سے سب سے پہلا جو سوال کیا تھا وہ یہ تھا "اَلَسْتُ بِرَبِّکُم" کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تو اس کے جواب میں انہوں نے کہا تھا۔ "بَلٰی شَہِدْنَا" کیوں نہیں! ہم گواہ ہیں۔ قرآن کریم نے یہ بھی بتلایا ہے کہ یہ سوال وجواب اس لئے کیا گیا تھا کہ مستقبل میں یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں اس کی خبر ہی نہ تھی۔

یہ ہے توحید کا عظیم الشان عقیدہ جس کا ہم نے اقرار کیا اور روز ازل میں اپنے مالک حقیقی سے پیمان وفا باندھا کتنی افسوسناک ہے یہ بات کہ آج انسان فطرت کی لازوال حقیقت کو بھلا کر اپنے لئے ہلاکت و بربادی کا راستہ ہموار کر رہا ہے اور ہم مسلمان کتاب وسنت کے شیدائی جو یہ نعرۂ توحید بلند کر رہے تھے کہ ؎

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے — آساں نہیں مٹانا نام ونشاں ہمارا

آج خود توحید حقیقی کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھے ہیں ؎

فطرت کا وہ پیمانِ وفا یاد نہیں ہے — فریاد کہ دنیا کو خدا یاد نہیں ہے

آج کل نعوذ باللہ کچھ نادان جن کا عقل سے کوئی واسطہ نہیں کہتے ہیں کہ سرے سے وجود باری تعالیٰ ہی خلاف عقل ہے ان کی نظر حضرت امام شافعیؒ کے اس جواب پر پڑنی چاہیئے جو انہوں نے ایک ملحد کو دیا تھا۔ ملحد نے پوچھا تھا کہ خدا کے وجود کی کیا دلیل ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ یہ سامنے والا شہتوت کا درخت۔ وہ حیران وپریشان ہو کر بولا کس طرح؟ امام صاحب نے فرمایا اس کے پتے دیکھو بظاہر کتنے حقیر معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی گوناگوں خاصیتوں پر نگاہ ڈالی جائے تو انسان ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے ان پتوں کو ہرن کھاتا ہے تو مشک بن جاتا ہے، مکھی کھاتی ہے تو شہد بن جاتا ہے، کیڑا کھاتا ہے تو ریشم بن جاتا ہے اور انہیں پتوں کو جب بکری کھاتی ہے تو یہ مینگنوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں کیا یہ بات عقل میں آتی ہے کہ ان حقیر پتوں میں یہ متنوع خصوصیات آپ سے آپ آگئی ہیں اور کوئی ان کا پیدا کرنے والا نہیں ہے۔

مقبول احمد اعظمی متعلم مدرسہ عالیہ عربیہ مئو ناتھ بھنجن۔

مقصد زندگی

انسان کی زندگی کی غایت کیا ہے ؟ انسان کا وجود کیوں ہوا ۔ اللہ نے انسان کو بے کار نہیں پیدا کیا ملکہ اس کا کوئی خاص مقصد ہے اور اسی مقصد کے پیش نظر انسان کو اشرف المخلوقات ٹھہرایا ۔ قرآن وسنت سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد اور غایت محض خدائے واحد کی عبادت وبندگی ہے ، وماخلقت الجن والانس الا لیعبدون میں نے جنوں اور انسانوں کو محض اپنی عبادت کے واسطے پیدا کیا ۔ سارے انبیاء کی دعوت کی اصل غایت عبادت ہی بتائی گئی ہے جیسا کہ اللہ کا فرمان ہے ۔ " وما ارسلنا من قبلك من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الہ الا انا فاعبدون (انبیاء ۲۵) ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی نبی بھیجے سب کی جانب اس بات کی وحی کرتے تھے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے لہٰذا میری ہی عبادت کرو ۔ جس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت اسلام کے لئے بادشاہوں کو خطوط لکھے تو انہیں یہی دعوت دی کہ خدائے واحد کی عبادت وبندگی کریں چنانچہ آپ نے روم کے بادشاہ ہرقل کی جانب جو خط بھیجا ۔ اس میں یہ آیت تحریر تھی " یا اھل الکتاب تعالوا الیٰ کلمۃ سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرك بہ شیئا ۔ اے اہل کتاب تم لوگ ایک ایسے کلمہ کی جانب آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے کہ ہم صرف اللہ ہی کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں ۔ عبادت ہی انسانی زندگی کی وہ غایت ہے جس کی دعوت حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام پیغمبروں نے دی اور یہی وہ حقیقی غایت ہے جس کی طرف قرآن وسنت اور تمام آسمانی کتابوں نے لوگوں کو بلایا ۔

انسان ہرگز اس واسطے نہیں پیدا کیا گیا کہ وہ خدائے واحد کی عبادت و بندگی کے بجائے غیروں کی عبادت کرے اور اس سے اپنی مرادیں مانگے۔ نصاریٰ کے بارے میں ارشاد ہے ۔ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح بن مریم وما امروا الا لیعبدوا الٰھا واحدا ۔ انہوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے ماسوا اپنا رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو بھی حالانکہ ان کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ ایک خدا کی عبادت کریں ۔ ان آیات مذکورہ سے واضح ہوتا ہے کہ زندگی کی اصل غایت عبادت ہے اور انسان کی تمام زندگی اسی عبادت پر ہی منحصر ہے ۔

دوسری آیتوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبادت اعمال زندگی کی بہت سی صورتوں کو محیط ہے ۔ قرآن وسنت نے تقویٰ ، احسان ، تزکیۂ نفس ، رضائے الٰہی اور طلب آخرت جیسے مختلف الفاظ اور اصطلاحیں استعمال کی ہیں ۔ تقویٰ کے بارے میں قرآن فرماتا ہے ۔ ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون ۔ (نحل) اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ اپناتے ۔ اور احسان کی روش اختیار کرتے ہیں قرآن نے تقویٰ کو عبادت ، اخلاق اور اجتماعی تعلقات کا حاصل قرار دیا ہے اور سارے اعمال صالحہ کی حقیقی روح قرار دیا ہے ۔ سورہ شعراء میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اذ قال لھم نوح الا تتقون ۔ انی لکم رسول امین ۔ فاتقوا اللہ واطیعون ۔ زندگی کے سارے افعال روزمرہ کے معاملات ، لین دین ، سیاسی تنظیم ، ملکی مسائل ، رہن سہن ، اجتماعی تعلقات ، عبادت واخلاق ، جذبات وکیفیات علم وفکر تمام چیزوں میں تقویٰ ضروری ہے اس لئے تقویٰ کو مقصد زندگی میں ایک بنیادی حیثیت حاصل ہے ۔

قرآن احسان کے بارے میں فرماتا ہے ۔ ان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون بیشک اللہ تعالیٰ متقین اور محسنین کے ساتھ ہے ۔ قرآن میں احسان کا لفظ دینی ترقی کی آخری غایت کی تعبیر کے لئے بارہا آیا ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے محسنین اور محسنات کو سب سے بہتر قرار دیا ہے ۔ حدیث میں دینی زندگی کی تین منزلوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور احسان کو آخری منزل قرار دیا گیا ۔

تزکیۂ نفس کے بارے میں خدا کا فرمان ہے ۔ واما من خاف مقام ربہ ونھی النفس عن الھویٰ فان الجنۃ ھی المأویٰ ۔ جو شخص اپنے رب کے پاس کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہشات سے باز رکھا تو جنت ہی اس کا ٹھکانا ہے ۔ تزکیۂ نفس کو قرآن وسنت نے بڑی اہمیت دی ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

...ے بعثت کی غایت ہی یہ بتلائی ہے کہ آپ انسانی زندگی کو برائیوں سے پاک کرنے اور انہیں کتاب وحکمت ...ی تعلیم دینے کے لئے بھیجے گئے تھے۔ تزکیۂ نفس تمام شعبہائے عمل کو محیط ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مختلف اعمال کا مقصود تزکیۂ نفس قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے۔ خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم ...ھا وصلّ علیھم ان کے مالوں سے صدقہ لیجئے اور انہیں پاک وصاف کیجئے اور ان کے لئے دعا کیجئے۔ تزکیۂ نفس کی صورت یہ ہے کہ آدمی جو عمل کرے اس سے اپنی غرض پوری کرنے کے بجائے اللہ کی رضا اور خوشنودی ومطلوب ومقصود بنائے۔ قرآن فرماتا ہے۔ قل انی امرت ان اعبد اللہ مخلصًا لہ الدین ...ے نبی آپ کہہ دیجئے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لئے خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کروں۔

تمام عبادات بدنیہ ومالیہ کی قبولیت کا دار ومدار صرف رضائے الٰہی پر ہے کوئی بھی عمل اس وقت تک ...للہ کے نزدیک قابل قبول نہ ہوگا جب تک کہ وہ خالص رضائے الٰہی کے لئے نہ ہو۔ رضائے الٰہی کو قرآن وسنت ...یں ہر ذہنی، قلبی اور جسمانی عمل کا مقصود بتلایا گیا ہے رضائے الٰہی کی حیثیت اصل مقصد کی غایت الغایات کی ہے یعنی ...مام دوسرے اعمال کے مقاصد کی آخری غایت ہے۔

طلب آخرت کے متعلق قرآن کریم میں صاف اور واضح الفاظ میں کہا گیا ہے کہ آخرت کی فلاح ہر کام میں پیش ...ظر ہونی چاہئے والاخرۃ خیر وابقیٰ اور آخرت ہی بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔ تمام عبادات کا حکم اللہ تعالیٰ نے اسی واسطے دیا ہے کہ اس عبادت کو صدق دل سے ادا کرکے لوگ آخرت کی کامیابی کو پالیں۔ انسانی زندگی کے جتنے مقاصد ہیں ان تمام مقاصد کو محض ایک مقصد یعنی طلب آخرت کی مختلف شکلیں کہا جاسکتا ہے۔

مذکورہ بالا سطور میں جو کچھ عرض کیا گیا یہی وہ مقاصد ہیں جن کی خاطر اللہ نے انسان کو پیدا کیا اس لئے انسان کو خصوصًا مسلمان کو اپنی زندگی انہیں مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے گذارنی چاہئے کیونکہ اس کا وجود اور اس کی تخلیق اسی واسطے ہوئی ہے اور اسی پر اس کی فلاح کا دار ومدار ہے۔ ● ●

ننگ ننگ ہنگری میں ایک استصواب کے نتیجے میں معلوم ہوا ہے کہ پچاس فی صد عورتیں اور ساٹھ فی صد مرد مادر زاد ننگے رہنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ (الاصلاح، دہلی، شمارہ ذی الحجہ ۱۴۰۳ھ)

نوٹ: اسی لئے کہ یورپ کی نظر میں انسان محض ایک ترقی یافتہ جانور ہے۔

امیر محمد افضل متعلم جامعہ (فضیلت دوم)

رابطۂ عالم اسلامی کے نئے سکریٹری جنرل

۱۹۶۲ء میں رابطۂ عالم اسلامی کا قیام عمل میں آیا اس بیس سال کے عرصہ میں اس کی سرگرمیوں کے متعلق ایک باشعور مسلمان کو کچھ بتلانے کی چنداں ضرورت نہیں۔ عالم اسلام میں فکری گمراہی، الحاد اور بے دینی کا مسئلہ ہو (واضح رہے کہ حبیب بورقیبہ اور معمر قذافی جیسے لوگوں نے جب اسلام کے بارے میں اپنے نت نئے خیالات کا اظہار کیا تو رابطہ کے مستقل وفود صحیح اسلامی نقطہ نظر بتلانے کے لئے لیبیا اور تونس گئے) یا دنیا کی مسلم اقلیات پر ظلم وستم کے خلاف مؤثر آواز بلند کرنے کی بات۔ سنجیدگی اور متانت کے ساتھ، حدود میں رہ کر رابطہ نے جو جہاد کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے، رابطہ کی سرگرمیوں کا نقطۂ عروج شاہ فیصل شہید کا دور تھا، اب بھی جب رابطہ کے ممبران سر جوڑ کر کسی عالمی مسئلہ پر تبادلۂ خیال کرتے ہیں تو یہ دنیا کے مسلمانوں کی آواز اور اعلیٰ ترین مسلم دماغوں کا نقطہ نظر ہوتا ہے جس کا خاصا وزن عالمی سیاسیات میں محسوس کیا جاتا ہے۔

اب تک رابطہ پر اس کی زندگی کی اکیس ۲۱ بہاریں گذر چکی ہیں اور تین اشخاص اس کی سکریٹری شپ کے مقتدر اور عظیم منصب پر فائز رہ چکے ہیں۔

(۱) شیخ محمد سرور الصبان۔ (۲) شیخ صالح القزاز۔ (۳) شیخ محمد علی الحرکان۔

گذشتہ دنوں جب شیخ حرکان کا انتقال ہوا تو اولاً عارضی طور پر شیخ ناصر العبودی قائم مقام سکریٹری مقرر ہوئے، اس کے بعد مستقل طور پر رابطہ کے بانی ممبران نے مکمل اتفاق کے ساتھ ڈاکٹر عبداللہ عمر نصیف کا انتخاب کیا ڈاکٹر صاحب کا مختصر تعارف ہدیۂ ناظرین ہے۔

آپ شخصی طور پر تبلیغی، دعوتی اور غیور اسلامی ذہن کے مالک ہیں۔ دین کے ایک مخلص خادم اور امانت دار

خدمت گذار کی حیثیت سے آپ کا نام معروف ومشہور ہے۔ آپ جدہ کے ایک سلفی (اہلحدیث) خانوادے کے چشم وچراغ ہیں، آپ کے پردادا الشیخ عمر نصیف آفندی اپنے وقت میں جدہ کے گورنر رہ چکے ہیں اور دادا محمد عمر نصیف کا شمار ملک عبدالعزیز رحمہ اللہ کے قریبی دوستوں اور حجاز کے چوٹی کے سلفی علماء میں ہوتا تھا آپ کے والد محترم شیخ عمر محمد نصیف ایک مدت تک جدہ کے مدیر تعلیم واوقاف اور پھر مجلس شوری کے رکن رہ چکے ہیں خود آپ (ڈاکٹر صاحب) مشہور اور معزز اہلحدیث عالم مولانا عبدالصمد شرف الدین کے بھانجے ہیں۔

رابطہ کی سکریٹری شپ کے منصب جلیل پر آپ کا تقرر ایک عظیم خلاء کو پُر کرتا ہے اور سعودیہ کی مشہور اور مرکزی شخصیت علامہ شیخ ابن باز کے الفاظ میں "آپ کا انتخاب حق بحقدار رسید کا درست ترین مظہر ہے" کیونکہ آپ کے مثالی جذبۂ خدمت، خلوص اور کام کرنے کی بے پناہ لگن یقیناً اس منصب سے عہدہ برآ ہونے میں کام آئے گی۔ اس سے قبل ایک لمبے عرصہ تک تن تنہا آپ جامعۃ الملک عبدالعزیز جدہ کے ڈائرکٹر رہے جبکہ آپ کا کوئی معاون اور سکریٹری تک نہیں تھا یہ بہت مشکل اور محنت طلب دور تھا جس کو آپ نے خیر وخوبی سے نبایا اور بے مثال ترقی دی جس کے نقوش جامعہ کے در و دیوار پر ثبت ہیں۔

⊙ ڈاکٹر عبد اللہ عمر نصیف: ماہ وسال کے آئینہ میں۔

- ولادت: ۵ رجولائی ۱۹۳۹ء بمقام جدہ، فی الوقت آپ چار بچوں کے شفیق باپ بھی ہیں۔
- ۱۹۶۴ء میں جامعہ ریاض سے بی۔ اے کیا۔
- سرکاری مندوب کی حیثیت سے عرصہ تک امریکا میں رہے۔
- پہلے کچھ عرصہ تک جامعۃ الامام محمد بن سعود (ریاض) میں رہے پھر ۱۳۹۱ھ میں لیڈس (LEEDS) یونیورسٹی برطانیہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور دوبارہ ریاض لوٹ آئے۔
- اس کے بعد جامعۃ الملک عبدالعزیز میں کام کیا اور ۱۳۹۴ھ میں اس کے سکریٹری مقرر ہوگئے۔
- تقریباً تین سال تک اس خدمت کی انجام دہی کے بعد ۱۳۹۶ھ میں آپ کو وکیل الجامعہ (ری ایکٹر) نامزد کیا گیا۔
- ۱۴۰۱ھ میں آپ جامعہ کے ڈائرکٹر ہوگئے ــ ــ ــ ــ جہاں سے ۱۶ر ذوقعدہ ۱۴۰۳ھ کی صبح کو آپ کا انتخاب رابطہ کے سکریٹری جنرل کی حیثیت سے ہوگیا۔ اب آپ رابطہ کے صدر مقام میں قیام پذیر ہیں۔

بقیہ صنا پر

عالم اسلام

صلیبی استعمار کی صدی ختم ہو رہی ہے

اسلام و عیسائیت کی کشمکش یا معرکۂ ہلال و صلیب اتنا ہی پرانا ہے جتنی خود تاریخ اسلام پرانی ہے۔ یہ شرارہ پہلی بار سنہ ۶ھ میں ایک عیسائی حکمراں کے ہاتھوں ایک مسلم سفیر کے قتل سے پھوٹا تو اس کی آگ آج تک نہ بجھ سکی۔ بلکہ رہ رہ کر شعلہ زن ہوتی رہی۔ نتیجہ کے اعتبار سے یہ کشاکش مسلمانوں کے لئے مفید اور عیسائیوں کے لئے مضر رہی۔ شام و اردن سے لیکر ایک طرف مراکش تک اور دوسری طرف سرحد یونان تک مسلم اکثریت کا موجودہ علاقہ جو آج بھی مسلمانوں کے تصرف میں ہے وہ انہیں علمبرداران صلیب سے مسلمانوں کو ملا ہے۔ صلیبیوں کو اپنی یہ ذلت بھولی نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ سے دو بار مسلمانوں کو اپنی تاریخ میں ان کے ہاتھوں شدید زک اٹھانی پڑی ہے۔ ایک بار دور وسطیٰ میں جب صلیبی جتھے شام و فلسطین پر چڑھ آئے اور کوئی ایک صدی بعد انہیں باہر نکالا جا سکا۔ اور دوسری بار پچھلی ڈیڑھ دو صدیوں سے جب مغربی یا صلیبی استعمار نے منظم منصوبے کے ساتھ عالم اسلام کو ہڑپ کرنا شروع کیا اور کوشش کی کہ اسلامی عقیدہ و عمل، تہذیب و تمدن اور تاریخ و جغرافیہ ہر ایک کو اس طرح مسخ کر دے اور عالم اسلام اور امت مسلمہ کو ایسی ایسی پیچیدگیوں میں پھنسا دے کہ یہ اپنا معنوی وجود کھو بیٹھے جس کے بعد اس کا ظاہری ڈھانچہ بھی شکست و ریخت کا شکار ہو کر رفتہ رفتہ ختم ہو جائے۔ علمبرداران صلیب کا یہ عمل اب بھی جاری ہے لیکن اسلام باطل کے مقابلے کی جو صلاحیت رکھتا ہے وہ ہر میدان میں ابھرتی اور نکھرتی جا رہی ہے اور تاریخ کے آثار چڑھاؤ سے واقفیت رکھنے والے محسوس کر سکتے ہیں کہ صلیبی استعمار اب ایک ہاری ہوئی بازی لڑ رہا ہے اور مستقبل کی آخری شکست اس کا مقدر بن چکی ہے ذیل میں ہم اس دوسرے دور کے صلیبی حملوں اور کشمکش کی ایک سرسری فہرست پیش کرتے ہیں تاکہ ہمارے نوجوانان اسلام بھی اس سے عبرت پکڑ سکیں۔

سنہ ۱۴۹۸ مغربی ہند پر پرتگیزیوں کا تسلط

۱۸۰۲ء ـ ۱۸۰۶ء جزیرہ جاوا میں جنگ گریبن

۱۸۲۰ء تبسیل عمان (موجودہ عرب امارات) اور قطر پر برطانیہ کا قبضہ

۱۸۲۱ء ـ ۱۸۳۸ء جزیرہ سوماطرہ میں جنگ بادری

۱۸۲۵ء ـ ۱۸۳۰ء جزائر جاوہ کی جنگ

۱۸۳۰ء ـ ۱۸۵۷ء الجزائر پر فرانس کے حملے

۱۸۳۴ء ـ ۱۸۵۹ء قوقاز پر روس کا قبضہ

۱۸۳۷ء ـ ۱۸۴۷ء وسط ایشیا میں روس کے خلاف بغاوت

۱۸۳۹ء عدن پر برطانیہ کا تسلط

۱۸۳۹ء ـ ۱۸۴۲ء افغانستان پر ہندوستان کے راستے برطانیہ کا حملہ۔ پورا ہندوستان انگریزوں کے زیر تسلط

۱۸۴۳ء سندھ کی مسلم ریاستوں کا برطانوی ہند کے ساتھ الحاق

۱۸۴۶ء ـ ۱۸۴۹ء جزیرہ (انڈونیشیا) کی جنگ

۱۸۴۷ء ـ ۱۸۶۴ء وادی سیر دریا (دریائے سیحوں) پر روس کا حملہ

۱۸۴۹ء صوبۂ سرحد کے بعض قبائلی علاقوں کا برطانوی ہند کے ساتھ انضمام

۱۸۵۳ء ـ ۱۸۶۵ء خوقند پر روس کا پہلا حملہ اور تاشقند پر قبضہ

۱۸۵۶ء عود کی اسلامی سلطنت کا برطانوی ہند میں انضمام

۱۸۵۷ء دہلی میں مغل سلطنت کا آخری چراغ گل

۱۸۶۶ء ـ ۱۸۷۲ء سمرقند و بخارا سے متصل علاقوں پر روس کا حملہ

۷۲ء ـ ۱۹۰۸ء سوماطرہ (انڈونیشیا) کے شمال میں واقع آشیہ کی جنگ

۱۸۷۳ء ـ ۱۸۸۷ء ازبکستان پر روس کی یورش

۱۸۷۵ء ـ ۱۸۷۶ء سرزمین خوقند پر روس کا حملہ

۱۸۷۹ء دوسری جنگ افغانستان

۱۸۸۱ء ـ ۱۸۸۳ء تونس پر فرانس کا حملہ

سنہ ۱۸۸۲ء	مصر پر برطانیہ کا قبضہ
سنہ ۱۸۸۳ء - سنہ ۱۸۸۵ء	سوڈان میں مہدی سوڈانی کے خلاف جنگ
سنہ ۱۸۸۵ء - سنہ ۱۸۹۰ء	اریٹریا پر اٹلی کا حملہ
سنہ ۱۸۹۰	سنیغال پر فرانس کا حملہ
۱۸۹۱ء - سنہ ۱۸۹۹	بالائی نیجر اور ساحل العاج پر فرانسیسی حملہ
سنہ ۱۸۹۱ء	مسقط اور عمان برطانیہ کے زیر تسلط
سنہ ۱۸۹۵ء	روس کے ساتھ علاقہ پامیر کا الحاق
سنہ ۱۸۹۸ء	سوڈان پر برطانیہ کا مکمل قبضہ
سنہ ۱۸۹۹ء	خوانین بلوچستان کے علاقوں کا انگریزی ہند میں انضمام
سنہ ۱۹۰۰ - سنہ ۱۹۱۰ء	برطانوی قبضہ گیروں کے خلاف صومال کی محاذ آرائی
سنہ ۱۹۰۰ء	چاڈ پر فرانسیسی حملہ
سنہ ۱۹۰۳ء	کانو (شمالی نائیجریا) کا معرکہ
سنہ ۱۹۰۶ء	شمالی نائیجریا کی اسلامی سلطنتیں انگریزی نوآبادی بن جاتی ہیں۔
سنہ ۱۹۱۲ء - سنہ ۱۹۳۰ء	لیبیا کے طرابلس اور سرینیہ کے علاقوں پر اٹلی کی چڑھائی
سنہ ۱۹۱۲ء	مراکش پر فرانس اور اسپین کا حملہ
سنہ ۱۹۱۲ء - سنہ ۱۹۱۵ء	اسپینی تسلط کے خلاف مراکش کی مقاومت
سنہ ۱۹۱۴ء - سنہ ۱۹۱۸ء	پہلی جنگ عظیم میں ترکی پر حملہ اور ترکی کی شکست
سنہ ۱۹۱۴ء	کویت برطانیہ کے زیر تسلط
سنہ ۱۹۱۶ء	دارفور (سوڈان) میں برطانیہ کے خلاف ناکام بغاوت
سنہ ۱۹۱۹ء - سنہ ۱۹۲۶ء	فرانسیسی قبضے کے خلاف مراکش کی مقاومت
سنہ ۱۹۱۹ء - سنہ ۱۹۲۰ء	اسپینی قبضے کے خلاف مراکش کی مقاومت
سنہ ۱۹۱۹ء - سنہ ۱۹۲۱ء	سمرنا اور دوسرے ترکی علاقوں پر قبضے کے لئے یونان کی پیش قدمی
سنہ ۱۹۱۹ء - سنہ ۱۹۲ء	انطاکیہ کے ترکی علاقے پر اٹلی کا قبضہ

۱۹۱ ـ ۱۹۲۱ء	صقلی کے ترکی علاقے پر فرانس کا قبضہ
۱۹ء	تیسری جنگ افغانستان
۱۹ء	صومالی مقاومت کا مکمل خاتمہ
۱۹ء	رافدین (عراق) برطانیہ کے زیر تسلط اور بغاوت
۱	شامی مقاومت کے باوجود شام ولبنان فرانس کے زیر تسلط
۱۹ء ـ ۱۹۲۷ء	شام میں فرانس کے خلاف دروزی بغاوت
۱ء	پورے اطالوی صومالی پر قبضے کے لئے حملہ
۱ء	ایران پر انگریزی روسی قبضہ
۱ء ـ ۱۹۴۹ء	ہالینڈ کے خلاف انڈونیشیا کی مسلح اور کامیاب جنگ آزادی
۱ء ـ ۱۹۴۸ء	قیام پاکستان اور جنگ کشمیر
۱ء	حیدرآباد دکن پر ہندوستان کا حملہ اور قبضہ
۱ء ـ ۱۹۶۲ء	فرانس کے خلاف الجزائر کی مسلح اور کامیاب جنگ آزادی
۱ء	نہر سوئز (مصر) پر فرانس، برطانیہ اور اسرائیل کا سہ فریقی حملہ
ـ	مغربی نیوگنی پر انڈونیشیا کا حملہ اور اس کی آزادی و انضمام
ء	عرب اسرائیل جنگ، جولان غرب اردن، غزہ اور صحرائے سینا پر اسرائیلی قبضہ
ء	جنگ سوئز۔ صحرائے سینا پر مصر کا جزوی قبضہ اور بعد میں سینا سے اسرائیل کا انخلاء
ء	جنوبی لبنان پر اسرائیلی حملہ
ء ـ اب تک	افغانستان پر روسی قبضہ اور افغانی مقاومت
ء	بیروت (لبنان) پر اسرائیلی حملہ
ـ	شمالی قبرص کا اعلان آزادی

مقام عبرت ہے کہ انگریز جن کی حکومت میں کبھی سورج نہیں ڈوبتا تھا آج انہیں سورج کی روشنی اتنی دیر کے لئے بھی نصیب نہیں ہوتی جتنی اس کے سابقہ غلام ممالک کو نصیب ہوتی ہے۔ آج انڈونیشیا سے مراکش تک عالم اسلام آزاد ہے۔ اور مسلم جوانوں کی ہمت و جہد جاری رہی تو انشاء اللہ اس میں مزید وسعت و فسحت اور حسن و نکھار آئے گا۔ اور دنیائے اسلام کے جمال جہاں آرا ے دیکھے گی۔

• •

اسحاق شامیر: اسرائیل کا نیا وزیر اعظم

سابق اسرائیلی وزیر اعظم مناحیم بگین وزارت عظمیٰ کی کرسی چھوڑ کر اپنی موت اور اپنے آخری حساب و کتاب کا انتظار کر رہا ہے۔ اور اب اس کی جگہ لٹکتی ہوئی چمڑی پر مشتمل چہرے والے ایک دوسرے یہودی بھیڑئے نے لی ہے جس کا نام نامی اسحٰق شامیر ہے۔ ذیل میں اس کا تھوڑا سا تعارف پیش خدمت ہے۔

اس شخص کے بارے میں ۳۵ سال پہلے فلسطین کے برطانوی وائسرائے سر ایلن کنگھم نے حکومت فرانس کو ایک ٹیلیگرام بھیجا تھا جس میں اس شخص کو اپنے دور کا سب سے بڑا انتہا پسند قرار دیتے ہوئے حکومت فرانس سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ اسے گرفتار کر کے حوالۂ زنداں کر دے۔ درحقیقت یہ شخص اسرائیل کے وجود میں آنے سے پہلے "لاحی" نام کے ایک دہشت پسند گروہ کا لیڈر رہا تھا۔ جس نے فلسطین کی برطانوی حکومت کے خلاف اعصابی جنگ برپا کر رکھی تھی اسی گروہ نے ۱۹۴۴ء میں برطانوی وزیر لارڈ موین کو جو مشرق وسطیٰ میں مقیم تھا قتل کر دیا تھا۔ اسی طرح ۱۹۴۸ء میں اس کے ایک مسلح گروہ نے فلسطین میں اقوام متحدہ کے جنگ بندی نگراں کمیشن کے سربراہ برناڈوٹ کو بھی قتل کر دیا تھا جو سویڈن کے باشندے تھے۔

جولائی ۱۹۴۶ء میں بیت المقدس میں واقع بادشاہ داود ہوٹل کو بم کے دھماکے سے اڑانے کا واقعہ پیش آیا جس میں ایک سو سے زیادہ برطانوی، عربی اور یہودی افراد ہلاک ہوئے۔ اس کے بعد شامیر کو گرفتار کر لیا گیا اور اریٹیریا لے جا کر جنگی قیدیوں کے ایک کیمپ میں رکھا گیا۔ لیکن یہ شخص ۱۹۴۷ء میں فرار ہو کر جیبوتی پہنچ گیا جو اس وقت فرانس کے زیر تسلط تھا۔

مذکورہ بالا ٹیلیگرام جسے برطانوی وائسرائے نے فرانسیسی نو آبادیات کے وزیر کے نام ارسال کیا تھا اس میں فرانس کو تاکید کی گئی تھی کہ وہ شامیر اور اس کے ایک ساتھی کو فوراً گرفتار کر لیں۔ اس میں کہا گیا تھا کہ "ان دونوں کا جیبوتی چھوڑ کر کہیں نکل جانا میرے لئے بڑا اہم اور خطرناک معاملہ ہے۔ اگر یہ گرفت سے آزاد ہو گئے تو مجھے یقین ہے کہ یہ بہت جلد کوئی ایسی جگہ تلاش کر لیں گے جہاں سے دہشت گردی کی مزید کاروائیاں کریں گے۔

آخر شامیر کو فرانس میں سیاسی پناہ کا حق دیدیا گیا۔ اور وہ مئی ۱۹۴۸ء کے آخر میں جبکہ اسرائیل کے قیام کا اعلان ہو چکا تھا پھر فلسطین آگیا۔

بقیہ صہ ۱۴۴ پر

جامعہ کا ششماہی امتحان اور تعطیل:

۱۳ ربیع الأول ۱۴۰۴ھ (۱۹ دسمبر ۱۹۸۳ء) سے جامعہ کا ششماہی امتحان شروع ہوا۔ اور ۲۰ ربیع الاول (۲۶ دسمبر) کو ختم ہوگیا۔ اسکے بعد دو ہفتہ کی تعطیل ہوئی۔ ان شاء اللہ ٦ ربیع الآخر (۱۰ جنوری ۱۹۸۴ء) کو جامعہ دوبارہ کھل جائے گا۔

تبلیغی سرگرمیاں:

بحمد اللہ اب تبلیغی سرگرمیاں منظم طریق پر چل رہی ہیں۔ ایک طرف جمعیت اہلحدیث مشرقی یو پی کے ناظم، نائب ناظم اور مبلغ مسلسل تبلیغی اور تنظیمی دورے کرتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف مرکزی دار العلوم کے اساتذہ بھی مناسب ترتیب کے ساتھ تبلیغی پروگراموں میں شرکت کر رہے ہیں۔ بنارس کے مختلف محلوں اور اطراف میں تھوڑے تھوڑے وقفے سے اجتماعات ہوتے رہتے ہیں۔ اسکے علاوہ جمعیۃ اہلحدیث مشرقی یو پی نے شہر پرتاب گڑھ میں ۲۳ محرم ۱۴۰۴ھ (۳۰ اکتوبر ۱۹۸۳ء) کو اور شہر جونپور میں ۲۴ صفر ۱۴۰۴ھ (۳۰ نومبر ۸۳ء) کو بڑے پیمانے کے ایک روزہ اجلاس کئے۔ اول الذکر میں اساتذۂ دار العلوم میں سے مولانا عبد السلام صاحب بستوی و مولانا عزیز الرحمن صاحب سلفی اور مولانا عبد الوھاب حجازی نے تقریریں کیں اور ثانی الذکر کو مولانا ڈاکٹر مقتدی حسن ازہری، مولانا صفی الرحمن مبارکپوری، مولانا عزیز الرحمن سلفی اور مولانا عبد الوھاب حجازی نے خطاب فرمایا۔ ان کے علاوہ دونوں اجلاس میں جمیعۃ کے ذمہ داران و متعلقین علماء و اعیان بھی خاصی تعداد میں شریک تھے۔ ۱۱ دسمبر کو مرکزی دار العلوم بنارس میں جمعیۃ اہلحدیث مشرقی یو پی کی اور ۱۸ دسمبر کو اہلحدیث منزل دھلی میں مرکزی جمیعۃ کی میٹنگیں بھی ہوئیں۔

JAN. **MOHADDIS** 1984

THE ISLAMIC CULTURAL & LITERARY MONTHLY MAGAZINE
AL-JAMIATUS SALAFIAH (AL-MARKAZIYAH) VARANASI (INDIA)

ہم سے طلب کریں

(اردو میں)

کتاب الجنائز

از مولانا عبد الرحمن صاحب مبارکپوری ، صاحب تحفة الاحوذی قیمت ۵/۰۰

تاریخ اهلحدیث

از مولانا محمد ابراهیم صاحب میر سیالکوٹی قیمت ۴۰/۰۰

شیخ الاسلام محمد بن عبد الوهاب

از مولانا صفی الرحمن صاحب مبارکپوری قیمت ۱۰/۰۰

اللمحات الی مافی انوار الباری من الظلمات جلد دوم

از مولانا محمد رئیس صاحب ندوی قیمت ۳۰/۰۰

(عربی میں)

دراسات فی الجرح والتعدیل

از ڈاکٹر ضیاء الرحمن اعظمی قیمت ۳۰/۰۰

تحفة أهل الفكر

اصول حدیث پر متوسط رسالة از مولانا عبد الرحمن رحمانی مبارکپوری قیمت ۴/۰۰

بهجة النظر

اصول حدیث پر مختصر رسالہ از مولانا صفی الرحمن مبارکپوری قیمت ۱/۰۰

مکتبہ سلفیہ ریوڑی تالاب وارانسی

Published from Markazi Darul-Uloom
Printed by Abdul Waheed
At Salafiah Press, Reori Talab, Varanasi.

محدث

مرکزی دارالعلوم بنارس کا دینی علمی اور ادبی ماہنامہ

★

ادارۃ البحوث الاسلامیۃ والدعوۃ والافتاء بالجامعۃ السلفیۃ

بنارس ۔ الهند

★

برگ وبار

جامعہ سلفیہ کا علمی ادبی اور اصلاحی رسالہ

ماہنامہ محدث

بنارس

جمادی الاولیٰ ۱۴۰۴ھ
فروری ۱۹۸۴ء

جلد: پنجم شمارہ: ۲

ترتیب

صفی الرحمن مبارکپوری

بدلِ اشتراک

- سالانہ: ۲۵ روپے
- ششماہی: ۱۳ روپے
- فی پرچہ: ۲/۵۰ روپے
- بیرونِ ملک سے سالانہ: ۱۵ ڈالر

• ناشر: جامعہ سلفیہ بنارس • طابع: عبدالوحید • مطبع: سلفیہ پریس بنارس

پتہ

خط وکتابت کے لیے: ایڈیٹر محدث، جامعہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس

بدلِ اشتراک کے لیے: مکتبہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، بنارس

MAKTABA . SALAFIA . REORI TALAB. VA[illegible] 2010

[illegible] دارالعلوم ٹیلی فون: ۶۳۵۷۷

تزئین وکتابت

اقبال

فصلِ بہار

..... عبدالمعید سالم

فروغِ حسن سے ان کو ارم کے باغ ملے
نگارِ بزم سے ہم سوختہ دماغ چلے

یہ اپنا اپنا مقدر یہ اپنا اپنا نصیب
کہیں چراغ بجھے اور کہیں چراغ جلے

تمام عمر جلائی ہے ہم نے شمع امید
کھلے تھے پھول کہ فرقت کا دے کے داغ چلے

ہر ایک رسم کہن میکدے کی ٹوٹ گئی،
جو بادہ کش تھے وہ خالی لیے ایاغ چلے

اس انجمن میں مجھے ڈس رہی ہے تنہائی
مجھے بتاؤ کسی کا کوئی سراغ ملے

چمن میں آئی ہے فصلِ بہار ایسی بھی
اُجڑ گئے ہیں نشیمن پلے تو زاغ پلے

عجیب آپ ہیں سالم کہ آس رکھتے ہیں،
یہ تتلیاں، انھیں شاید کبھی فراغ ملے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تنظیمات کا المیہ

موجودہ دور کو اسلامی تاریخ میں تنظیمات کے موسم بہار کا دور کہا جا سکتا ہے۔ جس طرف دیکھیے، اسلام کی جزوی یا جامع خدمات کے لیے کوئی نہ کوئی تنظیم بنی ہوئی ہے اور خود رو جنگلی پودوں کی طرح ان کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ تنظیم بنانے والے اور اس سے متاثر ہونے والے یہ سمجھ کر خوشی خوشی جان اور مال کھپاتے ہیں کہ اسی بہانے اسلام کی کچھ خدمت کر دی جائے۔ مگر یہ کیسی عبرت انگیز اور المناک حقیقت ہے کہ اسلام اپنے ان خادموں کے جھرمٹ میں رہتے ہوئے بھی آج اس طرح پنپ اور پھل پھول نہیں رہا ہے جس طرح وہ ان ادوار میں پنپا اور پھلا پھولا تھا، جب امتِ اسلامیہ اس طرح کی تنظیمات سے سرے سے آشنا ہی نہ تھی، مسلمان اپنے دورِ زوال اور دورِ غلامی میں بھی اپنا جو عملی اور اخلاقی وزن رکھتے تھے آج وہ انھیں حاصل نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اپنے دائرے کے اندر داخل ہونے والوں کو ایک ایسی مضبوط اور ناقابلِ شکست اخوت اور معنویت کی لڑی میں پرو دیتا ہے کہ یہ اسلامی تعلق دیگر تمام تنظیمی تعلقات کی معنویت سے صد درجہ بالاتر ہے۔ اسلامی تعلق کے مقابلے میں کسی بھی تنظیمی تعلق کی حیثیت برگد کے مقابل میں ایک چھوٹے سے جنگلی پودے سے زیادہ نہیں اسلام نے عقیدہ و عمل سے لے کر توجہ و اثر تک ہر ہر مرحلے میں ہم آہنگی و یکجہتی، اتحاد و یگانگت اور تعاون و تناصر کی ایسی جامع ہدایات عطا فرمائی ہیں کہ کوئی مضبوط سے مضبوط تنظیم بھی اپنے افراد میں تعلقات و تعاون کا ایسا . . . . جامع خاکہ تیار نہیں کر سکتی۔ پھر اس کے لیے جان و مال کی فداکاری کا جیسا جذبہ اسلام نے پیدا کر دیا ہے ویسا جذبہ پیدا کرنا تو کسی تنظیم کے بس کی بات ہی نہیں ہے، اسی لیے اسلامی تعلق و اخوت نے مسلمانوں کو دوسرے تمام طرح کے تعلقات سے بے نیاز کر دیا ہے کہ اس کے رہتے ہوئے اور کسی کی حاجت نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے۔

لاحلف فی الاسلام وما کان من حلف فی الجاھلیۃ فلا یزیدہ الاسلام الا شدۃ۔ اسلام میں کوئی حلف (یعنی دوستی اور تعاون کا معاہدہ نہیں) اور جاہلیت میں جو حلف تھا اسلام اسے مزید پختہ ہی کرتا ہے

مطلب یہ ہے کہ دو انسانوں یا دو قبیلوں اور دو قوموں کا محض مسلمان ہونا ہی اس بات کے لیے کافی ہے کہ وہ ایک دوسرے کی دل وجان سے معاونت اور مدد کریں، اس کے لیے علیٰحدہ سے کسی معاہدے کی ضرورت نہیں، البتہ اگر دورِ جاہلیت میں دو قوموں اور دو قبیلوں کے درمیان دوستی و تعاون کا کوئی معاہدہ ہوا تھا، پھر دونوں مسلمان ہوگئے تو یہ معاہدہ مزید پختہ اور واجب الاحترام ہوگیا۔

اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ امتِ اسلامیہ کے سارے افراد اور تمام قومیں اور قبیلے ایک منظم وحدت میں اور باہمی اعتماد اور تعاون و تناصر کے لیے محض ان کا مسلمان ہونا ہی کافی ہے، مزید کسی تنظیمی رکنیت کا ان سے مطالبہ کرنا اسلامی وحدت پر قناعت نہ کرنے کے ہم معنی ہے۔

ہم اگر گہری نظر سے اسلامی تاریخ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ تنظیم اندر تنظیم، کی شکل میں اسلامی وحدت کے دائرے کے اندر سب سے پہلے جس داخلی تنظیم کا وجود ہوا وہ منافقین کی تنظیم تھی، یہ بظاہر تو امتِ مسلمہ کے جسدِ واحد کا ایک حصہ تھے، لیکن اپنے دیرینہ خبیث مقاصد کے لیے انھوں نے درپردہ ایک باقاعدہ تنظیم قائم کر رکھی تھی جس کے ارکین خلوتوں میں جمع ہوکر طرح طرح کے اسلام دشمن پروگرام بنایا کرتے تھے۔ اور اسی مقصد کے لیے انھوں نے اپنا ایک مرکز قائم کیا تھا جو تاریخ میں مسجد ضرار کے نام سے معروف ہے اور جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم خداوندی سے ڈھا دیا تھا۔ کبار صحابہ اور ان کے بعد کے ادوار میں بھی امتِ مسلمہ کے دائرے کے اندر اگر کوئی تنظیم وجود میں آئی تو وہ انھیں اعدائے اسلام کی تنظیم تھی جو اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسلام کو نیست و نابود کرنے کی تدبیروں اور عملی حکمتوں کے لیے اپنی ساری صلاحیتیں وقف کیے ہوئے، باقی رہے مسلمان تو انھوں نے اسلامی تعلق سے آگے بڑھ کر مزید کسی داخلی تنظیم کی ضرورت محسوس نہیں کی، ان کا اسلامی رشتۂ اخوت ہی ہر طرح کے فتنوں اور شورشوں کا مقابلہ کرنے کیلیے کافی تھا، کیوں کہ یہی امت گیر تنظیم کی وحدت متماسکہ تھا۔

لیکن جس طرح مختلف اسباب وعوامل کے تحت امت میں طرح طرح کے فرقے وجود میں آئے آج اسی طرح مختلف اسباب وعوامل کے تحت قسم قسم کی تنظیمات اور جمعیتیں وجود میں آئی ہیں، بظاہر تو یہ خدمتِ اسلام کے لیے بنی ہیں مگر عقائدی اور فقہی فرقوں کی طرح ان تنظیمات اور جمعیتوں کی بھرمار نے بھی امت کی وحدت اور اس کے

اسلامی جذبۂ تعاون و تناصر کو سخت دھچکا پہنچایا ہے۔ سب سے پہلے تو ان تنظیمات نے اپنے اور غیر کا امتیاز پیدا کیا، پھر یہ امتیاز رفتہ رفتہ تعصب میں تبدیل ہو گیا، پھر اس امتیاز و تعصب کو جیسے جیسے ترقی ملتی گئی، تنظیمی دائرے سے باہر کے مسلمانوں کے ساتھ رشتۂ اخوت کمزور پڑتا گیا بلکہ کٹتا گیا۔ پھر نوبت یہاں تک ہو گئی کہ اسلامی جذبۂ اخوت کی جگہ حدود رقابت نے لے لی اور پس پردہ یا کھلم کھلا اکھاڑ پچھاڑ شروع ہو گئی۔ اب تعاون و تناصر کی جگہ تحارب و تناحر کی نوبت آ گئی۔ اور ایمانی غیرت و حرارت اس مقام کو پہنچی کہ اسلام کی سرعام نافرمانی بلکہ مخالفت تو گوارا ہے، اسلام پر تنقید اور قرآن اور رسول کی توہین پر تو رگِ حمیت کچھ زیادہ نہیں پھڑکتی، مگر اپنی تنظیم کے قائد درہ نما پر یا ارکین و متعلقین پر یا اصول و ضوابط پر ہلکی سی تنقید بھی ہو جائے تو قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔

بعض تنظیمات کو تشکیل دینے والوں کے غرور علم اور پندارِ ہمہ دانی نے اور مصیبت کھڑی کر رکھی ہے ایک صاحب کو اپنی فلسفیانہ اسلامی تھیوری پر اس درجہ غرور تھا کہ انھوں نے اپنی تنظیم کو تشکیل دینے کے جلد ہی بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس خوشخبری کو پامال کرتے ہوئے کہ امت کا ایک طبقہ قیامت تک مسلسل حق پر قائم رہے گا یہ اعلان کر دیا کہ خلافت راشدہ کے بعد سے اب تک امت مسلمہ حق و باطل کے آمیزے کی دلدل میں پھنسی ہوئی تھی۔ ہم نے حقِ خالص پیش کر دیا ہے۔ جو اسے مسترد کرے گا، یہود کے درجہ کو پہنچ جائے گا۔ اسی پندار ہمہ دانی کا نتیجہ تھا کہ یہ صاحب اپنی تنظیم میں داخل ہونے والوں سے پھر سے کلمہ لا الٰہ الا اللہ پڑھواتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان صاحب کی برپا کی ہوئی تنظیم اپنے آپ کو اسلام کا اجارہ دار اور دوسرے مسلمانوں کو یہود کی طرح راندۂ درگاہ سمجھتی ہے اور انھیں کبھی سرکاری مسلمان، کبھی دوسرے درجے کا مسلمان اور کبھی درزج رجسٹر مسلمان کہتی ہے اور ایک سازشی ٹولے کی طرح مسلمانوں کے خلاف حسد و بغض اور سازش و عداوت وغیرہ کی ان لعنتوں میں خود گرفتار ہو گئی ہے جو یہود کا خاصہ ہیں، خلقِ خدا کے ساتھ اس طرح کا سلوک کرنے والوں کا یہی انجام ہے۔

ایک اور صاحب پندار ہمہ دانی اور غرور علم کی جہالت میں گرفتار دہلی کی ایک عمارت کے ایک حصے پر غاصبانہ قبضہ جمائے ملحدوں اور حیثیت رسالت کے منکروں کی روٹی پر پیٹ پالتے ہوئے یہ اعلان کر رہے ہیں کہ اس دور میں اسلام کو میں نے سمجھا ہے یا میرے بیٹے نے، کسی تیسرے نے نہیں۔ پھر یہ صاحب اس ڈھیلے پن کے ساتھ اہلِ اسلام کا استحصال کرتے ہوئے ایک تنظیم کی تشکیل فرما رہے ہیں۔ ظاہر ہے اسلام کے ایسے اجارہ داروں سے جنگ دستوروں کے جنگل کے سوا اسلام کی کھیتی میں اور کیا اگ سکتا ہے۔ (باقی ص ۵۳ پر)

بہ سلسلہ عباد الرحمان

قتل اور حرامکاری سے اجتناب

مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی جھنڈانگری

ہم محدث کے متعدد شماروں میں مختلف عنوانات کے تحت سورۂ فرقان میں اللہ کے بندوں کی بیان کی ہوئی خصوصیات پر روشنی ڈال چکے ہیں۔ زیر نظر مضمون بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

اللہ اپنے نیک بندوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔

وَلَا یقتلون النفس التی حرم اللہ الا بالحق۔ یعنی وہ ناحق کسی حرام جان کو ہلاک نہیں کرتے۔

در اصل نوع انسان کے گوناگوں مصالح اور نوع بہ نوع فوائد کے لیے خدا نے بڑی سختی کے ساتھ انسانی جان کی حرمت قائم کی ہے، اور اسلام کا قانون یہ ہے کہ اس کے مقرر کردہ اسباب و حالات کے سوا کسی دوسری بنیاد پر آدمی کا خون نہ بہایا جائے۔ نہ کوئی اپنی جان دے اور نہ دوسرے کی جان لے۔

یہیں سے قتل ناحق کے مختلف اسباب مثلاً قومی و وطنی تعصب، نسلی و لسانی تعصب اور مذہبی فرقہ پرستی کی بنیادیں اکھڑ جاتی ہیں جس سے آئے دن قتل و خونریزی کی گرم بازاری رہتی ہے۔

قرآن کریم نے قتل نفس کو آدمی کے لیے سب سے بڑی معصیت قرار دیا ہے، شرک کے بعد سب سے بڑی اگر کوئی برائی ہو سکتی ہے تو وہ یہی ہے، چنانچہ ارشاد ہے۔

ومن یقتل مومنا متعمدا فجزاءہ جھنم خالدا فیھا۔ یعنی جو شخص جان بوجھ کر کسی مومن کو قتل کر دے تو اس کی سزا جہنم ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔

اس بارے میں طبیعت انسانی کے لیے اصلی آزمائش کا وقت وہ ہوتا ہے جب رگوں میں انتقام کا جوش ابھر آتا ہے، کیونکہ اس صورت میں بسا اوقات ایک قتل کے بدلے سیکڑوں جانیں ضائع ہوتی ہیں اور کبھی کبھی تو

ایک قتل پوری ایک آبادی کی ویرانی کا سبب بن جاتا ہے، بلکہ انتقام کا چکر پورے پورے ملک کو جلانے اور کلی تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ اسی لیے ارشاد ہے:

انه من قتل نفساً بغير نفس او فساد فی الارض فكانما قتل الناس جميعا۔ — یعنی جس نے ایک نفس کو کسی جان کے بدلے یا زمین میں کسی فساد کے بغیر قتل کیا تو اس نے گویا سارے انسانوں کو قتل کر دیا۔

یعنی چونکہ ایک نفس کا قتل کر دینا نسلِ انسانی کو ختم کر دینے کا سبب بن سکتا ہے اسی لیے گویا یہ سارے انسانوں کے قتل کے مترادف ہے۔ احادیث میں قتل کا گناہ نہایت سنگین بتلایا گیا ہے اور اس سے نہایت سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَلَا یَزْنُوْنَ"۔ یعنی خدا کے نیک بندوں کی پہچان یہ ہے کہ وہ زنا نہیں کرتے۔ یہ برائی اللہ کی نگاہ میں نہایت سنگین ہے اور اس نے مختلف اندازِ بیان کے ذریعہ اس سے دور رہنے کی سخت تاکید کی ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے۔

ولا تقربوا الزنا انه كان فاحشة وساء سبيلاً۔ — زنا کے قریب بھی نہ جاؤ یہ فحش کام ہے اور برا راستہ ہے۔

ایک لمبی حدیث کے اندر وارد ہے کہ جب زنا اور بدکاریاں عام ہو جاتی ہیں تو لوگ آفات و بلیات اور قحط سالیوں میں گرفتار کر دیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس برائی پر دنیا میں بھی نہایت سنگین سزا مقرر کی ہے۔ یعنی اگر کوئی شادی شدہ مسلمان زنا کرے تو اسے سرِعام رجم کر دیا جائے گا، یعنی پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا جائے گا اور غیر شادی شدہ زنا کرے تو اسے سرِعام سو کوڑے لگائے جائیں گے۔ ایسی سخت سزا اس لیے مقرر کی گئی ہے تاکہ زنا کے دواعی و محرکات اور شہوانی خیالات مغلوب اور کمزور سے کمزور تر پڑ جائیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نوجوان کو زنا سے روکنے کے لیے بڑا حکیمانہ اسلوب اختیار فرمایا۔ آپ نے اس نوجوان سے فرمایا: کیا تو اپنی بہن سے زنا کرے گا؟ اس نے کہا یا رسول اللہ نہیں۔ فرمایا: کیا تو اپنی ماں سے زنا کرے گا؟ اس نے کہا یا رسول اللہ نہیں؟ فرمایا: کیا تو اپنی لڑکی سے زنا کرے گا؟ اس نے کہا یا رسول اللہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تو اپنی خالہ اور پھوپھی سے زنا کرے گا؟ اس نے کہا نہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس طرح تو اپنی ماں، اپنی بہن، اپنی بیٹی، اپنی خالہ اور اپنی پھوپھی

کے ساتھ زنا کرنا پسند نہیں کرتا ۔ اسی طرح کوئی آدمی یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی ماں، بہن، بیٹی اور خالہ یا پھوپھی سے کوئی زنا کرے۔ اس پرحکمت تعلیم اور پُراثر تعبیر سے نوجوان پر بڑا اثر ہوا۔ اسے پوری حقیقت سمجھ میں آگئی اور اس نے صدق دل سے توبہ کی۔ (الخصائص الکبری للسیوطی وتفسیر ابن کثیر)

ایک مشہور حدیث میں وارد ہے کہ سات آدمیوں کو عرش الٰہی کے نیچے سایہ ملے گا، ان میں سے ایک آدمی وہ ہوگا جس کو کسی حسین نوجوان عورت نے زنا کی دعوت دی، لیکن اس آدمی نے یہ کہدیا کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔ اور پھر زنا کے قریب نہیں گیا، اس آدمی کو بھی قیامت کے دن عرش الٰہی کے نیچے سایہ ملے گا جبکہ قیامت کے دن اس سایہ کے علاوہ کوئی دوسرا سایہ نہیں ہوگا۔

اللہ کے نیک بندے زنا کے خیالات سے بھی ہمیشہ کوسوں دور رہتے ہیں، اور اس سے اپنا دامن بچانے کے لیے اپنے جذبات کی بڑی سے بڑی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

امام ابن سیرین رحمہ اللہ کے متعلق بعض تاریخی کتابوں میں پڑھا کہ یہ بڑے خوبصورت نوجوان تھے۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد انھوں نے اپنے معاش کا انتظام کپڑا فروخت کرنے کے ذریعہ کیا۔ ایک دن کپڑے کی گانٹھ کندھے پر لادے ایک ایسے علاقے میں پہنچ گئے، جہاں ایک نوجوان اور مالدار بیوہ ابن سیرین جیسے صاحب جمال نوجوانوں کی تاک جھانک میں رہا کرتی تھی، ان کو دیکھتے ہی سوجان سے فریفتہ ہوگئی۔ اپنی نوکرانیوں کے ذریعہ ابن سیرین کو اوپر بلوایا۔ انھوں نے طرح طرح کے کپڑے دکھائے لیکن بیوہ نے کہا اس سے اچھے قسم کے کپڑے لے کر کل دوبارہ میرے پاس آئیے۔ امام ابن سیرین دوسرے دن اچھے اچھے کپڑوں کے تھان لیکر پہنچے اور اسے دکھانے لگے، لیکن اس عورت نے کپڑوں کی خریداری کے بجائے لگاوٹ اور عشق ومحبت کی باتیں ..... اور ناز وانداز شروع کر دیا۔ امام ابن سیرین نے اسے باز رکھنے کے لیے زنا کی مذمت پر وعظ کہہ ڈالا، لیکن اس عورت کے دل پر کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر امام ابن سیرین کے دل میں بچنے کی ایک حکمت سوجھی، انھوں نے اس عورت سے کہا کہ مجھے بیت الخلاء جانے کی حاجت ہے نوکرانیوں نے راستہ بتا دیا۔ کھانا پکانے کی نالی جو اس طرف بہہ کر جاتی تھی اس کا کیچڑ اور کالی سیاہ مٹی امام نے اپنے تمام چہرے پر لت پت کرلی اور اسی ہیئت میں اس کے سامنے آگئے۔ اس طرح اس عورت کو نفرت پیدا ہوگئی اور امام ابن سیرین اپنی گٹھری اٹھا کر باہر آگئے۔ اور اس بدکاری سے نجات پانے پر خدا کا شکر ادا کیا اور گھر پہنچکر سارا ماجرا

بیوی کو سنایا ۔

حافظ ابن حجر نے تذکرہ کا منہ میں اور امام ابن جوزی نے المنتظم وغیرہ میں اس قسم کے متعدد واقعات درج فرمائے ہیں۔ آج بھی اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں میں وہی لوگ شمار کیے جائیں گے جو اللہ کی بندگی و اطاعت کرتے ہوئے زنا کاری اور بدکاری جیسے فسق و فجور سے اپنے آپ کو پاک وصاف رکھیں۔

آگے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَمَنْ يَفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدْ فِيهِ مُهَانًا إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولٰئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۔ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ۔

اور جو شخص ایسا کرے گا۔ (یعنی اوپر کی آیات میں ذکر کیے گئے گناہوں یعنی شرک، قتل ناحق اور زنا کا ارتکاب کرے گا) وہ اپنے گناہ کی تحت سزا پائے گا اس کے لیے قیامت کے دن عذاب دگنا کر دیا جائے گا اور وہ اس عذاب میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ذلیل و رسوا ہوگا مگر جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک عمل کرے تو ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے ۔ اور جو شخص توبہ کرتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے تو یہ شخص یقیناً اللہ کی طرف ٹھیک ٹھیک توبہ کرتا ہے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے بندوں کا ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ اگر ان سے برائی سرزد ہو جاتی ہے تو وہ اس پر اڑے رہنے کے بجائے اس سے توبہ کرتے ہیں اور اسے چھوڑ کر نیک عمل کرنے لگتے ہیں اور جب کوئی توبہ کرکے نیک عمل کرنے لگے تو اللہ اس قدر خوش ہوتا ہے کہ صرف اس کے گناہ بخش ہی نہیں دیتا بلکہ بسا اوقات گناہ کی جگہ نیکیاں لکھ دی جاتی ہیں، کیوں کہ ہر گناہ پہ اس نے پشیمانی کے آنسو بہا بہا کر اور اللہ سے معافی مانگ مانگ کر اس گناہ کی سزا کی جگہ اس پشیمانی اور عفو طلبی کی نیکی کے اجر کا مستحق ہو چکا ہوتا ہے ۔

توبہ کی اہمیت اتنی ہے کہ ایک حدیث میں اس کی یوں تمثیل دی گئی کہ ایک شخص اونٹنی پر اپنے خورد و نوش کا سارا سامان رکھ کر سفر پر نکلتا ہے ۔ اور ایک لق و دق صحرا سے گزرتا ہے، کسی جگہ ایک درخت نظر آجاتا ہے، سوچتا ہے

دوڑا دوڑا ہوں ۔ اونٹنی سے اترتا ہے اور درخت کے نیچے سو جاتا ہے ، آنکھ کھلتی ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ اونٹنی سارے سامان سمیت لاپتہ ہے ، تلاش میں دردر کی خاک چھان ڈالتا ہے مگر اونٹنی کا کہیں نام و نشان نہیں ، مجبور و مایوس ہو کر درخت کے نیچے آتا ہے کہ اب یہیں جان دیدے ، آنکھ لگ جاتی ہے ، کچھ دیر بعد جاگتا ہے تو کیا دیکھتا ہے کہ سواری سارے سامان سمیت کھڑی ہے ۔ اتنا خوش ہوتا ہے کہ فرطِ شادمانی میں اللہ کو خطاب کر کے کہتا ہے ۔ انت عبدی وانا ربك ۔ (اے اللہ تو میرا بندہ اور میں تیرا رب ہوں ۔) یعنی مارے خوشی کے لٹے کہہ دیتا ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اللہ اپنے بندے کی توبہ پر اس سے بھی بڑھ کر خوش ہوتا ہے ۔

پس تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ ہر طرح کی مکاری و بدکاری سے نہایت سختی کے ساتھ دور رہنے کی کوشش کریں اور اگر خدانخواستہ لغزش ہو چکی ہے تو درِ توبہ کھلا ہے ۔ اللہ کے حضور توبہ کریں ۔ اور اس دنیا سے جانے سے پہلے اس توبہ کے ذریعہ اللہ کی پکڑ اور اس کے عذاب سے بچنے کی کوشش کریں ۔ اللہ تمام مسلمانوں کو برے اور قبیح اعمال سے دور رکھے اور جو مبتلائے معصیت ہو چکے ہیں انھیں خالص توبہ کی توفیق دے ۔ آمین ۔

فرانس میں قبول اسلام کی رفتار

فرانسیسی اخبار "کوٹ الیٹیہ زیلجنس" جو فرانس کا سب سے بڑا کیتھولک اخبار مانا جاتا ہے ، لکھتا ہے کہ پچھلے چند برسوں کے دوران فرانس کے تمام طبقوں سے تعلق رکھنے والے کوئی تیس سے پچاس ہزار فرانسیسی باشندوں نے اسلام قبول کیا ہے ۔ اخبار کہتا ہے کہ حالیہ برسوں میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا ہے وہ روحانیت کی طرف واپسی کی اس تحریک سے وابستہ ہیں جو آج کل بہت بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی ہے ۔ ان لوگوں میں مفکرین بھی ہیں ، جیسے رجا رجارودی ۔ اور ماہرین فنون بھی ، بلکہ سرکاری ملازمین اور مزدور بھی ۔ مجلہ مزید لکھتا ہے کہ اسلام نے انھیں اپنی سادگی کی وجہ سے کھینچ لیا ہے اور اس لیے کہ اسلام ایک زندہ دین ہے جس میں قناعت اور زہد کی خوبیاں موجود ہیں اور اس لیے کہ اسلام یہ موقع فراہم کرتا ہے کہ انسان کسی واسطے اور وسیلے کے بغیر ۔ براہ راست اللہ کی طرف متوجہ ہو سکے (بحوالہ التوحید مصر صفحہ ۱۴)

محدث ! جن لوگوں کو اسلام میں اپنے عقلی فلسفے گھسیڑے بغیر تشفی نہیں ہوتی اور جو لوگ مسلمان ہوتے ہوئے بھی اللہ اور بندے کے درمیان وسیلوں کے چکر میں پھنسے ہیں انھیں ایک غیر مسلم اخبار کے مذکورہ بالا بیان سے عبرت پکڑنی چاہیے ۔

اسلام کی صحیح تعبیر

عقیدۂ رسالت میں اس تعبیر کی ایک جھلک

ابو العاص وحیدی مدرس دار العلوم الاسلامیہ بستی

عقیدہ توحید کے بعد دین اسلام کا دوسرا بنیادی عقیدہ، عقیدۂ رسالت ہے۔ کلمہ اسلام "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کا پہلا جز عقیدۂ توحید پر اور دوسرا جز عقیدہ رسالت پر مبنی ہے۔ عقیدۂ رسالت کا تقاضا ہے، اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کی بے چون وچرا اطاعت کرنا، آپ کے نقش قدم پر چلنا، آپ کی باتوں کی تصدیق کرنا، آپ کی منع کی ہوئی چیزوں سے رک جانا اور من مانی باتوں اور طبع زاد طریقوں یعنی بدعتوں سے بچ کر شریعت محمدی کے مطابق اللہ کی عبادت کرنا۔

ہم قرآنی آیات اور احادیث نبوی کی روشنی میں منصب رسالت کے چند پہلوؤں کی وضاحت کرتے ہیں اور رسول کی صحیح حیثیت کی تشریح کرتے ہیں تاکہ اسلام کی صحیح تعبیر میں عقیدۂ رسالت کے سچے جلوے دیکھے جاسکیں۔

رسول کی شرعی حیثیت

(الف) قرآن مجید میں بڑی وضاحت وصراحت کے ساتھ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کا شارح اور مبین بتایا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم۔ (النحل : ۴۴)

ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن) اتارا تاکہ لوگوں کی طرف جو چیز نازل کی گئی ہے آپ اس کی تشریح کردیں۔

اس آیت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کام یہ بتلایا گیا ہے کہ آپ قرآن کی تبیین کریں، تبیین کا معنی ہے کسی چیز کو کھول کھول کر بتلا دینا، یعنی اس میں جو اشکالات ہوں، اس کی توضیح کرنا، جو اجمال ہو اس کی تفصیل کرنا، جو ابہام

اور پوشیدگی ہو اسے دور کرنا، متعدد احتمالات ہوں تو صحیح معنی اور ٹھیک ٹھیک مراد کی تعیین کرنا وغیرہ۔

(ب) قرآن بڑی وضاحت کے ساتھ بتلاتا ہے کہ آپ اس امت کے معلم اور مربی بھی تھے، ارشاد ہے،

هو الذى بعث فى الاميين رسولاً منهم يتلو عليهم آيته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة (الجمعة : ۲)

وہی ہے جس نے امیوں کے درمیان خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، انکا تزکیہ کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

لقد من الله على المومنين اذ بعث فيهم رسولاً من انفسهم يتلو عليهم آيته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة۔ (آل عمران : ۱۶۴)

اللہ نے مومنوں پر احسان فرمایا ہے جبکہ ان کے اندر خود انہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا جو انھیں اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے، ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس معنی کی آیات بے شمار ہیں جن میں بار بار جس بات کو زور و تاکید کیساتھ دہرایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو صرف آیات قرآن سنا دینے کے لیے نہیں بھیجا تھا بلکہ اس کے ساتھ بعثت کے تین مقصد اور بھی تھے۔

ایک یہ کہ آپ لوگوں کو کتاب کی تعلیم دیں دوسرے یہ کہ اس کتاب کے منشا کے مطابق کام کرنے کی حکمت سکھائیں اور تیسرے یہ کہ آپ افراد کا بھی اور ان کی اجتماعی ہیئت کا بھی تزکیہ کریں، یعنی اپنی تربیت سے ان کی انفرادی اور اجتماعی خرابیوں کو دور کریں اور ان کے اندر اچھے اوصاف اور بہتر نظام اجتماعی کو نشوونما دیں۔

(ج) قرآن یہ بھی واضح کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس امت کے پیشوا، قائد، اور نمونہ تقلید بھی تھے۔ ارشاد ہے:

قل ان كنتم تحبون الله فاتبعونى يحببكم الله (آل عمران) ۳۱

اے نبی کہو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

لقد كان لكم فى رسول الله اسوة حسنة لمن كان يرجوا الله واليوم الآخر

تمہارے لیے اللہ کے رسول میں نمونہ تقلید ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو۔

(الاحزاب : ۳۱)

قل اطیعوا اللہ والرسول فان تولوا فان اللہ لا یحب الکافرین۔ (آل عمران)
کہو اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، پھر اگر وہ منہ موڑتے ہیں تو اللہ کافروں کو پسند نہیں کرتا۔

ان آیات میں اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیشوا قرار دیا ہے۔ ان کی زندگی کو نمونۂ تقلید ٹھہرایا ہے، اپنی محبت کا دار و مدار پیغمبر ہی کی اتباع پر رکھا ہے اور اس سے منہ موڑنے کو کفر قرار دیا ہے۔

(د) قرآن نے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تشریعی اختیارات بھی عطا کیے ہیں یعنی آپ کو شارع قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے:

یامرھم بالمعروف وینھٰھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم (اعراف ۱۵۷)
وہ رسول ان کو معروف کا حکم دیتا ہے، اور انہیں منکر سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاک چیزوں کو حلال کرتا ہے اور ان پر ناپاک چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے وہ بوجھ اور بندھن اتارتا ہے جو ان پر چڑھے ہوئے تھے۔

ما اٰتاکم الرسول فخذوہ وما نھٰکم عنہ فانتھوا واتقوا اللہ ان اللہ شدید العقاب۔ (الحشر: ۷)
جو کچھ رسول تمہیں دیں اسے لے لو اور جس سے منع کریں اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرو، اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

یہ آیات اس بارے میں صریح اور دو ٹوک ہیں کہ اللہ کی طرف سے امر و نہی اور تحلیل و تحریم صرف وہی نہیں ہے جو قرآن میں بیان ہوئی ہے بلکہ جو کچھ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حلال یا حرام ٹھہرا دیا ہے۔ جس چیز کا حکم دیا ہے اور جس چیز سے منع کر دیا ہے وہ بھی اللہ کے دیے ہوئے اختیارات سے ہے اس لیے وہ بھی احکام الٰہی کا ہی ایک حصہ ہے اور اس کی پابندی اسی طرح ضروری ہے جس طرح قرآنی احکام کی پابندی ضروری ہے۔

(ک) قرآن ہمیں یہ بھی بتلاتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قاضی اور جج بھی تھے۔ ارشاد ہے:

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ۔ (النساء: ۱۰۵)
ہم نے آپ کی طرف حق کے ساتھ کتاب نازل کی تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اللہ کی دکھائی ہوئی روشنی کے مطابق فیصلہ کریں۔

فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک
تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہیں ہوں گے جب تک

فیما شجر بینهم ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔ (النساء : ۶۵)

تجھے اپنے جھگڑوں میں بھی فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر تم جو فیصلہ بھی کرو اس کے متعلق اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ محسوس کریں۔ اور بے چون و چرا تسلیم کر لیں۔

جب اللہ اور اس کے رسول کسی با

دوسری جگہ ارشاد ہے

وما کان لمومن ولا مومنة اذا قضی الله ورسوله امرا ان یکون لهم الخیرة من امرهم۔

جب اللہ اور اس کے رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو کسی مومن مرد یا مومنہ عورت کو اپنی طرف سے کچھ کرنے کا اختیار باقی نہیں رہتا۔

اس طرح کی آیات بیشمار ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امت کے ہر طرح کے تمام معاملات اور تنازعات کا فیصل اور حکم قرار دیا گیا ہے اور ایسا حکم قرار دیا گیا ہے کہ آپ کے فیصلے پر دم مارنے کی گنجائش نہیں رہی بلکہ دل میں بھی تنگی محسوس ہو تو ایمان سلامت نہ رہے گا۔

(د) قرآن میں بھرپور صراحت کے ساتھ یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے مقرر کیے ہوئے حاکم اور فرمانروا تھے۔ ارشاد ہے۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن الله۔ (النساء : ۶۴)

ہم نے کوئی رسول نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے اذن سے اس کی عبادت کی جائے۔

من یطع الرسول فقد اطاع الله (النساء : ۸۰)

جو رسول کی اطاعت کرے، اس نے اللہ کی اطاعت کی

ان الذین یبایعونك انما یبایعون الله۔ (الفتح : ۱۰)

جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ در اصل اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔

یا ایها الذین آمنوا اطیعوا الله واطیعوا الرسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوه الی الله والرسول ان کنتم تومنون بالله والیوم الآخر (النساء : ۵۹)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔ پھر اگر تمہارے درمیان نزاع ہو جائے تو اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیر دو۔ اگر تم اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہو۔

ان تمام آیات سے یہ بات صاف طور پر متعین ہو جاتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس امت کے حاکم و فرمانروا تھے اور آپ کی حکومت و فرمانروائی ایک عام حکمران کی حیثیت سے نہ تھی کہ آپ کی مخالفت اور آپ کے ساتھ نزاع کی گنجائش ہوتی بلکہ آپ کی حکومت و فرمانروائی آپ کے منصب رسالت کا ایک حصہ تھی، اسی لیے آپ کی اطاعت اور آپ سے بیعت اللہ سے بیعت قرار دی گئی۔ آپ کے فیصلہ کے بعد کسی کے لیے کوئی اختیار باقی نہیں رکھا گیا اور دیگر حکمرانوں کے ساتھ نزاع کی صورت میں آپ کو اللہ کے بعد آخری مرجع قرار دیا گیا۔

مقامِ رسالت

رسول کی اس شرعی حیثیت کی نشاندہی کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ و مقام کی طرف بھی مختصر اشارہ کر دیا جائے۔

(۱) معراج کی رات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جملہ انبیائے سابقین کی امامت فرمائی اور آپ امام الانبیاء قرار پائے اور خدا سے قاب قوسین کا قرب حاصل کیا۔

(۲) آپ کا ارشاد ہے انا سید ولد آدم یوم القیامۃ ولا فخر و بیدی لواء الحمد یوم القیامۃ ولا فخر۔ میں قیامت کے دن اولاد آدم کا سردار رہوں گا۔ اور کوئی فخر نہیں۔ اور میرے ہاتھ میں قیامت کے دن حمد کا جھنڈا ہوگا اور کوئی فخر نہیں۔

(۳) قیامت کے روز جب سارے انبیاء معذرت فرمادیں گے، آپ شفاعت کبری فرمائیں گے، اس روز سب سے پہلی شفاعت آپ فرمائیں گے اور سب سے پہلے آپ ہی کی شفاعت قبول بھی کی جائے گی، آپ ہی کی شفاعت پر در جنت کھلے گا۔ اور اہل جنت کو جنت میں داخلے کی اجازت ملے گی۔

(۴) پہلے انبیاء اور رسل خاص قوموں کی جانب ایک مخصوص زمانے کے لیے بھیجے جاتے، آپ کو سارے عالم کے لیے بھیجا گیا۔ اور قیامت تک کیلیے بھیجا گیا۔ چوں کہ آپ سارے عالم کے لیے آفتاب ہدایت بنائے گئے اور آپ کی ہدایت سے ساری دنیا کو جگمگانا تھا، اس لیے آپ کو سراج منیر کا لقب دیا گیا۔

(۵) آپ کا خصوصی معجزہ قرآن مجید ہے جو ابدی اور دائمی ہے، اور انبیائے سابقین کے معجزوں کی بہ نسبت اس معجزے پر ایمان لانے والوں کی تعداد اتنی ہے کہ سارے پیغمبروں کی کل امت کی مجموعی تعداد کی دگنی ہوگی۔

(۶) آپ کی وہ وہ خصوصیات ہیں، جس سے سارے انبیاء اور پیغمبر خالی ہیں۔

(۷) غرض کیا عہدہ و منصب اور کیا مرتبہ و مقام کسی بھی لحاظ سے کوئی مخلوق آپ کی ہمسر نہیں، آپ ساری مخلوق سے افضل تھے۔

آپ کے ساتھ اہل ایمان کے تعلق کی نوعیت

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

النبی اولی بالمومنین من انفسھم و ازواجہ امھاتھم (الاحزاب)

نبی اہل ایمان کے لیے ان کے اپنے نفسوں سے بھی زیادہ قریبی اور حقدار ہیں، اور ان کی بیویاں اہل ایمان کی مائیں ہیں۔

یہ ایک آیت نبی اور اہل ایمان کے تعلق کی نوعیت واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ اہل ایمان کے نزدیک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز و محبوب ہوں اور وہ آپ کے اشاروں پر چلنا اور آپ پر اپنی جان قربان کرنا اپنی سعادت سمجھتے ہوں۔ یہی ہے محبت و تعظیم اور عزت و توقیر کا وہ مقام جس کا اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان سے مطالبہ فرمایا ہے۔ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

عن انس رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لایومن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین (متفق علیہ)

انس رضی اللہ عنہ نے روایت کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم میں کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے باپ اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

یہ حدیث کس زور و تاکید اور صراحت و وضاحت کے ساتھ ثابت کرتی ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے الفت و محبت ایمان کی ضروری شرط ہے یا د رہے کہ الفت و محبت کا مطلب زبانی دعویٰ نہیں بلکہ آپ کے طریقہ پر چلنا، آپ کی سنت کو اپنانا اور پوری زندگی میں آپ کو اسوہ ماننا ہے۔

ذات رسول بحیثیت بشر

چونکہ عقیدت و محبت کے جوش میں انسان عموماً حقیقت و واقعیت کی حدوں کو پھلانگ جاتا ہے، اس لیے قرآن و احادیث میں انبیاء و رسل کے منصب و مقام کے پہلو بہ پہلو ان کی ذاتی اور شخصی شخصیت اور حدوں کی بھی تعیین کر دی گئی ہے تاکہ رسالت اور خدائی میں کوئی التباس نہ ہو سکے، چنانچہ بتایا گیا ہے۔ انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والتسلیم منصب رسالت و نبوت پر فائز ہونے کے باوجود بشر تھے اور بشری خصوصیات سے متصف تھے، نیند اور اونگھ کرنا، بیمار ہونا، خوش ہونا، رنج کرنا غم میں مبتلا ہونا، پیشاب و پاخانہ کی ضرورت ہونا، بھول جانا، بیوی بچوں والا ہونا، کھانا پینا، اللہ کا بندہ ہونا اور اس کے سامنے عاجز و نیاز مند ہونا وغیرہ۔ جو بشری لوازم اور خصوصیات ہیں، وہ انبیاء کرام میں پائی جاتی تھیں۔

بلکہ یہی تو انبیاء کرام کا طغرائے امتیاز ہے کہ بشر ہونے اور بشری اوصاف وخصوصیات کے حامل ہونے کے باوجود رسالت ونبوت جیسے عظیم منصب ومقام پر فائز کیے گئے۔

خدا اور رسول میں کیا فرق ہے اس کا اندازہ آیات ذیل سے بخوبی ہو جاتا ہے : ارشاد ہے۔

قل انی لا املک لکم ضرا ولا رشدا قل انی لن یجیرنی من اللہ احد ولن اجد من دونہ ملتحدا (الجن ۲۱، ۲۲)

آپ کہدیجیے میں تمہارے کسی نفع ونقصان کا مالک نہیں، مجھے اللہ سے کوئی بچا نہیں سکتا اور اللہ کے علاوہ میں کوئی جائے پناہ نہیں پاسکتا، آپ کہدیجیے آسمانوں اور زمین میں جتنے ہیں اللہ کے سوا کوئی بھی غیب نہیں جانتا۔

قل لایعلم من فی السموٰت والارض الغیب الا اللہ۔ (النمل : ۶۵)

ان آیات سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کسی کے نفع ونقصان کے مالک نہ تھے بلکہ وہ خود بھی اللہ کے محتاج ونیازمند اور اس کے سامنے عاجز وبے بس تھے، یہ بھی معلوم ہوا کہ انھیں علم غیب بھی حاصل نہیں ہے۔

حضرت عائشہ نے سورہ نمل کی آیت مذکورہ کو سامنے رکھ کر ارشاد فرمایا ہے :

من زعم انہ یخبر بما یکون فی غد فقد اعظم علی اللہ الفریۃ۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۹۷)

جس نے یہ گمان کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کل ہونے والی بات کی خبر دیتے ہیں، اس نے اللہ پر بڑا بہتان باندھا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جوش عقیدت میں حد سے آگے بڑھ جانے سے منع فرمایا ہے۔

لاتطرونی کما اطرت النصاری عیسی ابن مریم انما انا عبد فقولوا عبد اللہ ورسولہ (رواہ البخاری ومسلم)

میرے بارے میں غلو نہ کرو، جیسا کہ نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ بن مریم کے بارے میں غلو کیا تھا، میں تو اللہ کا بندہ ہوں، مجھے اللہ کا بندہ اور رسول کہو۔

یعنی میری تعریف وتوصیف میں حد سے آگے نہ بڑھو اور مجھے میرے اس مقام سے اوپر نہ کرو جہاں اللہ نے مجھے بٹھایا ہے، جس طرح نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ کے بارے میں غلو کیا کہ ان کو الوہیت کا جز بنا دیا۔ میں تو اللہ کا بندہ ہوں، اس کا رسول ہوں، مجھے ویسا ہی کہو جیسا خود میرے رب نے کہا ہے۔

آپ نعت گوئی اور شعر وشاعری میں بھی غلو اور افراط سے روکتے تھے، بخاری شریف کی مشہور روایت ہے کہ ایک بار

بچیاں راگ سے کچھ اشعار پڑھ رہی تھیں، انھوں نے دوران میں یہ کہہ دیا «وفینا نبی یعلم ما فی غد» ہمارے درمیان ایسے نبی ہیں جو کل کی بات جانتے ہیں تو آپ نے فوراً ان بچیوں کو یہ شعر پڑھنے سے روک دیا۔

ان تفصیلات کے بعد ہم اس ناگوار پہلو کا ذکر کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ عقیدۂ رسالت اسلامی تاریخ میں مختلف افراط و تفریط

عقیدۂ رسالت میں افراط و تفریط

سے دوچار ہوا۔ تفریط کا مطلب ہے جہالت یا عناد کی وجہ سے رسول اور رسالت کا مقام گھٹا دینا، یعنی رسول کے اندر خدا .... مطلب ہے رسول کو مقامِ رسالت سے آگے بڑھا کر الوہیت کا درجہ دیدینا، یعنی رسول کے اندر خدا کی صفات مان لینا۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ حق افراط و تفریط کی ان دونوں حدوں کے درمیان ہے، جس کی نشاندہی گزشتہ صفحات میں مختصراً اور اشارۃً ہو چکی ہے، اب ہم ذیل میں ایک ایک مثال سے افراط اور تفریط دونوں کی توضیح کرتے ہیں۔

منکرینِ حدیث عقیدۂ رسالت میں تفریط کے مرتکب ہیں، ان میں بہت سے لوگ بالکلیہ احادیث کا انکار کرتے ہیں، اور رسول کی اطاعت کو شرطِ ایمان نہیں قرار دیتے وہ کہتے ہیں کہ رسول کی حیثیت خدا کے ایک ڈاکیہ کی ہے جب اس نے خدا کی ڈاک ہم تک پہنچا دی تو پھر ہمیں ڈاکیہ سے کیا تعلق اور ہمیں اس کی کیا ضرورت کہ اس کے اقوال و افعال کی پیروی کریں۔ اور اس کے کردار و عمل کو رہ نما بنائیں۔

قرآن مجید اس باطل عقیدہ کی کھلی تردید کرتا ہے اور رسول کے اقوال و افعال اور رائے و اجتہاد کو واجب الاطاعت بلکہ شرطِ ایمان قرار دیتا ہے۔ جبکہ تفصیل کے ساتھ اس معنی و مفہوم کی آیات نقل کی جا چکی ہیں، اور ان کی تشریح ہو چکی ہے۔

مسلمانوں کا ایک گروہ رسالت کے بارے میں افراط کا مرتکب ہے، اس نے الوہیت اور رسالت کو خلط ملط کر دیا ہے، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے کے علاوہ مختارِ کل، حاجت روا، مشکل کشا اور عالم وغیرہ مانتے اور بتاتے ہوئے آپ کو متعدد صفاتِ الٰہی میں شریک ٹھہرایا ہے، ان کے عقیدے کا یہ غلو اولیائے کرام کے بارے میں بھی چل پڑا ہے، اس طرح سے ان لوگوں نے عیسائیوں اور مشرکین عرب کے شرک و غلو کی پوری نقل کی، اور ان آیات و احادیث کی صریح مخالفت کی جو ان کے عقائدِ باطلہ کی بھرپور تردید کرتی ہیں اور انھیں کھلا ہوا شرک بتلاتی ہیں۔

حیرت ناک بات یہ ہے کہ یہ گروہ ایک طرف تو عقیدت و محبت کے غلو میں حدودِ شرک کے اندر جا گھسا ہے اور دوسری طرف شخصیت پرستی کے دلدل میں پھنس کر عقیدۂ رسالت کے ایک لازمی پہلو یعنی اطاعتِ رسول کے بارے میں

کوتاہی اور تفریط کا بھی ارتکاب کیا ہے، فقہی اعتبار سے ان لوگوں نے اپنے علماء وائمہ کی رائے وقیاس اور بنائے ہوئے اصول و مبادی پر ایسا اعتماد کیا ہے کہ نصوص کتاب وسنت پر انہیں مقدم کر دیا ہے، چنانچہ جب قرآنی آیات و احادیث ان کے علماء وائمہ کی رائے وقیاس اور اصول و مبادی کی مخالف ہوتی ہیں تو وہ آیات و احادیث میں دور از کار تاویلات کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اور اگر کچھ نہیں بن پاتا تب بھی اپنے علماء اور ائمہ ہی کے اقوال پر جمے اور ڈٹے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں چوتھی صدی ہجری کے مشہور حنفی امام ابو الحسن عبید اللہ الکرخی (م ۲۶۰ - ۳۴۰ ہجری) جس عجیب وغریب ذہنیت کا مظاہرہ کیا ہے وہ ملاحظہ کے لائق ہے، پوری جرأت کے ساتھ لکھتے ہیں:

کل آیة تخالف ما علیه اصحابنا فهو مؤولة او منسوخة وکل حدیث کذا فهو مؤول او منسوخ۔ جو بھی آیت ہمارے اصحاب (علماء وائمہ) کی مخالف ہو وہ یا تو منسوخ ہے یا مؤول، اسی طرح جو حدیث ہو وہ بھی یا منسوخ ہے یا مؤول۔ (تاریخ التشریع الاسلامی ص ۳۵۳)

یہ ہے عقیدہ رسالت کے بارے میں افراط و تفریط کا المناک حادثہ، اللہ تعالیٰ امت کو اس سے نجات دے اور جادۂ اعتدال پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

حدیث وسنت کا مقام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بحیثیت رسول اور نبی جو باتیں پہلی بار کہیں جو کام کیے اور جن واقعات پر رضامندانہ خاموشی اختیار کی انہیں محدثین کی اصطلاح میں حدیث وسنت کہا جاتا ہے۔ اسلام میں حدیث وسنت کو بڑا عظیم مقام حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید کے ساتھ سنت بھی عطا کی ہے، سنن ابی داؤد میں مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا

الا انی اوتیت القرآن ومثله معه۔ سنو مجھے قرآن دیا گیا ہے اور اس کی مثل مزید براں (یعنی سنت) (سنن ابی داؤد باب لزوم السنة ج ۲)

محدثین کی تشریح کے مطابق مثله معه سے مراد سنت وحدیث ہی ہے۔ حدیث وسنت قرآن مجید کے لیے تفسیر و شرح کا درجہ رکھتی ہے۔ علامہ شاطبی رحمہ اللہ اپنی کتاب الموافقات میں لکھتے ہیں۔

السنة بمنزلة التفسیر والشرح لمعانی احکام الکتاب (الموافقات ج ۴ ص ۱) حدیث وسنت کتاب اللہ کے احکام کے لیے تفسیر وشرح کا درجہ رکھتی ہے۔

آن مجید کے مجملات و مشکلات کی توضیح و تفسیل اور عملی تشکیل آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال و اعمال اور پے احوال جانے بغیر نہیں ہو سکتی، کیونکہ آپ مراد الٰہی کے مبیّن یعنی بیان کرنے والے تھے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

وانزلنا الیک الذکر لتبین ہم نے آپ کی طرف ذکر (قرآن) اتارا تاکہ لوگوں کی طرف
ناس ما نزل الیھم (النحل، ۴۴) جو چیز نازل کی گئی آپ اس کی تشریح کر دیں۔

قرآن مجید میں وضو، غسل، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، درود، دعا، جہاد، ذکر الٰہی، اسی طرح نکاح، طلاق ع و شراء، اخلاق و معاشرت، سیاسیات ملت اور فصل قضایا و حضرات غرض جملہ احکام دین کے متعلق کلی احکام جود ہیں یعنی ان کو اجمالاً بیان کیا گیا ہے، مگر ان احکام کی تشریح اور ان کے جزئیات کی تفصیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، اسی لیے آپ کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

ان اشاروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ دینِ اسلام میں احادیث کو کتنا اونچا مقام حاصل ہے اور دینی و دنیوی امور و مسائل میں قرآن مجید کے بعد حدیث عظیم ترین حجت ہے۔

علماء حدیث اور ائمہ سنت علی العموم علوم حدیث کے متعلق چار لفظ ذکر فرماتے ہیں، خبر، حدیث، اثر، سنت، اسی لیے عاملین بالحدیث جو عقائد و احکام میں کتاب اللہ کے بعد مطلقاً حدیث صحیح کی حجیت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور اسے حجت شرعی سمجھتے ہیں وہ مختلف نسبتوں سے مشہور ہیں، اہل الحدیث، اہل الاثر، اور اہلسنت وغیرہ۔

صحیح عقیدۂ رسالت اور اسلامی نقطۂ نظر سے احادیث صحیحہ (خواہ اخبار متواتر ہوں یا اخبار آحاد) ان کے انکار کا ایمان و دیانت پر بالکل وہی اثر پڑتا ہے جو قرآن عزیز کے انکار کا اور مطلقاً احادیث صحیحہ جس طرح احکام میں حجت ہیں اسی طرح عقائد میں بھی حجت ہیں۔

یہی جماعت اہلحدیث کا نقطۂ نظر ہے اور اسی نقطۂ نظر کو اپنا کر احادیث کی صورت میں مکمل نظام حیات پایا جا سکتا ہے، اس جماعت کے علاوہ اور دوسرے گروہوں نے بڑی غیر محتاط روش اختیار کی ہے، جس کے نتیجہ میں زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کی رہنمائی کا مقام نہیں مل سکا ہے یعنی سیاسی اور معاشی امور تو درکنار عبادات اور معاملات میں بھی اسلام جگہ جگہ سے دخل کر دیا گیا ہے۔

•••

امام ابو الحسن اشعری

اور ان کا عقیدہ

تحریر: شیخ حماد بن محمد انصاری
استاذِ حدیث، مدینہ یونیورسٹی۔

ترجمہ:
ابو ذکی انور عبد الرقیب سلفی

الحمد للہ الذی ارسل رسولہ بالهدى ودين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون والصلاة والسلام على نبينا محمد وآله وصحبه ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين

اسلامی ممالک میں بہت سے لوگ عقیدہ میں اپنے آپ کو ابو الحسن اشعری کی طرف منسوب کرتے ہیں، اس کے باوجود وہ ان کی زندگی کے نشیب و فراز سے ناواقف ہیں اور انہیں اس بات کا علم نہیں کہ ان کی آخری عقائد کیا تھی جسے اعتزال سے توبہ کے بعد انھوں نے اپنا عقیدہ قرار دیا تھا اور جس کی وجہ سے وہ ان ائمہ کی صف میں آ گئے ہیں جن کی اقتدا کی جاتی ہے، اس لیے ہم امام موصوف کے احوال و کوائف سے نابلد لوگوں کو ان کی حقیقت حال سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں جو معتبر مراجع کی تلاش و جستجو کے بعد معلوم ہوئی ہے۔

سب سے پہلے ہم ان کی زندگی کے مختصر حالات ہدیۂ قارئین کرتے ہیں۔

امام کی زندگی

آپ کا نام و نسب حسب ذیل ہے:

علی بن اسماعیل بن اسحاق بن سالم بن اسماعیل بن عبد اللہ بن موسیٰ بن ابی بردہ بن موسیٰ الاشعری۔ آپ کی ولادت سنہ ٢٦٠ھ میں ہوئی آپ کے احوال حیات کو جن علماء سیرت و تاریخ نے بھی اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے۔ ان میں سے بعض درج ذیل ہیں۔

ابو القاسم علی بن الحسن بن ہبۃ اللہ بن عساکر الدمشقی نے اپنی کتاب "تبیین کذب المفتری فیما نسب الی ابی الحسن الاشعری" میں خطیب بغدادی نے اپنی کتاب "تاریخ بغداد" میں ابن خلکان نے "وفیات الاعیان" میں ذہبی نے "تاریخ الاسلام" میں، ابن کثیر نے "البدایہ والنہایہ" میں، تاج الدین سبکی نے "طبقات الشافعیۃ الکبری" میں، ابن فرحون المالکی نے "الدیباج المذہب فی اعیان اہل المذہب" میں، مرتضیٰ الزبیدی نے "اتحاف السادۃ المتقین شرح اسرار احیاء علوم الدین" میں، ابن العماد الحنبلی نے "شذرات الذہب فی اعیان من ذہب" میں، ان کے علاوہ دیگر علمائے کرام نے بھی آپ کی زندگی کے حالات کو اپنی تصانیف میں قلم بند کیا ہے۔

امام بغداد آئے اور زکریا بن یحییٰ الساجی جو فقہ و حدیث کے ایک امام ہیں، ان سے علم حدیث کی تحصیل کی، ابوخلیفہ الجمحی، سہل بن سرح، محمد بن یعقوب المقری، عبد الرحمان بن خلف وغیرہم سے بھی علم حدیث کے اندر استفادہ کیا اور ان لوگوں کے واسطے سے اپنی تفسیر کی کتاب "المختزن" میں بہت ساری روایتیں بیان کیں۔

علم کلام اپنے استاذ اور اپنی ماں کے خاوند ابوعلی الجبائی سے حاصل کیا۔

جب آپ کو اعتزال کے کلام میں پوری مہارت حاصل ہوگئی اور اس کے اندر انتہائی بلند درجہ کو پہنچ گئے تو دوران درس اپنے استاد کے سامنے ایسے سوالات اور اشکالات پیش کرنے لگے کہ استاد کی طرف سے ان کا تسلی بخش جواب ملنا مشکل ہوگیا۔ جس کی وجہ سے ان کی حیرانی بڑھ گئی۔

ان سے منقول ہے کہ ایک رات مجھے اپنے عقیدے سے متعلق کچھ شکوک وشبہات دل میں پیدا ہوئے تو اٹھ کر میں نے دو رکعت نماز پڑھی اور اللہ تعالیٰ سے سیدھی راہ کی ہدایت مانگی، اس کے بعد سوگیا، پھر خواب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو آپ سے اپنی مصیبت کا تذکرہ کیا اور تکلیف کی شکایت کی، جس پر مجھے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ "علیک بسنتی" (تم میری سنت پر عمل کرنا واجب قرار دے لو") آپ کی اس بات سے میں چونک پڑا۔ پھر علم کلام کے تمام مسائل کو قرآن وحدیث پر پیش کیا جو ان کے موافق ثابت ہوا انھیں برقرار رکھا اور جو ان دونوں کے اصول کے خلاف معلوم ہوا انھیں پس پشت ڈال دیا۔

ابوبکر احمد بن علی بن ثابت المعروف بہ خطیب بغدادی المتوفی سنہ ۴۶۳ھ نے اپنی تاریخ کے گیارہویں جز کے اندر ص ۳۴۶ پر لکھا ہے۔ ابوالحسن الاشعری المتکلم کی بہت سی کتابیں اور تصنیفیں معتزلہ روافض، جہمیہ، خوارج اور دیگر بدعت پسند ملحدین کے رد میں موجود ہیں۔ یہاں تک کہ انھوں نے لکھا ہے "وکانت المعتزلۃ قد رفعوا رؤسھم حتی اظھر اللہ تعالیٰ الاشعری فحجزھم فی اقماع السمسم۔ معتزلہ اپنا سر اٹھائے ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اشعری کو پیدا کیا اور انھیں [illegible]

ابن فرحون نے "دیباج" میں لکھا ہے "و اثنی علی ابی الحسن الاشعری ابو محمد بن ابی زید القیروانی وغیرہ من ائمۃ المسلمین" ابو محمد بن ابو زید قیروانی اور دوسرے ائمہ مسلمین نے ابوالحسن اشعری کی تعریف کی ہے۔

ابن عماد حنبلی نے شذرات ج۲ ص ۳۰۳ میں ذکر کیا ہے ، ابوالحسن اشعری نے جس کام کے ذریعہ سنت نبوی کے حامیوں کو سرخ رو بنایا معتزلہ اور جہمیہ کا جھنڈا سرنگوں کر دیا ، حق کو واضح طور پر نمایاں کر دیا اور اہل ایمان و اہل عرفان کے دلوں کو ٹھنڈک پہنچائی وہ ان کا اپنے شیخ جبائی کے ساتھ مناظرہ ہے جس کے ذریعہ انھوں نے ہر مجادل بدعتی کی کمر توڑ دی ، مناظرہ سے میری مراد وہ مناظرہ ہے جس کے بارے میں ابن خلکان نے لکھا ہے :

ابوالحسن اشعری نے اپنے استاد ابو علی الجبائی سے ایسے تین بھائیوں کے بارے میں سوال کیا جن میں سے ایک مومن تھا ، دوسرا فاسق اور بدبخت تھا ، تیسرا ابھی چھوٹا ہی تھا ، پھر تینوں مر گئے تو ان تینوں کا حال قیامت کے دن کیا ہوگا۔

جبائی نے جواب دیا زاہد (جنت) کے درجات میں ہوگا ، کافر (جہنم کی) پستیوں میں اور چھوٹا اہل نجات میں اشعری نے اس پر اعتراض کیا کہ اگر چھوٹا زاہد کے درجات تک پہنچنا چاہے تو کیا اس کو اس کی اجازت ملے گی ، جبائی نے جواب دیا نہیں ، اس لیے کہ اس سے کہا جائے گا کہ تمہارا بھائی ان درجات تک عبادت و اطاعت کی کثرت کی وجہ سے پہنچا ہے اور تمہارے پاس عبادت و اطاعت کی کوئی مقدار موجود نہیں ہے۔ اشعری نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے کہا کہ اگر وہ چھوٹا یہ کہے کہ (خدایا) یہ کوتاہی میری نہیں ہے ، تو نے نہ تو مجھ کو زندہ رکھا اور نہ اطاعت و عبادت کی قدرت عطا کی پھر میں کیسے میں تیری بندگی کرتا۔ جبائی نے اس کا جواب دیا کہ باری جل فرمائے گا کہ میں جانتا تھا کہ اگر تم زندہ رہتے تو نافرمانی کرتے اور عذاب الیم کے مستحق بنتے ، اس لیے میں نے تمہاری ضرورت و مصلحت کا خیال کرتے ہوئے تمہیں (بچپن ہی میں) موت کی نیند سلا دی ، اشعری نے اس پر اعتراض کیا کہ تب اگر بڑا بھائی یہ کہے کہ یا الہ العلمین جس طرح تو اس کی حالت جانتا تھا اسی طرح میری بھی حالت سے واقف تھا ، پھر تو نے اس کی مصلحت کی رعایت کیوں برتی اور میری ضرورت کا خیال کیوں نہیں رکھا۔ (تو اللہ اس کا کیا جواب دے گا) ۔ اس اعتراض کو سن کر ابو علی الجبائی لاجواب ہو گئے۔

ابن العماد نے لکھا ہے کہ اس مناظرہ میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت سے نوازتا ہے اور جسے چاہتا ہے اسے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

تاج الدین السبکی نے "طبقات الشافعیۃ الکبری" کے اندر لکھا ہے "ابوالحسن الاشعری امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اہلِ سنت کے بڑے امام ہیں، ان کا اور امام احمد رحمہ اللہ کا عقیدہ بلاشک وشبہ ایک ہے اور اس کی تصریح خود اشعری نے اپنی تصانیف کے اندر کی ہے اور بارہا بیان کیا ہے کہ میرا عقیدہ امام مبجّل احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا عقیدہ ہے۔ شیخ ابوالحسن کی یہ عبارت ان کے کلام کے بہت سے مقامات میں موجود ہے۔

اس مختصر سی بحث میں ابوالحسن اشعری کے فضائل ومناقب کا احاطہ مشکل ہے اور جو لوگ ان کی تالیفات سے اعتزال سے توبہ کے بعد واقف ہوئے ہیں ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی اپنی توفیق سے مدد کی ہے اور انھیں حق کی حمایت اور اس کی راہ سے مدافعت کے لیے قائم کیا۔

اہلِ مذاہب کا ان کے مذہب کے بارے میں جھگڑا ہے۔ مالکی دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ مالکی تھے اور شافعی خیال کرتے ہیں کہ وہ شافعی تھے اور حنفی حضرات کا گمان ہے کہ وہ حنفی تھے۔

ابن عساکر نے ذکر کیا ہے کہ میں نے ایک فاضل فقیہ شیخ سے ملاقات کی اور اس نے مجھے بتایا کہ ابوالحسن اشعری مالکی تھے اور تمام مذاہب کے اصولِ دین کی معرفت میں تفقہ حاصل کیے ہوئے تھے، آج بہت سے لوگ جو اہلِ سنت سے تعلق رکھتے ہیں اشعری کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ یہ ان کی کثرتِ تالیف کی وجہ سے اور کثرتِ قرأت کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ ابن فورک نے لکھا ہے کہ ابوالحسن اشعری کی وفات ۳۲۴ھ میں ہوئی ہے۔

امام کے اس مختصر ترجمہ کے بعد اب ہم ان کا اعتزال سے رجوع ثابت کریں گے اور ان کی کتاب "الابانہ" کی نسبت کی صحت ان کی طرف بیان کریں گے۔ جسے ہم قابلِ اعتماد مراجع سے نقل کریں گے۔ اور توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے

اعتزال سے عقیدۂ سلف کی طرف رجوع

شام کے مورخ حافظ ابو القاسم علی بن حسن بن ہبۃ اللہ بن عساکر الدمشقی متوفی ۵۷۱ھ نے اپنی کتاب "تبیین" کے اندر کہا ہے، ابوبکر اسماعیل بن ابو محمد بن اسحاق الازدی القیروانی نے کہا ہے کہ ابوالحسن الاشعری معتزلی تھے اور چالیس سال تک مذہب اعتزال پر قائم رہے، معتزلیوں کے امام تھے پھر پندرہ دن لوگوں کی نظر سے اپنے گھر میں چھپے رہے، اس کے بعد بصرہ کی جامع مسجد میں آئے اور جمعہ کی نماز کے بعد منبر پر چڑھ کر اعلان کیا: اے لوگو میں تم لوگوں کی نظر سے اس مدت میں غائب رہا اس لیے کہ میں نے متعارض دلائل کے اندر غور وفکر کیا تو حق و باطل میرے نزدیک ایک دوسرے پر راجح قرار نہیں پا سکا، لہٰذا میں نے اللہ تعالیٰ سے ہدایت طلب کی اور اس نے میری رہنمائی

میری ان باتوں کی طرف کی جیسے میں نے۔ اس سلسلے میں سپرد قلم کیا ہے اور میں نے اپنے سابقہ عقیدے کو ختم کر دیا ہے اور اس سے اپنے ذہن و دماغ کو اسی طرح خالی کر دیا ہے جس طرح میں اس وقت اپنا جسم اپنے اس کپڑے سے خارج کر رہا ہوں اس کے بعد انھوں نے اپنا لباس اتار کر پھینک دیا اور کتابیں لوگوں کو دیدیں، ان میں "کتاب اللمع" وغیرہ بھی جن میں سے بعض کا تذکرہ جلد ہی آئے گا۔ ان شاء اللہ۔ پھر جب یہ کتابیں اہل سنت کے علمائے اہلِ حدیث و فقہ نے پڑھی تو ان کی برتری تسلیم کر لی، اور انھیں اپنا امام بنا لیا یہاں تک کہ اپنے مذہب کی نسبت بھی ان کی طرف کر دی اور معتزلہ کے تعلق سے ان کی حیثیت اس کتابی جیسی ہو گئی جس نے اسلام قبول کیا اور اسلام نہ قبول کرنے والے اہلِ کتاب کی غلطیاں بیان کیں جس کی وجہ سے وہ ذمیوں کے نزدیک سب سے بڑے دشمن بن گئے۔ اسی طرح ابو الحسن اشعری بھی معتزلیوں کے نزدیک ان کے سب سے بڑے دشمن ٹھہرے۔

چنانچہ یہ لوگ ان کو برا بھلا کہتے ہیں اور ان کی طرف غلط باتیں منسوب کر کے ان کو بدنام کرتے ہیں، ابو الحسن اشعری کا رتبہ اس قدر بلند ہے کہ مذہب معتزلہ کے اختلاف کی وجہ سے ان کے رتبہ کے اندر کسی طرح کی کمی واقع نہیں ہو سکتی اصول کی معرفت میں ان کا علو مرتبت مسلم ہے اور اصحاب بصیرت کے نزدیک یہ ان کے فضل و کمال کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ جو شخص کسی مذہب سے رجوع کرتا ہے وہ اس کی غلط فہمیوں اور کوتاہیوں سے زیادہ با خبر ہوتا ہے۔ اس کے شکوک و شبہات کی تردید پر زیادہ قادر ہوتا ہے اور جن تلبیسات کی وجہ سے وہ اس مذہب کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کرتا ہے اس کی توضیح کی زیادہ بصیرت رکھتا ہے، لہٰذا جو لوگ انھیں اس سلسلہ میں عیب لگاتے ہیں ان کا اطمینان ہارون بن موسیٰ الاعور کے مناظرے کے اطمینان جیسا ہے، اس کا قصہ یہ ہے کہ ہارون اعور یہودی تھے پھر مسلمان ہو گئے اور اچھے مسلمان ثابت ہوئے قرآن حفظ کیا اس کے معانی کو ضبط کیا اور نحو یاد کیا۔ ان سے ایک دن ایک آدمی نے کسی مسئلہ میں مناظرہ کیا اور یہ اس پر غالب آگئے، جب مغلوب کو کوئی کام کی بات نہیں سوجھ سکی تو اس نے ان سے کہا کہ تم پہلے یہودی تھے پھر مسلمان ہو گئے۔ ہارون نے اس کا جواب دیا کہ میں نے کیا برا کیا۔ اور یہ اس طرح اس جواب میں بھی غالب آگئے۔

اصحاب الحدیث کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ابو الحسن اشعری ائمہ حدیث میں سے تھے اور ان کا مذہب اہلِ حدیث کا مذہب تھا۔ اصول دین کے اندر ان کی باتیں اہلِ سنت کے طریقہ کے مطابق ہیں، اہلِ بدعت اور اہلِ زیغ کی انھوں نے تردید کی ہے، معتزلہ، روافض، خوارج اور دوسرے بدعتیوں کے لیے شمشیر برہنہ تھے، جو لوگ ان پر طعن کرتے ہیں یا ان کو برا بھلا کہتے ہیں وہ تمام اہلِ سنت کے ساتھ بدکلامی کرتے ہیں۔

ابوالحسن اشعری اہلِ سنت کی زبان میں کوئی پہلے متکلم نہیں تھے بلکہ ان سے پہلے بہت سے دوسرے لوگ گزر چکے تھے اور یہ ان لوگوں کی اسی راہ کے مسافر تھے، جو مذہب کی حمایت کا مشہور و معروف راستہ ہے۔ لہذا انھوں نے بیانِ حجت میں نہ کوئی زیادتی پیدا کی ہے نہ کوئی نئی بات اپنی طرف سے ایجاد کرکے کہی ہے اور نہ کوئی غلط مذہب بنایا ہے بلکہ صرف دوسرے ائمہ کی طرح مذہب کی شرح و بسط کا کام انجام دیا ہے۔

ابوبکر بن فورک نے کہا ہے ابوالحسن اشعری نے ۳۰۰ھ میں اعتزال سے رجوع کرکے اہلِ سنت کا مسلک اختیار کیا، ان کے علاوہ بھی دوسرے علماء نے اشعری کے اعتزال سے رجوع کی بات کہی ہے، ان میں سے بعض درج ذیل ہیں:

ابوالعباس شمس الدین، احمد بن محمد بن ابی بکر بن خلکان الشافعی متوفی ۶۸۱ھ نے وفیات الاعیان ج۲ ص۴۴۶ میں لکھا ہے: کان ابوالحسن الاشعری معتزلیا ثم تاب، ابوالحسن اشعری معتزلی تھے پھر اس سے توبہ کرلی۔

عماد الدین، ابوالفداء اسماعیل بن عمر بن کثیر القرشی الدمشقی الشافعی متوفی ۷۷۴ھ نے "البدایہ والنہایہ ج۱۱ ص۱۸۷ میں لکھا ہے کہ ابوالحسن اشعری معتزلی تھے پھر بصرہ میں منبر پر اس سے توبہ کی اور معتزلہ کے نقائص و معائب بیان کیے۔

شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان الدمشقی الشافعی الشہیر بالذہبی متوفی ۷۴۸ھ نے اپنی کتاب "العلو للعلی الغفار" میں لکھا ہے ابوالحسن اشعری پہلے معتزلی تھے، ابو علی الجبائی سے علم حاصل کیا پھر اسے چھوڑ دیا اور اس کی تردید کرنے لگے اور سنت کے متکلم بن گئے، ائمہ حدیث سے موافقت پیدا کرلی، اگر ہمارے متکلمین اصحاب ابوالحسن کی باتیں معلوم کرتے اور اسے اپنے لیے لازم قرار دیتے تو یقیناً ایک اچھا کام کرتے لیکن یہ لوگ پہلے کے حکماء کی طرح بہت ساری چیزوں میں گھس پڑے ہیں اور منطق کے پیچھے چل پڑے ہیں۔ فلا قوۃ الا باللہ۔

تاج الدین ابو نصر عبد الوہاب بن تقی الدین السبکی الشافعی المتوفی ۷۷۱ھ نے طبقات الشافعیۃ الکبریٰ ج۲ ص۲۴۶ میں کہا ہے ابوالحسن اعتزال پر چالیس سال تک قائم رہے یہاں تک کہ معتزلہ کے امام بن گئے، پھر جب اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی حمایت کا ارادہ کیا تو ان کا سینہ اتباعِ حق کے لیے کھول دیا اور لوگوں کی نظر سے اپنے گھر میں چھپ کر بیٹھ گئے اس کے بعد انھوں نے ابن عساکر کی گزشتہ باتیں بعینہٖ بیان کیں۔

برہان الدین ابراہیم بن علی بن محمد فرحون الیعمری المدنی المالکی متوفی ۷۹۹ھ نے اپنی کتاب "الدیباج المذہب فی معرفت اعیان علماء المذہب" کے ص۱۹۳ میں ذکر کیا ہے کہ ابوالحسن اشعری شروع میں معتزلی تھے

پھر مذہب حق کی طرف یعنی اہلِ سنت کے مذہب کی طرف رجوع کر لیا جس کی وجہ سے لوگوں کو کافی تعجب ہوا اور اس کے سے میں ان سے سوالات کیے گئے تو انھوں نے جواب دیا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ماہِ رمضان میں خواب میں دیکھا اور آپ نے مجھے حق کی طرف رجوع کرنے اور اس کی حمایت کرنے کا حکم دیا اور یہ اسی سبب سے ہے۔ والحمد للہ تعالیٰ۔

سید محمد بن محمد الحسینی الزبیدی الشہیر بمرتضیٰ نے اپنی کتاب "اتحاف السادہ المتقین بشرح اسرار احیاءِ علوم الدین" کی دوسری جلد کے ص ۳ میں لکھا ہے ابوالحسن اشعری نے علم کلام معتزلہ کے امام شیخ ابو علی الجبائی سے حاصل کیا، پھر اس دیکھے گئے خواب کی وجہ سے ان سے مفارقت اختیار کر لی، اعتزال سے برگشتہ ہو گئے اور اس کا واضح طور پر انھوں نے اعلان کیا، جمعہ کے دن بصرہ کے منبر پر آئے اور بلند آواز سے کہا کہ جو مجھے جانتا ہے وہ تو جانتا ہے، جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں فلاں ابن فلاں ہوں، پہلے کہتا تھا کہ قرآن مخلوق ہے اور اللہ تعالیٰ کو قیامت کے دن ان آنکھوں سے نہیں دیکھا جائے گا اور بندے اپنے افعال کے خود ہی خالق ہیں، اب میں اعتزال سے توبہ کرتا ہوں اور معتزلہ کی تردید کرنے کا عقیدہ و ارادہ رکھتا ہوں، پھر معتزلیوں کی انھوں نے تردید شروع کر دی اور ان کے خلاف کتابیں لکھیں۔

ابن کثیر نے بیان کیا ہے کہ شیخ ابوالحسن اشعری کی تین حالتیں ہیں، پہلی حالت اعتزال کی ہے جس سے انھوں نے یقیناً رجوع کر لیا ہے' اور دوسری حالت (اللہ کے لیے) سات عقلی صفتوں یعنی زندگی، علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر اور کلام کے اثبات کی اور خبری صفتوں یعنی وجہ، یدین، قدم اور ساق وغیرہ کی تاویل کی ہے۔ تیسری حالت ان تمام صفات کو بلا تکییف و تشبیہ سلف کے طریقے کے مطابق ثابت کرنے کی ہے، اور یہی طریقہ یا مسلک انھوں نے اپنی کتاب "الابانہ" کے اندر اختیار کیا ہے جو ان کی آخری تصنیف ہے۔

ان علمائے اعلام کے مذکورہ اقوال سے یہ بات بالکل یقینی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ ابوالحسن اشعری کا آخری عقیدہ سلف کا عقیدہ تھا۔ جسے قرآن کریم اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان کیا ہے۔

تصانیف

یہاں ہم امام ابوالحسن اشعری کی بعض ان تالیفات کا تذکرہ کر رہے ہیں جنھیں انھوں نے اعتزال سے توبہ کے بعد تصنیف کیا ہے حافظ ابن عساکر نے اپنی کتاب "تبیین الکذب المفتری" کے اندر ابن حزم ظاہری کا قول نقل کیا ہے کہ ابوالحسن اشعری نے پچپن کتابیں لکھیں۔ اس کے بعد کہا ہے کہ ابن حزم نے ان کی نصف سے زیادہ کتابوں کا ذکر چھوڑ دیا ہے، چنانچہ موصوف نے اس کے بعد ان کتابوں کو گنایا ہے اور بتایا ہے کہ ان تصانیف میں ایک کتاب "اللمع" بھی ہے اس کتاب میں امام اشعری نے معتزلہ کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو بیان کیا ہے۔

اور اس کا نام "کشف الاسرار و ہتک الاستار" رکھا ہے ان ہی تصانیف میں ان کی تفسیر "المختزن" بھی ہے جو پانچ سو جلدوں میں ہے، اس کے اندر ہر اس آیت پر بحث کی ہے جس سے کسی بدعتی نے اپنا تعلق جوڑا ہے اور اس بدعتی کا ابطال کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ وہ آیت اہل حق کی دلیل و حجت ہے۔ نیز مجمل اور مشکل الفاظ کی تبیین و تشریح بھی کی ہے اور جبائی اور بلخی نے اپنی تفسیروں میں جو معنوی تحریف کی ہے، اس پر اعتراض بھی کیا ہے۔ موصوف کی انہی تصانیف میں ایک کتاب "الفصول" بھی ہے جو ملحدین اور ملت سے خروج کرنے والوں جیسے فلاسفہ، دہریہ، مشبہ وغیرہم کی تردید پر مشتمل ہے اور انہی میں سے ایک کتاب مقالات المسلمین ہے جس کے اندر مسلمانوں کے تمام اختلافات و مقالات کا پورے طور پر ذکر موجود ہے، حافظ ابن عساکر نے ان تصانیف کو ان کے نام اور موضوع کے ساتھ اپنی کتاب "التبیین" کے ص ۱۲۸ سے ۱۳۱ تک ذکر کیا ہے۔ میں (اس رسالہ کا مولف) مذکورہ تینوں کتابیں یعنی اللمع، الابانہ، اور المقالات الاسلامیہ، کا مطالعہ کر چکا ہوں، یہ تینوں طبع ہو چکی ہیں۔

ابن عساکر نے تبیین کے ص ۲۸ پر لکھا ہے کہ ابوالحسن اشعری کی تصانیف اہل علم کے مابین مشہور و معروف ہیں اور محققین کے نزدیک عمدگی اور درستگی کی صفت سے متصف ہیں اور جو شخص ان کی کتاب الابانہ سے واقف ہے اسے ان کا علمی و دینی رتبہ معلوم ہے۔ پھر ۱۵۲ پر لکھا ہے کہ ابوالحسن اشعری ویسے ہی تھے جیسا کہ ان کے حسن اعتقاد کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔ علم و نقد کی معرفت رکھنے والوں کے نزدیک یہ صحیح مذاہب کے جویا تھے، چنانچہ انھوں نے بہت ساری باتوں میں ان کے مذہب کو اکابرین ملت کے مذہبوں کے موافق قرار دیا ہے صرف جاہل اور معاندین ہی ان کے اعتقاد پر نکتہ چینی کرتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ہم ان کے اعتقاد کی باتیں انھی کے حوالے سے امانت کے ساتھ نقل کریں، خیانت سے احتراز کریں اور نقل کے اندر اپنی طرف سے کسی طرح زیادتی اور کمی سے احتراز کریں تاکہ "دینی اصولوں" کے سلسلے میں ان کے عقیدہ کی حقیقت معلوم ہو سکے، لہٰذا غور سے ان کی وہ باتیں سنو جو انھوں نے اپنی اس کتاب "الابانہ" کی ابتدا میں ذکر کی ہیں۔ ان باتوں کو ہم آخر میں ذکر کریں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ۔

پھر ص ۱۷۱ پر چند اشعار ذکر کیے ہیں، جن کی نسبت ان کے بعض معاصرین کی طرف کی ہے ان اشعار کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

اگر وہ پوری زندگی "الابانہ" اور "اللمع" کے علاوہ کوئی اور کتاب نہ لکھتے تو بھی کافی تھی، چہ جائیکہ مختلف علوم و فنون کے اندر انھوں نے اتنی کتابیں لکھی ہیں کہ ان کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے اور وہ اپنی۔

(باقی ص ۴۰ پر)

شیخ الاسلام مولانا ابوالوفا

ثناء اللہ امرتسریؒ اور ان کی تصنیفات

مولانا محمد مستقیم سلفی

شیخ الاسلام مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری کی شخصیت ان نادرۂ روزگار شخصیات میں سے ہے جو روز روز
ں دنیا میں نہیں آتیں اور جب اس دنیا سے عالم بالا کو سدھار جاتی ہیں تو اپنے پیچھے اپنی یادوں کے انمٹ نقوش چھوڑ
اتی ہیں۔

آپ جون ۱۸۶۸ء / ۱۲۸۷ھ میں خضر جو بن اکرم جو ساکن ڈور تحصیل اسلام آباد ضلع سری نگر
یر کے گھر میں پیدا ہوئے آپ اپنی سوانح حیات میں لکھتے ہیں کہ "میری عمر سات برس میں تھی کہ والد (خضر جو) صاحب
انتقال ہوگیا۔ بڑے بھائی ابراہیم مرحوم رفوگری کا کام کرتے تھے، مجھے بھی انھوں نے یہ کام سکھایا، چودھویں سال میں والدہ
بھی انتقال ہوگیا، چودھویں سال ہی میں مجھے پڑھنے کا شوق ہوا۔ ابتدائی کتب فارسی پڑھ کر مولانا احمد اللہ صاحب
یس امرتسر کے پاس پہنچا، رفوگری کا کام بھی کرتا رہا اور سبق بھی پڑھتا رہا، اس کے بعد بغرض تحصیل علم حدیث
لانا حافظ عبدالمنان صاحب وزیر آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا، وہاں کتب درسیہ پڑھ کر سند
ل کی۔ یہ واقعہ ۱۳۰۷ھ مطابق ۱۸۸۹ء کا ہے اس کے بعد شمس العلماء سید نذیر حسین محدث دہلوی کی خدمت
ں حاضر ہوا۔ سند مذکور دکھا کر آپ سے اجازت تدریس حاصل کی، پھر سہارنپور چند روز قیام کرکے دیوبند پہنچا،
ہاں کتب درسیہ معقول و منقول ہر قسم پڑھیں، دیوبند کے بعد مدرسہ فیض عام کانپور میں جاکر داخل ہوگیا۔
ر مولانا احمد حسن مرحوم کے درس حدیث میں شریک ہوا، کانپور سے فارغ ہوتے ہی میں اپنے وطن پنجاب
نچا، مدرسہ تائید الاسلام امرتسر میں کتب درسیہ نظامیہ کی تعلیم پر مامور ہوا، طبیعت میں تجسس زیادہ تھا۔

اس لیے ادھر ادھر سے ماحول کے مطابق مذہبی حالات دریافت کرنے میں مشغول تھا۔ میری طبیعت طالب علمی ہی کے زمانہ میں مناظرات کی طرف بہت راغب تھی اس لیے درس و تدریس کے علاوہ میں ان تینوں (عیسائی، آریہ، قادیانی) کے علم کلام اور کتب مذہبی کی طرف متوجہ رہا بفضلہ تعالیٰ میں نے کافی واقفیت حاصل کرلی۔"

(ماخوذ اخبار اہلحدیث امرتسر محررہ ۲۲ جنوری ۴۳ء ۱۹)

کون جانتا تھا کہ خدائے قدیر نے مئو جیسے گمنام قصبہ میں جنم لینے والے اس بچے کو عام کاروباری گھرانوں کے ان بچوں جیسا نہیں بنایا ہے جو پروان چڑھ کر دنیائے دوں کے لیے تگ و تاز میں لگ جاتے ہیں بلکہ اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ برصغیر ہندو پاک میں اپنے اخلاق کریمانہ[1] کا ایسا جوہر اپنے دشمنوں کو بھی دکھائیں جیسا کہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم دکھاتے تھے اور اسلام پر عیسائی مشنریوں کی یورش کو روکیں، شریعت اسلام کو اعداء اسلام کے نرغے سے بچائیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی پر زبان گستاخ دراز کرنے والوں کا محاسبہ کریں اور اس شمع نبوت کو بجھنے نہ دیں جس کو فروزاں رکھنے کے لیے ائمہ محدثین، اولیاء اللہ اور مجددین دین نے اپنا خون تک بہا دینے سے گریز نہیں کیا تھا۔

جس وقت آپ نے آنکھیں کھولیں اس وقت حالت یہ تھی کہ ایک طرف پورے برصغیر میں آریوں نے مسلمانوں کے عقائد و مذہب کی مخالفت کے جوش میں "رنگیلا رسول" اور "ستیارتھ پرکاش" جیسی بیہودہ و لایعنی کتابیں ہی لکھکر پھیلانے پر بس نہیں کیا بلکہ ہر سو ہلچل مچا رکھی تھی، عیسائیت کے فتنے سر اٹھائے ہوئے تھے، اسی اثنا میں مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعویٰ کیا، نیچریوں نے دہریت کا شعلہ بھڑکایا، "خاکسار" تحریک کے بانی نے الگ راگ الاپا۔ بیشتر کو حکومت کی پشت پناہی اور معاونت بھی حاصل تھی اور انھوں نے کھلم کھلا اسلامی تعلیمات کا مضحکہ اڑایا اور اسلام کے مسلمات کا انکار کیا، ایسے پر آشوب و پرفتن دور میں مولانا نے اعداء اسلام کو للکارا اور پھر ہر میدان میں آریت، عیسائیت، مرزائیت اور ہندو مت کے علمبرداروں کو شکستیں دیں اور اسلام پر وارد کیے گئے اعتراضات کے دنداں شکن جوابات دیے۔

---

[1] آپ کے اخلاق کی ایک مثال: ۴ نومبر ۱۹۳۷ء کو اہلحدیث امرتسر کے ایک جلسے میں مولانا تشریف لے جا رہے تھے جلسہ گاہ پہنچ کر سواری سے اترے ہی تھے کہ ایک نوجوان مسمی قمر بیگ ولد نعمت بیگ نے ایک تیز دھار والے ہتھیار سے "یا رسول اللہ" کا نعرہ لگاتے ہوئے حملہ کیا جس سے سر پر سخت زخم آیا اور ایک کاری زخم ناک پر بائیں آنکھ کے کنارے لگا۔ حملہ آور اپنے ہمراہیوں کی مدد سے فرار ہو گیا، لیکن بعد میں گرفتار ہو کر جیل چلا گیا۔ وہ جب تک جیل میں رہا، اس کے بچوں کی کفالت مولانا خود کرتے رہے

برصغیر ہندوپاک میں اسلام کے اس مجدد اور مسلمانوں کے سب سے بڑے ترجمان نے جہاں غیروں کے ساتھ ہر محاذ پر جنگ لڑی اور ان کی طرف سے شریعت بیضا پر ہونے والے حملوں کا بھرپور جواب دیا وہیں مسلمان کہلانے والوں یعنی شیعوں، بریلیوں اور اہل قرآن کے بغض و حسد، کینہ و دشمنی کا بھی نشانہ بننا پڑا، لیکن اس مجدد وقت نے بڑی پامردی سے ان کا مقابلہ کیا اور غیروں کے ساتھ اپنوں کے بھی ان تمام اعتراضات کا جواب بھی دیتے رہے جو وہ مسلک اہلحدیث پر کرتے تھے۔

تقسیم ہند کے بعد ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کو آپ مع اہل وعیال لاہور چلے گئے، پھر کچھ احباب سا کنان گوجرانوالہ آپ کو لاہور سے اپنے یہاں لے آئے، مگر چونکہ آپ کو اپنے امرتسر والے پریس کے عوض سرگودھا میں ایک پریس الاٹ ہوا تھا اس لیے وسط جنوری ۱۹۴۸ء میں وہاں چلے گئے اور ۱۲ رفروری ۱۹۴۸ء کو آپ پر فالج کا حملہ ہوا اور سوا مہینہ صاحب فراش رہ کر ۱۵ رمارچ ۱۹۴۸ء بروز دوشنبہ بوقت صبح اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حدیث و تفسیر، فقہ و اصول اور جدل و مناظرہ میں آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں جو سب کی سب نہایت مفید اور اہل حق کے نزدیک مقبول ہیں، ان کا مختصر تعارف آپ کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں آپ کی صرف ان کتابوں کا تذکرہ کیا گیا ہے جو میری نظر سے گزر چکی ہیں، سہولت کے لیے تصانیف کی نوعیت کے لحاظ سے انھیں چند دائروں یا شاخوں میں تقسیم کرکے ایک ایک دائرے کی تصانیف الگ الگ ذکر کی جائیں گی۔

تصانیف در تردید 'آریہ مشن'

صفحات ۱۶ طبع اول ۱۹۰۳ء مطبع اہلحدیث امرتسر

۱۔ حدوث وید (اردو) علمائے یورپ کی تحقیق یہ ہے کہ آریہ قوم ایران سے ہندوستان میں آئی تھی، مگر دیانند جی کہتے ہیں کہ جب وید اسے نہیں مانتا تو دوسرے غیر ممالک کے باشندوں کی من گھڑت باتوں کو دانشور کبھی تسلیم نہیں کر سکتے، مولانا امرتسری نے اپنی کتاب میں علمائے یورپ کی تائید کرتے ہوئے "وید" کی قدامت کا ابطال بھی وید ہی کے ذریعہ کیا ہے۔

صفحات ۳۰ طبع اول ۱۹۰۴ء

(۲) رسالہ رکوب السفینہ[۱] فی مناظر النگینہ (اردو) مطبع اہلحدیث امرتسر

یہ کتاب اسی مناظرہ پر مشتمل ہے جو مولانا ثناء اللہ امرتسری اور ماسٹر آتما رام کے مابین ۵ رجون ۱۹۰۴ء سے ۱۴ رجون تک بمقام نگینہ ضلع بجنور ہوتا رہا۔ اس مناظرہ میں دس شرائط تھے جن میں سے دو شرطیں سب سے اہم تھیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں، اس کے بعد ناظرین کے لیے حکم کا فیصلہ بھی درج کیا جا رہا ہے۔

(۱) مباحثہ کی ابتدا الہام سے ہوگی پھر مسائل سے بحث ہوگی (۲) مباحثہ میں قرآن مجید وید یا فریقین کے مابین مسلمہ کتب منقولات اور دلائل عقلی پیش کیے جائیں گے۔ حکم کی رائے یہ ہے کہ "مدعی (آریہ سماج) کا دعویٰ ثابت نہ ہونے کی وجہ سے خارج اور اہل اسلام کا تمام خرچہ بذمہ آریہ سماج اور یہ آخری فیصلہ ہے لہٰذا کسی محکمہ میں اس کی اپیل نہ ہوگی۔

صفحات ۳۴، طبع اول ۱۹۰۴، مطبع اہلحدیث امرتسر

(۳) حدوث دنیا (اردو)

یہ کتاب اس مباحثہ پر مشتمل ہے جو مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ اور رسالہ ...جی ایڈیٹر "رسالہ آریہ مسافر ہردوار" کے مابین ہوا تھا، اس کتاب میں تکوین عالم اور اس کے قدیم و حادث ہونے پر مفصل طریقے سے بحث کی گئی ہے اور اس میں ان کی غلط فہمی کا بھرپور علاج ہے۔

صفحات ۱۶، طبع اول ۱۹۰۴ء مطبع اہلحدیث امرتسر

(۴) الہام (اردو)

اس کتاب میں الہام کی تعریف کرتے ہوئے وید اور قرآن کے الہام کی تعبیر کی گئی ہے اور ساتھ ہی دونوں کا فرق واضح کرتے ہوئے قرآن مجید کی افضلیت ثابت کی گئی ہے۔

صفحات ۱۸ طبع اول ۱۹۰۴ء مطبع اہل حدیث امرتسر

(۵) شادی بیوگان اور نیوگ[۲] (اردو)

شادی بیوگان کا مسئلہ آریہ سماج نے ہندوؤں میں جاری کرنا چاہا چنانچہ انھوں نے امرتسر میں ۵ راکتوبر ۱۹۰۴ء کو ایک اشتہار شائع کیا کہ ہم "بال بدوا ودوا...

---

[۲] نیوگ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے اولاد نہ ہوئی یا ہوئی ہو مگر ہونہار نہ ہو تو اولاد کی خاطر دوسرے مرد سے زنا کرائے۔

[۱] اس کتاب کی ترتیب حکیم ارتضیٰ علی صاحب ساکن نگینہ ضلع بجنور نے کی ہے۔

(غیر مدخولہ لڑکی کا نکاح ثانی) کے موضوع پر ہندو پنڈت سے بحث کریں گے اگر وہ ناجائز ثابت کردیں تو ہم مبلغ پانچ ہزار روپئے انعام دیں گے۔

اس کتاب میں مذکورہ مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے مولانا نے ثابت کیا ہے کہ جس طرح غیر مدخولہ کا نکاح ضروری ہے اسی طرح بیوگانِ مدخولہ کا نکاح بھی ضروری ہے یہ آریہ سماج کی نا سمجھی ہے کہ نصف حصہ (یعنی بیوگان غیر مدخولہ) کو مانیں اور نصف حصہ (یعنی بیوگانِ مدخولہ) کو چھوڑ دیں، اس کے بعد نیوگ کی تردید ویدوں اور آسمانی کتابوں سے کی ہے۔

صفحات ۴۰، طبع اول ۱۹۰۴ء

(۶) ترکِ اسلام بجواب ترکِ اسلام (اردو) مطبع اہلحدیث امرتسر

ایک صاحب بابو عبدالغفور[1] بی اے نے آریہ مذہب قبول کرکے اور دھرم پال نام اختیار کرکے تبدیلی مذہب کے وجوہات بیان کرتے ہوئے ایک سو پندرہ اعتراضات قرآن مجید پر کیے تھے اور مصنف ستیارتھ پرکاش کی طرح خوب جی کھول کر خدا کی پاک کتاب پر پھبتیاں کسی تھیں۔ یہ کتاب انہی اعتراضات کے جواب پر مشتمل ہے۔ اور قابل دید ہے

(۷) تغلیب الاسلام (اردو)

جلد اول:- صفحات ۱۰۰ طبع اول ۱۹۰۵ء مطبع اہلحدیث امرتسر
جلد دوم:- صفحات ۱۲۰ طبع اول ۱۹۰۵ء مطبع اہلحدیث امرتسر
جلد سوم:- صفحات ۷۴ طبع اول ۱۹۰۵ء مطبع اہلحدیث امرتسر
جلد چہارم:- صفحات ۷۶ طبع اول ۱۹۰۵ء مطبع اہلحدیث امرتسر

مذکورہ بالا کتب قرآن مجید پر ان اکیاسی اعتراضات کے جواب پر مشتمل ہیں جو مہاشے دھرم پال نے بذریعہ اپنی کتاب (تہذیب الاسلام - جو چار جلدوں میں ہے) کیے تھے۔ مہاشے جی نے اعتراضات کے ساتھ ساتھ

---

[1] بابو عبدالغفور صاحب بی اے موضع بھینوہ تحصیل گڑھ شنکر ضلع ہوشیار پور کے باشندے، قوم کے بافندے میاں جی سلطان محمد مرحوم کے بیٹے ہیں، مرحوم بڑے نیک دل اور سادہ طبیعت تھے، بدل مڈل تک تعلیم دے کر ان سے بیزار ہوگئے تھے، فرماتے تھے مجھے اس کے بگڑنے کا خطرہ ہے، آخر بابو صاحب کے بہنوئی منشی عزیزالدین نے ان کی تربیت کا ذمہ لیا مگر ایف اے کلاس پہونچنے تک برہمو ہوگئے لیکن بظاہر مسلمان۔ آخر ۱۴ر جون ۱۹۰۳ء کو کھلم کھلا آریہ بنکر بر ہمچاری دھرم پال بن گئے (بحوالہ ترک اسلام)

فحش گوئی اور بدکلامی سے بھی کام لیا تھا، جیساکہ شیخ الاسلام اپنی اس کتاب کی چوتھی جلد کے اخیر میں لکھتے ہیں کہ "آریہ سماج کے بانی دیانند جی نے جو بدکلامی اور دلآزاری آریہ سماج کی گھٹی میں بھری تھی (دیکھو دیباچہ تغلیب ج ۲) اس کا اثر پہلے تو پنڈت لیکھرام نے قبول کرکے اس کو اعلیٰ درجہ تک پہنچایا، گو لیکھرام کے زمانہ میں اس کی بدتہذیبی انتہائی درجہ پر معلوم ہوتی تھی، مگر یوں کہ ترقی کا زمانہ تھا اس لیے مہاشے دھرمپال نے اس سے بھی آگے قدم رکھا اور اپنے طریق عمل سے ثابت کردیا کہ آرین تہذیب ابھی اپنے آخری زینہ پر نہیں پہنچی۔"

صفحات ۱۹۲ طبع ۱۹۰۵ء مطبع اہلحدیث امرتسر

(۸) الہامی کتاب (اردو) یہ رسالہ وید اور قرآن کے الہامی کتاب ہونے کے سلسلہ میں صاحب کتاب اور ماسٹر آتمارام امرتسری کے مناظرہ پر مشتمل ہے۔ اس میں فریقین کے سوال و جواب من وعن منقول ہیں۔

صفحات ۴۲ طبع اول ۱۹۰۸ء مطبع اہلحدیث امرتسر

(۹) بحث تناسخ (اردو) یہ رسالہ اس مناظرہ پر مشتمل ہے جو مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری اور ماسٹر آتمارام جی آریہ امرتسری کے مابین ہوا تھا۔ اس میں تناسخ اور مادہ کے ابطال پر بحث ہوئی تھی اخیر میں ضمیمہ کے ذریعہ روح اور مادہ پر فلسفیانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات ۱۶، طبع اول ۱۹۰۹ء مطبع اہلحدیث امرتسر

(۱۰) سوامی دیانند کا علم و عقل (اردو) اس رسالہ میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دیانند جی دوسرے مذاہب پر اعتراض کرنے میں تحقیق و تدقیق اور علم و معرفت سے کام نہیں لیتے ہیں۔

صفحات ۱۰۲ طبع اول ۱۹۰۹ء مطبع اہلحدیث امرتسر

(۱۱) تبر اسلام (اردو) ایک رسالہ بنام "نخل اسلام" مہاشے دھرم پال نے ۱۹۰۹ء میں شائع کیا تھا جسب عادت اس میں اسلام اور مسلمانوں کی ایسی ہجو کی ہے کہ کوئی غیرت مند مسلمان اس کو پڑھنا بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی غیر مہذب رسالہ کے جواب میں یہ کتاب لکھی گئی ہے جو قابل دید ہے۔

صفحات ۹۲ طبع اول ۱۹۱۶ء مطبع راجپوت پرنٹنگ ورکس لاہور

(۱۲) مناظرہ جبل پور[1] **(اردو)** یہ کتاب اس مباحثہ پر مبنی ہے جو مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری اور

[1] اس کتاب کو تاج الدین صاحب مالک تاج پرنٹنگ ورکس جبل پور نے مرتب کیا ہے

مہاشے دھرم بیر جی ۔ آگرہ نواسی سے ۱۳ مئی ۱۹۱۵ء سے لے کر ۲ جون تک بمقام جبل پور ہزاروں آدمیوں کی موجودگی میں توحید فی الصفات اور روح و مادہ کے حادثات یا قدیم ہونے پر ہوتا رہا، جس میں آریہ سماج پر اسلام کی نمایاں فتح ہوئی

صفحات ۱۹ طبع اول ۱۹۲۳ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

(۱۳) رسالہ محمد رشی (اردو) اس رسالہ میں پیغمبر اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کا ثبوت وید، توریت اور انجیل سے دیا گیا ہے۔

صفحات ۸۰ طبع اول ۱۹۲۴ء مطبع آفتاب برقی پریس امرتسر

(۱۴) مقدس رسول (اردو) (بعد میں بہت سے ایڈیشن نکلے)

آریوں نے اپنے زہریلے رسالے مسمی "رنگیلا رسول"[1] (اردو) اور "ویچتر جیون" (ناگری) مصنفہ پنڈت کالی چرن، میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس اور ازواجِ مطہراتؓ پر سخت ناپاک اعتراضات کیے تھے، یہ کتاب ان کا معقول و مدلل جواب ہے۔

صفحات ۴۰ طبع اول ۱۹۲۵ء، مطبع برقی پریس امرتسر

(۱۵) نکاح آریہ (اردو) اس رسالہ میں آریہ دھرم کے مندرجہ ذیل احکام متعلقہ نکاح لکھ کر آریہ نوجوانوں کو نذر کیے گئے ہیں اور یہ امید ظاہر کی گئی ہے کہ نوجوانِ آریہ اسے بغور مطالعہ کر کے معقول پسندی کا ثبوت دیں گے۔

(۱) نکاح کی ضرورت اور غرض (۲) نکاح کس عمر میں ہو (۳) نکاح کس قسم کی عورت سے ہو، (۴) نکاح کے اقسام (۵) طریقہ نکاح (۶) میاں بیوی کے ملاپ کا طریق (۷) نکاح دائم اور غیر منفک عقد ہے یا قابلِ فسخ (۸) نکاحِ بیوگاں۔

صفحات ۵۴ طبع اول ۱۹۴۳ء مطبع ثنائی برقی پریس ہال بازار امرتسر

(۱۶) تحریف آریہ (اردو) سوامی دیانند جی کی وفات کے بعد ان کی کتاب "ستیارتھ پرکاش" مطبوعہ ۱۸۷۵ء میں آریوں نے حسب منشا تبدیلیاں کی ہیں، اس کے ایک باب کی جھلک اس کتاب (تحریف آریہ) میں دکھائی گئی ہے جیسا کہ شیخ الاسلام اس کتاب کے صفحہ ۲ پر لکھتے ہیں کہ "ستیارتھ پرکاش مطبوعہ ۱۸۷۵ء میں بارہ باب ہیں، ان میں سے صرف دسواں باب اس مقالہ کے لیے میں نے انتخاب کیا ہے، اس لیے انتخاب کیا کہ اس میں مسئلہ گوشت خوری خاص کر

---

[1] اس کتاب پر مصنف کا نام درج نہیں ہے، مولانا خود لکھتے ہیں "مجہول مصنف نے اپنا نام درج نہیں کیا" (دیباچہ مقدس رسول)

لحم البقر کھانے کا ذکر ملتا ہے، جس کو اردو ترجمہ میں بالکل حذف کردیا گیا ہے، پہلے کالم میں ۱۸۷۵ء کی اصل عبارت اصل لفظوں میں نقل ہے، دوسرے کالم میں ستیارتھ مطبوعہ ۱۸۷۵ء کی وہ عبارت نقل ہے جسے "مہاشے دھرم پال" (غازی محمود) بی اے نے آریہ ہونے کی حالت میں بحروف اردو شائع کیا تھا۔ تیسرے کالم میں ۱۸۷۵ء والی ستیارتھ پرکاش، کا صحیح ترجمہ، جسے ہم نے خود ایک پنڈت سے کرایا ہے، نقل ہے، چوتھے کالم میں آریوں کا مستند اردو ترجمہ درج ہے، ناظرین بغور مطالعہ فرمائیں۔"

صفحات ۲۶ طبع اول ۱۹۲۶ء مطبع برقی پریس امرتسر

(۱۷) **اصول آریہ** (اردو) اس رسالہ میں شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے مادہ، روح اور سلسلۂ کائنات کا حدوث دلائلِ عقلیہ سے ثابت کرکے آریوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کے نام نذر کیا ہے۔

صفحات ۳۲ طبع اول ۱۹۲۷ء مطبع آفتاب برقی پریس امرتسر

(۱۸) **ہندوستان کے دو ریفارمر** (اردو) اس رسالہ میں ہندوستان کے دو مدعیانِ اصلاح کی بدزبانیوں کے نمونے دکھلائے گئے ہیں (۱) سوامی دیانند جی۔ جو آریوں کے قائد و رہنما تھے (۲) مرزا غلام احمد قادیانی جو اپنے آپ کو نبی و رسول ہونے کا دعویٰ کرتے تھے، اس کتاب میں سوامی جی کی عبارتوں کے نواسی اور مرزا قادیانی کے عبارتوں کے بائیس اقتباسات نقل کرکے اس کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

صفحات ۱۹۲ طبع ۱۹۰۵ مطبع اہلحدیث امرتسر

(۱۹) **الہامی کتاب** (اردو) یہ کتاب "وید" اور قرآن مجید، کے الہامی کتاب ہونے کے سلسلہ میں مولانا ثناء اللہ امرتسری اور ماسٹر "آتمارام" امرتسری کے مناظرہ پر مشتمل ہے۔

صفحات ۴۰ طبع اول ۱۹۱۱ء مطبع اہلحدیث امرتسر

(۲۰) **جہاد وید** (اردو) اس رسالہ میں آریہ دھرم کی معتبر کتابوں سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ دنیا میں امن و شانتی قائم کرنے کے لیے جہاد کرنا ضروری اور لازم ہے اور اس دھرم کے ماننے والے اسے چھپاتے ہیں۔

صفحات ۴۰ طبع اول ۱۹۰۴ء مطبع اہلحدیث امرتسر

(۲۱) **نماز اربعہ** (اردو) اس رسالہ میں اسلامی، عیسائی، ہندوانہ اور آرین نمازوں کا مقابلہ کرکے اسلامی نماز کی بالدلائل فضیلت ثابت کی گئی ہے تاکہ حق تلاش کرنے والوں کو صحیح رہنمائی مل سکے۔

(۲۲) **القرآن العظیم** (اردو) صفحات ۲۳ طبع چہارم ۱۹۲۳ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

اس رسالہ میں بدلائل، قرآن مجید، یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن شریف ایک الہامی کتاب ہے اور "وید" وغیرہ غیر الہامی، اگر کسی آریہ کا یہ دعویٰ ہے کہ "وید" بھی الہامی ہے تو روزمرہ پیش آنے والے مسائل میں سے چند کا جواب مرحمت فرمائیں۔

(۱) رام کہتا ہے کہ میرے پاس ایک بیس سال کا لڑکا ہے اور سولہ سال کی لڑکی، میں چاہتا ہوں کہ ان دونوں کی شادی ایک ساتھ کردوں (۲) میرے پاس ایک جوان لڑکی ہے اور اس کی ماں مر چکی ہے۔ ابھی میں بھی جوان ہوں میں چاہتا ہوں کہ اسی سے اپنی شادی کرلوں کیا ایسا کرنا مجھے پرماتما کی اور (طرف) سے منع ہے؟ مجھے جواب الہامی کتاب سے چاہیے۔

(۲۳) **مناظرہ تحصیل دیوریا مابین اہل اسلام و دیانندی آریہ** (اردو)

صفحات ۲۸۴ طبع اول ۱۹۰۶ء مطبع مجتبائی لکھنؤ

یہ کتاب اس مناظرہ پر مشتمل ہے جو مولانا ثناء اللہ[1] صاحب امرتسری اور پنڈت درشنانند[2] صاحب عرف کرپارام جگرانوی کے مابین مورخہ ۱۶ اگست سے لے کر ۲۱ اگست ۱۹۰۳ء تک ہوتا رہا، موضوع مناظرہ یہ تھا کہ وید اور قرآن میں کون الہامی، سچ اور بہتر ہے؟

اس کتاب میں فریقین کے سوالات و جوابات من وعن مذکور ہیں ہر پڑھنے والا معمولی غور و فکر کرنے کے بعد حق و باطل کی تمیز کر سکتا ہے، اس کے شرائط مناظرہ میں سے ایک شرط یہ تھی کہ آریہ سماج مولوی صاحب کی بحث کی تردید قرآن اور قرآن کے مطابق جو کچھ کسی کتاب میں تحریر ہو ان سب سے اور عقلی دلائل سے بھی کرے گا۔

---

[1] آپ کے معاونین میں مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی، مولانا ابو محمد عبدالحق دہلوی، مولانا ابو رحمت حسن میرٹھی، مولانا شجاعت علی صاحب بریلوی، مولانا عبدالحمید صاحب پانی پتی تھے۔

[2] پنڈت جی کے معاونین میں منشی گردھاری لال صاحب، پنڈت لالتا پرشاد اگنی ہوتری، بسنت لال جی آریہ اپدیشک پنڈت نند کشور جی آریہ اپدیشک، پنڈت رودرت لال جی آریہ اپدیشک، بابو دیبی پرشاد صاحب آریہ مقام دیوریا تھے۔

مولوی صاحب آریہ لوگوں کی تردید صرف رگ وید، یجر وید، سام وید، اتھرو وید، ست گا تھاؤں، نیز کتب آریہ سماج سے کریں گے اور عقلی دلائل بھی پیش کریں گے۔ اس مناظرہ کے سن وقوع کے سلسلہ میں بہت سے شعر کہے گئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے۔

بے سرو پا آریہ گشتہ چو ہنگام بحث گفت احمد شرع با شکست فکر آریہ ،

۱۹۰۳ء

صفحات ۱۲ مطبع راجپوت پرنٹنگ ورکس لاہور

(۲۴) **قرآن اور دیگر کتب** (اردو) اس رسالہ میں قرآن، انجیل، اور وید، کا چند مسائل میں مقابلہ کرتے ہوئے یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جو انسان کی جملہ ضرورتیں پوری کر سکتی ہے۔

صفحات ۶۶ طبع اول ۱۹۱۸ء

(۲۵) **فتح اسلام یعنی مناظرہ خورجہ** (اردو) مطبع الیکٹرک پریس ہال بازار امرتسر

یہ کتاب اس تحریری مناظرہ پر مشتمل ہے جو مابین مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ اور مہاتمے شانتی سروپ جی اور بابو رام چندر جی دہلوی برابر تین دن یعنی ۱۹، ۲۰ اور ۲۱ مارچ ۱۹۱۸ء تک ہوتا رہا، اس میں موضوع مناظرہ یہ تھا۔ "مذہب حق کی تعریف اور اس کے معیار پر بحث" اس کتاب میں عقلی و نقلی دونوں دلائل پیش کیے گئے ہیں اور فریقین کی تحریر مع دستخط درج ہیں۔

صفحات ۲۲۴ طبع اول ۱۹۰۸ء

(۲۶) **حق پرکاش بجواب ستیارتھ پرکاش** (اردو) مطبع اہلحدیث پریس امرتسر

آریوں کے رہنما "سوامی دیانند جی" نے "ستیارتھ پرکاش" نامی ایک کتاب لکھی تھی، جس کے چودہویں باب میں قرآن شریف پر ایک سو انسٹھ اعتراضات کیے تھے۔ یہ کتاب انھی بیہودہ اور لایعنی اعتراضات کا مسکت جواب ہے۔

صفحات ۱۴۲ طبع اول ۱۹۳۰ء / ۱۳۴۹ھ

(۲۷) **کتاب الرحمٰن حصہ اول** (اردو) مطبع آفتاب برقی پریس امرتسر

پنڈت دھرم بھکشو، آریہ نے ایک کتاب لکھی جس میں بہت سے مضامین کے اندر وید اور قرآن کا مقابلہ کر کے بزعم خود وید کو قرآن پر ترجیح دی ہے۔ یہ کتاب اسی کا مفصل جواب ہے، پنڈت جی نے ایک سور پکی

تخلیق کی ہے جس کے جملے اور الفاظ تک صحیح نہیں مگر اسی کو قرآن کے چیلنج کا جواب بنایا ہے ، ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے ہم اس مصنوعی سورہ سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں اور اس کے بعد مولانا کا دلچسپ تبصرہ بھی ۔ پنڈت جی لکھتے ہیں ۔

السورۃ الحکمیہ المکتوبیۃ واللاھوریۃ وھی خمسۃ واربعون آیات

الف واو میم الحمد للہ الذی معبودنا یرزق من یشاء بحساب او ینظر اعمالنا بالقسطاط لنا فضل وعذاب انا ارسلتکم الی الارض مانوار و فیھا لکم استقرار کلوا واشربوا من کل رزق ما رزقت واسکنوا فی دار قرار یا ایھا الاریاء انتم من الانبیاء الاستغناء و اولیاء اللہ الذین یرسلون من السماء یوحی الیھم الوحی بالحکمۃ و ستفسار الیوم انزلت الیکم الوید من حکمتی وعلمی من یومن بہ ففی الجنۃ و المنکر فی لنار وللعائشۃ من المسلمات والشمس البازغۃ غیر ظلمات والبعیر اذ یتذکر القرآن و للائکۃ اجنحۃ والجان حق العقول نبیہ الفرقان والتبیان قد تبین الرشد و السلطان نی یکفر بہ فھو کالحیوان مشتملا علیہ الثقل والتخان یتضور ضجرا بما قال ما نذا الا خفقات والذین آمنوا وعملوا الصالحات لھم الروضۃ والرضوان بالروح ریحان یا ایھا الذین اسلموا انزل الیکم دیانند رسولا لیخرجکم من الظلمات الی نور مقبولا فاسلموا بالایمان وسلموا علیہ رسلنا الیک النبی بشیرا ورسولاً جعلنا، نسان حیات ورحمۃ وروح معقولاً۔

مولانا لطیفہ کے عنوان سے اس سورہ پر نہایت برمحل تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

عرصہ ہوا اردو کا ایک شاعر کسی بستی سے گزرا ۔ اس بستی میں بھی اساتذہ کلام رہتے تھے ، انھوں نے اس شاعر (عزت) میں ایک محفل مشاعرہ منعقد کی ان اساتذہ میں سے ایک نے طرح دی :

« بول رے بھیا ، بول رے بھیا ، بول رے بھیا . بول ! »

رے نے دوسرا مصرعہ لگایا :

« کنویں میں ڈالو ڈول رے بھیا ڈول رے بھیا ڈول ، »

سرے نے تیسرا مصرعہ لگایا : « ہاتھ سے رسی کھول رے بھیا کھول رے بھیا کھول »

اب یہ تینوں اس مہمان شاعر سے ملتجی ہوئے کہ جناب اس مثلث کو آپ رباعی فرمائیں، ہم آپ کے کلام سے مستفید ہوں گے، وہ نازک مزاج شاعر بھلا اس فصاحت و بلاغت کو کیا پہنچتا لاچار چوتھا مصرعہ یہ لگایا :

یہ صحبت نامعقولوں کی لاحول ولا لاحول ولا، لاحول "

غالباً پنڈت جی اسی بستی کے اساتذہ میں سے ہیں جنہوں نے یہ عربی نثر بمقابلہ قرآن شائع کی جس کا ایک ایک فقرہ مرقومہ مثلث سے ہزار درجہ ترقی یافتہ ہے ایک ایک فقرہ جواہر کی طرح چمک رہا ہے، غور تو فرمائیے۔

والبعیر اذ یتذکر القرآن۔ کیا ہی شاندار بلاغت ہے

اللہ رے ایسے حسن پہ یہ بے نیازیاں
بندہ نواز آپ کسی کے خدا نہیں!

آریہ سجنو!

اتنی لمبی عبارت تو کیا پنڈت جی کو اتنی بھی خبر نہیں کہ مذکر کی صفت مونث نہیں آیا کرتی، گر آپ جگہ جگہ "منوجی" کے حق میں "مقنن اول" کا لفظ لکھ کر ایسے مہا پرش کو مذکر سے مونث بناتے ہیں۔ •••

ص ۲۸ کا بقیہ : ان تصانیف میں اچھی باتیں اخذ کرنے میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں برتتے، ان کتابوں سے ہدایت کے طلبگار ہدایت پاتے ہیں اور ان کی ورق گردانی کرنے والے ان سے نفع اٹھاتے ہیں، منبروں پہ لوگوں کے سامنے ان کتابوں کے مقاصد و معانی بیان کیے جاتے ہیں، کنیسہ اور گرجا گھر کے لوگ ان کتابوں کے مسکت جواب سے خوف کھاتے ہیں۔ یہ کتابیں سنت کی راہ چھوڑ کر بدعت کی راہ اپنانے والوں کی حلق کا کانٹا ہیں۔ •••

---

۳۰ نومبر ۱۹۸۳ء کو مات

حرام کاری کے اڈے بند کرنے کا بین الاقوامی مطالبہ

اسلامی ممالک یعنی کویت، سوڈان لیبیا، ملیشیا، ترکی، ایران اور پاکستان نے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کو ایک قرارداد پیش کی جس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ حرام کاری کو بین الاقوامی طور پر ممنوع قرار دیا جائے۔ ۱۰۶ ممالک نے اس کی حمایت میں ووٹ دیا اور یہ قرارداد منظور کر لی گئی۔ مخالفت میں کوئی ووٹ نہیں پڑا، البتہ ۲۸ ممالک نے ووٹ نہیں دیا۔

نوٹ : ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ملحدوں کی سر توڑ کوشش کے باوجود انسان کی اخلاقی شعور و احساس رکھنے والی فطرت ابھی مردہ نہیں ہوئی ہے۔

مولانا اثری کی یاد اور حقائق

مولانا محمد مستقیم سلفی

ماہنامہ "آثار" مئو اعظم گڑھ، دسمبر ۱۹۸۳ شمارہ ۱۲ دیکھنے کا اتفاق ہوا مولانا ابو علی اثری صاحب کا مضمون بعنوان "اہلحدیث کانفرنس کے اجلاس منعقدہ مئو کی یاد" انتہائی دلچسپی اور غور سے پڑھا، وجہ یہ ہے کہ یہ مضمون ہمارے سلف صالحین (نور اللہ مرقدہم) کے حالات سے متعلق ہے، مولانا اثری صاحب نے اس مضمون میں مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری اور مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی رحمہما اللہ کے بارے میں چند ایسی عجیب و غریب باتیں لکھی ہیں، جنھیں پڑھ کر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ان میں سے چند اہم باتیں نقل کر کے میں قارئین کو حقیقت حال سے واقف کرانا چاہتا ہوں:

(۱) مولانا اثری صاحب صفحہ ۲۸ پر مولانا ثناء اللہ امرتسری اور مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی رحمہما اللہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "جماعت کے ان دونوں مایۂ صد ہزار ناز فخر و افتخار بزرگ حضرات میں بہت سے اوصاف مشترک تھے۔ ایک تو یہی کہ دونوں بے مثال اسلام کے داعی، مبلغ اور مناظر تھے۔ ایک کو رد آریت اور رد قادیانیت میں شہرت حاصل تھی اور وہ شیر پنجاب کے پر ہیبت لقب سے پکارے جاتے تھے اور مرزا غلام احمد قادیانی تو اس کا نام سن کر کانپ جاتا تھا اور دوسرے کو رد عیسائیت و رد نصاریٰ میں غیر معمولی مہارت اور شہرت حاصل تھی۔"

مولانا کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ رد آریت اور قادیانیت میں جو مہارت مولانا امرتسری کو حاصل تھی وہ مولانا میر سیالکوٹی کو نہ تھی اور رد عیسائیت میں جو مہارت مولانا میر سیالکوٹی کو حاصل تھی وہ مولانا امرتسری کو نہ تھی حالانکہ یہ بات صحیح نہیں۔ مولانا امرتسری کو جس طرح رد آریت اور رد قادیانیت میں مہارت و امامت حاصل تھی بالکل اسی طرح رد عیسائیت میں بھی مہارت و امامت حاصل تھی۔ اہل علم کے نزدیک یہ بات اس قدر معروف ہے کہ اس پر

کسی دلیل کی ضرورت نہیں، مولانا کا یہ ذوق دور طالب علمی ہی سے تھا۔ لکھتے ہیں۔

"میری طبیعت طالب علمی ہی کے زمانہ میں مناظرات کی طرف بہت راغب تھی، اس لیے درس و تدریس کے علاوہ ان تینوں (عیسائی، آریہ، قادیانیوں) کے علم کلام اور کتب مذہبی کی طرف متوجہ رہا۔ بفضلہ تعالیٰ میں نے کافی واقفیت حاصل کرلی۔" (اخبار اہلحدیث مجریہ ۲۲ رجنوری ۱۹۴۲ء)

رد عیسائیت میں مولانا امرتسریؒ کی تصانیف اور مناظرے اس قدر کثرت سے اور اتنے بلند پایہ ہیں کہ مولانا میر سیالکوٹیؒ کے یہاں اس کی مثال نہیں ملتی، رد عیسائیت میں مولانا امرتسری کی چند کتابوں کے نام درج ہیں تفصیل آئندہ میرے مستقل مضمون میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

(۱) ثنائی پاکٹ بک (۲) نماز اربعہ (۳) معارف قرآن (۴) اثبات التوحید (۵) تم عیسائی کیوں ہوگئے؟ (۶) رسالہ توحید، تثلیث اور راہ نجات (۷) اسلام اور مسیحیت (۸) تفسیر سورۂ یوسف اور تحریف بائبل، (۹) قرآن اور دیگر کتب (۱۰) اسلام اور پال کس (۱۱) تقابل ثلاثہ (۱۲) عصمت النبی وغیرہ۔

اور مناظرے کے بارے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس میدان میں مولانا امرتسری کے آنے کے بعد ہندوستان میں اسلام اور عیسائیت کے مابین تمام چوٹی کے مناظرے مولانا امرتسری ہی نے سر کیے۔ صرف چند مناظرے ذیل میں درج کیے جارہے ہیں۔

(۱) **مناظرۂ لاہور** ۱۹۱۰ء اس میں فریق مقابل عیسائیوں کا شیخ المنطق پادری جوالا سنگھ تھا اس نے اپنی ناکامی کا اعتراف خود کیا اور پورا عیسائی خاندان مسلمان ہوگیا۔

(۲) **مناظرۂ ہوشیارپور** ۲ رستمبر ۱۹۱۲ء یہ مناظرہ خاصا دلچسپ تھا، عیسائیوں کے شیخ المنطق پادری جوالا سنگھ صاحب مناظر تھے اور انھوں نے اپنا پورا سرمایۂ منطق داؤں پر لگا دیا لیکن نتیجہ حسرت و یاس کے سوا کچھ نہ رہا۔

(۳) **مناظرۂ گجرانوالہ** ۲۷، ۲۸ رفروری ۱۹۲۶ء کو انجمن اہلحدیث گجرانوالہ کا سالانہ جلسہ تھا، اسی جلسہ میں پادری محمد سلطان پال سے مسئلہ توحید پر مناظرہ ہوا، پادری صاحب کی شکست فاش سے متاثر ہوکر عین جلسۂ عام میں ایک عیسائی نے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا۔

(۴) **مناظرہ حافظ آباد** ضلع گجرانوالہ ۲، ۳ رستمبر ۱۹۲۸ء اس میں عیسائیوں کو اس بری طرح

منہ کی کھانی پڑی کہ عرصہ دراز تک تلملاتے رہے اور سر نہ اٹھا سکے

(۵) مناظرہ الہ آباد[1] ۴ ر ۵ ر اگست ۱۹۳۵ء اس میں عیسائی مناظر پادری عبدالحق تھا جو مولانا کی گرفتوں سے اس قدر بوکھلایا کہ اس نے خود کہہ دیا کہ ہم الوہیت مسیح کے قائل نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائی صفوں میں کھلبلی مچ گئی اور مسلمان اپنی شاندار فتح پر شاداں وفرحاں واپس ہوئے یہ مناظرہ بڑا معرکہ خیز تھا اور اسے ہندوستان میں اسلام اور عیسائیت کے درمیان سب سے اہم، زبردست اور فیصلہ کن مناظرہ تسلیم کیا گیا ہے، اس کا فائدہ بہت دوررس ثابت ہوا۔ (ماخوذ از فتنۂ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ امرتسری، تالیف مولانا صفی الرحمٰن اعظمی)

خلاصہ یہ کہ مولانا اثری صاحب نے رد عیسائیت کے باب میں مولانا میر سیالکوٹی کو مولانا امرتسری پر جو برتری عطا کی ہے وہ امر واقعہ کے خلاف ہے، بلکہ یہ تقابل ہی سرے سے عجیب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں بزرگ چوٹی کے عالم تھے اور ہر ایک اپنے اپنے رنگ میں نرالا تھا۔

(۲) مولانا اثری صاحب نے آگے دوسری حیرت ناک بات یہ لکھی ہے کہ و لیکن ایک میدان میں دونوں میں بڑا بعد تھا اور وہ میدان شعر و شاعری کا تھا، اس میں ایک کو یعنی مولانا ثناء اللہ امرتسری کو بالکل دخل نہ تھا اور دوسرا صدفی صد متقشف اہلحدیث ہونے کے باوجود اپنے تمام کمالات و فضائل کے ساتھ شاعر بھی تھا اور میر تخلص کرتا تھا۔

---

[1] اس مناظرے کا پس منظر انتہائی دلچسپ ہے وہ یہ کہ اس وقت الہ آباد کے باشندے سب کے سب بریلوی تھے۔ جب عیسائیوں کی تبلیغ سے مسلمانوں کا نوجوان طبقہ عیسائیت کی طرف مائل ہونے لگا تو مسلمانان الہ آباد بہت پریشان ہوئے اور ان کا ایک گروپ اپنے پیرومرشد مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے پاس گیا اور ان سے حالات بتلانے کے بعد عیسائیوں سے مناظرہ کرنے کی درخواست کی اور بہت اصرار کیا، جب پیرومرشد کسی طرح تیار نہ ہوئے تو وہ لوگ دیوبند گئے اور شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے سامنے الہ آباد کے حالات اور اپنے پیرومرشد کے انکار کا تذکرہ کرتے ہوئے عیسائیوں سے مناظرہ کرنے کی درخواست کی۔ اہل دیوبند بھی مقابلے میں آنے سے کترا گئے، ایسے نازک وقت میں شیخ الہند نے شیر پنجاب مولانا ثناء اللہ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ کو خط لکھ کر الہ آباد کے حالات اور عیسائیوں کے مقابلے میں علماء دیوبند و بریلوی کے نہ آنے کی اطلاع دی، اور لکھا کہ اگر اسلام کی لاج رکھنی ہے تو فوراً الہ آباد پہنچو، چنانچہ شیر پنجاب الہ آباد آئے اور بحمد اللہ اس مناظرے میں انھیں شاندار فتح و کامیابی نصیب ہوئی۔

جو ... کے واجب الاحترام نام کا جزو لاینفک تھا۔ اور مولانا سید سلیمان ندوی کی روایت ہے کہ فرط اتباع سنت میں مولانا ثناء اللہ کا شعر کہنا تو درکنار اردو و فارسی کا کوئی شعر بھی ٹھیک سے نہیں پڑھتے تھے۔

مولانا اثری صاحب کا یہ پورا کا پورا بیان غلطہائے مضامین کا مجموعہ ہے امر واقعہ یہ ہے کہ دونوں بزرگوں میں سے شاعر کوئی بھی نہ تھا، لیکن علامہ امرتسری کو شعر کا بے حد ذوق تھا جبکہ مولانا میر سیالکوٹی کو اس سے بالکل مس نہ تھا۔ مولانا امرتسری کا ذوق ان کی تحریروں میں دیکھا جاسکتا ہے، ان تحریروں میں اردو فارسی اور عربی اشعار قدم قدم پر نگینے کی طرح کثرت سے فٹ ہیں کہ مولانا ابو الکلام آزاد کے علاوہ بڑے بڑے ارباب قلم اور اصحاب ذوق کے یہاں اس کی مثال ملنی مشکل ہے، جن لوگوں نے ان کی تقریریں سنی ہیں ان کا بیان ہے کہ دوران تقریر بھی ان کی شعر خوانی کا حال یہی ہوا کرتا تھا اور صرف اجلاس عام کی تقریروں ہی میں نہیں بلکہ نجی مجلسوں میں بھی مولانا کا یہ ذوق شگفتگی پیدا کیے رہتا تھا۔

مولانا امام خاں نوشہروی اپنے مقالہ بعنوان "حیات ثنائی" میں لکھتے ہیں کہ "میں امرتسر ملازم خدمت ہوا۔ شعر کہنے کی مجھے بھی اسی قدر وحشت ہے کہ ؎

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مگر مولانا اطال اللہ عمرہ کی شعر بندی کے سامنے میری یہ تگ و پو گرد ہے کہ ممدوح اس باب میں بھی مصداق ہیں اس قول غالب کے ؎

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

فرمایا کہ جب مضمون میں شعر لکھتا ہوں، تم مرے سامنے آجاتے ہو گویا ؎

آج ساقی نے مجھے قطرے سے دریا کر دیا

(حوالہ اخبار اہلحدیث امرتسر ۲۰ رمضان ۱۳۶۱ھ مطابق ۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء)

یہاں یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ مولانا اگرچہ شاعر نہ تھے اور نہ شعر و شاعری پر تنقید کرنا ان کا موضوع تھا لیکن ان کے ذوق لطیف کا حال یہ تھا کہ وہ ضمناً بڑے بڑے اساتذۂ فن کی خامیاں ظاہر فرما دیتے تھے اور کبھی کبھی ان کی اصلاح بھی کر دیا کرتے تھے۔

(۱) مولانا اپنی تالیف "کتاب الرحمٰن" ص ۴۸ پر جس کا ذکر اسی شمارہ میں دوسری جگہ ہے اپنے مقا...

کو مخاطب کر کے لکھتے ہیں کہ :

کلام کے تین درجے ہوتے ہیں ..... دوسرا درجہ یہ ہے کہ کلام اس زبان کے قواعد صرف و نحو کے مطابق اور محاورات کے موافق ہو مگر بلاغت سے گرا ہوا، اس کی مثال میں ایک بڑا پسندیدہ شعر آپ کو سناتے ہیں جو عام طور پر آج کل قومی و سیاسی جلسوں اور جلوسوں میں پڑھا جاتا ہے وہ یہ ہے ۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

یہ شعر اردو قواعد و محاورات کے بالکل مطابق ہے اور پسندیدہ اتنا ہے کہ اس پر اعتراض کرنے سے خطرہ ہے کہ ورد طعن نہ بننا پڑے، حقیقت یہ ہے کہ یہ شعر باوجود صحیح ہونے کے بلیغ نہیں ہے کیونکہ؟ اس لیے کہ اس کے الفاظ میں تناسب نہیں ہے۔ "سرفروشی" کے مقابل "خریدار" کی ضرورت ہے قاتل کی نہیں۔ پھر یہ کیا تناسب ہے ہم سرفروش ہیں قاتل کی تلاش ہے، یہ تو ایسی بات ہوئی جو کہے کہ میں سر سے ننگا ہوں مجھے بوجھ کی ضرورت ہے۔ ہاں اس کو بلیغ بنانے کے لیے یوں ترمیم کی جائے گی ۔

سر کٹانے کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

بلکہ سر کٹانے کے ساتھ قاتل کا لفظ مناسبت رکھتا ہے۔

یک اور مثال مولانا امرتسری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی متعدد تالیف میں ایک شعر یوں لکھا ہے ۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں۔

معلوم نہیں یہ شعر کس کا ہے اور کیسا ہے، مگر ماہر القادری صاحب نے ایک بار مولانا کی کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ یہ شعر اصلاً یوں ہے :

تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم مسرور بیٹھے ہیں۔

اگر واقعی یہ شعر اسی طرح ہے تو مولانا امرتسری کی ترمیم ایک استادانہ اصلاح ہے، کیونکہ مسرت کی حالت میں اٹکھیلیاں اور شوخیاں تو پسند آتی ہیں، لیکن بیزاری اور دل گرفتگی کے عالم میں شوخیاں اور اٹکھیلیاں سخت ناگوار اور ناپسند معلوم ہوتی ہیں۔

سید سلیمان ندوی کی طرف مولانا کے شعر پڑھنے کے سلسلے میں جو روایت منسوب کی گئی ہے اس میں بہر حال کچھ ہوا ہے، عین ممکن ہے کہ سید صاحب نے وہ بات مولانا سیالکوٹی کے بارے میں کہی ہو۔ یا خود راوی کی چوک اور تصرف ہو۔

یہ بھی عرض ہے کہ مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی رحمۃ اللہ علیہ اپنے نام کے ساتھ میر کا لفظ بطور تخلص نہیں لگاتے تھے بلکہ نسل اور خاندان کی وجہ سے لکھتے تھے، آپ کے خاندان کے سب لوگ آج بھی اپنے نام کے میر لکھتے ہیں، جیسا کہ یوپی وغیرہ میں لوگ اپنے نام کے ساتھ سید، خاں، انصاری، صدیقی وغیرہ لکھتے ہیں۔

(۳) مولانا اثری نے اسی ضمن میں ایک حیرتناک بات سید سلیمان صاحب ندوی کی طرف یہ بھی منسوب کی ہے کہ

انھوں نے صہبائی کے مجموعہ کلام کے [1] چمنستان کے تبصرہ میں ایک موقع پر لکھا ہے کہ عام طور سے مشہور ہے کہ اہلحدیث شاعر اور شیعہ حافظ نہیں ہوتے، لیکن دو شاعر مستثنیٰ ہیں، ایک غالب و ذوق کے معاصر جناب مومن جو حضرت سید احمد شہید کے سلسلہ کے آدمی اور غیر مقلد اور اہلحدیث تھے اور دوسرے ابھی موجودہ دور کے عبد السمیع پال اثر صہبائی جو اہل حدیث ہونے کے باوجود بہت اچھے شاعر بھی ہیں۔ (ایضاً آثار ص ۴۴)

ہم نے سید صاحب کا یہ بیان دیکھا نہیں، البتہ مولانا اثری پر تعجب ہے کہ انھوں نے اسے تائیدی انداز میں کیسے نقل فرمایا ہے، ہم انھیں یاد دلانا چاہتے ہیں کہ مظہر جانجاناں بھی اہلحدیث تھے، علامہ حالی بھی اہلحدیث تھے، بسمل سعیدی اہلحدیث تھے، عظیم آباد کے کئی چوٹی کے شاعر اہلحدیث تھے، اور آپ ہی کے ضلع میں آپ سے چند میل کے فاصلے پر رہنے والے جناب فضا ابن فیضی بھی اہلحدیث ہیں جو اس دور کے چوٹی کے بین الاقوامی شعراء میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ نے انھیں کیسے بھلادیا۔ مولانا اثری خود کہا کرتے ہیں کہ علامہ اقبال سہیل اہلحدیث تھے، معلوم نہیں موصوف نے انھیں کیسے بھلا دیا۔ ان سے بعد کی سطح کے جن شعراء کو دوسرے حلقوں میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے، اس سطح کے شعراء اہلحدیثوں میں ڈھونڈئیے تو ہر طرف بکھرے ملیں گے۔ اصل یہ ہے کہ اہلحدیث جماعت اپنے کارناموں کے لحاظ سے ایک عجیب غریب دست در ماغ جماعت گزری ہے مگر حسد سے لبریز "تاریخ سازوں" نے اس کی کردار کشی کی جو مہم صدیوں سے چلا رکھی ہے مولانا کا مولہ بیان اسی کا ایک ادنیٰ سا پرتو ہے جس پر جماعت اہلحدیث نہیں بلکہ وہ طبقہ لائق ملامت ہے جو آنکھوں پر پٹی باندھ کر تاریخ سازی کر رہا ہے۔

(۴) مولانا اثری نے ایک اور حیرتناک بات یہ بھی لکھی ہے کہ:

"...... اپنی عمر میں پہلی اور آخری دفعہ مسٹر محمد علی جناح کو بھی دیکھا جو اس وقت تک قائد اعظم کے پرفخر لقب،

[1] آثار میں کے کے کی تکرار یوں ہی ہے، نیز صہبائی کے مجموعہ کلام کا نام خمستان ہے، مگر آثار میں چمنستاں ہی چھپا ہے۔

ے پکارے نہیں جاتے تھے۔ یہ خطاب تو ان کو تحریک پاکستان کے شباب میں ان کی قوم یعنی مسلمانوں نے نہیں گاندھی جی نے دیا تھا جو بعد میں ان کے نام کا جزو لاینفک ہوگیا۔"

(آثار مذکور ص ۴۳)

مولانا کے اس بیان میں دو تاریخی سہو ہے، ایک یہ کہ جناح صاحب کو قائد اعظم کا لقب گاندھی جی نے نہیں بلکہ علامہ اقبال مرحوم نے ۱۹۳۷ء کے اپنے اس تاریخی مکتوب میں دیا تھا جس میں مسٹر جناح سے مسلمانوں کی قیادت سنبھالنے کی گزارش کی تھی، دوسرے یہ کہ تحریک پاکستان کا شباب ۱۹۳۷ء کے بہت بعد ہوا تھا، ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی، اور شباب اس کے بھی کچھ عرصہ بعد اس وقت آیا تھا جب ۱۹۴۵ء ۱۹۴۶ء کے الیکشن کو تقسیم ملک کے سلسلے میں استصواب کا درجہ دیدیا گیا تھا۔ ●●●

اسلامی ممالک کی دولت کدھر جارہی ہے۔

بین الاقوامی بینک کی آخری رپورٹ میں بتلایا گیا ہے کہ پٹرول کی آمدنی ۴۷،۱۰ کھرب ڈالر تک پہنچ چکی ہے جو حسب ذیل ترتیب سے خرچ ہو رہی ہے۔

۱۴،۳۰ کھرب ڈالر تعمیرات اور پراجیکٹوں کے لیے بین الاقوامی بینک کو عطیات کی صورت میں دیا جاتا ہے۔

۷،۲۰ کھرب ڈالر ترقی پذیر ممالک کو قرض اور عطیات کے طور پر دیا جاتا ہے

۱۴،۱۰ کھرب ڈالر یورپ اور امریکہ کے بینکوں میں بطور امانت جمع ہوتا ہے۔

۱۱،۱۰ کھرب ڈالر یورپی منڈی کی تحویل میں دیا جاتا ہے۔

۲۴،۴۰ کھرب ڈالر دوسری پیداوار میں صرف ہوتا ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ عالم اسلام کی دولت سے اصل فائدہ یورپ اور امریکہ والے اٹھا رہے ہیں، حالانکہ چاہیے یہ تھا کہ یہ دولت عربی اور اسلامی بینکوں میں جمع ہو۔ عالم اسلام کے تعمیری اور ترقیاتی پراجیکٹوں میں لگائی جائے۔ ترقی پذیر اسلامی ممالک کو قرضے دیے جائیں اور ان سے صنعت و حرفت اور سائنس و ٹکنالوجی میں عالم اسلام کو خود کفیل بنانے کی کوشش کی جائے۔ دیکھیے ہمارے حکمرانوں کو کب ہوش آتا ہے۔

مناظرہ جو نہ ہوسکا

مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری

رام گنج، دیناجپور (مغربی بنگال) کا ایک قدرے معروف مقام ہے جو بنگلہ دیش کی سرحد سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے، اس سے ملحقہ مواضعات میں تھوڑے سے اہلحدیث ہیں، کچھ دیوبندی اور عموماً بریلوی، معلوم ہوتا ہے کہ بنگال اور مشرقی بہار کے عام مقامات کے برخلاف رام گنج کے علاقے میں سید احمد شہید اور ان کے خلفاء کے داعی اور مناد نہیں پہنچ سکے تھے اسی لیے اہلحدیث بہت تھوڑے ہیں۔ اور جتنے ہیں عموماً نئے ہیں۔ یہاں کی تاریخ اہلحدیث مختصراً یوں ہے۔

رام گنج (مغربی دیناج پور) سے کوئی دو میل جنوب میں ایک گاؤں مالن گچھ ہے، یہاں کے دو فرد خاصے مشہور ہیں۔ ایک قاری ابوالحسن صاحب محمدی اور دوسرے ان کے بھتیجے مولوی محمد اللہ سلفی۔ یہاں مسلک اہلحدیث کا تعارف اور آغاز جناب قاری ابوالحسن صاحب سے ہوا۔ موصوف کے والد اس علاقے میں بریلوی پیروں کے سب سے بڑے میزبان تھے۔ چھوٹے بڑے تمام پیر جو اس دیار میں آتے تھے ان کے یہاں ضرور قیام کرتے تھے اور اس طرح خود ان کو بھی ایک بلند پایہ پیر جیسی عظمت اور اہمیت حاصل تھی انھیں شوق ہوا کہ اپنی اولاد کو بھی عالم بنائیں۔ چنانچہ اپنے صاحبزادے قاری ابوالحسن صاحب کو قرآن حفظ کرایا، پھر حکم دیا کہ اجمیر شریف جاؤ خواجہ صاحب کو نذرانے پیش کرو اور ان سے اپنے علم وفضل کی ترقی کی استدعا کرو۔ قاری ابوالحسن صاحب اپنے والد کی اس آرزو کی تکمیل کے لیے عازم سفر ہوئے۔ دہلی اترے تو خیال ہوا کہ یہاں کے مدارس میں بنگال بلکہ خاص ضلع دیناجپور کے طلبہ ضرور ہوں گے، کیوں نہ یہاں چند دن قیام کرلیں، پھر آگے بڑھیں گے۔ مگر موصوف کو کسی خاص مدرسے کا نام معلوم نہ تھا، رکشے والے سے کہا مجھے کسی مدرسے میں پہنچا دو۔ اس نے مولانا عبدالستار رحمانی امیر عزبار (؟) اہلحدیث کے مدرسے میں پہنچا دیا۔ قاری صاحب کو علم ہوا کہ "وہابیوں" کا مدرسہ ہے تو بڑے شش وپنج

میں پڑھے۔ مگر خاموشی کے ساتھ پڑھتے رہے، جمعہ کا دن تھا خطبے میں مولانا عبدالستار صاحب نے قرآن واحادیث سے شرک وقبر پرستی کی تردید کی۔ قاری صاحب متاثر بھی ہوئے اور متعجب بھی۔ ترجمہ قرآن سے تقابل کیا تو تراجم اور مطالب صحیح نکلے، پھر اس ماحول میں کچھ ایسی کشش پائی کہ اجمیر جانے کے بجائے وہیں مقیم ہو گئے۔ اور چھ ماہ وہیں گزارے اس دوران الحمد للہ حق اچھی طرح سمجھ میں آگیا اور وہ قبر پرستی سے تائب ہو کر پختہ اہلحدیث ہو گئے۔ اس کے بعد مدرسہ بحانیہ الہ آباد میں داخل ہوئے۔ جہاں فن قرأت کی تکمیل کے علاوہ الہ آباد بورڈ سے عالم کا امتحان بھی پاس کیا اور علامہ رفیق سے عربی ادب کی تعلیم بھی حاصل کی۔ اس دوران اہلحدیث طلبہ خصوصاً قاری عبدالرشید صاحب خانجہانپوری اور قاری عبدالمنان صاحب شنکر نگری کی رفاقت رہی تعلیم کی تکمیل کے بعد بحکم وانذر عشیرتك الاقربین۔ گھر والوں کے سامنے حق کا اظہار کیا۔ اور آزمائش شروع ہو گئی۔ علاقے میں دسیوں جگہ ملازمت اختیار کی، مگر حق کے اختیار واظہار کی پاداش میں ہر جگہ ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ تاہم موصوف نے حق کی تبلیغ جاری رکھی۔ نتیجۃً والد اور گھر کے دوسرے افراد اہلحدیث ہو گئے اور اب تک گاؤں اور قرب وجوار کے بھی کوئی دو سو افراد اہلحدیث ہو چکے ہیں اور قبر پرستی سے تائب ہونے والوں کی تعداد خاصی بڑی ہے اور اب قاری صاحب کوئی پانچ برس سے خاص رام گنج کی جامع مسجد میں بچوں کو تعلیم دے رہے ہیں۔ مدرسہ کا نام بحر العلوم ہے اور انتظام خود قاری صاحب کے اپنے موافقین کے ہاتھوں میں ہے۔

مولوی محمد اللہ سلفی جو قاری صاحب موصوف کے بھتیجے ہیں، یتیم الطرفین ہیں، یعنی بچپن ہی میں والدین کا سایہ اٹھ گیا تھا، قاری صاحب نے کفالت کی اور تبلیغ دین کی مہم کو آگے بڑھانے کے لیے ان کی تعلیم پر خاص توجہ دی، چنانچہ موصوف نے کئی برس ہمارے جامعہ سلفیہ میں زیر تعلیم رہ کر فراغت حاصل کی، اور اس کے بعد مدینہ یونیورسٹی میں داخل ہوئے، جہاں سے پچھلے سال تعلیم مکمل کرنے کے بعد اب الفجیرہ (متحدہ عرب امارات) میں داعی کی حیثیت سے جانے والے ہیں ـــ ان شاء اللہ ـــ موصوف بھی اپنے علاقے میں نور توحید پھیلانے کی کوشش میں سرگرم ہیں اور چچا بھتیجے کی کوشش سے علاقہ روشن ہو رہا ہے۔ کئی دیو بندی عالم بھی اس علاقے میں موجود ہیں۔ اور اہلحدیث اور دیو بندی حضرات کا مشترکہ پلیٹ فارم بنا ہوا ہے اور الحمد للہ کہ گرد ونواح کی داخلی اور خارجی کوششوں کے باوجود بنا ہوا ہے۔

" ۔یہی علاقہ اور یہی ماحول ہے جس میں بریلوی اور غیر بریلوی علماء کے درمیان ۱۵ر جنوری ۱۹۸۰ء کو ایک فیصلہ کن مناظرہ ہونا طے پایا تھا لیکن وہ ملتوی ہی نہیں بلکہ منسوخ ہو گیا۔ واقعات کا خلاصہ مختصراً درج ہے۔

مولوی محمد اللہ فاضل مدینہ ہونے کے سبب بریلوی عوام و خواص میں بھی قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اور اس لیے انھیں تبلیغ حق کے زیادہ مواقع میسر ہیں، یہ بات مقامی بریلوی علماء کو کھلتی ہے اور وہ میلاد و قبر پرستی جیسے مسائل کو ہمیشہ چھیڑتے رہتے ہیں، ادھر ایک مقامی بریلوی مولوی شمس الہدیٰ نے کچھ دن سے جگہ جگہ یہ اعلان کر رکھا تھا کہ ۳۱ دسمبر ۱۹۸۳ء مولوی محمد اللہ سے مناظرہ کرنے جاؤں گا۔ پھر ۳۱ دسمبر کو اس شخص نے مولوی محمد اللہ کے گاؤں مالن گچھ میں ایک مجلس میلاد منعقد کرائی اور تقریر کا آغاز ان جملوں سے کیا وہ اجڑ جائے وہ گھر جس میں میلاد نہ ہو۔ کافر ہے وہ شخص جو میلاد نہ کرے، شیطان ہے وہ شخص جو میلاد سے روکے، پھر تقریر جو شروع ہوئی تو تقریر کیا تھی اچھا خاصہ گالی نامہ تھا۔ وہاں کے سبھا پتی ڈاکٹر محمد اسماعیل (اہلحدیث) نے رقعہ بھیجا کہ تم نے مناظرے کا اعلان کیا ہے اس لیے گالی گلوج کے بجائے مناظرہ کرو۔ مگر جواب کے بجائے اس کی گالیوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر اسماعیل نے پیغام بھیجا کہ میں ملنا چاہتا ہوں مگر اس نے ملنے سے انکار کر دیا اس کے بعد ایک نئے اہلحدیث نے جا کر مطالبہ کیا کہ تم گالی بکنے کے بجائے قرآن سے میلاد ثابت کرو، اس نے کہا میں بھاگوں گا نہیں بلکہ میلاد ختم کر کے مناظرہ شروع کروں گا مگر خاتمہ میلاد پر اعلان کر دیا کہ مناظرہ یہاں نہیں بلکہ رام گنج میں صبح ۹ بجے ہوگا۔ مگر دوسرے دن وہ شخص مد مقابل نہ آیا بلکہ اہلحدیث کی طرف سے جو اعلان مناظرہ ہو رہا تھا، اسے روک کر کہا ہم بیس دن کے بعد مناظرہ کریں گے، آج کا اعلان نہ کرو۔ اس پر فریقین سے لوگوں نے کہا جب تم میلاد نہ کرنے والوں کو کافر اور شیطان کہتے ہو اور قرآن و حدیث سے اسے ثابت بھی کرنے کا دعوی کرتے ہو تو یہ ثبوت ابھی دکھانے سے کیوں بھاگتے ہو۔ اس پر وہ شخص پسینہ پسینہ ہو گیا پھر انچل (گرام سماج) کے ذمہ داروں نے کہا کہ اب ہم مناظرہ کرائیں گے۔ چنانچہ انچل (گرام سماج) کی عمارت میں فریقین کے ذمہ دار افراد اور مقامی علماء اسی وقت جمع ہوئے اور تیرہ سوالات مرتب کر کے ان کے بارے میں دونوں فریق کا موقف لکھوایا اور طے کیا کہ جن سوالوں کے جوابات مختلف ہیں ان پر ۱۵ جنوری ۱۹۸۴ء کو فریقین میں مناظرہ ہوگا اور دونوں کو اپنی اپنی بات کا ثبوت قرآن یا حدیث یا اجماع یا قیاس سے دینا ہوگا۔ ان سوالات و جوابات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

جواب منجانب اہلحدیث و دیوبندی	سوالات	جواب منجانب بریلوی
شرعاً اس کی کوئی حیثیت نہیں	چہلم فاتحہ [1] کا جلسہ شرعاً کیا حیثیت رکھتا ہے؟	جائز و مباح و مستحسن ہے

[1] آئندہ صفحہ پر

قرآن و حدیث سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے	(۲) میلادِ مروجہ و قیام قرآن و حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟	جائز و مباح و مستحسن ہے۔
نہیں ہے	(۳) قبر پر چادر چڑھانا جائز ہے یا نہیں؟	جائز ہے
حضور ہم جیسے بشر ہیں قرآن و حدیث سے اس کا ثبوت ہے	(۴) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم جیسے بشر ہیں یا نہیں؟	حضور افضل البشر ہیں۔
نہیں ہے	(۵) بارہ ربیع الاول کی فاتحہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟	ہے
زندہ ہیں ؎	(۶) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبر میں زندہ ہیں یا نہیں؟	زندہ ہیں۔
نہیں لے سکتے ہیں۔	(۷) لا الہ الا اللہ کے بعد حالتِ بیداری میں غیر کا نام لے سکتے ہیں یا نہیں؟	نہیں لے سکتے ہیں۔
نہیں کہہ سکتے ہیں	(۸) یا رسول اللہ عقیدۂ غیب کے ساتھ کہہ سکتے ہیں یا نہیں؟	کہہ سکتے ہیں۔
نہیں تھا	(۹) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غیب تھا یا نہیں؟	تھا
نہیں ہے	(۱۰) قبر میں اذان دینا قرآن و حدیث سے ثابت ہے یا نہیں؟	ہے
چاروں امام برحق ہیں جو کر گئے ہیں درست ہے۔ ؎	(۱۱) چاروں امام برحق ہیں یا نہیں وہ جو کر گئے وہ درست ہے یا نہیں؟	چاروں امام برحق ہیں وہ جو کر گئے ہیں درست ہے
بدعت ہے جو کام خیر القرون میں نہ ہوا ہو بدعت ہے	(۱۲) جو کام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں نہ ہوا ہو اس کو ابھی کرنا کیسا ہے؟	جو شریعت کے مطابق ہو جائز ہے
مسلمان ہے	(۱۳) جو میلاد مروجہ و قیام نہیں کرتا ہے مسلمان ہے یا نہیں؟	مسلمان ہے۔

چار دلیلوں سے ان مسائل کو ثابت کیا جائے گا۔ قرآن، حدیث، اجماع، قیاس۔

حاشیہ اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمایئے۔

چونکہ دونوں فریق نے نمبر ۲ نمبر ۷ اور نمبر ۱۱ و نمبر ۱۳ کے ایک ہی جواب دیے تھے اس لیے انھیں چھوڑ کر مناظرے کے لیے صرف باقیماندہ ۹ سوالات ہی موضوع بحث رہ گئے۔ بہرحال مناظرہ طے کرکے فریقین باہر نکلے تو بریلوی عوام تالیاں پیٹ رہے تھے کہ اب وہابیوں کی درگت بنے گی۔ مگر نجی محفل میں جب مقامی علماء نے ان موضوعات پر مناظرہ کرنے سے اپنی بے بسی کا اظہار کیا تو انھیں کسی قدر مایوسی ہوئی۔ تاہم انھوں نے حوصلہ نہ ہارا۔ جھٹ پھیلانے پر چندہ شروع کیا، اور ارشد القادری سمیت تمام بریلوی جغادریوں کی خدمت میں پہنچنے کا فیصلہ کیا۔ یہ صورت حال دیکھ کر اہلحدیث و دیوبندی فریق نے مناسب سمجھا کہ وہ بھی اپنا کوئی عالم بلالیں۔ پھر

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

مولوی محمد اللہ اس مہم کے لیے بنارس تشریف لائے اور آتے وقت یہ اعلان کر دیا کہ ہمارے فلاں استاد جنھوں نے بجرڈیہہ میں مناظرہ کیا تھا انھی کو بلانے جارہا ہوں۔ بریلوی فریق کو اس کا علم ہوگیا اور انھوں نے اپنے جغادری علماء کے دریافت کرنے پر بتایا کہ دوسری طرف سے فلاں شخص کو بلایا جارہا ہے۔ پھر کیا تھا، ہر ایک نے مناظرے میں آنے سے انکار کر دیا، گویا ؎ نام میرا سن کے مجنوں کو حیا آگئی ؛ بید مجنوں دیکھ کر انگڑائیاں لینے لگا

پچھلے صفحات کے حاشیے: ۔ [1] چلہ خانہ کی توضیح یہ ہے کہ اس علاقہ میں ایک جنگل تھا جس میں ایک مسلمان کی بھی ایک قطعہ زمین تھی۔ ۴۷ء میں تقسیم ملک کے بعد شرنارتھیوں کی آمد ہوئی تو رفتہ رفتہ جنگل تقریباً ختم ہوگیا اور انھوں نے منجملہ دیگر اراضی کے مسلمان کی اس زمین پر بھی قبضہ کرنا چاہا جس پر فریقین میں تنازعہ کھڑا ہوا۔ ہندوؤں نے ایک درخت کا نام کشن جوگ رکھ کر وہاں ایک پتھر رکھا۔ اور اس پر کچھ پھول، سیندور پانی وغیرہ گرا کر کہا یہاں ہمارے بھگوان نے تپسیا کی ہے ہم اسے نہ چھوڑیں گے جواباً ایک مسلمان نے کچھ لوگوں کو لے کر وہاں مرغے بکرے وغیرہ ذبح کیے اور کہا یہاں ہمارے پیر نے چلہ کیا ہے ہم نہ چھوڑیں گے۔ پھر عدالت سے مسلمان کو ڈگری بھی مل گئی، ادھر ذبیحہ اور چڑھاوا نے بعد ترقی کی، اب درخت ہے ایک آستانہ نما دیوار ہے، جہاں نذرانے اور پیسے وغیرہ مسلسل تو پہنچتے ہی ہیں۔ سال میں ایک دن عرس کی شکل کا جلسہ بھی ہوتا ہے، لوگ اولاد اور مختلف مرادوں کے لیے نذریں مانتے ہیں اور جلسے کے دن بڑی دھوم دھام سے چڑھاوے چڑھاتے ہیں، مرغے بکرے، بیل وغیرہ ذبح ہوتے ہیں، شیرینی بتاشے چڑھتے ہیں مرادیں مانگی جاتی ہیں اور آستانے کو سجدہ بھی کیا جاتا ہے۔ یہ ہی چلہ خانہ ہے۔

[2] حیات برزخی مراد ہے۔

[3] جواب دیوبندی نقطہ نظر سے ہے، کیونکہ اہلحدیث کے ساتھ وہ بھی شریک تھے۔ اہلحدیث کے نزدیک یہ قدرے تفصیل طلب ہے۔

مولوی محمد اللہ واپس گئے تو سنا کہ بریلوی حضرات کہتے ہیں ۔ اب کی بار تو ہم مناظرہ جیت ہی لیں گے ۔ اگر کوئی صورت نہ ہوئی تو مار پیٹ کر ہی جیت لیں گے ۔ موصوف کو فکر دامن گیر ہوئی اور انھوں نے پاس پڑوس کے اضلاع میں جہاں اہلحدیث آبادی کثرت سے ہے چکر لگا کر لوگوں کو صورت حال سے مطلع کیا ۔ اس سے پورے علاقے میں جوش و خروش پھیل گیا اور انھوں نے وعدہ کیا کہ ہم بڑی تعداد میں آئیں گے اور ہر صورت حال کا مقابلہ کریں گے ۔ اس دوران رام گنج سے پچیس تیس میل کے فاصلے تک ہر طرف مناظرے کی دھوم مچ چکی تھی ۔ اور یہی ہر طرح کی مجلسوں کا موضوع بن چکا تھا ۔ بریلوی حضرات کو اہلحدیثوں کے مذکورہ جواب کا علم ہوا تو ان کا " انا اکثر منک مالا و اعز نفرا " کا غرور ٹوٹ گیا ۔ دلوں پر رعب طاری ہوگیا ، اور انھوں نے در پردہ دوڑ دھوپ شروع کردی ، ہمیں مناظرہ بجرڈیہہ کا تجربہ ہے کہ یہ حضرات حکام سے مل کر کس طرح اپنی ذلت کے اسباب کا مداوا کرتے ہیں ، وہی یہاں بھی ہوا ۔ ضلع حکام جو مناظرے کے اندر خود شریک ہونے کا وعدہ کر چکے تھے اور فورس کا بھرپور انتظام کرنے کا یقین دلا رکھا تھا انھوں نے جمعرات ۱۲ جنوری ہی سے فریقین کو بلا کر پوچھ گچھ شروع کردی اور بالآخر یہ فیصلہ سنایا کہ مناظرہ نہیں کرنے دیا جائے گا ۔

۱۳ جنوری کو میں مولانا عابد حسن رحمانی ایدہ ایک طالب علم ابو المکرم بنارس سے روانہ ہوکر ۱۴ جنوری کی صبح کشن گنج اترے تو مولوی محمد اللہ اور ایک اور صاحب استقبال کے لیے موجود تھے ۔ انھوں نے بتایا کہ دوسرے فریق کا کوئی عالم آنے کے لیے تیار نہ ہوا اور ضلع حکام نے کل ہی مناظرے کی اجازت منسوخ کردی ہے ۔ ہم رام گنج پہنچے تو دوسرا فریق مناظرے کی منسوخی کا اعلان کر رہا تھا ۔ یہ خبر بھی اگرچہ ہر طرف پہنچا دی گئی تھی تاہم ۱۵ جنوری کو دور دراز کے ہزارہا افراد رام گنج پہنچے اور مایوس واپس لوٹے ۔ بعض وفود بنگلہ ضلع مالدہ تک سے آئے تھے ، جو بے نیل و مرام واپس ہوئے ہم نے بھی شکار حاصل کیے بغیر شام تک رخت سفر باندھا ۔

ص ۵ سے آگے

بات طویل بھی ہے اور المناک بھی ۔ ہم زخم کو گہرائی تک کریدنے کے بجائے صرف اس کی ظاہری پپڑیوں کو دکھلا کر عرض کرنا چاہتے ہیں کہ یہ صحت کی علامت نہیں ، بلکہ فساد خون کی علامت ہے ۔ لہذا مخلصین امت کو یہ سوچنا چاہیے کہ اس فساد کا سرچشمہ کہاں ہے ؟ اور اسے کیونکر بند کیا جا سکتا ہے ؟ اللہ ہمارا حامی و ناصر ہو اور عجز و نیاز مندی اور جذبۂ بندگی کے ساتھ اپنے دین متین پر چلنے اور اس کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے ، آمین ۔

عالمِ اسلام

افغانستان

ابوہشام اعظمی

افغان مقاومت ترقی پذیر ہے۔ قندھار میں روسی کنٹرول ختم ہو چکا ہے۔ بگتیا کے ہوائی اڈے اور دوسرے اہم مراکز پر مجاہدین کا قبضہ ہے۔ روسی فوجیں اپنی قیام گاہوں میں محصور ہیں اور ٹینک اور آرمرڈ گاڑیوں کی حفاظت کے بغیر باہر نہیں نکل سکتیں، کسی روسی قافلے کے لیے مجاہدین کی ضرب سے بچ کر اپنے ٹھکانے تک پہنچنا مشکل ہو گیا ہے۔ کابل میں پچھلے دس مہینوں سے تقریباً ہر رات توپوں اور راکٹوں کی گھن گرج سنائی پڑتی ہے، جن کا نشانہ روسی سفارتخانہ اور وزارتِ دفاع کے مراکز ہوتے ہیں۔ دیہی علاقے مجاہدین کے کنٹرول میں ہیں جن کا رقبہ کل افغانستان کا ۸۰ فیصد ہے، گوریلا مقابلوں میں مارے جانے والے روسی کارمل فوجیوں کی تعداد مجاہدین شہدا کے بالمقابل عموماً دس گنا زیادہ ہوتی ہے۔ بلکہ بکثرت مقابلوں میں مجاہدین کا کوئی بھی آدمی ہلاک نہیں ہوتا، البتہ روسی طیارے عوامی آبادی پر وحشیانہ بمباری کرتے ہیں جس سے عورتوں، بچوں، بوڑھوں وغیرہ کی بڑی تعداد ہلاک ہو جاتی ہے۔ امیر المجاہدین عبدرب الرسول سیاف نے عرب اخبارات کو دیے گئے اپنے ایک حالیہ انٹرویو میں بتایا ہے کہ روسی جلادوں کی نسل کشی کی مہم کے نتیجے میں اب تک ۱۲ لاکھ افغان باشندے جامِ شہادت نوش کر چکے ہیں۔

لبنان:

لبنان کے سنی مسلم عوام کے علاوہ باقی سارے فریقوں کا منشا یہ تھا کہ وہاں سے فلسطینیوں کو نکال دیا جائے۔ طرابلس سے یاسر عرفات کی روانگی سے یہ مقصد حاصل ہو گیا۔ اس وقت لبنان مختلف طاقتوں کے درمیان اس طرح تقسیم ہے۔ نصف سے زائد شمالی لبنان شام کے کنٹرول میں ہے۔ دریائے اوّلی سے سرحدِ فلسطین تک جنوبی لبنان اسرائیل کے کنٹرول میں ہے۔ وسطی لبنان یعنی مشرقی بیروت اور اس سے مشرق و شمال کا تھوڑا سا علاقہ لبنانی حکومت اور فلانجسٹوں کے کنٹرول میں ہے۔ اور اسرائیل اور لبنانی حکومت کے زیرِ اثر علاقوں کے درمیان

واقع شوف کی پہاڑیاں دروزیوں کے زیر کنٹرول ہیں، مغربی بیروت پر کثیر الاقوام فوج کی نگرانی ہے، اور وہاں پر لبنانی حکومت کا کسی نہ کسی حد تک عمل دخل ہے، شوف کے مغربی دامن میں مغربی بیروت سے دریائے اولی تک ساحلی پٹی کا علاقہ لبنانی حکومت اور دروز کے درمیان کشمکش کا سبب بنا ہوا ہے۔ ایک تو یہاں غیر دروزی ہی یعنی مسلم اکثریت ہے، دوسرے اگر اس پر موجودہ لبنانی حکومت قائم ہو جائے تو چونکہ وہ فلانجسٹوں ہی کے چہرے کا دوسرا رخ ہے اس لیے فلانجسٹ دستے اس پٹی اور اس کے واسطے سے جنوبی لبنان اور شوف کے مشرق میں واقع لبنانی علاقوں پر قابض ہو کر دروزیوں کو محصور کر دیں گے اور ساری دنیا سے ان کا رابطہ کٹ جائے گا، اسی لیے دروزی کسی قیمت پر اس ساحلی پٹی پر لبنانی حکومت کا کنٹرول قائم نہ ہونے دیں گے۔

دوسری طرف ستمبر ۱۹۸۲ء میں بیروت سے فلسطینیوں کو نکال کر اسرائیل اور اس کے سرپرستوں نے سمجھا تھا کہ ان کی مہم تمام ہو گئی، مگر اسی وقت سے لبنانی مسلمانوں نے یہودی قبضہ گیروں کے خلاف جو کارروائی شروع کر رکھی ہے اس نے اسرائیل کی ساری خوشیاں اور خوش فہمیاں ختم کر دی ہیں۔ شوف کی پہاڑیوں میں اس کے گشتی دستوں پر ہر رات حملے ہوتے تھے، اس میں اتنے یہودی فوجی مارے گئے کہ ان کی تعداد جنگ کے دوران مرنے والے فوجیوں سے زیادہ ہو گئی ہے۔ اس صورتحال سے تنگ آکر اپنے سرپرستوں کی منشا کے خلاف اور خود اپنے اس متکبرانہ اعلان کے خلاف کہ جب تک شامی فوجیں پیچھے نہ ہٹیں گی ہم بھی نہ ہٹیں گے۔ اسرائیل نے اپنی فوجیں اچانک دریائے اولی تک پیچھے ہٹالیں اور ۶ یہودی قیدیوں کے عوض انصار کیمپ کے کوئی چار ہزار لبنانی اور فلسطینی باشندوں کو آزاد کر دیا، کیوں کہ اسرائیلی فوجیں انھیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتیں۔

اسرائیل کو توقع تھی کہ شوف کی پرخطر پہاڑیوں سے پیچھے ہٹ کر اس کی فوجیں محفوظ ہو جائیں گی مگر لبنانی مقاومت کا یہ محاذ بھی اسرائیلیوں کے ساتھ صیدا کے علاقے میں منتقل ہو گیا اور روزمرہ گوریلا کارروائیاں ہونے لگیں۔ ۴ نومبر ۱۹۸۳ء کو صور کا اسرائیلی فوجی ہیڈکوارٹر کار بم کے ذریعہ اڑا دیا گیا، جس میں اسرائیلی ریڈیو کے بقول ۲۹ اور دوسرے ذرائع کے بقول ۲۰۰ یہودی مارے گئے۔ اس کے بعد اسرائیل نے نہر اولی کے دو پل بند کر دیے اور تیسرے پل پر زبردست پہرہ لگا دیا۔ مگر اس سے کوئی فرق نہ آیا، اسرائیلی فوج جب بھی گشت پر نکلتی ہے کوئی نہ کوئی کارروائی اس کے خلاف ضرور ہوتی ہے، جس سے اسرائیلی فوجیوں کے حوصلے بری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ستمبر ۱۹۸۲ء سے ستمبر ۱۹۸۳ء تک شوف میں اور اس کے بعد سے اب تک صیدا کے علاقے میں جو لوگ

کارروائیاں کرتے رہے ہیں اسرائیل کو ان کی نوعیت تک کا پتہ نہ لگ سکا تھا اور دنیا سمجھ رہی تھی کہ یہ شیعہ ملیشیا کے آدمی ہیں۔ مگر حالیہ مہینوں میں ایک کھلی ٹکر کے دوران تین مسلمان حملہ آور شہید ہوگئے جو "الاخوان المسلمین" سے تعلق رکھتے تھے، اس وقت معلوم ہوا کہ یہ کارروائیاں سنی مسلمان انجام دے رہے ہیں۔

بہرحال اب اسرائیلی سیاستدانوں کا مشورہ ہے کہ اسرائیلی فوجیں صیدا سے پیچھے ہٹ جائیں، یعنی نہر اولی کے بجائے نہر زہرانی کے جنوب میں چلی جائیں، لیکن مشکل یہ ہے کہ صیدا میں ان کی جگہ لبنانی فوج نہیں پہنچ سکتی کیونکہ بیچ میں دروز حائل ہیں اور سعد حداد کی ملیشیا میں اتنی طاقت نہیں کہ صیدا پر اپنا کنٹرول قائم کرسکے۔ کیونکہ جب یہاں اسرائیلیوں کی درگت بن رہی ہے تو سعد حداد کی ملیشیا کے چت ہونے میں کتنی دیر لگے گی اور اگر صیدا کو جہاں ڈیڑھ لاکھ سنی ہیں، اسرائیل کی فوجیں یوں ہی بے انتظام چھوڑ کر پیچھے ہٹ جائیں تو یہ لبنانی مقاومت کا ایک آزاد اور مضبوط مرکز بن جائے گا، جہاں سے مکمل تیاریوں کے ساتھ اسرائیلی فوجوں پر اور زیادہ حملے ہونے لگیں گے غرض اس وقت لبنانی مقاومت نے ایک طرف مسلمانوں کے لیے صحیح شاہراہ روشن کر دی ہے اور عزائم کو سینوں میں بیدار کردیا ہے تو دوسری طرف اسرائیل کا حال یہ ہے کہ ؎

نہ ٹھہرا جائے ہے اس سے نہ جایا جائے ہے اس سے

حال ہی میں اس کویت خبر رساں ایجنسی "کونا" کا ایک نمائندہ خفیہ طور سے مقبوضہ لبنان پہنچا۔ اور لبنانی مقاومت کے ایک ذمہ دار حمزہ ابوہاشم سے تفصیلات دریافت کیں جسے البلاغ (کویت شمارہ ۷۱۲) نے شائع کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مقاومت میں سب طبقے شامل ہیں اگر جوان ضرب لگاتے ہیں تو بوڑھے مرد اور عورتیں انھیں چھپانے بچانے اور سامانِ ضرورت فراہم کرنے کا کام کرتی ہیں۔

●●●

ٹیٹو کا ترکہ (کمیونسٹ مساوات)

اخبار لوپوان نے ذکر کیا ہے کہ جب یوگوسلاویہ کے سابق صدر ٹیٹو کے ترکے کا جائزہ لیا گیا تو اس میں منجملہ اور سامانوں کے ایک ٹن یعنی ایک ہزار کلو سونا برآمد ہوا۔ جو اینٹوں کی شکل میں ڈھلا ہوا تھا۔

نوٹ: یہ ہے کمیونسٹ ممالک میں انسانی مساوات اور برابری کی حقیقی تصویر، جہاں مزدور طبقہ اپنے گھر میں ایک ٹن کیا چند تولہ سونا رکھ لے تو بھی گردن زدنی مجرم ہے۔ ...

خوشخبری :

ریاستی جمعیۃ اہلحدیث مشرقی یوپی کے زیر اہتمام ۱۲، ۱۳ مئی ۱۹۸۴ء مطابق ۱۰، ۱۱ شعبان ۱۴۰۴ھ بروز شنبہ، یکشنبہ کو قصبہ بھدوھی ضلع بنارس میں ایک مثالی صوبائی کانفرنس منعقد ہوگی۔ انشاء اللہ۔ احباب اس کانفرنس کو تبلیغ حق کے لئے ایک سنگ میل کی حیثیت دینے کی کوشش میں ابھی سے لگ جائیں۔

عبد الحفیظ سانی، ناظم ریاستی جمعیۃ اہلحدیث، مشرقی یوپی
B. 18/19 ریوڑی تالاب، وارانسی

انتخاب جمعیۃ اہلحدیث مالیگاؤں :

۱۶ دسمبر ۸۳ء کو جمعیۃ اہلحدیث مالیگاؤں کا نیا انتخاب ہوا: (۱) امیر: الحاج محمد عمر مقادم (۲) نائب امیر: الحاج عبد الرحمن سردار (۳) ناظم اعلی: فیضی محمد انور عبد الوکیل (۴) نائب ناظم: عبد الودود محمد رمضان (۵) خازن: الحاج عبد الرحمن عبد اللطیف۔

ضروری تصحیح :

محدث دسمبر ۸۳ء کے ص ۲۳ سطر ٦ کی عبارت میں ایک فروگذاشت ھے لھذا عبارت اسطرح پڑھی جائے "مولانا سید ابو الاعلی مودودی نے تفہیم القرآن کے ایک چوتھائی حصہ کا کام جیل ھی میں کیا" مولانا زکریا پرتاب گڑھی فیضی صاحب نے یہ تصحیح مدھو پور سے بحوالہ "۵ – اے ذیلدار پارک" ص ۱۳۱ بھیجی ھے۔ شکریہ!

ضرورت ملازمت :

میں امامت و خطابت اور بچوں کی تعلیم کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دے سکتا ہوں۔ پتہ ذیل پر مراسلت فرمائیں:

محمد عباس کانپوری، موضع میر پور، پوسٹ سڈھیا مئو. ضلع بارہ بنکی (یو، پی)

FEB. **MOHADDIS** 1984
THE ISLAMIC CULTURAL & LITERARY MONTHLY MAGAZINE
AL-JAMIATUS SALAFIAH (AL-MARKAZIYAH) VARANASI (INDIA)

Published from Markazi Darul-Uloom
Printed by Abdul Waheed
At Salafiah Press, Reori Talab, Varanasi.

محدث

مرکزی دارالعلوم سلفیہ بنارس کا دینی علمی تبلیغی ماہنامہ

ادارۃ البحوث الاسلامیہ والدعوۃ والافتاء بالجامعۃ السلفیہ
بنارس - الہند

برگ وبار

صفحہ

جامعہ سلفیہ کا علمی ادبی اور اصلاحی رسالہ

ماہنامہ

محدّث

جمادی الاخریٰ سنہ ۱۴۰۴ھ
مارچ سنہ ۱۹۸۴ء
جلد: ۳ شمارہ: ۳

مرکزی دارالعلوم (جامعہ سلفیہ) کا پوسٹ بکس نمبر تبدیل ہوگیا ہے۔ لہذا جو لوگ پوسٹ بکس نمبر کے حوالے سے خط وکتابت کریں وہ پتہ اسطرح لکھیں۔

مرکزی دارالعلوم پوسٹ بکس نمبر ۱۰۱۹ بنارس
P. O. Box No. 1019 VARANASI U. P. (INDIA)

• ناشر: جامعہ سلفیہ بنارس • طابع: عبدالوحید • مطبع: سلفیہ پریس بنارس

پتہ

خط وکتابت کے لیے: ایڈیٹر محدث، جامعہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس
بدل اشتراک کے لیے: مکتبہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، بنارس
MAKTABA . SALAFIA . REORI TALAB , VARANASI , 221010
ٹیلی گرام: "دارالعلوم" وارانسی • ٹیلی فون: ۶۳۵۷۷

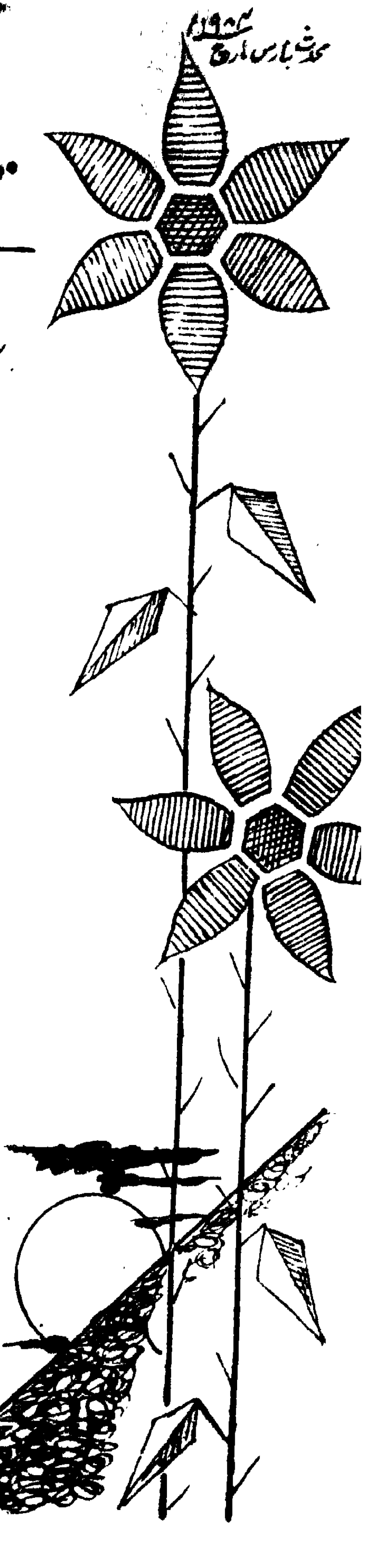
• بیرونِ ملک سے سالانہ: ۱۵ ڈالر

(۵)

تزئین وکتابت

یہاں خار و گل میں شعور ہے

صوفی نذیر احمد کاشمیری



•

بجواب اقبال[1] : بجلیاں ہیں زلزلے ہیں، قحط ہیں آلام ہیں
کیسی کیسی دُخترانِ مادرِ ایام ہیں!

•

تری آنکھ کا یہ فتور ہے جو جہاں میں نقص و قصور ہے
ہو گنہ سے پاک تو دیکھ پھر کہ حیات عین سرور ہے
دلِ زنگ خوردہ کی تیرگی ہے محیط عقل و حواس پر
یہ یقیں سے جان کہ چار سو میں یقیں کا نورِ ظہور ہے
ہے ہوس معارضِ مصلحت، ہے خودی منافیٔ عبدیت
تری بے خودی ہے بقا تری، یہ غیوب عین حضور ہے
ہے بنارِ عقل و خردِ جہاں، یہ نہیں جنوں کدۂ ہوس
یہاں برگ و بار میں ہوش ہے، یہاں خار و گل میں شعور ہے
شب و روز ادائے صلوٰۃ و صوم ادائے فرضِ حیات ہو
فقط اس پہ قانع نہ ہو کبھی "پس پردہ کوئی ضرور ہے"
ہے حیات منزلِ جاوداں پہ طویل عرصے سے گام زن
وہی زیچ پیچ کے پہنچ سکا جو مطیعِ داعیٔ طور ہے۔

•

[1] صوفی صاحب علامہ اقبال کو حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کے بعد دوسرا اسلامی شاعر مانتے ہیں لیکن وہ علامہ موصوف کے مذکورہ شعر کو رحمت و ربوبیت اور عدلِ الٰہی کی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ صوفی صاحب کی نظم کی بنیاد یہی ہے۔

نقشِ راہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایمان کی ایک علامت!

کچھ شخصیات ایسی ہوتی ہیں جن کی صحبت ایمان کی تازگی اور خدا شناسی کا ذریعہ ہوتی ہے اور ان سے عقیدہ و عمل کی دنیا کو جذبے اور ولولے نصیب ہوتے ہیں۔ اس وقت ہماری رسائی کے دائرے میں صوفی نذیر احمد صاحب کاشمیری کی شخصیت ایسی ہی ہے۔ موصوف جامعہ ملیہ اسلامیہ — جس پر غیر اسلامیت کی چھاپ نمایاں ہے — کے شمال مغربی گوشے کے آخری کمرے میں قیام پذیر ہیں۔ اسی لیے جب کبھی دہلی جانا ہوتا ہے تو موصوف کی خدمت میں حاضری کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔

۳۱؍ جنوری ۱۹۸۴ء کی سہ پہر ایسے ہی ایک موقع سے راقم الحروف، مولانا عبدالمعید، مولانا اشفاق احمد اور مولانا عبدالواحد (فاضلان مدینہ یونیورسٹی) کے ہمراہ صوفی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، کئی گھنٹے تک مختلف موضوعات پر گفتگو ہوئی جسے ترتیب دیا جائے تو ایک اچھا خاصا انٹرویو تیار ہو جائے گا۔ لیکن فی الحال اس محفل کی صرف دو تین جھلکیاں ہدیۂ قارئین کرنی مقصود ہیں۔

صوفی صاحب کچھ ہی دنوں پہلے پاکستان کے سفر سے واپس تشریف لائے تھے۔ ناگزیر تھا کہ اس خصوص میں متعدد سوالات کیے جاتے۔ صوفی صاحب کے جوابات سے واضح تھا کہ اصلاحِ خلق، اتحادِ امت اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کا جو مقصد موصوف کے وجود کا جزو لاینفک بن چکا ہے، اس کی کامیابی کے لیے وہاں کی فضا بڑی سازگار بھی اور مختلف سطح کے لوگ صوفی صاحب کو روک بھی رہے تھے۔ ہم نے کہا: پھر آپ رک کیوں نہیں گئے؟ فرمانے لگے میں نے خدا سے عہد کر رکھا ہے کہ ہندوستان کو کلمہ لا الٰہ الا اللہ پڑھاؤں گا یا اسی سرزمین پر شہادت حاصل کروں گا۔ صوفی صاحب کی اس مومنانہ عزیمت نے ہمارے سست رو وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔

باتوں باتوں میں مولانا سیالکوٹی اور مولانا امرتسری کا ذکر آ گیا۔ صوفی صاحب نے اُس دور کا ایک واقعہ سنایا جب متحدہ ہندوستان کی تقسیم کے لیے کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاسی کشمکش شباب پر تھی۔ فرمانے لگے میں امرتسر مولوی ثناء اللہؒ کے پاس پہنچا۔ دور سے آتا دیکھ کر کسی قدر ظریفانہ انداز میں کہنے لگے، آہا، خصر جماعت آ رہے ہیں۔ قریب پہنچا تو کہنے لگے۔ کدھر سے آ رہے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں؟ مقصد کیا ہے؟ میں نے مغرب کی طرف اشارہ کر کے کہا، ادھر سے آ رہا ہوں اور مشرق کی طرف اشارہ کر کے کہا ادھر جا رہا ہوں، منزلِ مقصود آپ کا قبلہ و کعبہ ورد ھا ہے۔ دریافت کیا مقصد کیا ہے؟ کہا کلمہ پڑھانے جا رہا ہوں، کہنے لگے: طاقت ہے؟ میں نے قدرے درشت لہجے میں کہا لاحول ولاقوۃ الا باللہ العلی العظیم۔ یہ طاقت نہیں ہے۔ یہ سننا تھا کہ مولانا امرتسری کو جیسے زور کا جھٹکا لگا۔ ظرافت ایکدم کافور ہو گئی۔ سارا وجود سنبھل، اور سکڑ گیا۔ کہنے لگے: صوفی صاحب، ہم لوگوں میں ایسی ایمانی طاقت کہاں؟۔ ہم لوگ تو منطق اور فلسفے کی عقلیات میں پھنس کر رہ گئے ہیں۔

اس کے بعد صوفی صاحب نے اُسی دور کا ایک اور واقعہ سنایا۔ فرمایا کہ دہلی مفتی کفایت اللہ صاحب کے پاس پہنچا، انھوں نے قرآن کی آیتیں پڑھ پڑھ کر منطق فلسفے کے زور سے کانگریس کی حمایت کو شرعاً برحق ثابت کرنے کے لیے نان اسٹاپ تقریر شروع کر دی۔ خاصی طول بیانی ہو چکی، تو میں نے کہا دو منٹ چاہتا ہوں۔ وقت دیا گیا تو میں نے کہا کہ اگر یہ سارے دلائل قیامت کے دن اللہ تعالیٰ یہ کہہ کر آپ کے منہ پر مار دے کہ جس بات کا تمھیں خود یقین نہیں تھا، اس کا یقین دوسروں کو دلانے کی کوشش کیوں کر رہے تھے؟ تو آپ کا کیا جواب ہوگا؟ بس میری یہ بات سننی تھی کہ موصوف کی ساری تقریر یکلخت بند ہو گئی۔ پیچھے سے پگڑی کا شملہ پکڑ کر آنکھ پر رکھا اور زار زار رونے لگے۔

ان واقعات سے صوفی صاحب کے جذبۂ ایمان کا اظہار مقصود نہیں کہ وہ تو عیاں ہے ہی مقصود ایمان کی اس علامت کی نشاندہی ہے جو ان دو بزرگوں کے مذکورہ واقعات سے تعلق رکھتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: انما المؤمنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم واذا تلیت علیھم ایاتہ زادتھم ایمانا وعلی ربھم یتوکلون (مومن تو بس وہی لوگ ہیں کہ جب (ان سے) اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل لرز اٹھتے ہیں اور جب ان پر اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ ان کے ایمان کو اور بڑھا دیتی ہیں اور وہ اپنے رب ہی پر توکل کرتے ہیں۔) آج ہماری کشتِ عمل کو اسی آبِ حیات کی ضرورت ہے کہ ندائے الٰہی سن کر ضد اور ہٹ دھرمی کی جگہ جذبۂ اطاعت و خشوع کروٹیں لینے لگے اور عزتِ نفس کی تاریکی کی جگہ قبولِ حق کا نور اپنی ضیاپاشیاں کرنے لگے۔ واللہ ولی التوفیق۔

اسلام کا تصوّرِ مساوات
اعتراضات اور ان کے جوابات[1]

سلطان احمد اصلاحی
رفیق ادارۂ تحقیق و تصنیف اسلامی، علی گڑھ ۔ یوپی

غلامی :

اسلام کو آزادی و مساوات کی قدریں جیسی کچھ عزیز ہیں، اس سے کون واقف نہیں، اس کے باوجود سوال کیا جا سکتا ہے کہ پھر اسلام میں غلامی کے ادارے (INSTITUTION) کا کیا جواز ہے، صاف اور سیدھا جواب یہ ہے کہ اسلام نے غلامی کے ادارے کو ایجاد (INVENT) نہیں بلکہ اسے انگیز (TOLERATE) کیا ہے ۔ انسانی تمدن میں غلامی کا رواج قدیم ترین ادوار سے چلا آرہا ہے ۔ یونان کے عظیم ترین فلاسفہ بھی انسانی طبقات میں آزاد اور غلام کی تقسیم کے قائل تھے ، اور غلامی کے ادارے کو تمدن کی ترقی کا ایک ناگزیر زینہ تصور کرتے تھے[2] ۔ روما کی عظیم ترین سلطنت میں بھی یہ رواج اپنی بدترین صورت میں موجود تھا ۔ ان متمدن اقوام میں غلاموں کی کیا حیثیت تھی ، اس کا اندازہ صرف ارسطو کے اس قول سے لگایا جا سکتا ہے کہ :

"غلام ایک آلہ ہے مگر ذی روح ، اور ایک کھلونا ہے مگر جاندار"[3]

ہر دور کا تمدن اپنی کچھ خصوصیات رکھتا ہے اور اس کا ایک مخصوص ڈھانچہ ہوتا ہے ۔ جسے آن واحد میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا ۔ دور جانے کی ضرورت نہیں خود اپنے ملک ہندوستان کو لے لیجیے ، جسے آزاد ہوئے آج ۳۰ برس

---

[1] راقم الحروف کی مرتب کردہ کتاب "اسلام کا تصور مساوات" کا باب سوم ۔ [2] روسو سیاسیات، کتاب اول

...رسے کو آرہے ہیں جو دستورِ ہند کی بنیادی حقوق (FUNDAMENTAL RIGHTS) کی دفعہ میں آزادی (FREEDOM) اور مساوات (EQUALITY) کو بلا لحاظ رنگ و نسل ہندوستان کے ہر شہری کا بنیادی حق تسلیم کیا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ دستور کے رہنما اصولوں (DIRECTIVE PRINCIPLES) میں ملک کے پسماندہ طبقات کو خاص طور پر معاشی اور تعلیمی اعتبار سے اونچا اٹھانے کی بات کہی گئی ہے [1]۔ لیکن آج اس پر چوتھائی صدی سے زیادہ کا عرصہ گزرنے کے باوجود عملاً صورت حال کیا ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے صرف پیلر اور بلچھی جیسے المیوں کا بس نام لے دینا ہی کافی ہے۔ جس میں اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے پسماندہ ہریجنوں کو زندہ جلادیا، اور ان کی جھلسی ہوئی لاشوں کی تصاویر قومی اخبارات میں شائع ہوئیں۔ اور آزادی کے معماروں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا۔

اس پس منظر میں اسلام کے لیے بھی اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ غلامی کی اس لعنت کے خاتمہ کے لیے تدریج کا راستہ اختیار کرے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر اسلام نے اپنے ماننے والوں کے سامنے غلاموں کو آزاد کرنے کے فضائل بیان کیے [2] اور اس کے لیے بالواسطہ اور بلاواسطہ ایسی متعدد صورتیں تجویز کیں جن میں ان کو آزاد کیے بغیر چارہ نہ رہے [3]۔ ثانیاً اس نے ان کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی اور ان کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی سے سختی کے ساتھ منع کیا، جس کی تفصیل اس سے پہلے گزر چکی ہے۔ ثالثاً اس نے ان تمام انسانی اور تمدنی حقوق کی ضمانت فراہم کی جو دوسرے آزاد انسانوں کو حاصل ہوتے ہیں۔

---

[1] ملاحظہ ہو دستورِ ہند میں بنیادی حقوق اور رہنما اصولوں کی دفعات

[2] البلد آیت ۱۳، وغیرہ دیگر آیات، نیز بخاری ج ۱ کتاب العتق، مسلم ج ۱ کتاب العتق باب فضل العتق

[3] مثال کے طور پر کفارہ یمین مائدہ ۸۹، قتل خطأ کا کفارہ، نساء ۹۲، اور کفارہ ظہار، مجادلہ ۳، ۴ وغیرہ یا مثلاً یہ صورت کہ کوئی شخص اپنے کسی قریبی عزیز کا مالک ہو جائے تو اس کی غلامی کی زنجیر خود بخود کٹ جائے گی اور وہ آزاد ہو جائے گا، ابوداؤد ج ۲ کتاب العتاق باب من ملک ذا رحم محرم

اسلام نے غلاموں کی آزادی کے لیے کیا کیا راستے اختیار کیے اور کیسی کیسی تجویزیں نکالیں، اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو مولانا سعید احمد اکبرآبادی کی کتاب "الرق فی الاسلام" میں وسائل حریت و آزادی کی بحث، نیز غلامی اور غلاموں کے تئیں اسلام کے رویے کے لیے ملاحظہ ہو غلامی کا مسئلہ، الجہاد فی الاسلام ص ۲۵۳ تا ۲۶۲۔

اسلام کی اس حوصلہ افزائی کے نتیجے میں دورِ صحابہؓ میں غلاموں کے طبقے سے جس رتبے کے لوگ پیدا ہوئے اسے جاننے کے لیے صہیب رومی، بلال حبشی، سلمان فارسی اور سالم مولی ابی حذیفہ جیسے اجلہ صحابہ کا نام ہی لے لینا کافی ہے ۔ ان کے بعد کے ادوار میں محمد بن سیرینؒ امام مالک کے استاذ نافعؒ ، عبداللہ بن مبارکؒ، عکرمہؒ، محمد بن اسحٰق، عطاء بن رباحؒ، طاؤس بن کیسانؒ، یزید بن حبیبؒ، امام مکحولؒ، میمون بن مہرانؒ، امام ضحاکؒ اور ابراہیم نخعی کے رتبے کے لوگ پیدا ہوئے ۔ جنھیں آج تک پوری امت اپنا مقتدیٰ اور رہبر تصور کرتی ہے ، اور معاملہ صرف مسند علم تک محدود نہ رہا بلکہ ہندوستان اور مصر میں ان غلاموں (ممالیک) کی مستقل حکومتیں قائم ہوئیں، جس میں قطب الدین ایبک شمس الدین التمش اور غیاث الدین بلبن جیسے عظیم الشان فرمانروا پیدا ہوئے ۔ ممالیک مصر کی حکومت تین سو سال (۱۵۱۷ - ۱۲۱۵م) کے طویل عرصے تک قائم رہی اور اس وقت کی پوری متمدن دنیا پر علماً الٰہی کا پھریرا لہراتا رہا جسے دیکھ کر پروفیسر ہتی بھی اس اعتراف کے لیے مجبور ہوتا ہے کہ ۔

In other than muslim annals the rise and prosperity of such a dynasty is hardly conceivable ۱

مسلمانوں کی تاریخ کے علاوہ کہیں اور اس طرح کے خاندان کی ایسی ترقی اور عروج کا مشکل ہی تصور کیا جا سکتا ہے ۔ ۱

اسلام کے اس کارنامے کی عظمت کے نقوش ہمارے دلوں پر مزید گہرے ہو جاتے ہیں ۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ آزادی و مساوات کا نعرہ بلند کرنے والی نام نہاد متمدن اقوام کے یہاں ابھی ۱۹ ویں صدی کے نصف تک غلامی کا یہ رواج اپنی بدترین صورت میں موجود تھا ۔ اہل یورپ افریقہ سے غلاموں کو جانوروں کی طرح پکڑ کر لاتے اور باقاعدہ ان کی تجارت کرتے تھے ۔ یہاں تک کہ ان کی اس یلغار کے نتیجے میں افریقہ کے نقشے سے بہت سی قوموں کا نام و نشان ہی مٹ گیا ۔ جنوبی امریکہ میں ان کی حالت یہ تھی کہ انھیں زندہ جلا دیا جاتا تھا ، اور گاڑی کے پہیوں کے نیچے دلوا دیا جاتا تھا ۔ اسی طرح ریاستہائے متحدہ امریکہ میں سفید فام عورت سے تعلق قائم کرنے پر غلاموں کو نعش تم کی سزا دی جاتی تھی

---

۱ PHILIP. K. HITTI: The Arbs: A short History P 184

۲ اسلامی تاریخ میں مختلف میدانوں میں کس کس رتبے کے غلام پیدا ہوئے اور انھوں نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیے ، اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ، سعید اکبر آبادی : غلامانِ اسلام اور بزم مملوکیہ ۔ مولفہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن ۔

جس میں ان کے جسم پر تارکول لیپ کر شمع کی طرح جلادیا جاتا تھا، نیز یہ کہ ۱۹ ویں صدی کے نصف اور اس کے بعد یورپ نے غلامی کے انسداد اور اس کے خاتمے کے لیے جو بل منظور کیے، اس کا محرک بھی اخلاقی نہیں بلکہ مادی عوامل تھے یعنی یورپ میں اس اقدام کا آغاز یورپ کے صنعتی انقلاب کے بعد ہوا ہے، جس کے ایجاد کردہ آلات اہلِ یورپ کے لیے غلاموں کی خدمت کے مقابلے میں زیادہ سستے اور نفع بخش تھے، اس کے باوجود ۱۹۳۰ء تک دنیا میں پچاس لاکھ غلام موجود تھے، جبکہ ۱۹۲۶ء میں جمعیت اقوام میں دنیا کی ۲۸ مہذب حکومتوں نے اپنے یہاں غلامی کے خاتمے کا عہد کیا تھا۔ ؎ یہ تو خیر نصف صدی پہلے کی بات ہے، آج بھی دنیا کے مختلف خطوں میں یورپی النسل اقوام کے زیرِ سایہ سیاہ فام اقوام جس طرح ظلم وستم کی چکی میں پس رہی اور عملاً غلاموں سے بدتر زندگی بسر کر رہی ہیں، اس سے ہر شخص واقف ہے، اس کے باوجود اگر کوئی شخص غلامی کے نام پر اسلام پر زبانِ طعن دراز کرتا ہے تو ہم اس کے جواب میں بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ:

اتنی نہ بڑھا پاکیٔ داماں کی حکایت　　دامن کو ذرا دیکھ ذرا بندِ قبا دیکھ

۲۔ جزیہ

جزیہ کے سلسلے میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اسلام نے اپنی ریاست کے غیر مسلم شہریوں پر ایک طرفہ طور پر ایک مالی ٹیکس عائد کرکے اپنے اصولِ مساوات کو توڑا ہے، اور طبقۂ انسانیت کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھا ہے، لیکن یہ اعتراض بھی سراسر کم فہمی کا نتیجہ ہے، آج تک روئے زمین پر کسی ایسی ریاست کا حوالہ نہیں دیا جاسکتا جس میں اس کی تمام تر مالی ذمہ داریاں (FINANCIAL OBLIGATIONS) شہریوں کے ایک طبقے پر ڈال دی گئی ہوں۔ اور دوسرے لوگوں کو اس سے بالکل آزاد رکھا گیا ہو۔ اسلامی ریاست کے مسلمان شہری زکوٰۃ، صدقات، نذر و کفارات وغیرہ کی صورت میں ریاست کی مالی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک میں امن وامان کی بحالی اور سرحدوں کی حفاظت کی ذمہ داری بھی مخصوص طور پر انہی پر عائد ہوتی ہے۔ اسلامی ریاست اپنے غیر مسلم شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کی ذمہ دار ہوتی ہے، اس کے علاوہ وہ انہیں ریاست کی فوجی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ قرار دیتی ہے۔ جزیہ کی صورت میں اسلامی ریاست ان سے جو رقم وصول کرتی ہے وہ ان کی اسی جان و مال کی حفاظت کا معاوضہ ہوتا ہے۔ چنانچہ جب کبھی مسلمان انہیں یہ حق فراہم کرنے سے قاصر رہیں گے وہ ان سے جزیہ لینے کے استحقاق سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ چنانچہ اسلامی تاریخ میں

؎ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، الرق فی الاسلام۔ میں غلامی پر ایک تاریخی نظر اور یورپ کی اجتماعی غلامی کی بحث۔

اس کی مثالیں موجود ہیں کہ مسلمانوں نے غیر یقینی صورتحال پیدا ہو جانے کے نتیجے میں جزیہ کی وصول کردہ رقمیں واپس کردیں۔ [١]

اسطرح جہاں تک غیر مسلموں سے لیے جانے والے اس معاوضے کی معقولیت (GENUINENESS) کا سوال ہے تو اس میں دو رائے نہیں ہوسکتی ہے۔ البتہ صرف ایک بات کی ضمانت درکار ہے اور وہ یہ کہ رقم ان کے معاشی حالات کے مناسب ہو اور ان کے اوپر اس رقم کا ایسا بوجھ نہ ڈالا جائے جس کا اٹھانا ان کے لیے ممکن نہ ہو، تو اسطرح کی تمام بے اعتدالیوں کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان کافی ضمانت ہے کہ:

الا من ظلم معاهدا او انتقصه او كلفه فوق طاقته او اخذ منه شيئا بغير طيب نفس فانا حجيجه يوم القيامة۔ [٢]

سن لو! جو کوئی کسی معاہد (ذمی یا مستامن) پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کوئی کمی کرے گا، یا اس کی طاقت سے زیادہ کا اس پر بوجھ ڈالے گا یا اس کی مرضی کے بغیر اس کی کوئی چیز لے گا تو میں قیامت کے دن اس کے خلاف خود مدعی بن کر کھڑا ہوں گا۔

جس کے پیش نظر فقہائے اسلام نے اس کی وہ تمام تفصیلات مرتب کردی ہیں جن کے ہوتے ہوئے ان پر کسی قسم کی زیادتی اور ناانصافی کا سوال نہیں پیدا ہوتا ہے۔ [٣]

ایک طرف اسلامی حکومت کے طرز عمل کا یہ مثالی آئینہ ہے جسے آج سے چودہ سو سال قبل ایک نبی امی نے پیش کیا تھا، دوسری طرف آج کی نام نہاد متمدن اقوام کا طرز عمل ہے جو عدل و انصاف اور آزادی و مساوات کی علمبردار تصور کی جاتی ہیں، اور جن کا کام ہی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ اپنے گروہی تعصب کی آگ بجھانے کی خاطر اسلام پر اعتراضات کی بوچھار کرتی رہیں۔ نو آبادی اور استعماریت کے دور کے گزرے ہوئے بھی پچاس برس بھی پورے

---

١ ملاحظہ ہو: الفاروق، شبلی نعمانی ٢/ ١٢٨

٢ ابوداؤد جلد ٢، کتاب الخراج والفئی والامارہ باب تعشیر اہل الذمہ اذا اختلفوا بالتجارہ۔

٣ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو، اسلام کا نظام محاصل اردو ترجمہ کتاب الخراج صفحات ٢٨٢ تا ٣٨٩ نیز احکام القرآن للجصاص ٣/ ١١٤ تا ١١٩ الجہاد فی الاسلام میں مستند کتب فقہ کے حوالہ سے جزیہ سے متعلق احکام کا ایک جامع خلاصہ پیش کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب مذکور صفحات: ٢٥٨ تا ٢٩٨ اس کے علاوہ آیت جزیہ پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو، الجہاد ص ١٢١ تا ١٢٧۔

نہیں ہوئے ہیں اور کرۂ ارض کے طول و عرض پر ابھی وہ نسلیں موجود ہیں جنھوں نے خود اس ظالمانہ نظام کی نحوست کا مزہ چکھا ہے، اس نوآبادیاتی نظام کے جبر و استبداد اور ظلم و بربریت کے دوسرے پہلوؤں سے قطع نظر اس کا ایک اہم ترین باب اپنی نوآبادیات کا معاشی استحصال بھی ہے، جس کا مطلب یہ تھا کہ نوآبادیات کے ممالک کی تمام دولت اور اس کے جملہ وسائل ثروت کو اصل ملک (MOTHER COUNTRY) کی ترقی و استحکام کے لیے وقف ہونا چاہیے اور اس کو صرف جائز ہی نہیں بلکہ بالکل برحق تصور کیا جاتا تھا اور آج اقوام مغرب کے یہاں وسائل ثروت کی جو فراوانی اور ان کو جو معاشی خوشحالی میسر ہے اس میں علاوہ ان کی اپنی جدوجہد اور جانفشانی کے ان غریب اور مظلوم اقوام کا خون جان بھی شامل ہے، بلکہ در اصل یہ ان غریبوں کا ہی خون ہے جو وہاں لہلہاتا اور برگ و بار لاتا نظر آتا ہے۔

اقوام مغرب کا پس خوردہ کھانے والی اور ان کی پیروی میں آزادی و مساوات کا ڈھول پیٹنے والی دوسری قومیں بھی ہیں جو کسی بھی وقت اسلام کو ہدف تنقید بنانے سے نہیں چوکتیں۔ لیکن ان کی اعلیٰ ظرفی کا اندازہ بس اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ خود اس کے اپنے عوام کا ایک عظیم طبقہ ایسا ہے جس کے لیے ایک لازمی عبادت کے طور پر اپنے مال کا ۲½ فیصد اور زمینی پیداوار میں سے دسواں اور بیسواں اپنے سماج کے مستحقین پر خرچ کرنا ضروری ہے لیکن اس کے باوجود ان کے اوپر حکومتی ٹیکسوں کا بوجھ اس طرح لدا رہتا ہے جیسا کہ اکثریت کی اس آبادی پر جس کے پاس لازمی زکوٰۃ و صدقات کا کوئی خانہ نہیں ہے، اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان دوہری مالی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے باوجود نہ اس کی جان محفوظ ہے نہ مال، اور حکومت کے فراہم کردہ شہری حقوق میں بھی اسے برائے نام ہی حصہ ملتا ہے، اور زندگی کے ہر میدان میں وہ امتیازی سلوک کا نشانہ بنی رہتی ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

۳۔ مسئلہ کفائت

کفاءت یعنی میل کی شادی کے سلسلے میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے شادی بیاہ کے سلسلے میں اس قید کو لگا کر اپنے اصولِ مساوات کو بے لاگ طریقے پر ملحوظ نہیں رکھا ہے لیکن ہلکے سے غور و فکر سے اس کی حکمت اور معقولیت کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ شادی بیاہ کے سلسلے میں اسلام کی اصل پسند و ناپسند کا معیار اخلاقی فضیلت کے عوامل ہیں اور لڑکی اور لڑکے دونوں کے انتخاب میں اس نے دینداری اور حسنِ اخلاق کے اختیاری اوصاف کو معتبر گردانا ہے، لیکن کسی بھی دوسرے رشتے کی طرح رشتۂ ازدواج کی کامیابی کا انحصار بھی اس پر ہے کہ زوجین کے درمیان توافق و ہم آہنگی کے عوامل بیش از بیش موجود ہوں، انسان کسی کو

اپنے سفر کا ساتھی بناتا ہے، یا کسی کے ساتھ بود و باش اختیار کرتا ہے اور اس کی شرکت سے کوئی کاروبار کرنا چاہتا ہے تو ایسا کرنے سے پہلے وہ اچھی طرح تحقیق کر لیتا ہے کہ آیا اس شخص کے ساتھ اس کا نباہ ہو سکے گا یا نہیں اور مزاج اور طبیعت میں کہیں غیر معمولی اختلاف تو نہیں پایا جاتا ہے۔ جب انسان زندگی کے عارضی ہمسفروں کی تلاش میں یہ جتن کرتا ہے تو جسے وہ اپنی زندگی کا مستقل ہمسفر بنانے والا ہے، اس کے سلسلے میں تو اسے بدرجہ اولیٰ اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ شادی بیاہ کے سلسلے میں اسلام نے کفاءت کی جو قید رکھی ہے، اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

عام طور پر کفاءت کا تذکرہ جس انداز سے کیا جاتا ہے اس سے لگتا ہے کہ یہ شادی بیاہ میں ذات برادری کے اعتبار کا دوسرا نام ہے۔ حالانکہ یہ اس مسئلے کے ساتھ صریح بے انصافی ہے۔ کفاءت کے سلسلے میں علی اختلاف الاقوال فقہاء نے عام طور پر چار چیزوں کا اعتبار کیا ہے۔ اور وہ ہیں۔ دینداری، آزادی، حسب نسب اور پیشہ، اور بعض لوگوں نے اس کے ساتھ عیب سے پاک ہونے اور مالداری کو بھی معتبر گردانا ہے۔ اس طرح یہ کل چھ چیزیں ہوتی ہیں [1]۔

اس سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں کفاءت کا مطلب ذات برادری کے نظام (CASTE SYSTEM) کو زندہ رکھنا اور اسے فروغ دینا نہیں بلکہ رشتۂ ازدواج کو امکانی حد تک ٹوٹنے سے محفوظ رکھنا ہے تاکہ بے جوڑ شادیوں کے نتیجے میں معاشرتی نظام درہم برہم نہ ہو۔

اسلام کے نزدیک فضیلت کا اصل معیار دینداری اور تقویٰ ہے اور زندگی کے دوسرے تمام دائروں کی طرح شادی بیاہ کے سلسلے میں بھی اصلاً اس نے اسی کو معتبر گردانا ہے، قرآن و حدیث کے بیشمار نصوص اس پر دلالت کرتے ہیں اور ائمہ اسلام میں سے بہت سے لوگوں کا مسلک بھی یہی ہے، چنانچہ امام مالک، کفاءت کو دینداری کے ساتھ مختص قرار دیتے ہیں، یہی خیال فقہائے صحابہؓ میں سے عبداللہ بن عمرؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ کا بھی ہے اور تابعین میں سے محمد بن سیرین اور عمر بن عبدالعزیز بھی اسی کے قائل ہیں [2]۔

اور یہ وہ حقیقت ہے جس پر خیر القرون کی عملی شہادت ثبت ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حضرت صفیہؓ کو آزاد کر کے ان سے نکاح کیا۔ اسی طرح ازواجِ مطہراتؓ میں سے حضرت جویریہؓ، ثابت بن قیسؓ

---

[1] معالم السنن للخطابی ۳/۲۰۷

[2] فتح الباری ۹/۱۰۴ نیز سبل السلام شرح بلوغ المرام ۳/۷۰

لونڈی بن چکی تھیں۔ آپ نے ان کا بدل کتابت ادا کر کے انھیں اپنے حبالہ عقد میں لیا[1] اپنے آزاد کردہ غلام
زید بن حارثہ کی شادی آپ نے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب بنت جحش رض سے کی۔ اسی طرح ان کے صاحبزادے
اسامہ بن زید رض کا نکاح آپ نے قبیلہ فہر کی معزز ترین خاتون فاطمہ بنت قیس رض سے کیا۔ اسی طرح حضرت بلال
کی شادی حضرت عبدالرحمن بن عوف کی بہن ہالہ بنت عوف سے ہوئی۔ حضرت سالم رض حضرت ابو حذیفہ کے آزاد کردہ
غلام تھے لیکن ان کی شادی انھوں نے اپنی بھتیجی ہند بنت الولید سے کی۔ اسی طرح حضرت زبیر کی صاحبزادی
ضباعہ رض مقداد بن الاسود کے حبالہ عقد میں تھیں جو کہ ایک آزاد کردہ غلام تھے۔[2] اسی طرح ابوالبکیر کے صاحبزادوں
کے اصرار پر آپ نے حضرت بلال رض کا نکاح ان کی بہن سے کرنا منظور کیا اور بار بار فرماتے رہے کہ:

این انتم عن بلال؟ این انتم عن رجلٍ من اھل الجنۃ[3]

تمھیں کیا نسبت بلال رض سے؟ تمھیں کیا نسبت ایک ایسے شخص سے جو جنتی ہے۔

اسی طرح ابو ہند رض جو کہ بنو بیاضہ کے غلام تھے اور پچھنا لگانے کا کام کرتے تھے، ان کے متعلق آپ نے
بنو بیاضہ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

یا بنی بیاضۃ انکحوا اباھند و انکحوا الیہ۔[4]

اے بنو بیاضہ کے لوگو! ابو ہند کی شادی اپنے میں کر دو اور ان کے خاندان میں اپنے رشتے کرو۔

زندگی کے دوسرے تمام شعبوں کی طرح شادی بیاہ کے سلسلے میں بھی اسلام کا اخلاقی فضیلت کا مسلمہ اصول
اور اس کے حق میں خیر القرون کی یہ عملی شہادت اور ان ائمہ اعلام کی تائید اس بات کا کافی ثبوت فراہم کرتی ہے کہ
رشتہ ازدواج کے سلسلے میں اسلام کی پسند و ناپسند کا اصل معیار اخلاقی فضیلت کے اوصاف ہی ہیں، اور جب کبھی
معاشرے کے اندر یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ نابرابری کے ماحول کو انگیز کر سکے اور رشتے کی کامیابی کے غالب
امکانات موجود ہوں تو کفاءت کے ظاہری اعتبارات کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف رشتہ اسلام کی بنیاد پر دو

---

[1] اصح السیر فی ہدی خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم صفحات ۴۳۰ اور ۴۴۶
[2] ملاحظہ ہو: زاد المعاد لابن القیم ۲/۲۲۶ نیز احکام القرآن لابن العربی ۲/۲۴۷
[3] طبقات ابن سعد ۳/۳۳۷
[4] ابو داؤد جلد ۱ کتاب النکاح باب الاکفاء

دو مسلمانوں کے درمیان رشتہ نکاح قائم کیا جا سکتا ہے اور نہ صرف یہ کہ یہ رشتہ جائز بلکہ بعض حالات میں مستحسن قرار پائے گا، نابرابری کے عوامل اسلام کے نقطۂ نظر سے اپنی نا اعتباری کے باوجود انسانی طبائع پر اپنا گہرا اثر رکھتے ہیں، اس لیے عام حالات میں کفاءت کے ظاہری اعتبارات کا لحاظ کیا جانا چاہیے۔ لیکن جب کبھی دو افراد اسلام کے آستانے پر اپنی انا کو پاش پاش کر کے دینی جذبے سے سرشار ہو کر رشتۂ ازدواج میں منسلک ہونے کا ارادہ رکھتے ہوں تو اسلام کے مذکورہ بالا مسلّمہ اصول اور صدرِ اوّل کے معیاری عمل کی روشنی میں بظاہر بے میل ہونے کے باوجود اسلام کی نظر میں یہ رشتہ بالکل درست ہوگا اور اسلام کے اس محکم اصول اور خیر القرون کی عملی شہادت کے روبرو فقہ کا کوئی جزئیہ قابلِ اعتناء نہ قرار پائے گا۔[1]

کفاءت کا تخیل انسانی مزاج و طبائع پر صرف انہی علاقوں میں اثر انداز ہے جہاں لوگوں نے اسلامی

محدّث

منشا اور ہدایت کے خلاف غیر مسلموں کی طبقاتی تقسیم اور اپنی قبل از اسلام کی جاہلی نابرابری کو دائرۂ اسلام میں داخل ہونے کے بعد بھی اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ آپ شمالی ہند سے نکل کر وسطی اور جنوبی ہند میں جائیے تو وہاں اس کے اثرات انتہائی دھندلے بلکہ عموماً ناپید نظر آئیں گے، پس درحقیقت مسئلہ کفاءت کی بقا اسلامی تعلیمات کے بجائے غلط سماجی رواج اور اندازِ فکر کا نتیجہ ہے۔ اسلام پر اس کا الزام عائد کرنا صحیح نہیں البتہ یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ فقہ حنفی نے اس برہمنی بٹوارے کے لیے کھاد مہیا کی ہے، جس کے اثرات عرب اور اسلامی ممالک پر تو بہت کم پڑے۔ البتہ شمالی ہند میں اس کو بڑی زرخیزی ملی۔ وعلی اللّٰہ قصد السبیل ومنہا جائر۔

---

[1] واضح رہے کہ کفاءت کے سلسلے کی تقریباً تمام حدیثیں سند کے لحاظ سے کمزور ہیں۔ (الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ ۲/ ۲۹۹، ۳۰۰) بلکہ حافظ ابن حجر کا کہنا تو یہ ہے کہ اس سلسلے میں کوئی صحیح حدیث ثابت نہیں ہے (فتح الباری ۹/ ۱۰۲) لیکن چونکہ اس مضمون کی متعدد حدیثیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں اور صحابہ کرام سے بھی اس طرح کی چیزیں روایت کی گئی ہیں۔ اس بنا پر عام طور پر فقہاء نے اس کا اعتبار کیا ہے، اس سے خود بخود ظاہر ہے کہ جب دونوں کے درمیان ترجیح کا سوال پیدا ہوگا تو وہ اسلام کی اخلاقی فضیلت کی اس اصل محکم کو ہی حاصل ہوگی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم۔

ذات پات یا اسلامی بھائی چارہ

مولانا عبدالقہار کھاروی سلفی
مدرس مدرسہ فیض العلوم سیونی

بلراج مدھوک جیسے لوگ فرماتے ہیں "چودہ سو سال کے دوران مسلمانوں نے کبھی بھی غیر مسلموں کے ساتھ تعاون امن وشانتی کا طریقہ نہیں اپنایا"، ۲۳ر اکتوبر ۱۹۸۳ء کو کانپور میں ہونے والے بڑے سمیلن کی اہم آواز یہ تھی "بھارت میں اگر رہنا ہے تو بندے ماترم کہنا ہوگا" "ہر عقل ہندو بھائی بھائی، مسلمان کہاں سے آئے، نیپال سے کنیا کماری تک پیدل یاترا کرنے والوں نے ۲۷ر دسمبر ۱۹۸۳ء کو سیونی (ایم۔ پی) میں نعرہ لگاتے ہوئے کہا "ادھرم کا ناس ہو ہندو دھرم کا نواس ہو"، مندرجہ ذیل کتابیں قابل توجہ ہیں۔ "قرآن کو ضبط کرو"، "مدھیہ کالین عرب"، "بودیا پیڑ بول کا"، نیز مسلمانوں کی مقدس جگہوں اور مساجد میں نجس جانور خنزیر اور مورتیوں کا داخل۔ عربی پیر طوطا لہ کا ہوا وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ چھوٹے چھوٹے معاملات کا کوئی شمار نہیں۔

مذکورہ تمام سازشیں، پروپیگنڈے، نعرے بازی، زہر آلود پمفلٹ اور رسالے ایک بہت بڑی
مسلمانوں سے سازش اور فتنے کی طرف واضح اشارہ کرتے ہیں، یہ ناسازگار حالات پورے ہندوستان کے گلی کوچوں میں اسلام اور مسلمانوں کے لیے عذاب بن کر منڈلا رہے ہیں۔ ان سب کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو ہندوستان سے ختم کر دینا ہے یا کم از کم اسلام کو بدنام کر کے ہندوؤں کو اسلام سے دور رکھنا، ہندو مسلم انتشار بڑھانا، مسلمانوں کی معیشت پر ضرب لگانا، سیاسی اعتبار سے ان کی اہمیت چوپٹ کرنا اور انھیں مجبور، قلاش ومفلس اور بے عزت کر دینا

لہٰذا مسلم عوام کو عموماً اور علماء اسلام اور ذمہ داران قوم وملت کو خصوصاً متعدد محاذوں پر توجہ دینا اشد ضروری ہے، اس سلسلہ کی چند باتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

(۱) ایسے مضامین تقریر اور تحریر کے ذریعہ غیر مسلموں کے سامنے زیادہ سے زیادہ لائے جائیں جن سے یہ واضح ہوتا ہو کہ چودہ سو سال کے دوران اسلام نے انسانیت کو کیا دیا اور قدیم ترین زمانے سے ہندو مت برہمن ازم سے انسانیت نے کیا پایا؟ اور مستقبل میں اس سے کیا پانے کی امید ہے۔؟

(۲) ۔ بتایا جائے کہ کیا ہندو دھرم میں ہریجن برہمن، سکھ جین کی برابری اور ان کے بھائی بھائی بن جانے کا امکان ہے؟ کیا ماضی بعید اور ماضی قریب میں کبھی ایسا ہوا ہے اور مستقبل میں ویدوں اور گیتا کے مطابق کیا اس کا امکان بھی ہے۔؟

(۳) اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں زہر آلود کتب پمفلٹ رسالے اور نعرے بازیوں کے تسلی بخش اور اطمینان بخش جوابات دیے جائیں مگر جواب دیتے ہوئے قانون کو ہرگز ہاتھ میں نہ لیا جائے بلکہ تبلیغ اسلام کی خاطر صبر و ضبط اور استقامت سے کام لیا جائے، جوابات دیتے ہوئے ایک دوسرے کا ادب و احترام ملحوظ رکھا جائے، گالیوں کے بدلے دعا اور دوا، جذباتیت و اشتعال کے بدلے سنجیدگی و اطمینان، جھوٹ کے بدلے سچ، نا انصافی کے بدلے انصاف پسندی، اور غصے و نفرت کے بدلے ہمدردی اور محبت کا اظہار کیا جائے۔ ان شاء اللہ مستقبل اسلام کا ہوگا۔ بر وقت جو لوگ اسلام کے خلاف پروپیگنڈے میں مصروف ہیں ان شاء اللہ وہ خود آپس میں لڑ بھڑ کر پس منظر میں چلے جائیں گے اور وہی چیز ترقی کرے گی، بڑھے گی اور پھیلے گی جس کا تعلق فطرت اور عقل سے ہے جس میں مساوات، ہمدردی اور نسلی اونچ نیچ کے بجائے انسانی شرافت ہے۔

حکومت سے حکومت پر افسوس ہے کہ وہ اکثریت کو اقلیت کی دل آزاری، ایذا رسانی اور زہر آلود نعرے بازی کی کھلی چھوٹ دیے ہوئے ہے، لیکن اگر یہی طریقہ اقلیت اپنائے، (حالانکہ وہ ایسا کرتی نہیں۔) تو وہ بہت بڑی قانونی مجرم بن جائے گی۔ اسلام پر کیچڑ اچھالنے والی کتابوں کے متعلق حکومت کا رویہ قطعاً غیر ذمہ دارانہ ہے۔ البتہ اقلیت غیروں کے ظالمانہ پردے اٹھانا چاہے، حقیقت کھولنا چاہے، ظالم اور محسن کا فرق بتانا چاہے تو اس پر فوراً کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور قانون حرکت میں آجاتا ہے۔ یہ ہماری جمہوری اور سیکولر حکومت کی شان ہے۔

ہندو دھرم راقم اب اس مذہب کے چند بنیادی اصول بیان کر دینا چاہتا ہے، جس دھرم کے نواسی ہوتے اور جس کے تحت ہریجن ہندو سکھ، جین بھائی بھائی بن جانے کے نعرے

الاپے جارہے ہیں اور جسے اسلام اور مسلمانوں کو ہندوستان سے ختم کرنے کی امیدوں کے ساتھ رائج کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہندو دھرم کے باطنی فلسفہ اور عملی کردار ان دونوں نے مل کر اشتراک و تعدد الٰہ کی بے روک راہ اختیار کی اور اصنامی تصورات کو اتنی دور تک پھیلنے دیا کہ ہر پتھر معبود بن گیا، ہر درخت خدائی کرنے لگا، چرند پرند چاند سورج سانپ بچھو غرضیکہ ہر بڑی اور چھوٹی چیز معبود بن گئی اور جس طرح لاتعداد خداؤں نے جنم پایا اسی طرح لاتعداد ذات پات بن گئیں، لاتعداد ذاتیں، لاتعداد معبودوں کی تفصیلات کے بجائے فی الحال خونی ونسلی امتیازات پر قائم لاتعداد ذاتوں کی قدرے تفصیل درج کی جاتی ہے۔

آج بھی بڑے بڑے ہندو کھلے عام بہ اصرار کہتے ہیں کہ ہمارے گرنتھوں نے ہمیشہ سے آج تک یہی بتایا ہے کہ نسلی اور خونی اونچ نیچ ذات پات اور چھوت چھات ہمارے دھرم کی بنیاد ہے۔ سادھو ٹی۔ ایل۔ واسوانی نے سوامی دیانند جی کی سوانح عمری لکھتے ہوئے سوامی جی کا یہ قول نقل کیا ہے

دیکھنا تمھاری نسل کا رشتہ ٹوٹنے نہ پائے۔ See The Thread of your race is not broken

سوامی جی کے اس اشارہ کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

ہندو اپنے طبقات کا نام برن یعنی الوان یا رنگ رکھتے ہیں۔ یہ طبقات ابتدائی منزل میں چار ہیں اور آگے چل کر لاتعداد۔

۱/ سب سے اونچا طبقہ برہمن کا ہے ان کی کتابوں میں مذکور ہے کہ برہمن برہما کے سر سے پیدا ہوا ہے۔ سر حیوان کا سب سے افضل حصہ ہے، اسی لیے برہمن نوعِ انسانی کا خلاصہ اور منتخب ہیں، اس مذہب کا ایک اشلوک برہمنوں کے بارے میں بہت مشہور ہے۔

"دیولوہے مان جگت سرین منترا ادھے تنت دیوتا۔ نی منترا برہمنا دہے برہمن شمات دیوتا"۔ یعنی تمام جہان دیوتاؤں کا تابع ہے اور دیوتے منتر کے تابع ہیں اور منتر برہمن کا تابع ہے، سو برہمن بڑا دیوتا ہے

۲/ کشتر (چھتری) ہندومت کی روایت کے مطابق یہ لوگ برہما کے مونڈھوں اور اس کے دونوں ہاتھوں سے پیدا ہوئے ہیں۔

۳/ بیش (ویش)، یہ لوگ برہما کے پہلو سے پیدا ہوئے ہیں۔

۴/ شودر، یہ لوگ برہما کے دونوں پیروں سے پیدا ہوئے ہیں۔

پھر چوتھی قسم میں لاتعداد طبقات میں سب سے نچلے اور ذلیل ترین لوگ پیدا ہوئے ، جو اپنے پیشوں ، خون اور نسلوں کی طرف منسوب ہیں ، مثلاً دھوبی ، موچی ، چمار ، بازیگر ، ملاح ، مچھیرے وغیرہ وغیرہ ۔ پھر اونچے اور نچلے طبقات کے لیے کاموں کے لحاظ سے الگ الگ القاب دیے گئے ہیں ، اونچے طبقات کے لیے ، مثلاً اگنی ہوتری ، اگنی ہوتری ، دیکشت وغیرہ وغیرہ ۔ ذلیل فرقوں کے لیے ہاڈی ، ڈوم ، چنڈال ، بیں ، بدھتو ، وغیرہ [1]

مذکورہ طبقات کے فرائض کچھ اس طرح ہیں

برھمن کے لیے علم پڑھنا پڑھانا ، چھتری کے لیے حکومت کرنا ، برہمن کی خدمت کرنا ، ملک کی حفاظت کرنا بدکاروں سے جرمانہ وصول کرنا ، ہاتھیوں ، گھوڑوں ، بیل اور خادموں کی خبر رکھنا وغیرہ ۔ ویش کے لیے کھیتی کرنا سوداگری ، بیل چرانا وغیرہ ۔ شودر کے لیے برہمن چھتری اور ویش کی خدمت کرنا ، ان کی نوکری کرنا ، ان کے اتارے ہوئے کپڑے پہننا ، اناج ، نمک ، شہد دودھ کی خرید و فروخت کرنا ، زرگری کرنا ، اسی طرح اور بھی وہ تمام کام جنھیں ہندو دھرم میں ذلیل ترین سمجھا گیا ہے ، ان پر شودر کا کاربند ہونا لازمی ہے ۔

منو شاستر کی روایت کے مطابق اگر کوئی شودر برہمن کو سخت بات کہدے تو اس کی زبان کاٹی جائیگی نچلی ذات والا اگر آسن (یعنی برہمن کی مخصوص نشست گاہ) پر بیٹھ جائے تو حاکم وقت پر لازم ہے کہ وہ اس کی کمر میں داغ دیکر ملک بدر کر اسے ۔ برہمن کتنا ہی بڑا جرم کرے خواہ وہ کسی کو قتل کردے تب بھی اس کے بدلے برہمن کو قتل کرنا بیوقوفی ہے ۔ منو شاستر میں لکھا ہے ۔

اگر برہمن کے ہاتھ سے کتا ، بلی ، مینڈک چھپکلی یا کوا مارا جاوے تو اس کا کفارہ ایسا ہے جیسے شودر کے مارے جانے کا ۔

दनाद्यमा जगत सर्वं मनवत्यामव
दवता !! तवा ब्रहामसा चीता
ब्रहमसा सगान दवता : !!

اس سے معلوم ہوا کہ برہمن کے مقابلے میں شودر کی حیثیت مذکورہ جانوروں جیسی ہے ۔

بیجا نہ ہوگا کہ سپریم کورٹ کے ایک جج شری کرشن آئر کے ایک بیان کا ایک ٹکڑا یہاں نقل کردیا جائے

ایک ہریجن بھنگی کے لیے برہمن کے ساتھ برابری کا اتنا بھی امکان نہیں جتنا ایک کتے کے

The harigan Bhangi does not have the dogs chance

[1] بحوالہ کتاب الہند از بیرونی ص ۱۲۸ ، ۱۲۹ باب ۹ ۔

of equality with a Brahman — لیے ہے [1]
as the Political power in India

(بحوالہ اخبار اسٹیٹس مین ۱۸ دسمبر ۷۷ء ص ۵)

گیتا باب ۴ کا یہ بیان آج بھی پورے وثوق اور یقین کے ساتھ پڑھا جاتا ہے

Mankind was created by me of four castes distinct in their principles and duties according to the distribution of action and qualities.

نوع انسانی کو میں نے (یعنی کرشن بھگوان نے) چار ذاتوں (برہمن، چھتری، ویش اور شودر) میں پیدا کیا ہے جو اپنے اصولوں اپنے پیشوں، اپنے کاموں اور اپنے اوصاف کے سبب ممتاز ہیں [2]

کتاب الہند کا مصنف البیرونی رقمطراز ہے: "کشتر (چھتری) کو یہ لوگ بید کی تعلیم دیتے ہیں اور وہ اس کو سیکھتا ہے، لیکن دوسرے شخص کو تعلیم دینے کی اگرچہ برہمن ہی ہو چھتری کو اجازت نہیں ہے۔ ویش اور شودر کے لیے اس کا سننا تک جائز نہیں چہ جائیکہ اس کو زبان سے نکالنا اور پڑھنا۔ اگر دونوں میں سے کسی کا پڑھنا ثابت ہو جائے تو برہمن اس کو حاکم کے حوالے کرے گا اور وہ اس کی زبان کاٹ دینے کی سزا دے گا [3]

مذکورہ بالا روایات و بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ہندو مت کے بنیادی اور اساسی مسئلہ یعنی خونی نسلی اور پیشہ ورانہ امتیازات برقرار رکھے جائیں تو ہندو دھرم برقرار رہے گا۔ اس مذہب میں اتحاد و مساوات اور شرافت انسانی کا نام تک نہیں بلکہ نسلی اونچ نیچ اور خونی امتیازات کا وہ طوفان ہے کہ حیوانات کے نسلی خونی اختلافات کی فہرست بھی ہیچ ہے۔

جس مذہب کا یہ بنیادی اصول ہو کہ ایک ادنیٰ ذات کے انسان کا سایہ اعلیٰ ذات پر پڑ جائے یا اس کا گزر پنڈتوں کی گلیوں سے ہو جائے تو سارے پنڈت غسل کرنے پر مجبور ہو جائیں اور اس کے کچن پر چلا جائے تو کچن ناپاک ہو جائے، تو گویا نسلی امتیازات کا برقرار رکھنا اس مذہب کا دین و ایمان اور انسان کی نوعی شرافت و مساوات اس مذہب

---

[1] بحوالہ حقیقی پیام انسانی ص ۷ ، [2] مذہب کی عالمگیری شکل [3] کتاب الہند اردو ترجمہ باب ۱۲ ص ۱۸۳

مذہب کی سب سے بڑی دشمن ٹھہری۔

اسلامی بھائی چارہ

توحید خدا اور انسانی شرافت سے مل کر اسلامی بھائی چارہ بنتا ہے، سارے انسان آدم کی اولاد ہیں، ساری بستی ایک ہی امت ہے، سب ایک دوسرے کے ہمدرد اور ایک دوسرے کے بھائی ہیں، یہاں برتری اور بڑائی کا معیار صرف اور صرف تقویٰ اور عمل صالح ہے۔ ملک، قوم، خون، نسل، پیشہ اور امیری اور غریبی کی بنیاد پر کسی کو کوئی امتیاز حاصل نہیں، بلکہ ان اقسام کی بنیاد پر برتری اور امتیاز کا زبانی اظہار بھی دین وایمان کو ختم کر دینے کے مترادف ہے، ہر مسلمان آزاد ہے، کوئی کسی کا غلام نہیں، ہر ایک اپنے آپ میں خلیفہ اور بادشاہ ہے کوئی کسی کی خدمت اور نوکری کے لیے نہیں پیدا کیا گیا۔ بلکہ سبھوں پر ایک دوسرے کی دستگیری لازم ہے، ہر ایک کسی بھی خانۂ خدا میں بلا روک ٹوک آ جا سکتا ہے، اس قوم کا ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی سارے مسلمانوں کی امامت کر سکتا ہے، ہر مسلمان قرآن مجید پڑھ اور پڑھا سکتا ہے۔ ان معاملات میں ہندو دھرم کی طرح کوئی پابندی اور امتیاز نہیں، کسی کو کسی خاص پیشے اور کام کے لیے نہیں پیدا کیا گیا ہے، ہر آدمی کوئی بھی پیشہ اختیار کر سکتا ہے۔

اسلام نوعِ انسانی کو اشرف ترین مخلوق قرار دے کر بلاتفریق ہر ایک کو اعلیٰ اور بہتر بننے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"اے انسانو! تمھیں ہم نے ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھیں محض اس لیے قبائل میں تقسیم کیا کہ باہم متعارف ہو سکو۔ تم میں وہی اللہ کے نزدیک زیادہ مکرم ہے جو سب سے زیادہ خدا سے خوف کھانے والا ہے۔"

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: "وہ ہم میں سے نہیں جو قبیلے کی دُہائی دے، وہ ہم میں سے نہیں جو خاندان پرستی میں مرے۔" "آپس میں نفرت مت کرو، باہمی حسد نہ کرو، ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو ایک دوسرے کی بدگوئی نہ کرو، اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن کر رہو۔"

فیصلہ کیجیے!

لاتعداد، ذات پات کی تفریق کے بوجھ سے دبی ہوئی انسانی برادری عقل وخرد کو کام میں لا کر ذرا انصاف اور ٹھنڈے دل کے ساتھ فیصلہ کرے کہ ظالم کون ہے اور محسن کون؟

لاتعداد چھوٹے بڑے دیوی دیوتاؤں اور لاتعداد چھوٹی بڑی اونچی نیچی ذاتوں پر مبنی۔ برہمن ازم کے چار پانچ ہزار

...، برس کی ظالمانہ تاریخ پر نظر رکھ کر اور اسلامی بھائی چارہ کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرے کہ کون سا نظام انسان کو امن اور شانتی دے سکتا ہے؟ کون فطرت کے مطابق ہے، کون نہیں؟ کون لائقِ عمل ہے اور کون قابلِ ترک ہے؟ اے مظلوم انسانیت آ۔ اسلامی مساوات و اخوت کو ہندوستان سے ختم کرنا چاہتی ہے یا نسلی اور خونی امتیازات، ناانصافی، و ناہمواری اور اونچ نیچ کو؟۔

فیصلے ہو رہے ہیں

نسلی اونچ نیچ اور خونی امتیازات کے خلاف بڑی تیزی سے فیصلے ہو رہے ہیں، ہفت روزہ نئی دنیا ۱۳ تا ۱۹ دسمبر ۱۹۸۳ء ص ۴ پر اخبار سنڈے کے نامہ نگار کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ کہان پور گاؤں کی مسجد کے امام عبدالسلام نے بتایا کہ اسی گاؤں کے ۱۲۰ ہریجن خاندانوں میں سے ۷۶ خاندانوں نے اسلام قبول کرلیا ہے، قبولِ اسلام کرنے والی ایک خاتون ٹیچر شرملا بانو نے قبول اسلام کا باعث علاقے کے دو واقعات بتائے۔ انھوں نے کہا کہ ایک مندر کی تعمیر کے دوران اعلیٰ ذات کے ہندوؤں نے ہریجنوں کو اس جگہ جانے سے روک دیا جہاں مندر تعمیر ہو رہا ہے اور اس کے لیے زیر تعمیر مندر کے چاروں طرف ایک گہرا گڈھا کھود دیا گیا۔ دوسرا واقعہ یہ ہے کہ ایک ہریجن جب ایک مذہبی تقریب کے دوران ایک مٹھ کے سوامی جی سے آشیرواد لینے پہنچا تو اسے بری طرح مارا پیٹا گیا، شرملا بانو نے کہا ہم نے سماج میں برابر کا درجہ حاصل کرنے کے لیے اسلام قبول کیا ہے۔"

●●●

فونٹن پن کس کی ایجاد؟

مغربی استعمار نے علوم و فنون کی تاریخ اس طرح مسخ کی ہے کہ ہر عمدہ اور نادر چیز کو اہلِ مغرب کی ایجاد سمجھا جانے لگا ہے۔ فونٹن پن کی ایجاد کے بارے میں بھی یہی غلط فہمی ہے۔ آیئے اس کے ایجاد کا واقعہ ذرا غور سے سنیے قاضی نعمان اپنی کتاب "المجالس والمسامرات" میں لکھتے ہیں کہ میں نے خلیفہ معز لدین اللہ فاطمی کو ایک مجلس میں یہ کہتے ہوئے سنا۔ ہم ایک ایسا قلم چاہتے ہیں جس سے لکھنے والا جب جی چاہے لکھے اور جب جی چاہے چھوڑ دے اور جب چھوڑ دے تو روشنائی اندر چلی جائے۔ اور قلم اس طرح خشک ہو جائے کہ لکھنے والا اسے اپنی جیب میں رکھ لے۔ چند دن گذرے تو کاریگر سونے کا ایک قلم بنا کر لایا جس میں روشنائی کہیں دکھائی نہ پڑتی تھی اور جب کاغذ سے قلم ہٹالیا جاتا تھا تو روشنائی خشک ہو جاتی تھی۔ اور قلم جیب میں رکھا جا سکتا تھا۔ (البلاغ کویت ۱۳ ربیع الاول ۱۴۰۴ھ)

واضح ہو کہ معز لدین اللہ فاطمی حاکم مصر ایک ہزار برس سے بھی زیادہ پہلے گزرا ہے۔

دوسری اور آخری قسط

امام ابو الحسن اشعری

اور ان کا عقیدہ

تحریر: شیخ حماد بن محمد انصاری
استاذ حدیث مدینہ یونیورسٹی

ترجمہ:۔ ابو ذکی انور عبد الرقیب سلفی

امام اشعری کی طرف ابانہ کی نسبت کا ثبوت اور منکرین کی تردید

اعتزال سے امام اشعری کی توبہ اور ان کی بعض تصانیف کے ذکر کے بعد اب ہم یہ بیان کریں گے کہ ان کی کتاب "الابانہ فی اصول الدیانہ" کی نسبت ان کی طرف صحیح ہے، نیز ہم ان نادانوں کی تردید بھی کریں گے جو اس زعم میں مبتلا ہیں کہ اس کتاب کی نسبت ان کی طرف غلط ہے۔

جن لوگوں نے ابانہ کی نسبت ابو الحسن اشعری کی طرف کی ہے، ان میں الحافظ الکبیر ابو بکر احمد بن الحسین بن علی البیہقی الشافعی المتوفی ۴۵۸ھ نے اپنی کتاب "الاعتقاد والہدایہ الی سبیل الرشاد" کے باب القول فی القرآن کے تحت ص ۳۱ پر لکھا ہے کہ امام شافعیؒ نے جو ذکر کیا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس قرآن کو ہم اپنی زبان سے پڑھتے ہیں، کانوں سے سنتے ہیں، مصاحف میں لکھتے ہیں اس کو اللہ عزوجل کا کلام کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کے ذریعہ اپنے بندوں سے بایں طور کلام کیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے ساتھ مبعوث کیا ہے اور اسی معنی و مقصد کی بات علی بن اسماعیل نے بھی کتاب الابانہ کے اندر بیان کی ہے اور کتاب مذکور کے ص ۲۳۱ پر ابو الحسن علی بن اسماعیل نے لکھا ہے کہ اگر کہنے والا یہ کہے کہ مجھے بتاؤ تم لوگ کہتے ہو کہ اللہ عزوجل کا کلام لوح محفوظ میں ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ ہم ایسا اس لیے کہتے ہیں کہ

اللہ تعالیٰ نے خود ہی یہ بات کہی ہے " بل هو قرآن مجید فی لوح محفوظ " بلکہ یہ قرآن مجید ہے لوح محفوظ میں۔ لہذا جو قرآن لوحِ محفوظ کے اندر ہے وہی قرآن اہلِ علم کے سینوں میں ہے، جس کی تلاوت زبان سے کی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے " لا تحرك به لسانك " (اس کے ساتھ اپنی زبان کو حرکت نہ دو) فی الحقیقت قرآن مصاحف میں لکھا ہوا ہے، سینوں میں محفوظ ہے اور زبانوں سے اس کی تلاوت ہوتی ہے، اور کانوں سے سنا جاتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے " فأجره حتی یسمع کلام الله " (اگر کوئی مشرک پناہ مانگے تو اسے پناہ دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سنے۔) پھر ص ۲۶ پر ان دلائل کے بیان کرنے کے بعد جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے مخلوق نہیں ہے یہ ذکر کیا ہے علی بن اسماعیل اشعری رحمہ اللہ نے ان فصول سے دلیل پکڑی ہے۔

(یہ ساری باتیں ایک مخطوط نسخہ سے ماخوذ ہیں جس کے لکھے جانے کی تاریخ ۱۰۸۶ھ ہے۔)

حافظ ذہبی نے اپنی کتاب " العلو للعلی الغفار " کے ص ۲۷۸ پر لکھا ہے کہ اشعری نے اپنی کتاب " الابانۃ فی اصول الدیانۃ " کے باب الاستواء میں لکھا ہے کہ اگر پوچھنے والا پوچھے کہ تم لوگ استواء کے بارے میں کیا کہتے ہو تو اسے ہم جواب دیں گے کہ اللہ اپنے عرش پر مستوی ہے، جیسا کہ اس نے کہا ہے " الرحمٰن علی العرش استوی " (رحمٰن عرش پر مستوی ہے) اس کے بعد لکھا ہے کہ کتاب الابانۃ ابوالحسن اشعری کی مشہور کتاب ہے۔ حافظ ابن عساکر نے اس کو شہرت دی ہے اور اس پر اعتماد کیا ہے اور اسے امام محی الدین نواوی کے خط سے نقل کیا ہے۔

امام ذہبی نے حافظ ابوالعباس احمد بن ثابت الطرقی سے نقل کیا ہے کہ میں نے ابوالحسن اشعری کی اس کتاب کے اندر جو " الابانۃ " کے نام سے موسوم ہے استواء کے ثبوت کی دلیلیں پڑھی ہیں اور ابوعلی الدقاق سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے ظاہر بن احمد الفقیہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ اشعری رحمہ اللہ کی موت اس حال میں ہوئی کہ ان کا سر میری گود میں تھا اور یہ جان کنی کے عالم میں فرما رہے تھے " اللہ لعنت کرے معتزلہ پر جنھوں نے شکوک و شبہات پیدا کیے۔"

ابن فرحون مالکی نے اپنی کتاب " الدیباج " کے ص ۱۹۳ سے ۱۹۴ تک لکھا ہے کہ ابوالحسن اشعری کی بہت سی کتابیں ہیں جن میں کتاب " اللمع الکبیر " اور " اللمع الصغیر " اور کتاب " الابانۃ فی اصول الدیانۃ " ہیں۔

ابوالفلاح عبدالحی بن العماد الحنبلی نے اپنی کتاب " شذرات الذہب فی اعیان من ذہب " کی دوسری جلد کے ص ۳۰۳ پر لکھا ہے کہ ابوالحسن اشعری نے اپنی کتاب الابانۃ فی اصول الدیانۃ کے اندر لکھا ہے کہ یہ کتاب ان کی آخری تصنیف ہے، اسی بنیاد پر ان کے اصحاب ان کی طرف سے طعن دفع کرتے ہیں، اس کے بعد ابانہ کی ایک مکمل فصل کا

تذکرہ کیا ہے۔

سید مرتضیٰ زبیدی نے "اتحاف سادۃ المتقین بشرح اسرار احیاء علوم الدین" کی دوسری جلد کے ص ۴ میں لکھا ہے کہ ابوالحسن اشعری نے مذہب اعتزال سے رجوع کے بعد "الموجز" تصنیف کی جو تین جلدوں میں ہے، یہ کتاب جہمیہ معتزلہ کی تردید کے لیے مفید ہے اور "مقالات الاسلامیین" اور "کتاب الابانہ" بھی اعتزال سے توبہ کرنے کے بعد لکھی ہے۔ ابن کثیر کی بات پہلے گزر چکی ہے کہ الابانہ ابوالحسن اشعری کی آخری تصنیف ہے۔

ابوالقاسم عبدالملک بن عیسیٰ بن درباس الشافعی نے اپنے رسالہ "الذب عن ابی الحسن اشعری" کے اندر لکھا ہے کہ میرے احباب و اصحاب کو معلوم ہونا چاہیے کہ کتاب "الابانہ عن اصول الدیانہ" امام ابوالحسن اشعری کی وہ تالیف ہے جس پر ان کے عقیدہ کا معاملہ آکر ختم ہوا تھا، جس کا وہ اعتقاد رکھتے تھے، اور اعتزال سے رجوع کے بعد جسے اللہ کا دین تسلیم کرتے تھے لہٰذا ہر وہ بات جو اس وقت ان کی طرف منسوب کی جاتی ہے، اگر وہ اس کتاب کے مخالف ہو تو وہ اس سے رجوع کر چکے ہیں اور اللہ سبحانہ تعالیٰ کے سامنے اس سے برأت کا اظہار کر چکے ہیں اور کیسے نہیں جبکہ وہ اس کی صراحت کر چکے ہیں کہ یہی وہ دین ہے جس کے ذریعہ وہ اللہ سبحانہ کی اطاعت کرتے ہیں اور انھوں نے روایت اور ثبوت پیش کیا ہے کہ یہی صحابہ، تابعین اور گزشتہ ائمۂ حدیث کا مع امام احمد (رضی اللہ عنہم اجمعین) دین و مسلک ہے اور جو باتیں اس کے اندر ہیں وہ وہی ہیں جن پر کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی دلیلیں قائم ہیں، تو کیا اس کے بعد یہ کہنا جائز ہو سکتا ہے کہ انھوں نے اس سے کسی دوسرے مذہب کی طرف رجوع کر لیا ہے، بھلا وہ رجوع کرتے تو کس طرف؟ کیا تمھارا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے نبی کی سنت سے ہٹ جاتے اور اس بات کے خلاف عمل کرتے جس پر صحابہ، تابعین اور ائمۂ حدیث کا عمل تھا اور جس کے متعلق انھیں معلوم تھا کہ یہی ان کا مذہب ہے، اور یہی ان سے منقول ہے؟ میری زندگی کی قسم اس کی نسبت تو عام مسلمانوں کی طرف بھی مناسب نہیں، پھر ائمۂ دین کی طرف اس کی نسبت کیسے درست ہو سکتی ہے؟ یا پھر یہ کہا جائے کہ انھوں نے اسلاف کا مسلک نقل کرنے میں غلطی کی ہے اور اس کے انتساب میں ان سے نادانی ہوئی ہے حالانکہ انھوں نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ مذاہب کے مطالعہ اور ادیان کی معرفت میں صرف کیا تھا، لہٰذا یہ ایسی بات ہوگی جس کا کوئی بھی انصاف پسند آدمی وہم نہیں کر سکتا اور اس زعم میں صرف مکابرہی مبتلا ہو سکتا ہے۔

غرض ابن درباس نے "الابانہ" کا تذکرہ کیا ہے، اس پر اعتماد کیا ہے، امام ابوالحسن اشعری سے اس کی نسبت ثابت کی ہے اور امام نے اس کتاب کے اندر جو باتیں ذکر کی ہیں ان پر ان کی تعریف کی ہے ہر منسوب بدعت سے ان کو بری

قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کتاب سے بڑے بڑے ائمہ فقہا، قرا، اور حفاظ حدیث وغیرہ ہم نے اپنی اپنی کتابوں اور تصانیف میں اقتباسات لیے ہیں۔

ابن درباس نے حافظ ابوالعباس احمد بن ثابت العراقی سمیت علماء کی ایک جماعت کا ذکر کیا ہے جن کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں، اور ان سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے اپنی تالیفات کے اندر مسئلہ استواء کے بیان میں کہا ہے کہ میں ان جہمیوں کو دیکھتا ہوں کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے عرش پر علو کی نفی اور استواء کی تاویل کا انتساب ابوالحسن اشعری کی طرف کرتے ہیں، لیکن یہ کوئی پہلی باطل بات نہیں ہے جس کا یہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں اور نہ پہلا جھوٹ ہے جسے پھیلاتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ میں نے ان کی کتاب "الابانہ عن اصول الدیانہ" کے اندر ایسی دلیلیں پڑھی ہیں، جن کو میں نے خود استواء کے اثبات کے لیے بیان کیا ہے۔

حافظ ابو عثمان اسماعیل بن عبدالرحمٰن بن احمد الصابونی کے بارے میں بیان کیا ہے کہ جب یہ درس کی مجلس میں آتے تھے تو اپنے ہاتھوں میں ابوالحسن اشعری کی کتاب "الابانہ" لیے ہوتے تھے اور اس پر اپنی پسندیدگی کا اظہار کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ کون اس شخص پر نکیر کر سکتا ہے جس کے مذہب کی شرح اس کتاب کے اندر موجود ہے "یہ امام ابو عثمان کا قول ہے، جو خراسان کے بڑے علماء آثار میں سے ہیں۔

امام القراء ابوالحسن بن علی بن ابراہیم الفارسی نے امام ابوالحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ ان کی ایک کتاب اہل سنت کے مسلک میں ہے جس کا نام "الابانہ" ہے یہ جب بغداد آئے تھے تو اس کی تصنیف کی تھی۔

ابن درباس نے ذکر کیا ہے کہ انھیں کتاب "الابانہ" بیت المقدس کے اندر ابوالفتح نصر المقدسی کے کتب خانہ میں ملی، وہ کہتے ہیں کہ میں نے ان کی بعض اصول کی کتابوں میں بہت سی فصلیں انہی کی تحریر سے دیکھی ہیں

فقیہ ابوالمعالی مجلی صاحب کتاب "الذخائر" کے بارے میں ابن درباس نے کہا ہے کہ مجھے بہت سارے لوگوں نے حافظ ابو محمد المبارک ابن علی البغدادی کے بارے میں بتایا ہے اور میں نے کتاب الابانہ کا آخر انہی کی تحریر سے نقل کیا ہے کہ وہ کہتے تھے یہ پوری کتاب میں نے ایک ایسے نسخہ سے نقل کی ہے جو شیخ فقیہ مجلی الشافعی کے پاس تھا، انھوں نے اس کو ایک جلد میں تیار کیا تھا، میں نے اس کو نقل کیا، اور اس سے مقابلہ کیا، موصوف اس کتاب اور اس کے اندر مذکورہ باتوں پر اعتماد کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ ہی کے لیے اس شخص کی خوبی ہے کہ جس نے ایسی کتاب لکھی، اس نے منکرین سے مناظرہ کیا جا سکتا ہے، انھوں نے مجھ سے اس کا ذکر کیا اور دکھلاتے ہوئے کہا کہ یہ میرا مذہب

اور اسی کو میں مانتا ہوں اور میں نے اسے ۴۰۳ھ میں مکہ کے اندر نقل کیا ہے، اور یہ آخری کتاب ہے جسے میں نے ابن طلباغ کی تحریر سے نقل کیا ہے۔

مزید جن لوگوں نے اس کتاب کو ابوالحسن کی طرف منسوب کیا ہے ان میں ابومحمد بن علی بغدادی نزیل مکہ کا نام بھی ذکر کیا ہے، ابن درباس کہتے ہیں کہ میں نے کتاب الابانہ کا ایک نسخہ ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا شروع سے اخیر تک دیکھا ہے اور یہ ہمارے شیخ امام رئیس العلماء فقیہ حافظ علامہ ابوالحسن بن المفضل المقدسی کے ہاتھ میں تھا اور اس سے میں نے ایک نسخہ نقل کیا ہے اور اسی سے میں نے ایک دوسرے نسخہ کا مقابلہ کیا ہے، جسے میں نے امام نصر مقدسی کی کتاب سے بیت المقدس میں نقل کیا تھا اور اس کتاب کو ہمارے بعض اصحاب نے ایک بڑے جہمی عالم کے سامنے بیت المقدس میں پیش کیا جو غلط طور پر اپنا انتساب ابوالحسن اشعری رح کی طرف کرتا تھا، تو اس نے اس کا انکار کیا اور کہا کہ میں نے اس کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سنا ہے اور نہ یہ ان کی تصنیف ہے اور اخیر میں اپنی ذہانت سے شبہ ختم کرنے کے لیے بڑی محنت سے اس کو دیکھا اور داڑھی ہلاتے ہوئے کہا، شاید اس وقت کی تالیف ہے جبکہ یہ حشوی تھے۔

ابن درباس کہتے ہیں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی کس بات پر تعجب کروں، آیا اس کتاب سے اس کی لاعلمی و جہالت کے اظہار پر جبکہ یہ مشہور ہے اور کثرت سے علماء نے اپنی تصانیف میں اس کا تذکرہ کیا ہے، یا خود اپنے اس شیخ کے حالات سے اس کی ناواقفیت پر جس کی طرف یہ اپنا غلط انتساب کرتا ہے، درانحالیکہ وہ اعتزال سے تائب ہونے سے پہلے ہی امت کے علماء وجہلاء کے درمیان مشہور تھے، اور جب ان لوگوں کی واقفیت کا یہ حال ایک ایسی شخصیت کے بارے میں ہے جس کی طرف یہ لوگ اپنا انتساب کرتے ہیں، تو بھلا انھیں اسلاف، ائمۂ دین، فقہاء کرام اور محدثین عظام کے حالات کی کیسے خبر ہوسکتی ہے درآں حالیکہ لوگ نہ تو ان کی کتابیں پڑھتے ہیں نہ ان سے منقول باتوں پر غور کرتے ہیں۔ واللہ یہ لوگ اس سے نرے جاہل ہیں، بھلا یہ محدثین کے حالات کیا جان سکتے ہیں اور ان کے متعلق کوئی صحیح بات کیا کہہ سکتے ہیں۔ جبکہ ان میں سے بعض ابوالحسن اشعری کی طرف اپنی نسبت کرنے میں محض ادعا سے کام لیتے ہیں، حالانکہ درحقیقت یہ ابوالحسن کی اس بات کے خلاف ہوتا ہے جس کی طرف انھوں نے رجوع کیا ہے اور جس پر اپنے عقیدۂ دین کی بنیاد رکھی ہے۔

امام تقی الدین احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام مشہور بہ ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ نے والفتاوی الحمویۃ الکبری، کے ص ۷۰ پر لکھا ہے کہ ابوالحسن اشعری نے اپنی کتاب میں جس کا نام «الابانۃ فی اصول الدیانۃ» ہے کہا ہے اور ان کے اصحاب نے بیان کیا ہے کہ یہ کتاب ان کی آخری تصنیف ہے اور ان پر لگائے گئے الزامات کے دفعیہ کے لیے یہ لوگ اسی پر اعتماد

ہیں۔ انھوں نے کہا ہے فصل فی إبانة قول اهل الحق والسنة پھر ابانہ کے شروع میں جو باتیں مذکور ہیں
انہی کے الفاظ میں نقل کیا ہے جس کا ذکر ان شاء اللہ جلد ہی آئے گا۔

ابو عبداللہ محمد بن ابی بکر بن ایوب الزرعی جو ابن قیم الجوزیہ کے نام سے معروف ہیں، اپنی کتاب "اجتماع
ش الاسلامیہ علیٰ غزو المعطلة والجهمية" کے ص ۱۱ پر لکھتے ہیں شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے فرمایا کہ جب اشعری
معتزلہ کے مذہب سے رجوع کر لیا تو اہلسنت وحدیث کے مسلک کو اختیار کیا اور امام احمد بن حنبل کی طرف اپنا انتساب
جیسا کہ انھوں نے اسے اپنی تمام کتابوں میں بیان کیا ہے، مثلاً الابانہ، الموجز اور المقالات وغیرہ۔ پھر ابن قیم
کہا ہے کہ ابوالحسن اشعری اور ان کے اصحاب ائمہ مثلاً حسن طبری، ابو عبداللہ ابن المجاہد اور قاضی ابوبکر باقلانی ان خبری
ت کے اثبات پر متفق ہیں، جن کا ذکر قرآن میں آیا ہے جیسے استواء، وجہ، یدین اور ان کی تاویل کے ابطال کے قائل ہیں۔
شعری کا اس کے اندر قطعاً دو قول نہیں ہے، اور نہ کسی نے اشعری سے اس کے اندر ان کا دو قول ذکر کیا ہے۔ البتہ انکے متبعین کا اس میں دو قول ہے۔

چنانچہ ابوالمعالی جوینی کا ان کی تاویل کے بارے میں دو قول ہے پہلا "الارشاد" میں۔ لیکن انھوں
اس تاویل سے اپنے رسالہ "النظامیہ" کے اندر رجوع کر لیا ہے اور اس کو حرام قرار دیا ہے اور اس کی حرمت پر سلف
جماع نقل کیا ہے اور کہا ہے نہ یہ ثابت ہے نہ جائز ہے، پھر ابن القیم نے اشعریوں کے امام ابوالحسن اشعری
ول نقل کیا ہے اور کہا ہے ہم ان وہ کلام بیان کر رہے ہیں جس پر ہم نے ان کی کتابوں الموجز، الابانہ، اور المقالات
ذریعہ اطلاع حاصل کی ہے۔

ابن القیم اپنے قصیدہ نونیہ کے اندر جس کا نام "الکافیة الشافیة فی الانتصار للفرقة الناجیة" ہے

تے ہیں:

اور اشعری نے کہا ہے کہ استویٰ کی تفسیر استولیٰ سے بہتان ہے، یہ معتزلہ اور جہمیہ کا قول ہے جو باطل
ہے، انھوں نے اپنی کتاب الموجز الابانہ اور المقالہ کے اندر یہ بات واضح طور پر کہی ہے۔

پھر مذکورہ کتاب کے ص ۶۹ پر لکھتے ہیں، ابن عبدالبر نے اپنی کتاب تمہید اور الاستذکار کے اندر بلا کسی کمزوری
ے دلیل وبرہان کے ساتھ اہل علم کا اجماع نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش کے اوپر ہے اور ہدایت یاب لوگوں کے لیے
شفا بخش بات بیان کی ہے، لیکن یہ اندھوں کی بیماری ہے کہ وہ اسے دیکھ نہیں پاتے۔ ایسے ہی اشعری نے اپنی کتابوں میں
یعنی ابانہ، موجز، مقالہ اور دوسرے رسالوں کے اندر واضح طور پر بیان کیا ہے کہ رب عرش پر مستوی ہے اور اسے

دلیل و برہان سے ثابت کیا ہے، اسی طرح اللہ کے لیے علو کو بھی بہت اچھی طرح ثابت کیا ہے، لہذا تم ان کی کتابیں بغور دیکھو۔

میں کہتا ہوں کہ یہ بڑے بڑے ائمہ کے اقوال ہیں کہ کتاب الابانہ کی نسبت ابوالحسن اشعری کی طرف غلط نہیں ہے، جیسا کہ جاہل مقلدین کا خیال ہے بلکہ یہ ان کی آخری تالیف ہے، جس پر ان کا عقیدہ ہے اور جو باتیں اس کتاب کے اندر مذکور ہیں وہی سلف کا مذہب و عقیدہ ہے جسے قرآن کریم اور حدیث رسول نے بیان کیا ہے۔

امام اشعری کا عقیدہ:

اس کے بعد اب ہم امام اشعری کے اس عقیدہ کا حصہ حصہ نقل کر رہے ہیں جس کی طرف امام نے رجوع کیا ہے اور جسے اپنی کتاب الابانہ میں بیان کیا ہے تاکہ انصاف پسند سمجھدار پڑھنے والے کے سامنے یہ بات واضح ہو جائے کہ ابوالحسن اشعری نے تعطیل و تاویل سے توبہ کر لی ہے اور یہ اللہ کے لیے مثال کے قائل نہیں ہیں بلکہ ہر اس صفت کو ثابت مانتے اور اس پر عقیدہ رکھتے ہیں جس کی خبر اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے بارے میں اپنی کتاب قرآن کے اندر دی ہے، یا جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے بارے میں بتایا ہے، اس میں نہ کسی قسم کی تاویل کرتے ہیں، نہ اسے معطل قرار دیتے ہیں، اور نہ کسی چیز سے تشبیہ دیتے ہیں۔

ابوالحسن اشعری نے اپنی کتاب "الابانہ" کے باب "ابانۃ قول اہل الحق والسنۃ" کے تحت لکھا ہے اگر سوال کرنے والا یہ سوال کرے کہ تم لوگ معتزلہ، قدریہ، جہمیہ، حروریہ، رافضہ اور مرجئہ کی بات کا انکار کرتے ہو تو تم لوگ جس بات اور جس دین کے قائل ہو، اس کے بارے میں ہم کو بتاؤ۔

تو اس کو اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ ہم لوگ جس بات اور جس دین کے قائل ہیں وہ ہے اللہ کی کتاب، اس کے رسول کی سنت، صحابہ، تابعین اور ائمہ حدیث کی مرویات، ہم لوگ اسی سے دلیل پکڑتے ہیں۔ اور اسی کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہتے ہیں اور اس چیز کو مانتے ہیں جس کے قائل ابوعبداللہ احمد بن محمد بن حنبل تھے اللہ تعالیٰ ان کے چہرہ کو تر و تازہ کرے، ان کے درجہ کو بلند کرے اور انھیں اس کا بھرپور بدلہ دے، جبکہ مخالفین نے ان کی بات کی مخالفت کی، اس لیے کہ وہ امام فاضل اور رئیس کامل ہیں جن کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے حق کو واضح کیا گمراہی کو ختم کیا، طریق ہدایت کو نمایاں کیا، بدعتیوں کی بدعت، کجروؤں کی کجروی اور شک پیدا کرنے والوں کے

شکوک کا قلع قمع کیا۔ اس بزرگ اور عظیم و جلیل امام پر اللہ کی رحمتیں نازل ہوں۔) حاصل کلام ہم لوگ اللہ تعالیٰ اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور ان کی لائی ہوئی شریعتوں کا اقرار کرتے ہیں، اور ان تمام باتوں کو تسلیم کرتے ہیں جس کو ثقہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے، اور ہم ان میں سے کسی کی بھی تردید نہیں کرتے ہیں۔ (ان کا ذکر مختصراً یہ ہے۔)

اللہ تعالیٰ تنہا معبود ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ ایک ہے، بے نیاز ہے، نہ اس کی کوئی بیوی ہے اور نہ بچہ۔ . . . محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں اس نے آپ کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے اور قیامت بیشک آنے والی ہے جو لوگ قبروں میں مدفون ہیں، اللہ تعالیٰ انھیں اٹھائے گا، اور اللہ تعالیٰ اپنے عرش پر مستوی ہے جیسا کہ اس نے خود ہی کہا ہے۔ "الرحمٰن علی العرش استوی"۔ اللہ تعالیٰ کے لیے وجہ ہے، جیسا کہ اس نے کہا "ویبقی وجه ربك ذوالجلال والاکرام"۔ بغیر کسی کیفیت کے اس کے دو ہاتھ ہیں، جیسا کہ اس نے کہا ہے "لما خلقت بیدی" اور جیسا کہ کہا ہے "بل یداہ مبسوطتان" اور بلا کسی کیفیت کے اس کی دو آنکھیں ہیں جیسا کہ اس نے کہا ہے "تجری بأعیننا" اور جو شخص اس زعم میں گرفتار ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اس کے غیر ہیں وہ گمراہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کے پاس علم ہے، جیسا کہ اس نے کہا ہے "انزله بعلمه" اور جیسا کہ کہا ہے "وما تحمل من انثی ولا تضع الا بعلمه" اور ہم اللہ تعالیٰ کے لیے سمع و بصر ثابت کرتے ہیں اور اس کی نفی نہیں کرتے جیسا کہ معتزلہ، جہمیہ اور خوارج اس کی نفی کرتے ہیں، اور ہم اللہ تعالیٰ کی قوت ثابت مانتے ہیں، جیسا کہ اس نے کہا ہے "اولم یروا ان الله الذی خلقهم هو اشد منهم قوة" اور ہم لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ کا کلام مخلوق نہیں ہے، اور اس نے کوئی چیز پیدا نہیں کی مگر اس سے کہا کہ ہو جا (اور وہ ہو گئی) جیسا کہ اس نے کہا ہے "انما قولنا لشیء اذا اردناه ان نقول له کن فیکون" اور زمین میں کوئی اچھی یا بری چیز پیدا نہیں ہوئی بنا اللہ کی مشیت سے ہی وجود پذیر ہوتی ہیں، اور کوئی شخص . . . کرنے سے پہلے کچھ کرنے کی استطاعت نہیں رکھتا، اور نہ وہ اللہ سے مستغنی ہے، اور نہ وہ اللہ عزوجل کے علم سے خارج ہے، اور کوئی خالق نہیں ہے مگر اللہ، اور بندے کے افعال و اعمال اللہ کی مخلوق ہیں، جیسا کہ اس نے کہا ہے "والله خلقکم وما تعملون"۔ بندے کسی چیز کے پیدا کرنے پر قادر نہیں ہیں بلکہ وہ خود ہی پیدا کیے گئے ہیں، جیسا کہ اس نے کہا ہے "هل من خالق غیر الله"، اور جیسا کہ کہا ہے "لا یخلقون شیئاً وهم یخلقون"، اور جیسا کہ کہا ہے "افمن یخلق کمن لا یخلق"

اور جیسا کہ کہا ہے " امر خلقوا من غیر شیء ام ھم الخالقون " اور یہ حقیقت اللہ تعالیٰ کی کتاب میں کثرت سے موجود ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے مومنوں کو طاعت و بندگی کی توفیق دی، ان کے ساتھ نرمی کی، ان کی طرف نظر عنایت کی، ان کی اصلاح کی اور ان کو ہدایت دی، کافروں کو گمراہ کیا ان کو ہدایت نہ دی اور آیات کے ذریعہ ان پر مہربانی نہیں کی جیسا کہ سرکشی اور محرومی کے خوگر حضرات کا زعم ہے اور اگر اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ مہربانی کرتا اور ان کی اصلاح کرتا تو یقیناً وہ لوگ نیک و صالح ہوتے اور اگر ہدایت دیتا تو ہدایت یاب ہوتے، اللہ تعالیٰ کافروں کی اصلاح اور ان کے ساتھ لطف پر قادر ہے اور وہ مومن ہو سکتے ہیں، لیکن اس نے اپنے علم کے مطابق ان کے کافر ہی رہنے کا ارادہ کیا اور ان کو اپنی نصرت و مدد سے دور کر دیا اور ان کے دلوں پر مہر لگا دی، خیر و شر اللہ کی قضا و قدر کے مطابق ہیں اور ہم اللہ کی قضا و قدر پر ایمان رکھتے ہیں، اس کے خیر و شر، تلخ و شیریں واقعات کو تسلیم کرتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ جو غلطی و خطا ہم نے کی ہے وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ ہم کو مصیبت میں مبتلا کرنا چاہتا ہے، اور جو مصیبتیں ہم کو پہنچی ہیں وہ اس وجہ سے نہیں ہیں کہ وہ خطاکار بنا دے ۔

بندے اپنی ذات کے لیے نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں مگر اللہ کی مدد سے جیسا کہ اللہ عز و جل نے کہا ہے :
ہم لوگ اپنے معاملات میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتے ہیں اور ہر وقت اپنی ضرورت و فقر اس کے سامنے پیش کرتے ہیں، ہم لوگ کہتے ہیں کہ اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے، اور جو شخص قرآن کے مخلوق ہونے کا قائل ہے وہ کافر ہے ۔

ہم لوگ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن آنکھوں سے دیکھا جائے گا، جیسا کہ چودھویں کا چاند دیکھا جاتا ہے کہ یہ چیزیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں سے ثابت ہیں ۔

ہم لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ جب مومنین اللہ تعالیٰ کو جنت میں دیکھیں گے تو کافرین اس سے محجوب ہوں گے ۔ جیسا کہ اللہ عز و جل نے کہا ہے " کلا انھم عن ربھم یومئذ لمحجوبون " (ہرگز نہیں وہ لوگ اپنے رب سے اس روز روکے رکھے جائیں گے ۔)

موسیٰ علیہ السلام نے اللہ عز و جل کو دنیا میں دیکھنے کا سوال کیا، اور جب اس کی تجلی نمودار ہوئی تو وہ گر پڑے اور ان کو یقین ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کو دنیا میں نہیں دیکھا جا سکتا ۔ ہم لوگ اس بات کو مانتے ہیں کہ اہل قبلہ میں سے کسی کو اس کے کسی گناہ مثلاً زنا، چوری، شراب نوشی وغیرہ کی وجہ سے کافر نہ کہا جائے، جیسا کہ یہ خوارج کا دین ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ایسا شخص کافر ہے ۔ البتہ ہم لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ جو شخص زنا، چوری جیسے کبیرہ گناہ کا

ارتکاب کرتا ہے اور اس کو حلال سمجھتا ہے، اس کی حرمت کا اعتقاد نہیں رکھتا وہ کافر ہے۔

ہم لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اسلام ایمان سے زیادہ وسیع ہے اور ہر اسلام ایمان نہیں ہے، ہم لوگ یہ مانتے ہیں کہ اللہ عزوجل دلوں کو اپنی دو انگلیوں کی گرفت میں رکھتا ہے اور الٹ پلٹ کرتا رہتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ آسمانوں کو ایک انگلی پر اور زمینوں کو دوسری انگلی پر رکھے گا جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔

ہم لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اہلِ توحید مومنین میں سے کسی کو جنت و جہنم کا مستحق نہ سمجھیں، مگر جن لوگوں کے جنتی ہونے کی بشارت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔

ہم لوگ گنہ گاروں کے جنت میں جانے کی توقع رکھتے ہیں اور اس کا خطرہ بھی محسوس کرتے ہیں وہ جہنم میں عذاب دیے جائیں۔ ہم لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ عزوجل ایک قوم کو جہنم میں داخل کرنے کے بعد رسول اللہؐ کی شفاعت کی وجہ سے نکال لے گا، جیسا کہ یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روایات و احادیث سے ثابت ہے۔ ہم لوگ قبر کے عذاب اور حوض پر ایمان رکھتے ہیں، میزان حق ہے، صراط حق ہے، بعث بعد الموت حق ہے۔ اللہ تعالیٰ بندوں کو موقف میں کھڑا کرے گا اور مومنوں سے حساب و کتاب لے گا۔

ایمان قول و عمل کا نام ہے، جو بڑھتا گھٹتا ہے، ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح روایات کو تسلیم کرتے ہیں، جسے ثقہ عادل لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک روایت کیا ہے۔ ہم لوگ سلف سے محبت کرتے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت کے لیے انتخاب کیا، اور ہم لوگ ان کی ویسی ہی تعریف کرتے ہیں جیسی ان کی تعریف اللہ تعالیٰ نے کی ہے اور ہم ان سب کو اپنا ولی سمجھتے ہیں، ہم لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد امام فاضل ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ دین کو عزت دی مرتدوں پر ان کو غالب کیا۔ مسلمانوں نے ان کو امامت اور خلافت کے لیے مقدم سمجھا، جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تمام امت کے لیے مقدم جانا اور تمام مسلمانوں نے ان کو خلیفۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے موسوم کیا۔

ان کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہیں پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ہیں، اور جن لوگوں نے ان سے قتال کیا انھوں نے ان سے ظلم و زیادتی کے طور پر قتال کیا۔ پھر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ائمہ ہیں اور ان کی خلافت خلافتِ نبوت ہے۔ ہم لوگ ان دس آدمیوں کے لیے جنت کی شہادت دیتے ہیں، جن کے جنت کی شہادت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے دوسرے اصحاب سے محبت کرتے ہیں اور ان کے آپسی جھگڑے میں پڑنے سے بچتے ہیں۔

ہم لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ ائمہ اربعہ خلفاء راشدین ہیں، ہدایت یاب ہیں، صاحب فضیلت ہیں، دوسرے لوگ ان کے فضل کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

ہم لوگ اہل زیغ و تضلیل کے برخلاف سماء دنیا پر اللہ کے نزول سے متعلق ان تمام روایتوں کی تصدیق کرتے ہیں جن کو محدثین نے ثابت مانا ہے، جیسے کہ اللہ رب العزت سماء دنیا پر نزول فرما کر پکارتا ہے، کیا کوئی مانگنے والا ہے، کیا کوئی مغفرت طلب کرنے والا ہے۔

ہم لوگ مختلف فیہ مسائل کے اندر اپنے رب کی کتاب اور اپنے نبی کی سنت اور اجماع مسلمین پر اعتماد کرتے ہیں۔ یا جو چیزیں اسی معنی میں ہوں، ہم لوگ اللہ تعالیٰ کے دین کے بارے میں کوئی نئی بات نہیں کرتے جس کی ہمیں اجازت نہیں ہے اور نہ اللہ کے بارے میں قول بلا علم کا ارتکاب کرتے ہیں۔

ہم لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ عزوجل قیامت کے دن آئے گا جیسا کہ اس نے کہا ہے وجاء ربك والملك صفا صفا اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے جس طرح چاہتا ہے قریب ہوتا ہے، جیسا کہ کہا ہے، ونحن اقرب اليه من حبل الوريد، اور جیسا کہ کہا ہے ثم دنا فتدلى فكان قاب قوسين او ادنى۔

ہم لوگ جمعہ، عیدین، بقیہ نمازیں اور جماعتیں ہر نیک و بد کے پیچھے ادا کرتے ہیں جیسا کہ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ حجاج کے پیچھے نماز پڑھتے تھے، سفر و حضر میں منکرین کے علی الرغم موزہ پر مسح سنت ہے، ہم لوگ ائمۃ المسلمین کے لیے صلاح و تقویٰ کی دعا اور ان کی امامت کی برقراری کے قائل ہیں۔

ہم لوگ خروج بالسیف کے منکر اور فتنہ کے وقت ترک قتال کے قائل ہیں۔ ہم لوگ دجال کے خروج کا اقرار کرتے ہیں، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث سے ثابت ہے۔ ہم لوگ عذاب قبر و منکر نکیر اور اہل قبور سے ان دونوں کے سوال و جواب پر ایمان رکھتے ہیں اور حدیث معراج کو صحیح جانتے ہیں، بہت سی خواب میں دیکھی گئی چیزوں کو صحیح سمجھتے ہیں اور ان کی تعبیر کا یقین رکھتے ہیں، مردہ مسلمانوں کی طرف سے صدقہ اور دعا کو جائز خیال کرتے ہیں اور اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس کا فائدہ دے گا اور اس بات کو سچ مانتے ہیں کہ دنیا میں جادو اور جادوگر موجود ہیں اور جادو دنیا میں ہوتا ہے اور پایا جاتا ہے، ہم لوگ مردہ اہل قبلہ کے لیے نماز جنازہ تسلیم کرتے ہیں، خواہ وہ برے ہوں یا بھلے، اور ان کے ورثاء کے درمیان وراثت کے قائل ہیں۔

اور ہم اقرار کرتے ہیں کہ جنت و جہنم دونوں اللہ کی مخلوق ہیں اور جو مرتے اور قتل ہوتے ہیں، وہ اپنے وقت پر مرتے اور قتل ہوتے ہیں، روزی اللہ کی طرف سے تقسیم ہوتی ہے اور وہی اپنے بندے کو حلال و حرام روزی دیتا ہے، معتزلہ اور جہمیہ کے برعکس ہم قائل ہیں کہ شیطان انسان کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، غلط راستے پر چلاتا ہے اور خطا کار بنا دیتا ہے، جیسا کہ اللہ عزوجل نے کہا ہے "الذین یاکلون الربٰو لا یقومون الا کما یقوم الذی یتخبطہ الشیطان من المس" اور جیسا کہ کہا ہے "من شر الوسواس الخناس الذی یوسوس فی صدور الناس من الجنۃ والناس"

ہم لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ یہ جائز ہے کہ اللہ عزوجل اپنے نیک بندوں کو آیات و کرامات سے نوازے اور ان کے ہاتھوں پر اسے ظاہر فرمائے۔ مشرکین کے بچوں کے بارے میں ہم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کے لیے آگ جلائے گا اور ان سے کہے گا اس کے اندر داخل ہو جاؤ، جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے [1]

ہم لوگ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ اللہ عزوجل جانتا ہے کہ بندے کیا کریں گے اور ان کا انجام کیا ہوگا، جو چیزیں موجود ہیں، جو موجود ہوں گی اور جو موجود نہیں ہیں لیکن موجود ہوتیں تو کیسے ہوتیں، اللہ ان سب کو جانتا ہے۔

ہم لوگ ائمہ کی اطاعت اور مسلمانوں کی نصیحت کے قائل ہیں، اور ہم لوگ ہر داعی الی البدعت سے مفارقت اور اہل ہوا سے کنارہ کشی کو ضروری سمجھتے ہیں۔" انتہیٰ بحروفہ

یہ ہے اجمالی طور پر امام ابوالحسن اشعری کا عقیدہ جسے چالیس سال تک اعتزال پر قائم رہنے کے بعد انھوں نے اختیار کیا اور "اپنی کتاب "الابانہ" کے شروع میں بیان کیا۔ پھر باب وار اس کی تفصیل کی۔ اگر کوئی شخص اس کا مراجعہ کرنا چاہے تو کرے وہاں اسے کافی و شافی بات ملے گی۔

اے منصف بھائی! اس عقیدہ پر غور کرو کہ یہ کس قدر واضح اور مبین بات ہے اور اس امام عالم کے فضل و کمال کا اعتراف کرو جس نے اس کو لکھا اور بیان کیا ہے، اس کے لفظ کی آسانی اور روانی پر نظر ڈالو کہ یہ کس قدر حسین اور فصیح ہے اور اللہ تعالیٰ کے ان بندوں میں ہو جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے "الذین یستمعون القول فیتبعون احسنہ" جو لوگ بات سنتے ہیں تو اس میں سے احسن بات کی اتباع کرتے ہیں۔ ابوالحسن اشعری

---

[1] اس مسئلہ میں اہلسنت کا اختلاف ہے، بہت سے محققین قائل ہیں کہ مشرکین کی غیر مکلف اولاد جنت میں جائے گی۔ صحیح بخاری کتاب الرؤیا کی آخری طویل حدیث سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ (دیکھیے ص ۴۴۰۱) محدث

کے فضل و کمال کو معلوم کرو۔ اس کے اوصاف کو پہچانو اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے فضل و کمال کی تعریف اس کی زبانی سنو تا کہ تم کو یہ حقیقت معلوم ہو سکے کہ اعتقاد میں دونوں کا اتفاق تھا، دین کے اصول اور سنت کے مذہب میں ان دونوں کے درمیان کوئی افتراق نہ تھا۔

میری زندگی کی قسم یہ عقیدہ اس لائق ہے کہ اسے ہر مسلمان اپنا عقیدہ بنائے اور اس ..... سے وہی شخص خارج ہو سکتا ہے جس کے دل میں کھوٹ ہو۔

ہم اللہ تعالیٰ سے اس پر ثبات قدمی کا سوال کرتے ہیں اور ان لوگوں کو بطور امانت دے رہے ہیں جو امانت ضائع نہیں کرتے۔

والحمد لله الذی بنعمته تتم الصالحات وصلی الله علی نبینا محمد معلم الخیرات وعلی آله واصحابه ومن تبعهم باحسان الی یوم تجزی فیه الحسنات۔ ●●●

پروفیسر عبیداللہ کشمیری سے انٹرویو

از :- امین محمد افضل متعلم جامعہ سلفیہ

سرخ وسپید رنگت ، اچھا خاصا تن و توش ، قد اوسط سے لمبا جو ورزشی بدن کی وجہ سے بُرا نہیں لگتا ، متشرع داڑھی ، فراخ پیشانی ، جسم پر شیروانی نما گرم اوورکوٹ ، سر پر چوگوشی اونچی دیوار کی ٹوپی ، ایک عدد عینک کے لازمہ کے ساتھ ، پاٹ دار آواز اور منجھی ہوئی بامحاورہ اردو ـــــــ یہ ہیں جماعت اہلحدیث کے مرد مجاہد مشہور بزرگ عالم ، مولانا پروفیسر عبیداللہ کشمیری رحمانی ، جو اپنی انقلاب انگیز شخصیت اور طاغوتی حکومت پر تیکھے تبصروں کی وجہ سے سنت یوسفی بھی ادا کر چکے ہیں ۔ اور جیل میں بھی آپنے اپنی مخصوص وضع قائم رکھی اور بڑی شان سے وقت کے حکمرانوں کے ساتھ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دو ٹوک بات کی ؎

ہزار طوق و سلاسل ہوں لاکھ دار و رسن   جنوں کو حوصلۂ کار آ ہی جاتا ہے !

پچھلے دنوں پروفیسر صاحب نے اپنے قدوم میمنت لزوم سے جامعہ سلفیہ کو بھی رونق بخشی ۲۳ ؍ اور ۲۴ ؍ جنوری دو روز تک آپ کا قیام رہا ، اس دوران تدریسی اوقات کے علاوہ کوئی موقع رات گئے بارہ بجے تک ایسا نہیں گزرا جب طلبہ آپ کو گھیرے ہوئے خاصی بے تکلفی اور اپنائیت کے ساتھ دنیا جہان کے مسائل پر باتیں نہ کر رہے ہوں ۔ ان دو دنوں میں آپ بیحد مصروف رہے ۔ روزانہ عصر کے بعد مذاکرہ و مباحثہ اور نماز عشاء کے بعد خطاب عام جس میں اکثر طلبہ نے بقدر ذوق حصہ لیا ۔ جامعہ کی عالیشان مسجد میں مسلسل دو دو تین تین گھنٹے کے تھکا دینے والے پروگرام ، لیکن آپ کے جوان نما چہرے پر درماندگی کا پتہ دور دور تک ڈھونڈھے نہ ملتا تھا ۔

دوسرے روز (۲۴ ؍ جنوری) کو بعد ظہر جامعہ کے دار الضیافہ (گیسٹ ہاؤس) میں اس ارادے

سے پہنچا کہ آپ سے ملاقات کے لیے کوئی وقت متعین کرلوں، اسطرح آپ کی پُر پیچ زندگی، اسکے نشیب وفراز، ذہنی رجحانات اور نظریات سے متعلق کچھ معلومات حاصل ہوجائیں ـــــ لیکن اس وقت مجھے حیرت ہوئی جب میں نے پروفیسر صاحب سے انٹرویو لینے کی خواہش کا اظہار کیا، کیونکہ آپ نے بلا توقف فرمایا: "بیٹھ جاؤ، پوچھو، کیا پوچھنا ہے!"

سوالات کا ایک خاکہ ذہن میں تھا، ابھی دو تین ہی سوالات ہوئے تھے کہ موذن کی آواز نے رشتۂ تقریر منقطع کردیا اور ہم عصر کی نماز کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے، عصر کے بعد مذاکرات تھے جو مغرب وعشاء کے درمیانی وقفہ طعام کو چھوڑ کر عشاء کے خطاب سے مل جاتے تھے۔ اس وجہ سے دوسری نشست اس وقت ممکن ہوسکی جب رات کافی بھیگ چکی تھی اور اس سلسلہ کی تکمیل نصف شب کو ہوئی، کیونکہ پروفیسر صاحب فجر کے بعد ہی بھدوہی اور وہاں سے مخدومنا حضرت شیخ الحدیث مبارکپوری سے ملاقات کے لیے مبارکپور جانے والے تھے۔ انٹرویو ہدیۂ ناظرین ہے۔

سوال:- مولانائے محترم! ہم سب سے پہلے آپکے حالاتِ زندگی، تعلیم اور تعلیم کے بعد آپکے مشاغل سے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنا چاہیں گے۔؟

پروفیسر صاحب:- (آپنے بہت مختصر طور پر اپنے بارے میں بتایا۔ بقیہ معلومات کے لیے ہمارے استاذ مولانا محمد مستقیم صاحب سلفی کی طرف اشارہ کردیا جو ابھی ابھی آپ کے حالات آپ سے پوچھ کر لکھ رہے تھے، ہم نے حضرۃ الاستاذ سے یہ حالات لے کر انٹرویو میں شامل کرلیے۔) میری پیدائش ۱۹۲۰ء یا ۱۹۲۱ء میں موضع دودھونیاں ضلع بستی میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم (صرف ونحو، منطق، فقہ نیز حدیث کی پہلی کتاب بلوغ المرام، اپنے والدِ محترم مولانا عبدالرحمن ڈوکمی ثم رائے بریلوی سے حاصل کی، اس کے بعد دارالحدیث رحمانیہ دہلی میں تیسری جماعت میں داخلہ لیا اور شیخ الحدیث مولانا عبیداللہ رحمانی و مولانا نذیر احمد املوی سے کسب فیض کیا۔ اسی درمیان ملک کی آزادی کا انقلاب برپا ہوا، اور رحمانیہ مرحوم ہوگیا۔ دونوں بزرگوں نے چھٹی جماعت کی سند دی، یہاں سے حضرت مولانا ابوالقاسم صاحب سیف بنارسی کی خدمت میں بنارس چلا آیا اور یہیں تکمیل کی۔ استاذ محترم فرمایا کرتے تھے کہ پینتالیس سال سے میں بخاری ومسلم پڑھا رہا ہوں لیکن وہ بات نہیں پیدا ہوئی جو عبیداللہ نے پیدا کردی۔ اگر میں یہ کہوں کہ عبیداللہ نے میرے اندر جوانی کی روح پھونک دی۔ تو غلط نہ ہوگا۔

تکمیل کے بعد استاذ محترم (حضرت سیف بنارسی) کے حکم سے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر (اعظم گڑھ) چلا گیا، وہاں شیخ الحدیث کی ضرورت تھی۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۱ء تک بحیثیت شیخ الحدیث بخاری ومسلم، بدایۃ المجتہد

اور منطق و فلسفہ کی بعض دیگر کتب مجھ سے متعلق رہیں لیکن ۱۹۵۱ء میں جب حضرت سیف بنارسی کا انتقال ہوگیا تو میں بھی اس خدمت سے سبکدوش ہوگیا اور لکھنؤ چلا آیا۔ یہاں طبیہ کالج میں ۱۹۵۱ء سے ۱۹۵۵ء تک تکمیل طب کے مراحل طے کیے اور پھر وہیں ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء تک جراحت (Surgery) اور علم تشریح الاعضا (Anatomy) کے پروفیسر کی حیثیت سے رہا، بعد ازاں کشمیر گورنمنٹ طبیہ کالج میں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۶۴ء تک میری خدمات بحیثیت پروفیسر کے رہیں۔

۱۹۶۴ء میں کشمیر میں ایک سیاسی ہنگامہ ہوا۔ میں موئے مقدس کا پجاری نہیں تھا، اس لیے پروفیسری سے مستعفی ہوگیا۔ اس پاداش میں میری تنخواہ روک لی گئی۔ شیخ عبداللہ مرحوم نے مجھے مشورہ دیا کہ تنخواہ کے لیے مقدمہ دائر کر دو، میں نے شیخ صاحب سے کہا، وہ عدالتیں جن میں باطل قوانین کے مطابق فیصلے ہوں ظلم و ستم اور رشوت ستانی کا بازار گرم ہو اُن چور عدالتوں میں جاکر جھوٹ سے نہیں بچ سکتا، اس لیے غیر مسلموں کی عدالت میں نہیں جاسکتا، نہ کبھی گیا ہوں۔ نہ انشاءاللہ آئندہ کبھی جاؤں گا۔ میں راضی بقضا ہوں اور ان الحکم الا للہ کا پابند ہوں۔

اس سبکدوشی کے بعد سے ابتک طبابت، دین کی اشاعت و تبلیغ اور رد عوتی دورے کرنا میرا مشغلہ ہے۔

سوال:۔ آپ جماعت اسلامی سے بھی متعلق رہے ہیں، اس تعلق کی نوعیت کیا تھی۔؟

پروفیسر صاحب:۔ میں مسلم اتحاد کا داعی ہوں اور امت کو کلمہ سواء پر قائم رکھنے کا قائل۔ میں جماعت کی بیس پچیس سال تک حمایت کرتا رہا، لیکن جماعت اسلامی کے اندر باقاعدہ ایک دن بھی نہیں رہا۔ ہاں اپنے پلیٹ فارم سے اس کی تصویب کر دیتا تھا کہ یہ بھی دینی جماعت ہے اور ٹھیک کام کر رہی ہے اس لیے چلنے دو اور یہ کہ تبلیغی جماعت والوں کی بہ نسبت ان کا مزاج ہم سے قریب تر ہے۔ وہ خانقاہی لوگ ہیں، پیروں، فقیروں کے معتقد اور یہ ذرا اپنے مسلک سے قریب معلوم ہوتے ہیں۔

سوال:۔ کن اسباب کی بناء پر آپ نے جماعت اسلامی سے اپنی حمایت کھینچ لی؟

پروفیسر صاحب:۔ جب تک جماعت اسلامی میں سیاسی مسائل نہیں آئے تھے اور تبلیغ و طریقہ کار یکساں رہا تب تک میں بعض اختلافات کو انگیز کرتے ہوئے جماعت کی حمایت کرتا رہا۔ لیکن جب گھٹیا سیاسی مقاصد کی کارفرمائی دیکھی تو اسی وقت چھوڑ دیا۔ اس کی بنیادی وجہ ایک واقعہ ہے۔ جب جماعت اسلامی جموں و کشمیر نے اپنے مکتوب سے

الیکشن لڑنے کا فیصلہ کیا تو اس سلسلے میں اس کے لیے ضروری ہوا کہ سیکولر دستورِ ہند کو جسے وہ طاغوت کا نظام کہتی تھی، حلفیہ تسلیم کرلے، جبکہ جماعتِ اسلامی کے دستور کی دفعہ ۳ کا مقتضا یہ تھا کہ جو شخص طاغوت کے آئین کو تسلیم کرتا ہے وہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ کا منکر ہے[1] اس حقیقت کو ان کے لٹریچر میں ایک دو جگہ نہیں، دسیوں جگہ، بیان کیا گیا ہے جب آدمی کلمہ کا منکر ہوگیا تو اس کے پاس اس کے بعد کون سی چیز باقی رہ گئی۔

اس پر امیرِ جماعت جو اس کے ذمہ دارِ اعلیٰ تھے، کہنے لگے: ہم چاہتے ہیں کہ اسمبلی میں اعلاءِ کلمۃ اللہ اور اصلاح کا کام جاکر کریں۔ میں نے کہا کہ اچھا! اسمبلی کے دروازے پر طاغوت کے صنمِ اکبر کو سجدۂ تعظیم و عبادت اور اسمبلی کے اندر وضو کرکے، مصلّی بچھاکر دو رکعت نفل نماز۔ آپ یہی کرنے جا رہے ہیں اسمبلی میں؟ —— فرمانے لگے: بس! اب دونوں مرکزوں کا اتفاق ہوگیا ہے مولانا!! میں نے کہا: دو مرکزوں سے مراد کون؟ کہنے لگے: پاکستان سے بھی ہدایت آگئی ہے اور دہلی سے بھی! —— مودودی صاحب اس وقت زندہ تھے، میں نے کہا: اچھا دونوں مرکزوں کا اور دونوں مرکزوں کے علماء کا اجماع ہوگیا ہے اس پر؟ کہا جی ہاں تقریباً ایسا ہی ہے۔ میں نے کہا پھر سن لیجیے کہ آپ کا اجماع قرآن اور توحید کے خلاف ویسا ہی ہے جس طرح علماءِ یہود تورات کے حکم کے خلاف اجماع کرلیا کرتے تھے۔ اور پھر یہیں سے بات ختم ہوگئی۔

سوال:۔ مولانا مودودی کے حکومتِ الٰہیہ اور اقامتِ دین جیسے مسائل و نظریات پر آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟

---

[1] دفعہ: ۳ درج ذیل ہے جو عقیدہ کی سرخی کے ساتھ جماعت کے دستور مطبوعہ جنوری ۸۱ کے صدا پر مرقوم ہے:

"جماعتِ اسلامی کا بنیادی عقیدہ "لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" ہے یعنی الٰہ صرف اللہ ہی ہے، اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں"۔ اس دفعہ کی تشریح کرتے ہوئے صدا پر لکھا گیا ہے کہ: اس حقیقت کو جاننے اور تسلیم کرنے سے لازم آتا ہے کہ ..... اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو مالک الملک اور مقتدرِ اعلیٰ نہ سمجھے، کسی کو باختیارِ خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز تسلیم نہ کرے، کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے اور ان تمام اطاعتوں کو صحیح تسلیم کرنے سے انکار کردے جو ایک اللہ کی اطاعت اور اس کے قانون کے تحت نہ ہوں۔

واضح رہے جماعت کی رکنیت کی شرطوں میں یہ داخل ہے کہ آدمی اس عقیدہ کی مع تشریح سابق شہادت دے اور اس کو صحیح تسلیم کرے نیز دفعہ ۸ میں یہ درج ہوا کہ ہر رکنِ جماعت کی ذمہ داری ہے کہ اگر وہ کسی بھی غیر الٰہی نظامِ حکومت میں کوئی کلیدی منصب رکھتا ہو یا اس کی مجلسِ قانون ساز کا رکن ہو ... تو اس سے دستبردار ہوجائے۔

پروفیسر صاحب :۔ حکومتِ الٰہیہ کا لفظ مولانا مودودی صاحب نے قرآن یا حدیث سے نہیں لیا ہے ، میں تو اس چیز کو خلافتِ راشدہ کہتا ہوں ۔ تمسکوا بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین تمسکوا بھا وعضوا علیھا بالنواجذ ۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت اور طریقہ کو مضبوطی سے تھامے رہو جو ہدایت یاب ہیں ۔ حکومتِ الٰہیہ درحقیقت بائبل کا محاورہ ہے ۔ حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں :

سرمایہ دار خدائی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے سے نکل جائے ۔

اونٹ کا سوئی کے ناکے سے نکل جانا ممکن ہے لیکن یہ ممکن نہیں ہے جبکہ سرمایہ دار خدائی بادشاہت کی منادی کرتا تھا ، بائبل کے اندر یوحنا نے جگہ جگہ حضرت مسیح سے پہلے آسمان کی بادشاہت کی مثال دی ہے ، غرضیکہ حکومتِ الٰہیہ کی تعبیر ہی بائبل کی ہے ۔ قرآن کی نہیں ، خلافتِ راشدہ کہنا ہی صحیح ہے ۔

سوال :۔ مولانائے محترم ! تو آیتِ قرآنی " اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ " کا آپ کے نزدیک صحیح مفہوم کیا ہے ؟

پروفیسر صاحب :۔ اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ والی آیت میں جن نبیوں کا ذکر کیا گیا ہے ، ان کی زندگیوں سے دین کی جو صورت ثابت ہے وہی اقامتِ دین ہے ۔ سوال یہ ہے کہ انھوں نے اقامتِ دین کیا یا نہیں کیا ؟ شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحا والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ ابراھیم وموسی وعیسی ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ ۔ (الشوریٰ /۱۳)

تمہارے لیے اس دین کو اللہ تعالیٰ نے مقرر کر دیا ہے ، جس کے اختیار کرنے کا حکم نوح کو دیا تھا اور جس کی (اے محمد) ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی ہے اور جس کا ابراہیم موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ دین کو قائم کرو اور اس میں پھوٹ مت ڈالو ۔

حضرت نوح ، حضرت ابراہیم ، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام نے سیاست میں کون سا کام کیا ہے ؟ حضرت موسیٰ نے تو یہ بھی نہیں کیا کہ جب اللہ پاک نے فرعون و آلِ فرعون کو غرق کر دیا تو مصر واپس چلے آتے اور حکومتِ الٰہیہ قائم کر دیتے ؟ ۔ حضرت ابراہیم نے عراق چھوڑنے کے بعد پھر کبھی عراق کا رُخ نہ کیا تو گویا یہ سب دین کے دشمن ہوئے اپنے ملک کو چھوڑ کر چلے جا رہے ہیں ، ہجرت فرما رہے ہیں ۔ بھئی ہجرت تو نام ہی ہے ترکِ وطن کا خدا کی راہ میں اس کی رضا کے لیے ، تو اسٹیٹ کا قیام کہاں ہے ؟ ۔ اگر " اقیموا الدین " کا مطلب یہ بیان کیا جائے کہ سیاست

قائم کرو، اور دینی ریاست کا قیام ہی اقامت دین ہے تو ریاست کہاں قائم ہوئی۔ یہاں تو ترک ریاست ہے
حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں، لومڑیوں کے بھٹ ہوتے ہیں ابن آدم کے لیے سر دھرنے کی بھی جگہ نہیں ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تیرہ سال کی دور میں قبائلی نظام جو عرب میں پھیلا تھا، اسی کے ساتھ زندگی گزاری اور آپ کو حکومت کی پیشکش بھی کی گئی تو آپ نے اسے مسترد کر دیا، قریش کے لوگ تو چاہتے ہی تھے کہ توحید کی تبلیغ سے انھیں چھٹی مل جائے۔ قوم کے سردار بھلے ہی آپ بن جائیں تو اگر حکومت کوئی ایسا لازمی ذریعہ ہوتی کہ اس کے بغیر دین کا کام ہو ہی نہیں سکتا تو بس بہترین موقع ہاتھ آگیا تھا۔ آپ فرماتے کہ اچھا میں آپ کا سربراہ ہوں گا، اور فرماتے کہ دیکھو! عرب کا کلمہ متحد ہو سکتا ہے اور اس کی بنیاد ہے اللہ کی توحید، اللہ کی توحید کے بغیر اتحاد ممکن نہیں ہے۔
اس لیے کہ توحید اور اتحاد کا ماخذ ایک ہی ہے تا ـــــ توحید کا لازمی اثر ہے اتحاد اور اتحاد ہو سکتا ہے وحدتِ دین اور وحدتِ انسانیت کی بنیاد پر اور یہ دونوں بنیادیں آنحضور نے پیش کی ہیں۔: انا خلقناکم من ذکر و انثی وجعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔
(ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھیں قبائل اور گروہوں میں بانٹ دیا تاکہ تم لوگ پہچانے جاؤ۔ بے شک تم میں سے شریف وہ شخص ہے اللہ کے نزدیک جو تم میں پرہیزگار اور متقی ہے۔) یہ تو ہے انسانی وحدت کی بنیاد اور دینی وحدت کی بنیاد: ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاعبدون، دوسری جگہ ہے وانا ربکم فاتقون۔ یہ آیت پانچ چھ جگہ قرآن میں موجود ہے۔

یہ دیکھیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس چیز کو پیش کر سکتے تھے کہ اچھا بھئی! یہ بات ہم سیاسی فارمولے کے طور پر کہہ رہے ہیں دین کی تعلیم کے طور پر نہیں کہہ رہے ہیں۔ سیاسی تعلیم۔ کہا ہے کہ اگر کلمہ کا اتحاد چاہتے ہو یعنی یہ چاہتے ہو کہ عرب کا کلمہ متحد ہو جائے تو اللہ کی توحید پر متحد ہو سکتا ہے، شرکت یا کثرتِ الٰہ کی بنیاد پر کلمہ متحد نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وحدت بٹ جائے گی، کثرت میں۔ اور اس سے تفرقہ پیدا ہو گا۔ کبر علی المشرکین ما تدعوھم الیہ اللہ یجتبی الیہ من یشاء ویھدی الیہ من ینیب۔ ٥ (الشوریٰ/۱۳) جس چیز کی طرف تم مشرکوں کو بلاتے ہو وہ ان کو دشوار گزرتی ہے، اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی بارگاہ کا برگزیدہ کر لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرے اسے اپنی طرف راستہ دکھا دیتا ہے۔

تو مشرکین کے یہاں تفریق کا راستہ ہے اور حکومت کے اندر استحکام منظور ہے ـــــ یہی چیز

سیاسی فارمولے کے طور پر پیش کی جاتی کہ بس یہی حل ہے تو میرا خیال ہے کہ الناس علیٰ دین ملوکھم (لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں۔) کے لحاظ سے لوگوں کے لیے اس کلمۂ توحید کو قبول کرلینے میں کوئی بات ہی نہیں تھی، یہ سیاسی فارمولا بہتر ہوتا۔ اگر وہ شاعر کی زبان سے اسے سن سکتے تھے تو ایک سیاسی کی زبان سے بھی سن سکتے تھے۔ لبیدؔ جو دورِ جاہلیت کا شاعر ہے کہتا ہے: الا کلّ شیءٍ ماخلا اللّٰہ باطل (اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے) یہ لا الٰہ الا اللہ کا ترجمہ ہی تو ہے۔ ایک شاعر کی زبان سے گوارا ہے، نبی کی زبان سے گوارا نہیں۔ لیکن ایک سیاسی انسان اگر سیاسی فارمولے کے طور پر اسے پیش کردیتا تو ٹھیک ہی تھا۔ انکار کی کیا وجہ تھی اور بڑا اچھا کام بھی بن جاتا۔ نہ یہ تمام جنگیں ہوتیں نہ حق و باطل کی اس کشمکش کا وجود ہوتا۔ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو تیرہ سال تک شدائد و مصائب کا سامنا بھی نہ کرنا پڑتا۔ ہجرت کی نوبت ہی نہ آتی، کچھ لوگ تو آپ کے پیروکار ہو ہی جاتے۔ سارے لوگ آپ کی حکومت تسلیم کرلیتے تو حکمرانوں کے دین پر بہت سے لوگ نہ چاہتے ہوئے بھی مجبور ہو کر آجاتے اور جو سیدھے نہ آتے انھیں حکومت کے ڈنڈے سے سیدھا کردیا جاتا۔ بس سارا کام بن جاتا۔ سارے حجاز پر جس کو سیاسی اقتدار حاصل ہوجاتا اور وہ بھی اہلِ عرب کی خواہش سے اس کے لیے کیا تھا۔ ساری اصلاحات جیسے چاہتے کرتے، جس طرح جماعتِ اسلامی چاہتی تھی کہ پاکستان میں سیاسی اقتدار ہاتھ آجائے تو ڈنڈے سے سیدھا کردیں گے۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی سیدھا کردیتے، لیکن آپ نے تو قریش کی درخواست ہی مسترد فرمادی۔

یہ راستہ دین کے بالکل اُلٹ راستہ ہے، ڈنڈے سے نفاق شائستہ ہوسکتا ہے۔ اگر کسی ملک میں نفاق پھیلا ہوا ہو تو وہ حکومت کے ڈنڈے سے شائستہ ہوسکتا ہے۔ ایمان ڈنڈے سے نہیں پیدا ہوتا، یہ ناممکنات میں سے ہے، دل کو ڈنڈے اور کوڑے سے نہیں بدلا جاسکتا۔

سوال:۔ کیا آپ جمعیۃ اہلحدیث ہند یا آل انڈیا اہلحدیث کانفرنس سے منسلک رہے ہیں؟

پروفیسر صاحب:۔ کس طرح کا تعلق؟

سوال:۔ مثلاً آپ کبھی اس کے ممبر یا عہدہ دار رہے ہیں؟

پروفیسر صاحب:۔ ممبری کیا ہے، دس نئے پیسے اور چار آنے فیس والی؟ تو چار آنے اور دس پیسے والی ممبری کو میں سمجھتا ہوں کہ ہماری جماعت اور مسلک کی سخت توہین ہے اور ممبر ہونے اور بننے کی کیا بات ہے بھئی!

کتاب وسنت جس کا طریقۂ کار ہے وہ اہلحدیث ہے۔ جماعت کے ساتھ تا دم مجھے ایسا کوئی انکار بھی کبھی نہیں تھا
میں ہر وقت اس کے لیے تیار تھا، آج بھی ہوں، جب بھی کسی گوشے سے دعوت دی گئی کہ یہ کام ہے تو میں نے لبیک کہا۔
لیکن یہ ہی ممبری والی بات تو اس میں کوئی دم خم نہیں ہے۔

سوال: تو کیا آپ جماعت اسلامی کی حمایت کے زمانہ میں بھی جمعیت اہلحدیث کا کام کرتے تھے؟

پروفیسر صاحب: بالکل، کوئی جلسہ ایسا نہیں ہوتا تھا جہاں بلائے نہ جاتے ہوں۔ لوگوں کو شکوہ بھی ہوتا تھا کہ ایسے لوگوں کو کیوں بلایا جاتا ہے جو در اصل مودودی ہیں۔ جماعت میں تین مودودی ہیں انھیں نہیں بلانا چاہیئے۔ اسی احتجاج پر مولانا قمر بنارسی صاحب کانپور کے دو روزہ اجلاس سے کرسئ صدارت چھوڑ کر چلے گئے تھے، اور کہا تھا کہ ہمیں صدارت کی فرصت نہیں۔ ، ہم منو آئمہ جارہے ہیں اور اس پر منتظمین حضرات نے کہا تھا کہ: ایک بھاری پتھر اٹھا کر کرسی پر رکھدو، ہمیں صدر کی ضرورت نہیں۔

سوال:۔ کن تین حضرات کو مودودی کہا جاتا تھا؟

پروفیسر صاحب: شیخ الحدیث مبارکپوری صاحب کو، مولانا نذیر احمدؒ صاحب کو اور مجھے۔

سوال:۔ آج ہر تنظیم میں نوجوان آگے بڑھ رہے ہیں۔ اگر جمعیت کے تنظیمی کاموں میں بھی نوجوانوں کو آگے بڑھایا جائے تو کیا برا ہے؟

پروفیسر صاحب:۔ بھائی سنیے! دین اسلام کے اندر نوجوان بوڑھے اور مرد وعورت کی کوئی تفریق نہیں ہے، کیا قرآن میں کوئی تفریق ہے؟ ہر جگہ من ذکر وانثیٰ ہے، جو بھی تم میں سے مرد وعورت ہوں۔ ؎

جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

نوجوان اور بوڑھے کی تفریق کس لیے؟ نوجوان اگر بالکل خود رائی سے کام لیں گے تو دھوکہ کھائیں گے غلط کاری کے شکار ہوں گے۔ اگر بوڑھوں کو عمل کے لیے آگے بڑھاتے ہو تو دور اندیشی تو ان میں ہوتی ہے مگر ان کی رفتار ذرا سست اور دھیمی ہوتی ہے۔ جس کے سامنے جو کام آئے اسے کرنا چاہیے۔ اسلام میں غلام، آزاد، مرد، عورت، بوڑھے جوان جو بھی اسلام میں داخل ہو جائیں اپنی اپنی جگہ پہ بہت قیمت رکھتے ہیں۔ ہمارا مسلک کتاب وسنت ہے۔ ہم رسولﷺ اور صحابہؓ کی پیروی کرتے ہیں۔ ان کے یہاں اگر ایسی کوئی تفریق ہو تو بتائیں۔ آپ بھی رکھیں اور اگر نہیں ہے تو انھیں کا طریقہ اپنانا چاہیے۔

سوال :۔ آپ نے غیر ممالک کے دورے بھی کیے ہیں ؟

پروفیسر صاحب : میں ہندوستان سے باہر کبھی نہیں گیا ۔

سوال :۔ عالم اسلام میں ہونے والے واقعات وحوادثات سے آپکا ربط ؟ خصوصاً افغانستان اور پاکستان کے موجودہ حالات پر تبصرہ ہم آپ کی زبان سے سننا چاہیں گے ۔ ؟

پروفیسر صاحب :۔ بھئی ! عالم اسلام افغانستان یا پاکستان کا جہاں تک تعلق ہے یا ان میں سے کسی بھی خطہ کا تو دنیا میں جہاں کہیں بھی مسلمان رہتے ہیں، ایک مسلمان کا ان سے جذباتی، ایمانی اور دینی تعلق ہے اور یہ تعلق جغرافیائی حدود سے بالاتر ہے، چاہے کوئی پاکستان میں رہتا ہو یا ہندوستان میں۔ جہاں کہیں بھی مسلمان ہیں ان سے ہمارا تعلق ہے پاکستان میں ہمارے کتنے رشتہ دار ہیں، ہر خاندان کے کچھ نہ کچھ لوگ پاکستان میں رہتے ہیں، تو خاندانی رشتہ بھی ہے اور دینی بھی، اور دینی رشتہ بہرحال خاندانی رشتہ پر مقدم ہے۔ مسلمان جہاں کہیں بھی ہے : ان اولی الناس بی المتقون من کانوا وحیث کانوا (میرے سب سے قریبی متقی لوگ ہیں، جو بھی ہوں اور جہاں بھی ہوں) ۔ نہ پاکستان کی کوئی تخصیص ہے نہ ہندوستان کی نہ ہی افغانستان کی، اور ہمیں اس کے اظہار میں کوئی جھجک بھی نہیں محسوس ہوتی کہ وہ ہمارے بھائی ہیں اور ہم ان کی خیر کے لیے ان کی فلاح بہبود کے لیے نمازوں تک میں دعا مانگتے ہیں اور اپنے ملک میں جو مسلمان ہیں ان کی بھی خیریت چاہتے ہیں۔ مسلمان سے زیادہ قوم و ملک کا کون خیرخواہ ہو سکتا ہے کہ جب بھی کوئی نیا چاند طلوع ہوتا ہے تو وہ یہ دعا پڑھتا ہے ۔

اللھم اھلہ علینا بالامن والایمان والسلامۃ والاسلام ربی وربک اللہ "

اسلام کے علاوہ دنیا میں کوئی مذہب نہیں ہے جو اپنے مذہب کی یہ دعا دکھا دے کہ جب آدمی نیا چاند دیکھے تو امن کی، ایمان کی، سلامتی کی اور اسلام کی دعا کرے کسی مذہب میں ایسی دعا نہیں نہ عیسائیوں کے یہاں نہ بدھسٹوں کے یہاں نہ آریوں اور سناتن دھرمیوں کے یہاں، سوائے اسلام کے ۔ اے اللہ! اس کو طلوع کر امن کے ساتھ، ایمان کے ساتھ، سلامتی اور اسلام کے ساتھ ۔ دیکھیے امن کے ساتھ ایمان کو اور اسلام کے ساتھ سلامتی کو جوڑ دیا ہے کہ ہمارے ملک میں امن وسلامتی کا دور دورہ ہو ۔ دکھلا سکتے ہیں آپ کسی مذہب میں ایسی دعا ؟ ۔

سوال :۔ آپ نے تقریر میں فرمایا کہ آپ نے پاکستان کے صدر صاحب کو نظام اسلامی کے بارے میں کچھ لکھا تھا ؟

پروفیسر صاحب :۔ نہیں میں نے کوئی خط نہیں لکھا تھا بلکہ "مسلم" (پندرہ روزہ سری نگر) میں میرے

بعض مضامین میں روئے خطاب ان کی طرف تھا۔ "مسلم" جماعت اہلحدیث جموں وکشمیر کا پرچہ ہے وہ مختلف اداروں اور لیڈروں کے ساتھ پاکستان میں جنرل ضیا کو بھی بھیجا جاتا ہے۔ اس میں ایڈیٹر نے لکھا تھا کہ: خبردار! مولویوں کو حکومت مت دینا!! جن کو حکومت کرنا نہیں آتا، جن بیچاروں سے اپنے گھر کا نظام، بیوی بچوں کا نظام نہیں سنبھل پاتا وہ پورے ملک کا نظام کیا سنبھالیں گے۔ کب انھوں نے صلاحیت پیدا کی ہے؟ ایک مدت تو تعلیم میں صرف ہو گئی جب قال اقول کی تعلیم سے فراغت ہوئی تو فوراً ہی ازدواجی زندگی میں قدم رکھا اور سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے معاشی مصیبت سر پر آن پڑی جس کے لیے تیار ہی نہیں تھے اور پھر اوپر سے ایک سیاسی مصیبت ڈال دی جائے تو نہ دین کے رہیں نہ دنیا کے۔ لہٰذا علماء کو اس زحمت سے معاف رکھنا چاہیے۔ ——— ابن خلدون نے لکھا ہے کہ "عالم سیاسی ہوتے ہی نہیں۔" بڑا مورخ ہے اور تاریخی تجزیہ شاید ہی اس سے اچھا کسی نے کیا ہو۔ اور جب بھی کسی بزرگ کو حکومت کی گدی پر بٹھا دیا گیا ہے تو حضرت علیؓ کی طرح حکومت فیل ہو گئی ہے۔ بیچارے تہجد گزار، عابد، زاہد، متوکل، اور ان کو پکڑ کر مہاجرین وانصار نے حضرت عثمانؓ کے قتل کے بعد بٹھا دیا کہ صاحب! آپ کے سوا ہے کون؟ چاہتے بھی نہیں تھے بیچارے، زبردستی جب ان کے سر حکومت منڈھ دی گئی تو پانچ سال میں سوائے خانہ جنگی کے ایک کام بھی نہیں ہوا۔ ——— خمینی صاحب آئے تو دیکھیے ایران کے سارے جنرلوں کو ختم کر دیا اور مودودی صاحب ہوتے تو شاید پاکستان کے بھی سارے جنرل ختم ہو جاتے۔ یہ تو اچھا ہی ہوا کہ نہیں ہوئے۔

سوال: لیکن مولانا! مودودی صاحب تو پورے مولوی بھی نہیں تھے۔

پروفیسر صاحب:۔ ہاں بھائی! پورا مولوی نہ ہونا بھی بہت بڑا خطرہ ہے۔ پورا مولوی ہونا چاہیے تبھی تو مولویوں کو سمجھے گا، پھر سیاست بھی پڑھنا چاہیے اور اس کے داؤ پیچ سے بھی واقف ہونا ضروری ہے، ہر زمانہ کی سیاست کا ایک الگ مزاج ہوتا ہے، اس زمانے میں سیاسی وہی ہو سکتا ہے نا، جو حریف سیاسیوں کے داؤ پیچ سمجھے، اور مولویوں کو یہ مکاریاں کہاں آتی ہیں جو آج کی سیاست کا جزو بنی ہوئی ہیں۔؟ ابن الوقتی، دروغ گوئی، مصالحت (Compromise) اور تینوں چیزیں اخلاقی طور پر گری ہوئی ہیں، مگر یہی آج کی سیاست کا لازمہ ہیں۔ ——— کیا ایسی سیاست کا دین سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے، جس میں تین تین بداخلاقیاں اس کا جزو بنی ہوئی ہوں اور اس کے سوا آج کی سیاست کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے ——— ہاں اس سیاست کی بات کیجیے جو خلفائے راشدین کی سیاست تھی، وہ ایمان اور تقویٰ کی سیاست تھی، لیکن پاکستان میں جماعت اسلامی کے لیے تو لازم ہے

جو کھیل کھیلا گیا وہ عجیب ہی ہے۔ فاطمہ جناح کو مودودی صاحب جنرل محمد ایوب خاں کے گرانے کے لیے لا رہے ہیں مشرقی و مغربی بلاد میں غلاف کعبہ کی نمائش ہو رہی ہے اور اس کے جلوس میں جن لوگوں نے بڑی گرمجوشی سے شرکت کی اس پر بہت ہی خوشی کا اظہار کیا گیا کہ ماشاء اللہ ہر زبان اللہ کے ذکر سے تر تھی۔ غلاف کعبہ کے جلوس میں اللہ کا ذکر اور عام مجالس میں ذکر اللہ پر پھبتیاں! اقبال کا یہ شعر آپ نے اکثر ان کے علماء کی زبانی سنا ہوگا ؂

مست رکھو ذکر و فکر صبحگاہی میں اسے ۔ پختہ تر کر دو مزاج خانقاہی میں اسے

گویا ذکر صبحگاہی خانقاہیت ہے۔ قرآن پاک تو یہ کہتا ہے: ولذکر اللہ اکبر (اور اللہ کا ذکر سب سے بڑا ہے۔) واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون۔ (اور اللہ کا زیادہ سے زیادہ ذکر کرو تاکہ فلاح یاب ہو جاؤ)

فرمایا: ان المسلمین والمسلمات والمومنین والمومنات والقانتین والقانتات والصدقین والصدقات والصابرین والصابرات، والخشعین والخشعات والمتصدقین والمتصدقات والصائمین والصائمات والحفظین فروجھم والحفظات والذاکرین اللہ کثیرا والذاکرات اعد اللہ لھم مغفرۃ واجرا عظیما۔ (الاحزاب/۳۵)

(جو لوگ خدا کے آگے سر اطاعت خم کرنے والے ہیں) یعنی مسلمان مرد مسلمان عورتیں، مومن مرد اور مومن عورتیں فرمانبردار مرد اور فرمانبردار عورتیں اور راست باز مرد اور راست باز عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، فروتنی کرنے والے مرد اور فروتنی کرنے والی عورتیں، خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں، روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں، خدا کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں، کچھ شک نہیں کہ ان کے لیے خدا نے بخشش اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

قرآن جابجا ذکر کثیر کی تلقین کرتا ہے اور ذکر قلیل کرنے والوں کو منافق کہتا ہے، منافقین کے ذکر میں وارد ہوا: ولا یذکرون اللہ الا قلیلا (اور وہ یعنی منافقین اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔) مذبذبین بین ذلک لا الی ھؤلاء ولا الی ھؤلاء (نساء) معلوم ہوا کہ ذکر قلیل کرنے والے منافق اور ذکر کثیر کرنے والے مومن، اور یہاں ذکر پر پھبتیاں یوں کسی جاتی ہیں۔

سوال: [illegible] کے بارے میں رابطہ عالم اسلامی ایران کے ساتھ آپ کی خط و کتابت کی اصل بنیاد کیا ہے۔

اور اب تک اس سلسلے میں کیا پیش رفت ہوئی ہے؟

پروفیسر صاحب: - سید علی خامنہ ای ایران کے موجودہ وزیر اعظم، وزیر اعظم ہونے سے قبل کشمیر آئے تھے۔ بلکہ میں آغا سید محمد الموسوی صاحب جن سے میری ۱۹۶۲ء سے جان پہچان ہے، جان پہچان کیا؟ ہوا یوں کہ اس وقت ایک بین جماعتی رابطہ کی شکل پیدا ہوگئی تھی اور ایک مجلس، مجلس تحفظ اسلام کے نام سے قائم ہوئی تھی جس کے رکن آغا صاحب بھی تھے اور میں اس کا کنوینر تھا۔ وہ تحریک صوفی صاحب (صوفی نذیر احمد کاشمیری) اور میں نے مل کر چلائی تھی، اس میں جماعت اسلامی اہلحدیث، شیعہ، سنی اور حنفی سب ایک ہی پلیٹ فارم پر آگئے تھے۔ اور اس اتحاد کا نام مجلسِ تحفظ اسلام تھا۔

—— تو انہی آغا صاحب سے سید علی خامنہ ای نے غالباً پوچھا تھا کہ یہاں اہلسنت میں سے بھی کوئی ہے۔ انھوں نے میرا تعارف کرا دیا اور بغیر کسی پیشگی توقع کے وہاں سے خط و کتابت جاری ہوگئی، رابطہ قائم ہونے پر وہاں سے خمینی صاحب کا ایک رسالہ بھیجا گیا جس میں آیت اللہ خمینی نے لکھا تھا کہ جو دین کو سیاست سے علیحدہ سمجھتا ہے، وہ نہ دین کو جانتا ہے نہ سیاست کو، —— میں نے اس کے جواب میں ان کے دہلی کے مرکز کو لکھا کہ جو دین و سیاست کو ایک کہتا ہے نہ وہ دین سمجھتا ہے اور نہ سیاست سمجھتا ہے۔ کوئی دس بارہ صفحہ کا ایک مضمون رہا ہوگا، خیر اس پر اس وقت انھوں نے خاموشی اختیار کر لی —— اس کے بعد ایک اور خط آیا کہ ڈھائی ہزار سالہ ساسانی حکومت کو ہم نے ایک زبردست انقلاب کے ذریعہ اکھاڑ پھینکا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس انقلاب کو اسلامی انقلاب بنائیں آپ اس بارے میں مشورے دیں۔ میں نے سولہ صفحات کا ایک خط لکھ دیا، جس میں ایک بات یہ بھی تھی کہ ایران اور عراق کی جنگ اگر آپ کے دشمن امریکہ اور اسرائیل کے حق میں جاتی ہے تو فوراً یکطرفہ طور پر بند کر دینا چاہیے اور اگر آپ اس انقلاب کو پوری ملت کے لیے بنانا چاہتے ہیں تو شیعہ سنی اختلافات بھی ختم کرنا پڑیں گے جو اسلام کے اندر رونما ہونے والا عہدِ صحابہ میں پہلا اختلاف ہے۔ اس سلسلے میں میں نے چند مثالیں بھی دی تھیں۔ نیز اس میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہ کے مابین ہونے والی جنگ کو میں نے سیاسی خانہ جنگی کہا تھا، جنگِ جمل و جنگ صفین میں دونوں طرف سے کوئی ایک لاکھ افراد قتل ہوگئے اس کے باوجود ہر ایک نے دوسرے کو مومن اور جنتی کہا، کسی نے کسی کے ایمان میں ذرہ برابر شبہ نہیں کیا۔ لہٰذا یہی طریقہ آپ کو بھی اپنانا چاہیے، صحابہ اور اہلبیت کی پیروی میں ——

وہاں سے جواب آیا کہ آپ کی اتحادِ عالم اسلامی کی کوششوں کو ہم بنظرِ استحسان دیکھتے ہیں اور بہت شکرگزار ہیں کہ آپنے ہمیں بہت ضروری قسم کی نصیحتیں کیں، لیکن چند باتیں اس سلسلے کی ہم سمجھنا بھی چاہتے ہیں کہ آپنے علی بن ابی طالب خلیفہ برحق اور باغیِ اسلام معاویہ کی اس جنگ کو خانہ جنگی کہا ہے حالانکہ یہ دینی اختلاف تھا اور یہ کہ معاویہ نے رشوت دیکر حضرت حسن اور دیگر اہل بیت کو راضی کر لیا تھا۔ (حضرت حسن کے ساتھ جو تصفیہ ہوا تھا اس میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اہواز کا سارا خراج ۲۰ لاکھ درہم آپ کو ملے گا)

میں نے جواباً لکھا کہ یہ اختلاف یقیناً سیاسی اختلاف تھا نہ کہ دینی۔ اس لیے کہ دین تو تیس سال پہلے ہی "الیوم اکملت لکم دینکم الخ" کے ساتھ مکمل ہو گیا تھا۔ رہی رشوت والی بات تو یاد رکھیے کہ اللہ کے رسول نے فرمایا ہے کہ "الراشی والمرتشی فی النار۔ (رشوت دینے والا اور لینے والا دونوں جہنم میں۔) اس طرح آپ اپنے ہی ہاتھوں اہلبیت رضوان اللہ علیہم پر ایک اتہام رکھ کر جہنم رسید کر رہے ہیں، یہ رشوت نہیں تھی بلکہ جس طرح اور زمانہ میں صحابہ اور اہلبیت کے ساتھ سلوک و احسان خلفاء کا وطیرہ تھا، حضرت معاویہ نے بھی لیا۔

اس خط کے بعد اب جو خطوط آئے ہیں اس میں صاف طور پر جناب حضرت معاویہ، لکھا ہوا ہے:
خلافت کی یہ بحث اور دیگر خطوط و مکاتیب دونوں طرف کے ملا کر اب تقریباً ایک ہزار صفحات ہو چکے ہوں گے۔ اس کا سلسلہ شاید اب بھی چلے۔

سوال:۔ ہندوستان میں دعوت و تبلیغ کے لیے کس قسم کا طریقہ کار مفید ہے؟
پروفیسر صاحب:۔ وہی طریقہ جو اللہ کے رسول اور آپ کے صحابہ کرام کا تھا: لن یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا آخری امت بھی اسی طریقہ سے صحیح ہوگی جس طرح اول امت درست ہوئی تھی۔

سوال:۔ ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات جیسے مسلم مسائل کا حل کیا ہے؟
پروفیسر صاحب: ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات، اس کے حل کی ہمیں ضرورت؟ آج مقصدِ زندگی سے ہٹ کر مسلمان ذرائع کا بھکاری بن گیا ہے۔ ہمیں اردو کا حق دے دیا جائے، ہمارے سر سے خوف و ہراس کی فضا دور کر دی جائے، غرض ہر چیز کی بھیک مسلمان ہندوستان کی حکومت سے مانگتا ہے۔
دیکھیے نا صاحب! حقوق مانگنے سے نہیں ملتے، اگر ہم اپنے دینی مقصد کے اندر لگ جائیں تو ہمارے

پیچھے پیچھے یہ حقوق کی ٹوکری لے کر دوڑیں گے کہ میاں جی! یہ حقوق ہیں اور اب ہم اردو کا حق بھی ماننے کے لیے تیار ہیں ٹھیک اسی طرح جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دین کی تبلیغ شروع کی تو مشرکین نے کہا کہ حکومت لے لیجیے صاحب! اے صاحب ہم تو چاہتے ہیں کہ آپ کو اپنا بادشاہ بنالیں، ہر قبیلہ کا سردار آپ کو لڑکیاں دینے کے لیے تیار تھا یہ لوگ کہتے تھے کہ مال و دولت کے ڈھیر آپ کے قدموں پر لگادیں، آپ خواہ مخواہ دین اور توحید کے نام سے ہمارے باپ دادا کے دین کی دھجیاں اُڑائے جاتے ہیں ـــــ گویا یہ آپ کی بے وقت کی شہنائی ہے کام کرنے کا یہ ہے کہ آئیے اور ہمارے سربراہ بنیے۔

تو آپ ابھی ہندوستان سے حق مانگ رہے ہیں اور وہ ایک ٹکڑا دینے کو تیار نہیں لیکن جب ہم مستغنی ہوکر کام کریں گے تو پھر یہ لوگ پیچھے پیچھے دوڑیں گے کہ آپ تو ٹکڑا مانگتے تھے لیجیے ہم سے کل حقوق لیجیے ـــــ یہی ہوتا ہے اور ہوتا آیا ہے ـــــ یہ بہت بڑے نکمے پن کی علامت ہے کہ ہمیں اردو کا حق دیدو، ہمیں فلاں حق دیدو ـ ارے بھائی! اسی حق کی بنیاد پر تو ملک کا بٹوارہ ہوگیا کہ لیجیے حضرت، ہم آپ کو چوتھائی حصہ لیے دیتے ہیں، جائیے اور وہاں اپنے طرز کی حکومت بنائیے، اب تین چوتھائی کے اندر آپنے وہی جھگڑا چھیڑ دیا۔

ـــــ تو سوال یہ ہے کہ ہم حقوق کی بات کیوں کرتے ہیں؟ میں تو اُن سے کہتا ہوں کہ حق وغیرہ سب اپنے پاس رکھو صرف ایک حق ہے جو ہم منوالیں گے اور اس سے زیادہ کوئی حق بات ہے ہی نہیں ـ تمھاری ہر چند ہم مان لیں گے، کھانے پینے میں، رہن سہن میں، سب جائز ہے، مگر ایک سچائی جس سے بڑی کوئی سچائی نہیں جس سے واضح کوئی حقیقت نہیں ہم منواکر رہیں گے وہ ہے لا إله إلا الله ـــــ اس بزم میں تم چلے آؤ اور بھاجی ہمیں کھلوا دو، کوئی پرواہ نہیں، زندگی بھر بھاجی کھائیں گے، کون سی پریشانی کی بات ہے گوشت کھانا کوئی Compulsory (لازمی) ہے کیا؟ گوشت اللہ نے حلال کیا ہے، تو حلال سمجھیں گے، حلال ہونے کا اعتقاد رکھیں گے ـ سارا ہندوستان لا إله إلا الله پڑھ لے تو ہم زندگی بھر گوشت نہ کھائیں ـ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ، حضرت یعقوبؑ نے نذر مانی تھی کہ اللہ پاک نے اگر گٹھیا کے مرض سے شفا بخشی تو ہم اپنی محبوب ترین غذا چھوڑ دیں گے ـ اس کی رضا کے لیے یعنی اونٹ کا گوشت ـ جی ہاں! یہ حضرت یعقوب کی نذر تھی جسے بنی اسرائیل نے بھی حرام کرلیا اور یہ ان کا اپنے اوپر ظلم تھا، کیونکہ یہ نذر تھی اور نذر کہتے ہیں غیر لازم چیز کو اپنے اوپر لازم کرلینا، کس نے یہ کہا تھا کہ اونٹ کا گوشت نہ کھانا ـ سارے بنی اسرائیل کھا

مذہب ہوگا لیکن جب انھوں نے ظلم کیا تو "فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات احلت لھم وبصدھم عن سبیل اللہ کثیرا" کہدیا۔ اونٹ کا گوشت ان کے لیے حلال تھا لیکن انھوں نے خود حرام بنالیا تو اسی کے مطابق حکم نازل ہوگیا، کیوں کہ اونٹ کا گوشت کھانا تم تقصیر ہی سمجھتے ہو تو تعقیہ کیسے کروگے چلو احرام کردیا اب رسولِ برحق پر ایمان لاؤ تو پھر اونٹ کا گوشت کھاسکتے ہو: ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم (الاعراف ۱۵۷)
(اللہ کے رسول طیبات کو حلال کرتے ہیں اور خبائث (ناپاک) کو حرام اور ان سے ان کے بوجھ اور بیڑیوں کو دور کرتے ہیں۔

سوال:۔ مولانائے محترم! آپ کی زندگی کا اہم اور عبرتناک واقعہ کون سا ہے؟ ہم اسے سننا چاہیں گے۔

پروفیسر صاحب: بغیر ادنیٰ تامل کے بول پڑے کہ میری زندگی کا حیرت انگیز اور عبرتناک واقعہ میری جیل یاترا ہے: "وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا" آپ نے بتانا شروع کیا:

یہ ۱۹۷۱ء کی بات ہے کہ ہندوستان کے ممبران پارلیمنٹ نے وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی پر زور دیا کہ بنگلہ دیش کے حالات کو دیکھتے ہوئے وہاں مداخلت ضروری ہے۔ مجھے یہ بات سوجھی کہ یہ مسلمانوں کو ایک طرح کا طعنہ دیا جارہا ہے کہ انھیں ملک و قوم سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تمام مشورے غلط ہیں کوئی مشورہ خیراندیشی پر مبنی نہیں، سب میں جذباتیت کی آمیزش ہے اور میں نے بحیثیت ایک مسلمان ہندوستانی کے اپنی تقریر میں کہنا شروع کردیا کہ اندرا جی آپ کا الزام بالکل غلط ہے اور پارلیمنٹ کے فاضل ممبران نے جتنے مشورے دیے ہیں ان میں سے کوئی صحیح نہیں ہے میرا مشورہ محفوظ رکھیں کہ ہندوستان بنگلہ دیش میں مداخلت کرکے چین سے نہیں رہ سکتا اور بنگلہ دیش ہمیشہ ہندوستان کے ہاتھ میں نہیں رہ سکے گا اور ایسا ہی ہوا بھی، واقعات نے اس کی تصدیق کی کہ ۱۹۷۵ء میں بنگلہ دیش شیخ مجیب کے قتل کے ساتھ ہی ہندوستان کے ہاتھوں سے نکل گیا۔

غرض اتنی سی بات اور یہی جرم بے گناہی تھا جس کی بنا پر مجھے ۱۲ جولائی ۱۹۷۱ء کو قومی سلامتی ایکٹ کے تحت گرفتار کرلیا گیا۔

جیل بہر حال جیل ہے، ابتر حالات دیکھ کر شروع میں گھبراہٹ محسوس ہوئی لیکن پھر جب معمولات متعین ہوگئے تو میں مطمئن ہوگیا۔ اپنے بچوں کو بھی ہدایت کردی کہ خبردار! کسی قسم کی گھبراہٹ کا اظہار نہ ہونے پائے

جیل میں میں نے دیکھا کہ بہت سے لوگ الگ الگ نماز پڑھتے ہیں اور کتنے مسلمان ایسے ہیں جو نماز ہی نہیں پڑھتے پہلے میں نے تمام حضرات کو باجماعت نماز کی ادائیگی کے لیے افہام و تفہیم کرکے آمادہ کرلیا، اس کے بعد جتنے بے نمازی تھے انھیں بھی نماز کی طرف مائل کرلیا، اس طرح ایک بڑی تعداد باجماعت نماز میں شریک ہوتی تھی ساتھ ہی باقاعدہ جمعہ کا قیام عمل میں آیا اور بعد نماز فجر درس قرآن کا سلسلہ بھی چل نکلا۔ اس طرح ایک اچھا اور صاف ستھرا ماحول جیل کی چہار دیواری کے اندر وجود میں آچکا تھا۔ نماز کی امامت اور خطابات میرے ہی ذمہ تھے، اور اذان اتفاقاً میری ہی بیرک کے ساتھی کے حصہ میں آئی۔ سکون و اطمینان سے بھری ہوئی اتنی پاک فضا اور آلائشوں سے محفوظ ماحول زندگی بھر نہیں ملا۔ فطری طور پر مسرت کی ایک ہوک سی اٹھتی تھی، جمعہ کے خطبات اور دیگر مسائل پر تقاریر سے جیل کے ساتھیوں میں ایک انقلابی جوش پیدا ہو گیا تھا۔ اور ان کی کایا پلٹ ہو چکی تھی۔ جیل کے حکام اس تبدیلی پر بےحد پریشان تھے۔ بار بار مجھے متنبہ کیا گیا تقریروں سے بھی منع کیا گیا ــــ ایک آدھ مرتبہ ایک آدھ بہی خواہ حکام نے یہ بھی کہا کہ تقریر جیل سے باہر کی جاتی ہے میں نے جواب دیا کہ جناب! میں جیل کے باہر ہی تو تقریر کررہا تھا، آپ نے خواہ مخواہ مجھے قید کیا۔ اس میں میرا کیا قصور ہے۔؟

جیل میں یہ معمول تھا کہ ہفتہ میں ایک دن قیدیوں کو فلم دکھائی جاتی تھی۔ میں نے اس کے خلاف حکام سے احتجاج کیا اور کہا کہ آئندہ اگر یہ سلسلہ بند نہ ہوا تو میں خود پردہ پھاڑ دوں گا اور سارا ساز و سامان برباد کردیا جائے گا۔ اس مخرب اخلاق شے کے خلاف دوسرے قیدیوں نے بھی میرا ساتھ دیا اور اس کے بعد پھر کبھی فلموں کی نمائش میری موجودگی میں نہ ہو سکی۔

شب و روز یوں ہی گزرتے رہے، ایک روز میں نے خواب دیکھا کہ جیل کی تمام دیواریں گر گئی ہیں، تمام قیدی بھاگ گئے ہیں لیکن میں ابھی اسی میں پڑا ہوں۔ اپنی بیرک کے ایک دوست سے بیان کیا تو کہنے لگا کہ میں معبر تو نہیں ہوں لیکن اتنا بتا سکتا ہوں کہ تمام لوگ اس میں رہیں گے، اور آپ سے گھبرا کر حکام آپ کو رہا کردیں گے۔

آخر کار وہ دن آ ہی گیا، رمضان نصف سے زیادہ گزر چکا تھا اور میں اعتکاف کی تیاریوں میں مشغول تھا ارادہ تھا کہ جیل ہی میں شاندار عید منائیں گے، اسی درمیان حکومت نے میری رہائی کا حکم جاری کردیا اور ۱۹ نومبر ۱۹۷۰ء مطابق ۲۰ رمضان کو میرا پروانۂ رہائی آ گیا۔ میں نے باہر جانے سے انکار کردیا، لیکن یہ تو قضائے مبرم جیسی صورت تھی، اور مجسٹریٹ کی کار سے مجھے اپنے گھر پہنچا دیا گیا۔ یہ رہا میری زندگی کا اہم ترین واقعہ۔

سوال :۔ اخیر میں عرض خدمت ہے کہ دینی طلبہ خصوصاً سلفی طلبہ کے لیے آپ کا کیا پیغام ہے ؟

پروفیسر صاحب : آپ اگر دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں تو اس کا صرف ایک مقصد ہونا چاہیے اور وہ ہے رضائے الٰہی جس میں جذبۂ خدمت دین شامل ہے ۔ اگر اس مقصد میں کھوٹ پیدا ہوئی تو پھر سب بیکار ہے ۔ ایک طالبعلم کی زندگی سپاہی جیسی زندگی ہونی چاہیے جو ہر کام تعین اور سلیقے کے ساتھ کرے ، اسے خود کو کدو کاوش اور محنت کا خوگر بنانا چاہیے ۔ آج جس طرح طلبہ کو آرام پہنچا کر پڑھایا جا رہا ہے مجھے تو یہ عیاشی دیکھ کر افسوس ہوتا ہے ۔ درحقیقت طلبہ کے لیے تعیش پسندی بڑی بُری چیز ہے ہمارے اسلاف نے حصول علم میں بڑی پتہ ماری اور مشقت برداشت کی ہے اور دنیا جانتی ہے کہ ان میں کتنے نوابغ روزگار پیدا ہوئے مجھے حیرت ہوتی ہے کہ صرف اس بے راہ روی کی وجہ سے طلبہ کا اور علم کا معیار گرتا چلا جا رہا ہے ۔ طلبہ مختلف قسم کے ہنگامے کرتے ہیں ، ان کے عجیب و غریب مطالبات ہوتے ہیں ۔ یہ روش بیحد خطرناک ہے ۔

ہمارے اندر تعیش اور جذبۂ رضا کے فقدان نے بہت سے مسائل پیدا کر دیے ہیں ۔ میں تو آپ کو مشورہ دوںگا کہ ہر شخص اپنے والدین کے یہاں ابھی لکھ دے کہ اگر آپ استطاعت رکھتے ہوں تو پھر میں مفت میں پڑھنے کے لیے تیار نہیں ہوں ، میرا سارا خرچ آپ بھیج دیجیے ۔ اس طرح تعیش پسندی کی ایک اور وجہ عربوں کے وہ پیسے ہیں جو ہمارے مدارس میں آتے ہیں ۔ میں تو کہتا ہوں ہم کو (طلبہ کو) عربوں کے صدقہ و خیرات کی مطلق ضرورت نہیں ۔ ان سے کہہ دو کہ ہم سے ثواب کمانے کی کوشش نہ کریں ، ہندوستان میں آپ کی دولت کے اور بہت سے مفید مصارف ہیں ۔ ہندوستان میں دعوت و تبلیغ کے بہت سے کام ہیں ـــــــ (اخیر میں آپ نے بڑے جوش اور ایمانی عزم کے ساتھ فرمایا کہ) یاد رکھو ہندوستان کا مقدر لا إله إلا الله ہے اور اس کی قسمت اسلام ہے ، وہ آج اسے تسلیم کرے یا کل ، اور یہ کام طلبہ کی اس نئی نسل ہی کو انجام دینا ہے ۔"

رات نصف سے زیادہ بیت چکی تھی اس لیے ہم نے پروفیسر صاحب کی ان نصائح اور توجہات کا شکریہ ادا کیا ، اور اٹھ کھڑے ہوئے ۔

●●●

عالمِ اسلام

"آغا خوش آمدید!"

شیخ عبدالمعید

اہلِ بیت اور سیادت کی دہائی دے کر ہوسناکوں نے ہمیشہ ملتِ اسلامیہ کا شیرازہ پارہ پارہ کیا ہے اور اس کے لئے سبائیت ، برابر سہارا بنی ہے ۔ ہندوستان کو بھی سبائیت نے کم نقصان نہیں پہنچایا ہے ۔ ہمایوں کو شیر شاہ سوری نے پندرہویں صدی عیسوی کے چوتھے دہے میں ہندوستان سے مار بھگایا ۔ وہ دوبارہ ایرانی طاقت کا سہارا لے کر آیا تو ہندوستان پر اپنا اقتدار مضبوط کیا ، اس نمایاں عسکری قوت کے ساتھ ایرانی افکار کا ریلا بھی آیا ۔ ماضی میں ہندوستان کی علمی سطح پر فقہ و تصوف کا تورانی عنصر کی بنا پر غلبہ تھا ، اب لوگ معقولات کی طرف بڑھنے لگے ، اب ہر طرف "آغا خوش آمدید" کا نعرہ لگنے لگا ، فارسی شاعری فارسی تہذیب کا دور دورہ شروع ہوا اور اسی کے بعد میر باقر نے جواہر خمسہ ، مرزا صدر الدین نے صدرا ۔ اسفار اربعہ ، میر زاہد نے الافق المبین ، ملّا محمود نے الشمس البازغہ اور ملا محب اللہ بہاری نے سلم ، مسلم وغیرہ لکھی ۔ تورانی عنصر (اہلسنت اصحاب فقہ و تصوف) ایرانی عنصر (شیعہ عجمی افکار فارسی ادب اور معقولات کے حامل) سے متاثر ہو گیا اور مغل فرمانروا ایرانی عنصر کے ساتھ رواداری برتی اور ان کی ناز برداری کرتی رہی ۔ اس رواداری ، ناز برداری اور ممنونیت کی بنا پر شیعیت اور سبائیت کو فروغ ملتا رہا ۔ عالمگیر رحمہ اللہ کے بعد جب مغل حکومت کی چولیں ڈھیلی ہوئیں ، ہر طرف انتشار و پراگندگی چھا گئی ۔ ساحلی علاقوں پر مغربی قزاقوں کی ہماہمی شروع ہوئی اور پھر کلائیو نے بنگال ، بہار اور اڑیسہ کو کمپنی بہادر کے نام پٹہ لکھا لیا سکھوں اور مرہٹوں نے اودھم مچائی ، پھر ان کا قضیہ ختم ہوا تو سادات بارہ (شیعہ حضرات) کے دو امراء حسین علی خان اور حسن علی خان نے مغل فرمانرواؤں معز الدین جہاں دار شاہ اور فرخ سیر میں خانہ جنگی شروع کرا دی ۔ جہاندار کو قتل

کر کے فرخ سیر کو، شاہ شطرنج، بنا کر بٹھایا اور خود حکومت کرتے رہے اور اہلسنت کی وہ تضحیک کی کہ ان کے خلاف تمام غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی جس کے نتیجے میں ان کا قصہ پاک ہوا۔

زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ ۱۱۵۰ھ میں نادر شاہ نے ہندوستان پر زبردست حملہ کیا اور شاہ اودھ نے یکطرفہ بے وقت بڑی عیارانہ جنگ چھیڑ کر خود کو گرفتار کرایا اور رہ نمائی کر نادر شاہ کو لال قلعہ لے گیا، پھر دلی میں جو لوٹ مچی ہے وہ تاریخ کا ایک خونچکاں باب ہے۔

مغل فرمانروا نیم جاں ہو ہی چکے تھے اس حملے نے رہی سہی کسر پوری کر دی اور دو صدی بعد ایرانی احسان کا بدلہ نادر شاہی حملے نے چکالیا، اور ساتھ ہی شیعہ حملہ آور اپنے بیٹے نصر اللہ مرزا کے عقد میں ایک مغل شاہزادی بھی لے گیا۔ اور پھر سبائیت کے پھلنے پھولنے کے لیے راستہ ہموار کر گیا۔ مصاہرت کے بعد اس پر کوئی چوں چرا نہیں کر سکتا تھا۔

اس فکری طوفان نے تباہی مچانی شروع کر دی تو اس کی روک تھام کے لیے اہل سنت کے گل سرسبد ولی اللہی خانوادے کو ہاتھ باندھنی پڑی، اسی دور میں شاہ ولی اللہ نے اپنی شاہکار کتاب ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء اور قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین لکھی اور شاہ عبدالعزیز نے تحفہ اثنی عشریہ تصنیف کی یا حکیم مرزا محمد کامل کے بقول خواجہ نصر اللہ کابلی کی کتاب صواقع کا ترجمہ کیا، لیکن نواب نجف خاں کی دارو گیر کے ڈر سے کتاب پر مصنف کی حیثیت سے اپنا نام نہیں دیا بلکہ ایک فرضی نام غلام حلیم کے نام سے کتاب شائع ہوئی۔

مسلم ہندوستان میں تشیع کی کرم فرمائیوں کے یہ اہم واقعات ہیں، اگر مسلم تاریخ میں برصغیر میں تشیع کی کرمفرمائی کا جائزہ لیا جائے تو نہ معلوم کتنے "بغداد" و "دہلی" خاک و خون، دھوئیں اور شعلوں میں لپٹے نظر آئیں گے۔

آج کل کے ایک واقعہ سے ان کی اہلسنت دشمنی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بنارس دوسی پورہ محلہ میں سوا سو سال پرانی دو قبریں ہیں، سوء اتفاق کہ شیعہ وقف کی ان قبروں پر ملکیت ثابت ہوگئی اس کے بعد ان دونوں قبروں کو اس بقعہ میں ہٹا دینے کا فیصلہ سپریم کورٹ نے سنا دیا، اور اس سلسلے میں ذمہ داروں کو کوتاہی کرنے اور رکاوٹ ڈالنے پر سخت سزا کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ یہ ہے ان کرمفرماؤں کی وسعت ظرفی۔ یہی کرم فرما اسی وسعت ظرفی کے ساتھ آج اتحاد اسلامی کا نعرہ بلند کیے ہوئے ہیں۔ ایک حقیقت پسند انسان اس ایک واقعہ سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ ان نعروں کی کیا حقیقت ہے۔

خمینی انقلاب کے بعد تشیع نے پھر اپنا تاریخی کردار ادا کرنے کی کوشش شروع کر دی ہے اور اپنا دو چہرہ بنا رکھا ہے، ایک سبائیت، کا دوسرا اسلام کا اور اس کی خاطر زبردست پروپیگنڈہ مہم جاری کر رکھی ہے اور اپنی داخلی و

خارجی سیاست کو بیباکی کے بہانے چلا رہا ہے ۔ خمینی انقلاب کے چار سالہ دورِ حکومت اور نفسیات پر جن کی نظر ہے انھیں خوب معلوم ہے کہ سبائیت پر پھر شباب آ رہا ہے ۔

افسوس اس کا ہے ہمارے بعض اہلِ سنت اپنی سادہ لوحی یا خود غرضی کی بنا پر خمینی پروپیگنڈہ کے شکار ہیں اور خاص طور پر وہ تعلیم یافتہ سادہ لوح طبقہ جسے شیعہ تاریخ اور شیعی افکار کا اندازہ ہے نہ خمینی انقلاب کے پس منظر و پیش منظر ان کی نظر ہے ، ان پر خمینیت کا بڑا تیکھا رنگ چڑھ رہا ہے ۔ ہمارے ایک فلسطینی دوست نے بتلایا کہ فلپائن کے مسلمان طلبہ شیعیت قبول کرنے لگے ہیں ، برصغیر کے دوسرے علاقوں میں بھی اس کے ہمنوا اور مداح پیدا ہو گئے ہیں ۔

برصغیر کی ایک "انقلاب پسند جماعت" تو اپنے ذرائع ابلاغ کو خمینیت کی تائید میں وقف کیے ہوئے ہے ، اس جماعت اور خمینیت کے درمیان مابہ الامتیاز اور وجہ اشتراک چیز "انقلاب" ہے اس بنا پر اس جماعت نے اپنا پرانا سبق بھلا دیا ہے اور اپنا تاریخی شعور (اگر رہا ہو تو) "خلافت و ملوکیت" کی صورت میں "سبائیت" کو نذرانہ دیدیا ہے ۔

حال میں اس کے آرگن سہ روزہ "دعوت" کا ایک خصوصی شمارہ شائع ہوا ہے ۔ اس کے مدیر نے جو اداریہ سپردِ قلم فرمایا ہے اس میں چار اسلامی تجربوں کا جائزہ لیا ہے ۔ سعودی عرب کا اسلامی تجربہ — یہ محدود تجربہ ہے اور "ملوکیت" کے زیرِ سایہ اس کے بڑھنے کی توقع نہیں ۔ سوڈان کا نوزائیدہ اسلامی تجربہ ۔ پاکستان کا "فوجی نظام" کے زیرِ سایہ ناقص اسلامی تجربہ اور چوتھا "جمہوری اسلامی ایران" کا مکمل صحیح اور بہترین اسلامی تجربہ ۔

موخر الذکر تجربہ ایک عظیم انقلاب کے بعد ہو رہا ہے ، اس انقلاب نے "مارکس" کے تصورِ انقلاب کے مطابق پرانی دیواروں کو ڈھا دیا ہے اور نئی اسلامی عمارت کی تعمیر شروع کی ہے ۔ اس سے پندرہویں صدی میں اسلامی کاز کی بھرپور ترقی کی توقع ہے ... یہ ہے اداریہ کا خلاصہ ۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ باتیں کسی سیاسی پارٹی کی ذہنی اپج ہوتیں تو زیادہ قابلِ گرفت بات نہ تھی ، اس لیے کہ وہاں کی اونچی دکان کے پکوان اسی طرح کے ہوتے ہیں ۔ لیکن یہاں مسئلہ دینی تحریک کے موقف کا ہے ، کسی دینی تحریک کے موقف کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے دینی اہمیت دی جائے اور عام دین پسندوں کی بات بن جائے ۔ اس تناظر میں اگر ہم دیکھیں تو ہمیں حق پہنچتا ہے کہ اس موقف سے متعلق سوال کریں ، ایسا کیوں ؟ یہ موقف کن بنیادوں پر قائم ہے ؟

میرا سمجھنا ہوں کہ کسی دینی تحریک کا خمینی انقلاب کے بارے میں یہ موقف محض "دوکانداری" کی بنیاد پر ہے جس طرح خمینی کے ایران میں "انقلاب" کی "دوکانداری" چل رہی ہے ۔ اس طرح ہمارے دوستوں کی بھی "انقلاب پسندی" کی

دوکانداری چل رہی ہے۔ اور اسی بنیاد پر ان کا بہاؤ مسلمانوں کے ایک طبقہ اور جدید نسل میں لگ رہا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے، اس کا تعلق دینی کاز سے نہیں ہے اور اگر ایرانی انقلاب اسلامی اور دینی مسئلہ کی حیثیت رکھتا ہے تو میں عرض کروں گا۔

۱ کیا خمینی اپنی ماضی کی تاریخ اور اپنے اسلاف کے افکار و تعلیمات سے دست بردار ہو سکتے ہیں۔ کیا ان کی تحریروں اور بیانوں میں سبائیت کی چھاپ نہیں رہتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں خمینی سبائیت سے دستبردار نہیں ہو سکتے ہیں۔ دور نہ جائیے نصف صدی کی نوزائیدہ جماعت اسلامی اپنے "مرشد" کی کسی بات سے دست بردار نہیں ہو سکتی ہے۔ کیا وہ حق پسندی کا صرف اتنا ثبوت دے سکتی ہے کہ تفہیم القرآن میں مولانا مودودی کی "انسانی بھول چوک" پر ایک حاشیہ لگا دے۔ اگر ایسا نہیں ہو سکتا ہے، نہ دوسروں کے مطالبات اور جذبات کے پیش نظر ایسا کیا جا سکتا ہے، پھر خمینی صاحب اہل سنت کی خاطر کیسے اپنی طویل تاریخ اور اپنے خیالات سے دست بردار ہو سکتے ہیں۔ اگر ہمارے انقلاب پسند احباب دوسروں کو متعصب یا بے عملی کا طعنہ دے کر اور اسلام کا رونا رو کر چپ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو کیا خمینی اپنا "مقدس تقیہ" انہیں استعمال کر سکتے ؟

۲ ایران میں جو کچھ ہو رہا ہے کیا وہ اسلام کے مزاج سے میل کھاتا ہے ؟ مسلم شہریوں اور فوجیوں کا قتل عام کسی شریعت میں جائز نہیں حتی کہ "سیاسی شریعت" بھی اس کے جواز کا فتویٰ نہیں دے سکتی۔ مثل مشہور ہے "الناس علی دین ملوکہم"۔ ظاہر ہے جتنے بیوروکریٹ ہوتے ہیں اپنے فرمانرواؤں کا ساتھ دیتے ہیں۔ دوسرا حکمران آیا تو اس کی پیروی کرتے ہیں اس صورت میں سابق حکمرانوں کے اہل کاروں کو مار ڈالنا شریعت، انسانیت، سیاست سب کے خلاف ہے۔ مزید یہ کہ انتہا پسندی کے مخالف اسلام پسندوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے کا جواز کہاں سے مل گیا۔

۳ کردستان میں انقلاب کے ہمنوا اہلسنت جس طرح شیعی تعصب کے شکار ہوئے، قید و بند سے دوچار ہوئے، ان سے جیلوں کو آباد کیا گیا۔ عربی کو ختم کر کے ان پر فارسی کو مسلط کیا گیا۔ یہ اتحاد اسلامی کی کوئی خوبصورت "شکل" ہے ؟

۴ افغان پناہ گزین سنی ہونے کی بنا پر ایران میں ظلم و تشدد کا شکار ہوں قید و بند کی زندگی گزاریں، انھیں روس کو سونپ کر روس سے اسلحہ حاصل کیا جائے، پھر بھی اسلامی اتحاد پر آنچ نہ آئے کیا یہی انصاف ہے۔ ؟

۵ بیت المقدس آزاد کرانے سے پہلے حرمین شریفین کا آزاد کرانا زیادہ ضروری ہے ؟ اس کے لیے فریضۂ حج استعمال کیا جائے ؟ حرمین میں قتل و خونریزی لڑائی اور ہنگامہ کی کوشش کی جائے۔ ؟ مفسدوں کو احرام پہنا کر ان کے ذریعہ حرمین میں اسلحہ درآمد کیا جائے۔ حج کا سکون و اطمینان غارت کیا جائے۔ حج کو خمینیت کے پروپیگنڈہ کے لیے استعمال کیا جائے۔ وہاں مسلم دشمن لٹریچر تقسیم کیے جائیں، مسلمانوں کے درمیان نفرت، بغض و عداوت پھیلایا جائے۔ حرمین کے اندر

سیاسی نعرہ بازیاں ہوں، جھگڑے ہوں، پھر بھی اس کے کرتا دھرتا اتحاد کے "داعی اعظم" بنے رہیں، کیا ہوش و حواس رکھتے ہوئے کوئی انسان ایسے جرائم کے مرتکب کو اتحاد کا داعی کہہ سکتا ہے، اور اسے اسلامی کاز کا مخلص اور ہوش مند امام مان سکتا ہے۔

۶ عالم اسلام سرمایہ داروں اور اشتراکی کامریڈوں کے نرغے میں ہے اس کو اتحادی قوت کی ضرورت ہے لیکن اتحاد اور اسلامی کاز کی دعوت دینے والے پورے عالم اسلام میں جنگ بپا کیے ہوئے ہیں۔ زیر زمین ان کی دہشت پسند تنظیمیں "حزب الدعوۃ"، "منظمۃ الدعوۃ"، "منظمۃ العمل"، وغیرہ وغیرہ کے نام سے پورے عرب میں پھیلی ہیں۔ انہی دہشت پسندوں نے عراق ایران جنگ کی آگ بھڑکائی ہے یہ دہشت گرد عالم اسلام میں دھماکے کرتے پھرتے ہیں۔ ادھر مجاہد خمینی کا ایک دستہ فلسطینیوں کے دشمنوں کے ساتھ لڑ کر انہیں لبنان سے نکلوانے میں شریک ہوا۔ پاکستان میں ایرانی مفسدوں نے کراچی میں زبردست فساد کرایا، سوال یہ ہے کیا عالم اسلام کے تمام ممالک میں ایرانی دہشت گردی جائز ہے، کیا اسلامی انقلاب دہشت گردی کی اجازت دیتا ہے؟

۷ "اسلامی ایران" نے لیبیا اور شام کے ساتھ "سرخ ٹولے" میں شریک ہو کر ہر وہ کام کیا جو عالم اسلام کے لیے نقصان دہ ہو۔ کراچی میں مسجدوں کے سامنے امہات المومنین کو سب و شتم سے پُر پمفلٹ بانٹا گیا، واشنگٹن میں بھی یہی عمل دہرایا گیا۔ جس کی بنا پر شیعہ سنی فساد بھڑکا اور اس کے نتیجے میں مسجد کو حکومت نے سیل کر دیا ابتک یہ مسجد اسی طرح بند پڑی ہے خلیجی عربی ملکوں کو تباہ کرنے کے لیے اسرائیل سے اسلحہ خریدا گیا، ارجنٹائنا سے اسلحہ اسمگل ہو کر ان کے پاس پہنچا، یہودی لابی اور یہودی ذرائع ابلاغ ان کی ہمنوائی کریں۔ کیا اس پر ایک مسلمان یہ سوچنے میں حق بجانب نہیں ہو سکتا کہ ایران کا دعویٰ اسلامیت صرف ایک فریب ہے۔

درحقیقت خمینی انقلاب پروپیگنڈوں کی بنیاد پر قائم ہے، اس کے قول و فعل میں تضاد ہے، وہ شرق و غرب میں ایک دہشت پسند "سیاسی ٹولہ" بن کر رہ گیا ہے اور اپنی آبرو اور بھرم باقی رکھنے کے لیے بے شمار "کلیم صدیقی"، اور "ظفر الاسلام" فریب خوردہ "شاہینوں" کا شکار کر لیا ہے جو دنیا بھر میں پھیلے ہیں اور شیوۂ خمینیت کے قتیل صدائے خمینی بنے ہوئے ہیں۔

میرا مشورہ ہے تحریک اسلامی اپنا نمائندہ بھیج کر عالم عرب اور ایران کا جائزہ لے، اس کے بعد اپنا موقف متعین کرے اور "آغا خوش آمدید" کا نعرہ چھوڑ دے تاکہ لوگ اس کے موقف کو دینی مسئلہ سمجھ کر فریب نہ کھائیں۔

●●●

ہنگامہ آہن کا نشہ ٹوٹ رہا ہے!

عبدالمعید اسلم

طوفان اٹھا سرخ اندھیروں کا جہاں میں   تاراج ہوئی جلوہ گہِ عشق جہاں میں
خونخوار درندوں سے دہلتی رہی ہستی   اک برقِ جہاں سوز کہ جلتی رہی گیتی،
شادابیِ چمن زارِ محبت سے بڑھی کد   بے گانگیِ حسن بڑھی کچھ نہ رہی حد
معصوم گلابوں کا لہو رقصِ سبو ہے   اٹھتے ہوئے شعلوں سے انھیں کیف و نمو ہے
آوارہ جبینوں سے رہا نورِ جہاں کم   اک برقِ شررِ تاب سے ہوتی ہے عیاں رم
مدت سے مری تیغِ عمل کند پڑی تھی   برسوں سے مری غیرتِ حق کوشش کھڑی تھی
اب جراتِ دیدار نہیں چشمِ عدو میں   ایمان کی برّش ہے مری موجِ لہو میں
کیوں وعدۂ فردا پہ اسے تابِ سکوں دوں   کیوں دامِ سیاست میں افق تابِ جنوں دوں
افسردگیِ عزم و عمل ٹوٹ چکی ہے   امید و تمنا کی کرن پھوٹ چکی ہے
امید کہ ہنگامِ سحر جس سے جہاں تاب   امید کہ مرغانِ سحر جس سے نوا یاب
امید سے افکار کی موجوں میں روانی،   امید سے گلزارِ محبت کی جوانی،
آوادیِ پنیشر میں میں تجھ کو بتاؤں   آدابِ تگ و تاز ہے کیا تجھکو سکھاؤں
آوازِ شکم، نانِ شبیں، رمزِ ہنر ہے   طوفان کہستاں میں لیے دردِ جگر ہے
اے عزمِ جواں عظمتِ ایماں کے شرارے   اک جوشِ جنوں اور کہ ہوں تیز نظارے
شیروں کے تڑپنے سے جگر کانپ رہا ہے   بازارِ سیاست میں عدو ہانپ رہا ہے۔
گرتی ہے اگر آتشِ زر پوش دنا میں   ایک صیدِ زبوں بن کے تڑپتی ہے فضا میں

ہنگامہ آہن کا نشہ ٹوٹ چکا ہے!
رستے ہوئے ناسور کا دم ٹوٹ چکا ہے!

اپیل

شہر کی ایک اہم ضرورت

جمیعت اہل حدیث بھیونڈی کا ایک عظیم رفاہی منصوبہ

شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر جمیعت اہل حدیث بھیونڈی نے ایمبولینس کی خریداری کا فیصلہ کیا ہے. گذارش ہے کہ اس منصوبہ کو پورا کرنے کیلئے دامے، درمے، قدمے، سخنے تعاون فرمائیں. اور رقم بذریعہ چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر مندرجہ ذیل پتہ پر روانہ کریں:

دفتر جمعیت اہل حدیث بھیونڈی، ۱۱۶ سوداگر محلہ، بھیونڈی
ضلع تھانہ. پن کوڈ نمبر ۴۲۱۳۰۲

اپیل کنندگان: اراکین ایمبولینس کمیٹی جمیعت اہلحدیث بھیونڈی
رجسٹریشن نمبر E. 629

رحلت

۱۶ ربیع الآخر ۱۴۰۴ھ ۲۱ جنوری ۱۹۸۴ء یوم سنیچر کو طلوع فجر سے کوئی ایک گھنٹہ قبل امیر جماعت اہلحدیث پچھم و بنی محلہ سوئیلہ جناب مولوی عبد اللہ صاحب ایک طویل علالت کے بعد اللہ کو پیارے ہوگئے انا للہ مرحوم بڑے نیک اور خدا ترس جماعتی تڑپ سے معمور اور علم و فضل کا سمندر تھے سادگی و بے نفسی اور شرافت و خوش خلق قابل رشک تھی. تقریر و خطابت کے ماہر تھے، اللہ تعالی جماعت کو اسکا نعم البدل عطا کرے اور مرحوم کے حسنات قبول فرمائے. (آمین)

محمد یوسف دینارا بھوج کچھ گجرات

MAR. **MOHADDIS** 1984

THE ISLAMIC CULTURAL & LITERARY MONTHLY MAGAZINE
AL-JAMIATUS SALAFIAH (AL-MARKAZIYAH) VARANASI (INDIA)

فارم ملکیت

مقام اشاعت	وارانسی
وقفۂ اشاعت	ماہنامہ
طابع وناشر	عبد الوحید سکریٹری جامعہ سلفیہ
قومیت	ہندوستانی
پتہ	ڈی ۔ ۵۷/۳۱ مدن پورہ وارانسی
ایڈیٹر	صفی الرحمن
قومیت	ہندوستانی
پتہ	بی ۔ ۱/۱۸ جی ۔ ریوڑی تالاب ، وارانسی
ملکیت	سکریٹری جامعہ سلفیہ ، وارانسی

میں (عبد الوحید) بذریعہ تحریر ہذا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم واعتماد کی حد تک صحیح ہیں ۔

دستخط

عبد الوحید

Published from Markazi Darul-Uloom
Printed by Abdul Waheed
At Salafiah Press, Reori Talab, Varanasi.

برگ وبار

جامعہ سلفیہ کا علمی ادبی اور اصلاحی رسالہ

ماہنامہ

محدث

بنارس

رجب المرجب ۱۴۰۴ھ

اپریل ۱۹۸۴ء

جلد: ۳ شمارہ: ۴

ترتیب

صفی الرحمن مبارکپوری

بدل اشتراک

- سالانہ : ۲۵ روپیے
- ششماہی: ۱۳ روپیے
- فی پرچہ: ۲/۵۰ روپیے
- بیرون ملک سے سالانہ: ۱۵ ڈالر

(۵)

تزئین وکتابت

• ناشر: جامعہ سلفیہ بنارس • طابع: عبدالوحید • مطبع: سلفیہ پریس بنارس

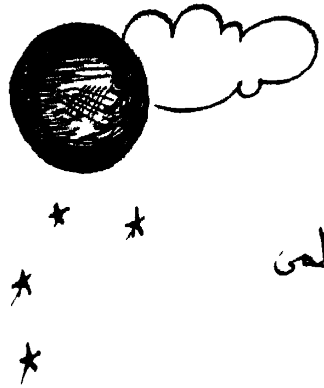
پتہ

خط وکتابت کے لیے: ایڈیٹر محدث، جامعہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس

بدل اشتراک کے لیے: مکتبہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، بنارس

MAKTABA. SALAFIA, REORI TALAB VARANASI.221010

ٹیلی گرام: "دار العلوم" بنارس ٹیلی فون: ۶۳۵۷۷



حمد

شوق اعظمی

خالقِ دو جہاں قادر و مہرباں
تیرے قابو میں دل تیرے قبضہ میں جاں
تو خدائے جہاں
ہستیِ جاوداں!

تو حکیمِ ازل حکم تیرا اٹل
تیری کاریگری بے ضرر بے خلل
تو خدائے جہاں
ہستیِ جاوداں

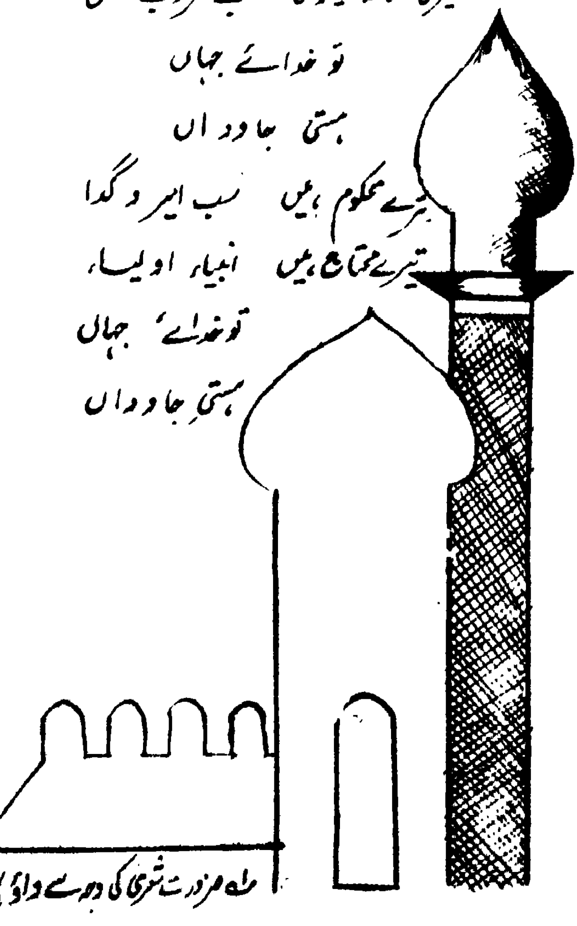
تیرے محکوم ہیں سب امیر و گدا
تیرے محتاج ہیں انبیاء اولیاء
تو خدائے جہاں
ہستیِ جاوداں

جابجا کو بکو ہر جگہ چار سو
تیرا ہے تذکرہ تیری ہے گفتگو
تو خدائے جہاں
ہستیِ جاوداں

لالہ زاروں میں تو کوہساروں میں تو
نورِ خورشید میں چاند تاروں میں تو
تو خدائے جہاں
ہستیِ جاوداں

تو ازل تو ابد تو احد تو صمد
ہاں تری شان ہے لم یلد لم یولد[1]
تو خدائے جہاں
ہستیِ جاوداں

علم و عرفان دے پختہ ایمان دے
شوقؔ تیرا رہے وہ دل و جان دے
تو خدائے جہاں
ہستیِ جاوداں



[1] ضرورتِ شعری کی وجہ سے واؤ نہیں پڑھا جائے گا۔

نقشِ راہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

اسلامی نظامِ حکومت میں متعدد پارٹیاں

مغرب کے جمہوری نظامِ حکومت میں جو ہمارے ملک میں بھی رائج ہے لازماً ایک سے زیادہ پارٹیاں ہوتی ہیں۔ ایک حزبِ اقتدار کہلاتی ہے جس کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہوتی ہے اور دوسری حزبِ اختلاف، جس کا کام ہی یہ ہوتا ہے کہ وہ حکومت کے پروگراموں اور پالیسیوں پر نکتہ چینی کرے اور برسرِ اقتدار پارٹی کو شکست دے کر خود اقتدار پر قابض ہونے کی کوشش کرے۔

اس وقت پاکستان کو فوجی حکومت کے دائرے سے نکال کر جمہوریت کے دائرے میں لانے کا پروگرام چل رہا ہے اور اس سلسلے میں یہ سوال اٹھ کھڑا ہوا ہے کہ الیکشن شخصی بنیادوں پر کرایا جائے یا پارٹیوں کی بنیاد پر، کچھ حضرات کا خیال ہے کہ اسلامی نظامِ حکومت میں سیاسی پارٹیوں کا تصور نہیں، اس لیے الیکشن شخصی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ مگر ان کے برعکس سیاسی پارٹیوں کے ناخداؤں کا کہنا ہے کہ جو شخص ایسی بات کہتا ہے وہ اسلامی سیاست کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ پارٹی سسٹم کی بنیاد پر الیکشن اسلامی نظامِ حکومت کے عین مطابق ہے۔

یہ مسئلہ اگرچہ پاکستان میں اٹھا ہے لیکن چونکہ بحث اسلامی نظامِ حکومت کے متعلق ہو رہی ہے اس لیے ہم بھی "دخل در معقولات" کا حق رکھتے ہیں اور چونکہ اسلامی مسائل کا حل کتاب و سنت اور قرنِ اول کے سلفِ صالحین کے طرزِ عمل کی روشنی میں ہونا چاہیے اس لیے ہم اس معاملے میں اسی طرف رجوع کر رہے ہیں۔

سب سے پہلے قرآنی ارشادات:

(۱) ان الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعا لست منھم فی شیء انما امرھم الی اللہ

جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور مختلف جماعتوں میں بٹ گئے (اے نبی!) آپ کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔

ثم ینبئھم بما کانوا یفعلون ۔ (۶: ۱۶۰)

ان کا معاملہ تو بس اللہ کے حوالے ہے ، پھر اللہ انہیں بتادے گا کہ وہ کیا کرتے تھے ۔

(۲) ولا تکونوا من المشرکین من الذین فرقوا دینھم وکانوا شیعاً کل حزب بما لدیھم فرحون ۔ (۳۰: ۳۱، ۳۲)

.... اور مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ، ان میں سے نہ ہو جاؤ جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کیا اور (خود) گروہوں میں بٹ گئے ۔ (اب) ہر گروہ کے پاس جو کچھ ہے اسی پر وہ خوش ہے ۔

(۳) واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا (۳ : ۱۰۳)

تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور گروہوں میں نہ بٹو ۔

(۴) ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءھم البینٰت و اولئک لھم عذاب عظیم (۳ : ۱۰۵)

اور تم ان کی طرح نہ ہونا جو گروہوں میں بٹ گئے اور کھلے کھلے دلائل آجانے کے بعد اختلاف کیا ۔ اور ایسے لوگوں کے لیے زبردست عذاب ہے ۔

یہ آیتیں نہایت صراحت کے ساتھ مختلف گروہوں میں بٹنے اور تقسیم ہونے سے روک رہی ہیں اور دین میں اختلاف اور گروہ بندی کو قابلِ عذاب جرم قرار دے رہی ہیں ۔ اسلامی نظام ریاست اپنے طریقۂ کار سے لے کر مقاصد تک ایک دینی معاملہ ہے لہٰذا اس میں اختلاف اور گروہ بندی بھی درحقیقت دین میں اختلاف اور گروہ بندی ہے ۔ اسلام نے حبل اللہ کو صرف پکڑنے کا حکم نہیں دیا ہے کہ اسے مختلف پارٹیاں الگ الگ اپنے طور پر پکڑ لیں ۔ بلکہ اختلافات اور گروہ بندیوں سے الگ ہو کر اجتماعی اور یکجائی طور سے پکڑنے کا حکم دیا ہے ۔

پھر سب سے اہم سوال یہ ہے کہ جب سارے ہی لوگ اسلامی نظام حکومت چاہتے ہیں اور یہ نظام حکومت اپنے طریقۂ کار سے لے کر مقاصد و اغراض تک ایک ہی ہے تو پارٹی بندی کی بنیاد کیا رہ جاتی ہے ۔ یہ کیوں کر ممکن ہے کہ جو لوگ نقطۂ نظر طریقۂ کار اور مقاصد ہر چیز میں پورے خلوص کے ساتھ متفق ہوں وہی ایک دوسرے کو اکھاڑنے ، پچھاڑنے اور گرانے گھسیٹنے کے لیے باہم دست و گریباں بھی رہیں ۔ ظاہر ہے ہر چیز میں یکساں نقطۂ نظر کے باوجود اس طرح کی رسہ کشی کا صرف ایک ہی سبب ہو سکتا ہے جسے خود غرضی اور مطلب پرستی کہا جاتا ہے اور جس کے بطن سے یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ چند مخصوص افراد یا طبقہ کو اقتدار کی مسند سے گھسیٹ کر اس پر خود براجمان ہو جائیں ۔ اس لیے آئیے دیکھیں اس کے بارے میں شریعت کیا کہتی ہے قرآن کا ارشاد ہے ۔

ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب

آپس میں رسہ کشی نہ کرو ورنہ پست ہمت ہو جاؤ گے اور تمھاری

(بحکم ۸ : ۴۶) ہوا اکھڑ جائے گی۔

اور اب احادیث نبوی: سب سے پہلے اس سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سنیے کہ کوئی شخص اقتدار کا خواہشمند ہو تو اسے برسرِ اقتدار آنے دیا جائے یا نہیں۔ آپ کا ارشاد ہے:

انا واللہ لا نولی علی ھذا العمل احدا سأله ولا احدا حرص علیه وفی روایة قال لا نستعمل علی عملنا من اراده (متفق علیه)

ہم بخدا کسی ایسے آدمی کو اس عمل کا والی نہیں بناتے جو اسے مانگے یا اس کی حرص رکھے۔ اور ایک روایت میں یہ ہے کہ ہم حکومت کا کام ایسے آدمی کو نہیں سونپتے جو اسے چاہتا ہو۔

خدارا سوچیے کہ اس حدیث کی روشنی میں اسلامی نظامِ حکومت کے اندر "حزبِ اختلاف" کی کیا گنجائش رہ جاتی ہے جس کا مقصدِ وجود ہی یہ ہوتا ہے کہ چھین جھپٹ کر اقتدار پر قابض ہو جائے۔ مزید سنیے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

(۱) انه سیکون ھنات وھنات فمن اراد ان یفرق امر ھذہ الامة وھی جمیع فاضربوا بالسیف کائنا من کان (صحیح مسلم)

دیکھو! کچھ گڑبڑ اور اتھل پتھل ہوگی۔ تو جو شخص اس امت کے معاملے کو متفرق کرنا چاہے اور وہ یکجا ہو تو اس شخص کو تلوار سے اڑا دو، چاہے وہ جو بھی ہو۔

(۲) من اتاکم وامرکم جمیع علی رجل واحد یرید ان یشق عصاکم او یفرق جماعتکم فاقتلوہ۔ (ایضاً)

جو شخص تمھارے پاس آئے اور تمھارا نظام کسی ایک آدمی پر جما ہوا ہو اور وہ چاہتا ہو کہ تمھارا ڈنڈا پھاڑ دے یا تمھاری جماعت کو ٹولیوں میں بانٹ دے تو تم لوگ اسے قتل کر دو۔

(۳) من بایع اماما فاعطاہ صفقة یدہ وثمرة قلبه فلیطعه ان استطاع فان جاء آخر ینازعه فاضربوا عنق الآخر (ایضاً)

جو شخص کسی حکمران سے بیعت کرے اسے اپنے ہاتھ کا صفقہ اور دل کا ثمرہ دیدے تو حسبِ استطاعت اس کی اطاعت کرے اب اگر کوئی دوسرا شخص آ کر اس سے اقتدار کے لیے نزاع کرے تو اس دوسرے کی گردن مار دو۔

(۴) اذا بویع لخلیفتین فاقتلوا الآخر منھما (ایضاً)

جب دو حکمرانوں کے لیے بیعت کی جائے تو ان میں دوسرے کو قتل کر دو۔

ان روایات سے صاف واضح ہوتا ہے کہ جب ایک بار ایک شخص کے ہاتھ میں اقتدار کی باگ ڈور آ جائے۔

تو پھر اس سے اقتدار چھیننے کے لیے نزاع کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہاں اگر وہ ایسے جرائم کا مرتکب ہوتا ہے کہ اسے معزول کیا جانا ضروری ہے تو یہ ایک الگ اور استثنائی مسئلہ ہے اور اس کے لیے کسی الیکشن اور حزبِ اختلاف کی ضرورت نہیں بلکہ یہ شوریٰ کی ذمہ داری ہے۔

کتاب و سنت کے ان واضح ارشادات کے بعد ذرا اسلامی تاریخ کا بھی جائزہ لیں کہ یہاں پارٹیوں یا حزبِ اختلاف کا وجود تھا یا نہیں۔

(۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پورے دس سالہ مدنی دور میں صرف ایک حزبِ اختلاف کا وجود ملتا ہے یعنی عبداللہ بن اُبی (راس المنافقین) اور اس کے رفقاء (منافقین) کی پارٹی۔ باقی سارے مسلمان مختلف قبائلی وحدتوں میں تقسیم ہونے کے باوجود باہم شیر و شکر تھے۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے انعقاد سے پہلے کے جس وقفے میں عالم اسلام کا کوئی سربراہ نہ تھا اس وقفے میں سربراہی کے منصب کے لیے سرکردہ صحابہ کرام کے تین رجحانات ابھرے جن کی حیثیت اصحابِ شوریٰ کے تبادلۂ خیال سے زیادہ کی نہ تھی۔

حضرت صدیق کی خلافت کے لیے نہ کوئی الیکشن ہوا، نہ امیدواروں کے درمیان مقابلہ آرائی ہوئی نہ الیکشنی تگ و دو ہوئی نہ رائے دہندگان کے ووٹ گنے گئے۔ بس اس معاملے کی شرعی اور معقول نوعیت سامنے آئی اور سب نے صاد کردیا، حضرت سعد بن عبادہ کو اس سے اختلاف ہوا تو خود ان کے قبیلے نے ان کے بارے میں وہ روش اختیار کی کہ وہ ملک شام چلے گئے۔ اور تاریخی روایات کے مطابق وہیں کسی مسلمان جن کے ہاتھوں اپنی اس روش کے نتیجے میں جاں بحق ہوئے۔ بعض آل ہاشم نے کچھ کسر پھسر کی تو حضرت عمرؓ نے انہیں نہایت سخت دھمکی دی۔ حضرت علیؓ نے قدرے ملول ہو کر بیعت نہ کی تو رفتہ رفتہ ان سے لوگوں کے چہرے پھر گئے۔ اور بالآخر معذرت کے ساتھ بیعت کی۔ ان دونوں بزرگوں سے یہ نہ ہوا کہ لاؤ حزبِ اختلاف کی مسند سنبھال کر مسجد نبوی میں اپنی الگ کرسی لگا دیں۔ ایسا کرتے تو شاید انہیں اپنے وجود سے بھی ہاتھ دھونا پڑ جاتا۔

(۳) حضرت عمر کی خلافت کسی الیکشن بلکہ مشورے کے بغیر نامزدگی کے ذریعہ عمل میں آئی اور ان کے پورے دورِ خلافت میں کسی حزبِ اختلاف کا پتہ نہیں چلتا۔

(۴) حضرت عمر کے بعد خلافت کا فیصلہ چھ صحابہ کی نامزد کمیٹی کے ذمہ تھا اور حکم تھا کہ چار افراد کسی ایک پر متفق ہوں، اور باقی دو اختلاف کریں تو ان کی گردن ماردی جائے۔ اور تین تین میں بٹ جائیں تو عبداللہ بن عمر یا عبدالرحمٰن بن عوف کی تائید سے فیصلہ ہو اور باقی تین نہ مانیں تو گردن ماردو۔ اس کی اجازت نہیں تھی کہ اقلیتی حزبِ اختلاف کی مسند پر بٹھایا جائے۔

اس چھ رکنی کمیٹی کے فیصلے کی رو سے حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو ان کے پورے دورِ خلافت میں صرف ایک حزبِ اختلاف کا پتہ چلتا ہے جس کی قیادت عبداللہ بن سبا کے ہاتھ میں تھی ۔ اس حزبِ اختلاف کی حشر سامانیوں سے خلیفہ وقت کی شہادت سمیت عالمِ اسلام پر جو کچھ بیتی میں نہیں سمجھتا کہ کوئی شخص ہوش و حواس رکھتے ہوئے اپنے ملک میں اس کا اعادہ گوارا کر سکتا ہے۔

(۵) حضرت علی کا دورِ خلافت حزبِ اختلاف کی کثرت اور "برکت" سے مالا مال ہے ۔ ایک تو حضرت عثمانؓ کے دورِ اخیر کی وہی حزبِ اختلاف جس کا دامن خونِ ناحق کے چھینٹوں سے داغدار ہی نہیں بلکہ تربتر تھا اب حضرت علی پر مسلط تھی ۔ دوسرے امیر معاویہ اور اہلِ شام تھے جنھوں نے "بے اختیار خلیفہ" کے ہاتھ پر بیعت کرنے سے انکار کر دیا تھا ۔ اور حضرت عثمان رض کے خونِ ناحق کے قصاص کا مطالبہ کر رہے تھے جو کسی بھی خلیفہ کا اولین شرعی فرض تھا اور جو اس وقت با اختیار خلیفہ ہونے کی بنیادی نشانی بھی تھی۔ تیسری طرف ام المومنین ، حواریِ رسول اور اہلِ بصرہ تھے جو قصاص کے معاملے میں مداہنت پر بپھرے ہوئے تھے ۔ ان اختلافات نے بصرہ اور صفین کے میدانوں میں جس "برکت" کی بارش برسائی اس کے نتیجے میں امت کا جوہری خون کے گھاٹ اتر گیا ۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت ششدر تھی کہ حضرت علیؓ جو بصرہ و شام کی اتنی بڑی افواج کو سبق سکھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں کہ مقتولین کی تعداد پون لاکھ سے ایک لاکھ تک پہنچ جائے ان کے یہ آہنی ہاتھ آخر قاتلوں کی صرف دو ہزار کی نفری کے مقابل شل کیوں ہیں ؟ اور اس بنا پر وہ اس پورے فتنے سے دامن کش تھی ۔

بعد از خرابیِ بسیار اس آگ کو بجھانے کے لیے تحکیم کی منزل آئی تو ایک نئی حزبِ اختلاف نے جنم لیا ۔ جس کی "برکت" سے سب سے پہلے نہروان کی زمین لالہ زار ہوئی اور جس نے صدیوں تک کلمہ گو مسلمانوں کے خون سے اپنی تلوار رنگین رکھی ۔ اور بوڑھوں اور عورتوں تک میں امتیاز گوارا نہ کیا ۔ خود حضرت علی بھی اسی حزبِ اختلاف کا لقمہ بنے ۔

(۶) حضرت معاویہ کے دور میں "حزبِ اختلاف" کا آتشدان ٹھنڈا رہا ۔ اگرچہ تہ میں چنگاریاں موجود تھیں ۔

(۷) یزید کے دور میں سب سے پہلے کوفہ نے "حزبِ اختلاف" کا رول ادا کیا ، اور حضرت حسین رض کی شخصیت کا سہارا لیا ۔ لیکن معاملے کی پوری نوعیت پر نظر ڈالنے کے بعد حضرت حسین نے یزید کے ہاتھ پر بیعت کے لیے دمشق کا رخ کیا تو کوفہ کی اسی حزبِ اختلاف کے لیڈروں نے منہ اندھیرے ان کا سر قلم کر کے عبداللہ بن زیاد کی خدمت میں پیش کر دیا ۔

ایک اور "حزبِ اختلاف" نے مدینہ سے سر اٹھایا تو حرہ کا سنگین واقعہ پیش آیا اور حرم نبوی کی بے حرمتی ہوئی ایک تیسرے حزبِ اختلاف نے مکہ میں قدم جمایا تو حرم کعبہ کی بے حرمتی تک نوبت پہنچی ۔

اور اس کے بعد سے رہ رہ کر "حزب اختلاف" کی برکت سے جو فتنے ابلتے رہے انھیں کہاں تک نام زد کریں۔ تاریخ کے صفحات میں انھیں دیکھا جا سکتا ہے اور اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام میں پارٹی یا پارٹیوں کی گنجائش کتنی ہے۔ اور یہ امت مسلمہ کے لیے اپنے دامن میں کیسے کیسے ثمرات رکھتی ہے۔ واللہ الموفق۔ ●●●

بقیہ اسلامی مساوات

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسلام جیسی مساوات کسی قوم اور کسی مذہب میں نہیں پائی جاتی۔ جس کا اعتراف اعدائے اسلام کو بھی ہے۔ "والفضل ما شهدت به الاعداء"۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اقوام عالم میں کتنے ہی لوگ ہیں جو صرف اس تعلیم کی بنا پر دائرۂ اسلام میں داخل ہو کر مشرف بہ اسلام ہو رہے ہیں۔

لیکن افسوس ہے کہ آج مسلمانوں نے اسلام کی اور تعلیمات کی مانند اس زریں تعلیم کو بھی پس پشت ڈال دیا ہے اور ان میں ذات پات اونچ نیچ کے ہزاروں بکھیڑے کھڑے ہو گئے ہیں۔ اگر مسلمان اس اصول کو صحیح طور پر اپنالیں تو ان کی بہت سی ملی، مذہبی، اقتصادی اور سماجی پریشانیاں دور ہو سکتی ہیں۔ ●●

بقیہ: شرک و الحاد

نہیں بننا چاہیے تھا، اس تجربہ نے نہ صرف یہ بتایا کہ خدا پرستی ہی انسان کی فطرت ہے بلکہ صرف ایک خدا کو تسلیم کرنا ہی فطرت کا تقاضا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ اپنے اندر توحید کا فطری پیغام رکھتا ہے، بقول حضرت سعدیؒ

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار!

●●●

اسلام کی صحیح تعبیر

اقوال الرجال اور اتباع ائمہ کے سلسلے میں اس تعبیر کی ایک جھلک

تحریر وافادات : علامہ محمد الخضری بک رحمہ اللہ
وعلامہ محمد ناصر الدین الالبانی حفظہ اللہ

ترجمہ وترتیب : ارشد فہیم الدین
متعلم جامعہ سلفیہ بنارس

قرآن مجید اور سنت نبوی در اصل ایک ہی چراغ کے دو پرتو اور ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ ایک کی تلاوت کی جاتی ہے اور دوسرے کی تلاوت نہیں کی جاتی ہے۔ قرآن وحدیث، دین وملت کی بنیاد اور جملہ احکام وقوانین کا ماخذ اور مرجع ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے یہی دو چیزیں چھوڑ کر تشریف لے گئے اور انہی پر دین کی تکمیل کر دی گئی، اس لیے بادی النظر میں دینی مسائل کے اندر اختلاف کا سوال پیدا نہیں ہوتا، لیکن یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ نصوص وآیات کے معانی ومطالب کے متعلق ہر آدمی کا فہم اور طرز فکر یکساں نہیں ہو سکتا اور اس کی وجہ سے اختلاف پیدا ہو سکتے ہیں اور ہوئے بھی ہیں۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں اس طرح کے اختلافات کے برقرار رہنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی اس لیے کہ آپ بحیثیت شارع خود موجود تھے۔ ہر پیش آنے والے مسئلے کو آپ کی خدمت میں پیش کیا جاتا تھا اور آپ اس کی وضاحت فرما دیتے تھے، لیکن آپ کے وصال کے بعد نصوص کتاب وسنت کے فہم میں اختلاف کے سبب مسائل میں جو اختلافات پیدا ہو سکتے تھے یا ہوئے ظاہر ہے اب اس کے خاتمے کا کوئی قطعی مرجع نہیں تھا، علاوہ ازیں تمدن کی وسعت پذیری اور ترقی کے سبب صحابہ کرام کے سامنے ایسے مسائل بھی آئے جن کے متعلق قرآن وحدیث میں کوئی صراحت موجود نہیں تھی۔ ان مسائل کے سلسلے میں صحابہ کرام کا طرز عمل یہ تھا کہ وہ پہلے کتاب اللہ میں ان کا حل تلاش کرتے اگر کتاب اللہ سے مسئلہ حل ہو جاتا تو ٹھیک ورنہ حدیث

پر نظر دوڑاتے لیکن اگر تلاش وجستجو کے بعد بھی حدیث نہ ملتی تو لوگوں سے مشورہ طلب کرتے اور جب سارے اہلِ حل وعقد کے باہمی مشورے سے کوئی بات طے پا جاتی تو اسی کے مطابق حکم نافذ کر دیتے۔ اظہارِ رائے کے اس طریقے کا نام اجماع تھا۔ اگر یہ صورت بھی اگر نہ ہوتی تو قرآن وسنت کے عموم اور شرعی احکامات کی نظیریں اور مثالیں دیکھ کر پیش آمدہ واقعہ کے سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر سے کوئی رائے قائم کرتے تھے۔ اصول وکلیات اور نظائر کی بنیاد پر کیا جانے والا یہ اجتہاد یا قیاس ان کی اصطلاح میں رائے کہلاتا تھا۔ چونکہ افراد اور ماحول کی روشنی میں دینی تقاضے اور مصالح کے متعلق مختلف لوگوں کے سوچنے کا انداز الگ الگ ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے اس لیے رائے میں اختلاف ہو سکتا تھا اور ہوا۔[1]

اس طرح دورِ صحابہ میں اختلاف کے دو اہم سبب وجود میں آگئے۔ ایک کتاب وسنت کے نصوص کے فہم میں اختلاف کے سبب مسائل میں اختلاف اور دوسرے رائے یا اجتہاد میں اختلاف کے سبب مسائل میں اختلاف، البتہ اس زمانے میں نہ صحابہ کرام کو اپنے فہم پر اصرار تھا اور نہ شخصی رائے کو شرعی حیثیت حاصل تھی۔ بلکہ صحابہ کرام اس خوف سے کہ لوگ رائے زنی پر دلیر نہ ہو جائیں ایسی رائے کو صرف یہی نہیں کہ شرعی حیثیت نہیں دیتے تھے بلکہ رائے سے مسائل طے کرنے کو بھی برا مانتے تھے۔ اور اس کی مذمت کرتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اپنی رائے سے کوئی اجتہاد کرتے تو فرماتے "یہ میری رائے ہے اگر صحیح ہے تو خدا کی جانب سے اور اگر غلط ہے تو میری جانب سے اور میں خدا سے استغفار کرتا ہوں"[2]۔ حضرت عمرؓ کے ایک محرر نے ایک مرتبہ لکھا "یہ خدا کی رائے ہے اور عمر کی رائے ہے" آپ نے جب یہ دیکھا تو فرمایا "یہ ایک بہت بڑی جسارت ہے یوں لکھو کہ "یہ عمر کی رائے ہے اگر صحیح ہے تو خدا کی جانب سے اور اگر غلط ہے تو عمر کی جانب سے، اور فرمایا سنت وہ ہے جس کو خدا اور اس کے رسول نے مقرر کیا ہے۔ رائے کی غلطی کو امت کے لیے سنت نہ بناؤ۔"[3] حضرت عمرؓ نے حضرت شریحؒ کو کوفہ کا قاضی مقرر فرمایا تو یہ ہدایت فرمائی "جو کچھ تمھیں کتاب اللہ سے معلوم ہو جائے، اس کے متعلق کسی سے دریافت نہ کرو اور جو چیز تم کو اس میں نہ معلوم ہو سکے اس کے متعلق حدیث نبوی میں تلاش کرو اور جو چیز تم کو اس میں نہ معلوم ہو سکے اس میں اپنی رائے سے اجتہاد کرو" لیکن اجتہاد میں "ہم صورت اور ہم شکل واقعات کو معلوم کرو، پھر ان پر قیاس کرو"[4]

مذکورہ صورت میں رائے پر عمل درحقیقت قرآن وحدیث کے عقلی مفہوم پر عمل ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ نے رائے پر عمل کا جو طریقہ بتلایا ہے، ضرورت کے وقت خود ان کا بھی یہی طریقہ ہو سکتا ہے۔ اس کے باوجود ان کی نظر میں

---

[1] تاریخ التشریع الاسلامی ص ۹۴ مطبوعہ جامعہ سلفیہ بنارس [2] تاریخ التشریع الاسلامی ص ۹۵
[3] ایضاً ص ۹۶ [4] ایضاً ص ۹۵۔

رائے کا جو درجہ تھا ۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے کیا سکتا ہے کہ ایک آدمی کو کوئی معاملہ درپیش تھا، اس نے حضرت علیؓ اور حضرت زید بن ثابت رضؓ سے مسئلہ دریافت کیا اس کے بعد حضرت عمرؓ سے ملاقات ہوئی ۔ انھوں نے دریافت کیا ۔ "تمھارے معاملے کا کیا ہوا ؟ اس نے کہا کہ حضرت علیؓ نے یہ فیصلہ کیا ہے اور حضرت زیدؓ نے یہ فیصلہ کیا ہے ، بولے ۔ اگر میں ہوتا تو یہ فیصلہ کرتا ۔ اس آدمی نے کہا کہ پھر آپ کو کس چیز نے روکا ہے ، جبکہ آپ خود خلیفہ ہیں ۔ آپ نے فرمایا ، اگر میں تم کو قرآن و حدیث کی طرف لوٹا سکتا تو لوٹاتا لیکن میں تم کو اپنی رائے کی طرف لوٹاتا ہوں اور رائے ایک مشترک چیز ہے ۔[1] چنانچہ انھوں نے (اختلاف کے باوجود) علیؓ اور زیدؓ کے فیصلے کو رد نہیں کیا ۔

مذکورہ بالا سطور سے یہ بات واضح ہوگئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ اور اصحاب کرامؓ کے ادوار میں شخصی رائے کی کوئی اہمیت نہیں تھی ۔ خواہ وہ خلیفۂ وقت کی رائے ہو یا کسی عقاریدہ بزرگ کی ۔ کسی کی رائے واجب الاتباع اور لازماً قابل عمل نہیں سمجھی جاتی تھی ۔ اس اندازِ فکر کا نتیجہ یہ تھا کہ مسائل میں اختلاف کے باوجود امت کے اندر تفرقے اور گروہ بندی کا کوئی تصور پیدا نہیں ہوا تھا ۔ لیکن جیسے جیسے خیر القرون کا دور ختم ہوتا گیا اس اندازِ فکر میں تبدیلی آتی گئی ۔ جس کے نتیجے میں رفتہ رفتہ چار بڑے بڑے فقہی مذاہب وجود پذیر ہوئے ۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ دین و ملت پر عمل درآمد کے لیے انہی چار مذاہب کو خاص کر دیا گیا اور آنکھ بند کر کے ان میں سے کسی ایک کی پیروی کو صرف یہی نہیں کہ کافی سمجھا گیا بلکہ لازمی قرار دے دیا گیا ۔ اب کسی کے لیے حلال نہیں تھا کہ ان چار مذاہب کو چھوڑ کر کسی پانچویں مذہب کی پیروی کرے ۔ بلکہ چاروں کو برحق ماننے کے باوجود یہ بھی ضروری قرار دیا گیا کہ جو شخص جس مذہب کی پیروی کا فیصلہ کر لے اس کے لیے تمام مسائل میں اسی کی پیروی ضروری ہے ۔[2] اگر بعض مسائل میں کسی دوسرے مذہب کی پیروی کر لے تو مجرم اور گنہ گار ہے ۔ اسی طرح یہی نہیں کہ ائمہ کے اجتہادات سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ختم ہوگئی بلکہ اگر کسی مسئلے میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا کوئی صاف روشن اور دو ٹوک حکم موجود تھا تو اسے بھی اس وقت تک قبول نہیں کیا جا سکتا تھا جب تک کہ امام مذہب اس کا قائل نہ ہو ۔ یعنی اگر خدانخواستہ کسی چوک یا غلطی کے سبب امام مذہب نے قرآن یا حدیث کے اس حکم صریح کے خلاف فتویٰ دیدیا ہے یا ان کی طرف کوئی ایسا فتویٰ منسوب ہوگیا ہے تو اس امام کے ماننے والے پر ضروری تھا کہ کتاب و سنت کا حکم چھوڑ دے اور اس طرح کتاب و سنت کی جو پامالی ہوئی اور ائمہ کی رائے و قیاس اور فہم و استنباط کو جو اہمیت حاصل ہوئی اس نے ساری بساط ہی الٹ کر رکھ دی اور اصولی حیثیت سے جس چیز کا جو درجہ و مقام تھا وہ بالکل ہی بدل گیا ۔ پھر اس تبدیلی نے

---

[1] تاریخ التشریع الاسلامی ص ۹۵ [2] مقدمہ ابن خلدون ص ۵۶ ۴ مطبوعہ مصر

آئی گروہ بندی کو جنم دیا جو صدیوں حرب و پیکار اور تباہی و بربادی کا سبب بنی رہی۔

ظاہر ہے اس سلسلے میں صحیح اصول وہی تھا جو قرن اول میں پایا جاتا تھا اور جسے محدثین اور ان کے مکتب فکر سے تعلق رکھنے والی جماعت اہلحدیث نے اپنائے رکھا۔ یعنی جو احکام کتاب و سنت کے نصوص میں صاف اور صریح طور پر موجود ہوں ان کے متعلق غیر ضروری وسوسوں اور احتیاط میں پڑے بغیر ان کی پیروی کی جائے اور ان پر کسی کی بات مقدم نہ کی جائے جن نصوص کے فہم میں ائمہ کا اختلاف ہو اس میں جس کا فہم دوسرے عام دلائل سے زیادہ راجح اور صحیح معلوم ہوتا ہو اس پر عمل کیا جائے۔ اور اگر کچھ لوگ دوسرے پہلو پر عمل کو ترجیح دیں تو اس اختلاف کو پوری وسعت قلبی کے ساتھ گوارا کیا جائے۔ اسطرح رائے و قیاس پر بوقت ضرورت و مجبوری عمل تو کر لیا جائے مگر اس کو نہ دین کا درجہ دیا جائے نہ اس پر اصرار کیا جائے نیز فہم نصوص یا رائے میں علماء یا ائمہ کا اختلاف ہو تو جس کی بات اقرب الی السنۃ معلوم ہوتی ہو اور جس کے دلائل زیادہ وزنی اور پائدار ہوں اس کی رائے قبول کی جائے اور سارے مسائل کے اندر کسی ایک امام کی رائے پر ہر گز اصرار نہ کیا جائے۔

محدث شام علامہ البانی اپنی کتاب صفۃ صلوٰۃ النبی میں سنت کو ائمہ کرام کے اجتہادات و قیاس پر مقدم کرنے کا اصول ذکر کر کے فرماتے ہیں:

۔یہی سب سے معتدل اور صحیح طریقہ ہے۔ اللہ نے مومنین کو اسی کا حکم دیا ہے اور سید الرسل جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کو بیان فرمایا ہے۔ اور سلف صالح یعنی صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے علماء اسلام اور ائمہ کرام کا یہی مسلک رہا ہے۔ اسی کو ائمہ اربعہ نے بھی اپنایا ہے، جنکی طرف آج جمہور مسلمان اپنی نسبت کرتے ہیں ان سب کا اتفاق ہے کہ سنت سے تمسک کرنا، اس کی طرف رجوع کرنا اور جو قول اس کے خلاف ہو اسے چھوڑ دینا ضروری ہے۔ خواہ وہ جتنے بھی باعظمت انسان کا قول ہو۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان اس سے بہر حال بلند ہے اور آپ کا طریقہ اس سے زیادہ درست ہے۔ لہٰذا جیسا کہ خود ان ائمہ کرام نے حکم دیا ہے کہ بہر حال حدیث سے تمسک کیا جائے خواہ وہ ان ائمہ کے اقوال کے خلاف ہی کیوں نہ ہوں، اس پر عمل پیرا ہونا چاہیے اور آنکھ بند کر کے ان کی تقلید نہیں کرنی چاہیے۔ بیجا نہ ہوگا کہ ہم ذیل میں ائمہ کرام کے وہ اقوال بھی نقل کر دیں، جن میں انھوں نے اس کی تاکید کی ہے۔

اتباع سنت کے سلسلے میں ائمہ اربعہ کے اقوال اور اپنے مخالف سنت اقوال کو ترک کر دینے کی صراحت:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی معلومات کی حد تک اس باب کے تحت بعض چیزوں کا

ذکر کرنا چاہوں بہت ممکن ہے کہ یہی باتیں ان لوگوں کے دلوں میں اتر جائیں جو آنکھ بند کرکے ائمہ اربعہ بلکہ ان سے بھی کم مرتبہ لوگوں کی تقلید کرتے ہیں لہ اور ان کے اقوال و مذاہب کو آسمانی احکام تصور کرتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: اِتَّبِعُوا مَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِنْ رَبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ قَلِيلًا مَا تَذَكَّرُونَ (اعراف: ۳)

(تمہارے رب کی جانب سے جو کچھ نازل کیا گیا ہے اسی کی پیروی کرو اور اس کے علاوہ دوسرے اولیاء کی پیروی نہ کرو، بہت کم تم لوگ نصیحت حاصل کرتے ہو۔

۱۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ

ائمہ اربعہ میں پہلے امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابتؒ ہیں۔ اتباع سنت اور ترک تقلید کے سلسلے میں آپ کے شاگردوں نے آپ سے بہت سارے اقوال اور مختلف عبارتیں نقل کی ہیں۔ جن سب کا مدعا یہ ہے کہ حدیث کے خلاف ائمہ کے اقوال کو ترک کرکے حدیث پر عمل کرنا واجب ہے۔ نقول یہ ہیں۔

۱۔ اذا صح الحدیث فھو مذھبی۔ صحیح حدیث ہی میرا مذہب ہے۔ لہ

---

(۱) اسی تقلید کے بارے میں امام طحاوی رقمطراز ہیں "لایقلد الا عصبی او غبی" تقلید کوئی متعصب یا بیوقوف ہی کرسکتا ہے۔ (رسم المفتی، لابن عابدین ص ۳۲۔ ج ۱۔ مجموعہ رسائل)

(۲) الحاشیۃ لابن عابدین (۱/۶۳)، رسم المفتی لابن عابدین (۱/۴) در مجموعہ رسائل ابن عابدین، ایقاظ الہمم للشیخ صالح الفلانی (ص ۶۲)، ابن عابدین نے ابن الہمام کے شیخ ابن الشحنۃ الکبیر کی "شرح الہدایہ" کے حوالے سے یہ نقل کیا ہے کہ "حنفی مذہب کے خلاف کوئی صحیح حدیث پائی جائے تو حدیث ہی پر عمل کیا جائے گا اور یہی حدیث امام صاحب کا مذہب قرار پائے گی۔ اور اس حدیث پر عمل کرنے کی وجہ سے ان کا مقلد حنفیت سے خارج نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ امام ابوحنیفہ سے صحت کے ساتھ منقول ہے کہ "جب حدیث صحیح ہو تو وہی میرا مذہب ہوگا۔ امام ابن عبدالبرؒ نے امام ابوحنیفہؒ کے علاوہ دیگر ائمہ کرام سے بھی یہی قول نقل کیا ہے۔

میں کہتا ہوں یہ چیز ائمہ کرام کے کمال علم اور کمال تقوی کی دلیل ہے کہ انھوں نے اپنے اس ارشاد سے یہ اشارہ کردیا کہ ان کو ساری سنت نبویہ کا علم نہیں تھا۔ امام شافعی نے بھی اس کی صراحت فرمائی ہے، جیسا کہ ابھی آرہا ہے، خلاصہ یہ کہ حدیث نہ ملنے کی بنا پر ان ائمہ سے بھی خلاف سنت باتیں واقع ہوگئی ہیں لیکن انھوں نے ہمیں اس صورت میں تمسک بالحدیث کا حکم دیا ہے اور ہمیں بتلایا ہے کہ ان کا بھی یہی مذہب سمجھیں۔

۲ - لا یحل لاحد ان یاخذ بقولنا مالم یعلم من این اخذناہ - کسی کے لیے حلال نہیں کہ ہمارے قول کو یہ جانے بغیر لے کہ ہم نے اسے کہاں سے لیا ہے - [1]

ایک روایت میں ہے: حرام علی من لم یعرف دلیلی ان یفتی بکلامی - جو میرے کلام کی دلیل نہ جانے اس پر حرام ہے کہ میرے کلام کی بنیاد پر فتوی دے - ایک روایت میں اتنا اور ہے - فاننا بشر نقول القول الیوم و نرجع عنہ غدا" - اس لیے کہ ہم بھی انسان ہیں، آج ایک بات کہتے ہیں اور کل اس سے رجوع کر لیتے ہیں۔

ایک روایت میں ہے: "ویحک یا یعقوب لا تکتب کل ما تسمع منی فانی قد اری الرائ الیوم واترکہ غدا وارى الرائ غدا واترکہ بعد غد" - (اے یعقوب (امام ابو یوسف کا نام) دیکھو! مجھ سے سنی ہوئی تمام باتیں مت لکھو - اس لیے کہ آج میں ایک رائے قائم کرتا ہوں اور کل چھوڑ دیتا ہوں اور کل ایک رائے قائم کرتا ہوں اور پرسوں چھوڑ دیتا ہوں - [2]

---

[1] الانتقاء فی فضائل الثلاثۃ الائمۃ الفقہاء لابن عبدالبر (ص ۱۴۵) اعلام الموقعین لابن القیم (۳۰۹/۲) الحاشیۃ علی البحر الرائق لابن عابدین (۲۹۳/۶) رسم المفتی (ص ۲۹ و ۳۲) - المیزان للشعرانی (۵۵/۱) دوسری روایت اور تیسری روایت عباس دوری نے صحیح سند کے ساتھ امام زفر سے نقل کی ہے - دیکھیے التاریخ لابن معین (۷۷/۶/۱) اور امام ابو حنیفہ کے دیگر اصحاب مثلاً زفر ابو یوسف اور عافیہ بن یزید سے بھی اس طرح کی روایت منقول ہے۔ جیسا کہ الایقاظ (ص ۵۲) میں موجود ہے اور ابن قیم نے (۲/ ۳۴۴) میں ابو یوسف سے اس کی صحت کا یقین کیا ہے اور زیادتی ابن عبدالبر اور ابن القیم کی الایقاظ ص ۶۵ کی تعلیق میں منقول ہے۔

میں کہتا ہوں ـــــ جب ان ائمہ کا یہ قول ان لوگوں کے لیے ہے جو ان کی دلیل نہ جانتے ہوں تو اندازہ لگائیے کہ ان لوگوں کے بارے میں یہ ائمہ کیا فرمائیں گے جو یہ جانتے ہوں کہ دلیل ان کے قول کے خلاف ہے پھر بھی دلیل کے خلاف فتوی صادر کر دیں، اس بات پر غور کیجیے - ان کی یہی ایک بات اندھی تقلید کی بنیاد ڈھا دینے کے لیے کافی ہے - اسی وجہ سے جب میں نے بعض مقلدین مشائخ کے ایسے خلاف دلیل فتوے پر نکیر کی تو انھوں نے اس حکم کو امام ابو حنیفہ کی طرف منسوب کرنے سے انکار کر دیا۔

[2] میرے خیال میں ایسا اس لیے ہے کہ امام صاحب اکثر اپنے قول کی بنیاد قیاس پر رکھتے تھے پھر ان کو کوئی دوسرا قوی قیاس یا کوئی حدیث نبوی مل جاتی تھی تو وہ اپنے قول کو چھوڑ کر اسی کو لے لیتے تھے۔
شعرانی نے "المیزان (۶۳/۱) میں بڑی اچھی بات لکھی ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے: کہ امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں

۳- اذا قلت قولا یخالف کتاب اللہ تعالیٰ وخبر الرسول فاترکوا قولی۔ جب میں کوئی ایسی بات کہوں جو کتاب اللہ اور خبر رسول کے مخالف ہو تو میرے قول کو چھوڑ دو۔ ؎

؎ میرا اعتقاد ہے بلکہ ہر منصف آدمی کا اعتقاد ہے کہ اگر آپ شریعت مطہرہ کے عہد تدوین تک زندہ رہتے اور مختلف ملکوں اور علاقوں میں گھوم گھوم کر حفاظ کرام نے جو حدیثیں جمع کیں انھیں پالیتے تو اپنے تمام قیاس چھوڑ کر انہی احادیث کو لے لیتے اور جس طرح دوسرے ائمہ کے مذاہب میں قیاس کم پائے جاتے ہیں اسی طرح آپ کے مذہب میں بھی قیاس کی کمی ہوتی۔ لیکن چونکہ آپ کے زمانے میں ادلہ شرعیہ تابعین اور تبع تابعین کے ساتھ شہروں اور دیہاتوں میں منتشر تھے، اس لیے دیگر ائمہ کے بالمقابل آپ کے مذہب میں قیاس کی زیادتی ایک قدرتی بات تھی۔ کیونکہ جن مسائل میں آپ نے قیاس کیا ان میں آپ کے پاس نصوص موجود نہ تھیں بخلاف اور ائمہ کے کہ ان کے زمانہ میں حفاظ حدیث نے شہروں اور دیہاتوں میں سرگرداں رہ کر احادیث کو جمع اور مدون کیا۔ اس لیے احادیث شریعت باہم ایک دوسرے کے موافق نکلیں۔ بس یہی وجہ ہے کہ امام ابو حنیفہ کے مذہب میں قیاس کی کثرت ہے اور دوسرے ائمہ کے مذاہب میں اس کی قلت ہے۔

شعرانی کے اس ارشاد کا بیشتر حصہ مولانا عبد الحی لکھنوی نے "النافع الکبیر" ص ۱۳۵ میں نقل کیا ہے اور اس پر تائیدی اور توضیحی حاشیہ بھی لگایا ہے۔ باذوق حضرات کو اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔

میں کہتا ہوں — امام ابو حنیفہ سے بلا قصد و ارادہ جن احادیث صحیحہ کی مخالفت ہو گئی ہے، جب ان کے سلسلے میں امام صاحب کا یہ عذر ہے — اور یہ قطعاً مقبول عذر ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی وسعت سے زیادہ مکلف نہیں بناتا ہے — تو اس کی بنا پر آپ کو مطعون کرنا ہرگز جائز نہیں، جیسا کہ بعض جاہل کرتے ہیں بلکہ آپ کا ادب کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ آپ ان ائمہ مسلمین میں سے ایک امام ہیں جن کے ذریعہ اس دین حنیف کی حفاظت کی گئی اور اس کے بہت سے فروعی مسائل ہم تک پہنچے۔ درحقیقت آپ ہر حال میں عند اللہ ماجور ہیں، خواہ غلطی کر بیٹھے ہوں یا صحیح استنباط کیا ہو۔ لیکن اسی طرح آپ کے ماننے والوں پر بھی ضروری ہے کہ آپ کے جو اقوال احادیث صحیحہ کے مخالف ہیں، ان سے چمٹے نہ رہیں۔ اس لیے کہ یہ آپ کے مذہب کے مسائل ہیں ہی نہیں جیسا کہ ابھی آپ نے اس بارے میں ان کے فرمودات دیکھے۔ درحقیقت یہ لوگ ایک وادی میں ہیں اور سابقہ لوگ ایک دوسری ہی وادی میں ہیں۔ اور حق دونوں کے بیچ بیچ ہے۔ ربنا اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربنا انک رؤف رحیم۔ (اے خدا ہمکو اور ہمارے بھائیوں کو بخش دے وہ جو ہم سے پہلے ایمان کے ساتھ گزر گئے [illegible]

۲- امام مالک بن انس رحمہ اللہ

امام مالکؒ نے فرمایا :- (۱) انما انا بشر اخطئ و اُصیب، فانظروا فی رائی فکل ما وافق الکتاب والسنۃ فخذوہ وکل ما لم یوافق الکتاب والسنۃ فاترکوہ - (میں محض ایک انسان ہوں، خطا و صواب دونوں مجھ سے صادر ہوتے ہیں اس لیے میری رائے دیکھ لو اگر وہ کتاب و سنت کے موافق ہو تو قبول کر لو، ورنہ چھوڑ دو۔[۱]

(۲) لیس احد بعد النبی ﷺ الا و یوخذ من قولہ و یترک الا النبی ﷺ (ص) (نبی ﷺ کے سوا کوئی ایسی ذات نہیں جس کے تمام اقوال کو لے لیا جائے بلکہ نبی کے سوا ہر شخص کی کچھ باتیں لی جائیں گی اور کچھ چھوڑ دی جائیں گی۔

(بقیہ پچھلے صفحے کا حاشیہ) الایقاظ (ص ۵۰) للفلانی۔ فلانی نے اس قول کو امام محمد کی طرف بھی منسوب کیا ہے پھر فرمایا ہے کہ یہ اور اس طرح کے اقوال مقلدین کے لیے ہیں۔ مجتہدین چونکہ ان کے محتاج نہیں اس لیے مجتہدین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں —— اسی لیے شعرانی نے المیزان (۱/۲۶) میں یہ وضاحت فرمادی ہے کہ اگر آپ یہ اعتراض کریں کہ میں ان احادیث کو کیا کروں جو ہمارے امام کی وفات کے بعد پائی گئیں اور صحیح ثابت ہوئیں، لیکن امام نے ان کے مطابق فتویٰ نہیں دیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ان احادیث پر بلا چوں چرا عمل کریں۔ اس لیے کہ اگر آپ کے امام صاحب نے ان احادیث کو پا لیا ہوتا اور وہ صحیح ثابت ہو جاتیں تو آپ کو اس پر عمل کرنے کا حکم دیے ہوتے۔ کیونکہ تمام ائمہ شریعت کے ہاتھوں قید ہیں۔؟

لہٰذا جس نے یہ طریقہ اختیار کیا اس نے دونوں ہاتھ سے خیر سمیٹا اور جس نے یہ کہا کہ میں کسی حدیث پر اس وقت تک عمل نہیں کر سکتا جب تک کہ ہمارے امام نے اس کو نہ لیا ہو تو وہ بہت سے خیر سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ آج اکثر مقلدین کی یہی حالت ہے۔ حالانکہ ان کے لیے زیادہ مناسب یہ تھا کہ وہ اپنے ائمہ کی وصیت کے مطابق ہر اس حدیث پر عمل کرتے جو ان کے بعد صحیح ثابت ہوئی۔ اس لیے کہ ان ائمہ کے بارے میں ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اگر وہ زندہ ہوتے اور ان احادیث کو پا جاتے جو ان کے بعد صحیح ثابت ہوئیں تو ان کو ضرور قبول کر لیتے اور ان پر عمل کرتے اور ان کے مقابل اپنے تمام قیاس اور تمام اقوال سے دست بردار ہو جاتے۔

[۱] الجامع (۲/۳۲) لابن عبدالبرؒ اصول الاحکام (۶/۱۴۹) لابن حزمؒ، الفلاق (ص ۷۲)

[۲] متاخرین فقہاء کے یہاں امام مالک کی طرف اس کلمے کی نسبت مشہور ہے اور ابن عبدالہادی نے بھی "ارشاد السالک" (۱/۲۲۷) میں اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ نیز ابن عبدالبر نے "الجامع" (۲/۹۱) اور ابن حزم نے "اصول الاحکام" (۶/۱۴۵، ۱۷۹) میں اس کو حکم بن عتیبہ اور مجاہد سے نقل کیا ہے اور تقی الدین سبکی نے اس کو "الفتاویٰ" (۱/۱۴۸) میں ابن عباس سے

۳۔ ابن وہب فرماتے ہیں: وضو کے اندر پاؤں کی انگلیوں کے خلال کے سلسلے میں امام مالک سے سوال کیا گیا تو میں نے آپ کو فرماتے سنا کہ لوگوں پر یہ کام نہیں ہے۔ ابن وہبؒ کہتے ہیں کہ میں نے انھیں چھوڑے رکھا۔ یہاں تک کہ لوگ کم ہو گئے تو میں نے امام مالک سے کہا اس بارے میں ہمارے پاس ایک سنت ہے۔ آپ نے فرمایا وہ کیا ہے؟ میں نے کہا۔ مجھ سے لیث بن سعد اور ابن لہیعہ اور عمر بن حارث نے۔ یزید بن عمرو معافری سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا اور انھوں نے ابو عبدالرحمان حبلی سے اور انھوں نے مستورد بن شداد قرشی سے روایت کی کہ انھوں نے کہا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی چھوٹی انگلی سے اپنے پیر کی انگلیوں کے درمیان خلال کرتے ہوئے دیکھا۔ اس پر امام مالکؒ نے فرمایا یہ حدیث حسن ہے اور میں نے اب سے پہلے اسے کبھی نہیں سنا تھا۔ اس کے بعد میں نے دیکھا کہ جب کبھی آپ سے اس کے بارے میں پوچھا جاتا تو آپ خلال کا حکم دیتے۔ ؎۱

۳۔ امام شافعی رحمہ اللہ

امام شافعیؒ سے اس بارے میں بکثرت اور عمدہ تصریحات منقول ہیں ؎۲ اور آپ کے اصحاب اس پر سب سے زیادہ سعادتمندی سے عمل پیرا ہیں۔ چند نقول یہ ہیں:

۱۔ ما من أحد إلا وتذهب عليه سنة لرسول الله ﷺ وتعزب عنه فمهما قلت من قول أو أصّلت من أصل فيه عن رسول الله ﷺ خلاف ما قلت، فالقول ما قال رسول الله وهو

← نقل کیا ہے اور اس کی عمدگی پر اظہار تعجب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس کلمہ کو مجاہد نے ابن عباس سے لیا ہے اور ان دونوں سے امام مالک نے لیا ہے اور ان ہی سے یہ بات مشہور ہو گئی ہے۔"

میں کہتا ہوں —— پھر ان حضرات سے اس کلمے کو امام احمد بن حنبل نے لیا ہے جیسا کہ امام ابوداؤدؒ "مسائل الامام احمدؒ" ص ۲۷۶ میں فرماتے ہیں "میں نے امام احمدؒ کو فرماتے ہوئے سنا۔ کہ نبیؐ کے علاوہ کوئی ایسی ہستی نہیں جس کے تمام اقوال کو لے لیا جائے بلکہ کچھ کو لیا جائے گا اور کچھ کو چھوڑ دیا جائے گا۔

؎۱ مقدمۃ الجرح والتعدیل لابن ابی حاتم (ص ۳۱-۳۲)

؎۲ ابن حزمؒ (۶/ ۱۱۸) میں رقمطراز ہیں "جن فقہاء کی تقلید کی گئی ہے وہ خود تقلید کو باطل قرار دیتے تھے اور انھوں نے اپنے اصحاب کو اپنی تقلید سے منع کیا تھا۔ جن میں امام شافعیؒ اس معاملہ میں بڑے سخت تھے۔ چنانچہ آپؒ نے اصح احادیث اور آثار کے اتباع کی اتنی سخت تاکید فرمائی ہے کہ اتمام حجت کر دیا ہے، کسی اور نے اتنی تاکید نہیں کی ہے۔ امام موصوف نے تقلید سے بالکلیہ ←

۱۔ ہر شخص سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی نہ کوئی سنت چھوٹ جاتی ہے اور رسائی سے باہر ہو جاتی ہے چنانچہ میں اگر کوئی ایسی بات کہوں یا کوئی ایسی اصل مستنبط کروں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے میرے قول کے خلاف ہو تو قول وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور وہی میرا بھی قول ہے۔

۲۔ اجمع المسلمون علی أن من استبان له سنة عن رسول اللهؐ لم يحل له ان يدعها لقول أحد ،، تمام مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ کوئی حدیث رسول واضح ہو جائے تو کسی کے لیے حلال نہیں کہ کسی کے قول کی بنا پر اس حدیث کو ترک کر دے۔ [۲]

۳۔ اذا وجدتم فی کتابی خلاف سنة لرسول الله فقولوا بسنة رسول اللهؐ ودعوا ما قلت میری کتاب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف کوئی بات پاؤ تو سنت رسول کو اختیار کر لو اور میرا قول چھوڑ دو۔ [۳]

۴۔ اذا صح الحديث فهو مذهبی ۔ جب حدیث صحیح ہو تو وہی میرا مذہب ہے [۴]

← برأت ظاہر فرمائی ہے اور برملا اس کا اعلان کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو نفع کا باعث بنائے اور انھیں اجر عظیم سے نوازے یقیناً موصوف خیر کثیر کا سبب ہے۔

[۱] اسے امام حاکمؒ نے امام شافعیؒ سے متصل سند کے ساتھ روایت کیا ہے، جیسا کہ "تاریخ دمشق" لابن عساکر (۳/۱/۱۵) اور اعلام الموقعین (۲/۳۶۳، ۳۶۴) اور "الایقاظ" ص ۱۰۰ میں ہے۔

[۲] ابن قیمؒ (۲/۳۶۱)، الفلانی (ص ۶۸)

[۳] ذم الکلام للہروی (۱/۴۷/۳) الاحتجاج بالشافعی للخطیب (۲/۸) وابن عساکر (۱۵/۹/۱۰) المجموع للنووی (۱/۶۳)۔ ابن القیمؒ (۲/۳۶۱) الفلانی (ص ۱۰۰)

[۴] المجموع للنووی الشعرانی (۱/۵۷) شعرانی نے حاکم اور بیہقی کی طرف بھی منسوب کیا ہے۔ الفلانی (ص ۱۰۷) شعرانی نے یہ بھی کہا ہے "ابن حزم فرماتے ہیں کہ مراد یہ ہے کہ وہ حدیث خواہ ان کے نزدیک صحیح ہو خواہ ان کے بجائے کسی دوسرے امام کے نزدیک"

میں کہتا ہوں ــــ امام نووی کا وہ قول جو اس کے بعد مذکور ہے اس کی مزید وضاحت کر دیتا ہے۔ امام نووی کے قول کا خلاصہ یہ ہے :۔ "تثویب کے مسئلے میں ہمارے اصحاب نے اسی اصول پر عمل کیا ہے۔ اسی طرح بیماری کی وجہ سے احرام کھولنے کی شرط لگانے کے مسئلے میں ــ اور اس جیسے بہت سے مسائل میں جو ہمارے مذہب کی کتابوں میں معروف ہیں ــ ←

و ـ انتم اعلم بالحدیث والرجال منی، فاذا کان الحدیث الصحیح فاعلمونی به ای شئ یکون کوفیا او بصریا او شامیا حتی اذهب الیه اذا کان صحیحاً ـ (امام احمد بن حنبل سے فرمایا)

اسی اصول پر عمل کیا گیا ہے اور ہمارے اصحاب میں سے جن لوگوں کے متعلق منقول ہے کہ انھوں نے حدیث کے مطابق فتویٰ صادر کیا، ان میں ـــ ابو یعقوب البویطی اور ابوالقاسم الدارکی ہیں اور ہمارے محدثین اصحاب میں سے جن لوگوں نے اس اصول کو استعمال کیا ان میں امام ابو بکر بیہقی اور بہت سے لوگ ہیں ـ نیز ہمارے متقدمین اصحاب کی ایک جماعت ایسی بھی گزری ہے کہ جب امام شافعی کا مذہب حدیث کے خلاف دیکھتی تو یہ کہتے ہوئے حدیث پر عمل کرتی اور فتویٰ دیتی تھی کہ جو مسئلہ حدیث کے موافق ہو وہی امام شافعیؒ کا مذہب ہے، شیخ ابو عمرو فرماتے ہیں ـ جو شافعی المسلک آدمی کسی حدیث کو اپنے مذہب کے خلاف پائے تو سب سے پہلے یہ دیکھے کہ اس (آدمی) کے اندر مطلقاً یا خاص اس باب میں یا خاص اس مسئلہ میں اجتہاد کی تمام شرطیں پائی جاتی ہیں یا نہیں؟ اگر پائی جاتی ہیں تو اس حدیث پر مستقل عمل کرنا اس کے لیے لازمی ہے، اور اگر نہیں پائی جاتی ہیں اور حدیث کی مخالفت مشکل ہے اور تلاش و جستجو کے باوجود حدیث کی مخالفت کرنے والے کے پاس کوئی اطمینان بخش جواب بھی نہیں ہے تو اگر امام شافعی کے علاوہ کسی مستقل امام نے اس حدیث پر عمل کیا ہے تو وہ بھی اسی پر عمل کرے اور یہ چیز اس کے لیے اپنے امام کا مذہب ترک کرنے کے لیے عذر کا درجہ رکھے ـ اور یہ بہت عمدہ اور متعین بات ہے ـ واللہ اعلم

میں کہتا ہوں ـــ یہاں ایک دوسری صورت بھی ہے جسے ابن صلاحؒ نے ذکر نہیں کیا ہے ـ وہ یہ کہ اگر وہ آدمی کسی ایسے شخص کو نہ پائے جس نے اس حدیث پر عمل کیا ہو تو اس صورت میں کیا کرے؟ اس کا جواب تقی الدین سبکی رحمہ نے رسالہ "معنی قول الشافعی ..... اذا صح الحدیث ..... (ص ۲۰ ج ۳) میں دیتے ہوئے فرمایا ہے ـ اس صورت میں بھی میرے نزدیک حدیث پر عمل کرنا بہتر ہے وہ انسان فرض کرلے کہ اگر وہ نبیؐ کے سامنے ہوتا اور آپ ہی سے اس حدیث کو سنتا تو کیا اس کے لیے اس حدیث پر عمل سے رکے رہنے کی گنجائش ہوتی؟ ہرگز نہیں ـ حقیقت یہ ہے کہ ہر آدمی اپنے عقل و فہم کے مطابق مکلف ہے ـ اس کی مکمل بحث اور تحقیق آپ کو "اعلام الموقعین" (۲/۳۰۲ و ۳۰۷) میں اور فلانی کی کتاب "ایقاظ ہمم اولی الابصار للاقتداء بسید المہاجرین والانصار وتحذیرہم عن الابتداع الشائع فی القری والامصار من تقلید المذاہب مع الحمیۃ والعصبیۃ بین فقہاء الاعصار" میں ملے گی ـ یہ اپنے باب میں ایک نرالی کتاب ہے ہر حق پسند آدمی کو فہم و تدبر سے کام لے کر اس کا مطالعہ کرنا چاہیے ـ

آپ لوگ علم حدیث اور معرفتِ رجال میں مجھ سے زیادہ ماہر ہیں۔ اس لیے جب حدیث صحیح ہو تو مجھے بھی بتا دیا کریں۔ خواہ وہ جہاں کی بھی ہو کوفی ہو یا بصری ہو یا شامی۔ ؎[1]

۶۔ کل مسالة صح فیها الخبر عن رسول اللہ ﷺ عند اهل النقل بخلاف ما قلت فانا راجع عنها فی حیاتی وبعد موتی۔ جس کسی مسئلے میں اہلِ نقل کے یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحیح حدیث ہو اور میرا قول اس کے خلاف ہو تو میں اپنے اس قول سے اپنی زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی رجوع کرتا ہوں۔ ؎[2]

۷۔ اذا رأیتمونی اقول قولا وقد صح عن النبی ﷺ خلافه فاعلموا ان عقلی قد ذهب۔ صحیح حدیثِ رسول کے خلاف جب مجھے کوئی بات کہتے ہوئے دیکھو تو سمجھ لو کہ میری عقل چلی گئی ہے۔ ؎[3]

۸۔ کل ما قلت فکان عن النبی ﷺ خلاف قولی مما یصح فحدیث النبی اولی فلا تقلدونی۔ صحیح حدیث کے خلاف میں نے جو کچھ بھی کہا ہے۔ اس کے اندر حدیث نبوی کو ترجیح حاصل ہوگی اور یاد رکھو میری تقلید نہ کرنا۔ ؎[4]

؎[1] مخاطب امام احمد بن حنبلؒ ہیں اسے خطیب نے "الاحتجاج بالشافعی" (۸/۱) میں اور ان سے ابن عساکر نے (۱/۹/۱۵) میں، ابن عبدالبر نے "الانتقاء" (ص ۷۵) میں، ابن الجوزی نے "مناقب الامام احمد" (ص ۴۹۹) میں اور ہروی نے (۲/۴۷/۲۱) میں تین طرق سے، عبداللہ بن احمد بن حنبل عن ابیہ کے واسطے سے نقل کیا ہے۔ امام شافعی نے ان سے یہ بات کہی اس لیے یہ صحیح ہے اور اسی لیے ابن القیم نے "الاعلام" (۳۲۵/۲) میں اور فلانی نے "الایقاظ" (ص ۱۵۲) میں جزم کے ساتھ اس کی نسبت ان کی طرف کی ہے پھر لکھا ہے کہ "امام بیہقی فرماتے ہیں۔ اسی لیے امام شافعی نے بکثرت حدیث سے اخذ کیا ہے، کیوں کہ انھوں نے حجاز، شام، اور عراق والوں کا علم جمع کیا تھا اور جو کچھ ان کے نزدیک صحیح ثابت ہوا اسے لے لیا، دوسروں میں حق واضح ہو جانے کے بعد انھوں نے اپنے اہلِ شہر کے مذہب کی طرف کوئی جھکاؤ اور طرفداری اختیار نہیں کی۔ درانحالیکہ ان سے پہلے ایسے بزرگ بھی تھے جنھوں نے اپنے اہلِ شہر کے مذہب سے جو کچھ پایا اسی پر اقتصار کیا۔ اور جو کچھ اس کے خلاف تھا، اس کی صحت جاننے کی کوشش نہیں کی اللہ ہمیں اور انھیں بخش دے۔

؎[2] الہروی (۱/۴۷)، اعلام الموقعین لابن القیم (۳۶۳/۲)، الفلانی (ص ۱۰۴)

؎[3] اس کو ابو القاسم سمرقندی نے "الامالی" میں روایت کیا ہے، جیسا کہ "المنتقی من الامالی" لأبی حفص المودب (۱/۲۳۴) اور ابن عساکر (۱/۱۰/۱۵) میں ہے۔

؎[4] ابن عساکر (۲/۹/۱۵)

۴۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ

امام احمد بن حنبلؒ نے سارے ائمہ سے زیادہ حدیث نبوی اکٹھا کی اور ان پر سب سے زیادہ عامل بھی تھے۔ حتیٰ کہ آپ تفریعات اور رائے پر مشتمل کتابیں تیار کرنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ ۱؎ اور اسی لیے آپ نے فرمایا ہے۔

۱۔ لا تقلدنی ولا تقلد مالکا ولا الشافعی ولا الاوزاعی ولا الثوری وخذ من حیث اخذوا۔ (میری تقلید نہ کرو، اور مالک، شافعی، اوزاعی اور ثوری کی بھی تقلید نہ کرو بلکہ وہیں سے تم بھی لو جہاں سے ان لوگوں نے لیا ہے۔ ۲؎

۲۔ رای الاوزاعی ورای مالک ورای ابی حنیفۃ کلہ رای وھو عندی سواء وانما الحجۃ فی الآثار۔ اوزاعی کی رائے، مالک کی رائے اور ابو حنیفہ کی رائے سب کی سب رائے ہی ہے اور میرے نزدیک سب برابر ہے، قابل حجت صرف آثار ہیں۔ ۳؎

۳۔ من رد حدیث رسول اللہ ﷺ فھو علی شفا ھلکۃ۔ جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث رد کر دی وہ ہلاکت کے دہانے پر ہے۔ ۴؎

یہ ہیں تمسک بالحدیث کے حکم اور بے بصیرت تقلید سے پرہیز کے بارے میں ائمہ اربعہ کے زریں اقوال، یہ اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ ان کے اندر تاویل اور مخاصمت کی کوئی گنجائش نہیں، اور اس کے مدنظر اگر کسی نے اتباع سنت کی خاطر ان ائمہ کے بعض اقوال کی مخالفت کر ڈالی تو ایسا شخص، ان کے مذہب کا مخالف نہیں اور ان کی روش سے خارج نہیں، بلکہ وہی شخص در اصل ان کا سچا متبع اور محکم طریقے کا پیرو کہلائے گا، اس کے برعکس اگر کسی نے ایک ثابت اور صحیح حدیث کو محض اقوال ائمہ کے مخالف ہونے کی بنا پر ترک کر دیا تو ایسا شخص ان کا مقلد اور پیروکار نہیں بلکہ ان کا نافرمان اور ان کے مذکورہ بالا اقوال کا مخالف ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: فلا وربك لا یؤمنون حتی یحکموك فیما شجر بینھم

۱؎ المناقب، لابن الجوزی (ص ۹۲)

۲؎ الفلانی (۱۱۳) الاعلام لابن القیمؒ (۲/۳۰۲)

۳؎ الجامع لابن عبدالبر (۲/۱۴۹)

۴؎ ابن الجوزی (ص ۱۸۲)

ثم لا یجدوا فی انفسهم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔ (النساء: ۶۵) اے محمدؐ تمہارے رب کی قسم! یہ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں یہ تم کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہے: فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبهم فتنة او یصیبهم عذاب الیم۔ (النور: ۶۳) رسول کے حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے کہ وہ کسی فتنے میں نہ گرفتار ہو جائیں یا ان پر دردناک عذاب نہ آ جائے۔

حافظ ابن رجب فرماتے ہیں: جس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم پہنچ جائے اور اس کو اس کا علم ہو جائے اس پر یہ فرض ہے کہ وہ امت سے بیان کر دے۔ امت کی خیر خواہی کے لیے کوشاں رہے، اس پر عمل درآمد کے لیے امت کو ابھارے۔ اگرچہ وہ امت کی کسی شخصیت کی رائے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، اس لیے کہ حکم نبوی کسی بھی بزرگ ہستی کی رائے کے بالمقابل اقتدار اور تعظیم کا زیادہ مستحق ہے۔ کیوں کہ وہ رائے ان بزرگ کی محض ایک غلطی ہے اور یہی وجہ ہے کہ صحابہ اور تابعین نے صحیح حدیث کی مخالفت کرنے والے کا رد کیا ہے اور بسا اوقات سخت نکیر کی ہے۔[1] لیکن یہ اس لیے نہیں کہ ان کو اس مخالفت کرنے والے سے بغض تھا۔ بلکہ وہ ان کے نزدیک محبوب اور معظم تھا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے نزدیک

---

[1] میں کہتا ہوں — اگرچہ اس کی زد ان کے آباؤ اجداد اور علمائے کرام ہی پر کیوں نہ پڑتی ہو جیسا کہ امام طحاویؒ نے "شرح معانی الآثار" (۱/۳۷۲) میں ثقہ رواۃ کے ذریعہ سالم سے روایت کیا ہے۔ سالم کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں حضرت ابن عمرؓ کے ساتھ مسجد میں بیٹھا تھا کہ ایک شامی شخص آیا اور حج تمتع کے بارے میں پوچھنے لگا۔ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا تمتع ایک عمدہ چیز ہے، اچھی چیز ہے، اس نے کہا: آپ کے والد تو اس سے منع فرماتے تھے۔ ابن عمرؓ نے فرمایا تمہارا ستیاناس ہو اگر ہمارے والد نے اس سے روکا ہے اور رسول اللہؐ نے کیا ہے اور کرنے کا حکم دیا ہے تو میرے والد کا قول اختیار کرو گے یا رسول اللہؐ کا حکم مانو گے؟ اس نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم مانیں گے۔ آپ نے فرمایا، تو پھر جاؤ۔

امام احمد (نمبر ۵۷۰۰) اور امام ترمذی (مع شرح تحفۃ الاحوذی، ۲/۸۲) نے بھی اسی کے مثل روایت نقل کی ہے اور صحیح قرار دیا ہے اور ابن عساکر نے (۷/۵۱/۱) ابن ابی ذئب سے روایت کیا ہے کہ ابن ابی ذئب نے کہا: سعد بن ابراہیم (یعنی عبدالرحمان بن عوف کے پوتے) نے ایک شخص کے خلاف ربیعہ بن ابی عبدالرحمان کی رائے کے مطابق فیصلہ صادر فرمایا، میں نے انھیں ان کے اس فیصلے کے خلاف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث سنائی۔ سعد بن ابراہیم نے ربیعہ سے کہا۔ یہ ابن ابی ذئب ہیں میرے نزدیک ثقہ ہیں اور میرے اس فیصلے کے خلاف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث بیان کرتے ہیں۔ ربیعہ نے ←

اس سے بھی زیادہ محبوب تھے اور آپ کا حکم ہر مخلوق کے حکم سے بڑھ کر تھا۔ اس لیے اگر کسی کا قول حکم نبوی سے ٹکرا جائے تو اس صورت میں حکم رسول ہی تقدیم اور اتباع کا زیادہ مستحق ہے اور اس سلسلے میں کسی بھی خدا رسیدہ اور بزرگ ہستی کی تعظیم مانع نہیں ہونی چاہیے۔[1] بلکہ خود وہ خدا رسیدہ بزرگ بھی اپنے خلاف سنت اقوال کی مخالفت ناپسند نہیں کر سکتے تھے۔[1]

میں کہتا ہوں — آخر وہ خدا رسیدہ ہستیاں اس کو ناپسند کیوں کرتیں جبکہ خود انھوں نے ہی اپنے متبعین کو یہ تاکید کر رکھی ہے کہ وہ ان کی خلافِ سنت باتوں کو ترک کر دیں۔ بلکہ امام شافعی نے تو اپنے اصحاب سے یہاں تک فرما دیا ہے کہ احادیث صحیحہ کی نسبت ان کی طرف کریں اگرچہ انھوں نے اس کے خلاف فتویٰ دیا ہو۔ اور اس کو اختیار نہ کیا ہو۔ اور اسی لیے جب محقق، ابن دقیق العید نے چاروں ائمہ کے ان مسائل کو جن میں سب نے یا کسی ایک نے صحیح حدیث کی مخالفت کی ہے۔ ایک ضخیم کتاب میں اکٹھا کیا تو سب سے پہلے یہ فرمایا "ائمہ مجتہدین کی طرف ان مسائل کی نسبت کرنا حرام ہے اور ان کے مقلدین فقہاء کے لیے اس کا جاننا ضروری ہے تاکہ وہ ان مسائل کو ان ائمہ کی جانب منسوب کر کے کذب بیانی کے مرتکب نہ ہوں۔[3]

مقلدین نے اتباعِ سنت کی خاطر اپنے ائمہ کے بعض اقوال ترک کر دیے۔

یہی وجہ ہے کہ ائمہ کے متبعین نے (زیادہ تر پہلوں نے اور کم تر بعد والوں نے) اپنے ائمہ کی تمام باتیں قبول نہیں کی ہیں بلکہ ان کے بہت سے اقوال کو یہ واضح ہو جانے پر کہ وہ سنت کے مخالف ہیں ترک کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ امام محمد بن حسن اور امام ابو یوسف نے تقریباً ایک تہائی مسائل میں اپنے استاذِ خاص امام ابو حنیفہ کی مخالفت کی ہے۔[4] فروعی مسائل کی کتابیں

← کہا، ہم نے اجتہاد سے کام لیا اور تمھارا فیصلہ نافذ ہو گیا۔ سعد نے کہا، عجیب بات ہے کہ سعد کا فیصلہ تو نافذ کر دوں اور رسول اللہ کا فیصلہ نافذ نہ کروں یہ نہیں ہو سکتا بلکہ سعد کی ماں کے پوت یعنی سعد کا فیصلہ رد کرتا ہوں اور رسولؐ کا فیصلہ نافذ کرتا ہوں اس کے بعد سعد نے فیصلہ کا نوشتہ طلب کر کے پھاڑ ڈالا اور جس کے خلاف فیصلہ ہوا تھا اس کے حق میں فیصلہ کر دیا۔

[1] میں کہتا ہوں — بلکہ ایسا شخص عند اللہ اجر پائے گا۔ اس لیے کہ فرمانِ رسول ہے "جب حاکم اپنے اجتہاد سے کوئی فیصلہ کرے اور وہ اجتہاد صحیح ہو تو اس کے لیے دو اجر ہوں گا۔ اور اگر وہ اپنے اجتہاد میں غلطی کر جائے تو اس کے لیے ایک اجر ہو گا۔ (بخاری و مسلم وغیرہ)

[2] ایقاظ الہمم کی تعلیق (ص ۹۳) میں یہ بات منقول ہے۔ [3] الفلانی (ص ۹۹)

[4] الحاشیہ لابن عابدین (۱/ ۶۲) اور مولانا عبد الحی لکھنوی نے "النافع الکبیر" (ص ۹۳) میں اس کو امام غزالی کی طرف منسوب کیا ہے۔

اس کی مخالف دلیل ہیں۔ یہی بات امام شافعی کے متبعین میں سے امام مزنی[۱] وغیرہ کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ اگر ہم اس سلسلے کی مثال بیان کریں گے تو بات لمبی ہو جائے گی اور اس بحث میں جو اختصار مطلوب ہے اس سے باہر نکل جائیں گے۔ اس لیے ہم صرف دو مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

(۱) امام محمدؒ اپنی معروف کتاب موطا ص ۱۵۸[۲] میں فرماتے ہیں: امام ابوحنیفہؒ استسقاء کے اندر نماز کے قائل نہیں تھے لیکن میرا قول یہ ہے کہ امام لوگوں کو دو رکعت نماز پڑھائے اور پھر دعا کرے اور اس کے بعد چادر پلٹے۔ الخ

(۲) امام محمدؒ کے شاگردوں میں سے عصام بن یوسف بلخی[۳] جو امام ابویوسف سے مسلسل وابستہ رہے[۴] امام ابوحنیفہ کے خلاف بکثرت فتویٰ دیا کرتے تھے کیونکہ انھیں امام ابوحنیفہ کے فتویٰ کی دلیل نہ ملتی اور اس کے خلاف کی دلیل ملتی لہٰذا وہ ان کے خلاف ہی فتویٰ دیتے[۵] اور اسی لیے وہ رکوع میں جاتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کرتے تھے[۶] اور اس عمل سے انھیں یہ بات

---

[۱] امام مزنیؒ نے امام شافعی کی کتاب "الام" کا جو اختصار کیا ہے اس کے شروع میں فرماتے ہیں "میں نے اس کتاب کو محمد بن ادریس شافعیؒ کے علوم سے اور ان کے قول کے مفہوم سے مختصر کیا ہے تاکہ خواہش مند حضرات کے لیے اسے قریب الفہم کر دوں اور یہ بتلا دوں کہ امام شافعیؒ نے اپنی اور اپنے غیر کی تقلید سے منع فرمایا ہے تاکہ آدمی اپنے دین میں نظر ڈال لے اور اپنے بارے میں محتاط بھی رہے۔

[۲] اس کتاب کے اندر تقریباً بیس مسائل میں اپنے امام کی مخالفت کی صراحت کی ہے، ہم ان کے حوالوں کی جانب اشارہ کیے دیتے ہیں (۴۲، ۴۴، ۱۰۳، ۱۲۰، ۱۵۸، ۱۶۹، ۱۷۲، ۱۷۳، ۲۲۸، ۲۳۰، ۲۴۰، ۲۴۴، ۱۷۴، ۲۷۵، ۲۸۴، ۳۱۴، ۳۳۱، ۳۳۸، ۳۵۵، ۳۵۶) (التعلیق الممجد علی موطا محمد)

[۳] الحاشیہ لابن عابدین (۱/۴۷) رسم المفتی (۱/۱۷)۔ قرشی نے اس کو "الجواہر المضیۃ فی طبقات الحنفیہ" ص ۳۴۷ میں نقل کیا ہے اور مزید فرمایا ہے: "آپ صاحب حدیث اور ثقہ تھے۔ آپ اور آپ کے بھائی ابراہیم اپنے زمانے میں بلخ کے شیخ مانے جاتے تھے۔ [۴] الفوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ ص ۱۱۶ [۵] البحر الرائق (۶/۹۳) رسم المفتی (۱/۲۸)

[۶] الفوائد (ص ۱۱۶) از مولانا عبدالحیؒ لکھنوی مولانا نے اس پر عمدہ اور مفید تعلیق بھی لگائی ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں کہتا ہوں ـــــ اسی سے اس روایت کے بطلان کا پتہ چلتا ہے جس کو مکحول نے امام ابوحنیفہ سے روایت کیا ہے۔ کہ جو نماز میں رفع یدین کرے اس کی نماز فاسد ہو جائے گی، کیونکہ عصام بن یوسف امام ابویوسف سے مسلسل وابستہ رہنے والے شاگردوں میں سے تھے اور رفع یدین کرتے تھے، اس لیے اگر اس روایت کی کوئی اصل ہوتی تو امام ابویوسف اور عصام کو اس کا پتہ رہتا۔ نیز فرماتے ہیں ـــــ اس سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ اگر کوئی حنفی اپنے امام کے قول کو کسی مضبوط مخالف دلیل کی ←

نہ روک سکی کہ تینوں حنفی ائمہ نے اس کے خلاف کہا ہے اور یہی طرز عمل ائمہ اربعہ کی حسب شہادت ہر مسلمان پر لازم ہے۔

اور ائمہ اربعہ نے تمسک بالحدیث کے سلسلے میں جس اصول کی تاکید کی ہے اور رائے و قیاس اور اجتہاد کو جو درجہ و مقام دیا ہے درحقیقت وہی ان دونوں کا صحیح درجہ و مقام ہے۔ محدثین نے اسی کو اپنایا ہے اس لیے وہ اصول و فروع ہر مرحلے میں سب سے صحیح اور درست راہ پر رہے ہیں۔ مولانا عبدالحئی نے امام الکلام فیما یتعلق بالقرأۃ خلف الامام، ص ۱۵۶ میں اس سلسلے میں فیصلہ کن بات لکھی ہے۔ فرماتے ہیں — جو شخص بھی تعصب اور تنگ نظری سے بالاتر ہو کر فقہ کے سمندر میں غوطہ لگائے گا اور انصاف کی نظر سے دیکھے گا اس کو یہ علم یقینی حاصل ہو جائے گا کہ اکثر اصولی اور فروعی مسائل جن میں علماء کا اختلاف رہا ہے ان میں محدثین کا مذہب غیروں کے مقابل زیادہ قوی اور پائیدار ہے اور میں جب بھی اختلافات کی گھاٹی میں چلتا ہوں تو محدثین کے اقوال کو انصاف سے زیادہ قریب پاتا ہوں۔ (بس اللہ ہی کے لیے ان کی خوبی ہے) ۔ ایسا ہو بھی کیوں نہ جبکہ محدثین کرام ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وارث برحق اور آپ کی شریعت کے نائب برحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان کے زمرے میں شامل کرے اور ان ہی کی سیرت و محبت پر ہمارا خاتمہ کرے۔ آمین۔

اللہ سے میری دعا ہے کہ وہ ہمیں ان لوگوں میں سے بنائے جن کے متعلق اس کا ارشاد ہے۔ انما کان قول المومنین اذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم ان یقولوا سمعنا واطعنا واولٰئک ھم المفلحون۔ (النور - ۵۱) مومنین جب اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جاتے ہیں تاکہ وہ ان کے مابین فیصلہ کرے تو ان کا قول یہ ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں، ہم نے سن لیا اور اطاعت کی۔ یہی لوگ کامیاب ہیں۔[۱]

← کی بنا پر ترک کر دے تو وہ تقلید کے دائرے سے خارج نہیں ہوتا، بلکہ اس صورت میں ترک تقلید ہی عین تقلید ہے۔

چنانچہ آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ عصام بن یوسف نے رفع یدین کے سلسلے میں ابوحنیفہؒ کے مذہب کو چھوڑ دیا، پھر بھی وہ حنفیہ ہی میں شمار کیے جاتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں لیکن ہمارے زمانہ کے جاہلوں سے خدا کی پناہ یہاں یہ حالت ہے کہ اگر کسی نے کسی ایک ہی مسئلے میں بھی اپنے امام کی تقلید کسی قوی دلیل کی بنا پر چھوڑ دی تو اسے مطعون کیا جاتا ہے اور اسے اس امام کے مقلدین کی جماعت سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ خیر عوام کی یہ حالت ہو تو چنداں تعجب نہیں۔ تعجب ان پر ہے جو بنتے تو ہیں عالم لیکن چلتے ہیں جانوروں کی طرح۔

۱ ؎ صفۃ صلاۃ النبی ص ۲۰ و ۲۲ تا ۴۱ ۔

کیا شرک و الحاد تقاضائے فطرت ہیں؟

محمد مسعود عالم قاسمی

شرک کی جتنی بھی صورتیں دنیا میں پائی جاتی ہیں، اس میں کوئی شک نہیں کہ سب کی سب اپنی جگہ انتہائی قبیح اور انسانوں کے مجد و شرافت پر بدنما داغ ہیں، جن سے سلیم الفطرت انسان ہمیشہ بیزار رہے ہیں۔ مگر اس کو کیا کہیے کہ شرک کی لعنت میں گرفتار ہونے والے ہمیشہ ان کو عقلی رنگ دینے کی کوشش کرتے رہے ہیں اور فطرت کا مقتضیٰ ثابت کرنے میں ایڑی سے چوٹی تک کا زور صرف کرتے رہے ہیں، تاکہ وہ اپنے مذموم اعمال و توہمات کے لیے سبیل جواز پیدا کر سکیں۔ مگر ایک حقیقت پسند نگاہ میں ان کے دلائل کتنا وزن رکھتے ہیں آیئے ہم اس کا جائزہ لے کر دیکھیں۔

شرک

شرک کا یہ تصور قدیم ترین ہے کہ انسان اللہ کی ذات، صفات، حقوق میں کسی ایک میں بھی دوسرے کو شریک قرار دے۔ شرک کی تمام شکلیں انہی تین دائروں میں پائی جاتی ہیں۔

مشرکین جس چیز کو وقائع شرک میں بنیاد بناتے رہے ہیں، اس کے تین پہلو ہیں:

(۱) خدا کو ایک ماننے سے تخلیق کائنات کا مسئلہ حل نہیں ہوتا اور کائنات کی توجیہہ نہیں ہوتی۔

(۲) اس کائنات کا انتظام اور استحکام کئی خداؤں کا تقاضا کرتا ہے۔

(۳) انسان کی نفسیات ایک خدا سے مطمئن نہیں ہے۔

پہلے نکتے کی وضاحت اس طرح کی جاتی ہے کہ اگر چھوٹا موٹا کام کرنا ہو تو ایک شخص اپنی قوت و صلاحیت کے بل بوتے پر اسے انجام دے سکتا ہے۔ مگر جب کوئی بہت بڑا کام درپیش ہو تو ایک شخص اپنی ساری کوششوں کے باوجود اس کو انجام دینے میں ناکام ہو جاتا ہے، اور اس کے لیے ایک جماعت کی ضرورت پڑتی ہے، ٹھیک اسی طرح یہ وسیع و عریض کائنات اونچے اونچے پہاڑ، چوڑی چکلی زمین، پھیلے ہوئے آسمان بھی کسی ایک ذات کی تخلیق نہیں ہو سکتے، یقیناً اس کے لیے متعدد

خداؤں کو ماننا پڑے گا، جن کو ان کا خالق قرار دیا جاسکے۔

یہ ساری تقریر اس لیے بے سود قرار دی جائے گی کہ انسان کی ناقص اور محدود عقل و بصیرت پر ایسی ہستی کو قیاس کیا جارہا ہے، جس کا علم، نظر، اختیار وغیرہ سب کچھ لامحدود ہیں، مذکورہ دلیل کی دوسری بڑی کمزوری اس سے بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ کام کی نوعیتیں الگ الگ ہوا کرتی ہیں، کام جیسا ہوگا، کام کرنے والے کی ضرورت اسی حساب سے پیش آئے گی۔ بہت سے کام ایسے ہیں جن کو ایک آدمی تن تنہا انجام دے لیتا ہے اور بہت سے کاموں کے لیے متعدد آدمیوں کی ضرورت واقعۃً پیش آجاتی ہے۔ مگر بہت سے کام ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو نہ ایک آدمی کر پاتا ہے نہ بہت سے آدمی کر پاتے ہیں۔ اگر ایک بھاری پتھر اٹھانا ہو تو بلاشبہ دو چار دس آدمی مل کر اسے اٹھالیں گے۔ مگر جب سوال مردہ کو زندہ کرنے، بیمار کو شفا دینے، خشکی و قحط سالی میں پانی برسانے اور ہوا چلانے کا آجائے تو ظاہر ہے ایسا نہ ایک آدمی کر سکتا ہے اور نہ ہزاروں اور لاکھوں آدمی مل کر کر سکتے ہیں۔ خدا کو لاشریک اسی لیے تسلیم کیا جاتا ہے کہ وہ سارے جہان کا خالق ہے، تمام چیزیں اسی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ موت و حیات بھی، مرض و شفا بھی اور فقر و غنا بھی۔ وغیر ذلک۔

دوسرے نکتے کی تفصیل کچھ یوں ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ دنیا مختلف اور متضاد قسم کے مظاہر کی آماجگاہ ہے۔ یہاں اشیاء میں اتحاد اور یکسانیت آثار کائنات میں ہم آہنگی اور توافق نہیں ہے، یہاں جتنے مظاہر ہمیں نظر آتے ہیں وہ اپنے پیچھے ایک مستقل طاقت رکھتے ہیں۔ اور موثر کا پتہ دیتے ہیں۔ یہاں جس اصول سے ہوا چلتی ہے، اس اصول سے پانی نہیں برستا، آگ کا جو محرک ہے، وہ سرسبزی و شادابی کا نہیں ہے۔ رزق رسانی کا جو نظام ہے وہ فاقہ کشی اور مفلوک الحالی سے مختلف ہے، مرض ہے تو اس کا ضابطہ شفا سے الگ ہے، حیات ہے تو اس کے قوانین موت سے جدا ہیں، اور اس طرح کی دوسری بے شمار چیزیں یہ بتاتی ہیں کہ وہ اپنے پیچھے الگ الگ ایک طاقت رکھتی ہیں، ورنہ مختلف اور باہم متضاد چیزوں پر ایک ذات کا قابو کس طرح ہو سکتا ہے اور ایک ہستی سے اتنی چیزوں کا صدور کس طرح ہو سکتا ہے۔

یہ مفروضہ بھی بجائے خود گمراہ کن ہے۔ مظاہر کے اختلاف کو اسباب کا اختلاف سمجھ لینا دانشمندی کا مذاق اڑانا ہے۔ آثار درحقیقت موثر کا جلوہ صد رنگ ہوتے ہیں۔ کائنات کی اشیاء یقیناً باہم مختلف ہیں، ان کے اثرات میں تضاد ہے مگر اس کے پس پردہ جو طاقت ہے اس میں کوئی اختلاف اور تضاد نہیں، جو طاقت ہوا میں لطافت پانی میں برودت اور آگ میں حرارت پیدا کرتی ہے، وہی طاقت حیات و موت، مرض و شفا اور تنگی و کشادگی کے اصول بھی متعین کرتی ہے، مختلف رنگ و روپ اور مختلف مظاہر میں اشیاء کو وجود بخشنے کا مقصد یہ ہے کہ

کائنات میں توازن ہے۔

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوقؔ اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے

اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے کہ ایک ہی ذات سے مختلف افعال و مظاہر کا صدور ہو، ٹھیک اسی طرح سے جس طرح ایک آدمی قادر الکلام شاعر بھی ہو، شعلہ بیان مقرر بھی، معلم اخلاق بھی ہو، میدانِ جنگ کا سپاہی بھی، بہترین ڈاکٹر بھی اور کامیاب سیاستداں بھی، صنعت و حرفت میں دسترس بھی رکھتا ہو اور امورِ زراعت سے واقف بھی، ایک مخلوق میں جب اتنی باتیں یکجا ہو سکتی ہیں تو خالق میں اس سے زیادہ کیوں نہ ہوں۔ عقل کا فیصلہ تو یہ ہے کہ وہ ذات اتنی ہی صفات کی حامل نہیں ہوگی جن کا ہم مشاہدہ مختلف مظاہر کی شکل میں کرتے ہیں، بلکہ اس کی اور بھی بہت سی صفات ہوں گی جن کو ہم نہیں جانتے۔ یہاں انسانی فطرت یہ سوال کرتی ہے کہ جب ایک خدا تسلیم کر کے انسان اپنی ضروریات پوری کر سکتا ہے اور نجات کا مسئلہ حل کر سکتا ہے اور اس کائنات کی توجیہ کر سکتا ہے تو متعدد خداؤں کو بلا وجہ ماننا کہاں کی عقلمندی ہے۔ اور اگر واقعی اس کائنات کے چند خدا ہوتے تو اس کا نظام کب کا درہم برہم ہو چکا ہوتا، نہ اس میں یہ نیرنگی و خوش سلیقگی ہوتی اور نہ یہ ناقابلِ تسخیر توازن ہوتا۔ آپ خود اندازہ کیجئے۔ جب آپ اپنے ملک کے لیے زیادہ نہیں صرف دو خودمختار اور مطلق العنان بادشاہ کا تصور نہیں کر سکتے تو اس دنیا کے لیے آپ کی عقل چند خداؤں کا وجود کیسے تسلیم کر سکتی ہے؟ پھر یہ کہ آدمی کو خدا سے طبعی طور پر زیادہ قریب ہونے کا احساس عام طور پر اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی مصیبت یا دکھ درد میں پھنس گیا ہو۔ (اگرچہ عام حالت میں بھی سلیم الفطرت خدا سے زیادہ قریب ہوتا ہے) اس وقت وہ خدا کو بے اختیار پکارتا ہے۔ یہ فطرت کی پکار ہوتی ہے مگر وہ صرف ایک خدا کو پکارتا ہے کیوں کہ اس وقت اسے کسی ایک سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی ایک سے اس کی ضرورت پوری ہو جاتی ہے، اس لیے ماننا پڑے گا کہ انسانی فطرت صرف ایک خدا کا تقاضا کرتی ہے۔ یہاں اس نکتہ کی بھی بنیاد منہدم ہو جاتی ہے کہ انسان کی نفسیات ایک خدا سے مطمئن نہیں، کیونکہ جب ایک خدا کا تصور ہی فطری اور عقلی قرار پایا تو لازماً انسانی فطرت ایک ہی خدا سے مطمئن ہوگی اور دو یا چند خداؤں کا وجود غیر ضروری ہوگا۔

الحاد

الحاد کا نظریہ خدا بیزاری، اور مذہب دشمنی پر قائم ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس الحاد کا مطلب ایک مدعیانہ انکار نہیں ہے بلکہ اس کی اپنی تشریح کے مطابق یہ محض ایک طریق مطالعہ ہے جو ذہنی اور علمی ارتقا کے

ایک مخصوص دور میں انسان کو حاصل ہوا ہے۔ اس ارتقائی مطالعہ کا لازمی تعلق کسی چیز کے انکار یا اثبات سے نہیں ہے بلکہ وہ مجرد ایک طریق جستجو ہے۔"

جو لوگ ایسا سمجھتے ہیں در اصل وہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ ماضی بعید میں بھی نظریۂ الحاد کا وجود پایا جاتا رہا ہے۔ حالانکہ وہ نہ ذہنی اور علمی ارتقاء سے پیشتر کا زمانہ ہے، یہ الگ بات ہے کہ جس زور و شور اور مدلل انداز میں آج اس کا اظہار کیا جا رہا ہے وہ آج سے پہلے غالباً نہ کیا گیا تھا، بہرحال الحاد کو عقل و فطرت کی صدا بنانے کے لیے ملحدین فلسفیانہ بحث و تحیص کا سہارا لیتے ہیں اور طرز استدلال کا رخ بدل دیتے ہیں، اس طرز استدلال کے بھی تین پہلو ہیں:

(۱) خدا سے بے نیاز ہو کر تخلیقِ کائنات کی توجیہ کی جا سکتی ہے تو خدا کی ضرورت نہیں۔

(۲) خدا پرستی انسان کی بہکی ہوئی حالت کا نتیجہ ہے۔

(۳) خدا پرستی ماحول اور آباء و اجداد کے اثر سے پیدا ہوتی ہے۔

پہلے نکتے کی وضاحت کچھ یوں ہے۔ 'یہ دنیا اپنے وجود کے لیے خدا کی محتاج نہیں ہے اور نہ اس کو کسی مافوق الفطرت ہستی نے پیدا کیا ہے۔ ہر ایسا خیال جو اس سائنٹفک تصور سے انحراف کر کے خدا کا وجود اور وجوب ثابت کرے وہ اوہام و خرافات ہے۔ اس کائنات کی حقیقت بجز مادہ کے اور کچھ نہیں، روح مادہ کی ایک خاصیت ہے جو اس وقت رونما ہوتی ہے جب مادہ اپنی ترکیب و ترقی کی خاص حالت کو پہنچ جاتا ہے۔ یہ سیارات ایک دھماکہ کی برکات ہیں اور دنیا اسی مادے کے پھٹنے سے وجود میں آئی ہے۔

مگر یہ فلسفۂ کائنات کی ایسی توجیہ ہے جو راہِ حق سے فرار اختیار کر کے نفس کو فریب میں مبتلا تو کر سکتی ہے لیکن انسانی عقل و دماغ کو مطمئن نہیں کر سکتی، چہ جائیکہ اس کو صدائے فطرت کہا جائے، یہاں جس چیز کو بنیاد مان کر دلائل قائم کیے گئے ہیں وہ حقیقت بین نگاہوں میں قطعی کوئی اہمیت نہیں رکھتی کیونکہ وہ بجائے خود اوہام، قیاس اور خرافات کا نتیجہ ہے مگر خیر یہ بات اس دورِ ترقی میں کہی جا رہی ہے جہاں پہنچ کر انسان اپنی عقل و دانش کے لیے زمانہ قدیم کے افلاطون اور سقراط جیسے سیکڑوں عقلاء کو مات کر چکا ہے، بات صرف اتنی سی ہے کہ مذہب کا جوا اتار دینے کے بعد یہ لوگ اس کائنات کی محسوس اور مادی توجیہ کرنا چاہتے تھے تاکہ اپنے عمل کے لیے جواز فراہم کریں۔ اسی طے شدہ اسکیم نے انسان کو ظاہر پرستی کا نظریہ دیا جو مظاہر پرستی کے نظریے سے کسی طرح کچھ کم نہ تھا اور زود اثر بھی تھا۔ ورنہ کون نہیں جانتا کہ اس دنیا میں صرف مادہ ہی سب کچھ نہیں بلکہ اس کے ماوراء بھی کوئی چیز ہے، محسوسات کا ہی وجود نہیں، ماورائے محسوسات بھی مسلم ہیں، بلکہ جوہر اصلی

وہی ہیں اور مادہ ان کا مظہر یا ان کی ارتقائی حالت کی تصویر ہے ۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سب کچھ مادہ ہی ہے اور مادہ کے آگے کوئی چیز نہیں ۔ تو آخر اس کا کیا جواب ہے کہ کیا باشعور مادہ کی اتفاقی حرکت ہی نے کائنات کے تن مردہ میں روح پھونک دی ، ہر چیز میں اس کے مناسب اثرات پیدا کر دیے ، اور اس کے مزاج و خواص میں توازن برپا کر دیا ۔ اگر یہ اتفاقی حادثہ اتنا ہی با اعتماد ہے تو کبھی آدمی کو امرت پی کر موت کے گھاٹ بھی اترنا چاہیے ۔ کبھی انسان کو آگ میں ہاتھ ڈال کر ٹھنڈک اور پانی میں ڈال کر حرارت بھی محسوس کرنی چاہیے ۔ کبھی سورج کو بجائے مشرق کے مغرب سے طلوع ہونا چاہیے اور مشرق میں غروب ہونا چاہیے ۔ کبھی دیا سلائی کی ٹکر سے پانی کا چشمہ بھی ابلنا چاہیے ۔ اور کبھی سنکھیا کھا کر حیاتِ جاودانی بھی حاصل ہونی چاہیے ، کیوں کہ اتفاق تو بہر حال اتفاق ہے وہ کسی ضابطہ اور قانون کا تو پابند نہیں ہوتا اور اگر ہوتا ہے تو تسلیم کرنا ہوگا کہ دنیا اتفاقی حادثہ نہیں بلکہ صناعِ فطرت کی حسین صناعی کا نمونہ ہے جس نے اس میں حسن ترتیب ، توازن و استحکام اور اصول و ضابطہ کا زبردست نظام برپا کیا ہے ۔

دوسرے نکتۂ الحاد کی وضاحت اس طرح ہے کہ خدا پرستی انسان کی دبی ہوئی حالت اور خوف و ہراس کا نتیجہ ہے اکثر و بیشتر گھٹے ہوئے ماحول کی یہی پیداوار ہوتی ہے ۔ انسان نے جب یہ دیکھا کہ بہت حادثات ہوتے ہیں ، طوفان آتا ہے ، زلزلے رونما ہوتے ہیں ، تو اس نے گھبرا کر ان دیکھی طاقت کا وجود تسلیم کر لیا ۔ مگر یہ بات بھی عقل سے لگتی ہوئی معلوم نہیں ہوتی ، ہم اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ خوف و ہراس کا اثر عارضی اور کسی فوری ناخوشگواری کا اظہار ہوتا ہے ، جبکہ اس سے پہلے سکون و اطمینان خوشی اور انبساط اور شکر و سپاس کا جذبہ موجود ہونا لازم ہے ہمیں کسی چیز کے چھن جانے کا غم اسی وقت ہوتا ہے جبکہ وہ ہمارے پاس پہلے سے موجود رہی ہو ، ہم اس چیز کے ضائع ہونے پر افسوس کریں گے جس کے ہم پہلے سے مالک رہے ہوں ۔ ایسی صورت میں خدا پرستی کو شکر و سپاس کے احساس کا نتیجہ ہونا چاہیے نہ کہ خوف و ہراس کا ، ہم خدا کو منعم و رحیم کی حیثیت سے مانتے ہیں نہ کہ ظالم و جابر کی حیثیت سے ۔ اگر چہ وہ غضبناک بھی ہوتا ہے ، مگر اس کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے ، اسے بھی ذہن میں رکھا جائے کہ زندگی میں صرف غم ہی نہیں ہوتا خوشی بھی ہوتی ہے ۔ یہاں طوفان حوادث ہی نہیں آتے ، رحمتوں کی بارشیں بھی ہوتی ہیں ، ہمیشہ آندھیاں ہی نہیں چلتیں ۔ سرور و تسکین کی نوازشیں بھی ہوتی ہیں ۔ گلشنِ حیات میں صدا خزاں ہی نہیں دوڑتی بہاریں بھی لوٹتی ہیں ، (بلکہ زندگی کا غالب پہلو سکون و سرور ہی ہے) مگر اس لطیف حقیقت سے نتیجہ وہی شخص اخذ کر سکتا ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ ”ان فی ذٰلک لذکری لمن کان لہ قلب او القی السمع

ھو شہید (ق ۔ ۳۷) اس میں عبرت کا سبق ہے ہر اس شخص کے لیے جو دل رکھتا ہو یا جو توجہ سے بات سنے

تیسرے نکتۂ الحاد کی تفصیل یہ ہے کہ انسان خدا پرستی کا سبق ماں باپ سے سیکھتا ہے، ماحول سے اثر لیتا
ہے اور اگر کسی بچہ پر اس طرح کی اثر اندازی نہ ہو تو وہ ہرگز خدا پرست نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ایک بچہ کو لاشعوری کی حالت
ں ایک ایسی جگہ چھوڑ دیا جائے، جہاں اس کو مذہبی اور روحانی قسم کا کوئی احساس نہ ہو نہ کسی خدا پرست سے سابقہ ہو
وہ بڑا ہو کر نہ خدا کو جانے گا اور نہ اس پر خدا پرستی کا خبط سوار ہو گا، اور یہی احساس فطری بھی کہا جائے گا کیونکہ
ایسی حالت میں ہو گا جہاں بچہ اپنی فطرت کے ساتھ تنہا ہو گا۔

یہ بھی کوئی معقول بات نہ ہوئی، فرض کیجئے جس طرح بچہ خدا کو نہ دیکھنے اور خدا کے بارے میں کچھ نہ جاننے
ی وجہ سے خدا کا منکر ہو جائے، اسی طرح وہ انسان کو نہ دیکھنے اور انسان کے بارے میں کچھ نہ جاننے کی وجہ سے انسانیت
انکار کر دے، یا یہ کہہ دے کہ دنیا انسانوں سے خالی ہے تو کیا اس کا یہ احساس بھی فطری ہو گا؟؟؟ سچ سچ بتایئے کیا آپ
س کا اثبات کر دیں گے؟۔

پھر یہ کہ تاریخ بتاتی ہے کہ عہد رفتہ میں ایسا تجربہ ہو چکا ہے، مگر اس کا نتیجہ انکار خدا کی صورت میں نہیں بلکہ
رار کی صورت میں رونما ہوا اور خدا پرستی کی ناقابلِ فراموش یادگار بن گیا، آج بھی وہ تجربہ خدا پرستی کے فطری ہونے پر
یک مستحکم دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔

واقعہ یوں ہے کہ نمرودِ وقت کے ایک پجاری آزر کے گھر ایک بچہ پیدا ہوا، پیدا ہوتے ہی ماں نے
س کو آبادی سے دور ایک پہاڑی کے دامن میں لے جا کر اس کی فطرت کے حوالے کر دیا۔ بچہ اپنی عمر کی منزلیں طبعی رفتار
سے طے کرتا رہا، اور اس دوران کسی نے بھی اسے خدا کی تعلیم نہیں دی۔ بڑا ہونے پر بچے کی فطرت نے سوال کیا۔
میرا رب کون ہے؟، مجھے کس کی عبادت کرنی چاہیے؟۔ اس نے چاند کو حسین اور چمکتا ہوا دیکھ کر سمجھا، شاید یہ میرا
رب ہے، جب وہ ڈوب گیا، اس کو ندامت ہوئی، اور اس نے کہا بھلا ڈوبنے والا بھی خدا ہو سکتا ہے۔ سورج نکلا تو
اس کے بڑے پن اور تیز روشنی کو دیکھ کر یہ خیال کیا، شاید یہ میرا رب ہے، مگر جب وہ بھی ڈوب گیا تو اس کو پھر ندامت
ہوئی اور اس کی فطرت نے پکارا، تمہارا رب تو وہ ہے، جس نے ساری دنیا کو پیدا کیا، اور جو اس کائنات کا حاکم ہے
مارتا ہے اور جلاتا ہے۔ بچہ اس جواب سے مطمئن ہو گیا اور اس نے ساری عمر خدا پرستی کی تعلیم و ترویج میں بسر کر دی۔
یہ بچہ تاریخ میں ابراہیم (علیہ السلام) کے نام سے موسوم ہے۔ اگر خدا بیزاری فطرت تھی تو ابراہیم کو بھی موحد

(باقی صـ پر)

اسلامی مساوات — تعلیم اور نمونے

مولانا محمد یونس سلفی استاذ جامعہ سلفیہ بنارس

مساوات کا نظریہ اسلام میں بنیادی حیثیت کا حامل ہے۔ اسی لیے اسلام نے اس کا خاص اہتمام کیا ہے، اس کے اغراض و مقاصد کی توضیح کی ہے اور یہ معاشرۂ انسانی کے لیے کس حد تک ضروری ہے اس کو بھی اجاگر کر دیا ہے۔ قرون اولیٰ کے مسلمانوں نے اس کو عملی جامہ پہنایا اور ایسی نظیر پیش کی کہ گزشتہ اقوام کی تاریخ میں دور دور تک اس کی مثال نہیں ملتی۔

بعثت نبوی سے پہلے عرب جاہلی سوسائٹی میں عجب انتشار تھا، لوگ خود سری، بے راہ روی اور اخلاقی گراوٹ میں مبتلا تھے۔ قبیلے اور رشتہ داریوں کی بنیاد پر بڑی سخت عصبیت اور جتھہ بندی تھی۔ اس عصبیت کی بنیاد جاہلی مزاج تھا جس کی روح اس مشہور جملہ سے ظاہر ہوتی ہے "انصر اخاک ظالماً او مظلوماً"۔ یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

عربی معاشرہ مختلف اور الگ الگ خاندانوں اور گھرانوں پر مشتمل تھا۔ ایک خاندان دوسرے سے اپنے کو بلند و برتر سمجھتا تھا بعض خاندان دوسرے خاندانوں یا عام انسانوں کے ساتھ بہت سی رسوم و عادات میں شرکت پسند نہیں کرتے تھے۔ غرضیکہ معاشرے میں عصبیت کا دور دورہ تھا، جس کی وجہ سے عدل و انصاف، شفقت و ہمدردی، اخوت و محبت اور مساوات کا فقدان تھا، ہاں کچھ لوگ ایسے ضرور تھے جو اس کی اہمیت کو بخوبی سمجھتے تھے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے آواز بھی اٹھاتے تھے۔ لیکن ان کی یہ آواز صدا بصحرا ہو کر رہ جاتی تھی۔

محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد رحمت خداوندی سے نوع انسانی کے افراد ایک خاندان میں تبدیل ہو گئے۔ وہ سب ایک باپ (آدم) کی اولاد تھے اور آدم کی اصل مٹی سے ہے، نہ کسی عرب کو کسی عجمی پر فضیلت تھی اور نہ کسی عجمی کو کسی عرب پر فوقیت تھی۔ ہاں اگر کسی کو کسی پر برتری تھی تو محض تقویٰ کی بنا پر، چنانچہ قرآن عزیز نے اسی نکتہ کی

طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے " یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثی وجعلنکم شعوباً و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم " سورہ حجرات ۔ (اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت (آدم وحوا) سے پیدا کیا اور تمھیں قبیلے اور خاندانوں میں تقسیم کردیا، تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے یہاں اسی کی عزت زیادہ ہے جو خدا ترسی اور تقویٰ میں بڑھا ہوا ہے ۔

اس آیت سے صاف ظاہر ہوگیا کہ چونکہ تمام بنی نوع انسان کی تخلیق ایک ہی مرد اور عورت سے ہوئی ہے اسلیے برادرانہ رشتے میں منسلک ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے پر فوقیت نہیں رکھتے ۔ مساوات ہی کی تعلیم کے پیش نظر پیغمبر اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے غلامی کے خلاف آواز بلند کی اور غلاموں کو تمام انسانوں کا درجہ دیا ۔ چنانچہ بعض غزوات میں آپ نے غلاموں کو امیر لشکر بنا کر بھیجا ، مساوات کی تعلیم سے قرآن وحدیث بھرے پڑے ہیں اور یہ تعلیم محض تعلیم ہی نہیں رہی ، بلکہ مسلمانوں نے ہر دور اور ہر زمانہ میں اس پر عمل پیرا ہوکر بھی دکھا دیا ۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب رضی اللہ عنہا کی شادی ایک غلام (زید بن حارثہ) سے کردی تھی ۔ اس سے آپ کا صرف یہ مقصد تھا کہ معاشرے میں غلاموں کو جو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔ یکلخت اس کا خاتمہ کر دیا جائے اور ان میں بھی عمل کا جذبہ پیدا ہو ۔

آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر پُرجوش خطبہ دیا تھا جس میں مساوات کی تعلیم کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔ آپ نے فرمایا: یا ایھا الناس ان ربکم واحد و اباکم واحد الا لا فضل لعربی علی عجمی ولا لعجمی علی عربی ولا اسود علی احمر ولا احمر علی اسود الا بالتقوی ۔ (مجمع الزوائد) (اے لوگو! تم سب کا خدا ایک ہے تم سب ایک ہی باپ کی اولاد ہو ۔ سنو کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر ، کسی سیاہ کو سرخ پر ، کسی سُرخ کو سیاہ پر کوئی فضیلت نہیں یعنی حسب ونسب اور رنگ ونسل کا امتیاز اسلام کی نظر میں ہیچ ہے ۔ معیار برتری اور فضیلت صرف تقویٰ ہے ۔

تاریخ کے مطالعہ کرنیوالوں پر یہ بات مخفی نہیں کہ خلیفہ ثانی عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں کئی ایسے واقعات ملتے ہیں جو مساوات کی زندہ مثال ہیں ۔

چنانچہ دورِ فاروقی میں حاکم مصر حضرت عمرو بن العاص کے بیٹے نے ایک مصری کو ایک موقع پر کوڑا مارا اور اپنے باپ دادا پر فخر کیا ، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصری کو ان سے بدلہ لینے کا حکم دیا اور عمرو بن العاص سے کہا ۔ "تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنالیا ، حالانکہ وہ اپنی ماں کی پیٹ سے آزاد پیدا ہوئے ہیں ۔ (الفاروق)

اسی طرح دورِ فاروقی کے ایک دوسرے واقعہ کا تعلق جبلہ غسانی سے ہے ، جب مسلمانوں کو ملک شام میں شاندار فتح

تعجب ہوتی ہے کہ جبلہ جو غسان کا سربراہ تھا، مشرف باسلام ہو جاتا ہے، اور مدینہ منورہ کی جانب ہجرت کرتا ہے۔ اس کی آمد پر اہل مدینہ اس کا شاندار استقبال کرتے ہیں۔ اور خلیفۂ وقت عمر رضی اللہ عنہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ اس کی ضیافت کرتے ہیں، اور اسے اعلیٰ مقام سے سرفراز کرتے ہیں پھر وہ بغرض حج مکہ جاتا ہے، جس وقت وہ بیت اللہ کا طواف کر رہا ہے اور فضا لبیک اللہم لبیک کے نعروں سے گونج رہی ہے، طواف کرنیوالوں میں قبیلہ فزارہ کے ایک شخص کا پیر جبلہ کی قیمتی چادر پر پڑ جاتا ہے۔ اس سے جبلہ چراغ پا ہو جاتا ہے اور غصے میں ایک طمانچہ رسید کر دیتا ہے۔ وہ شخص خلیفۂ ثانی عمر فاروق کی خدمت میں استغاثہ پیش کرتا ہے۔ جبلہ عام مجرموں کی طرح پیش کیا جاتا ہے۔ حضرت عمرؓ جبلہ سے دریافت کرتے ہیں کہ تمہارے خلاف جو مقدمہ پیش ہوا ہے، کیا وہ صحیح ہے؟ جبلہ جواب دیتا ہے۔ جی ہاں میں نے اس شخص کو اس کی گستاخی پر مارا ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ جبلہ تم خود اپنے منھ سے اقرار کر رہے ہو۔ اب وہ جاہلیت و کفر کا زمانہ بھول جاؤ۔ جب امراء سے بڑی سے بڑی لغزش پر بھی باز پرس نہیں کی جاتی تھی اور مظلوموں کو ظلم کی چکی میں پیا جاتا تھا۔ اب خدا نے ہمیں اسلام کی نعمت سے سرفراز کیا ہے۔ اور اسلام کی تعلیم ہے کہ تمام انسانوں کو مساویانہ حقوق حاصل ہیں۔ اس میں کسی بڑے سے بڑے بادشاہ اور رئیس کی بھی رعایت نہیں ہو سکتی لہذا فیصلہ کیا جاتا ہے کہ یا تو جس طرح تم نے غریب کو مارا ہے اسی طرح وہ بھی تم کو مارے اور یا تم اس کو راضی کر لو۔ جبلہ نے جواب دیا کہ کیا ایک بادشاہ اور ایک ادنیٰ درجہ کے دیہاتی انسان میں فرق نہیں؟ یہ مجھ سے ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ایک معمولی انسان کی خوشامد کروں۔ حضرت عمر نے فرمایا تو بدلہ دینے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جبلہ نے کہا: مجھے آج رات بھر کی مہلت دی جائے۔ میں سوچ کر کل جواب دوں گا۔ حضرت عمر نے منظور کر لیا اور جبلہ رات کی تاریکی میں چپکے سے قیصر روم کے پاس فرار ہو گیا۔ (تاریخ ابن خلدون)

ناظرین کرام! یہ تھی عملی مساوات کی مثال کہ ایک بادشاہ اور ایک عام انسان میں کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا۔ ایسی ایسی سیکڑوں مثالیں تاریخ اسلام میں ملیں گی۔ جو مسلمانوں کے عملی مساوات کی جیتی جاگتی زندہ تصویر ہیں، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں غلاموں اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں کو وہ درجہ حاصل ہوا کہ دنیا انگشت بدنداں رہ گئی۔

مساوات کی ایک زندۂ جاوید مثال نماز ہے، جس کا نمونہ دن رات میں پانچ بار مسجدوں میں دیکھا جا سکتا ہے اور اس وقت مساوات کا یہ عالم ہوتا ہے کہ شاہ و گدا۔ امیر و غریب، کالے، گورے، سب ایک ہی صف میں شانہ بشانہ کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان میں کسی قسم کا کوئی امتیاز باقی نہیں رہتا اور سب ایک ہی شخص کی پیروی کرتے ہیں۔ اس وقت نہ تو غلام، غلام ہوتا ہے اور نہ آقا، آقا رہتا ہے۔ سب کے سب ایک ہی آقا (خدا) کے غلام ہوتے ہیں اور بڑی عجز و انکسار کے ساتھ کھڑے رہتے ہیں۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز　　نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

ابوالکلام آزاد

ملّت اسلامی کا ایک مظلوم بھائی

صوفی نذیر احمد کاشمیری

عمر ۷۷ برس کے نشانے کو پار کر کے ۷۸ برس میں داخل ہو رہی ہے اور اسی رفتار سے زندگی کے صغائر و کبائر کی فہرست بھی سامنے آتی جا رہی ہے۔ اور ان کے کفارے کی صورت بھی کی جا رہی ہے ۔

اصل کفارہ : اللھم مغفرتک اوسع من ذنوبی ورحمتک ارجی عندی من عملی ۔

سب سے بڑا کفارہ گناہ یہ خط کشیدہ دعا ہے ۔ اے اللہ تیری مغفرت میرے گناہوں سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور تیری رحمت میرے نزدیک میرے عمل سے کہیں زیادہ امید کا سرچشمہ ہے ۔

اس کے بعد جہاں تک حقوق العباد کا تعلق ہے ان میں ظلم و زیادتی کا کفارہ مظلومین کے لیے کہ جو اکثر دنیا سے جا چکے ہیں ۔ دعائے مغفرت ہے ۔ اسی سلسلے میں آج یکم مارچ ۱۹۸۴ء بعد نماز فجر ابوالکلام آزاد یاد آ گئے اور ان کے متعلق یہ سطور لکھنے کے لیے راقم مجبور ہو گیا ۔ اللھم اغفرلہ وارحمہ وتجاوز عن سیئاتہ وادخلہ فی جوار رحمتہ ۔ مرحوم کے فوت ہونے کے دن سے راقم کے دل میں اس کی مظلومیت کا احساس غالب ہوتا گیا اور وقتاً فوقتاً اس کے لیے دعائے مغفرت بھی اضطراراً ہوتی رہی ۔ حالانکہ مرحوم کے فوت ہونے سے پہلے مرحوم کے ظالم ہونے کا احساس غالب تھا ۔ راقم کا اندازہ اور احساس یہ تھا کہ وہ امت و دین کے سلسلے میں بہت کچھ کر سکتا تھا اور اسے کرنا چاہیے تھا۔ مگر اس نے یہ نہیں کیا لہٰذا وہ ظالم تھا ۔ اور مرحوم کے فوت ہو جانے کے بعد یہ احساس الٹ گیا اور اس کے بجائے یہ احساس غالب ہو تا گیا کہ مرحوم نے خدمت ملک و دین کے لیے بہت کچھ کرنا چاہا مگر خود ملت کی طرف سے اسے کوئی تعاون نہ ملا ۔ اس نے حزب اللہ کی تحریک اسی مقصد کے ماتحت چلائی کہ ملت کی ذہنی فکر کی صحیح لائن پر تربیت کی جائے مگر اسے تعاون کے بجائے عدم تعاون بلکہ شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ۔

اس نے مسلمانوں کی عملی تنظیم امارتِ شرعیہ کے انداز پر کرنی چاہی اور عوام کی حد تک اسے امام الہند کا خطاب بھی ملا۔

مگر جہاں تک علماء کا تعلق ہے وہ در پردہ اس کی بیخ کنی کرتے رہے سوائے ایک شیخ الہند محمود الحسنؒ کے، جنھوں نے قدامت پسند حلقوں کے مسلمہ امام ہونے کے باوجود کسی رشک و رقابت کے بجائے آزاد کی رہنمائی کی توثیق کی ۔ کاش اس دور ابتلاء کا تذکرہ کوئی بندۂ خدا مرتب کرکے شائع کردے ۔

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اپنی صحت کی جس حالت میں ہیں ان سے کوئی عملی اقدام تو ممکن نہیں ۔لیکن اگر کوئی شخص ان کی معلومات سے فائدہ اٹھاتا ہوا یہ قدم اٹھائے تو چنداں مشکل نہ ہوگا ۔مفتی صاحب آزاد مرحوم کی مظلومیت کی داستان کو اچھی طرح جانتے ہیں اور بعض وقت نہایت ہمدردی سے اس داستان کو بیان بھی کرتے رہے ۔

اعتقادی ہمواری : ۔ آزاد مرحوم موجودہ دور کی الحاد زدہ، تشکیک خوردہ اور اباحتی فکر کے تمام پہلوؤں پر کامل نظر رکھتے تھے اور وقتاً فوقتاً اس کے زخم خوردہ بھی رہے مگر پھر اس صفائی سے اس زہریلے جنگل سے نکل آتے رہے کہ اس کا کوئی تاثران پر محسوس نہ ہوتا تھا ۔مرحوم کی فکر میں ابن تیمیہ کی ہمواری تھی ۔ علم الکلامی فکر کا کوئی اثر نہ تھا ۔

مرحوم کی تفسیر اسی اعتقادی ہمواری و استواری کا کامیاب نمونہ ہے ، اسے وسیع ترین اشاعت دلاکر موجودہ دور کے الحادات کا علاج کیا جاسکتا ہے ۔

سنا ہے کہ ساہتیہ اکادمی وغیرہ مرحوم کی تفسیر کو اشاعت دلا رہے ہیں ۔مگر وہ تو صرف ایک علمی چیز ہوگی ۔ اور ملت کی دینی ضرورت یہ ہے کہ ان کی ہموار فکر کو دینی حیثیت سے ملت گیر کیا جائے ۔

حضرت شیخ الہند نے بھی عمر کے آخری حصے میں قرآن مجید کی ہمہ جہتی تحکیم کو ملت میں رواج دینے کا ارادہ کیا تھا مگر ایک مختصر آغاز کے سوا اس سلسلے میں کوئی قدم نہ بڑھایا جاسکا ۔ لہٰذا حضرت شیخ کے اسی مختصر آغاز کار کو ابوالکلام کے منصوبہ تفسیر قرآن سے ملاکر کوئی اجتماعی شکل دینا اور اسے ملت گیر بنانا ، جمعیت العلماء ہند کے دائرۂ کار کے اندر کی چیز ہے اور وہ اس طرف قدم اٹھا سکتے ہیں ۔بلکہ انھیں یہ قدم اٹھانا ہوگا ۔ اور سیاست سے وابستگی کو اپنے ۱۹۴۸ء کے اجلاس لکھنؤ کے مطابق چھوڑ کر دینی خدمت کو مستقل طریق کار کی حیثیت سے قبول کرنا ہوگا ۔لکھنؤ کا یہ اجلاس آزاد مرحوم کی صدارت میں ہوا تھا اور آئندہ کے لیے جمعیت العلماء کا لائحہ عمل سیاست کے بجائے خالص دینی خدمت ملی کو قرار دیا تھا ۔

اللہ پاک علمائے امت کی صحیح رہنمائی کرے اور ان کے ذریعہ ملت اسلامی کو ہر قسم کے انتشار سے محفوظ کرتے ہوئے دینی شاہراہ اور صراط مستقیم پر رواں دواں فرمائے ۔ ادھر ترنگ کا ہوا جاتا ہے اور ہے قافلہ بے حس
مری آواز میں تاثیر بخشے خود خدا میرا !

فقیر نذیر احمد کاشمیری ۔

مولانا امرتسریؒ اور ان کی تصنیفات (در ردِ قادیانی مشن)

—— مولانا محمد مستقیم سلفی

۱۔ الہاماتِ مرزا (اردو) صفحات ۱۳۲ طبع ثالث ۱۹۰۲ء مطبع

اس رسالہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کے الہامات اور پیشین گوئیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے بالدلائل یہ بتایا گیا ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے سارے الہامات اور پیشین گوئیاں بناوٹی ہیں اور وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا اور مفتری ہے۔

مولانا کی یہ تصنیف اپنے موضوع پر شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ مرزا صاحب کی زندگی میں انعامی چیلنج کے ساتھ بار بار شائع ہو چکی ہے۔ انتہائی تحقیق و تدقیق کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ اس کا اندازہ خود مولانا کی اس تحریر سے ہوتا ہے کہ:

"میں نے اس کے بارے میں (یعنی قادیانی مذہب کی تحقیق کے بارے میں) اتنی محنت کی ہے کہ خود مرزا صاحب کے کسی مرید نے اتنی محنت نہ کی ہوگی۔ بلکہ میں نے بھی کسی اور مذہب (آریہ وغیرہ) کی جانچ پڑتال کے لیے اتنی محنت نہ کی ہوگی۔ اسی محنت کا نتیجہ یہ رسالہ "الہاماتِ مرزا" ناظرین کے سامنے موجود ہے۔" (الہاماتِ مرزا ص ۳)

۲۔ صحیفۂ محبوبیہ (اردو) صفحات ۷۶ طبع اول ۱۹۰۹ء / ۱۳۲۷ھ مطبع اہلحدیث امرتسر

یہ کتاب قادیانی رسالہ "صحیفۂ آصفیہ" مصنفہ حکیم نورالدین صاحب (خلیفہ اول قادیانی) کا مکمل جواب ہے۔ صحیفۂ آصفیہ کے ذریعہ قادیانیوں نے نواب حیدرآباد دکن شاہ آصف جاہ محبوب علی خاں کو یہ تبلیغ کی تھی کہ ان چند برسوں سے جو ہندوستان بھر میں عموماً طاعون، قحط، وبا اور دوسرے حوادثِ ارضی و سماوی پیش آئے تھے اور خاص کر حیدرآباد دکن کے علاقہ میں ۱۹۰۸ء میں جو بے مثال طوفان اور موسی ندی کی ہیبت ناک تباہ کاریاں پیش آئی تھیں ان تمام حوادث کی خبر ہمارے مرزا صاحب قادیانی نے پہلے ہی سے دے رکھی تھی، اس لیے مرزا صاحب اپنے دعویٰ میں سچے تھے آپ پر ایمان لانا فرض ہے اور اس کے بغیر نجات نہیں ہو سکتی۔

۳۔ شہادتِ مرزا ملقب بہ عشرۂ مرزا (اردو) صفحات ۳۲ طبع اول ۱۹۰۹ء مطبع برقی پریس امرتسر

اس رسالہ میں دس شہادتوں سے مرزا غلام احمد قادیانی کے مسیح موعود ہونے کی تردید کی گئی ہے۔ ان دس شہادتوں کو احادیث شیعہ، مرزا صاحب کی وحی والہام اور مرزا صاحب کے اپنے معیار واقوال، سے اکٹھا کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ رد مرزائیت کے سلسلہ میں ایسا منفرد لاجواب ہے کہ مولانا امرتسری نے خود اس کے جواب دینے والے کو مبلغ ایک ہزار روپے دینے کا اعلان کیا تھا۔

(۴) فاتحِ قادیان (اردو) صفحات ۷۰ طبع اول ۱۹۱۲ء مطبع اہلحدیث امرتسر

اپریل ۱۹۱۲ء میں مولانا ثناء اللہ امرتسری اور قادیانیوں کے درمیان مقام لدھیانہ میں ایک مقامی مناظرہ ہوا تھا یہ رسالہ اسی مناظرہ کی روداد اور فریقین کی تحریروں نیز حکم حضرات کے فیصلوں پر مشتمل ہے۔

(۵) عقائدِ مرزا صفحات ۸ طبع ۱۹۱۶ء

اس رسالہ میں بانی قادیانیت کے چند دعاوی اور عقائد کو اس کی اصل عبارت میں مع حوالجات پیش کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ ملک کے اطراف سے چند استفسارات پر لکھا گیا ہے۔ استفسارات یہ ہیں۔ (۱) مرزا صاحب کے عقائد کیا ہیں؟ (۲) علماء کرام ان کے مخالف کیوں ہیں یہ رسالہ قادیانی عقائد سمجھنے کے لیے بہت مفید ہے

(۶) مرقعِ قادیانی (اردو) صفحات ۵۸ طبع اول ۱۹۱۷ء مطبع روز بازار اسٹیم امرتسر

یہ ایک رسالہ تھا جو قادیانیت کے خلاف ہر انگریزی مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوا کرتا تھا۔ بعد میں اسی ماہنامہ کے خاص خاص اور اہم مضامین کو منتخب کرکے کتابی شکل دیدی گئی ہے۔ یہ مضامین بہت ہی معرکہ آرا اور برمحل ہیں۔

(۷) چیستانِ مرزا (اردو) صفحات ۸ طبع اول ۱۹۲۸ء مطبع راست گفتار امرتسر

اس رسالہ میں مولانا نے مرزا صاحب کے الہامات واقوال میں تضاد ثابت کرتے ہوئے تین سو روپیہ کا چیلنج کیا ہے۔ اس میں ایک مضمون نہایت ہی دلچسپ ہے جس کو مولانا امرتسری نے ۱۵ رجون ۱۹۱۷ء کے "اہلحدیث" میں شائع کیا تھا۔ اس کی بابت مولانا نے مضمون کے شروع میں ہی لکھا ہے کہ اس کا جواب لاہوری پارٹی کے سرگروہ دیں تو ایک صد روپیہ، قادیانی پارٹی کے رئیس میاں محمود دیں تو دو صد روپیہ انعام کے مستحق ہوں گے۔"

یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے لیکن قادیانیوں کے لیے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۸) زارِ قادیان (اردو) صفحات ۸ طبع اول ۱۹۱۷ء مطبع اہلحدیث امرتسر

یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے جو پہلے پہل ۲۹ جون ۱۹۱۷ء کے ہفت روزہ اہلحدیث امرتسر میں بصورت مضمون شائع ہوا تھا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ۱۹۱۷ء میں روس کے اندر کمیونسٹ انقلاب آیا تو "زارِ روس" سے متعلق مرزا صاحب کی ایک غیر متعلق عبارت کو سہارا بنا کر قادیانیوں نے یہ پروپیگنڈہ شروع کیا کہ یہ انقلاب مرزا صاحب کی پیشن گوئی کے مطابق ہے جس سے آپ کے مامور من اللہ ہونے کے دعویٰ کی تصدیق ہوتی ہے۔

مولانا امرتسری صاحب نے اس رسالہ میں دکھلا دیا ہے کہ خود مرزا صاحب کی تصریح کے مطابق اس عبارت کا تعلق انقلاب روس سے نہیں ہے۔

(۹) تاریخ مرزا (اردو) صفحات ۶۴ طبع اول ۱۹۱۹ء مطبع لال الیکٹرم پریس لاہور

یہ کتاب مرزا غلام احمد قادیانی کی سوانح حیات کی حیثیت سے خود انہی کے اشتہارات اور تالیفات کی روشنی میں لکھی گئی ہے اور ان کی زندگی کے تمام گوشوں کو نمایاں کیا گیا ہے۔ مرزا صاحب کی سوانح حیات کے سلسلہ میں اس کتاب کا شمار مستند ترین ماخذ میں ہوتا ہے اور اس کی واقعاتی صحت پر مخالفین و موافقین دونوں ہی متفق ہیں۔

(۱۰) نکاتِ مرزا (اردو) صفحات ۴۰ طبع اول ۱۹۲۶ء مطبع راست گفتار لاہور۔

یہ رسالہ بہت دلچسپ صورتحال کی یادگار ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مارچ ۱۹۲۵ء میں قادیان کے اندر اہلِ اسلام کا جلسہ ہوا بعض علمائے دیوبند نے دوران تقریر مرزا صاحب کے "معارف قرآنیہ" پر کچھ تنقید کی، اس پر خلیفہ قادیان میاں محمود نے علمائے دیوبند کو اپنے مقابل تفسیر نویسی اور نکات آفرینی کا چیلنج دیا۔ مقابلہ کی صورت یہ تجویز ہوئی کہ قرآن مجید کے تین رکوع کسی جگہ سے قرعہ ڈال کر انتخاب کر لیں اور تین دن میں اس کی تفسیر لکھیں، علمائے دیوبند نے اس چیلنج پر خاموشی اختیار کی۔ لیکن مولانا ثناء اللہ امرتسری ؒ نے اس چیلنج کے جواب میں لکھا کہ بلا تکلف ہم کو یہ صورت منظور ہے۔ قادیانیوں نے سامنے آنے کی ہمت نہ کی۔ مولانا نے قلم اٹھایا اور آیات قرآن کے اندر مرزا صاحب کے نکات کے بعد اس زمانہ کی ایک اور فتنہ خیز شخصیت مولوی عبداللہ چکڑالوی

حدیث کے نکاتِ قرآنی کے نمونے بھی پیش فرمائے اور آخر میں لکھا کہ "مرزا صاحب کے مریدو! نکاتِ مرزائیہ کے ساتھ ساتھ نکات بکڑ الوہ بھی پڑھو اور ہمارے مندرجہ ذیل شعر کی تصدیق کرو ؎

آج دعویٰ ان کی یکتائی کا باطل ہوگیا روبرو ان کے جو آئینہ مقابل ہوگیا!

(۱۱) محمد قادیانی (اردو) صفحات ۲۴ طبع اول ۱۹۲۸ء مطبع آفتاب برقی پریس امرتسر

اس رسالہ کی خصوصیت جاننے کے لیے خود مولانا کا مندرجہ ذیل نوٹ کافی ہے۔

"واضح ہے کہ مرزائی دعاوی کی تحقیق کرنے کے لیے کئی ایک معیار ہیں۔ (۱) ان کی پیشین گوئیاں (۲) ان کی صداقت کلام (۳) قرآن اور احادیث کی تصریحات وغیرہ۔ آج جو معیار ہم پیش کرتے ہیں وہ انوکھا ہے، اس میں ہم صرف اس معیار پر گفتگو کریں گے کہ مرزا صاحب چونکہ اپنے آپ کو "بروزِ محمد" (صلی اللہ علیہ وسلم) کہا کرتے تھے اس لیے وہ محمد ثانی بنتے اور اپنے اتباع کو اصحاب محمد اول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں داخل کرتے تھے۔ (ملاحظہ ہو خطبۂ الہامیہ ص ۱۷۱) لہٰذا دیکھنا ہے کہ محمد ثانی کو محمد اول کے کاموں سے کہاں تک مشابہت ہے؟ اس اصطلاح پر ہم نے اس رسالہ کا نام محمد قادیانی تجویز کیا ہے۔ اس میں ہم دکھائیں گے کہ محمد اول (ص) نے کیا کام کیے۔ اور ان کے "بروز محمد ثانی" قادیانی نے کیا کیے۔ تاکہ ان کاموں کی مطابقت یا عدم مطابقت سے مرزا صاحب کے صدق وکذب کا ثبوت ہوسکے" (دیباچہ محمد قادیانی)

(۱۲) فیصلہ مرزا (اردو) صفحات ۴۰ طبع اول ۱۹۳۱ء مطبع آفتاب برقی پریس امرتسر۔

مرزا صاحب نے ۱۵ اپریل ۱۹۰۷ء کو مولانا ثناء اللہ امرتسری کے سلسلہ میں "آخری فیصلہ" کے نام سے ایک اشتہار شائع کیا تھا جس میں یہ دعا کی تھی کہ "جھوٹا سچے کی زندگی ہی میں مر جائے" اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا صاحب مولانا امرتسری کی زندگی ہی میں چل بسے، یہ رسالہ اصلاً اسی اشتہار اور اس کا نتیجہ بتانے کے لیے لکھا گیا ہے اور اس سلسلہ میں قادیانیوں کی طرف سے جتنے حیلے بہانے کیے گئے تھے ان سب کی تردید کی گئی ہے۔ یہ رسالہ اردو کے علاوہ عربی، انگریزی، کشمیری، پنجابی اور بنگالی زبانوں میں بھی شائع ہوا اور عوام وخواص میں بہت مقبول ہوا۔

(۱۳) ناقابل مصنف مرزا (اردو) صفحات ۶۰ طبع اول ۱۹۳۲ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر۔

یہ رسالہ "علم کلام مرزا"، کا تیسرا حصہ ہے، اس رسالہ میں مرزا صاحب کی تین کتابیں تنقید کے لیے منتخب کی گئی ہیں۔
(۱) براہین احمدیہ (۲) آئینۂ کمالات اسلام (۳) چشمۂ معرفت۔
ان تینوں کتابوں پر کیے گئے تنقیدی اجزا ایک دوسرے سے الگ الگ رکھے گئے ہیں۔

(۱۴) بہاء اللہ اور مرزا (اردو) صفحات ۶۰ طبع اول ۱۹۳۳ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر
اس کتاب میں دکھایا گیا ہے کہ مرزا صاحب نے اپنے دعاوی میں ٹھیک وہی راہ اختیار کی ہے جو شیخ بہاء اللہ ایرانی نے اختیار کی تھی۔ آغاز کتاب میں دونوں کے حالات و سوانح ذکر کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد رسالہ کو تین ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے باب میں دونوں کے دعوے الگ الگ نقل کر کے تقابل کیا گیا ہے اور دوسرے باب میں دونوں کے دلائل ان کے اصل الفاظ میں نقل کر دیے گئے ہیں۔ تیسرے باب میں خاص شیخ بہاء اللہ کی تعلیم پر بحث کی گئی ہے۔ یہ کتاب بہت ہی دلچسپ ہے۔

(۱۵) علم کلام مرزا (اردو) صفحات ۸۰ طبع ۱۹۳۲ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر
اس کتاب میں مولانا نے مرزا صاحب کی کتابوں میں سے اس کی پہلی تصنیف "براہین احمدیہ"، کا علم کلام کی حیثیت سے جائزہ لیا ہے اور فرقہ مرزائیہ کے اصول کا بیخ و بُن سے قلع قمع کر دیا ہے۔

(۱۶) عجائبات مرزا (اردو) صفحات ۲۴ طبع اول ۱۹۳۳ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر
یہ رسالہ "علم کلام مرزا"، کا حصہ دوم ہے۔ اس رسالہ میں مرزا صاحب قادیانی اور ان کے صاحبزادہ میاں محمود صاحب خلیفۂ قادیان کی تحریرات متعلقہ "عمر دنیا اور پیدائش مرزا"، پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ ان لوگوں کی تحریرات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرزا صاحب کی عمر گیارہ سال کی تھی اور اتنی تھوڑی سی عمر میں آپ نے علوم و فنون پڑھے۔ سیالکوٹ میں محرری کی۔ مختاری عدالت کا امتحان دیا، پھر مجدد بنے۔ مسیح بنے، مہدی بنے، کرشن بنے، سب کچھ بنے۔ مگر عمر گیارہ سال سے متجاوز نہ ہوئی ہوئی۔

(۱۷) اباطیل مرزا (اردو) صفحات ۱۶ طبع اول ۱۹۳۴ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر
یہ رسالہ چند مضامین کا مجموعہ ہے۔ جو اہلحدیث امرتسر میں شائع ہوئے تھے۔ ان مضامین کے عنوان یہ ہیں۔

(۱) آہ نادر شاہ کہاں گیا؟ (۲) حلف موکد بعذاب (۳) زلزلہ بہار (۴) نکاح آسمانی (۵) تقریر لائلپوری۔
ان رسالوں میں مرزا صاحب کا کذب ثابت کیا گیا ہے اور اس دور کے قادیانیوں کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔

(۱۸) تحفہ احمدیہ

(اردو) صفحات ۵۲ طبع اول ۱۹۳۹ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

اس رسالہ میں مرزا صاحب نے آسمانی نکاح کی بابت جو پیشین گوئی فرمائی تھی، اس کے جھوٹا ہونے کو قادیانی امت کے دیگر اکابر جیسے حکیم نورالدین، ڈاکٹر بشارت احمد، ڈاکٹر میر اسماعیل، احمد نور کابلی اور مولوی فضل خاں وغیرہ علماء احمدیہ کی تحریرات سے ثابت کیا گیا ہے۔

(۱۹) مکالمہ احمدیہ

(اردو) صفحات ۵۲ طبع اول ۱۹۳۹ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

قادیانی جماعت ۱۹۱۴ء سے دو فرقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک فریق مرزا صاحب کے صرف مجدد اور مسیح ہونے کا مدعی تھا اور دوسرا فریق نبی اور رسول ہونے کا۔ یہ دونوں آپس میں خوب لڑے خوب رسالہ بازی کی اور ہر فریق نے اپنے مدمقابل پر کفر کا الزام عائد کیا۔ مولانا امرتسری نے اس کتاب میں، اس بحث پر فریقین کی تحریریں جمع کر دی ہیں اور یہ بتلایا ہے کہ مرزا صاحب کا دعویٰ تھا کہ میں مسلمانوں کو اعلیٰ درجہ کا مسلمان بنانے آیا ہوں تو دیکھیں کہ قادیانیوں کا انداز گفتگو شریفانہ ہے یا رذیلانہ اور اخلاقی معیار بلند ہے یا پست۔

(۲۰) لیکھرام اور مرزا

(اردو) صفحات ۱۶ طبع اول ۱۹۴۳ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

اس رسالہ میں مولانا نے مرزا صاحب کی پیش کردہ تفصیلات کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ پنڈت لیکھرام کے قتل سے مرزا صاحب کی پنڈت جی سے متعلق پیشین گوئی سب سے زیادہ غلط ثابت ہوئی جس پر مرزا صاحب کے اتباع کو بڑا ناز تھا۔ مولانا امرتسری فرماتے ہیں کہ: "چوں کہ مرزا صاحب اور ان کے اتباع کو پنڈت لیکھرام والی پیش گوئی پر بڑا ناز ہے وہ اس کو ایسا صحیح جانتے ہیں جیسے دو دونے چار، ہماری تحقیق میں یہ پیش گوئی سب سے زیادہ غلط ثابت ہوئی، اس لیے اس کے متعلق مستقل رسالہ لکھنے کی ضرورت پیش آئی۔"

(لیکھرام اور مرزا ص ۲)

(۲۱) مراق مرزا (اردو) صفحات ۱۴ طبع اول ۱۹۲۰ء مطبع اہلحدیث امرتسر

اس رسالہ میں مرض مراق کی تشریح اور مرزا قادیانی کے اقوال سے خود اس کا اس کی بیوی اور اس کے بیٹے میاں محمود کا مراقی ہونا ثابت کیا گیا ہے اور اخیر میں قادیانی اکابر کی یہ رائے مع حوالجات درج کی گئی ہے کہ «مراقی انسان، نبی یا ملہم نہیں ہو سکتا

(۲۲) نکاح مرزا (اردو) صفحات ۲۰ طبع اول ۱۹۱۹ء مطبع اہلحدیث امرتسر

اس رسالہ میں مرزا غلام احمد قادیانی صاحب کی آسمانی منکوحہ «محمدی بیگم» سے متعلق تمام پیشین گوئیوں کو مولانا نے غلط ثابت کیا ہے۔

(۲۳) فتح ربانی در مباحثۂ قادیانی (اردو) صفحات ۸۸ طبع اول ۱۹۱۶ء مطبع روز بازار امرتسر

یہ کتاب اس مباحثہ امرتسر کی مکمل روئداد اور رپورٹ ہے جو مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری اور مولوی غلام رسول راجیکی کے مابین ۲۹، ۳۰ اپریل ۱۹۱۶ء کو «حیات و وفات مسیح» کے موضوع پر ہوا تھا، جس کا نتیجہ «اخبار بلیٹن لاہور» کے نمائندہ کی زبانی سنیے:

«اس مباحثہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی ثناء اللہ صاحب کو مولوی غلام رسول راجیکی پر فتح ہوئی۔ اور مرزائی ہار گئے۔ جلسہ میں علاوہ مسلمانوں کے دیگر مذاہب کے لوگ بھی موجود تھے اور سب نے بالاتفاق مرزائیوں کے خلاف فیصلہ دیا۔»

(بلیٹن لاہور ۳ مئی ۱۹۱۶ء ماخوذ از اہلحدیث امرتسر ۱۲ مئی ۱۹۱۶ء)

رسالہ کے اخیر میں ایک مبسوط تنقیدی مضمون بھی شامل ہے۔

(۲۴) شاہ انگلستان اور مرزا قادیانی (اردو) صفحات ۱۲ طبع اول ۱۹۲۱ء مطبع آفتاب برقی پریس لاہور

مولانا نے اس رسالہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ جب لارڈ کرزن وائسرائے نے ۱۹۰۶ء میں صوبہ بنگال کو شرقی اور غربی دو حصوں میں تقسیم کیا اور دوبارہ ۱۹۱۱ء میں اس کی منسوخی کے سلسلہ میں جارج پنجم شاہ انگلستان دہلی تشریف لائے تو اس سے خدا کی جانب سے مرزا کی تکذیب ہوئی۔

(۲۵) فسخ نکاح مرزائیاں (اردو) صفحات ۲۲ طبع ۱۹۲۲ء مطبع اہلحدیث امرتسر

اس کتاب میں مرزائیوں سے میل، جول اور شادی غمی میں شرکت سے متعلق ایک سو اسی[۱۸۰] علماء کا متفقہ فتویٰ درج ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مرزائی خارج از اسلام ہیں۔

(۲۶) تعلیمات مرزا (اردو) صفحات ۷۲ طبع اول ۱۹۳۰ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

اس رسالہ میں مولانا نے مرزا صاحب کی تعلیم کے چار ابواب (یعنی اختلافات مرزا، کذبات مرزا، نشانات مرزا اخلاق مرزا) کو نقل کر کے اس میں مرزا کی ۴۷ عبارتیں درج کیں اور ہر ایک میں باہم تضاد دکھلایا ہے۔

(۲۷) ہفتوات مرزا (اردو) صفحات ۱۰ مطبع برٹش انڈیا پریس کلکتہ

اس رسالہ میں مرزا صاحب کے کچھ عقائد اور تناقضات بیان کیے گئے ہیں اور بالدلائل ثابت کیا گیا ہے کہ اس قسم کے اختلافات کا رونما ہونا ایک الہامی نبی سے ممکن نہیں۔ یہ رسالہ اگرچہ مختصر ہے مگر اچھا خاصا دلچسپ اور اثر انگیز ہے۔

(۲۸) ثنائی پاکٹ بک (اردو) صفحات ۹۶ طبع اول ۱۹۳۴ء ثانی ۱۹۷۹ء مطبع الجمعیۃ پریس دہلی

یہ پاکٹ بک قادیانیت کا بخیہ ادھیڑتے ہوئے دوسرے تمام مخالفین اسلام یعنی دھریہ، عیسائی، ہندو، آریہ، رادھا سوامی، سکھ، منکرین نبوت محمدیہ، فرقہ بہائیہ، شیعہ، اہل قرآن، اور نیچریہ کی مختصر اور جامع تردید کرتا ہے۔

(۲۹) تفسیر بالرائے[۱] جلد اول (اردو) صفحات ۱۱۲ طبع اول مئی ۱۹۳۹ء / ۱۳۵۸ھ مطبع برقی پریس ہال بازار امرتسر

اس رسالہ میں مرزا غلام احمد قادیانی کی تفسیر "خزینۃ العرفان"، مولوی مقبول احمد شیعی کا ترجمہ قرآن مع حواشی، مولوی عبداللہ چکڑالوی اہل قرآن کا ترجمہ قرآن مع حواشی، مولوی محمد علی صاحب لاہوری، (قادیانی) کا ترجمہ قرآن مع حواشی، مولوی احمد الدین صاحب امرتسری نیچری کی تفسیر "بیان للناس"، مرزا محمود خلیفہ قادیان کے تفسیری نوٹ، تحریرات شیخ بہاء اللہ ایرانی، چند آیات کا ترجمہ "عام فہم تفسیر" مصنفہ خواجہ حسن نظامی کی تحریفات، ترجمہ قرآن مولوی احمد رضا خاں صاحب مع حواشی مولوی محمد نعیم مرادآبادی

---

[۱] یہ تفسیر اگرچہ مستقل طور پر رد قادیانیت پر نہیں ہے، لیکن اس میں تین قادیانی علماء کی تفسیر و ترجمہ پر تنقید ہے، اس لیے رد قادیانیت میں میں نے شامل کر لیا۔ (مولف)

کے چند مقامات کو بطور نمونہ دکھا کر اصلاح کی گئی ہے ۔ یہ رسالہ سورہ فاتحہ سے لے کر سورہ بقرہ تک پر مشتمل ہے ۔

(۳۰) بطش قدیر بر قادیانی تفسیر کبیر (اردو)

صفحات ۴۳ طبع اول ۱۹۴۱ء مطبع ثنائی برقی پریس ہال بازار، امرتسر

خلیفہ قادیانی میاں محمود صاحب نے تفسیر قرآن کی ایک جلد از سورہ یونس تا سورہ کہف شائع کی ہے جس کا نام "تفسیر کبیر" رکھا ہے اس رسالہ میں بطور نمونہ دس آیات کی غلطیاں درج کی گئی ہیں اور باقی آیات کی غلطیاں مولانا امرتسری کی دوسری کتاب "تفسیر بالرائے جلد ثانی میں درج تھیں جس کا اشتہار مولانا نے ۱۴ / ۲۱ مارچ ۴۷ ۱۹ء مطابق ۲ ربیع الآخر ۱۳۶۶ھ کے اہلحدیث میں شائع کیا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے :

"بطش قدیر حصہ اول کی اشاعت کے بعد خلیفہ قادیان کی "تفسیر کبیر" کا جو حصہ شائع ہوا ہے بطش قدیر حصہ دوم میں اس کا جائزہ لیا گیا ہے چونکہ اس وقت پنجاب خصوصاً امرتسر میں فسادات کی لہر چل رہی ہے اس لیے اس حصہ کی اشاعت امن ہو جانے کے بعد ہوگی ۔

لیکن افسوس کہ بحالی امن کے بجائے چند ماہ کے بعد آزادی و تقسیم ملک اور طوفان و فساد کا ہنگامہ کھڑا ہو گیا جس کے دوران مولانا کا گھر بھی لوٹ لیا گیا اور کتب خانہ کو نذر آتش کر دیا گیا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

ان کتابوں کے علاوہ عشرہ کاملہ[۳۱]، تفسیر نویسی کا چیلنج اور فرار[۳۲]، قادیانی مباحثہ دکن[۳۴]، محمود مصلح موعود[۳۵] نام کی مزید چار کتابوں کا ذکر مولانا صفی الرحمٰن صاحب حفظہ اللہ استاذ جامعہ سلفیہ بنارس نے اپنی کتاب "فتنۂ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ امرتسری" میں کیا ہے ۔ لیکن یہ کتابیں مجھے دستیاب نہ ہو سکیں ۔

رد قادیانیت کے موضوع پر مولانا امرتسری کی دو کتابیں اور بھی ہیں، ایک: ہندوستان کے دو ریفارمر (جس کا ذکر رد آریت میں ہو چکا ہے) ۔ دوسری تفسیر ثنائی (جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے) اس کے حواشی پر جگہ جگہ رد قادیانیت کے سلسلہ میں اتنے طویل اور جامع نوٹ ہیں جو اپنے خاصے رسالوں کا حجم رکھتے ہیں ۔

●●●

پیامِ کعبہ خطبہ حرم

ایمان صادق۔ اور اس کے ثمرات

شیخ محمد بن عبد اللہ السبیّل امام حرم مکی

الحمد للّٰه الهادی الیٰ سبیله القویم ، انعم علیٰ من شاء من عباده فهداهم الی الصراط المستقیم ۔ احمده سبحانه مع انعامه العمیم ، واشهد ان لا إله الا الله وحده لا شریك لهٗ الحکیم العلیم ، واشهد انّ سیّدنا محمداً عبده ورسوله المبعوث رحمۃً للعالمین ، اللّٰهم صلّ وسلّم علیٰ عبدك ورسولك محمد وعلیٰ اٰله وصحبه والتابعین لهم باحسان۔

اللہ کے بندو اللہ سے ڈرو ، جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور اس نعمت پر اس کا شکر بجا لاؤ کہ اس نے تمہیں دولت ایمان سے نوازا ۔ اس کا شکر ایمانی وصف کے اظہار ، کتاب اللہ اور سنت نبوی کی پیروی منہیات سے کنارہ کشی اور احکام الٰہی کی بجا آوری کے ذریعہ کرو ۔

اپنے مومن ہونے کا ثبوت زبان سے اعتراف واقرار کے ذریعہ اعضاء سے عمل کے ذریعہ اور دل سے اعتقاد و اخلاص کے ذریعہ فراہم کرو ۔ یاد رکھو ، ایمان زیب وزینت اور آرزو و تمنا کا نام نہیں ۔ یہ تو دل کے پختہ اعتقاد کا نام ہے جس کی تصدیق عمل سے ہوتی ہے ۔ ایمان صادق دل کو امن ویقین اور روشنی وہدایت سے معمور کر دیتا ہے اس کے اندر اللہ کی بندگی کرنے ، ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کرنے اور تمام آفات ومہمات میں اسی کی پناہ میں آنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے ۔ اور اللہ کے ذکر سے اطمینان وسکون حاصل ہوتا ہے ۔ أَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ

ایمانِ صادق بندے کے اندر اللہ پر توکل اور اس کی ذات پر کامل اعتماد و وثوق اور تمام دینی و دنیوی معاملات میں صرف اور صرف اسی کی ذات سے استمداد اور استعانت کا داعیہ پیدا کرتا ہے۔ ایاک نعبد و ایاک نستعین۔ یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔ سچی ایمانی کیفیت، انسان کو عزت و قوت عطا کرتی اور اسے جری و بہادر بنا دیتی ہے، بشرطیکہ اسے اس بات کا پورا یقین ہو کہ نفع و نقصان کا مالک صرف اللہ ہے، دینا اور محروم کرنا صرف اسی کے ہاتھ میں ہے اور جو اس کا سہارا لے وہی باعزت اور غالب رہے گا۔ وللہِ العزۃ ولرسولہٖ وللمؤمنین اور اسے اس امر کا بھی یقین کامل ہو کہ جو اللہ پر توکل و اعتماد کرلے اللہ اس کے لیے کافی ہے اور جو اس کی پناہ لے لے وہ اس کی حفاظت کا ضامن ہے۔

حقیقی ایمان کا ایک فائدہ یہ ہے کہ مصائب و آفات میں مومن کو تسلی رہتی ہے اور سختیوں کا احساس کمزور پڑ جاتا ہے ومَن یُؤمِنْ باللہِ یَھْدِ قلبَہٗ جو اللہ پر ایمان رکھے اللہ اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ بندہ جب کسی مصیبت میں گرفتار ہو اور اسے اس کا احساس ہو کہ یہ ابتلاء و آزمائش اللہ کی طرف سے ہے اور جو کچھ اسے پیش آیا، اس سے بچ نکلنے کی کوئی گنجائش نہ تھی اور جس آفت سے وہ محفوظ رہا وہ اسے لاحق ہونے والی نہ تھی اور خود کو اللہ کے فیصلہ و تقدیر کے سپرد کر کے اس پر راضی رہے تو وہ تمام مصائب جو کسی مومن یا غیر مومن کو پیش آئے ہیں، اس بندۂ مومن پر ہلکے پڑ جائیں گے۔ مومن اور غیر مومن میں فرق یہی ہے کہ مومن اس بات کا یقین رکھتا ہے کہ یہ ساری آفات اللہ کی تقدیر اور اس کے فیصلے کے تحت ہیں، اس لیے وہ ان پر اللہ کی طرف سے اجر و ثواب کی آس رکھتا ہے۔ اور غیر مومن کے حصہ میں اس فیصلہ و تقدیر الٰہی پر اظہار ناراضگی اور واویلا کرنے کی وجہ سے مصیبت اور اخروی سزا کے علاوہ اور کچھ نہیں آئے گا۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

ان تکونوا تألمون فانھم یألمون کما تألمون وترجون من اللہ ما لا یرجون۔ اگر تم لوگ الم اور تکلیف محسوس کرتے ہو تو وہ (کافر بھی) بھی اسی طرح تکلیف محسوس کرتے ہیں جیسے تم کرتے ہو، لیکن تم لوگ اللہ سے ایسی چیز کی امید رکھتے ہو جس کی امید وہ نہیں رکھتے۔

ایمانِ صادق کا ثمرہ یہ بھی ہے کہ بھلائی کے کاموں میں پر زور رغبت اور اعمالِ صالحہ سے خود کو آراستہ کرنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔ دوسروں پر شفقت، راست گوئی اور ثواب کی امید پہ مصائب و آلام برداشت کرنے کی قوت و ہمت پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح ایمانِ صادق انسان کو گناہ و معصیت کاری سے روکتا اور برے اخلاق سے

ز رکھتا ہے۔ ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر ۔ یقیناً نماز فحش کاریوں اور برائیوں سے
تی ہے ۔

ایمان دلوں کو پاکیزگی بخشتا ہے نفوس کی تطہیر کرتا ہے اور اخلاق فاضلہ کی نشوونما کرتا ہے اور مومن کے اندر
ہ اور اس کے بندوں کے لیے خاکساری، فروتنی اور تواضع پیدا کرتا ہے ۔ قبول حق اور بندگان الٰہی کی حسب مراتب خیرخواہی
بھارتا ہے ۔ اس کے برعکس ایمان سے محروم شخص کا خاصہ حق سے روگردانی، تکبر اور خود رائی و احساس برتری ہے ۔

مومن کا وصف یہ ہے کہ اس کا دل کھوٹ اور کینہ سے پاک ہو، زبان کا سچا اور معاملہ کا اچھا ہو ۔ نرم خو، بردبار
ر باوقار ہو ۔ صابر مہربان اور وعدے کا پکا ہو ۔ اللہ پر توکل اور اس کی کارسازی پر پورا بھروسہ رکھتا ہو ۔ اپنے
پوری لگن اور محنت سے انجام دے کر اس میں کامیابی کے لیے اللہ پر یقین رکھتا ہو ۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے
حْرِصْ عَلٰی مَا یَنْفَعُکَ وَاسْتَعِنْ بِاللّٰہِ ۔ یعنی جو چیز تمھیں نفع دے اس کی حرص رکھو اور اللہ سے مدد مانگو
س ارشاد پر عمل کرتے ہوئے اللہ ہی سے مدد اور تکمیل کی توفیق کا طالب رہے ۔ جب اس کو نعمتیں میسر آئیں تو یقین کرلے
یہ سب اللہ ہی کی طرف سے ہے اور اس کے سوا کسی کے بس میں ان کے عطا کرنے کی قوت نہیں، اس لیے انھیں شکر
امتنان کے ساتھ لے کر انھیں صحیح راستوں میں خرچ کرے، جو دنیا و آخرت دونوں میں اس کے لیے سودمند ہوں اور
ب مصائب آئیں تو پامردی کے ساتھ ان کا سامنا کرتے ہوئے تقدیر الٰہی پر راضی رہ کر ان سے مخلصی اور چھٹکارے
تدبیر اور انتظار کرے اور اس آزمائش پر اللہ سے اجر و ثواب کی امید رکھے ۔

جس شخص کا دل صحیح ایمان سے خالی ہو، اس کے اندر ریاکاری، چاپلوسی، نفاق اور اللہ اور اس کے رسول
اطاعت سے بیزاری پائی جاتی ہے ۔ وہ جھوٹ بولتا ہے اور خیانت کرتا ہے اور بدزبان اور لعن طعن کرنے والا
ہوجاتا ہے اور گناہوں میں لت پت اور حرام کاریوں کا رسیا ہوجاتا ہے ۔ اللّٰھم احفظنا ۔

اللہ کے بندو اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اس کی نافرمانی سے بچو اور اس کی اطاعت و فرماں برداری میں جی جان
سے لگ جاؤ ۔ یاایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ ولتنظر نفس ما قدمت لغد واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بما
تعملون ولا تکونوا کالذین نسوا اللہ فانساھم انفسھم أولٰئک ھم الفسقون ۔ اے ایمان والو
اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور ہر شخص کو دیکھنا چاہیے کہ کل کے لیے اس نے کیا پیش کیا ہے ۔ اور تم لوگ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو ۔
تم لوگ جو کچھ کرتے ہو اللہ یقیناً اس کی خبر رکھتا ہے ۔ اور تم لوگ ان لوگوں کی طرح نہ ہوجاؤ جنھوں نے اللہ کو بھلا دیا ۔ تو اللہ نے بھی انھیں
بھلا دیا ایسے ہی لوگ فاسق ہیں ۔ اقول قولی ھٰذا واستغفر اللہ العظیم لی ولکم ولسائر المسلمین من کل ذنب فاستغفروہ

بزمِ طلبہ

مغربی اقدار و ثقافت
صحت مند معاشرے کی تشکیل میں رکاوٹ

جاوید مصطفیٰ اعظمی ع ۲
متعلم جامعہ سلفیہ بنارس

یہ حقیقت ہے کہ مغرب نے سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں بہت ترقی کی اور اس راہ میں انسان کو کافی آگے بڑھا دیا، لیکن اسی کے ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا ہوگا کہ جہاں اس نے سائنسی علوم میں ترقی کی، نئے نئے محیر العقول انکشافات کیے، انسانوں کو ہر قسم کی مادی سہولیات فراہم کیں وہاں وہ تیزی کے ساتھ اخلاقی حیثیت سے گرتا چلا گیا شرم و حیا جیسے قیمتی جوہر اس کے یہاں نایاب ہو گئے، باہمی بے لوث خدمت اور تعاون کا جذبہ مفقود ہو گیا، وہ اخلاقی اعتبار سے بالکل صفر ہو کر رہ گیا، آج وہاں کی تہذیب بالکل زوال پذیر ہے، یہی نہیں بلکہ ساتھ ساتھ بیرونی دنیا پر بھی تیزی سے اثر انداز ہو رہی ہے، جس کو دیکھتے ہوئے یہ سوچنے پر مجبور ہو جانا پڑتا ہے کہ کیا مغرب کا یہ خوفناک طوفان دنیا سے عفت و پاکدامنی کا استیصال کر کے چھوڑے گا، کیا مغرب کا یہ بیکراں سیلاب انسانیت کو اپنی رو میں بہالے جائے گا؟ دنیا میں ایک اچھے معاشرے ایک اچھے سماج کو کبھی قائم نہیں ہونے دے گا؟ ظاہر ہے معاشرے کی تشکیل افراد سے ہوتی ہے، چنانچہ معاشرے کا بہتر اور صحتمند ہونا یا خراب ہونا افراد کے اچھے اور برے ہونے پر منحصر ہے۔ کسی وجہ سے ان کے اندر نیکی اور بہتری کا اثر آیا تو معاشرہ بھی بہتر ہوگا بصورتِ دیگر برا۔

معاشرے کا مفہوم یہی ہوتا ہے، ایسی جماعتی زندگی جس میں افراد کو اپنی ترقی اور بہبود کے لیے ایک دوسرے سے واسطہ پڑتا رہتا ہے، ایک بہترین اور صحت مند معاشرہ کی تشکیل کے واسطے "اصلاحِ معاشرہ" کے وسیع میدان کو مختلف شعبوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔ چنانچہ اس کی اجمالی تقسیم یوں کی جا سکتی ہے:

(۱) افراد کی صحیح طور پر تعلیم، کیوں کہ یہی بہترین سماج کی اساس ہے (۲) فحاشی و بے حیائی کا قلع قمع کرنا (۳) خانگی اور غیر خانگی اختلافات کا دور کرنا، باہمی رواداری اور حسن سلوک کا جذبہ پیدا کرنا (۴) صنعت و حرفت کو ترقی دینا کہ اقتصادی ترقی ہو (۵) مذہب کو فروغ دینا کہ باطل پرستی، ضعف اعتقاد دور ہو (۶) سیاسیات کہ تمدنی ضروریات کے تحت حکومت سے مرافعہ کرنا لابدی ہو۔ (۷) عدم مساوات اور تنگ نظری کو دور کرنا۔

اب آئیے یہ سوال حل کرنے کے لیے کہ کیا مغربی تہذیب و تمدن بہترین سماج کی تشکیل میں سنگ راہ ہے یا نہیں، اور ہے تو کس قدر، ؟۔ سب سے پہلے یہ دیکھیں کہ جو چیزیں معاشرے میں محتاجِ اصلاح ہیں وہ مغرب میں کس قدر اور کس نوع کی پائی جاتی ہیں۔

تعلیم:۔ اس سلسلے میں اہلِ مغرب نے دنیا کو بہت کچھ دیا۔ چنانچہ آج کے سائنسی اور دیگر عصری علوم کا عروج مغرب کے ہاتھوں ہوا ہے۔ لیکن تعلیم کا لفظ بہت وسیع المعنی ہے، کوئی کالج، یونیورسٹی اور تعلیمی ادارہ قائم کر کے مروجہ علوم کو سکھانے پر تعلیم کا اطلاق تو ہوتا ہے، لیکن یہ عوامی تعلیم نہیں، یعنی ایسی تعلیم جس کا اثر معاشرے کے ہر فرد پر ہو خواہ وہ کیمپاؤنڈ میں جاتا ہو یا نہ جاتا ہو، بلکہ یہ تعلیم تو معاشرے میں رائج اخبارات و اشتہارات اور دیگر رسائل سے ہوتی ہے، اور یہی معاشرے کے رُخ کو ایک جانب سے دوسری جانب موڑ سکتے ہیں، لیکن یہ مغربی دنیا میں اس نوع کے ہوتے ہیں کہ اخلاقی سطح پر عوام کو محض فحاشی، عریانیت اور دیگر برائیاں ہی دیتے ہیں۔

آج سے دسیوں برس پہلے ایک تحقیق کے مطابق صرف ریاستہائے متحدہ امریکہ میں پانچ لاکھ افسانہ نگار موجود تھے، مگر ان کی تعداد میں اس طرح دن دونی رات چوگنی ترقی ہوئی کہ اب نہ معلوم ان کی تعداد کتنی ہوگی، پھر افسانہ نگاری بھی بالکل فحش۔ اخبارات و اشتہارات میں سے بعض میں سنجیدہ تبصرے اور ٹھوس اور عمیق مضامین مل سکیں گے، دیگر تمام عشق و عاشقی کی داستانوں اور جنسی خبروں سے بھرے پڑے ہوں گے، اور بدقسمتی سے عوام میں یہی مقبول بھی ہیں۔

فحاشی و بے حیائی: ۔ سماج اور سوسائٹی کو سدھارنے کے لیے صنفی آوارگی، برہنگی، عریانیت، جنسی آزادی کو دور کرنا، عورتوں اور مردوں کو ان کا اپنا اپنا مقام بتلانا، نہایت ضروری ہے، لیکن مغرب اس کے برعکس کر رہا ہے چنانچہ جیسا کہ سب جانتے ہیں وہاں لباس میں برہنگی عام ہے اور اس پر طرہ یہ کہ کہا جاتا ہے کہ اس کے پیچھے ایک فلسفہ ہے سماجی و اقتصادی نظریات ہیں۔ مغربی اقوام کا نظریہ اس سلسلے میں یہ ہے کہ شرم و حیا در اصل کوئی فطری جذبہ نہیں بلکہ لباس پہننے کی عادت نے اسے پیدا کر دیا ہے، انسان عریاں پیدا ہوا ہے، اس لیے عریانیت ہی فطری چیز ہے، لباس

ایک مصنوعی چیز ہے، مسکرات کا استعمال اور قماربازی داخلِ تہذیب ہے، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ کا استعمال بڑھتا ہی جارہا ہے، ڈرامے جو کبھی سیاسی، تاریخی اور حب وطن کے لیے ہوا کرتے تھے، اب ان کی جگہ جنس نے لی ہے، جنسی آوارگی کی ممانعت کے لیے قانون تو یہ ہے، لیکن صرف نام نہاد یعنی صرف جبر کی ممانعت ہے، ورنہ فی الواقع مردوں عورتوں کو اس میں پوری پوری آزادی حاصل ہے۔

خانگی اور غیر خانگی اختلافات، باہمی رواداری اور حسنِ سلوک کا فقدان :۔ مغرب کے جدید تمدن میں مفاد پرستی، خودغرضی کو ہی دانائی شمار کیا جاتا ہے، اجتماعی اور انفرادی تمام شعبوں پر تشدد کا رجحان تیزی سے حاوی ہوگیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جذبات کے معمولی سے اکساوے سے ہر شخص تشدد پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ بین الاقوامی رقابتیں اور رنجشیں معمولی معمولی باتوں پر پیدا ہوجاتی ہیں، چھوٹی چھوٹی لغزشوں کا پُرتشدد ردعمل ہوتا ہے، حتیٰ کہ ایک خاندان کے افراد میں بھی محبت و ہمدردی، باہمی تعاون کا جذبہ ختم ہوگیا ہے، مغربی تہذیب کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ جب سے وہاں مادہ پرستی کا دور شروع ہوا ہے زندگی کے ہر شعبے میں انھوں نے جدت چاہی اور قدامت پسندوں کو لپماندہ شمار کرنے لگے۔ عورتیں مردوں کے شانہ بشانہ فیکٹریوں، آفسوں میں کام کرنے لگیں، اس کے نتیجے میں انھیں امورِ خانہ داری کو چھوڑ کر مردوں کی طرح ہر معاملے میں ان کی ہمسری اور تمام بندشوں سے آزاد رہنے کی خواہش دامنگیر ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے مغربی مرد و زن دونوں ہی کے اندر سے بڑوں کا ادب و لحاظ حتیٰ کہ ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا جذبہ بھی ختم ہوگیا ہے۔ بلوغت کے بعد ہی سے وہاں کا ہر فرد ماں باپ کو اپنی آزادی میں دخیل سمجھتا ہے اور ان کے ساتھ نازیبا سلوک کرتا ہے اور یہی آزادی کی ہوس ہے جس کی وجہ سے مائیں بچوں کی بھی ماں کی طرح دیکھ بھال نہیں کر پاتیں۔ چنانچہ بچے مناسب دیکھ بھال نہ پاکر آوارہ گردی کی راہ اختیار کرلیتے ہیں۔ اور یہی بڑے ہوکر خطرناک مجرم اور سماج کے لیے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔

رشتۂ ازدواج نہایت کمزور اور ناپائدار ہوا کرتا ہے، معمولی معمولی باتوں پر طلاق ہوجاتی ہے۔ غرضیکہ خاندان جو افراد کا سب سے پہلا ادارہ ہے، اس میں کوئی ڈسپلن نہیں۔ ازدواجی زندگی میں ہمیشہ رخنے پیدا ہوتے رہتے ہیں، مرد و عورت کے درمیان کسی قسم کا تعاون اور اشتراکِ عمل نہیں۔ ریاست، مذہب اور صنعت وحرفت زیرِ نظر موضوع سے باہر کی بحثیں ہیں۔

عدم مساوات اور تنگ نظری : اس سلسلے میں تو میں یہی کہوں گا کہ یہ وبا مسلمانوں کے علاوہ

تقریباً ہر قوم میں موجود ہے ، اسلام ہی وہ عالمگیر مذہب ہے جس نے اپنی ٹھوس تعلیمات کے ذریعہ سختی سے اس کا سدباب کیا ہے ۔ اپنے یہاں کے ہندوؤں ہی کو لیجیے ان کا ایک طبقہ صرف اس اعتقاد کی بنیاد پر کہ وہ فلاں دیوتا کی نسل سے ہیں یا فلاں ذات سے تعلق رکھتے ہیں ، اس لیے فلاں سے یا اپنے ماسوا سے افضل ہیں ۔ لیکن مغربی دنیا نے مسیحؑ کی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر رنگ کے تعصب کو اس حد پر پہنچا دیا کہ ذات پات کے تعصب کے پچھلے دور کی یاد تازہ کردی ، مشرقی ممالک کے گرجوں میں عبادت کے اوقات متعین کر دیے گئے ہیں کہ عبادت میں بھی دو رنگ نہ ملنے پائیں ۔

افسوس ہے کہ مغرب کے اس جدید تمدن کے اثرات مغربی سماج ہی تک محدود نہیں ، بلکہ آج یہ ثقافت پوری دنیا پر اثر انداز ہو رہی ہے اور اسی کے وہ مضر اثرات اور دور رس اثرات ہیں جو ایک بہترین سماج کو پنپنے اور پروان چڑھنے نہیں دیتے ۔ پورے کرۂ ارض میں کون سا ملک ہے جہاں یہ سب کچھ کسی نہ کسی حد اور شکل میں نہ پایا جاتا ہو ۔ اگر امریکہ ، فرانس ، برطانیہ ، روس ، سوئٹزرلینڈ اس راہ پر آگے آگے ہیں تو ہم پیچھے ، وہ پیشوا ہیں تو ہم ان کے مقلد

مشہور مفکر اور اہل قلم جناب مولانا عبدالماجد دریا آبادی اس تہذیب کی لامحدودیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں : ۔

" اس تہذیب کے ماحول میں رہ کر اس کا جغرافی محل وقوع خواہ لندن ، پیرس ، ماسکو و پیکن ہانگ کانگ و شنگھائی ، نیویارک و واشنگٹن ہو یا دہلی و بمبئی ، کراچی و لاہور ، قاہرہ و تہران ، بغداد و استنبول ہو روئے زمین کے کسی خطے میں اور بسنے والی قوم میں بھی ہو اوسط درجہ کے مرد اور اوسط درجہ کی عورت کا سرے سے پاکیزہ رہنا اور اس (جنسی) ابتلا میں پڑنے سے محفوظ رہ جانا یہی نہیں کہ دشوار ہے ، بلکہ تقریباً محالات عادیہ میں سے ہے ، خصوصاً جبکہ تبرج یا ذوق خودنمائی درجہ کمال پر پہنچا ہوا ہو اور شہوانی محرکات قدم قدم پر موجود ہوں ، ہر نوجوان لڑکی قبل از وقت عورت بنی جا رہی ہو اور ہر نوجوان لڑکا قبل از وقت مرد ۔ "

اسکولوں ، کالجوں ، یونیورسٹیوں میں جو بھی تعلیم ملتی ہے سب اسی تہذیب کے ماتحت ہے ۔ تفریحی منظر ، کھیل تماشے ، جو بھی سامنے آتے ہیں سب اسی شعلہ کو اور تیز کرنے والے ہیں ، وضع لباس کی ساری فیشن طرازیاں اسی آگ پر تیل ڈالنے والی ہیں ، اس لیے ماحول سارے کا سارا اسی منزل کا مؤید ہے ۔ " [1]

موجودہ زمانے میں اس تہذیب کے اثرات کے سبب مشرقی سماج میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب نہیں تو کم از کم

(باقی ص۵۵ پر)

[1] فریب تمدن یا مغربی تہذیب اپنے آئینہ میں ، مصنف : اکرام اللہ ایم ۔ اے ۔ ص ۴۸۹

عالمِ اسلام

افغان مجاہدین ایران و عراق محاذ پر

کابل ٹیلی ویژن سے۔ ایران سے واپس آنے والے کئی افغان باشندوں کا یہ بیان نشر کیا ہے کہ عراق کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے انھیں ایرانیوں نے جبراً محاذ جنگ پر بھیجا تھا۔ ایک افغانی نے ایک ٹیلی ویژن انٹرویو کے دوران جسے کابل میں نشر کیا گیا بتایا کہ ایرانی فوجیں افغانیوں کو جبراً بارودی سرنگوں کے علاقے میں بھیجتی تھیں تاکہ یہ سرنگیں پھٹیں تو ان افغانوں کے جسم اڑیں۔ اس کے بعد بچوں اور بوڑھوں کو بھیجتی تھیں تاکہ بچی کھچی سرنگیں بھی پھٹ جائیں۔ اس کے بعد فوج اور پاسداران انقلاب پیش قدمی کرتے تھے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اپنی پوری ٹیم میں سے صرف میں زندہ بچ کر واپس آسکا۔

(البلاغ کویت ۱۹ر فروری ۸۴ء۱۹)

خمینی کی نوازشوں کا شکار

جلا وطن ایرانی رہنما مسعود رجوی نے۔ فرانس کے دارالحکومت پیرس میں کہا ہے کہ خمینی نے ایران کو شاہ کا تختہ الٹنے والوں کے قبرستان میں تبدیل کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا خمینی کی ڈکٹیٹرشپ شاہ کے ظلم و تشدد کا امتداد ہے، خمینی کے پانچ سالہ دورِ حکومت میں تیس سے چالیس ہزار افراد کو موت دی گئی ہے۔ ایک لاکھ سیاسی قیدی بنائے گئے ہیں، ۵ لاکھ فوجی جنگ میں مارے گئے یا معذور ہوئے ہیں۔ تیس لاکھ افراد نے بھاگ کر دوسرے ملکوں میں پناہ لی ہے۔ زراعت کٹ گیا ہے ...... صنعتیں منجمد ہیں۔ خوراک کا دارومدار سو فی صد درآمدات پر ہے۔ اور پچاس لاکھ سے زیادہ افراد بے روزگاری کا شکار ہیں۔

(البلاغ: کویت ۱۹ر فروری ۱۹۸۴م)

افغانستان کی جیلوں میں کیا گزر رہی ہے؟

افغانستان کی جیلوں میں افغان مسلمان قیدی بدترین ظلم و بربریت کا شکار ہیں۔ انسانیت سوز درندگی اور وحشت کی کوئی قسم ایسی نہیں جس سے یہ قیدی دوچار نہ ہو رہے ہوں انکی وحشت آمیز ایذا رسانی کے بیس سے زیادہ طریقے ہیں، جن میں سے ہر

طریقہ انتہائی دلدوز اور اپنی سنگینی کے لحاظ سے دوسرے پر فوقیت رکھتا ہے ۔ ان کا اجمالی طور پر ذکر کیا جاتا ہے:

• خاردار تاروں کے لپٹے ہوئے لکڑی کے تختوں پر ننگا کرکے ڈال دیا جاتا ہے اور اس حالت میں اوپر سے انتہائی سنگدلی کے ساتھ کوڑے برسائے جاتے ہیں ۔ یہاں تک کہ قیدی کے جسم سے خون بہنے لگتا ہے اور بے ہوشی طاری ہوجاتی ہے ۔

• قیدی کو ننگا کرکے ابھرے ہوئے کانٹوں والی لکڑیوں پر ڈال دیا جاتا ہے اور اس حالت میں اوپر سے پتھر دل جلاد پورے وزن کے ساتھ کھڑے ہوکر زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں ۔ یہاں تک کہ قیدی کے جسم سے خون رسنے لگتا ہے اور اس حالت کرب میں وہ ہوش کھو بیٹھتا ہے ۔

• قیدی کے ہاتھ پاؤں لوہے کی زنجیروں سے مضبوطی کے ساتھ باندھ دیے جاتے ہیں اور ایک ایک ہفتہ تک اسے اس حالت میں کھانا اور پانی پینا پڑتا ہے اور اسی حالت میں طبعی ضروریات سے گزرنا پڑتا ہے جس کے نتیجہ میں نفسیاتی طور پر وہ انتہائی کرب انگیز کیفیت کا شکار ہوجاتا ہے ۔

• تحقیقاتی کمروں کے فرش نیچے سے گرم کرکے آگ بنا دیتے ہیں اور قیدی کو ننگے پیر زبردستی فرش پر چلایا جاتا ہے ، جس سے اس کے پیر جھلسنے لگتے ہیں اور وہ شدید قسم کی اعصابی تکلیف سے بلبلا اٹھتا ہے ۔

• چھوٹے چھوٹے حوضوں میں جن کا پانی انتہائی درجہ ٹھنڈا کیا ہوا ہوتا ہے ، قیدیوں کو ان میں ڈبو دیا جاتا ہے ۔

• تحقیقاتی کمرے میں قیدی کے ہاتھ ہنڈل سے باندھ دیے جاتے ہیں ، جس میں بجلی کا کرنٹ ہوتا ہے ، پھر سختی کے ساتھ دروازہ کھولا جاتا ہے ، جس کے نتیجہ میں کرنٹ کی پوری مقدار قیدی کے بازو میں پہنچ جاتی ہے اور بسا اوقات اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بازو شانے سے الگ ہوجاتا ہے ۔

• نفسیاتی طور پر تکلیف پہنچانے کی کچھ صورتیں عمل میں لائی جاتی ہیں ، مثلاً قیدیوں کو دھمکی دی جاتی ہے کہ ان کے مکانات تباہ کردیے جائیں گے ۔ اور تحقیقات کے سلسلہ میں ان کی خواتین بھی جیل میں لائی جائیں گی ۔ اور ان کی بے حرمتی کی جائے گی ۔ قیدیوں کے سروں کے اوپر رائفل رکھ کر فائر کیا جاتا ہے اور دھمکیاں دی جاتی ہیں کہ اگر سوالات کے تسلی بخش جواب نہ ملے تو ان رائفلوں سے انھیں چھلنی کردیا جائے گا ۔

• بھوکے کتوں کو قیدیوں کی کوٹھڑیوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے جو انتہائی ہولناک طریقہ سے ان کے جسموں کی تکا بوٹی کردیتے ہیں

• قیدیوں کو ایک طویل عرصہ تک سونے نہیں دیا جاتا اور بھوکا رکھا جاتا ہے پھر تیز نمک ملائے ہوئے کھانے زبردستی کھلائے جاتے ہیں تاکہ بدستور پیاس کی شدت باقی رہے ۔

• ناخنوں کو جڑ سے اکھاڑ دیا جاتا ہے ننگے جسم پر بجلی کے کرنٹ والے تار رکھ کر اوپر سے ضربیں لگائی جاتی ہیں جس سے شعلے اٹھتے ہیں اور جگہ جگہ سے جسم جل جاتا ہے۔

• قیدی کو کمرے میں بٹھا کر اس کا سر اوپر کی طرف کر دیا جاتا ہے اور ایک برتن جس میں معمولی سوراخ ہوتا ہے ٹھنڈے پانی سے بھر کر اس کے اوپر رکھ دیا جاتا ہے، اس میں سے ایک ایک قطرہ اس کی پیشانی پر ٹپکتا ہے جس سے پورے جسم میں سردی کی ایک تیز لہر دوڑ جاتی ہے۔

• کپڑا وغیرہ ٹھونس کر قیدی کا منہ بند کر دیا جاتا ہے اور پھر اس کی خوب پٹائی کی جاتی ہے، اور کئی کئی گھنٹے تک ہاتھ اٹھائے رکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

• ماچس کی تیلیوں سے جسم جلایا جاتا ہے اور جلتے ہوئے سگریٹ جسموں پر بجھا کر اذیت پہنچائی جاتی ہے۔

• قیدی کے سامنے پھٹ پڑنے والا آتشیں مادہ ڈال دیا جاتا ہے اور لگایا ہوا الزام قبول نہ کرنے پر اس کے اوپر چلنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

• قیدیوں کو کچھ دیر کے لیے سخت گرم پانی سے بھرے ہوئے حوض میں رکھا جاتا ہے اور پھر نکال کر اسی لمحہ اوپر سے برف کا ٹھنڈا پانی ڈال دیا جاتا ہے۔

• دروازے کے کواڑ پر ہتھیلی رکھ کر دوسرا کواڑ سختی سے بند کر دیا جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں ہتھیلی ٹوٹ جاتی ہے یا بری طرح کچل کر ہمیشہ کے لیے بیکار ہو جاتی ہے۔

• قیدی کو قتل کی دھمکی دی جاتی ہے اور کسی وحشتناک مقام پر زندہ درگور کرنے کی دھمکی دی جاتی ہے۔ ●●●

(ماہنامہ ہجرت نومبر دسمبر ۱۹۸۳ء)

بقیہ مغربی اقدار و ثقافت

اپنے ملک میں حالت تو ہمارے سامنے ہے، جس پر تفصیلی روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ آج زندگی کے ہر شعبے میں ہم اس کا خمیازہ بھی بھگت رہے ہیں، انفرادی اور اجتماعی تمام زندگیاں بہیمیت کی راہ پر چل پڑی ہیں۔ اب تو مغربی ارباب تفکر اور ماہرین سماجیات خود یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ہمارا تمدن آج غلط شاہراہ پر چل پڑا ہے، جس کی وجہ سے ایک بہترین سماج جس کے اندر حقیقی سکون و راحت، بھائی چارہ، انسانیت ہو، پیدا نہیں ہو پا رہا ہے۔ ●●●

نعت

تابش حجازی مئوناتھ بھنجن

اللہ رے یہ رفعت و یہ شانِ محمدؐ　　قرآں میں خدا خود ہے ثناخوانِ محمدؐ
رحمت کی گھٹا، زلفِ پریشانِ محمدؐ　　ہے شمعِ حرم عارضِ تابانِ محمدؐ
بے چون و چرا اپنا حدیثوں پہ عمل ہے　　اللہ کا فرمان ہے فرمانِ محمدؐ
بوبکرؓ و عمرؓ حضرتِ عثمانؓ و علیؓ سب　　یہ چاروں ہیں گلہائے گلستانِ محمدؐ
ہو جائیں جو ہم سنت و قرآن کے پیرو　　ہوں عرش نشیں پھر یہ غلامانِ محمدؐ
وہ دل نہیں، سینے میں ہے اک لعل بدخشاں　　جس دل میں کہ ہے الفت و ارمانِ محمدؐ
ہجرت کی وہ شب اور وہ کفار کی یورش　　کیا خوف؟ خدا جب ہے نگہبانِ محمدؐ
بے رنگ ہیں اب یہ مہ و خورشید کے جلوے　　ہے میری نظر میں رخِ تابانِ محمدؐ
وہ دین ہو، دنیا ہو کہ ہو رنج و مسرت　　ہر حال میں ہو پیشِ نظر شانِ محمدؐ
کیا شانِ رسالت ہے کہ موسیٰ کے لیے بھی　　چارہ نہیں جز طاعتِ فرمانِ محمدؐ

کونین میں تابش یہ تجلی ہے اسی کی
ہے نور فشاں شمعِ فروزانِ محمدؐ

بیٹوں کے ہاتھوں باپ کی پٹائی! کناڈا کے دارالحکومت اٹاوہ کے نفسیاتی مرکز نے یہ تحقیق نشر کی ہے کہ ۱۵ فی صد لڑکے اپنے باپ کی بڑی سختی اور سنگدلی کے ساتھ پٹائی کرتے ہیں۔ ان لڑکوں کی عمر ۱۷ اسے ۲۱ سال ہوتی ہے۔ یہ نہایت مالدار اور ترقی یافتہ گھرانوں کے لڑکے ہیں۔

(الاصلاح دبئی شمارہ ذی الحجہ ۱۴۰۳ھ)

نوٹ:- یہ مادی جنت کا ایک عملی تحفہ ہے۔

جماعت وجامعہ

جوار رحمت میں

مولوی محمد الیاس صاحب

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سپرد قلم کی جارہی ہے کہ جماعت کے ایک اہم ذمہ دار، جامعہ کے رکن رکین اور بنارس کے ایک اہم عوامی رہنما جناب مولوی محمد الیاس صاحب (بیٹھک مدنپورہ) ایک مختصر اور معمولی علالت کے بعد ۱۵ اور ۱۶ مارچ ۸۴ھ کی درمیانی رات (شب جمعہ) کو حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، جمعہ کے بعد نماز جنازہ ادا کی گئی اور تدفین عمل میں آئی۔ شرکائے جنازہ کی اتنی کثرت تھی کہ ہر طرف انسان ہی انسان نظر آتے تھے، بڑی تعداد میں لوگوں نے ازخود دکانیں اور کاروبار بند کر رکھے تھے، اور ہر مکتب فکر کے لوگ سوگوار تھے، غیر مسلموں کی بھی ایک خاصی تعداد آخری دیدار اور شریک تدفین ہونے کے لئے حاضر تھی۔

موصوف مدنپورہ بنارس کی مشہور لائبریری سعیدیہ کے سکریٹری بھی تھے، اپنی خوش طبعی اور بے لوث خدمات کے سبب مسلم اور غیر مسلم ہر طبقے میں مقبول اور ہر دلعزیز تھے۔ اللہ کروٹ کروٹ اپنی رحمتوں سے نوازے۔ اور لغزشوں سے درگذر فرمائے۔ آمین۔

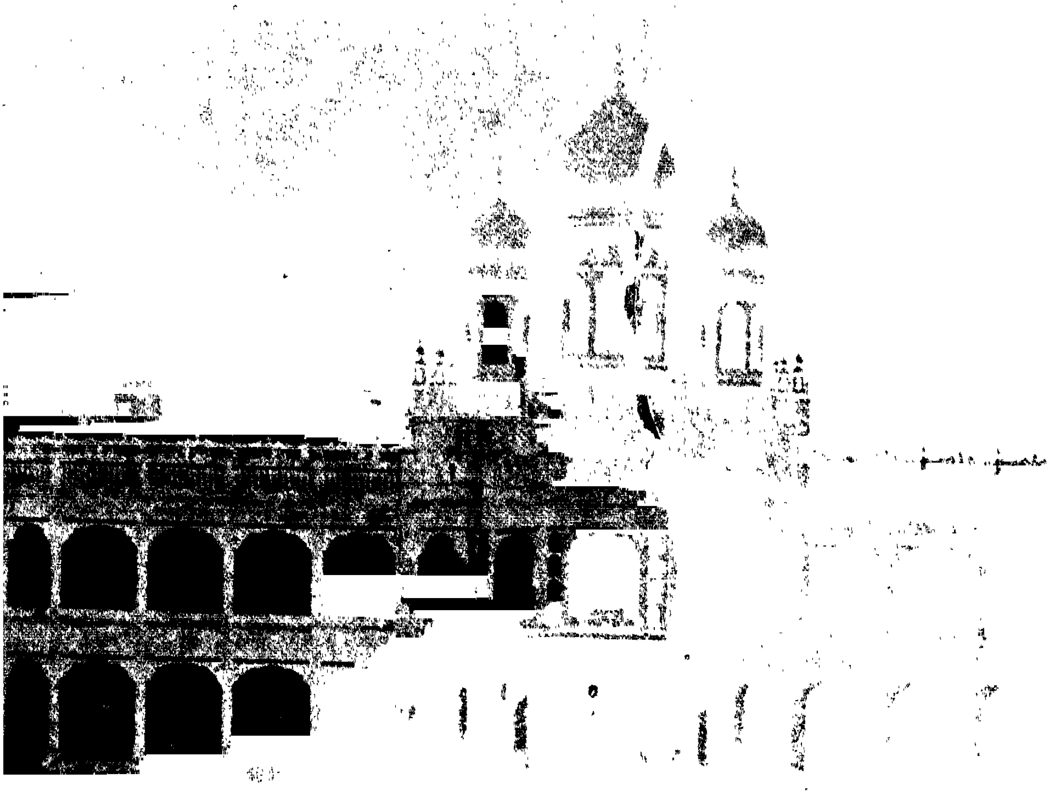
عبد الجلیل صاحب (گونڈہ)

ہمارے جامعہ کے نو عمر اور نوخیز استاد مولانا عبد المعید صاحب فاضل مدینہ یونیورسٹی کے والد بزرگوار جناب عبد الجلیل صاحب ایک طویل علالت کے بعد ۱۲ مارچ ۸۴ء بروز دوشنبہ بوقت صبح انتقال کر گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالی مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور عفو و مغفرت کا معاملہ فرمائے آمین۔

APR. **MOHADDIS** 1984

THE ISLAMIC CULTURAL & LITERARY MONTHLY MAGAZINE
AL-JAMIATUS SALAFIAH (AL-MARKAZIYAH) VARANASI (INDIA)

Published from Markazi Darul-Uloom
Printed by Abdul Waheed
At Salafiah Press, Reori Talab, Varanasi.



برگ وبار

صفحہ

جامعہ سلفیہ کا علمی ادبی اور اصلاحی رسالہ

ماہنامہ

بنارس

شعبان المعظم ۱۴۰۴ھ

مئی ۱۹۸۴ء

جلد: ۳ شمارہ: ۵

ترتیب

صفی الرحمن مبارکپوری

بدلِ اشتراک

- سالانہ : ۲۵ روپے
- ششماہی: ۱۳ روپے
- فی پرچہ: ۲/۵۰ روپے
- بیرونِ ملک سے سالانہ: ۱۵ ڈالر

(۵)

تزئین وکتابت

• ناشر: جامعہ سلفیہ بنارس • طابع: عبدالوحید • مطبع: سلفیہ پریس بنارس

پتہ

خط وکتابت کے لیے: ایڈیٹر محدث، جامعہ سلفیہ ریوڑی تالاب، بنارس

بدلِ اشتراک کے لیے: مکتبہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، بنارس

MAKTABA . SALAFIA . REORI TALAB . VARANASI.221010

ٹیلی گرام: دارالسلام وارانسی ٹیلی فون: ۶۳۵۷۷

بچوں کیلئے

ترانہ

شوق اعظمی

الفت کی پھونک دے تو اک روح جان و تن میں
بے خود رہیں ہمیشہ یارب تری لگن میں
توفیق دے ہمیشہ اچھے عمل کی ہم کو
بازو بھی ہوں توانا چستی بھی ہو بدن میں
شام و سحر زباں سے وحدت کے گیت گائیں
نغمہ سرا ہو بلبل جس طرح سے چمن میں
رحمت خدا کی ہردم کرتی رہے حفاظت
زندہ رہیں جہاں بھی ہم شہر یا کہ بن میں
بے داغ ہو سراسر یہ زندگی ہماری
خلوت میں ہم رہیں یا لوگوں کی انجمن میں
مرنے کے بعد تربت گلزار ہو ہماری
حسنِ عمل کی خوشبو لیجائیں ہم کفن میں
بے خود بنادے ہم کو ہر وقت شوقؔ تیرا
الفت تری بسی ہو ہردم ہمارے من میں

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نقش راہ

زہر خر منے خوشہ یافتم

کہا جاتا ہے کہ "سفر وسیلۂ ظفر ہے"۔ اس کہاوت کی سچائی یا جھوٹ کا عملی تجربہ ان لوگوں کو بار بار ہوتا ہے جو بار بار اس جہانِ رنگ و بو اور اس دنیائے کاخ و کو کا چکر لگاتے ہیں۔ راقم الحروف نے بھی ابھی قریب میں ایک ایسا ہی مختصر سا سفر کیا۔ میری اصل منزلِ مقصود تو دہلی تھی لیکن ۲۰ / مارچ کی شب ضلع ایٹہ کے ایک قصبے جلیسر میں ایک جلسے کے لیے گزارنی تھی۔ ارادہ تھا کہ جلسے سے فارغ ہوکر ۲۱ / مارچ کی صبح پھر دہلی لوٹ جاؤں گا۔ مگر یہاں کی دنیا خاصی نرم خرام تھی۔ بمشکل ساڑھے دس بجے علیگڑھ پہنچ سکا، اور اس وقت مقصد کے لحاظ سے قدم آگے بڑھانا فضول تھا۔ اس لیے خیال ہوا کہ یہیں احباب اور بزرگوں کی مجلس میں چند گھنٹے گزار لوں۔ اور سرِ شام دہلی چلا جاؤں گا۔ مگر قدرت کی طرف سے رات بھی یہیں گزارنی مقدر تھی۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی دنیا میرے لیے برسوں سے مانوس ہے۔ یہاں میں نے اگرچہ نہ تعلیم حاصل کی ہے نہ لمبا قیام کیا ہے، لیکن کئی زیر و بم دیکھے ہیں۔ جن کے نقوش لوحِ حیات پر اب بھی ثبت ہیں اور کشاں کشاں اپنی کوچہ گردی پر مجبور کردیتے ہیں۔ شہر کی ہماہمی سے نکل کر یونیورسٹی کے حدود میں قدم رکھا تو حسبِ معمول ایسا محسوس ہوا کہ زندگی کے سارے ہنگامے ختم ہوگئے ہیں اور وہ "فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے" کا سماں ہے۔ پہلی منزل "ادارہ تحقیقاتِ اسلامی" تھی۔ مولانا جلال الدین انصر عمری حفظہ اللہ سے کوئی پانچ برس قبل ایک بار مالابار کی روشنی میں مختصر سی ملاقات ہوئی تھی۔ اب اتنے عرصے بعد ملاقات ہوئی تو پہلی نظر میں پہچان نہ سکا۔ پھر وہیں عزیز گرامی محمد مسعود عالم قاسمی اور مولانا سلطان احمد اصلاحی صاحبان سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہاں سے فرصت پاکر مولانا محمد تقی امینی (ناظم سنی دینیات علی گڑھ یونیورسٹی) کی خدمت میں جانے کا ارادہ تھا اور یقین تھا کہ اس وقت وہ اپنے دفتر میں ملیں گے۔ مگر چند ہی لمحوں بعد صحن میں ان کی مانوس آواز سنائی پڑی۔ میں نے نکل کر

سلام کیا تو بے ساختہ ملاقات کا ہنگامۂ مسرت بپا ہو گیا۔ پھر کیا تھا۔ مولانا عمری صاحب کے پاس دلچسپ مجلس جمی۔ بعد میں مولانا امینی صاحب کے ساتھ ان کے دولت کدے پر دوپہر کا کھانا کھا کر دیر تک تبادلۂ خیالات کرتا رہا۔ دھیرے دھیرے ہم دونوں نے اپنی اپنی منزل کی راہ لی مولانا اپنے دفتر تشریف لے گئے اور میں اپنے دیرینہ رفیق جناب عبدالمنان صاحب کے پاس سمن زار جامعہ اردو روڈ پہنچا۔ رات یہیں بسر کرنے کی نوبت آئی۔ (ایم ایم ہال (محسن الملک مہدی علی خاں ہال) کی مسجد سے نمازِ عشاء پڑھ کر نکلتے ہوئے محترم ڈاکٹر محمد معین صاحب فاروقی سے ملاقات ہو گئی۔ موصوف سائنسی علوم میں اپنی مہارت کے لیے خاصا شہرہ رکھتے ہیں اور مسلکاً اہلحدیث ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں اسلام آباد (پاکستان) میں سائنس اور اسلام کے موضوع پر جو بین الاقوامی اجتماع ہوا تھا اور جس میں عالم اسلام کو سائنسی حیثیت سے بقیہ دنیا کے ہم پلہ بنانے کے لیے نہایت وسیع مربوط اور طویل المیعاد منصوبے اور نقشے سوچے اور تیار کیے گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف صرف یہی نہیں کہ اس میں تشریف لے گئے تھے۔ بلکہ قرآن اور سائنس کے موضوع پر اتنا وقیع مقالہ پیش کیا تھا کہ وہاں پر تبصرہ کرنے والے نے کہا کہ ہندوستانی مسلمان سائنسی علوم کے میدان میں پاکستان سے بھی آگے نظر آتے ہیں۔ موصوف سے کچھ "اجالے" اور کچھ "اندھیرے" میں دیر تک اظہارِ خیال ہوتا رہا اور کئی موضوع زیر گفتگو آئے۔ ان سطور کا مقصود روادادِ سفر نہیں بلکہ ان ہی گفتگوؤں کے بعض حصے ہیں۔

"تنظیمات کا المیہ" پر گفتگو

یاد ہوگا کہ محدث فروری ۱۹۸۴ء کے شمارے میں ہم نے جو اداریہ سپردِ قلم کیا تھا اس کا عنوان تھا "تنظیمات کا المیہ"، اس اداریے میں مسلمانوں کی اجتماعی حیثیت اور ہیئت کے متعلق اسلام کے جو احکامات ہیں اور تنظیمات اور جمعیتوں کی رقیبانہ کشمکش نے اس کی بجائے باہمی تعلقات کی جو ناگوار صورت برپا کر رکھی ہے ہم نے ان دونوں کی نشاندہی کرتے ہوئے مخلصینِ امت سے گزارش کی تھی کہ اس کے علاج کی تدبیر سوچیں۔ مولانا امینی نے اس اداریے پر کھل کر اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا بلکہ انھوں نے — شاید حوصلہ افزائی کے لیے — اس حد تک سراہا کہ ندامت سی محسوس ہونے لگی۔ دوسرے رفقاء کی ملاقاتوں سے بھی اندازہ ہوا کہ انھوں نے اس آواز کو وقت کی اہم اور ضروری آواز سمجھا ہے۔ اور عام مسلمانوں کے علاوہ اسلام پسند مفکرین اور دانشوروں نے بھی اسے بروقت آواز قرار دیا ہے۔

یہ بات اگرچہ ہمارے لیے بڑی اطمینان بخش ہے کہ جو مسلمان امت کی وحدت اور فلاح کی باتیں سوچتے ہیں انھوں نے اس کلمۂ حق کو بڑی فراخدلی کے ساتھ اپنے ذہن بلکہ دل میں جگہ دی۔ تاہم کچھ دوسرے مقامات اور افراد کی جانب سے ایک دوسرا ہی ردعمل سامنے آیا۔ جو افسوسناک اگرچہ ہے لیکن حیرت ناک نہیں ہے۔ بلکہ ہم نے جو کچھ کہا تھا ٹھیک اسی کی تصدیق ہے

کہ "اسلام پر تنقید اور قرآن و رسول کی توہین پر تو رگِ حمیت کچھ زیادہ نہیں پھڑکتی مگر اپنی تنظیم کے قائدو رہنما پر یا اراکین و متعلقین پر یا اصول و ضوابط پر ہلکی سی تنقید بھی ہو جائے تو قیامت ٹوٹ پڑتی ہے ۔" چنانچہ بعض حضرات نے اس پر بڑی بحث لے دے مچائی ۔ بعض مجالس میں زبانی کشتیاں ہوئیں ۔ اور بعض حضرات نے نہایت بھونڈے انداز میں طنز و تعریض کے تیر و نشتر استعمال کیے اور دل کھول کر ناوک فگنی کی ۔ البتہ سنجیدہ اور معقول انداز سے کسی نے اس کی تردید کی ضرورت نہیں سمجھی ۔ ان حضرات سے ہماری گزارش ہے کہ ایک مرتبہ آپ پھر ان آیات و احادیث پر نظر ڈالیے، جس میں اسلامی رشتۂ اخوت کی یکجہتی اور اہمیت مختلف انداز سے سمجھائی گئی ہے اور غور فرمائیے کہ ان اسلامی احکام و ہدایات کے سلسلے میں آپ کس جگہ کھڑے ہیں اور کیا آپ کا طرزِ عمل اس حقیقت کا شاہد عدل نہیں ہے کہ اپنی تنظیمی حدبندیوں کے سبب بہت سی ایسی باتیں اپنے لیے روا رکھی ہیں ۔ بلکہ لازم کر لی ہیں ۔ جس کا جواز اسلامی ہدایات کے اندر کہیں نظر نہیں آتا ۔ پھر اسے تنظیمات کا المیہ نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ جو تنظیمات خدمتِ اسلام کے مقصد سے ـــ یا کم از کم اسی مقصد کا اظہار کر کے ـــ وجود میں لائی گئی تھیں ، یہی تنظیمات عین اس مقصد کے برعکس نتیجہ دے رہی ہیں اور اسلام کی "خدمت" کے ساتھ ساتھ اس کی "مرمت" بھی کر رہی ہیں ۔

مجھے اس بات کا قطعی اعتراف ہے کہ امتِ مسلمہ جن حالات سے دوچار ہے ، ان کے پیشِ نظر کسی فقہی فرقے یا تنظیمی جمعیت کا محض وجود قابلِ ملامت نہیں گردانا جا سکتا ۔ مگر اگر یہ وجود کتاب و سنت کی خدمت کے بجائے امت کے افتراق و انتشار اور انارکی و ابتری کے تابوت میں ایک اور کیل ٹھونکنے کا ذریعہ بن جائے تو بتلایئے کہ اسے کیونکر پسندیدہ قرار دیا جا سکتا ہے ۔ میں نے جو کچھ عرض کیا تھا ، اس کا منشا یہی تھا کہ ہمیں موجودہ انتشار کی آگ پر تیل ڈالنے کے بجائے پانی ڈالنے کی تدبیر کرنی چاہیے ۔ واللہ ولی التوفیق ۔

... ...

اسلام ، سائنس اور مسائلِ جدیدہ

محترم ڈاکٹر معین فاروقی صاحب سے گفتگو کا موضوع زیادہ تر ان کا اپنا فن تھا یعنی موجودہ سائنسی تحقیقات و اکتشافات نے قرآن و حدیث کے بہت سے بیانات کی جس طرح تصدیق کی ہے بلکہ اس کے خدائی اور الہامی احکامات اور فقروں کے اندر پوشیدہ دنیائے اسرار و رموز کو سائنس نے جس طرح واشگاف کیا ہے وہ ہمارے مطالعے کی خاص مستحق ہے ۔ اس سے صرف یہی نہیں کہ ایمان و یقین کی دنیا میں تازگی و بالیدگی اور بہار آتی ہے اور عزائم کو غذا ملتی ہے

بلکہ اسے غیر مسلم اہل فکر وتحقیق کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے کے لیے ایک اہم بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس بارے میں اصل مشکل کا اظہار بڑے لطیف انداز میں کیا۔ انھوں نے فرمایا کہ ابتدا ہی سے اس معاملے میں سب سے بڑی دشواری رہی ہے کہ آپ لوگ (علماء) جو زبان بولتے ہیں اسے ہم نہیں سمجھتے اور ہم جو زبان بولتے ہیں اسے آپ نہیں سمجھتے۔ چاہیے کہ علماء اور جدید علوم کے ماہرین میں تقارب اور تبادلۂ افکار ومعلومات ہو۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ میں شاہ عبدالقادر کے ترجمے کے ساتھ قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے اس آیت پر پہنچا جس میں ذکر ہے کہ اللہ خون اور گوبر کے درمیان سے دودھ نکالتا ہے تو میں رک گیا کہ اس میں تو ایک بڑی سائنسی حقیقت بیان کی گئی ہے۔ قرآن مجید بند کردیا اور دوران خون، ہضم غذا اور دودھ کی پیدائش کے نظام کی جو تفصیلی تحقیقات سائنس نے کی ہیں ان کا مطالعہ شروع کردیا ان دونوں کے تقابل سے جو حقیقت سامنے آتی ہے وہ اس بات پر قناعت کے لیے کافی ہے کہ یہ قرآن قطعاً الہامی کتاب ہے یہ چودہ سو برس پرانے کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا کہ اس وقت کسی کی رسائی میں وہ حقائق تھے ہی نہیں جو اس کتاب میں بیان کیے گئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے حسرت کا اظہار کیا کہ ہمارے پاس سائنس کی جو تفصیلات ہیں اس کی بابت ہمیں یہ علم نہیں کہ قرآن واحادیث میں کیا ہے۔ اور جنھیں قرآن واحادیث کا علم ہے انھیں اس کی خبر نہیں کہ سائنسی تحقیقات کیا ہیں۔ اگر دونوں فریق مل کر کام کریں تو ایک جامع خاکہ تیار ہوسکتا ہے۔

انھوں نے اس کے لیے بطور نمونہ فرانسیسی محقق موریس بکائی کی کتاب بائبل قرآن اور سائنس کا حوالہ دیا، اور اس کے مطالعے کی ترغیب دلائی۔ ہمیں خوشی ہے کہ ڈاکٹر صاحب اس میدان میں افادے کے لیے تیار ہیں اور ہم بھی حسب مقدور اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے مستعد ہیں۔ خدا کرے ہماری یہ آرزو وجود کا جامہ پہن سکے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس موقع پر اس بات پر بھی زور دیا کہ گروہ بندیوں سے الگ ہوکر بے لاگ تحقیق کے ساتھ اسلامی شریعت کے مسائل کا جواب خالص کتاب وسنت کی روشنی میں دیا جائے تو یہ اسلام کی صحیح خدمت ہونے کے ساتھ ساتھ ان شاء اللہ بہت ساری پیچیدگیوں کا نہایت صحیح حل بھی ہوگا۔ اس سلسلے میں ہمیں اپنے ایک اہل محترم جناب عبداللطیف صاحب اعظمی کا بھی ایک اہم گرامی نامہ دستیاب ہوا ہے۔ موصوف جامعہ ملیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور ماہنامہ جامعہ اور سہ ماہی "اسلام اور عصر جدید" میں اپنی خصوصی حیثیت اور اپنے بہت سے اوصاف اور خوبیوں کی وجہ سے ہند و پاکستان کے علمی حلقوں میں اچھی طرح متعارف ہیں۔ خط وکتابت کی بنیاد ایک استفسار تھا جس کا تعلق پوتے کی میراث سے تھا۔

موصوف نے اپنے موجودہ مکتوب میں مسلم پرسنل لا، اور متبنٰی بل کے سلسلے میں بعض اہم پہلوؤں کی طرف اشارہ کرنے کے علاوہ محدث جنوری ۱۹۸۴ء کا حوالہ دیتے ہوئے رقم فرمایا ہے کہ

"مجھے آپ کا یہ اصول یا موقف پسند آیا کہ : "امت مسلمہ کی گروہ بندیوں سے علیحدہ اور بالاتر ہو کر خالص اسلامی تعلیم پیش کرے اور اسلام کے اصل سرچشموں یعنی کتاب و سنت سے عقائد و احکام کے سلسلے میں جو کچھ ثابت ہے اسے وضاحت اور ثبوت کے ساتھ کسی گروہ، جماعت یا فرقے کی جانبداری کے بغیر پیش کرے۔" (ص ۱۸)

اس کے بعد موصوف رقمطراز ہیں :

"مجھے معلوم نہیں آپ مسلمانوں کے جدید مسائل کے بارے میں اسلام کی روشنی میں اپنا نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں یا نہیں۔ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی اور معاشرتی نظام پر اسلام کے نام پر جو مواد پیش کیا جا رہا ہے اس سے جدید تعلیم یافتہ اور مسلمانوں کا باشعور طبقہ مطمئن نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ موجودہ ضروریات اور حالات کے پیش نظر پوری غیر جانبداری کے ساتھ اسلام کے اصل سرچشموں کی مدد سے ان مسائل پر روشنی ڈالی جائے۔ اس میں شبہ نہیں کہ یہ کام خاصا مشکل ہے۔ لیکن اگر ماہنامہ "محدث" یہ کام انجام دینے کی کوشش کرے تو میرے خیال میں اسلام اور ہندوستانی مسلمان دونوں کی بڑی خدمت ہوگی۔"

(اقتباس از مکتوب ۲۹ مارچ ۱۹۸۴ء)

جہاں تک اس تجویز کا تعلق ہے اس میں شبہ نہیں کہ یہ ایک مفید اور بابرکت تجویز ہے۔ لیکن اس راہ میں اصل دشواری وہی ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یعنی ماہرین شریعت اور موجودہ مسائل کی پیچیدگیوں کے واقف کار ایک دوسرے کی زبان سے ناآشنا ہیں۔ اس لیے فریقین کے باہمی تبادلۂ افکار اور بحث و تمحیص کے بغیر اصل مقصد کے سلسلے میں کوئی مفید اور تسلی بخش پیش رفت مشکل ہے۔ ہم دعوت دیتے ہیں کہ ہمارے علماء اور دانشور مل کر یہ کار خیر انجام دیں۔ محدث کے صفحات اس کے لیے حاضر ہیں۔

●●

خرافات اور حقیقی مذہب؟

صوفی نذیر احمد کاشمیری

خرافات انسان کے ابتدائی اخلاقی و روحانی احساسات کو تمثیلات کے ذریعہ انسان کی گرفت میں لانے کا نام خرافات ہے اور موجودہ مذاہب میں اس کی سب سے واضح مثال برہمن ازم ہے۔ یہ مذہب کی سب سے قدیم شکل ہے۔ پھر انسان کے مذہبی احساسات جوں جوں قوی ہوتے جاتے ہیں توں توں خرافاتی لباس تحلیل ہوتا جاتا ہے اور یہ احساسات وہ شکل اختیار کرتے جاتے ہیں جنھیں شریعت کہا جاتا ہے۔ اس کی واضح ترین مثال مترو ازم ہے۔ اور اس کی سب سے واضح شکل اسلام ہے۔ اسے پیغمبر خدا نے ملۃ، سہلۃ، سمحۃ بیضا کہا ہے، جس کا معنیٰ "آسان بامروت اور روشن مذہب" ہے۔

جرمن مفکر سپنگلر نے اسلام کو آسان، پاکیزہ اور عام فہم مذہب بتایا ہے اور اس کی عالمگیری کا بنیادی سبب اسلام کی اسی سادگی، پاکیزگی اور عام فہم ہونے کو بتایا ہے۔

مگر میں کہتا ہوں کہ سپنگلر کے اس بیان کے صحیح مان لینے پر بھی اسلام کی عالمگیر قبولیت کا مرکزی سبب اس کا اخوتِ مومنانہ کا اعتقاد ہے جو انسان کو انسان سے ملانے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

اسلام سے پہلے کے مذاہب میں بھی انسانی بھائی چارے کا اعتقاد موجود ہے۔ مگر اس میں اخوت کی بنیاد صرف وحدتِ اعتقادی ہے بلکہ وحدتِ اعتقاد کے ساتھ ہی نسلی و خونی رابطے نے ان امتوں کی تعلیم میں مل کر کام کیا ہے اور نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس میں شرافت انسانی کی اخلاقی بنیاد واضح نہیں ہو سکی اور خالص نسلی امتیازوں کے جھگڑے کسی نہ کسی صورت قائم رہے اور اخلاقی احساسات کے کمزور ہو جانے سے یہ خونی رابطہ پھر ابھر کر سامنے آ جاتا رہا اور انسان و حیوان کی امتیازی لائن کو ملیامیٹ کرتا رہا۔

لیکن پیغمبر اسلام نے شرافتِ انسانی کی اخلاقی بنیادوں کو اس درجہ واضح کر دیا ہے کہ انھیں ملیامیٹ کرنے

کی سارے جنودِ ابلیسی کو مل کر بھی توفیق نہیں ہوسکتی ۔ اسلام دینِ انسانی کی سب سے آخری سب سے کامل اور سب سے وسیع و عالمگیر شکل ہے اور اس کی اس ہمہ گیری کی ساری بنیاد اس کا اخوتِ مومنانہ کا اعتقاد ہے ۔

اخوت کی ہمہ گیری انسانی معاشرے میں سب سے بلند درجہ انہی انبیا کا ہے ۔ « بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر » اسلام سے سابقہ مذاہب میں انبیاء ہی کا عہدہ وہ چیز تھی جہاں دنیا کی اقوام توحید خدا کی حدود کو مسمار کرتے ہوئے انبیاء کو اللہ کا مظہر قرار دے کر اپنا معبود قرار دے لیتی تھیں، مگر اسلام نے اخوتِ مومنانہ پر اتنا زور دیا کہ قرآن مجید میں ایک درجن سے زیادہ مقام پر انبیاء کے نام کے ساتھ بھائی کے لفظ کو نتھی کر دیا ہے ۔ " إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ " وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ هُودًا " ۔ تقریباً اکثر انبیاء کے نام کے ساتھ اخوت کا لفظ آپ کو نتھی کیا ہوا ملے گا اور ان سب پر " إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ " کا سہرا غلاف لپٹا ہوا آپ کو ملے گا ۔

حیوانات کی ساری قدر و قیمت خونی و وطنی بنیاد پر ہے ۔ مثلاً عربی گھوڑا اور غیر عربی گھوڑا ، عام ہرن اور خطا و ختن کا ہرن ، عام بھینس اور روہتک کی بھینس ، عام گائے اور ناگوری گائے ۔ غرض کہ حیوانات کے تمام سلاسل کی قدر و قیمت کا دارومدار خونی و نسلی اور انہی مواقع پر وطنی رابطے پر ہے ۔ مگر انسانی شرافت و کرامت کا دارومدار صرف اخلاق کردار پر ہے اور نسلی و خونی رابطہ کا یہاں کوئی اعتبار نہیں ہے ۔

حضرت نوح نے جب اللہ تعالیٰ سے اپنے بیٹے کے لیے سفارش کی اسے اپنا اہل بتایا تو اللہ نے ان کی اس دلیل کو رد کر دیا اور ایک قسم کی تہدید کی ۔ حضرت ابراہیم کو والد کے لیے دعائے مغفرت کرنے سے روک دیا گیا ۔ خود حضرت خاتم الانبیاء کو بھی اپنی والدہ کے لیے دعائے مغفرت سے روک دیا گیا ، اس لیے کہ یہاں وحدتِ خون و نسل کے باوجود وحدتِ اخلاق کا نام و نشان بھی نہ ہے لہذا دونوں کو ایک صف میں لانے کا امکان نہیں ہے ۔ غرض کہ شرافتِ انسانی کا سارا دارومدار اخلاقی کردار پر ہے نسل و وطن پر ہرگز نہیں ہے ۔

ٹھیک اسی بنیاد پر اسلام نے سب انسانیت کو اصولاً ایک امت قرار دیا ہے ۔ سب افرادِ انسانی مشترک اخلاقی فطرت رکھتے ہیں ۔ ایک امت قرار دیا ہے ۔ " إِنَّ هَٰذِهِ أُمَّتُكُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً وَأَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُونِ "

مذہب کی متعین شکل کے متعلق یہ بیان سامنے رکھنا از حد ضروری ہے تاکہ مذہب اور خرافات ، بدعت و سنت اور توحید و شرک کی حدود واضح رہیں ۔

تجدید حضرت خاتم الانبیاء سے پہلے مذہب میں بگاڑ آجانے کے بموجب اصلاح کی ضرورت ہوتی تھی ۔

[...] لیے اللہ پاک کسی نبی کو بھیجتا تھا اور وہ دین کو دوبارہ اپنی شکل پر قائم کرتا تھا۔ اس کی سماعت و اطاعت فرض ہوتی تھی بلکہ شریعت کا سارا نظام اسی کی شخصی اطاعت پر ہوتا تھا۔ ایک نبی اپنے سب امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں "مطاع باذن اللہ" ہوتا ہے وہ نہ صرف دین کو دوبارہ قائم کرتا ہے بلکہ خود شرعی حدود کو دوبارہ قائم کرتا ہے۔

تکمیلِ دین

چوں کہ حضرت خاتم الانبیاء پر دین و شریعت دونوں کمال کو پہنچ گئے ہیں اور چوں کہ کمال کے بعد اضافے اور ترمیم کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ لہٰذا اب امت دین کے ہر بگاڑ کا علاج صرف تجدیدِ دین ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ دین و شریعت نے دعوتِ محمدی میں جو شکل اختیار کی ہے اسے اپنا ہمہ وقتی معیار اور ماڈل مان کر معاشرے کی بھول چوک اور افراط و تفریط کا علاج کیا جائے اور اب کسی بھی شخصی دعوے کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اب تو صرف اتباع کا راستہ کھلا ہے۔ "لو کان موسیٰ حیاً ما وسعہ الا اتباعی"۔ موسیٰ بھی زندہ ہوتے تو میرے اتباع کے سوائے ان کے لیے اور کوئی راستہ کھلا نہ ہوتا۔ (ح)

چنانچہ روایاتِ اسلام اسی بات پر متفق ہیں کہ جب حضرت مسیح دنیا میں تشریف لائیں گے تو وہ شریعتِ محمدی کا اتباع کریں گے وہ اپنی شریعت پر یا اپنے اجتہاد پر عمل نہ کریں گے۔ اس لیے کہ شریعت و دین کی حضرت خاتم الانبیاء پر تکمیل ہو چکی تھی اور اب ساری کائناتِ انسانی کیلئے یکساں نظم و نسق کی ضرورت ہے اور وہ اسلامی شریعتِ عالمگیر کے ذریعہ قائم ہوگا۔ وقتی مسائل کو اجتہاد و باہمی مشاورت سے حل کیا جائے گا۔

تجدیدِ دین اور خرافات کا تعلق

انسان کبھی بھی تصورِ خالق اور تصورِ عاقبت سے خالی نہیں رہا۔ ماضی کے ابتدائی جھٹپٹے Twilight میں بھی یہی انسان کو جب پیٹ کے دھندے سے فرصت ملتی تھی تو وہ مختلف اخلاقی تپ تپسیا میں عاقبت کی تیاری میں لگ جاتا تھا۔ آثار قدیمہ کی تحقیقات اس میں کوئی شک نہیں چھوڑتیں۔ اس تپ تپسیا کے علاوہ ہمیں اسی ابتدائی تاریخ میں انسان اپنے آباء و اجداد کی قبروں میں یا ان کے اردگرد کچھ ایسی رسوم ادا کرتا دکھائی دیتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے آباء کی آئندہ زندگی کے لیے کچھ سہولتیں مہیا کرتا ہے۔ ایسے ہی وہ مختلف ہیبت ناک مظاہرِ قدرت کو اپنا مرجع امید و بیم مان کر اپنی حاجت روائی کی تدبیر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ہے اس کے ابتدائی ایمان باللہ کا ثبوت۔ یہ ہے دینِ مبین کے مقابل خرافات کی حیثیت۔ وہ انسانی ظن و تخمین کے اندازے ہیں جو انسان بطور خود خالقِ کائنات کے متعلق اور حیاتِ اخروی کے

متعلق قائم کرتا ہے۔ وہ عالمِ خلق میں قیدی انسان کے عالمِ امر کے متعلق اندازے ہیں۔ اور متعین مذہب عالمِ امر کے دار الیقین کی طرف سے خالقِ برحق کا اور حیاتِ اُخروی کا واقعاتی اظہار ہے، جس میں شک و ظن و تخمین کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

تجدیدِ دین کا معنیٰ اور تجدید دین کا مفہوم یہ ہے کہ عالمِ امر کے یقینیات کی روشنی میں عالمِ خلق کے کاروبار کو درست کرنا۔ اسی نقطۂ نظر سے دُنیا عاقبت کے لیے صرف ایک مزرع کی حیثیت رکھتی ہے اور اسی حیثیت سے دنیا کو قبول کرنا انسان کو ہزار بلاؤں سے نجات دیتا ہے۔ سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ چونکہ اس نقطۂ نگاہ سے دنیا کو مقصودِ حیات قرار دینے کا امکان نہیں رہتا۔ لہٰذا تمام وہ جھگڑے قدرتاً ختم ہو جائیں گے جو دنیا کو مقصدِ حیات قرار دینے سے پیدا ہوتے ہیں۔

کائناتِ انسانی کا دار الامن اور دار السلام ہونے کا اعتقاد اسی کا پھل ہے۔

لیکن عالمِ خلق کی تنگ گھاٹی میں بیٹھ کر خالقِ کائنات و عاقبت کے اندازے قائم کرنے سے خرافات کا سارا ملبہ تیار ہوتا ہے، جو یقینی و بے یقینی کی حدود کو مسمار کر دیتا ہے۔

اور چوں کہ انسان اس ظن و دماغی جمناسٹک سے شاید ہی کبھی پاک رہا ہو۔ لہٰذا وہ بہت جلد عالمِ خلق کے ظنیات و عالمِ امر کے یقینیات کو خلط ملط کر دیتا ہے اور دینِ حق میں بہت سے باطل تصورات کو ملا دیتا ہے۔

سابقہ امتوں میں حق و باطل کی حدود کو بار بار ممتاز کرنے کے لیے انبیاء آتے تھے۔ مگر شریعت و دین کی تکمیل کے بعد حق و باطل کے اس امتزاج کو صاف کر کے حق کو حق اور باطل کو باطل دکھانے کا کام ایک عملِ تجدید کہلاتا ہے اور اللہ پاک نے اس کے لیے مجددین کا سلسلہ قائم کر دیا ہے اور ہر صدی کے آغاز میں اللہ پاک نے اس کا سامان کر دیا ہے۔

مگر چوں کہ مجدد کا کام ایک واضح و طے شدہ راستے کی طرف بلانا ہوتا ہے، اُسے بطورِ خود کوئی چیز متعین کرنا نہیں ہوتی لہٰذا اس کے اظہار کی ضرورت نہیں ہوتی۔

چونکہ اسلام کے ملۃ، سہلۃ، سمحۃ، بیضا کے اصول و مبانی کے واضح ہونے کے باوجود خرافات کا کوڑا کرکٹ اس میں آ جاتا ہے، لہٰذا اس کی تجدید اسی چیز کو صاف کرنے کے لیے ہوتی ہے۔

اس صدی کی تجدیدِ عالمگیر: آج امت اسلامیہ اپنی مادی بقا کے لیے بھی ایک عالمگیر تجدید کے لیے مجبور ہے اور یہ کام بنیادی طور پر علمائے امت کو انجام دینا ہوگا لہٰذا اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق یہ سطور بحیثیت ایک مسلمان کے لکھی گئی ہیں۔ اور اسی حیثیت سے بغرض اشاعت و لائحے کے لیے جماعتِ اہلحدیث ہند کو بھیجا جا رہا ہے۔ ●●● ———

امام ابن جارودؒ صاحب المنتقی

متوفی ۳۰۷ھ/۹۱۹ء

مرتب: محمد حنیف عبدالرشید هندی
۳/ کلیۃ الحدیث الشریف
جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ

نسب اور کنیت:

آپ کا نام عبداللہ، کنیت ابو محمد اور سلسلۂ نسب یہ ہے: عبداللہ بن علی بن جارودؒ[1]

دت:

سنۂ ولادت کے تعیین کا علم نہ ہو سکا البتہ حافظ ذہبی آپ کی ولادت کے بارے میں رقمطراز ہیں: ولد فی
ود الثلاثین ومائتین[2] آپ دوسوتیس ہجری کے حدود میں پیدا ہوئے۔

ن: وطن مالوف نیشاپور ہے بنا بریں آپ نیشاپوری کہلاتے ہیں، لیکن مکہ مکرمہ کی مجاورت اختیار کرلی تھی۔

روئما:

آپ نے جس دور میں آنکھیں کھولیں وہ تاریخ حدیث میں عصر ذہبی (سنہرا زمانہ) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ زمانہ
شوونما کے لیے سازگار سے سازگار تر تھا۔ ہر چہار جانب علم حدیث کا چرچا تھا۔ دنیا کے گوشے گوشے میں علم حدیث کی
شنی پھیل گئی تھی۔ خوش قسمتی سے آپ کی ولادت بھی ایسے مبارک زمانے میں خاص کر نیشاپور جیسے شہر میں ہوئی جو
ہ ادارۂ علوم وفنون اور مرکز ثقافی کی حیثیت رکھتا تھا اور جلیل القدر محدثین کے نفوس پاک نے اسے مرجع خلائق بنا رکھا تھا
یے لازمی طور پر آپ نے بھی اس مقدس فن کی جانب توجہ کی اور باکمال اصحاب فن سے اکتساب فیض کیا۔

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ۷۹۴/۳
[2] سیر اعلام النبلاء ۲۳۹/۱۴

شیوخ :

چند شیوخ کے نام مندرجہ ذیل ہیں : ابو سعید اشج ۔ محمود بن آدم ۔ علی بن خشرم ۔ یعقوب بن ابراہیم دورقی ۔ عبداللہ بن ہاشم طوسی ۔ حسن بن محمد زعفرانی ۔ احمد بن ازہر ۔ محمد بن ابی عبدالرحمان مقری ، احمد بن یوسف سلمی ۔ محمد بن یحییٰ بن ابی اسحاق کوسج ، زیاد بن ایوب ، ۔ بحر بن نصر ۔ محمد بن عثمان بن کرامہ ۔ عبدالرحمن بن بشر ۔ محمد بن عبداللہ بن عبدالحکم امام ابن خزیمہ ۔

تلامذہ :

بعض تلامذہ کے نام یہ ہیں ۔ ابو حامد بن شرقی ۔ محمد بن نافع مکی ۔ یحییٰ بن منصور ، ۔ دعلج بن احمد سجزی ابوالقاسم طبرانی ۔ محمد بن جبریل عجیفی ۔ ابو بکر احمد بن عبداللہ بن عبدالمومن زیات ۔ حسن بن عبداللہ عادج زبیدی ۔ احمد بن تقی

حفظ و اتقان اور حدیث میں مقام :

آپ بلند پایہ محدث، حافظِ حدیث ، امام فن اور صاحب نقد تھے ، چنانچہ علامہ ذہبی آپ کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں : هو الحافظ الامام الناقد یعنی آپ حافظِ حدیث ، امام فن اور مرویات کے جانچ پرکھ کے ماہر تھے نیز فرماتے ہیں : وکان من العلماء المتقنين المجودين ۔ یعنی آپ صاحب ضبط و اتقان اور جید علماء میں سے تھے ۔ حاکم اور دیگر حضرات نے آپ کی مدح و منقبت کی ہے اور خراجِ تحسین پیش کیا ہے[2] حدیث میں آپ کے مقام کا اندازہ لگانے کے لیے صرف اس قدر کافی ہے کہ آپ کا شمار جلیل القدر محدثین میں ہوتا ہے ۔ جرح و تعدیل میں آپ کی ایک تالیف ہے اور آپ کی کتاب "المنتقی" بلند پایہ کتب حدیث کی صف میں شامل ہے ۔

وفات :

امام ابن جارود نے ۳۰۷ ہجری مطابق ۹۱۹ ء میں اس دارِ فانی سے کوچ کیا اور علم حدیث کا یہ روشن آفتاب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا ۔ سقى الله ثراه وجعل الجنة مثواه ۔

(نوٹ) سنہ وفات صاحب الرسالہ المستطرفہ نے ۳۰۶ ھ یا ۳۰۷ ھ تحریر کیا ہے اور ذہبی وغیرہ نے سنہ ۳۰۷ ھ رقم فرمایا ہے ۔ سن عیسوی کا ذکر صرف معجم المولفین اور اعلام زرکلی میں ہے ۔ لیکن اول الذکر میں ۹۱۹ء ہے اور آخر الذکر

---

[1] تذکرۃ الحفاظ ۳/۷۹۴ ، سیر اعلام النبلاء ۱۴/۲۴۰ ، مختصر طبقات علماء الحدیث ۱/ق ۹۶ ب

[2] تذکرۃ الحفاظ ۳/۷۹۴ و سیر اعلام النبلاء ، ۱۴/۲۴۰ ۔

میں ۹۲۰ء ہے[1]

تصانیف:

آپ کی تصانیف کے سلسلے میں صرف تین کتابوں سے آگاہی ہوسکی ہے، جو مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) المنتقی (۲) الجرح والتعدیل[2] (۳) کتاب التاریخ[3]

المنتقیٰ لابنِ الجارُود

اجمالی تعارف:

یہ امام ابن جارود کی مشہور و معروف تالیف ہے اور ان مہتم بالشان اور مستند کتابوں کی صف میں شامل ہے، جن کا محدثین کرام نے اعتبار کیا ہے اور جن کی حدیثوں سے احتجاج کیا ہے۔ اس کا پورا نام یہ ہے: "کتاب المنتقی من السنن المسندة عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"۔ یہ احکام و سنن سے متعلق احادیث کا ایک منتخب مجموعہ ہے جو ایک جلد میں ہے۔

سنن وہ کتابیں ہیں جو فقہی ابواب پر مرتب ہوں اور صرف احادیث مرفوعہ پر مشتمل ہوں۔ موقوف یا مقطوع حدیث ان میں نہ ہو کیونکہ موقوف اور مقطوع کو محدثین کی اصطلاح میں سنت نہیں کہا جاتا ہے بلکہ حدیث کہا جاتا ہے۔ اگر غیر مرفوع پائی بھی جائے تو ندرت کے طور پر (ملاحظہ ہو اصول التخریج ص ۱۳۱ ودراسة الاسانید للدکتور محمود الطحان) صاحب الرسالہ المستطرفہ رقمطراز ہیں کہ اس میں تقریباً آٹھ سو حدیثیں ہیں[4] لیکن اس کتاب کا جو نسخہ پاکستان سے چھپ کر شائع ہوا ہے اس کی حدیث شماری کے مطابق یہ کتاب ۱۱۱۴ حدیثوں پر مشتمل ہے۔

کتب احادیث میں اس کا مقام:

یہ کتاب کتب حدیث میں خاص حیثیت کی حامل ہے اس کی علمی قدر و منزلت کا اندازہ لگانے کے لیے اس قدر کافی ہے کہ صحیحین کے علاوہ خالص صحیح میں جو مجموعہائے احادیث قلم بند کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے اور

---

[1] تذکرة الحفاظ ۳/۷۹۴، ومعجم المؤلفین ۲/۸۷ والاعلام ۲/۵۶۹ والرسالہ المستطرفہ ۲۰

[2] مفتاح السنہ ۱۵۲، الجرح والتعدیل لابی لبابہ حسین ۱۶۳، بحوث فی تاریخ السنة المشرفة لاکرم ضیاء ۱۰۴

[3] کنز العمال ۱/۸ [4] الرسالة المستطرفہ ص ۲۰

انھی کی صف میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے جیسے صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن عوانہ اور صحیح ابن سکن وغیرہ۔ بلاشبہ مصنف نے اس کی تالیف میں دقتِ نظر سے کام لیا ہے۔ علامہ ابن عبدالہادی اس کے متعلق رقمطراز ہیں: ھو نظیف الاسانید[1] یعنی اس کی سندیں صاف ستھری ہیں۔ حافظ ذہبی رقم فرماتے ہیں لا ینزل فیہ عن رتبۃ الحسن ابدا الا فی النادر فی احادیث یختلف فیھا اجتھاد النقاد[2] یعنی مولف اس کتاب کے اندر (حدیثوں کے انتخاب میں) حسن کے درجے سے نیچے کبھی نہیں اترتے مگر نادر طور پر ان حدیثوں کے اندر جن میں ناقدین فن کے اجتہادات مختلف واقع ہوئے ہیں۔ کتانی کا بیان ہے: وتتبعت فلم ینفرد عن الشیخین منھا الا یسیر[3] یعنی اس کتاب کے تتبع اور جستجو سے پتہ چلا ہے کہ اس کی تھوڑی حدیثوں میں صحیحین سے تفرد کیا گیا ہے۔ سید عبداللہ ہاشم لکھتے ہیں: فالحفاظ یعتبرونہ فی درجۃ الموطا وصحیح ابن خزیمۃ و ابی عوانۃ وابن السکن والمستخرجات والعزو الیھا معلم بالصحۃ۔[4] یعنی حفاظ حدیث منتقی ابن جارود کا اعتبار موطا، صحیح ابن خزیمہ، صحیح ابن عوانہ، صحیح ابن سکن اور مستخرجات کے درجے میں کرتے ہیں۔ اور ان مذکورہ کتابوں کی طرف انتساب صحت کا پتہ دیتا ہے۔ علامہ ابن حزم کا خیال ہے کہ کتب حدیث میں سب سے اعلیٰ درجہ پر صحیحین ہیں پھر صحیح ابن سکن، منتقی ابن جارود اور منتقی ابن اصبغ کا مرتبہ ہے پھر ان کے بعد ابوداؤد، نسائی وغیرہ کی کتابوں کا نمبر ہے[5] شاہ عبدالعزیز صاحب کا بیان ہے کہ یہ کتاب گویا صحیح ابن خزیمہ پر مستخرج ہے۔ لیکن چونکہ اس میں اس کے اصول احادیث پر اکتفا کیا ہے، اس لیے اس کا نام منتقی رکھا[6]

بعض خصوصیات:

۱۔ ایک خصوصیت اسانید کی نظافت اور احادیث کی صحت ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ احادیث صحیحہ کی تعداد میں اضافہ ہو گیا ہے۔
۲۔ اس کی تھوڑی حدیثوں میں صحیحین سے تفرد کیا گیا ہے، جیسا کہ کتانی کا قول گذر چکا۔
۳۔ چونکہ یہ کتاب احکام میں ہے اس لیے احکامی روایات کی معرفت کراتی ہے
۴۔ یہ کتاب فقہی صلاحیت اور اجتہادی بصیرت ودیعت کرتی ہے۔

تخریج احادیث:

سید عبداللہ ہاشم یمانی مدنی نے اس کی حدیثوں کی تخریج کی ہے جس کا نام "تیسیر الفتاح الودود فی تخریج المنتقی

---

۱ مختصر طبقات علماء الحدیث ۱/ق ۹۶ ب ۲ سیر اعلام النبلاء ۲۳۹/۱۴ ۳ الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۰
۴ مقدمہ منتقی ابن جارود سید عبداللہ ہاشم ص ۵ ۵ تدریب الراوی ۱۱۰/۱ ۶ بستان المحدثین ص ۲۲۰

لابن الجارود ہے۔

شروح:

علامہ ابو عمرو اندلسی نے اس کی ایک شرح لکھی ہے جو "المرتقی فی شرح المنتقی" سے موسوم ہے [1]

اطراف:

حافظ ابن حجر کی ایک کتاب "اتحاف المہرۃ باطراف العشرۃ" آٹھ اجزاء میں ہے۔ یہ کتاب مندرجہ ذیل کتابوں کے اطراف پر مشتمل ہے۔ موطأ، مسند شافعی، مسند احمد، مسند دارمی، صحیح ابن خزیمہ، منتقی ابن جارود، صحیح ابن حبان، مستخرج ابی عوانہ، مستدرک حاکم، شرح معانی الآثار، سنن دارقطنی۔

زوائد:

محدث عصر علامہ ناصر الدین البانی نے اس کی حدیثوں کے زوائد قلمبند فرمائے ہیں جو "الحوض المورود فی زوائد منتقی ابن الجارود" کے نام سے موسوم ہے۔

یہاں ایک عدد کا اضافہ اس لیے کیا کہ مصنف کو صحیح ابن خزیمہ کا ایک چوتھائی حصہ دستیاب تھا [2]

(نوٹ) یہ کتاب (منتقی ابن جارود) ہندوستان اور پاکستان میں زیور طباعت سے آراستہ ہو کر شائع ہو چکی ہے۔

نمونۂ منتقی ابن جارود

باب فرض الوضوء

قال اللہ عزوجل: "یا ایہا الذین آمنوا اذا قمتم الی الصلاۃ" الآیہ

الدلیل علی ان ھذا علی بعض القائمین دون بعض:

۱۔ ما حدثنا عبد اللہ بن ہاشم قال ثنا یحیی ـ یعنی ابن سعید ـ ح و ثنا اسحٰق بن منصور، حدثنا عبد الرحمٰن بن مہدی جمیعاً عن سفیان عن علقمہ بن مرثد عن سلیمان بن بریدۃ عن ابیہ رضی اللہ عنہ قال: کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتوضأ عند کل صلاۃ، فلما کان یوم الفتح توضأ ومسح علی خفیہ فصلی الصلوات بوضوء واحد، فقال عمر رضی اللہ عنہ: یا رسول اللہ انک فعلت شیئاً لم تکن تفعلہ، قال "انی عمداً فعلتہ یا عمر" الحدیث لاسحٰق ولم یذکر ابن ہشام "ومسح علی خفیہ" ص ۱۱

---

[1] الرسالۃ المستطرفہ ص ۲۰۔ [2] ذیل تذکرۃ الحفاظ لابن فہد ص ۳۳۳۔

صفة صلاة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

۱۷۷ - حدثنا ابن المقرئ وهارون بن اسحاق ويوسف بن موسى، قالوا ثنا سفيان عن الزهري عن سالم عن ابيه رضي الله عنه انه رأى النبي صلى الله عليه وسلم اذا افتتح الصلاة رفع يديه حتى يحاذي منكبيه واذا اراد ان يركع وبعد ما يرفع رأسه من الركوع ولا يرفع بين السجدتين ۔ (ص ۶۹)

باب القراءة وراء الامام

(۳۲۱ حدثنا محمد بن يحيى قال ثنا احمد بن خالد، قال ثنا محمد بن اسحاق عن مكحول عن محمود بن الربيع عن عبادة بن الصامت رضي الله عنهما قال صلى بنا رسول الله صلى الله عليه وسلم صلاة الغداة فثقلت عليه القراءة فلما انصرف قال: انى اراكم تقرؤن وراء امامكم. قال قلنا اجل والله يا رسول الله هذا قال: فلا تفعلوا الا بأم القرآن فانه لا صلاة لمن لم يقرأ بها ۔ (ص ۱۸)

ترجمہ

وضو کی فرضیت کا باب:

اللہ عزوجل کا فرمان ہے کہ اے مومنو! جب تم نماز کا قصد کرو تو اپنا منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھوؤ اور اپنے سر کا مسح کرو اور اپنے پیروں کو ٹخنوں تک دھوؤ۔

اس بات کی دلیل کہ اس آیت میں وضو کا حکم بعض لوگوں کے لیے ہے جن کا وضو باقی نہ ہو۔ ان لوگوں کے حق میں نہیں ہے جن کا وضو باقی ہے ۔ مندرجہ ذیل حدیث ہے ۔

۱ - بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے وقت وضو کیا کرتے تھے ۔ جب فتح مکہ کا دن آیا تو آپ نے وضو کیا اور دونوں موزوں پر مسح کیا اور ایک ہی وضو سے چند نمازیں پڑھیں ۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! آپ نے ایک ایسا کام کیا جسے اس سے پہلے نہیں کرتے تھے ۔ (یعنی ایک وضو سے کئی نمازیں پڑھنا ۔) تو آپ نے فرمایا اے عمر میں نے ایسا قصداً کیا ہے ۔

آپ نے فرمایا اے عمر! میں نے ایسا قصداً کیا ہے ۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی صفت کا بیان :

۱۷۷ ۔ سالم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ جب نماز کا افتتاح کرتے تو اپنے دونوں ہاتھوں کو اپنے دونوں مونڈھوں کے بالمقابل اٹھاتے اور جب رکوع کرنے کا ارادہ کرتے تب بھی اٹھاتے اور جب رکوع سے کھڑے ہوتے تب بھی اٹھاتے اور دونوں سجدوں کے درمیان میں نہیں اٹھاتے تھے یعنی ان تین حالتوں میں رفع یدین کرتے تھے۔ ایک نماز شروع کرتے وقت، دوم رکوع میں جاتے وقت، سوم رکوع سے سر اٹھاتے وقت۔

امام کے پیچھے قرآن پڑھنے کا باب :

۳۲۱ ۔ عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم لوگوں کو صبح کی نماز پڑھائی تو آپ پر قرآن کا پڑھنا دشوار ہوگیا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا: میں سمجھتا ہوں کہ تم لوگ اپنے امام کے پیچھے قرآن پڑھتے ہو؟ ہم نے کہا ہاں اے اللہ کے رسول! بخدا ہم لوگ قرآن پڑھتے ہیں اور اس کے پڑھنے میں جلدی کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا سوائے سورۂ فاتحہ کے اور کچھ نہ پڑھو کیونکہ جس نے سورہ فاتحہ نہ پڑھی اس کی سرے سے نماز ہی نہیں ہوئی۔

ناچ، ملبی دوڑ اور عورتیں :

امریکہ کی اوریگیت یونیورسٹی کے ڈاکٹروں کی ایک ٹیم نے اپنے ایک سالانہ اجتماع میں یہ اعلان کیا ہے کہ جو عورتیں ناچتی ہیں، یا لمبی دوڑ لگانے کی ورزش کرتی ہیں ان کے حیض (ماہواری) کا نظام اوائل عمر ہی میں بگڑ جاتا ہے اور ایسی عورتیں پروجیسٹرون ہارمون کی افزائش کے نتیجے میں سینے کے کینسر اور ہڈیوں کی کمزوری کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹروں کی اس ٹیم نے زور دیا ہے کہ عورتیں اس قسم کا کام چھوڑ دیں

(المجتمع کویت ۱۶ راگست ۱۹۸۳ء)

نوٹ : جو لوگ دین وشریعت کی راہ سے نہیں ملتے فطرت ان سے اسی طرح منواتی ہے۔

دینی نصاب تعلیم میں حدیث و فقہ کی حیثیت

شیخ عبدالمعید

کسی اسلامی ادارے کے نصاب کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ فرد کی عقلی اور نفسیاتی تربیت کی جائے تاکہ وہ مستقبل میں ملت کی تعمیر میں حتی الامکان بہتر سے بہتر حصہ لے سکے یا کم از کم معاشرہ کا ایک بہترین رکن بن کر زندگی گزار سکے۔ عقلی، اور نفسیاتی تربیت کے لیے جو نصاب تیار کیا جاتا ہے، اس میں بہت سے عوامل اور اثرات کارفرما ہوتے ہیں۔ اس پر ماحول اور زمانوں کے دھوپ چھاؤں کا اثر پڑتا ہے۔ وہ احتیاجات اور عصری تقاضوں کی چھلنی میں چھن کر ایک خاص شکل اختیار کر لیتا ہے نئے نئے لباس اور پیراہن مانگتا ہے۔ اسلامی ادارے عوامل اور موثرات کا صحیح اور دینی جذبوں سے ہم آہنگ اثر قبول کر سکتے ہیں۔

ہم اپنے نصاب تعلیم میں اسلوب بیان طرز بحث و استنتاج میں اس منہج کو اپنا سکتے ہیں۔ جو ہمیں حق و صداقت کی راہ پر گامزن رکھے دینی مسلمات کے سلسلے میں تشکیک نہ پیدا کرے۔ زمانے اور ماحول کے اثرات کو اسی قدر قبول کیا جا سکتا ہے جو تمدن کی گاڑی کو اسلام کی شاہراہ پر لے کر چلنا سکھائے، نہ کہ مسلمات کو قابل تغیر بتلا دے اور اخلاقیات کو پامال کر دے اور بندگان شکم پیدا کرنے لگے۔

نصاب میں مکانی اور جغرافیائی حدود کے تقاضے بھی دخیل انداز ہو سکتے ہیں۔ ایک ملک کا نصاب تعلیم دوسرے ملک سے مختلف ہو سکتا ہے۔ مسلمات کے علاوہ دوسرے امور میں ایک جگہ کا نصاب تعلیم دوسرے مقام کے نصاب تعلیم سے جدا ہو سکتا ہے۔

ہندوستان میں ہماری حیثیت مسلم اقلیت کی ہے۔ اقلیت کے جتنے مسائل اور پیچیدگیاں ہو سکتی ہیں وہ سب یہاں موجود ہیں۔ تعمیر ملت کا کام مسلم عوام کو ہی کرنا ہے۔ سیاسی ادارہ اور سیاسی قیادت سے ہم ملت کی نگہبانی کی توقع نہیں کر سکتے۔ اس جغرافیائی اور اجتماعی تناظر میں ہی مرتب نصاب تعلیم کی ہمیں ضرورت ہے۔

ہمارا نصاب تعلیم کیا ہو؟ اس میں کس حد تک زمانی اور مکانی تقاضوں کو قبول کیا جا سکتا ہے۔ کچھ مسلم قیادت یعنی علماء کی غفلت اور کچھ وسائل کی قلت کی بنا پر اس طرف توجہ نہیں ہو سکی، اگر کسی گوشے پر توجہ ہوئی بھی تو اس کی حیثیت نصاب تعلیم کے دوسرے اجزاء کی بہ نسبت سواری کی رہی ہے۔ سواری تو تیار ہوئی لیکن سوار کو نہیں تیار کیا گیا یا مولانا مونگیری کے الفاظ میں صرف قلم ہی بنایا جاتا رہا، لکھنے کی نوبت نہیں آئی اور وقت گزرنے کے ساتھ سواری بھی لاغر و ضعیف ہو چکی ہے اور قلم بھی خستہ ہو گیا ہے۔

آج ہمیں اسلام کی حد بندیوں میں رہتے ہوئے زمانی اور مکانی تقاضوں کو قبول کرنا پڑے گا، ان صحیح اثرات کو قبول کرنے کے بعد ہی ہم ملت کی تعمیر کما حقہ کر سکتے ہیں اور اسی وقت ہم اپنے اداروں میں افراد کی عقلی اور نفسیاتی تعمیر کر سکتے ہیں۔

مسلم اقلیت کی حیثیت سے ہمارا نصاب تعلیم ایسا ہونا چاہیے کہ وہ ایسے افراد پیدا کرے جن کے اندر یگانگت کا شعور ہو اور ملت کی وحدت کا جذبہ ابھرے۔ نصاب تعلیم کے دیگر لوازمات جس قدر بھی مہیا ہوں ان پر بھی ملت اسلامیہ ہند کی وحدت کی چھاپ ہونی چاہیے، تاکہ ملت کی کوششیں ایک رخ اختیار کر سکیں۔ باہم متصادم نہ ہوں۔ اور یہ وحدت محض اندھی بہری وحدت نہ ہو نہ کسی بھی حق کی حق تلفی پر مبنی ہو اصول و فروع کل دین کو ملحوظ رکھتے ہوئے ایسا نصاب کسی فرد یا ادارہ کی حوصلہ مندیوں سے تکمیل نہیں پا سکتا۔ اس کے لیے ملت کی ضرورتوں کو سمجھنا اور اسلامی اخوت کا ثبوت دینا ہوگا۔

اسلامی اداروں کے نصاب تعلیم کے ہر عنصر کا اپنا ایک خاص مقام اور اہمیت ہے، نصاب تعلیم سے مطلوبہ نتائج فرد کی عقلی و نفسیاتی تعمیر اسی وقت ہو سکتی ہے جب ہر عنصر کو اس کا مقام دیا جائے اور اس کے تقاضوں کو پورا کیا جائے اور ہر ایک کو اپنا اپنا کردار ادا کرنے کا موقع دیا جائے۔ اگر ایک عنصر کا مقام یہ ہے کہ اسے آخری درجہ ملنا چاہیے لیکن اسے درجہ اولیں مل جائے تو پھر مطلوبہ نتائج کا حصول غیر ممکن ہوگا۔

اسلامی اداروں کے نصاب تعلیم میں حدیث اور فقہ کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ حدیث کا مقام یہ ہے کہ وہ سرچشمۂ ہدایت ہے، انسان کے تمام احتیاجات کا حل اس کے اندر موجود ہے۔ ضرورتوں، تقاضوں اور مسائل کو حل کرنے کی ذمہ داری فقہ پر ہے۔ یہ فقہ کا کام ہے کہ سرچشمۂ ہدایت کے نظائر کو سامنے رکھ کر نو پید مسائل کا حل پیش کرے۔ حدیث اور فقہ کی اس اساسی حیثیت کے پیش نظر انفس اولیت ملنی چاہیے اور ان کی جو اہمیت ہے اس اہمیت کے پیش نظر انفس پڑھنا چاہیے۔

حدیث سے دینی اداروں کی وابستگی کا حال یہ ہے کہ ان میں صحاح ستہ ختم کرادی جاتی ہیں، کہیں انھیں ایک سال کے کورس میں ختم کیا جاتا ہے، کہیں کچھ مزید توجہ دی جاتی ہے اور کہیں انھیں سہ ماہی تک استاذ طالب علم سب سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، پھر ششماہی تک صرف استاذ سمجھتا ہے اور ششماہی کے بعد کوئی بھی نہیں سمجھتا۔ کہیں حتی الامکان سال بھر ترجمہ کی حد تک وابستگی رہتی ہے اور سمجھنے کی کوشش ہوتی ہے۔ پھر ہر ادارہ ان مقدس احادیث کو اپنے رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتا ہے اور عمل کی باری آتی ہے تو ضعیف اور موضوع اور صحیح کے درمیان تمیز کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی۔ ظاہر ہے کہ حدیث سے ایسی تعلیمی وابستگی کو "تبرک" کا نام دیا جاسکتا ہے۔

فقہ اسلامی بصیرت کا نام ہے (من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین) یہ اسلامی بصیرت زندگی کے تمام گوشوں میں روشنی بکھیرتی ہے۔ ادب میں دینی بصیرت، سیاست میں دینی بصیرت، فلسفہ میں دینی بصیرت، اقتصاد میں دینی بصیرت غرضیکہ یہ دینی بصیرت تمام شعبہائے حیات میں جلوہ گر ہوسکتی ہے۔ یہ بصیرت اللہ کا عطیہ ہوتی ہے اور کتاب وسنت میں غور وفکر اور قیاس واجتہاد کے وسائل کا اکتسابی ثمرہ بھی۔ یہی بصیرت اسلاف کو ملی تھی اور اس کے نتیجے میں انھوں نے علم وفکر کا بے بہا سرمایہ ہمارے لیے چھوڑا۔

ہماری درس گاہوں میں آج فقہ کا مفہوم تنگ کرکے اس کی بنیاد پر تحزب کے گھروندے تعمیر کرلیے گئے ہیں اور انھیں خوش کن "محلات" میں جینے کا سارا جتن کیا جاتا ہے۔ فقہ کی تعلیم آج جس طرح دی جاتی ہے، اس سے ایسے افراد پیدا ہوتے ہیں جو تحزب کے قلعوں کے محافظ معلوم ہوتے ہیں۔

دینی اداروں میں فقہ کے بٹوارے نے بڑے دوررس نتائج چھوڑے ہیں۔ اس بٹوارے نے ملت اسلامیہ ہند کے تہذیبی وسعت اور ارتقاء کو نقصان پہنچایا اور تاریخ کو مسخ کرکے رکھدیا ہے۔

مسلم اقلیت اور محکوم کی حیثیت سے ہماری ڈیڑھ سوسالہ تاریخ ازخاعی اور تحلیلی تاریخ بن کر رہ گئی ہے۔۔۔ بلکہ بسا اوقات چالاک اور عیار قلم نے افسانوں کو تاریخ بناڈالا ہے اور تاریخ کے اندر بناؤ کے جو اثرات ہوسکتے ہیں انھیں تباہ کرکے رکھ دیا ہے۔ بات نئے نصاب تعلیم کی ہورہی ہے تو اس سے "تبرک" اور "تحزب" کو چھانٹ دینا ضروری ہے۔ اس سے ملت کی چولیں روز بروز ڈھیلی ہورہی ہیں۔ دینی نصاب تعلیم میں حدیث اور فقہ کو "کم" و "کیف" دونوں اعتبار سے ان کا اصل مقام ملنا چاہیے۔

حدیث ہدایت کا سرچشمہ اور تمام انسانی احتیاجات کا جواب ہے ہمیں انھی دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر

حدیث پڑھنا ہوگا۔ سرچشمۂ ہدایت ہونے اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہونے کی وجہ سے اس پر طہارت اور عصمت کی چھاپ لگی ہے ہمیں احادیث کو ادھر اُدھر کھینچنے تاننے کے بجائے خالی الذہن ہوکر اُسے سمجھنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہمارے لیے اسوۂ و نمونہ ہے ہمیں اسی اسوہ کی اتباع میں ہدایت مل سکتی ہے، حیات، انسان اور کائنات کے متعلق اس کی ہدایتوں سے مستفید ہونا اور حتی الامکان نئے نظریات و رجحانات اور تصورات کے کھوٹ پن کو اس کی روشنی میں واضح کرنا بھی ضروری ہے۔

حدیث کے سائے میں رہتے ہوئے اساتذہ اور طالب علم کو اس کے کیف آگیں، روح پرور اور عطر بیز ماحول سے اخلاقی اعتقادی اور عملی دنیا کو معطر بنانا اشد ضروری ہے۔ روحانی جسمانی اور نفسیاتی احتیاجات کو حدیث سے پورا کرنے کے بعد پھر ادھر ادھر بھٹکنا مناسب بات نہیں ہے۔

حدیث کو پڑھتے ہوئے قواعد لغت کے اعتبار سے ان کی تفہیم ہونی چاہیے اور قرآن کی آیات کو بھی حتی الامکان ان کی ہم معنی اور شارح احادیث سے ملانا چاہیے تاکہ دونوں سرچشموں کے سنگم سے انسان کی اعتقادی اور عملی زندگی میں نکھار پیدا ہوجائے۔

احادیث سے رسول اللہ کی زندگی کے تمام گوشے نمایاں ہیں ان کی جامع وضاحت ہونی چاہیے۔ حدیث سے متعلق قدیم و جدید جو اعتراضات و شبہات ہیں یا تعقل پسندی کے نتیجے میں اپنوں اور غیروں نے حدیث کا مقام گرانے کی جو کوشش کی ہے اس کی بھی علمی تردید ہونی چاہیے۔

حدیث کے طالب علم کو مصطلحاتِ حدیث سے بھی متعارف ہونا ضروری ہے تاکہ حدیث کے رتبوں کو جان سکے اور معیار ردّ و قبول سے آگاہ ہوسکے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں حدیث اور علوم حدیث کے ائمۂ عظام کا ایک مختصر اور جامع خاکہ ہونا چاہیے۔

مختصراً حدیث کے نصاب میں پانچ پہلوؤں کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ (۱) اعتقاد (۲) فقہ، (۳) سیرت (۴) نئے اور پرانے شبہات کی تردید اور حدیث کی اہمیت کی توضیح (۵) مصطلحاتِ حدیث اور علوم حدیث کے ائمۂ عظام کی تاریخ کا مختصر اور جامع خاکہ۔

انہی پانچ امور کو سامنے رکھ کر ہمیں موجودہ نصابِ حدیث اور طرزِ تدریس کا متبادل تلاش کرنا ہوگا۔ مختلف مراحل کے معیار کے مطابق ہم کو کتبِ حدیث و علوم حدیث کا انتخاب کرنا چاہیے۔ نچلی جماعتوں کے لیے بلوغ المرام ریاض الصالحین

ادب الادب المفرد پڑھائی جا سکتی ہے یا ان کے علاوہ معیار و سال کو سامنے رکھتے ہوئے دوسرے منتخبات پڑھائے جا سکتے ہیں۔
اور اونچی جماعتوں میں صحاح کے منتخبات پڑھائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً عقائد کو بخاری سے منتخب کیا جا سکتا ہے، سیر بخاری ومسلم اور شمائل ترمذی سے لے سکتے ہیں۔ اور فقہ ابو داؤد جامع ترمذی اور بخاری سے لے سکتے ہیں۔ مصطلحات کے لیے نزہۃ النظر ڈاکٹر صبحی صالح کی علوم الحدیث ڈاکٹر ضیاء الرحمن کی دراسات فی الجرح والتعدیل پڑھائی جا سکتی ہیں۔ موخر الذکر کی کتاب ائمہ عظام حدیث کی جامع تاریخ کے لیے بھی کافی ہو گی۔ اونچی جماعت والوں کے لیے ابن کثیر سیوطی، جمال الدین قاسمی وغیرہ کی کتابیں مفید ہیں۔ مقررات میں اس بات کا بھی لحاظ ہے کہ یہ مرحلہ وار طالب علم کے معیار فہم کو سامنے رکھتے ہوئے رکھے جائیں تاکہ کما حقہ وہ اس سے مستفید ہو سکیں۔ اس نصاب کو پڑھانے کے لیے اساتذہ کے اندر کن شرائط کا ہونا ضروری ہے۔ ہندوستان کے مراحل تعلیم کیسے ہوں وہ دوسری بحث ہے، مذکورہ صورتوں کے لیے وسائل کی کمی کی شکایت بھی نہیں ہو سکتی۔

فقہ کا مسئلہ بڑا پیچیدہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ فقہ انسانی افکار اور کوششوں کا نتیجہ ہے جس میں صاف پانی کے ساتھ ساتھ ریت بھی آ سکتی ہے۔ اگر یہی ریت آمیز پانی پیاسوں کو دیدیا گیا تو اس سے ان کی صحت پر برا اثر پڑے گا۔ ان انسانی افکار اور کوششوں پر عصمت کی چھاپ نہیں لگی ہے۔ نہ مسائل فقہ کی کثیر تعداد اجماعی ہے جس پر عصمت کا دعویٰ کیا جا سکے۔ پھر مزید یہ کہ تعصبات کی دبیز تہوں نے اس کے اردگرد ایک ہالہ بنا دیا ہے کہ ان پر بحث و گفتگو کرنا دینی جرم کے ہم معنی قرار دیدیا گیا ہے۔ پھر برسوں کے جمے جمائے طریقے سے ایسی محبت ہو چکی ہے کہ اسے ہٹایا جانا قلب و ذہن پر بڑا بار ہوتا ہے۔

لیکن فروغ حق کے لیے ان خود ساختہ شیش محلوں کو چکنا چور کرنا ہو گا تب فقہ کے عظیم سرمائے سے صحیح استفادہ ہو سکے گا۔ آج فقہ کی صحیح تعلیم کے لیے ہمیں دو چیزوں کو سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔ فقہ کے آفاقی مفہوم کو اسلامی اداروں میں جگہ ملنی چاہیے اور اس راہ کی جتنی رکاوٹیں ہیں انھیں دور کرنا چاہیے۔ یہ رکاوٹیں بے شمار ہیں، اور ہر شخص انھیں رکاوٹ سمجھتا ہے۔ ضرورت بالجبر ان رکاوٹوں کو دور کر دیتی ہے، خواہ مخصوص ذہن ضد میں اور مناظرہ بحث میں انھیں تقدس کا مقام دیدیں۔ اگر ہم ان رکاوٹوں کو دور کر لیں اور اس کے بعد فقہ کے تمام سرمائے سے استفادہ کریں، تعصبات اور تنگ نظریاں چھوڑ دیں تو کاروان فکر و نظر پھر سے جادہ پیما ہو سکتا ہے اور روز روز کے نظریات اور آئیڈیولوجیاں اسلامی افکار اور اسلامی معاشرہ پر حملہ آور نہیں ہو سکتیں۔ یا یہ تحریک پیدا کرنے کے لیے ہمیں تمام فقہی سرمائے

کو اپنا سرمایہ سمجھا ہوگا اور نفرت دشمنی اور عداوت چھوڑنی ہوگی۔

ہم فقہی مذاہب پر عمل کرتے ہوئے تعصبات اور تحزب اور جمود کو چھوڑنا چاہیے اور وسعت قلب و نظر کا ثبوت دینا چاہیے۔

ہندوستان میں تقریباً اکثر مدارسِ فکر اپنا انتساب ولی اللّٰہی مدرسۂ فکر کی طرف کرتے ہیں اور ان کے منہج فقہ کو پسند کرتے ہیں لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ اس انتساب اور پسندیدگی کے باوجود کسی نے ان کا منہج نہیں اپنایا۔ اس کے برعکس لا نظام الدین ہی اکثر مدارس میں چل رہے ہیں۔ ولی اللّٰہی فکر کو چھوڑ کر لوگ دوراتہا ؤں پا چلے گئے۔ کم از کم اگر ان کا منہج فقہ اپنا لیا جائے اور ان کی دستیوں پر عمل کیا جائے تو ہندوستان کے فقہی ماحول پر جو کثافت جمود اور تحزب چھائی ہے وہ دور ہو سکتی ہے۔

فقہ کا نصاب تعلیم کیا ہو؟ اس سلسلے میں پہلی بات یہ دھیان میں رکھنی چاہیے کہ ابتدائی مراحل میں ہر مکتب فکر اپنے مسلک کی فقہ پڑھائے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ ایسی کتابوں کا انتخاب ہو جس میں فقہی آراء کے دلائل موجود ہوں۔ طالب علم کو بغیر دلیل کے کتاب نہ پڑھنی چاہیے۔ فقہ حنفی کی حد تک فتح القدیر ابن ہمام کا منہج اس بارے میں بہتر ہے اسی کے انتخابات پڑھائے جاسکتے ہیں۔ یا پھر اسی طرح کی دوسری کتاب یا فقہ السنہ جو نصاب کے لیے بہتر ہو۔ نیز اصول فقہ میں بھی ایسی کتاب کا انتخاب ہو جس میں مناظراتی انداز نہ ہو یا جس میں دوسروں کے تخطیہ کا التزام نہ کیا گیا ہو۔ بلکہ مسلک کے اصول فقہ کا جامع اور بہترین ترجمان ہونا چاہیے۔

اونچی جماعتوں میں فقہ مقارن اور اصول فقہ مقارن پڑھانا بہت ضروری ہے۔ فقہ مقارن میں ابن رشد کی بدایۃ المجتہد یا اس کے مماثل کتابیں پڑھائی جاسکتی ہیں۔ یا پھر ہر مکتب فکر کی امہات کتب کے منتخب ابواب مثلاً ہدایہ کا کوئی باب لے لیں اور وہی باب المدونہ، المغنی، الام المحلی اور فتاوی ابن تیمیہ سے لے لیں اور اس باب میں ہر فکر کا جائزہ لیں۔ طرز استدلال اور دلائل کو سمجھیں اور راجح اور مرجوح کا فیصلہ کریں۔

اصول فقہ میں بھی مقارنہ ہو اور ہر مکتب فکر کے اصول کو سمجھا جائے اور ان سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کی کوشش ہو۔ اس میں بھی مثلاً روضۃ الناظر، المستصفی ارشاد الفحول، التوضیح والتلویح الموافقات کے یکساں مباحث کا تقابلی مطالعہ کیا جانا چاہیے۔

مسلم اقلیت کی حیثیت سے ہمارے لیے جو میدان عمل خالی ہیں ہمیں ان میدانوں میں عمل کے لیے لازماً

تیاری کرنی چاہیے۔ مزید تخصصات علم و فن میں اگر ہمارے وسائل ساتھ دے سکیں تو ہر علم میں جو کچھ اضافہ منہجی حیثیت سے یا مسائل کی حیثیت سے یا افکار و نظریات کی حیثیت سے ہوا ہے ان سے بھی استفادہ کرنا چاہیے۔

رہا مسئلہ ان درسیات کے مدرسین کا تو اس سلسلے میں ہمارے اسلاف کے تدریسی اخلاقیات کو زندہ کرنا چاہیے آج تعلیم و تربیت کے تمام اصول و ضابطے اس اخلاقیات کا بدل نہیں بن سکتے۔

ہماری عرض داشت حدیث اور فقہ کے متعلق ہے چند باتیں معقولات سے متعلق عرض ہیں، عصری تقاضوں کے پیش نظر ہمیں معقولات کے نصاب میں بھی تبدیلی کرنی چاہیے۔ میں تو سمجھتا ہوں معقولات کو نصاب میں رکھنا ایک عبث کام ہے۔ معقولات کو نصاب میں رکھنے کا جواز اس وقت ہو سکتا ہے جب اسلامی تراث کا منہج بحث و نظر پڑھایا جائے اور صرف اسی قدر اس مقصد کی خاطر انکی ضرورت ہوگی جو منہج بحث میں کام آوے یا ایسے طلبہ کو معقولات کے بنیادی مسائل پڑھائے جائیں جو ایڈ ٹک تعلیم حاصل کریں لیکن یہاں حالت یہ ہے کہ عام طلبہ معقولات پڑھکر فارغ ہو جاتے ہیں اور زندگی میں ایک بار بھی ان کی افادیت انھیں نظر نہیں آتی۔ ان کے کام کا میدان ہی ایسا ہوتا ہے کہ کبھی انھیں معقولات کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ہماری تجویز یہ ہے کہ ان معقولات کی جگہ عالم اسلام کا جغرافیہ اور تاریخ اسلام پڑھائی جائے اور جدید اجتماعی نظریات کا مختصر کورس بھی رکھا جائے۔ اس سے ایک بڑی کمی پوری ہو سکتی ہے۔ •••

... ...

یہ مقالہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے دینی نصاب تعلیم کے سمینار کے لیے تیار کیا گیا تھا لیکن ناگزیر مجبوری کی بنا پر سمینار میں شرکت نہ ہو سکی۔ موضوع لائق توجہ اور تنقیح طلب ہے لہٰذا اہل فکر کو اظہار رائے کی دعوت دی جاتی ہے۔

قسط (۳)

شیخ الاسلام مولانا امرتسری اور ان کی تصنیفات

تصانیف در ردّ عیسائیت

مولانا محمد مستقیم سلفی
مدرس جامعہ سلفیہ

(اردو) صفحات ۱۵۱ طبع اول ۱۹۰۹ء مطبع اہلحدیث امرتسر

(۱) **تقابل ثلاثہ** اس کتاب میں تورات، انجیل، اور قرآن کے مابین تقابلی جائزہ لیا گیا ہے اور دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ موجودہ آسمانی کتابوں میں سے صرف قرآن مجید اپنی اصلی حالت میں ہے

(اردو) صفحات ۲۴ طبع اول ۱۹۱۴ء مطبع روزبازار اسٹیم پریس امرتسر

(۲) **کلمۂ طیبہ** اس رسالہ میں کلمہ "لا الہ الا اللہ" کی توضیح و تشریح اس ڈھنگ سے کی گئی ہے کہ ماسوا اللہ کے کوئی ذات ایسی نہیں ہے جو کسی کی حاجت روائی و مشکل کشائی کر سکے اور کلمۂ "محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کی وضاحت کرتے ہوئے آپ کے آنے کی بشارتیں عیسائیوں کی مقدس کتب سے پیش کی گئی ہیں۔

(اردو) صفحات ۳۰ طبع اول جولائی ۱۳۳۲ھ/۱۹۱۴ء

(۳) **رسالہ توحید، تثلیث اور راہ نجات** مطبع وزیر ہند اسٹیم امرتسر

عیسائیوں کی طرف سے عام طور پر جو مضامین شائع ہوتے ہیں وہ تین ہیں (۱) توحید (۲) نجات (۳) کفارۂ مسیح، اس لیے مسلمانوں اور ناواقف لوگوں کی اطلاع اور ہدایت کے لیے ان تینوں کی اصل حقیقت شیخ الاسلام نے اس رسالہ کے ذریعہ واضح کی ہے اور ہر موضوع پر مفصل بحث کی ہے۔ یہ رسالہ عیسائیوں کے شہ رگ پر تلوار کی حیثیت رکھتا ہے۔

(۴، ۵، ۶) **جوابات نصاریٰ** (اردو) صفحات ۹۲ طبع اول ۱۹۳۰ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

یہ کتاب عیسائیوں کے رسالہ "حقائق قرآن" کے جواب "معارف قرآن" اور "اثبات التثلیث فی التوحید" مصنفہ پادری عبدالحق کے جواب "اثبات التوحید" اور "میں مسیحی کیوں ہوا" مصنفہ پادری سلطان محمد پال کے جواب "تم عیسائی کیوں ہوئے" کا مجموعہ ہے۔

"حقائق قرآن" میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ از روئے قرآن حضرت مسیح علیہ السلام حضرت سید الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے افضل ہیں۔

"اثبات التثلیث فی التوحید" میں منطقیانہ اور فلسفیانہ طریقہ سے تثلیث ہی کو توحید ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یعنی اسلامی توحید کا ابطال کیا گیا ہے۔

"میں مسیحی کیوں ہوا" اس رسالہ میں مصنف نے اپنے مسیحی ہونے کی وجہ لکھی ہے کہ قرآن کے مطالعہ سے مجھے یہ معلوم ہوا کہ نجات کا ملنا صرف اعمالِ صالحہ پر موقوف ہے اور آدمی انسان ہونے کی حیثیت سے صرف اعمالِ صالحہ ہی کرے یہ غیر ممکن ہے اس لیے میں مسیحی ہو گیا۔

ان سب کا مدلل و محقق جواب دیا ہے، کتاب دیکھنے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔

(اردو) صفحات ۳۲۰ طبع اول مئی ۱۳۶۰ھ/۱۹۴۱ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

(۷) اسلام اور مسیحیت یہ کتاب پادری برکت اللہ صاحب کی تین کتابوں کے جوابات پر مشتمل ہے۔ پادری صاحب کی کتابوں کے نام یہ ہیں: (۱) توضیح البیان فی اصول القرآن: اس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام کے اصول میں عالم گیر ہونے کی صلاحیت نہیں ہے۔ (۲) مسیحیت کی عالمگیری: اس کا مضمون نام ہی سے ظاہر ہے (۳) دین فطرت اسلام یا مسیحیت: اس میں مسیحیت کو مطابق فطرت اور اسلام و قرآن کو مخالفِ فطرت دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

مولانا نے اپنی کتاب (اسلام اور مسیحیت) میں تین ابواب قائم کرکے بالترتیب تینوں کا جواب دیا ہے پہلے باب میں اسلام کی طرف سے مدافعت، دوسرے میں عیسائیت پر تنقید اور تیسرے میں مدافعت کے علاوہ حسب ضرورت تنقید بھی کی ہے۔ مولانا کی یہ تصنیف اپنے موضوع پر شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے، مولانا اس کتاب کے مقدمہ میں خود لکھتے ہیں کہ "میں اپنے دلی خیال کا اظہار کرتا ہوں کہ اپنی جملہ تصانیف میں سے دو کتابوں کی نسبت مجھے یقین ہے کہ خدا ان کو میری نجات کا ذریعہ بنائے گا ان میں ایک کتاب "مقدس رسول" ہے جو رنگیلا رسول اور وچتر جیون کے جواب میں ہے"۔

دوسری کتاب یہی "اسلام اور مسیحیت" ہے

(۸) **تفسیر سورہ یوسف اور تحریف بائیبل** (اردو) صفحات ۹۰ طبع اول مئی ۱۹۴۴ء مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

اس کتاب میں سورہ یوسف کی تفسیر کے ساتھ ساتھ بائیبل کے بیان (متعلقہ یوسف علیہ السلام) کا مقابلہ کیا گیا ہے۔ اور تحریف بائیبل کا ثبوت بھی پیش کیا گیا ہے۔

(۹) **اسلام اور پالیٹکس** (اردو) صفحات ۸ طبع اول ۱۹۳۰ء

اس رسالہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ آج دنیا میں ان لوگوں کو مختلف مذاہب والے خصوصاً عیسائی حضرات اپنے مذہب کی طرف بلاتے ہیں، لیکن ان کی جائز خواہشات پوری کرنے کی ذمہ داری کوئی نہیں لیتا۔ مگر اسلام ایک ایسا اخلاقی وعباداتی اور سیاسی تعلیمات کا جامع ہے جو سب کی نجات کی ذمہ داری لیتا ہے، اس لیے سب کو اسلام کی تعلیمات کی روشنی میں کام کرنا چاہیے

(۱۰) **اسلام اور برٹش لاء** (اردو) صفحات ۵۶ طبع اول ۱۹۰۵ء مطبع اہلحدیث امرتسر

اس رسالہ میں تین باب اور ایک خاتمہ ہے۔ باب اول تعزیرات کے بیان میں ہے اور باب دوم میں ضابطۂ دیوانی سے گفتگو اور باب سوم میں مالگزاری کا مقابلہ اور خاتمہ میں فلاح رعیت کا مختصر ذکر ہے۔ اس کتاب میں انگریزی قوانین کے مدمقابل اسلامی قوانین کو ہر شعبہ میں افضل اور بہتر ثابت کیا گیا ہے۔

... ...

ان کتابوں کے علاوہ چند اور کتابیں رد عیسائیت کے موضوع پر مولانا امرتسری کی تصنیف ہیں جو ذیل میں درج کی جاتی ہیں:

(۱) نماز اربعہ (۲) قرآن اور دیگر کتب (جن کا ذکر رد آریت میں ہو چکا ہے) (۳) ثنائی پاکٹ بک (اس کا ذکر رد قادیانیت میں ہو چکا ہے) (۴) تفسیر ثنائی (جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے) (اس تفسیر کا ذکر آئندہ شمارہ میں آئے گا ان شاء اللہ)

... ...

تصانیف در تردید منکرین حدیث

(۱) دلیل الفرقان بجواب اہل القرآن (اردو) صفحات ۸۰ طبع اول شوال ۱۳۲۳ھ
طبع ثانی رجب ۱۳۳۶ھ ثالث رجب ۱۳۴۸ھ

یہ کتاب مولانا عبداللہ صاحب چکڑالوی کے رسالہ "برہان القرآن علی صلوٰۃ القرآن" (جس میں انھوں نے نماز پڑھنے کا طریقہ قرآن سے بتایا ہے۔) اور مولوی حشمت علی پنجابی کے رسالہ "اثبات الخبر" کا جواب" کے جواب پر مشتمل ہے مولانا امرتسری کی یہ کتاب قابلِ دید شاہکار ہے۔

(۲) حدیث نبوی اور تقلید شخصی (اردو) صفحات ۳۲ طبع سوم ۱۹۲۴ء/۱۳۴۲ھ
مطبع آفتاب برقی امرتسر

اس رسالہ میں قرآن مجید کے ساتھ احادیث رسول کے شرعی حجت ہونے کا ثبوت اور قرآن و حدیث کی باہمی نسبت اور تعلق کی نوعیت بیان کرتے ہوئے حدیث نبوی اور تقلید شخصی کی تحقیق بھی کی گئی ہے اور منکرین حدیث کے جوابات اچھی طرح دیے گئے ہیں۔

(۳) برہان القرآن (اردو) صفحات ۱۸۰ طبع اول ۱۹۲۳ء مطبع وزیر ہند پرنٹنگ پریس
ہال بازار امرتسر

یہ کتاب اس مناظرہ کی روئداد ہے جو مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری اور مولوی احمد الدین کے مابین بعنوان "حجیت حدیث" ہوا تھا۔

(۴) حجیت حدیث اور اتباع الرسول (اردو) صفحات ۶۴ طبع اول ۱۹۲۹ء
یہ کتاب اس مباحثہ پر مشتمل ہے جو مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری اور

---

۱ "اثبات الخبر" مولوی عبدالرحمن (اہلحدیث) مرحوم کا رسالہ ہے (دلیل الفرقان)

۲ چونکہ یہ کتاب مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری کی تصنیف یا ترتیب نہیں ہے بلکہ ان کے مخالف یعنی منکرین حدیث کی ترتیب ہے۔ اس میں کتر بیونت سے کام لیا گیا ہوگا۔ لیکن پھر بھی جتنی عبارت مولانا امرتسری کی نقل کی گئی ہے اہلِ قرآن مولوی —

مولوی احمد الدین (منکر حدیث) کے مابین ہوا تھا، مولوی احمد الدین کا کہنا تھا کہ نبی کو اصل مطاع بماتحت حکم خدا ماننا شرک ہے اور مولانا امرتسری صاحب کا کہنا ہے کہ نبی کو اصل مطاع بماتحت حکم خدا ماننا اپنا اور مسلمانانِ دنیا کا ایمان ہے ۔ یہ مناظرہ تحریری ہوا ہے، اس کتاب میں دونوں کے سوال و جواب من و عن درج ہیں ۔

(۵) خاکساری تحریک اور اس کا بانی

(اردو) صفحات ۱۶۰

مطبع محبوب المطابع دہلی

اس کتاب میں اولاً یہ بتایا گیا ہے کہ بانی "تحریک خاکساری" یعنی مسٹر عنایت اللہ مشرقی صاحب کے والد حدیث رسول کو حجت شرعیہ نہیں مانتے تھے اور مشرقی صاحب بھی اپنے والد سے متاثر ہونے کی وجہ سے حدیث نبوی کو حجت شرعیہ بلکہ تفسیر بھی نہیں مانتے ۔ ساتھ ہی آپ کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ قرآن مجید کسی لغت کا محتاج نہیں ۔

مولانا امرتسری نے اس کتاب میں اس تحریک کا جائزہ لیتے ہوئے مشرقی صاحب کے انکارِ حدیث یا عمل بالقرآن کی حقیقت واضح کی ہے ۔ اور اس تحریک و مشن کا بھرپور جواب دیا ہے ۔

کتاب کے اخیر میں عنایت اللہ مشرقی صاحب کے عقائد اور ان کی تصنیف "تذکرہ" اور "تحریک خاکساری" کے متعلق ہندوستان کے مشاہیر علماء و مشائخ اور اہل قلم حضرات کے ارشادات و بیانات اور بصیرت افروز تبصرے بھی شائع کیے گئے ہیں جس میں سب لوگوں نے مشرقی صاحب کو بالاتفاق کافر گردانا ہے ۔

نوٹ : رد اہلِ قرآن کے موضوع پر مولانا کی رد اور کتابوں میں خاصی مقدار میں موجود ہے ۔ ایک کتاب "تفسیر بالرائے" ہے ۔ (جس کا ذکر رد قادیانیت میں ہو چکا ہے) دوسری تفسیر ثنائی (جو آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے ۔)

در تردید شیعیت

(۱) خلافتِ محمدیہ

(اردو) صفحات ۶۳ طبع اول محرم ۱۳۳۶ھ طبع ثانی جمادی الثانیہ ۱۳۴۰ھ

مطبع ثنائی برقی پریس امرتسر

ے احمد الدین کے مقابلہ میں کافی مدلل ہے اور حجیت حدیث پر دال ہے، اسی لیے اس کتاب کا ذکر یہاں کیا گیا ہے ۔

ے یہ مضمون اخبار اہلحدیث امرتسر میں ۳ رجون ۱۹۳۹ء سے ۶ راکتوبر ۱۹۳۹ء تک جاری رہا اسی کو یکجا کر کے کتابی شکل دیدی گئی ہے ۔

اس کتاب میں مسئلہ خلافت اصحاب ثلاثہ (یعنی حضرت ابوبکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم) کو ثابت کر کے قرآن مجید سے ان کے مومن اور متقی ہونے پر عالمانہ استدلال کیا گیا ہے اور مسئلہ باغ فدک پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

(اردو) صفحات : ۲۰ طبع اول ذی قعدہ ۱۹۳۰ء/۱۳۴۸ھ

(۲) خلافت رسالت

مطبع برقی پریس امرتسر

شیعہ اور سنی میں مسئلہ خلافت ایک عرصہ سے زیر بحث چلا آرہا ہے سنی کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر، عمر، عثمان علی رضی اللہ عنہم بالترتیب آپ کے خلیفہ برحق تھے۔ شیعہ کہتے ہیں کہ علی اور ان کی اولاد ہی مستحق خلافت تھی۔ اس مختصر رسالہ میں بطرز جدید اس مسئلہ کو حل کیا گیا ہے۔

عظیم الشان ریاستی کانفرنس

ریاستی کانفرنس بھدوہی کے انتظامات کے سلسلہ میں ۸ر اپریل ۸۴ء کو ریاستی جمعیۃ اہلحدیث مشرقی یوپی کی مجلس عاملہ کی ایک اہم میٹنگ دارالحدیث ہال جامعہ سلفیہ بنارس میں ہوئی جس میں طے پایا کہ :

۱ - ریاست کی تمام ضلعی جمعیتیں اپنے یہاں سے زیادہ سے زیادہ نمائندے کانفرنس میں بھیجنے کی کوشش کریں۔

۲ - تمام شرکاء کانفرنس اپنی تشریف آوری کی اطلاع جلد از جلد مندرجہ ذیل پتوں میں سے کسی ایک پتہ پر ضرور روانہ فرمائیں۔

- دفتر ریاستی جمعیۃ اہلحدیث مشرقی یوپی بی ۱۸/۱۹ ریوڑی تالاب بنارس ۲۲۱۰۱۰
- دفتر استقبالیہ کمیٹی c/o Teppich-de Orienta. پوسٹ بکس نمبر ۱۳ بھدوہی بنارس

۳ - کھانے کی فیس (تین وقت سنیچر شام، اتوار دوپہر اور شام) دس روپے ہوگی۔

۴ - مدارس کے طلبہ کے کھانے کا انتظام منجانب اجلاس ہوگا بشرطیکہ مدارس کے ناظمین و ذمہ داران کی جانب سے شرکت کرنے والے طلبہ کی فہرست اواخر اپریل ۸۴ء تک ریاستی جمعیۃ کے دفتر کو پہونچ جائے۔

۵ - کانفرنس میں تشریف لانے والے مرکزی، ریاستی اور ضلعی جمعیتوں کے اراکین اور مدارس کے صدور و ناظمین اور علماء کرام کی ایک اہم میٹنگ ۱۳ر مئی بروز اتوار دن میں منعقد ہوگی جس میں اہم جماعتی امور زیر بحث آئیں گے اور جماعت کی ترقی کے لیے ٹھوس اور بنیادی باتیں طے پائیں گی۔ ان شاء اللہ۔

عبدالحمید سلفی / ناظم ریاستی جمعیۃ اہلحدیث۔ مشرقی یوپی۔

تعلیمی میدان میں مسلمانوں کے ریکارڈ

تحریر بزبان بنگلہ: حافظ شیخ عین الباری، عالیاوی
ترجمہ: عبد اللہ محمد اسماعیل مرشد آبادی متعلم جامعہ سلفیہ بنارس۔

(۱) کیا تاریخ عالم کے صفحات میں کسی ایسی ہستی کا سراغ لگتا ہے جس نے صرف تحصیل علم کی خاطر پانچ، چھ لاکھ روپئے خرچ کیے ہوں؟ جی ہاں مسلمانوں میں ایک مایۂ ناز ہستی ہے جس نے صرف حصول حدیث کی خاطر ساڑھے دس لاکھ درہم خرچ کیے ان کا اسم گرامی یحییٰ بن معین ہے۔ (۱۵۸-۲۳۳ھ)

(تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۱۷۸، وفیات الاعیان ج ۵ ص ۱۹۰)

(۲) کیا دنیا کے اندر کسی ایسی شخصیت کا پتہ لگتا ہے جس نے اپنی مادری زبان میں دو لاکھ اشعار یاد کیے ہوں۔ جی ہاں مسلمانوں میں ایک ایسے دانشور گزرے ہیں جنھوں نے قرآن کے صحیح معانی معلوم کرنے کے لیے تین لاکھ عربی اشعار ازبر کیے۔ آپ کا اسم گرامی ابوبکر محمد بن القاسم بن الانباری تھا۔ (۲۷۱ - ۳۲۷/۳۲۸ھ)

(طبقۃ النحویین واللغویین ص ۱۷۱ - الوافی بالوفیات ج ۴ ص ۳۴۴)

(۳) کیا دنیا کی تاریخ کوئی ایسی ہستی پیش کر سکتی ہے جس کے اساتذہ کی تعداد دو ہزار ہو؟ جی ہاں! دو مسلم شخصیتیں ایسی گزری ہیں جن میں ایک کے اساتذہ کی فہرست چار ہزار اور دوسرے کی تین ہزار تک پہنچتی ہے اول الذکر محدث عبد اللہ بن مبارک (۱۱۸ یا ۱۱۹ - ۱۸۱ھ)

(تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۲۷۶، فتح المغیث ص ۳۲۷ اور سمعانی تعلیقات سنیہ ص ۱۰)

اور ثانی الذکر علم الدین ابوالقاسم بن محمد بن یوسف بن محمد البرزلی ہیں۔ انھوں نے اپنے تمام اساتذہ کے اسماء کو اپنی معجم

میں بیان کیا ہے۔ (۶۶۵ ۔ ۷۴۹ء)۔ (ذیل تذکرۃ الحفاظ ص ۲۰، ذیل طبقات الحفاظ ص ۳۵۳ ۔ ۳۵۴، درر کامنہ ج ۲)

(۴) پوری دنیا کی تاریخ میں کیا کسی ایسے فہیم، ذکی اور ذہین انسان کا پتہ چلتا ہے جو روزانہ کم از کم دو سو صفحات لکھتے رہے ہوں؟ جی ہاں! ابو حفص فرماتے ہیں کہ دنیا کے بے مثل اور تعجب خیز انسان علامہ امام ابن تیمیہؒ ہر روز ۴۰ سے ۸۰ فرما تحریر فرماتے تھے۔ (امام ابن تیمیہ ص ۱۹۴ ۔ ۱۹۵) (۶۶۱ ۔ ۷۲۸ء) یعنی اوسطاً روزانہ ۴۰۰ صفحات لکھا کرتے تھے۔

(۵) کیا دنیا میں کسی ایسے صاحب تصنیف کی خبر ملتی ہے جن کی صرف ایک کتاب کے صفحات ۵ سے ۴ لاکھ ہیں؟ جی ہاں! ایک مسلم مصنف کا نام پیش کیا جا سکتا ہے جن کی ۹۹ کتابوں میں سے صرف ایک کتاب "القانون" پانچ لاکھ صفحات اور تقریباً دس کروڑ حروف کی تھی۔ ان کا اسم گرامی ابو علی الحسین بن عبد اللہ ابن سینا تھا۔ (۳۷۰ ۔ ۴۲۸ء)
(دیکھو تو دیر ابن سینا (بچوں کے ابن سینا) ص ۴)

(۶) احمد بن علی خطیب بغدادیؒ (۳۹۲ ۔ ۴۶۳ ہجری) کا یہ واقعہ کس قدر تعجب خیز ہے کہ صرف تین نشست میں مکمل بخاری شریف پڑھ لیا کرتے تھے۔ (الاولیاء فی رجال الحدیث ص ۴۵)
اسی طرح حافظ ابن حجر عسقلانیؒ (متوفی ۸۵۲ھ) کا واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ظہر و عصر کے درمیان کی دس نشستوں میں پوری بخاری شریف پڑھ جاتے تھے۔ (بلوغ المرام مترجم اردو ص ۲۶)
یعنی دونوں بزرگ تقریباً تیس گھنٹوں میں پوری بخاری پڑھ لیتے تھے۔
مذکورہ بالا دونوں بزرگوں کی رفتار خواندگی سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر ایک منٹ میں چودہ سو سے زیادہ حروف پڑھتے تھے۔

(۷) شارح مسلم امام محی الدین ابو زکریا یحییٰ بن شرف النوویؒ (متوفی ۲۰ رجب ۶۷۶ھ) اپنے تعلیمی ایام میں ہر روز دن رات کے مقررہ اوقات میں اپنے استاد سے ۱۲ اسباق پڑھتے تھے اور عشاء کے بعد صرف ایک لقمہ کھانے کے علاوہ کچھ نہ کھاتے۔ اور فجر کے وقت صرف ایک گھونٹ پانی پیتے۔
(طبقات الفقہاء ص ۸۷، بدایہ و نہایہ ج ۱۳ ص ۲۷۸)

(۸) علامہ ابو منصور عبد القاہر بن طاہر بغدادی (متوفی ۴۲۹ھ) ہر روز ۱۷ فنون کی تعلیم دیتے تھے۔
(طبقات الفقہاء ص ۷۴)

(۹) مشہور لغوی، صاحب القاموس علامہ مجد الدین فیروز آبادی (متوفی ۸۱۶ھ) فرمایا کرتے تھے کہ میں دو سو

حفظ کیے بغیر نہیں سوتا ہوں۔ (بغیۃ الوعاۃ ص ۱۱۷)

(۱۰) ایک روز خلیفہ مامون رشید نے لفظ سداد کو بفتح السین پڑھا۔ نضر نے ان سے فرمایا کہ کلمہ سداد کو بکسر السین پڑھیے تو انھوں نے ثبوت طلب کیا۔ نضر نے جھٹ سے ایک عربی شعر ثبوت میں پیش کر کے غلطی کی اصلاح کردی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مامون نے اسی ہزار درہم کا عطیہ دانعام پیش کیا۔

(طبقات النحویین واللغویین ص ۵۴ و ۵۹ اور نزہۃ الالباء ص ۱۱۵)

ایک روز نضر بن شمیل غربت کی وجہ سے مادر وطن کو ترک کر کے خراسان کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت بصرہ کے تین ہزار لوگ ان کے پیچھے ہولیے، جن میں کوئی محدث کوئی لغوی، کوئی نحوی، کوئی عروضی اور کوئی مورخ تھا۔ (موصوف نے ۲۰۳ ہجری میں شہر مرو میں وفات پائی۔) (طبقۃ النحویین واللغویین ص ۵۳)

صرف ایک لفظ کی اصلاح کی خاطر کیا دنیا کی کسی قوم کے بادشاہ یا سلطان نے علماء کو یکبارگی اس قدر انعام سے نوازا ہے۔؟ کیا فی الحال چاندی کے اسی ہزار سکے کی قیمت ۴۰ لاکھ روپیے سے کم ہوگی۔؟

(۱۱) یہ بات منقول ہے کہ ایک بار یونان کے بادشاہ نے علامہ خلیل کے پاس ایک خط یونانی زبان میں ارسال کیا۔ ان کو اس خط کا مضمون تنہائی میں ایک مہینہ سر کھپانے کے بعد سمجھ میں آگیا اور اسی کی برکت سے یونانی زبان بھی سیکھ لی۔ (ایضاً ص ۴۷)۔ ان کا انتقال علی اختلاف الاقوال ۷۴ سال کی عمر میں ۱۷۰ یا ۱۷۵ھ میں ہوا۔

(۱۲) دور حاضر میں علماء دانشوروں کی قدردانی کے لیے جو سب سے قیمتی انعام پیش جاتا ہے وہ نوبل پرائز ہے جس کی قیمت ہندوستانی روپیے کے حساب سے ساڑھے ۱۲ لاکھ ہے۔

مگر مسلمان بادشاہوں کے انعام واکرام کے مقابلہ میں وہ کچھ نہیں، لاشئی کے برابر ہے۔ کیونکہ شراب سے مخمور کچھ انگریز مورخین نے جس بادشاہ کو خام خیال بادشاہ کے نام سے موسوم کیا ہے، اسی بادشاہ محمد بن تغلق نے ایک روز ملک سنجار بدخشانی کو ۸۰ لاکھ اور ملک الملوک امام الدین ریحانی کو ۷۰ لاکھ اور اپنے استاد عضد الدین کو ۴۰ لاکھ تنکے تحفے میں دیا تھا۔

تنکے کہتے ہیں چاندی کے ایک سکہ کو جس میں معمولی تانبا ملا ہوا ہو۔ اگر موجودہ ہندوستانی روپیے سے اس کا حساب لگایا جائے تو ۴۰ لاکھ تنکوں کی قیمت کروڑ سے زیادہ ہوگی۔

(تاریخ فرشتہ اردو ترجمہ جلد ۲ ص ۹)

(۱۳) جب مولانا عبدالحکیم صاحب سیالکوٹی بادشاہ شاہجہاں کے دربار میں تشریف لے جاتے تو بیشمار دینار لے کر واپس ہوتے۔ بادشاہ نے ان کو دو مرتبہ سونے سے وزن کر کے ان کی خدمت میں وہ سونا پیش کیا۔
ایک مرتبہ شاہجہاں نے مولانا کو قیمتی ہیرے جواہرات سے تولوا کر پورے ہیرے جواہرات انکی تحفہ میں دیدیا۔ (ماثر الکرام ص ۲۰۵)

(۱۴) علامہ ابوعبیدہ صاحب خرتے نے صرف گھوڑے کے اعضاء کے متعلق پچاس ہزار اجزاء میں ایک کتاب لکھی۔ (العلم والعلماء ص ۵۰) (م ۲۰۸ھ)

(۱۵) امام ابن الجوزی اتنا لکھتے تھے کہ جب ان کی موت کا وقت قریب آیا تو انھوں نے اپنے اس قلم کے برادے کو دیکھ جس سے صرف احادیث لکھا کرتے تھے۔ لوگوں کو یہ وصیت کی کہ مجھے میرے مرنے کے بعد اس برادے سے پانی گرم کر کے غسل دیا چنانچہ ان کی وصیت کے مطابق ان ہی سے پانی گرم کر کے غسل دیا گیا۔ (مقدمہ تحفۃ الاحوذی)
انکی پیدائش ۵۱۰ھ میں ہوئی ۳ سال ہی کی عمر میں یتیم ہو گئے۔ انھوں نے اپنے ہاتھ سے دو سو جلدیں لکھیں۔ ان کی کتاب المنتظم فی تواریخ الامم من العرب والعجم ۲۰ جلدوں میں ہے۔
ان کی تقریری محفل میں خلیفہ وزیر، بادشاہ، گورنر، پنڈت، اور عوام سبھی شرکت فرماتے۔ جن کی کم سے کم تعداد دس ہزار اور زیادہ سے زیادہ لاکھ ہوتی۔ (البدایہ والنہایہ ج۱۳ ص ۲۸ - ۲۹)
دورِ حاضر کا سب سے مشہور خطیب ایڈمنڈ برک کو کہا جاتا ہے کیا ان کے سامعین ابن الجوزی کے سامعین کے نصف بھی ہوتے ہیں۔

(۱۶) اسپین کے عظیم دانشور امام ابن رشد (مولود ۵۲۰ ہجری)۔ ۷ سال کی عمر میں بھی روزانہ سولہ گھنٹے پڑھا کرتے تھے۔ (چھوٹو دیر امام غزالی کے بچوں کے امام غزالی)۔
جوانی کا عالم یہ تھا کہ ہمیشہ پڑھتے رہتے۔ یہاں تک کہ رات کو بھی ان کے ہاتھ سے کتاب الگ نہ ہوتی تھی۔
آپ کی زندگی میں صرف دو راتیں ایسی گزریں جس میں آپ کچھ پڑھ لکھ نہ سکے۔ ایک تو شب زفاف اور دوسری وہ رات جس میں آپ کے والد بزرگوار کی وفات ہوئی۔ ان کی اس محنت و جفاکشی کا ثمرہ یہ ظاہر ہوا کہ ۱۲ ویں صدی عیسوی سے ۱۷ ویں صدی عیسوی تک اہل یورپ میں ان کے فلسفہ کے علاوہ کسی اور کے فلسفہ کا تصور حاشیۂ خیال میں نہیں آیا۔

•••

"ایک وضاحت" کا خیر مقدم

محمد مستقیم سلفی
مدرس جامعہ سلفیہ

راقم نے جب سے علمائے اہلحدیث کی تصنیفی خدمات کے تذکرہ و تعارف کا سلسلہ شروع کیا ہے، اسی وقت سے اپنے بزرگوں اور دوستوں سے برابر کہتا چلا آرہا ہے کہ اس پر تنقیدی نظر فرمائیں اور کوئی خامی نظر آئے تو خاکسار کو مطلع کریں تاکہ میں اصلاح کرلوں۔ میں یہ بھی واضح کرتا رہا کہ اسے کتابی شکل میں لانے سے پہلے رسالہ "محدث" میں چھپوانے کا ایک خاص مقصد یہ بھی ہے۔ ایک عرصہ تک تو علماء نے اس طرف توجہ نہیں کی لیکن بار بار کہنے پر بعض بزرگوں نے خطوط کے ذریعہ مفید مشورے دیے اور کافی ہمت افزائی بھی کی، جس کے لیے میں ان سب کا شکرگزار ہوں۔

ہمارے محترم مولانا عبدالعزیز صاحب عمری حفظہ اللہ نے "محدث" اگست ۱۹۸۲ء کے شمارے میں چھپے ہوئے مضمون بعنوان "مولانا ابو المکارم محمد علی مئوی اور ان کی تصنیفی خدمات" میں سے دو کتابوں کے تعارف پر تنقید فرمائی ہے جو ماہنامہ "آثار" مئو مارچ ۱۹۸۴ء میں بعنوان "ایک وضاحت" شائع ہوئی ہے۔ میں مولانا کی اس تحریر سے کافی خوش اور سراپا شکرگزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ مولانا کو جزائے خیر دے۔ آمین۔

خاکسار نے "مولانا ابو المکارم رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف میں سے ایک تصنیف "التحقیق الحسن فی اثبات القمیص فی الکفن" کا تعارف کراتے ہوئے لکھا ہے کہ "یہ رسالہ کفن میں کرتا دینے اور سلا ہوا آستین دار کلی دار کپڑا دینے کے اثبات میں ہے اور جو لوگ اس کے عدم جواز کے قائل ہیں، ان کا مفصل جواب بھی ہے"۔ اس پر مولانا عمری حفظہ اللہ نے لکھا ہے کہ "یہاں تبصرہ نگار سے سہو ہوگیا ہے۔ یہ رسالہ آستین دار اور کلی دار کرتا کے اثبات میں نہیں ہے بلکہ بلا آستین اور بلا کلی کے کرتا کے اثبات میں ہے۔" (ص ۳۵ مارچ ۸۴ء)

مولانا کی اس تنقید پر میں حیران رہ گیا اور دوبارہ کتاب منگا کر پڑھی۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ خود مولانا سے سہو ہوگیا ہے۔ بیجا نہ ہوگا کہ کتاب سے کچھ عبارت نقل کردوں تاکہ یہ امر کسی سے پوشیدہ نہ رہ جائے کہ مولانا مرحوم نے

اس رسالہ میں بلا شبہ سلا ہوا آستین دار کلی دار کرتا دینا ثابت کیا ہے اور مولانا عمری حفظہ اللہ نے اس کی جو نفی کی ہے وہ صحیح نہیں مولانا ابوالمکارم صاحب مرحوم نے جہاں اس سلسلے میں کئی روایتیں نقل کی ہیں وہاں ایک لمبی روایت شداد بن الہاد کی بھی ہے جس کا آخری ٹکڑا یہ ہے: ثم کفنه النبی صلی اللہ علیه وسلم فی جبة النبی صلی اللہ علیه وسلم ثم قدمه فصلی علیه فکان فیما ظهر من صلوته اللهم هذا عبدك خرج مهاجراً فی سبیلك فقتل شهیداً انا شهید علی ذلك ۔ اس کے بعد لکھتے ہیں "یہ تو غالباً کوئی نہیں کہہ سکتا کہ اس میں جبہ کا ذکر ہے نہ کہ قمیص کا، کیونکہ جبہ اور قمیص میں کوئی ایسا فرق نہیں کہ جس سے وہ دونوں باہم متغائر فی الحکم ٹھہریں واہذا امام بخاری نے حدیث یعلی بن امیہ قال کنت مع رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم فاتاه رجل علیه جبة الحدیث پر یہ باب منعقد کیا ہے۔ باب اذا احرم جاہلا و علیه قمیص اور نیز منتخب کنز العمال ص ۱۰۸ ج ۵ میں حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ جب حضرت علی کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کرتے میں ان کو کفن دیا۔

نیز زمانۂ صحابہ کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں: "لیکن کفن میں کرتا دینا صحابہ سے بس اسی لیے کہ صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۸۶ میں حضرت عائشہ سے مروی ہے: قالت دخلت علی ابی بکر رضی اللہ عنه فقال فی کم کفنتم النبی صلی اللہ علیه وسلم قالت فی ثلاثة اثواب بیض سحولیة لیس فیها قمیص ولا عمامة الحدیث وفیه فنظر الی ثوب علیه کان یمرض فیه به ردع من زعفران فقال اغسلوا ثوبی هذا وزیدوا علیه ثوبین فکفنونی فیهما قلت ان هذا خلق قال ان الحی احق بالجدید من المیت ۔ اگرچہ اس روایت میں کرتہ کی تصریح نہیں لیکن آپ کے پوتے قاسم بن محمد کے قول سے جو فقہائے سبعہ سے ایک جلیل القدر صحابی ہیں اس کی تصریح ہو جاتی ہے وہ قول آپ کا یہ ہے ۔ کفنونی فی ثیابی التی کنت اصلی فیها قمیصی و ازاری وردائی فقال ابنه الا نزید ثوبین فقال هکذا کفن ابوبکر فی ثلاثة اثواب والحی احوج الی الجدید من المیت۔ تاریخ ابن خلکان ج ۱ ص ۴۱۸)

ان احادیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں ۔ اور اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ آپ کے کفن میں کرتا کا ہونا ایک محتمل امر ہے تو روایت مذکورہ سے قمیص فی الکفن (یعنی سلا ہوا کپڑا) کا ثبوت تو ضرور ہوتا ہے ۔ مولانا مرحوم نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ سلا ہوا کرتا کفن کے اندر دینے کی تقویت میں ایک صحابی کی وصیت بھی نقل کی ہے کہ ۔ فقال کفنونی فی قمیصه (ای النبی) وادرجونی وفی رعایة وانزروني بازاره"۔

عہد نبوت و عہد صحابہ میں سلا ہوا آستین دار کرتا کفن میں دینے کا ثبوت پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں ۔

" یہ بھی واضح رہے کہ کفن میں کرتا دینا جس طرح عہد نبوت اور عہد صحابہ میں دستور تھا، اسی طرح عہد تابعین و عہد تبع تابعین میں بھی دستور تھا۔ فتح الباری جلد ۳ ص ۱۱۱ میں محمد بن سیرین کا یہ قول ہے : یستحب ان یکون قمیص المیت کقمیص الحی مکففا مزررا اور جامع ترمذی میں عبداللہ بن مبارک کا یہ قول مذکور ہے : احب الی ان یکفن فی ثیابہ الذی یصلی فیھا ...... اور ایک قول قاسم بن محمد کا اوپر گزر چکا ہے اور جب از منۂ مشہود لہا بالخیر میں قمیص فی الکفن (یعنی سلا ہوا بٹن دار کرتا) ایک مروج امر تھا تو اس کے مسنون ہونے میں کیا شک ہے "

(التحقیق الحسن ص ۳، ۴، ۵)

کلی دار اور آستین دار کرتے کے ثبوت میں لمبی بحث کرنے کے بعد مولانا مرحوم اپنے زمانہ کے مروجہ یعنی بلا کلی و بلا آستین والے کرتے کے متعلق بحث شروع کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں کہ " اگرچہ روایات مندرجہ بجواب سوال اول سے قمیص سے مراد وہی قمیص ہے جو سلا ہوا آستین دار کلی دار ہوتا ہے ۔ لیکن فی زمانا جیسا کرتا میت کے لیے مروج ہے اس کے دینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا ہے ۔" (دیکھیے ص ۷)

مولانا مرحوم کی مذکورہ عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ کفن میں سلا ہوا آستین دار کلی دار کرتا دینا ہی سنت اور افضل ہے لیکن فی زمانا جو مروج ہے یعنی بے سلا ہوا اس کو بھی دے سکتے ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ اس توضیح کے بعد اس میں شبہ نہیں رہ جاتا کہ اس معاملہ میں خود مولانا عبدالعزیز صاحب عمری حفظہ اللہ سے سہو ہو گیا ہے ۔ یہاں دو باتوں پر مجھے مزید حیرت ہے ۔ ایک یہ کہ ۱۲ صفحات کے اس رسالہ میں ابتدا سے ص ۷ کے نصف کے قریب تک مسلسل دلائل سے یہی ثابت کیا گیا ہے کہ کفن میں سلا ہوا کلی دار آستین دار کرتا دینا چاہیے ۔ اس کے بعد صرف ایک صفحہ کی مقدار میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بغیر سلا ہوا مروجہ کرتا دینا بھی جائز ہے ۔ اور اس میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ بقیہ صفحات میں ان لوگوں کی تردید ہے جو کرتا نہ دینے کو افضل اور مستحب سمجھتے ہیں یا کرتا دینے کو مکروہ و بدعت کہتے ہیں معلوم نہیں مولانا عمری صاحب نے یہ سب نظر انداز کر کے صرف اسی ایک صفحہ کی بحث پر کیوں نظر مرکوز رکھی جو پورے رسالے کی مرکزی بحث کے اندر محض ایک ضمنی جزیئے کی حیثیت رکھتی ہے ۔ دوسری حیرتناک بات یہ ہے کہ مولانا عمری صاحب نے اپنا مدعا ثابت کرنے کے لیے مولانا ابوالمکارم مرحوم کے رسالے سے ادھوری عبارت نقل کی یعنی ہم نے اخیر میں مولانا مرحوم کی جو عبارت نقل کی ہے اس کا پہلا ٹکڑا جس پر ہم نے لکیر کھینچ دی ہے، مولانا عمری نے اسے چھوڑ دیا اور صرف اس سے آگے کا ٹکڑا نقل کر کے بالکل الٹا نتیجہ نکال دیا ۔ خرط ادب

مجھے سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے کس لفظ سے تعبیر کروں۔

مولانا ابو المکارم صاحب مرحوم کا دوسرا رسالہ "الجواب الاسنی عن مسئلة المصافحة بالید الیمنی" ہے۔ اس کے تعارف میں میں نے لکھا تھا۔ "اس کتاب میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ عند الملاقات مصافحہ دونوں ہاتھ سے کرنا بھی سنت ہے اور جن احادیث سے ایک ہاتھ سے مصافحہ کرنے کا استدلال کیا جاتا ہے، یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔"

میری اس عبارت کے اس ٹکڑے سے . . . "مصافحہ دونوں ہاتھوں سے کرنا بھی سنت ہے"، کتابت کے دوران لفظ "بھی" چھوٹ گیا۔ اور تصحیح کے دوران اس پر نظر نہ گئی۔ اس کی وجہ سے جو عبارت بنی اس پر مولانا عبدالعزیز صاحب حفظہ اللہ کی گرفت کا خلاصہ یہ ہے کہ مولانا ابو المکارم صاحب مرحوم نے یہ ثابت کیا ہے کہ "مصافحہ ہر طرح درست ہے۔ ایک ہاتھ سے بھی اور دو ہاتھ سے بھی۔" ظاہر ہے کہ میں بھی یہی کہہ رہا ہوں۔ مگر لفظ "بھی" چھوٹ جانے سے مطلب میں فرق آ گیا۔ لہذا میں مولانا عمری کی اس توجہ دہانی کا شکر گزار ہوں۔ البتہ مولانا نے اپنی گرفت کے دوران ایک بات ایسی لکھی ہے، جس سے اتفاق مشکل ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

"مرحوم نے اس رسالہ میں دو ہاتھ سے مصافحہ کرنا ثابت نہیں کیا ہے۔ بلکہ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ جن احادیث سے ایک ہاتھ سے مصافحہ ثابت کیا جاتا ہے ان سے مدعا ثابت نہیں ہوتا۔ بلکہ پورے رسالہ میں صرف اسی سلبی پہلو پر زور ہے۔" (آثار ص ۴۳)

مولانا عمری کے اس ارشاد سے اس لیے اتفاق نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا ابو المکارم صاحب مرحوم کے زیر بحث رسالہ[۵] کے عنوان "مصافحہ کے متعلق امام بخاری کا خیال" کے تحت جو کچھ تحریر فرمایا ہے، اس کا خاص مقصد ہی دو ہاتھ سے مصافحہ کا ثبوت پیش کرنا اور اسے تسلیم نہ کرنے والوں کی تردید کرنا ہے۔ ضمناً مولانا مرحوم نے امام بخاری کی تبویب کے اندر پنہاں نکات کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے۔ — اخیر میں یہ بھی عرض ہے کہ اس مختصر رسالہ میں ایک ہاتھ سے مصافحہ کے دلائل کا رد کوئی تین صفحات میں اور دو ہاتھ سے مصافحہ کے ثبوت پر بحث کوئی ڈیڑھ صفحات میں ہے۔ مولانا عمری حفظہ اللہ نے پچھلے رسالے کی ۱۵ صفحہ کی بحث میں سے صرف ایک صفحہ کی ضمنی بحث کو نظر انداز نہیں کیا تو تعجب ہے کہ اس رسالے کی صرف ۵ صفحے کی بحث میں سے ڈیڑھ صفحہ کیسے نظر انداز کر دیا — بہر حال میں مولانا کا شکر گزار ہوں اور توقع رکھتا ہوں کہ میری مزید غلطیوں پر متنبہ فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں گے۔

● ● ●

جاہلیت ــــــ کل اور آج

تحریر: عبدالرحمن صالح / تلخیص و ترجمہ: امیر محمد فضل متعلم جامعہ سلفیہ

شعبان سنہ ۱۰ھ میں دس افراد پر مشتمل بنو خولان کا ایک وفد مدینہ آیا۔ ارکان وفد نے عرض کیا: "یا رسول اللہ ہم اپنی قوم کے نمائندے ہیں، اللہ کی وحدانیت اور اس کے رسول کی رسالت پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہم بڑی مشقت اٹھا کر نرم و سنگلاخ زمین طے کرتے ہوئے آپ کی زیارت کو حاضر ہوتے ہیں اور آپ کے فرمانبردار ہیں۔"

آپ نے فرمایا: "یہ جو تم نے میرے پاس آنے کا ذکر کیا تو جو شخص مدینہ میں میری زیارت کرے گا۔ قیامت کے دن میرا پڑوسی ہوگا۔"

ارکان وفد نے کہا: "تب تو یہ گھاٹے کا سودا نہیں ہے۔"

آپ نے ان سے پوچھا: "عم انس کا کیا بنا؟" (عم انس، یہ خولانیوں کا بت تھا، جس کی اسلام لانے سے قبل وہ پوجا کرتے تھے، اس پر نذریں چڑھاتے تھے، اس سے خوف کھاتے اور امیدیں باندھتے تھے۔)

ان لوگوں نے جواب دیا: "اس کی بری درگت بنی ہے۔ اللہ نے اس کا بدل ہمیں دین اسلام کی صورت میں عطا فرمایا ہے، لیکن ہم میں سے کچھ بڈھے اور بوڑھیاں اب بھی اس کو مانتے ہیں۔ ہم واپس گھر جا کر اسے ضرور منہدم کر دیں گے کیونکہ ہم اس کی وجہ سے بڑے فتنہ و فریب میں مبتلا تھے۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کیا: "تم نے کون سا بڑا فتنہ اس میں دیکھا ہے۔؟"

ان حضرات نے کہا: "ہمیں ایک مرتبہ شدید قحط لاحق ہوا، یہاں تک کہ ہم بوسیدہ ہڈیاں کھانے لگے۔ پس ہم نے حتی المقدور مال جمع کیا اور اس سے سو عدد بیل خریدے اور تمام بیلوں کو ایک ہی صبح "عم انس" کے واسطے قربان کر کے، درندوں کے لیے چھوڑ دیا۔ جبکہ درندوں سے زیادہ ہمیں اس کی حاجت تھی ــــــ پھر اسی وقت بارش

بارش ہوئی اور ہم نے دیکھا کہ سرسبز گھاس آدمی کو چھپائے لیتی ہے اور ہم میں سے کہنے والے کہتے تھے کہ عم انس نے بڑا احسان کیا!" وفد نے اس کی بھی تفصیل بتائی کہ لوگ عم انس کے لیے چوپایوں اور کھیتی میں کیا حصہ مقرر کرتے تھے۔ اللہ کے رسول نے ان سے فرمایا کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کا تذکرہ فرمایا ہے۔

وَجَعَلُوا لِلَّهِ مِمَّا ذَرَأَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْأَنْعَامِ نَصِيبًا فَقَالُوا هَٰذَا لِلَّهِ بِزَعْمِهِمْ وَهَٰذَا لِشُرَكَائِنَا فَمَا كَانَ لِشُرَكَائِهِمْ فَلَا يَصِلُ إِلَى اللَّهِ وَمَا كَانَ لِلَّهِ فَهُوَ يَصِلُ إِلَىٰ شُرَكَائِهِمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (انعام / ۱۳۶)

اور اللہ تعالیٰ نے جو کھیتی اور مویشی پیدا کیے ہیں ان لوگوں نے ان میں سے کچھ حصہ اللہ کا مقرر کیا اور بزعم خود کہتے ہیں کہ یہ اللہ کا ہے اور یہ ہمارے معبودوں کا ہے پھر وہ چیز جو ان کے معبودوں کی ہوتی ہے وہ تو اللہ کی طرف نہیں پہنچتی اور جو چیز اللہ کی ہوتی ہے وہ ان کے معبودوں کی طرف پہنچ جاتی ہے۔ انھوں نے کیا بری تجویز نکال رکھی ہے۔

وفد نے کہا کہ حضور! ہم کاہن کے پاس مقدمات فیصل کرانے جاتے تھے تو وہ بات بھی کرتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شیاطین تم سے بات کرتے تھے۔ پھر آپ نے وفد خولان کو فرائض دین کی تعلیم دی۔

کچھ دنوں بعد انھوں نے رخصت کی اجازت چاہی آپ نے انھیں اجازت دیدی اپنی قوم کے پاس پہنچتے ہی انھوں نے سب سے پہلے عم انس کو منہدم کیا۔

ہم نے اس وفد کا ذکر دو اسباب کی بنا پر چھیڑا ہے: — پہلا سبب یہ کہ وفد خولان کی دو حالتیں تھیں اور دونوں ایک دوسرے کے برعکس ایک تو وہ زمانہ کہ وہ اس بت کی پوجا کر رہے ہیں جو نہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے۔ وہ اس کے لیے نذریں چڑھاتے اور منتیں مانتے ہیں —— اور ایک وہ مبارک زمانہ کہ حضور کی خدمت میں وہ اس حالت میں حاضر ہوتے ہیں کہ دل کی دنیا میں انقلاب آچکا ہے۔ زبان بدل چکی ہے، گفتگو کا انداز تبدیل ہو چکا ہے، آج وہ اس بت کو خاک پا کے برابر بھی نہیں سمجھتے —— غور کیا جائے کہ ان دونوں صورتوں کے درمیان کتنا بعد ہے۔

دوسرا سبب: ہم نے یہ واقعہ اس لیے بیان کیا ہے تاکہ خولان کی جاہلیت کا بیسویں صدی کی جاہلیت سے موازنہ کریں۔ آج کا انسان علم و معرفت کی جس معراج پر پہنچ چکا ہے۔ وہاں جاکر یہ تصور مشکل سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ کوئی ایسا طرز عمل بھی اپنا سکتا ہے جو دور جاہلیت کی تقلید یا اس سے مشابہت رکھتا ہو۔

بعض امریکی اخبارات میں ایک تنظیم سے متعلق خبر شائع ہوئی ہے جس کا مقصد قیام یہ ہے کہ مذکورہ تنظیم

اپنے ذرائع سے مُردوں کے پاس خطوط بھیج سکتی ہے۔ یعنی مردہ شخص کا کوئی زندہ رشتہ دار اگر مردے سے خط و کتابت کا تعلق قائم کرنا چاہتا ہے تو اس سلسلے میں تنظیم کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں اور عالم اموات سے خط بھیجنے والے کے پاس خط کا جواب بھی آئے گا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ مغرب کی ترقی پسند دنیا اور وہاں کے بہت مشغول اور مصروف زندگی گزارنے والے لوگ اس تنظیم کو لغو اور مہمل سمجھ کر چھوڑ دیتے اور تنظیم کا یہ فراڈ تنظیم سمیت اپنی موت آپ مر جاتا، لیکن باعث تکلیف ہے کہ ان اخبارات نے ایسے سیکڑوں افراد کے فوٹو شائع کیے ہیں جو تنظیم کی عمارت کے سامنے لائن لگا کر اپنے خطوط لیے کھڑے ہیں۔ تاکہ وہ انھیں اپنے مردہ رشتہ دار ان احباب کو تنظیم کے واسطے سے ارسال کر سکیں۔

ایک خط پوسٹ کرنے کا چارج بیس ڈالر ہے اور کوئی شخص اس کو بوجھ نہیں محسوس کرتا جبکہ ان میں کتنے لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے پیسے پیسے کے محتاج ہوتے ہیں۔

خدارا کوئی ہمیں بتائے کہ جدید دور کی ان خرافات پر ٹوٹ پڑنے والے لوگوں اور پندرہ سو سال قبل "عم النس" کے پجاریوں کے درمیان کیا فرق ہے؟

ع کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟

جہالت اور مادیت پرستی کی وہ صورت اب بھی باقی ہے۔ ہاں فرق اتنا ہوا کہ خوش نصیبوں نے حق کی روشنی دیکھ کر اس سے اپنے دل کی دنیا روشن کر لی تھی۔ لیکن جدید تاریک دور کے لوگ اب تک اپنی مادیت میں حیران و سرگرداں ہیں۔ اس المیہ کے پیچھے بہت کچھ ان کے دل و دماغ اور ذہن کا قصور ہے اور کچھ حق کے ان مشعل برداروں کا بھی جن کے ذمہ دنیا کی رہنمائی کا کام سونپا گیا ہے۔ یا لیت قومی یعلمون۔

اعلان

محدث ماہ جون و جولائی ۸۴ء کا شمارہ یکجا شائع ہوگا۔

"ادارہ محدث"

عالم اسلام

ایران کے حقیقی حالات

صوفی نذیر احمد کاشمیری اور ایڈیٹر محدث کے درمیان مراسلت

مارچ ۱۹۸۴ء کے محدث میں "نا خوش آمدید" کے عنوان سے ایران کی موجودہ حکومت کے متعلق جو کچھ تحریر کیا گیا تھا اس پر ہمارے ایک نہایت ہی . . . . قابلِ احترام بزرگ صوفی نذیر احمد صاحب کاشمیری نے ہمیں یہ مراسلہ بھیجا ہے:

صوفی نذیر احمد کاشمیری
۸ مارچ ۱۹۸۴ء

خمینی کے متعلق راقم کا موقف

ابھی ایک مہربان جنہوں نے رسالہ محدث بنارس کا مارچ کے مہینے کا پرچہ پڑھا تھا، میرے ملنے کے لیے آگئے اور باتوں باتوں میں پوری صراحت سے ایک فقرہ کہہ کر میرے ردعمل کو معلوم کرنا چاہا۔ فقرہ یہ تھا کہ "خمینی کے متعلق جماعت اسلامی کی طرح میرا موقف یکسر غلط ہے۔" لہٰذا اس سلسلے میں بات کو صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ میرا یقین ہے اور امر واقعہ بھی یہی ہے کہ شیعہ فرقہ اصولاً مذہبی فرقہ نہیں ہے بلکہ اس نے خاص سیاسی حالات میں جنم لیا تھا۔ اس نے اس وقت جنم لیا جب اسلام بحیثیت دین کامل دنیا پر ظاہر ہو کر ایک ہمہ گیر اصلاح انسانی کی تحریک بن چکا تھا اور اس میں جو اصول کام کر رہا تھا وہ اخوۃ مومنانہ کا اصول تھا جس میں کنبہ داریت کا نام و نشان نہ تھا۔ اس کے بجائے اس میں یہ فتویٰ موجود تھا کہ "لیس منی من دعا الی العصبیہ، لیس منی من قاتل علی عصبیۃ، لیس منی من مات علی العصبیۃ" وہ ہم میں سے (امت مسلمہ سے) خارج ہے جو کنبے کے نام کی دہائی دے۔ وہ ہم میں سے نہیں جو کنبے کے نام پر جنگ کرے، وہ ہم میں سے نہیں جس کی موت کنبہ پروری پر ہو۔"

اور شیعہ سنی کا موجودہ جھگڑا اس دور سے کوئی رابطہ نہیں رکھتا۔ لہٰذا اصلاح امت کی کوشش کرنے والوں کا فرض ہے کہ اصل پر نظر رکھ کر ہر دور میں کوشش کریں۔ یہی تجدید امت و دین کا مفہوم ہے۔

اور چونکہ موجودہ دور عالمگیر اصلاح و تجدید دین کے لیے امت کے علماء کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ اصلاح امت کر کے

رت محمدی کو عالمگیر وحدت امت و دین کا نمونہ بننے کی کوشش کریں ۔ ابتدا راقم کا ان مصلحین کو مشورہ ہے کہ وہ اصل
ن پر نظر رکھ کر اور بعد کے تفرقے کو نظرانداز کرتے ہوئے وحدت امت کا تصور مسلمات پر قائم کریں ۔

چونکہ مسلمات امت سب یکساں ہیں لہٰذا الٰہی رسی تمسک کو بنیادی شرط قرار دینے کے بعد امت کی وحدت
گیر کے قیام کا سوال آسان ہو جاتا ہے ۔

مجھے معلوم نہیں کہ اس سلسلے میں جماعت اسلامی کا کیا موقف ہے ؟ خدانکردہ اگر محض سیاسی مصالح کے ماتحت
دودی صاحب نے اس میں کچھ کمی زیادتی کی ہو تو اسے نظرانداز کر دیں اور راقم کے معین کردہ مشورے کو قبول کر لیں ۔ ان شاء اللہ
سا میں اللہ پاک کامیابی دے گا ۔

لہٰذا جو لوگ راقم کے متعلق کسی سوء ظن میں گرفتار ہوں وہ راقم کی اس وضاحت کو سامنے رکھیں اور اسی
نظر نظر کو اپنائیں اور امت گیر کریں ۔ راہ اصلاح صرف یہی ہے اور علماء امت کو آغاز کار کرنے سے پہلے اعلان کرنا
وگا ۔ ان اُرید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ ! ہم تو صرف اصلاح چاہتے ہیں جہاں تک
مکن ہے ۔

یہ معروف جناب امیر جماعت اسلامی کی خدمت میں ارسال ہیں کہ وہ انھیں اشاعت دے کر اصلاح حال کی
شش کریں ۔ جناب مدیر محدث کی خدمت میں گزارش ہے کہ وہ اس تذکرے کو ضرور ضرور شائع کر دیں ورنہ عنداللہ
یہ شکایت ہوگی ۔ والسلام فقیر نذیر احمد

... ...

خمینی یا ایران سے متعلق صوفی صاحب نے اس حسن ظن یا خوش فہمی کی بنیاد کیا ہے اس کی وضاحت صوفی
صاحب ہی کے ایک دوسرے مکتوب سے ہوتی ہے جسے آپ نے میرے ایک خط کے جواب میں ۱۹ / اپریل ۱۹۸۳ء کو
لکھا تھا ۔ سلام وغیرہ کے بعد لکھتے ہیں :

" شیعہ عقائد سے پوری طرح واقف ہوں ۔ لیکن یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ گزشتہ سو برس سے جب سے
بہودی دور کا آغاز ہوا ہے شیعہ مفکرین اپنے خرافاتی عقائد واعمال سے نکل آئے اور اسلام سے اپنا رابطہ قائم کرنے کے
یے مسلسل کوشاں رہے ہیں ۔ آغا خاں جو شیعہ ازم کے ایک بڑے حصے کا امام رہا ہے اس کا کھلا اعلان ہے کہ " اسلام کا
زوال تو فاروق اعظم کے فوت ہونے کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا " ، اس کا کھلا ہوا یہ بھی بیان ہے کہ بنو امیہ کی ملوکیت

تاریخ ملوکیت کا شاہکار ہے اور مسلمان مورخوں نے ان کے ساتھ ظلم کیا ہے۔ آخری جنگ عظیم کے بعد اس نے یورپ کے سامنے اسلامی دعوت کو لانے کی کوشش کی تو اس سلسلے میں اس نے جو دعوت نامہ شائع کیا، اس میں چھوٹتے ہی یہ اعلان کردیا کہ شیعہ نقطۂ نظر کے بجائے غزالی کے نقطۂ نظر کو وہ اختیار کررہا ہے۔ حضرت عمر و حضرت ابوبکر کے متعلق اس کا اعتقاد کسی غالی سنی سے کم نہ تھا۔ یہی حالت اس کی صحیحین کے متعلق تھی۔ ایک دفعہ اس کے فرقے کا بہت بڑا اجتماع بمبئی میں ہوا تو اس کے مریدوں نے شکایت کی کہ وہ ایک طرف سے غیر مسلموں کو اپنے فرقے میں لاتے ہیں تو دوسری طرف وہ سنی ہوجاتے ہیں۔ تو اس نے جواباً یہ کہا کہ اس سے ان کے اصل مقصد پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان کا اصل مقصد صرف یہ ہے کہ وہ غیر مسلم دنیا کی بڑی سے بڑی تعداد کو اسلام میں لائیں۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ آغاخانی ہی رہے۔ حیدرآباد میں ایک امیر و کبیر کنبہ آغاخانی تھا۔ مگر تھوڑے عرصے میں ان میں سے ایک تو دیوبندی ہوگیا، دوسرا اہلحدیث ہوگیا، تیسرا قادیانی ہوگیا۔ ان کے ماموں حاجی پیر محمد شدید درجہ کے اہلحدیث تھے۔ اور باوجود بے علم ہونے کے بڑے بھاری مبلغ بھی تھے۔ میں اسی امکان پر کام کررہا ہوں۔

... ...

صوفی صاحب کے اس مکتوب سے ان اسباب کی نشاندہی ہوتی ہے جو صوفی صاحب کے حسن ظن اور خوش فہمی کی بنیاد ہیں۔ ہماری بھی آرزو تھی کہ ایران کا انقلاب ملت کے عروج و اتحاد کی بنیاد بنتا۔ مگر افسوس ہے کہ حقائق اس حسن ظن اور آرزو کا ساتھ نہیں دیتے۔ خمینی صاحب اور ان کے پاسداران انقلاب کا نقطۂ نظر آغاخان کے نقطۂ نظر کے بالکل برعکس اور متضاد ہے۔ وہ نہ حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو مسلمان مانتے ہیں نہ ان کی خلافت کو برحق سمجھتے ہیں۔ نہ اہل سنت کو مسلمان سمجھتے ہیں۔ نہ ان کے وجود کو قابل برداشت۔ نہ وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز سمیت بنوامیہ کی خلافت کو جائز سمجھتے ہیں۔ نہ صحیحین سے ان کا کوئی تعلق ہے نہ وہ قرآن ہی کو موجودہ شکل میں درست سمجھتے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں اہلسنت کی تباہی اور قتل عام ہی اسلام کی سب سے زبردست اور جلیل القدر خدمت ہے۔ (ان باتوں کا مدلل ثبوت دیکھنا ہو تو ملاحظہ فرمائیے (محدث۔ فروری، مارچ، اپریل، مئی ۱۹۸۲ء)

ہم نے صوفی صاحب کو اپنے ایک طویل مکتوب میں خمینی صاحب کی تحریروں کے حوالے سے بتایا تھا کہ خمینی صاحب کا اعتقاد ہے کہ شیعوں کے امام پوری کائنات کا خدائی نظام چلاتے ہیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ والہٖ وسلم سمیت سارے انبیاء سے افضل و برتر ہیں۔ فرشتے اور انسان سب حضرت علی کے تابع فرمان ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے دشمن بھی۔

خمینی صاحب تقیہ کے اس حد تک قائل ہیں کہ حرام شرمگاہ بھی بطور تقیہ حلال جانتے ہیں، اور حضرت عائشہ وحفصہ کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شادی کو اسی بنیاد پر صحیح مانتے ہیں۔ اہلسنت کے پیچھے نماز درست نہیں مانتے لیکن بطور تقیہ پڑھنے کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے صف اول میں پڑھنے کے برابر مانتے ہیں۔ موجودہ قرآن کو صحیح نہیں مانتے بلکہ ان کا ایمان ہے کہ پورا قرآن صرف حضرت علی کے پاس تھا، جس میں مہاجرین و انصار صحابہ کرام کی سیاہ کاریاں بھی درج تھیں۔ وہ صحابہ کو کافر کہتے ہیں اور ان پر لعنت بھی بھیجتے ہیں۔ حضرت علی کے علاوہ تمام حکمراں صحابہ یعنی حضرت ابوبکر و عمر و عثمان کو سخت ظالم کہتے ہیں۔ اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز سمیت بنو امیہ کے تمام حکمرانوں کو بھی ایسا ظالم سمجھتے ہیں کہ ان کی وجہ سے احکام اسلام کا بیان ممکن نہ رہا۔ خمینی صاحب غدیر خم کی اس شیعی روایت کے قائل ہیں جس میں حضرت ابوبکر و عمر کو ابلیس سے بھی بڑا کافر کہا گیا ہے۔ خمینی صاحب امام غائب والی خرافات کے بھی قائل ہیں کہ وہی مہدی بن کر نمودار ہوں گے اور حضرت ابوبکر و عمر کو قبر سے زندہ نکال کر سولی دیں گے اور تمام سنی حکمرانوں اور ان کے درباریوں کو پانچ پانچ سو کی تعداد میں چھ بار زندہ کرکے انھیں قتل کریں گے۔ پھر ساری روئے زمین سے ابوبکر و عمر کو مسلمان سمجھنے والوں کا وجود مٹا دیں گے۔ خمینی صاحب اپنے آپ کو اسی مہدی کا نائب کہتے ہیں اور اپنی حکومت کو اسی مہدی کی آمد کی راہ ہموار کرنے والوں کی حکومت کہتے ہیں۔

صوبۂ اہواز کے عربی النسل سنی مسلمانوں پر خمینی حکومت نے بے تحاشا ظلم توڑے ہیں انھیں اپنی مادری زبان عربی پڑھنے کی اجازت نہیں۔ کردوں کو بھی سنی ہی ہونے کی وجہ سے کچلا جا رہا ہے۔ اندرون ملک بڑے بڑے سنی علماء کو جیل میں ڈال دیا گیا ہے۔ اور ان کی مسجدوں اور مدارس پر یا تو تالے ڈال دیے گئے ہیں یا شیعوں نے قبضہ کر رکھا ہے۔ سنیوں کو بالجبر شیعہ بنایا جا رہا ہے۔ اور اس سلسلے میں ایسے مظالم ہو رہے ہیں کہ مشرقی ایران کی سنی اکثریت کی ایک خاصی بڑی تعداد نے اپنے متصل روسی علاقوں میں پناہ لے رکھی ہے۔ اہل سنت کے ساتھ مل کر کام کرنے کے قائل روشن خیال شیعہ دانشوروں کو انحراف اور غلو کے الزام میں تہ تیغ کرتے کرتے صاف کر دیا گیا ہے۔

جنگ کے لائق افغان مہاجرین کی ایک خاصی تعداد کو خمینی حکومت نے ہتھیاروں کے بدلے روس کے حوالے کر دیا جنھیں روس نے تہ تیغ کر دیا بقیہ کی نگرانی قیدیوں کی طرح کی جاتی ہے۔ ابھی حال ہی میں ان کی خاصی تعداد ایران سے بھاگ کر پاکستان آئی ہے۔

روس میں ایران کے کم از کم ایک سو پراجیکٹ تیار ہو رہے ہیں اور اسلام دشمن سرگرمیوں میں ملوث

دوسرے کمیونسٹ ملکوں سے بھی ایران کی دوستی ہے۔ لبنان میں ایرانیوں نے فلسطینیوں کو کچلنے والی طاقتوں کا پورا پورا ساتھ دیا۔ عراق سے جنگ کا بہانہ یہ ہے کہ وہ بعثی یعنی بے دین ہے۔ مگر شام اس سے بھی زیادہ گندہ بعثی ہے اور اس سے ایران کی دوستی ہے۔

ایران امریکہ اور اسرائیل کے خلاف نعرے لگاتا ہے مگر اس کو عراق سے لڑنے کے لیے ہتھیار اسرائیل اور امریکہ ہی سے ملتے ہیں۔ غالباً یہ تقیہ کی برکت ہے۔

کراچی میں ایرانی طلبہ صحابہ کی لعنت و تکفیر پر مشتمل ٹریکٹ تقسیم کرتے تھے اسی پر وہاں سخت شیعہ سنی فساد ہوا۔ اسی طرح کے ٹریکٹ تقسیم کرنے پر واشنگٹن کی جامع مسجد میں بھی فساد ہوا۔ اور اس کے بعد توں تالا ڈال کر پولیس کا پہرہ رہا۔ خمینی حکومت امریکہ اور مغربی ممالک کے خلاف گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگاتی ہے مگر خمینی صاحب کے پروپیگنڈے کے دو بڑے مراکز لندن اور امریکہ میں ہیں۔ (یہ بھی تقیہ کی برکت ہے) جہاں سے اسلام پسند ممالک کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈہ کا غلغلہ بلند کیا جاتا ہے۔

نصیر الدین طوسی جس نے ہلاکو کو بغداد پر چڑھا کر بغداد اور نواحِ بغداد میں چھ کروڑ سے زیادہ مسلمانوں کا قتلِ عام کرایا تھا۔ خمینی صاحب طوسی کی اس حرکت کو اسلام کی جلیل القدر خدمت قرار دیتے ہیں۔

ان تفصیلات کی روشنی میں خمینی صاحب کا حقیقی چہرہ دیکھا جا سکتا ہے کہ وہ امت کو خود سربلند کرنا چاہتے ہیں یا امت کی لاش پر شیعی عظمت کا شیش محل تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ اور خمینی صاحب کا وجود شیعوں کے قدیم تاریخی جرائم کی ایک کڑی ہے یا ان جرائم کا کفارہ۔

یہ ہے اس طویل خط کا خلاصہ جو ہم نے پورے ثبوت اور حوالوں کے ساتھ اس موضوع پر ۲۳ر جنوری ۱۹۸۴ء کو صوفی نذیر احمد صاحب کی خدمتِ عالیہ میں روانہ کیا تھا۔ افسوس ہے کہ صوفی صاحب گہری سوجھ بوجھ اور مومنانہ فراست رکھنے کے باوجود ان سارے حقائق کے سامنے آجانے پر بھی خمینی صاحب کے بارے میں اپنی خوش فہمی اور حسنِ ظن قائم رکھے ہوئے ہیں۔ سمجھتے ہیں کہ اس باقاعدہ اتمام حجت کے بعد اب ندامت بیکار ہے۔

اگر صوفی صاحب عدم اشاعت کی صورت میں عنداللہ شکایت کا دھمکی نہ دیتے تو ہم اس موضوع کو اس ڈھنگ پر سرے سے چھیڑتے ہی نہیں۔ واللہ ولی التوفیق

●●●

جماعت و جامعہ

جاڑے کی شدت ختم ہوتے ہی اور موسم بہار کے آثار شروع ہوتے ہی جماعت کی تبلیغی سرگرمیوں پر بھی بہار آگئی۔ قریہ قریہ چھوٹے بڑے جلسوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، جن کی تفصیلات محدث کے محدود صفحات میں پیش کرنی مشکل ہے۔ البتہ بعض بعض اجلاس جماعت کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں ۲۴، ۲۵ / مارچ کو صوبائی جمعیۃ اہلحدیث مغربی بنگال کے زیر اہتمام دھلیان ضلع مرشد آباد کے اندر جامعہ رحمانیہ کے نام سے ایک عظیم اور صوبے کی مرکزی درسگاہ کی تاسیس کا اجلاس۔ نیز اسی ۲۴، ۲۵، ۲۶ / مارچ کو جامعہ احمدیہ سلفیہ لہریا سرائے دربھنگہ کا جلسہ مذاکرہ علمیہ، ۱۰، ۱۸ / اپریل کو ندوۃ المجاہدین کیرالا کے زیر سرکردگی جامعہ ندویہ کیرالا کا نفرنس، ۱۳ / اپریل کو جامعہ محمدیہ کی مسجد کا افتتاحی اجلاس اور ۱۴، ۱۵ / اپریل کو بمبئی میں جمعیۃ اہلحدیث ہند کا کنونشن اور جمعیۃ اہلحدیث بمبئی عظمیٰ کا اجلاس عام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

ان میں سے فی الحال ہمیں دربھنگہ کے مذاکرہ علمیہ کی تفصیلات دستیاب ہوسکی ہیں۔ جسے جامعہ سلفیہ کے معروف و ماہیہ ناز استاد مولانا محمد رئیس ندوی حفظہ اللہ نے ــــ جو اس مذاکرہ میں جامعہ کے نمائندہ کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے قلمبند فرمایا ہے ــ

جلسہ مذاکرۂ علمیہ دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ :

مجھے جامعہ سلفیہ بنارس کے نمائندہ کی حیثیت سے دارالعلوم احمدیہ سلفیہ لہریاسرائے دربھنگہ کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے سہ روزہ جلسۂ مذاکرۂ علمیہ میں بتاریخ ۲۴، ۲۵، ۲۶ مارچ ۱۹۸۲ء کو شرکت کی سعادت حاصل ہوئی۔

یہ جلسہ دراصل مناظرِ اسلام حضرت العلام عبدالعزیز محدث رحیم آبادی مصنف حسن البیان کی یادگار ہے، جو دارالعلوم احمدیہ سلفیہ دربھنگہ کے بانی بھی ہیں۔ یہ جلسہ عام طور سے دو سال کے وقفے کے بعد ہر تیسرے سال ہوا کرتا ہے مگر اس مرتبہ سات سال کے وقفے سے منعقد ہوا۔ اس جلسہ کی ایک مستقل اور مربوط تاریخ ہے جس کا سلسلہ حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید کی تحریک اصلاح وتجدید سے جڑا ہوا ہے۔ مسلمانوں میں اصلاح وتبلیغ کے ساتھ تحریک اہلحدیث اور مسلک اہلحدیث کی ترویج واشاعت میں اس جلسہ کا بہت ہاتھ ہے۔ اپنی سابقہ روایت کے مطابق اس سال کا جلسہ مذاکرۂ علمیہ بھی بہت کامیاب اور اثرانگیز رہا۔ اس میں عوام وخواص بہت بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ اور ملک کے طول وعرض سے مشہور علماء ومقررین نے اسے رونق بخشی۔ اس جلسہ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں مختلف مکاتبِ خیال کے علماء اور مختلف طبقات کے اہم افراد کو بھی دعوت شرکت دی جاتی ہے۔ چنانچہ اس سال بھی اس اجلاس میں ریاستی حکومت کی طرف سے وزیر تعلیم اور وزیر اوقاف کے ساتھ بعض دوسرے اہم اشخاص نے شرکت کی۔ اور دوسری طرف حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی ناظم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور مولانا شاہ منت اللہ اور مولانا مجاہد الاسلام امارتِ شرعیہ کی طرف سے شریک ہوئے۔

اجلاس کا افتتاح ۲۴ مارچ کو بوقت ۹ بجے صبح فضیلۃ الشیخ جناب مولانا عبدالصمد شرف الدین کی زیرِ صدارت قرآن مجید کی تلاوت سے ہوا۔ پھر ہر روز مقررہ اوقات اور طے شدہ پروگرام کے مطابق خطاب ہوتے رہے۔ عام طور پر اجلاس کی صدارت مولانا عبدالصمد صاحب ہی فرماتے رہے۔ البتہ بعض نشستوں کی صدارت مولانا عبدالرؤف صاحب رحمانی جھنڈانگری اور مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بھی فرمائی۔ بندۂ خاکسار کو بھی ایک تقریر کا مختصر سا وقت ملا۔ وزراء کی موجودگی میں کمسن طلبہ کی ایک تمثیلی کانفرنس "موجودہ تعلیمی مسائل کا حل" کے موضوع پر ہوئی جو پورے اجلاس کی روح وجان تھی اسے تمام سرکاری حکام خواص وعوام، علماء ومقررین نے دلچسپی اور توجہ سے ملاحظہ کیا۔ اس موقع پر سات سال کی مدت میں دارالعلوم احمدیہ سلفیہ سے فارغ ہونے والے ایک سو دس فضلاء اور اُنیس حفاظ کی

دستار بندی ہوئی، دستار بندی کے بعد فارغین کو خصوصی طور پر مولانا مختار احمد ندوی خطیب الاسلام اور مولانا علی میاں ندوی نے خطاب فرمایا اور ان کی ذمہ داریاں بتلائیں۔ پورے صوبۂ بہار کے مدارس اسلامیہ کے ناظمین اور صدر المدرسین کی ایک خاص میٹنگ ونشست بھی ہوئی جس میں مجھے شرکت کا موقع نہیں ملا۔ اسی طرح ابنائے سلفیہ کی میٹنگ بھی ہوئی لیکن میں اس میں بھی شریک نہ ہو سکا۔ مدارس کی تنظیم اور حکومت سے اپنے مطالبات اور اسی طرح کے بعض دوسرے مسائل پر غور و فکر ہوا۔ اور تجاویز پاس ہوئیں۔

اجلاس کے تیسرے دن دار العلوم احمدیہ سلفیہ کی خستہ و بوسیدہ مسجد کی تعمیر جدید و توسیع کے لیے شیخ عبد الصمد کے ہاتھوں رسم تاسیس عمل میں آئی، اس موقع پر دار العلوم احمدیہ سلفیہ کے ناظم ڈاکٹر سید عبد الحفیظ صاحب حفظہ اللہ نے اپنی طرف سے دس ہزار روپے کا چندہ دیا اور شیخ لقمان نے پانچ ہزار کا عطیہ دیا۔ جزاہما اللہ

۲۶ر مارچ کو ظہر کے وقت اجلاس ختم ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔

اس اجلاس کی تاریخی خصوصیت و روایت میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس میں شریک ہونے والے تمام خواص وعوام اور سامعین کے کھانے کا معقول انتظام ہوا کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس اجلاس کی افادیت کو عام کرے اور تمام باشندگان ہند خصوصاً مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ آمین۔

محمد رئیس ندوی : استاذ جامعہ سلفیہ بنارس۔

جامعہ کے شب و روز

جامعہ میں حسب دستور تعلیمی اور علمی سرگرمیاں جاری ہیں۔ البتہ اپریل کے اخیر میں سالانہ امتحان شروع ہو کر اوائل مئی میں ختم ہو رہا ہے۔ ۱۰ر مئی کے بعد جامعہ کی سالانہ تعطیل کلاں شروع ہو جائے گی اور پھر جامعہ دوبارہ ماہ شوال میں کھلے گا۔ جامعہ کی سرگرمیوں میں شعبہ اردو اور شعبہ عربی کے آخری اجلاس جو انعامی مقابلے کی شکل میں منعقد ہوتے ہیں اب کی بار اس کی تفصیل ناظم ندوۃ الطلبہ جناب مولوی عبد السلام (متعلم فضیلت اول) کے قلم سے پیش کی جا رہی ہے۔

ندوۃ الطلبہ کا شاندار تقریری انعامی مقابلہ :

جماعت کی مرکزی درسگاہ جامعہ سلفیہ کتاب وسنت کی خالص اور بے لاگ ترجمانی کے لیے درس و تدریس کی وسیع اور جامع خدمات کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف اور دعوت و تبلیغ کے میدانوں میں بھی اعلیٰ پیمانے پر کام کر رہا ہے۔

دعوت الی اللہ کے تمام طریق کار سے مسلح کرنے کے لیے ارباب جامعہ نے طلبہ جامعہ کی تقریری و تحریری اور علمی و فکری تربیت کے لیے انجمن ندوۃ الطلبہ قائم کر رکھی ہے جو تبلیغ دین کے دیرینہ مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے جامعہ ہی کی زیر سرپرستی مصروف کار ہے۔

ندوۃ الطلبہ کا یہ دستور اور روایت رہی ہے کہ اس کے تحت ہمیشہ تعلیمی سال کے آخری ایام میں اردو اور عربی کا تقریری مقابلہ کرایا جاتا ہے اور انعامات تقسیم کیے جاتے ہیں۔ ان مقابلوں میں طلبہ پورے جوش و خروش اور زبردست باہمی کے ساتھ شریک ہو کر اپنی تقریری صلاحیتوں کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پھر طرز و اسلوب بیان کی جاذبیت، مواد کی فراہمی مضمون کی پختگی اور اپنی کدوکاوش کے لحاظ سے جو طلبہ اول دوم و سوم آتے ہیں انھیں خصوصی انعام سے نوازا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مقابلہ میں تمام حصہ لینے والوں کو عمومی انعام بھی دیا جاتا ہے۔

اردو اور عربی ہر دو مقابلوں کے لیے طلبہ کو تین گروپوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ عالمیت اول و دوم کا پہلا گروپ عالمیت سوم و چہارم کا دوسرا گروپ اور فضیلت اول و دوم کا تیسرا گروپ۔ ہر گروپ کے لیے ایک عنوان مقرر کر دیا جاتا ہے جس پر مقابلہ میں حصہ لینے والے اس گروپ کے تمام طلبہ مکمل تیاری کے بعد اپنی خطیبانہ صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اس کی روشنی میں اس گروپ کے اول دوم سوم آنے والوں کی تعیین کی جاتی ہے۔ پوزیشن کی اس تعیین کا طریق کار یہ ہے کہ ہر گروپ کے لیے جامعہ کے اساتذہ میں سے ایک استاذ صدر اور تین اساتذہ حکم ہوا کرتے ہیں۔ ہر حکم ایک مقرر کو زیادہ سے زیادہ ۳۳ نمبر دینے کا مجاز ہوتا ہے۔ گروپ کے سارے طلبہ تقریر ختم کر لیتے ہیں تو حکم صاحبان کے دیے ہوئے نمبرات جوڑے جاتے ہیں اور اسی کی بنیاد پر اول، دوم اور سوم کی تعیین کی جاتی ہے۔

اس سال بھی بہ توفیق الٰہی اساتذہ کرام کی قیادت و رہنمائی اور طلبہ کے باہمی تعاون سے ندوۃ الطلبہ کے زیر اہتمام بڑے شد و مد کے ساتھ ۱۵؍ مارچ کو شعبہ اردو اور ۲۱؍ مارچ کو شعبہ عربی کے تقریری انعامی مقابلے منعقد ہوئے جن میں طلبہ نے کافی جوش و خروش کے ساتھ خاصی تعداد میں شرکت کی۔

شعبہ اردو کے مقابلے کے موضوعات اور پوزیشن حاصل کرنیوالوں کی تفصیل یہ ہے:

پہلے گروپ (عالمیت اول و دوم) کا موضوع مقابلہ: تصورِ آخرت ـــ عقل کی روشنی میں

اس موضوع پر (۱) محمد فرخ (عالمیت دوم) نے پہلی پوزیشن (۲) محمد ہاشم (عالمیت دوم) نے دوسری اور (۳) عبدالعزیز (عالمیت دوم) و محمد شاکر (عالمیت اول) نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔

دوسرے گروپ (عالم سوم وچہارم) کا موضوعِ مقابلہ: ملت اسلامیہ ہند پر سلفی دعوت کا اثر
ـا عنوان پر (۱) محمد حسین (عالیت چہارم) نے پہلی (۲) عبداللہ (عالیت چہارم) نے دوسری اور (۳) ریاض الدین
ـالیت چہارم) نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔

تیسرے گروپ (فضیلت اول ودوم) کا موضوعِ مقابلہ: مذہب وسیاست میں ربط کی نوعیت "
ـا گروپ میں (۱) ابوالمکرم (فضیلت ثانی) نے پہلی پوزیشن (۲) عبیداللہ بن امراللہ (فضیلت اول) نے دوسری اور
ـند سراج الدین (فضیلت اول) نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔

اخیر میں گروپ کے مقابلے کے صدر مولانا صفی الرحمٰن صاحب استاذ جامعہ نے چند اختتامی کلمات کے بعد
ـائج کا اعلان کیا۔

شعبۂ عربی کے تقریری مقابلے کے موضوعات اور کامیاب ہونے والوں کی تفصیل یہ ہے:

ـلے گروپ (عالم اول ودوم) کا موضوعِ مقابلہ: خلق المسلم فی ضوء الكتاب والسنة
اس مقابلے میں جاوید مصطفٰے (عالیت دوم) نے پہلی پوزیشن (۲) محمد اشفاق (عالیت اول) نے دوسری
ـر محمد شاکر (عالیت اول) نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔

دوسرے گروپ (عالم سوم وچہارم) کا موضوعِ مقابلہ: الاعتصام بالسنة، اهمية ومكانة فی الشريعة
ـا مقابلے میں فضل اللہ (عالیت چہارم) نے پہلی پوزیشن (۲) غیاث الدین (عالیت سوم) نے دوسری پوزیشن اور
ـر حسین (عالیت چہارم) نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔

تیسرے گروپ (فضیلت اول ودوم) کا موضوعِ مقابلہ: موقف الاسلام من الجهاد بالسيف "
ـا عنوان پر (۱) ابوالمکرم (فضیلت دوم) نے پہلی پوزیشن (۲) محمد ارشد (فضیلت اول) نے دوسری اور (۳) عبدالرحیم
ـفضیلت اول) نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔

تقاریر کے خاتمے کے بعد عزت مآب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن صاحب ازہری حفظہ اللہ نے اپنی مصلحانہ و مشفقانہ ہدایات
ـے ساتھ جلاس کے اختتام کا اعلان کیا۔ اللہ تعالیٰ ہم تمام طلبہ کو مزید عزم وہمت عطا کرے اور اسلام کی صحیح اور مطلوبہ خدمت
ـام دینے کی توفیق بخشے۔ آمین

عبدالسلام بستوی
ناظم ندوۃ الطلبہ۔

ہماری نظر میں

۱۔ ردّ الاشراک

تالیف: شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ تحقیق و تخریج: محمد عزیز شمس

صفحات: ۱۰۴ قیمت: درج نہیں

پتہ: المکتبۃ السلفیہ، شیش محل روڈ لاہور پاکستان۔

یہ شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی نہایت گرانمایہ اور بلندپایہ عربی تالیف ہے جس میں شاہ صاحب نے قرآن مجید کی آیات اور مستند احادیث کے ذریعہ مسلمانوں کے اندر رائج شرکیات کی تردید فرمائی ہے۔ یہی کتاب وہ گوہر گرانمایہ ہے جس کے باب اول کی شرح خود شاہ صاحب نے "تقویۃ الایمان" کے نام سے کی ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب کو ایک مقدمہ اور دو ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پھر ہر باب کے تحت متعدد ذیلی عنوانات ہیں۔ کتاب کی اہمیت اور نوعیت کا اندازہ فہرست مضامین سے کیا جاسکتا ہے جو یہ ہے۔

(۱) باب (اول) ارتکاب شرک سے اجتناب، ذیلی عنوانات: ذکر رد الاشراک فی العلم ذکر رد الاشراک فی التصرف، ذکر رد الاشراک فی العبادہ، ذکر رد الاشراک فی العادات

(۲) باب (دوم) سنت کے اتباع اور بدعت سے اجتناب کا وجوب۔ ذیلی عنوانات: ذکر حقیقۃ الایمان ذکر الایمان (بالقدر) ذکر رد بدعات القبور، ذکر رد بدعات التقلید، ذکر رد بدعات الرسم۔

ہر عنوان کے تحت پہلے قرآن مجید کی آیات ہیں، پھر احادیث، اور عموماً انہی دو چیزوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔ شاہ صاحب نے کہیں کہیں کوئی بات توضیح و تشریح یا استنباط کے طور پر کہی ہے اس طرح دین کے مذکورہ بالا بنیادی معاملات و مسائل میں خالص کتاب و سنت کے ذریعہ حق کو اس کی اصل جگمگاتی ہوئی اور تابناک شکل میں پیش کردیا گیا ہے۔ اور اللہ تعالی کی صراط مستقیم سے ہر طرح کے گرد و غبار جھاڑ دیے گئے ہیں۔

بدقسمتی سے یہ کتاب ابتک زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکی تھی اور اس کے مخطوطے بھی اتنے کمیاب تھے کہ

انھیں نایاب سمجھ لیا گیا تھا۔ ایک بار نواب صدیق حسن خان رحمۃ اللہ علیہ نے ایک نسخے کی بنیاد پر اسے شائع بھی فرمایا تو اس میں مختلف نوع کا اضافہ فرما کر اس طرح اصل کے ساتھ مخلوط کر دیا تھا کہ اصل اور اضافے میں تمیز ممکن ہی نہ رہ گئی تھی۔ خدا بھلا کرے شیخ محمد عزیز شمس کو کہ موصوف نے پوری جانفشانی کے ساتھ اس کے پانچ مخطوطوں کا پتہ لگایا اور ان میں سے چار مخطوطوں کے تقابل و تحقیق کے بعد ایک جامع اور تحقیقی نسخہ تیار کیا۔ موصوف ہمارے جامعہ سلفیہ کے فارغ ہیں اور پھر مدینہ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر اب جامعۃ القریٰ مکہ مکرمہ میں ایم اے کر رہے ہیں۔ تحقیق و تنقید کا نہایت صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں۔ انھوں نے حواشی میں تمام آیات واحادیث کی جامع تخریج کی ہے۔ دیگر مراجع کے حوالے بھی دیے ہیں اور بوقت ضرورت احادیث پر فنی حیثیت سے گفتگو بھی کی ہے۔ شروع میں آٹھ صفحات کا مقدمۂ تحقیق ہے اور چار صفحات میں شاہ صاحب رحمہ کا سوانحی خاکہ۔ اس طرح کتاب کی افادیت اور جامعیت میں علمی حیثیت سے بھی بڑا اضافہ ہو گیا ہے۔

طباعت نہایت عمدہ اور عمدہ حروف کی ہے۔ کاغذ اعلیٰ اور معیاری ہے۔ البتہ تصحیح کا اہتمام نہیں کیا گیا ہے۔ جس کی وجہ سے اغلاطِ طباعت کی بھرمار ہے اور بعض بعض جگہ بڑے دلچسپ تصرفات ہو گئے ہیں۔

تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی کا مشرکانہ عقیدہ:

تحریر: ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی ترتیب: محمد عنایت اللہ ندوی صفحات: ۸ تقسیم: بلاقیمت

پتہ: ادارہ تحریک اسلامی 11-3-926/7 نزد تاج محل ٹاکیز۔ ملے پلی۔ حیدرآباد (اے۔ پی۔)

اس مختصر سے ٹریکٹ میں پہلے تبلیغی جماعت کے چند ایسے عقائد کی نشاندہی کی گئی ہے جن کے ڈانڈے شرک سے ملتے ہیں، مثلاً "اللہ کا بندہ مرتا نہیں بلکہ نقلِ مکانی کر جاتا ہے۔ اور پھر اس بارگاہِ عالم میں تصرفات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر دیتا ہے۔" "نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی قبر سے نکل کر مرے ہوئے سودخوار حاجی کے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور اس کے چہرے کی سیاہی نورانیت میں بدل جاتی ہے۔" "ملا جامی نعت پڑھنے کی غرض سے قبر نبوی پر چلنے لگے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے والیٔ مکہ کو منع کر دیا کہ جامی ہرگز مدینہ نہ آنے پائے، کیونکہ آپ کو خدشہ تھا کہ قبر سے باہر ہاتھ نکال کر جامی سے مصافحہ کرنا پڑے گا۔"

اس کے بعد جماعت اسلامی کے سلسلے میں بتایا گیا ہے کہ ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات ہیں کہ غیب کی بات اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ ماں کے رحم میں کیا ہے۔ لیکن دوسری طرف

اس جماعت کے بانی مولانا مودودی لکھتے ہیں "میری پیدائش کے تین سال پہلے ایک بزرگ نے میرے والد کو ایک لڑکے کی پیدائش کی بشارت دی تھی۔ اور کہا تھا اس کا نام ابوالاعلیٰ رکھنا۔ والد صاحب نے ان کی بات مان کر میرا یہی نام رکھا۔"

(تصویر اور تعمیر سیرت ص ۱۵)

اس سے زیادہ بھیانک مولانا مودودی کا یہ فیصلہ ہے کہ "اگر کوئی شخص ولی اللہ کی قبر پر زور زور سے پکار کے اپنے حق میں دعا کرنے کی درخواست کرے تو ایسی صورت میں اعتقاد کی خرابی تو لازم نہ آئے گی مگر یہ اندھیرے میں تیر چلانا ہوگا۔" (فاران توحید نمبر ص ۸۲، ۸۳، رسائل ومسائل ۳/۶۹ ۳)

اس کتاب میں یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ مولانا مودودی نے اپنی حکومت الٰہیہ کے قیام کی دعوت وتجویز کے سلسلے میں فرمایا تھا کہ "انگریزی اقتدار اور جمہوری اقتدار شرک ہے۔ اور اس کی اسمبلیاں اور پارلمنٹ الرسا ز اور لرے ہیں۔ الا کے انتخابات میں حصہ لینا یعنی ووٹ دینا اور ووٹ لینا اصلاً حرام اور عقیدۂ توحید کے منافی ہے، لیکن ۱۴ دسمبر ۱۹۶۱ء کو جماعت اسلامی ہند نے غیر اسلامی مجالس قانون ساز کے انتخابات میں حصہ لینے یعنی ووٹ دینے اور ووٹ لینے کو جائز اور عقیدۂ توحید کے مطابق قرار دیدیا۔ اور اس سلسلے میں مولانا مودودی نے اپنے ایک رفیق کے نام خط میں لکھا کہ ہندوستان کی تحریک اسلامی کے لوگوں کو اپنے حالات دیکھتے ہوئے خود ہی یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ آیا انتخابات میں حصہ لینے سے ان کے حق میں واقعی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے .... پھر اکثریت جو فیصلہ کرے اسے قبول کرلینا چاہیے۔ بعد میں اگر معلوم ہوا کہ اس فیصلے سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا تو اس پر نظر ثانی کی جاسکتی ہے۔" (یادوں کے خطوط ص ۱۱۵)

کتابچہ کے مرتب نے اظہار حیرت کیا ہے کہ جو چیز خود مولانا مودودی کے حسب ارشاد شرک ہے وہ جماعت اسلامی کی اکثریت کے فیصلے سے جائز اور مطابق توحید کیونکر ہوسکتی ہے؟ یہ کتابچہ اگرچہ مختصر ہے لیکن ہر شخص کو بغور پڑھنا چاہیے۔ اور یہ سوچنا چاہیے کہ رضائے الٰہی اور نجات آخرت کا دارومدار ایمان وتوحید کی سلامتی پر ہے۔ اگر کسی تنظیم اور جماعت کی حمایت اور جانبداری کے چکر میں یہ چیز کھودی گئی تو قیامت کے روز کوئی جماعت یا کوئی بڑے سا بڑا امام اپنا سارا زور بیان، ساری منطق اور سارے وسائل صرف کرکے بھی بخشوا نہیں سکتا۔ پس ایمان وتوحید کے سلسلے میں ہر شخص کو اپنی ذمہ داری سمجھنی چاہیے اور اپنے دین کے سلسلے میں ہر طرح کی گروہ بندی سے بالاتر ہوکر سوچتا رہنا چاہیے۔

●●●

الفت رسولؐ کی

نسیم بنارسی

دل میں اگر کسی کے ہے الفت رسول کی
لازم ہے ہر عمل میں اطاعت رسول کی
روشن رہے گی اس کی نظر میں صراط حق
جس کے عمل میں رہتی ہے سنت رسول کی
دستور زندگی کلام ہے اللہ کا کلام!
فرمانِ مصطفےٰ ہے شریعت رسول کی
رسی خدا کی تھام لو مل کر اے مومنو!
تفریق سے بچے گی جماعت رسول کی
تقلید سے جہاں کو جو ملتی صراطِ حق
پڑتی نہ پھر کبھی بھی ضرورت رسول کی،
دنیا میں آج ساری ضلالت اسی سے ہے
تحقیق سے ہے دور جو امت رسول کی
اقوالِ غیر سنتے ہی کہتے ہیں جو عمل
ملتی نہیں ہے ان کو ہدایت رسول کی

قولِ امام چھوڑ دیں ایمان ہے یہی
مل جائے ہم کو جب کوئی سنت رسول کی
قرآن اور حدیث پہ جس کا ہو ہر عمل
واللہ اس کو کہتے ہیں امت رسول کی
دنیا میں جو قدم بہ قدم مصطفےٰ چلا
روزِ جزا ملے گی شفاعت رسول کی
سمجھائیں ہر کسی کو حدیثِ رسولِ پاک
عالم کو جب ملی ہے نیابت رسول کی
اصحابِ مصطفےٰ کا عمل تھا حدیث پر
تسلیم دل سے کی تھی امامت رسول کی
کرتے تھے ہر امام ہر اک آن ہر گھڑی
حکم خدا کے ساتھ اطاعت رسول کی
ان کا امام کون تھا کیا مصطفےٰ نہ تھے
تسلیم تھی سبھی کو نبوت رسول کی۔

لازم ہے ہم پہ آج ضلالت سے دور ہوں
اپنائیں ہر عمل میں طریقت رسول کی
دنیا میں عام ہم کریں فرمانِ مصطفےٰ
اللہ کی زمیں ہو خلافت رسول کی
مظلوم کو بچالے جو ظالم کے ظلم سے
دیکھے نگاہِ شوق مروت رسول کی
دل میں کسی یتیم کے احساسِ غم نہ ہو
جنت میں پھر ملے گی معیت رسول کی
جلوت میں رہ کے عام کیا اپنا ہر عمل
پیشِ نظر جہاں کے ہے خلوت رسول کی
اللہ کے رسول سراجِ منیر تھے۔
ہے ظلمتوں سے دور شریعت رسول کی
دل سے دعا ہے آج خدا کی جناب میں
چھوٹے نہ اب نسیم سے سنت رسول کی۔

جامعہ سلفیہ کی اسناد مسلم یونیورسٹی نے تسلیم کر لیں :

ہم جامعہ سلفیہ کے فارغین و متعلقین کو مسرت کے ساتھ یہ اطلاع دیتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ نے جامعہ کے درجۂ عالمیت اور درجۂ فضیلت کی سندوں کو حسب ذیل تفصیل کے ساتھ منظور کر لیا ہے۔

۱ — عالمیت کی سند پری یونیورسٹی کے برابر مان لی گئی ہے۔ لہذا اس سند سے مسلم یونیورسٹی کے بی۔ اے۔ سال اول میں اور طبیہ کالج کے بی۔ یو۔ ایم۔ ایس۔ میں داخلہ لیا جا سکتا ہے۔

۲ — فضیلت کی سند بی۔ اے۔ کے برابر مان لی گئی ہے۔

لہذا اس سند کی بنیاد پر مسلم یونیورسٹی کے ایم۔ اے۔ عربی میں داخلہ لیا جا سکتا لیکن اسکیلئے شرط ہے کہ طالبعلم نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے۔ آنرس (صرف انگلش میں) پاس کیا ہو۔

یہ بھی منظور کر لیا گیا ہے کہ جامعہ کا مذکورہ بالا امتحان پاس کرنے والا طالبعلم علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کے پی۔ یو۔ سی۔ (انگلش) اور بی۔ اے۔ آنرس (انگلش) کے امتحانات میں شریک ہوسکتا ہے۔

ایڈیٹر محدث کی سیرت کی کتاب سعودی مدارس کے نصاب تعلیم میں :

مدینہ یونیورسٹی کے سابق سکریٹری اور موجودہ رئیس امور دعوت شیخ عمر محمد فلاتہ جو اہلحدیث کنونشن بمبئی میں تشریف لائے تھے ان سے معلوم ہوا کہ سیرت کی وہ عربی کتاب جس پر ایڈیٹر محدث نے چند سال قبل رابطہ عالم اسلامی کے تحت ہونے والے عالمی مقابلہ سیرت نویسی میں پہلا انعام حاصل کیا تھا اب وہ سعودی عرب کے طلبہ و طالبات کے مدارس میں نصاب تعلیم کے اندر داخل کر لی گئی ہے۔ اور سیرت کے باب میں اسے ایک اہم مرجع قرار دیا گیا ہے۔

MAY **MOHADDIS** 1984

THE ISLAMIC CULTURAL & LITERARY MONTHLY MAGAZINE
AL-JAMIATUS SALAFIAH (AL-MARKAZIYAH) VARANASI (INDIA)

Published from Markazi Darul-Uloom
Printed by Abdul Waheed
At Salafiah Press, Reori Talab, Varanasi.

مرکزی دار العلوم بنارس کا دینی علمی اور ادبی ماہنامہ

محدث



ادارۃ البحوث الاسلامیۃ والدعوۃ والافتاء بالجامعۃ السلفیۃ بنارس

★

جلد ۲۴ شمارہ ۷ ◎ مطابق جمادی الاول ۱۴۲۷ھ ◎ جون و جولائی ۲۰۰۶ء

برگ وبار

جامعہ سلفیہ کا علمی ادبی اور اصلاحی رسالہ

ماہنامہ

محدّث

بنارس

رمضان، شوال ۱۴۰۴ھ
جون جولائی ۱۹۸۴ء
جلد ۳ شمارہ ۶، ۷

ترتیب

صفی الرحمٰن مبارکپوری

• ناشر: جامعہ سلفیہ بنارس • طابع: عبدالوحید • مطبع: سلفیہ پریس بنارس

بدلِ اشتراک

• سالانہ: ۲۵ روپئے
• ششماہی: ۱۳ روپئے
• فی پرچہ: ۲/۵۰ روپئے
• بیرونِ ملک سے سالانہ: ۱۵ ڈالر

(۵)

تزئین وکتابت

[illegible]

پتہ

خط وکتابت کے لیے: ایڈیٹر محدث، جامعہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس
بدل اشتراک کے لیے: مکتبہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، بنارس
MAKTABA SALAFIA . REORI TALAB VARANASI 221010
ٹیلی گرام: "دارالعلوم" وارانسی • ٹیلی فون: ۶۳۵۷۷

فصلِ بہاراں

شوق اعظمی

★

شاد اے چشمِ تمنا مہِ رمضاں آمد   مژدہ اے غنچۂ دل فصلِ بہاراں آمد
جان و دل گشت معطر ز شمیمِ رحمت   گل بداماں و در آغوشِ گلستاں آمد
رحمت و فضلِ خداوند درِ خلد کشود   بوئے خوش از طرفِ روضۂ رضواں آمد
روزہ دار است کہ بوئے دہنش نزدِ خدا   خوشتر از مشک و گل و سنبل و ریحاں آمد
اے خوشا ماہ کہ نازل شدہ قرآں در و   آنکہ از بہرِ ہدایت بہ مسلماں آمد
روح بخشِ دل و جاں است یکے جزوِ او   ماہِ رمضاں کہ بہ جانش مئے عرفاں آمد
جائے آں است کہ عاصی بہ مقدر نازد   ابرِ رحمت ز پئے شستنِ عصیاں آمد
ہاتفِ غیب شب و روز ندائے دارد   طالبِ عفو بیا موسمِ غفراں آمد
لیلۃ القدر کہ بہتر ز ہزاراں ماہ است   شکر ایزد کہ بہ صد جلوہ فروزاں آمد
قابلِ رشک دریں ماہ بود قسمتِ او   ہر کہ با چشمِ تر و دیدۂ گریاں آمد
روزہ داراں کہ فزوں روزیٔ ایشاں گردید   وقتِ افطار چہا نعمتِ الواں آمد
جذبۂ خیر فزوں گشتہ و ابلیسِ لعیں   پا بہ زنجیر بہ صد ذلت و خسراں آمد

باد ہر شام و سحر وردِ زباں مصرعۂ شوق
شادے اے چشمِ تمنا! مہِ رمضاں آمد

★



نقشِ راہ

عبادت یا کھلواڑ

رمضان کا مہینہ آتا ہے تو اپنے دامن میں خیر و برکت اور سعادت و خوش نصیبی کے ذخیرے لاتا ہے لوگوں کے بڑے جذبات و عزائم سرد پڑ جاتے ہیں۔ جو لوگ سال بھر عبادت سے غافل رہتے ہیں وہ اس مہینے میں عبادت میں لگ جاتے ہیں اور جو ہمیشہ عبادت کرتے رہتے ہیں اس مہینے میں ان کا جذبۂ عبادت کچھ اور ہی تیز ہو جاتا ہے۔ اس ماہِ مبارک میں عبادتوں کا درجۂ و مقام اور اجر و ثواب بھی بقیہ مہینوں کی بہ نسبت بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ اس لیے یہ مہینہ خیر و برکت سے مالا مال ہونے کیلئے ایک بہت ہی غنیمت موقع کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کی برکتوں سے محرومی بڑی حسرتناک ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مہینے کے آخری دس دنوں کو مزید خصوصی اہمیت دی ہے آپ آخری عشرہ آتے ہی کمر کس کر تیار ہو جاتے، پوری پوری رات عبادت میں گزارتے اور اہل و عیال کو بھی بیدار رکھنے کا اہتمام فرماتے، اسی آخری عشرے کا واقعہ ہے کہ آپ نے ایک سال تین روز رات کی نماز جماعت سے پڑھائی اور پھر اس اندیشے سے جماعت بند کر دی کہ کہیں یہ نماز فرض نہ کر دی جائے، اور پھر یہ مسلمانوں پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ بن جائے۔ اسی آخری عشرے کی ایک طاق رات لیلۃ القدر ہوا کرتی ہے جس کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ ہزار مہینوں سے افضل ہے اور جس کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

مَن صام رمضان ایماناً واحتسابا غفرله ما تقدم من ذنبه ومن قام رمضان ایمانا واحتسابا غفرله ما تقدم من	جو رمضان میں ایمان کے ساتھ ثواب کی نیت سے روزہ رکھے اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے اور جو رمضان کی راتوں میں ایمان کے ساتھ ثواب کی

ذنبه ومن قام ليلة القدر ايمانا واحتسابا غفر له ما تقدم من ذنبه۔

نیت سے قیام کرے (نماز تراویح پڑھے) اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور جو لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ ثواب کی نیت سے قیام کرے (نماز تراویح پڑھے) اس کے پچھلے گناہ بخش دیئے جائیں گے۔ (متفق علیہ)

اس ترغیب کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں نے رمضان میں عموماً اور لیلۃ القدر میں خصوصاً ہمیشہ تراویح اور عبادت کا خاص اہتمام کیا لیکن امت کا یہ بڑا دردناک المیہ ہے کہ جس طرح اور اسلامی کاموں کی روح نکل گئی رسم باقی رہی، مغز جاتا رہا اور چھلکا باقی رہا (جس کی تزئین و آرائش کا اتنا اہتمام کیا گیا کہ دیکھنے والوں کی نگاہیں خیرہ ہو جائیں) اسی طرح رمضان کے آخری عشرے اور لیلۃ القدر کی عبادتوں کی روح بھی نکل گئی۔ اور جو کچھ باقی رہا وہ محض بے جان چھلکا ہے۔

سب لوگ جانتے ہیں کہ عبادت میں اور خصوصاً نماز میں بندے اور اللہ کے درمیان ایک خصوصی ربط ہوتا ہے۔ بندہ اپنی روح بلکہ پورے وجود کے ساتھ اپنے پروردگار کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اپنے گردوپیش کے حالات سے بالکل بے نیاز اور بے تعلق ہو کر اللہ سے سرگوشیاں کرتا ہے۔ اور عجز و نیاز کے ساتھ اپنی دنیوی اور اُخروی حاجات پیش کر کے دونوں جگہ کے خیر کا طالب ہوتا ہے۔ یہ کیفیت صرف یہی نہیں کہ یکسوئی چاہتی ہے بلکہ ایسی تنہائی بھی چاہتی ہے کہ اس میں نہ کوئی مخل ہو سکے نہ کسی کو اس کا علم ہو سکے۔

اگرچہ بعض مصالح کے پیش نظر اس تنہائی کو شرعاً لازم نہیں قرار دیا گیا ہے تاہم پسندیدہ ضرور گردانا گیا ہے اور سارے علائق دنیا سے کٹ کر پورے خشوع و خضوع کے ساتھ نماز میں یکسوئی کو تو بہرحال لازمی قرار دی گئی ہے۔ اس یکسوئی میں خیالات اور وسوسوں ہی کے ذریعہ بھی جس قدر خلل ہوگا عبادت اتنی ہی ناقص ہوگی۔ اور یہی وجہ ہے کہ عبادت کو نمائش اور ریاکاری سے آلودہ کرنا سنگین گناہ قرار دیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ ایسی عبادت کو اللہ تعالیٰ رد کر دے گا۔

یہ شبینے؟

ان باتوں کو ملحوظ رکھ کر ذرا اس دھوم دھام پر نظر ڈالیے جو ہر سال ماہ رمضان میں عبادت کے نام پر بہت سے شہروں میں کی جاتی ہے۔ آخری دس دنوں کی

کسی ایک رات کو۔ عموماً ستائیسویں رات کو۔ پورا قرآن ختم کرنے کے لیے شبینہ کا اہتمام کیا جاتا ہے اور اب بعض لوگ ایک رات کے بجائے دو رات میں ختم قرآن کا پروگرام رکھ کر اسے شبینہ کے ہم قافیہ ایک دوسرے نام "دودینہ" سے موسوم کرتے ہیں ان شبینوں اور دودینوں میں جو پیچ در پیچ خرافات ہوتی ہیں وہ ہر سنجیدہ مسلمان کے لیے لائق عبرت ہیں۔

ان شبینوں کے لیے حفاظ کی ٹولیاں فراہم کی جاتی ہیں جو باری باری اپنے مقررہ حصۂ قرآن کے ساتھ تراویح پڑھاتے ہیں اور عموماً اس قدر تیز رفتاری سے قرآن پڑھتے ہیں کہ آیات کا درمیانی حصہ تو درکنار آخری الفاظ یعنی یعلمون تعلمون وغیرہ کا بھی پتہ نہیں چلتا۔ یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ ایک تو ایک رات میں پورا قرآن پڑھنا ہی ناپسندیدہ ہے پھر اس کے لیے جو رفتار اختیار کی جاتی ہے وہ انتہائی ناپسندیدہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی نے آکر کہا کہ میں ایک رکعت میں پورا مفصل پڑھ ڈالتا ہوں، انھوں نے کہا: اھذّا کھذّ الشعر ونثرا کنثر الدقل (سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۱۹۱) کیا شعر جیسی تیز رفتاری سے کھینچتے ہو اور اس طرح بھر بھراتے ہو جیسے ردی کھجور (درخت ہلانے پر) بھربھرا کر گرتی ہے۔ اس کے بعد آپ نے بتلایا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کی مقدار اور رفتار کیا تھی۔

ان شبینوں میں یہ حال تو اماموں کا ہوتا ہے۔ مقتدیوں کی کیفیت یہ رہتی ہے کہ پورا ایک جھرمٹ جمع ہو جاتا ہے۔ جن میں سے عموماً صرف چند افراد امام کے پیچھے کھڑے ہوتے ہیں، بقیہ لوگ بیٹھے گپ ہانکتے رہتے ہیں۔ کہیں چائے پک رہی ہوتی ہے اور کہیں بریانی کی دیگ چڑھی ہوتی ہے کہیں مسجد کے گوشے ہی میں یا اس سے متصل باہر حقے، سگریٹ، اور بیڑی کا دور چل رہا ہوتا ہے۔ ایسی اکثریت کی ساری عبادت تو چائے بریانی اور حقے سگریٹ کے گرد سمٹ کر رہ جاتی ہے۔ باقی چند افراد جو شریک نماز رہتے ہیں ان کی بھی ساری یکسوئی اور خشوع وخضوع درہم برہم رہتا ہے۔ بس محض رسم کی پابندی اور رکھ رکھاؤ میں قیام ورکوع وسجود کی مشقت برداشت کرتے ہیں۔ کہیں یہ لطیفہ کارستانی بھی ہوتی ہے کہ امام تنہا نماز پڑھتا اور قرأت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ طے رہتا ہے کہ جب صرف چند آیات باقی رہیں تو رفتار دھیمی کر دے۔ مقتدی پیچھے بیٹھے رہتے ہیں۔ رفتار دھیمی ہوتے ہی سمجھ جاتے ہیں کہ اب اسٹیشن قریب ہے لہٰذا نماز میں جا شامل ہوتے ہیں اور اتنے میں امام رکوع میں چلا جاتا ہے۔ پھر دوسری رکعت ہلکی پڑھی جاتی ہے اس طرح یہ شب بیداری عبادت گناہ بلکہ

مشقت سے بچ جاتے ہیں۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ اب بے پناہ قمقموں اور بلب کا اہتمام کرکے مسجدوں کو چراغاں کیا جاتا ہے اور لاؤڈ اسپیکر کی کرخت آواز پر قرآن کی تلاوت اس طرح کی جاتی ہے کہ دو دو تین تین میل تک سنائی پڑتی ہے رات بھر یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ جو شخص چند لمحوں کے لیے سونا چاہے سو نہیں سکتا، جسے پاخانہ پیشاب کی حاجت ہے وہ مجبور ہے کہ تلاوت سنتا رہے اور حاجت پوری کرتا رہے۔ جو بیمار ہے وہ زچ ہوکر کروٹیں بدلتا رہے اور تلملاتا رہے۔ غرض یہ تلاوت قرآن کو پرکشش بنانے کے بجائے گوناگوں اذیتوں کا سبب بن کر قرآن سے اکتاہٹ اور اس کی بے حرمتی کا سبب بنتی ہے۔ پھر تلاوت کے لیے آواز کی یہ مقدار ان خرابیوں کے علاوہ سنت نبوی کے بھی خلاف ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت کا حال یوں بیان کرتے ہیں:

كان قراءة النبي صلى الله عليه وسلم على قدر ما يسمعه من في الحجرة وهو في البيت۔ (ابوداؤد)

یعنی آپ کی قرأت کی مقدار اتنی ہوتی تھی کہ آپ گھر میں قرأت کر رہے ہوں تو بیٹھک میں موجود آدمی سن سکے۔

ولا تجهر بصلاتك ولا تخافت بها وابتغ بين ذلك سبيلا۔

آپ اپنی نماز (یعنی قرأت) کے ساتھ آواز (بہت) بلند نہ کریں اور بالکل پست بھی نہ کریں اور ان دونوں کے درمیان کا راستہ تلاش کریں (یعنی درمیانی آواز سے قرأت کریں۔ نہ بہت بلند نہ بالکل دھیمی)

یہ کتنی المناک بات ہے کہ قرآن کی تلاوت میں خود قرآن کی ہدایت اور صاحب قرآن کے اسوہ کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ پھر بھی خوش فہمی یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اور اسلام کی سربلندی کا کام کیا جا رہا ہے۔ یاد رہے کہ اسلام ایک بڑا سنجیدہ اور حقیقت پسند دین ہے اور عبادت خشوع وخضوع اور رب سے سرگوشی ومناجات کی کیفیت چاہتی ہے۔ دھوم دھام، ہاؤ ہو، کھانے پینے کے ہنگاموں اور جشن کے رنگ ڈھنگ کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ یہ ہنگامے اور کھلواڑ اس رات میں آنے والی برکت سے محرومی کا سبب بنتے ہیں۔

اس لیے ان مبارک راتوں کو اس طرح ضائع نہ ہونے دیجیے ۔

ضمناً یہ ذکر کر دینا بھی بیجا نہ ہوگا کہ مسجدوں میں چراغاں کرنے کا رواج کوئی اسلامی رواج نہیں ہے بلکہ یہ بڑی خطرناک اور اسلام دشمن سازش کی یادگار ہے ۔ اس کی ابتدا اس طرح ہوئی تھی کہ مجوسی النسل آتش پرست ایرانیوں نے اسلام کے سیل رواں کے آگے جب بے دست و پا ہو کر اسلام قبول کیا تو ان میں اونچے اور بڑے لوگوں کی ایک خاصی تعداد ایسی تھی جس نے اگرچہ بظاہر اسلام قبول کر لیا تھا مگر وہ در پردہ اپنے اصل آبائی دین کی دلدادہ تھی ۔ ان لوگوں نے اپنی چرب دستی اور چابک دماغی سے دربار خلافت میں اثر و رسوخ حاصل کیا ۔ اس کے بعد وہ آگ کی تعظیم اور اس کی پوجا کا کھلم کھلا مظاہرہ تو نہ کر سکتے تھے مگر اس مقصد کے لیے اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر یہ چور دروازہ پیدا کیا کہ شب قدر یا برات میں خوب چراغاں کیا جائے ۔ اس سے بظاہر شب قدر کی اہمیت کا اظہار مقصود تھا مگر درحقیقت یہ آگ کی تعظیم اور پوجا کا ایک پس پردہ حیلہ تھا ۔ اسی لیے اصل حقیقت کھل جانے پر یہ بھی فارسیوں کے زوال کا ایک سبب بنا ۔ بس ہمیں اس میں ملوث ہونے کے بجائے اس سے عبرت حاصل کرنی چاہیے ۔

• • •

جامعہ سلفیہ میں شیخ امین اللہ ابوبکر (نائیجیریا) کی آمد

موصوف اپریل کے اواخر میں جامعہ تشریف لائے ۔ آپ نائجیریا کے تعلیدی اور مشائخ پرستی کے تاریک ماحول میں سلفی دعوت کے داعی و منادا اور نقیب ہیں ۔ آپ ڈاکٹر عبدالعلی ازہری دموناتھ بھنجن کے شاگرد ہیں اور مدینہ یونیورسٹی کے فاضل ۔ ۱۹۴۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۸ء میں تعلیم مکمل کی ، دینی اور تبلیغی امور سے دلچسپی آپ کو زمانۂ طالب علمی ہی سے تھی ۔ فراغت کے بعد نائجیریا کے مشہور شہر کانو میں سلفی دعوت و جماعت کی بنیاد رکھی ۔ اور بڑی تیز رفتاری سے ترقی و وسعت اختیار کی اور اب باقاعدہ ایک سلفی جماعت تیار ہو گئی ہے ۔ قادریہ اور تیجانیہ کی جانب سے آزمائشیں بھی کھڑی کی گئیں لیکن آپ حزم و تدبر کے ساتھ اپنی دعوت پر کاربند ہیں ۔ آپ نے ایک نرسری اور ایک پرائمری مکتب بھی قائم کیا ہے ۔ اب ہائی اسکول قائم کرنا چاہتے ہیں ۔

جامعہ سلفیہ دیکھ کر موصوف بے حد خوش ہوئے ان کے اعزاز میں اساتذہ سے تبادلۂ خیال کے لیے ایک مجلس منعقد ہوئی جس میں ان کی کوششوں کی تفصیلات سنی گئیں ۔ ایک اور نشست میں موصوف نے طلبہ کو خطاب کیا



حیرتناک انکشاف

انسان کے دل پر لفظ "اللہ"

حقائق (Realies) نامی ایک جریدے نے یہ خبر نشر کی ہے کہ ایک ماہر قلب ترک ڈاکٹر خلوق نور باقی نے اپنی تحقیقات کے دوران یہ حیرتناک انکشاف کیا ہے کہ انسانی دل کے ایک ٹکڑے پر نہایت نفیس رسم الخط میں لفظ اللہ لکھا ہوا ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کا بیان ہے کہ میں ایک روز سائنس کی ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اچانک ایک چیز دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ میں نے دیکھا کہ دل کے ٹکڑے کے بیچوں بیچ لفظ اللہ لکھا ہے۔ پہلے تو میں نے سمجھا کہ یہ محض میرا واہمہ ہے، لیکن پھر میں نے قریب ہو کر بار بار اس فوٹو کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ واقعۃً اس میں لفظ اللہ موجود ہے اور اتنا خوشخط اور واضح ہے کہ گویا کسی ماہر خطاط کی انگلیوں کی فنکاری ہے۔

اس کے بعد میں کئی سال تک اس کی کھوج اور تحقیق میں لگا رہا اور بالآخر اس حتمی یقین پر پہنچا کہ انسان کے دل پر اللہ کے نام کے دستخط کا وجود ایک واقعی حقیقت ہے۔ میں نے اسے اہلِ مغرب کی ترتیب دی ہوئی ایک طبی اٹلس میں بھی بالکل صاف اور واضح شکل میں دیکھا۔

خلاصہ یہ کہ دل پر الٰہی دستخط محض اتفاق نہیں ہے۔ اللہ جل جلالہ کے نام کا یہ دستخط دل کے بائیں کنارے پر دیکھا جا سکتا ہے۔ (نوٹ: دل کے اس ٹکڑے کا فوٹو اوپر ملاحظہ فرمائیے!)

(الدعوۃ ریاض ۱۵ ربیع الاول ۱۴۰۴ھ)

روزے کے احکام و مسائل

نواب سید صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ

حدیث ابوہریرہ رضؓ میں آیا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جب رمضان آتا ہے، بہشت کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں، جہنم کے دروازے بند ہو جاتے ہیں، شیطان کو قید کر دیا جاتا ہے۔ (متفق علیہ)

ایک دروازے کا نام ریان ہے، اس دروازے سے روزہ دار ہی بہشت میں جائیں گے۔ (یہ مضمون حدیث سہل بن سعد میں آیا ہے۔ حدیث مذکور متفق علیہ ہے)۔ ہر نیکی کا اجر دس گنا ہوتا ہے۔ سات سو گنے تک۔ مگر روزہ کہ وہ خدا ہی کے لیے ہے۔ وہی اس کی جزا دے گا۔ (متفق علیہ من حدیث ابی ہریرہ)۔ معلوم ہوا کہ روزے کا اجر بے حساب ہے، سات سو چند سے بھی زیادہ ہے۔ زیادہ بھی کیا جس کی کچھ حد ہی ہم کو نہیں بتائی۔ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِيَ لَهُم مِّنْ قُرَّةِ اَعْيُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُوْنَ[1] روزہ بھی مثل نماز کے فرض عین ہے۔ جو حکم تارک نماز کا عمداً ہے۔ وہی حکم اس کا بھی ہے۔

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: جس نے جھوٹ بات کہنا نہ چھوڑا، اس پر عمل کرنا ترک نہ کیا تو اللہ کو اس کی حاجت نہیں ہے کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔ (رواہ البخاری)

دوسری روایت میں اتنا اور آیا ہے کہ تم میں سے جس کا روزہ ہو وہ بے حیائی نہ کرے، گپ شپ نہ لگائے۔ اگر کوئی اس کو گالی دے یا اس سے لڑے تو کہہ دے کہ میرا روزہ ہے۔ (اس کو بھی بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے۔)

---

[1] (السجدہ ۱۷) ترجمہ: پس ان لوگوں کے لیے ایسی آنکھوں کی ٹھنڈک مخفی رکھی گئی ہے جس کو کوئی شخص نہیں جان سکتا، یہ سب ان کے کیے ہوئے اعمال کا بدلہ ہوگا۔

ہر چیز کی ایک زکوٰۃ ہوتی ہے ، بدن کی زکوٰۃ روزہ ہے ۔ روزہ رکھنا آدھا صبر ہے ۔ لیلۃ القدر میں جاگنا عبادت کرنا ، بڑا اجر رکھتا ہے ۔ رمضان میں قیام کرنے کا بڑا ثواب ہے ۔ سارے اگلے گناہ صغیرہ مٹ جاتے ہیں ۔

عورت کو نفل روزہ رکھنا بدون اجازت شوہر کے جائز نہیں ہے ۔ حدیث ابوہریرہ میں آیا ہے جس عورت نے بغیر اذن شوہر کے روزہ رکھا ، پھر شوہر نے اس سے ارادہ کسی بات کا کیا ، اس نے نہ مانا تو اس پر تین گناہ کبیرہ لکھے جاتے ہیں ۔ (رواہ الطبرانی فی الاوسط) یہ حدیث غریب ہے ۔

سفر میں افطار عزیمت ہے ، جس کو قوت ہو اس کے لیے رخصت ہے ۔ مگر بہتر یہ ہے کہ باوجود قدرت کے بھی نہ رکھے ۔

حدیث عمار بن یاسر میں آیا ہے : حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے : یہ کچھ نیکی نہیں ہے کہ تم سفر میں بھی روزہ رکھو ۔ اللہ نے تم کو رخصت دی ہے ۔ تم اس رخصت کو قبول کرو ۔ (رواہ الطبرانی فی الکبیر باسناد حسن)

افطار میں جلدی کرنا ، سحری کھانے میں دیر کرنا مسنون ہے ۔ یہ مضمون کئی حدیثوں میں آیا ہے ۔ روزہ افطار کرانے کا بھی بڑا اجر ہے ۔ حدیث زید بن خالد جہنی میں آیا ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے : جس نے کسی روزہ دار کو افطار کرایا اس کو روزہ دار کے برابر اجر ہے ، بدون اس کے کہ اس صائم کا اجر کم ہو ۔ (اس کو ترمذی نسائی ، ابن ماجہ ، ابن خزیمہ ، ابن حبان نے روایت کیا ہے ۔ ترمذی نے حسن صحیح کہا ہے ۔) اس سے بڑھ کر بھی اور بہت حدیثیں اس کی فضیلت میں آئی ہیں ۔ خدا کی رحمت کا کچھ شمار نہیں ہو سکتا ۔ عطاءہ جم و فضلہ واسع ۔ یہ بھی فرمایا ہے کہ روزہ سپر ہے ، یعنی آگ دوزخ سے بچاتا ہے جب تک کہ اس کو پھاڑ نہ ڈالے ۔ (رواہ النسائی عن ابی عبیدہ باسناد حسن وابن خزیمہ فی صحیحہ والبیہقی) پھاڑنے کا مطلب یہ ہے کہ جو کام روزہ میں کرنا منع ہیں وہ کرے ۔ اگر کرے گا تو گویا روزے کو پھاڑ ڈالا ۔ اب روزے کا کچھ اجر نہ ملے گا ۔ طبرانی نے اوسط میں اتنا اور زیادہ کیا ہے کہ پھاڑنا اس کا کذب و غیبت سے ہوتا ہے ۔

حدیث ابوہریرہ کا لفظ یہ ہے کہ روزہ کچھ کھانے پینے سے نہیں ہوتا ہے ، روزہ تو لغو و رفث سے ہوتا ہے ، یعنی بیہودہ بات ، بے حیائی ، بے شرمی کا کام نہ کرے ، تجھ کو اگر کوئی گالی دے یا تجھ سے لڑے ، تو کہہ دے کہ میں روزہ دار ہوں ۔ (اس کو ابن خزیمہ ابن حبان نے روایت کیا ہے ۔ حاکم نے اس کو شرط مسلم پر بتایا ہے ۔)

دوسری روایت میں ابوہریرہؓ سے یوں آیا ہے: بہت روزہ دار ہیں جن کو روزے سے سوا بھوک کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ بہت قائم ہیں جن کو قیام سے سوا جاگنے کے کچھ حاصل نہیں ملتا۔ (رواہ ابن ماجہ واللفظ لہٗ والنسائی وابن خزیمہ فی صحیحہ والحاکم وقال صحیح علی شرط البخاری) لفظ ان دونوں کا یہ ہے کہ بہت روزہ دار ہیں جن کا حصہ روزے سے یہی بھوک پیاس ہے۔ بہت رات کے کھڑے ہونے والے ہیں جن کا حصہ اس قیام سے یہی جاگنا، نیند کا کھونا۔ یہ مضمون بہت حدیثوں میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جس نے روزہ رکھا پھر لغو و لہو ولعب وکذب وغیبت ونمیمہ ورفث وفسق ونخور وغیرہ امور منکر کو نہ چھوڑا۔ بری باتوں، برے کاموں سے نہ بچا تو اس کا روزہ مقبول نہیں ہے۔ وہ بے فائدہ بھوکا پیاسا رہا۔ اسی طرح جس نے رات عبادت میں بسر کی مگر بری باتوں سے نہ بچا تو وہ عبادت اس کی قبول نہ ہوگی۔ ناحق نیند کو کھو کر ساری رات جاگتا رہا۔

ہم سے دل مردہ اگر رات کو جاگے تو کیا
چشم بیدار تو ہے پر دل بیدار نہیں

فائدہ: حدیث ابوہریرہ میں مرفوعاً آیا ہے کہ جس نے افطار کیا ایک دن رمضان میں، بدون کسی رخصت و مرض کے تو سارے زمانے کا روزہ رکھنا بھی اس کا عوض نہیں ہو سکتا۔ (رواہ الترمذی واللفظ لہٗ وابوداؤد والنسائی وابن ماجہ وابن خزیمہ فی صحیحہ والبیہقی) معلوم ہوا کہ بے وجہ روزہ ترک کرنے کا بڑا گناہ ہے۔

حدیث میں ابوامامہ کا لفظ یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: میں سوتا تھا دو آدمی آئے مجھ کو ایک سخت پہاڑ پر لے گئے۔ وہاں میں نے ایک قوم دیکھی کہ جن کے الٹے سر پاؤں کے بل لٹکایا ہے۔ ان کی باچھیں پھٹی ہوئی ہیں، ان میں سے خون بہتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ کہا یہ لوگ ہیں جو روزہ کھولنے کے وقت سے پہلے افطار کر بیٹھتے ہیں۔ (رواہ ابن خزیمہ وابن حبان فی صحیحہما)

ابن عباس کہتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: اسلام کی رسی اور دین کا قاعدہ تین چیزیں ہیں جن پر اسلام کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ جس نے ایک کام کو بھی ان میں سے ترک کیا وہ کافر حلال الدم ہے ایک ہے لا الٰہ الا اللہ کی شہادت یعنی مع محمد رسول اللہ، دوسری نماز فرض تیسرے رمضان کا روزہ۔

(رواہ ابویعلی باسناد حسن)

دوسری روایت کا لفظ اس طرح پر ہے: جس نے ان میں سے ایک کو بھی ترک کیا اس نے خدا کے

ساتھ کفر کیا۔ اس کا فرض اور نفل قبول نہیں۔ اس کا خون و مال حلال ہے۔ معلوم ہوا کہ جس طرح ترک نماز سے عمداً کفر آجاتا ہے، اسی طرح آدمی ترک صوم سے عمداً بلا عذر کافر ہو جاتا ہے۔

فائدہ: رمضان شریف کا روزہ تو فرض عین ہے، اس کے سوا نفل صوم اور بھی بہت ہیں۔ جیسے چھ روزے ماہِ شوال کے، اس کو حدیث مرفوع ابو ایوب میں صیام دہر کے برابر رکھا ہے۔ (رواہ مسلم واہل السنن والطبرانی) یا جیسے روزہ عرفہ کا، اس شخص کے لیے جو عرفہ میں موجود نہ ہو۔ یہ دو سال کے گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔ (یہ مضمون حدیث ابو قتادہ میں نزدیک مسلم کے آیا ہے۔) نو روزہ ذی الحجہ کی بھی بہت فضیلت آئی ہے۔

یا جیسے محرم کا روزہ۔ اس کو رمضان کے بعد افضل صیام فرمایا ہے۔ محرم میں ہر ایک دن کا روزہ تیس روزے کے برابر ہوتا ہے۔ (رواہ الطبرانی عن ابن عباس مرفوعاً واسنادہ لاباس بہٖ)

یا جیسے عاشورے کا روزہ کہ یہ ایک سال کا کفارہ ہے۔ (اس کو مسلم نے ابو قتادہؓ سے نقل کیا ہے)

یا جیسے ماہ شعبان کے روزے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اس مہینے میں بہت روزے رکھتے تھے۔ فرماتے: اس مہینے میں اعمال خدا کی طرف اٹھائے جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب میرا عمل جائے تو میں روزہ دار ہوں۔ (اس کو نسائی نے اسامہ بن زید سے روایت کیا ہے۔) یا جیسے تین روزے ہر مہینے کے ان کو ایام بیض کہتے ہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوہریرہؓ کو وصیت کی تھی کہ ہر ماہ میں تین روزے رکھا کرو۔ (رواہ مسلم عنہ) یہ تین روزے صوم دہر کے برابر ہیں۔ گویا جس نے یہ روزے رکھے، اس نے ساری عمر روزہ رکھا۔

یا جیسے پیر یا جمعرات کا روزہ۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اس دن روزہ رکھتے۔ فرماتے کہ آج کے دن اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب میرا عمل پیش کیا جائے تو میں روزہ دار ہوں۔

(رواہ الترمذی عن ابی ہریرہ وقال حدیث حسن غریب۔)

یا جیسے چہارشنبہ، پنجشنبہ، جمعہ، سنیچر، اتوار کا روزہ۔ ابن عباس کہتے ہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ جس نے روزہ رکھا، چہارشنبہ، پنجشنبہ کے دن کا، اس کے لیے دوزخ سے برأت لکھی گئی۔ (رواہ ابو یعلیٰ) یا جس نے جمعہ بھی ان کے ہمراہ ملا لیا اس کے لیے بہشت میں گھر بنایا جائے گا۔ (رواہ الطبرانی فی الاوسط)

ہاں تنہا جمعہ یا سنیچر کا روزہ منع ہے۔ اس لیے ایک دن آگے یا پیچھے کا روزہ اس کے ساتھ ملا لے۔

سب سے عمدہ طریقہ صوم کا وہ ہے جو داؤد علیہ السلام نے اختیار کیا تھا۔ وہ یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھے

ایک دن افطار کرے۔ ہمیشہ روزہ رکھنا یا وصل کرنا منع ہے۔ دونوں عید اور ایام تشریق میں روزہ رکھنا حرام ہے اسی طرح ماہِ رمضان کا استقبال کرنا ایک دو روزے سے منع ہے۔ مگر جس کو عادت نفل صوم کی ہے اور وہ نفل اتفاق ان دنوں میں واقع ہوا۔

فائدہ: رمضان کا روزہ ایک مردِ عادل کے چاند دیکھنے یا شعبان کی گنتی پوری ہونے سے واجب ہو جاتا ہے جب تک شوال کا چاند نظر نہ پڑے تیس روزے برابر رکھے۔ اگر ایک شہر میں کسی نے چاند دیکھا تو اور شہر والوں کو ان کی موافقت لازم ہے۔ مذہب حنفیہ کا بھی یہی ہے، روزے کی نیت صبح سے پہلے کرے۔

روزہ کھانے، پینے، صحبت کرنے سے عمداً جاتا رہتا ہے۔ نسیان سے اگر کھا لیا یا پی لیا یا جماع کر لیا تو نہیں جاتا۔ جان بوجھ کر اگر توڑ ڈالا ہے تو کفارہ واجب ہوگا۔ ایک گردن آزاد کرے یا دو مہینے تک روزے رکھے یا ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلائے۔

جس نے کسی عذر شرعی سے روزہ نہیں رکھا اس پر روزے کی قضا کرنا واجب ہے۔ جس طرح عورت حیض و نفاس میں، مسافر سفر میں، بیمار مرض میں روزہ نہیں رکھ سکتا ہے۔ جس کو یہ ڈر ہو کہ روزہ رکھنے سے بیماری میں کمزوری یا تلف ہو جائے گا اس کو افطار کرنا عزیمت ہے۔

جو شخص مر گیا اور اس پر روزے تھے تو اس کی طرف سے اس کا ولی روزہ رکھے۔ جو بوڑھا آدمی مرد یا عورت روزے کی ادا یا قضا نہ کر سکے، وہ ہر دن ایک مسکین کو کھلا دے۔

اعتکاف اگرچہ ہر وقت مسجد میں مشروع ہے۔ مگر رمضان میں زیادہ تر تاکید اس کی آئی ہے۔ خصوصاً عشرۂ اخیر میں معتکف مسجد سے سوائے حاجت ضروری کے باہر نہ نکلے۔

(یہ سب خلاصہ ہے احادیث کا)

بقیہ زکوٰۃ:

(تقریباً ڈھائی کلو (بقول بعض) نصف صاع ہے (یعنی اگر گیہوں سے ہو جیسا کہ بعض ضعیف روایتوں میں ہے۔ (ع۔ح)) پھر اس کی ادائیگی نمازِ عید سے پہلے ضروری ہے۔ (بعض احادیث میں صراحت ہے کہ عید گاہ کی طرف جانے سے پہلے صدقۂ فطر ادا کر دینا چاہیے۔) اور جو شخص صبح و شام کی خوراک سے زیادہ قدرت نہ رکھتا ہو اس پر فطرہ واجب نہیں ہے۔ صدقۃ الفطر کے مصرف بھی وہی ہیں جو زکوٰۃ کے مصرف ہیں۔

احکام ومسائلِ زکوٰۃ

نواب سید صدیق حسن خان رح

زکوٰۃ اسلام کا تیسرا رکن ہے۔ اس کے تارک کا وہی حکم ہے جو عمداً نماز اور روزے کے تارک کا ہے اس میں کوئی فرق نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ کو جب یمن کی طرف بھیجا تو ان سے فرمایا کہ تم اہلِ کتاب کی طرف جا رہے ہو انھیں سب سے پہلے لا الٰہ الا اللہ وان محمداً رسول اللہ کی طرف دعوت دینا۔ اگر وہ اس امر میں تمھاری اطاعت کر لیں تو پھر ان کو یہ بتلاؤ کہ اللہ نے ان پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں، اس کے بعد ان کو بتلانا کہ ان پر صدقہ یعنی زکوٰۃ فرض ہے۔ اور یہ زکوٰۃ ان کے تونگروں سے کر ان کے فقیروں کو دے دی جائے گی۔ الحدیث (صحیحین)

معلوم ہوا کہ جس شہر کی زکوٰۃ ہو اس کو اسی شہر میں خرچ کرے، دوسری جگہ نہ بھیجے۔ البتہ اگر اپنے شہر کے خرچ سے فاضل ہو یا دوسری جگہ حاجت مند زیادہ ہوں تو زکوٰۃ دوسری جگہ بھیجی جا سکتی ہے۔

زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر سخت وعید: ابوہریرہ کی ایک طویل حدیث میں آیا ہے کہ جو شخص سونے چاندی کی زکوٰۃ نہیں دیتا، اس کو قیامت کے دن اسی زر وسیم کی تختیوں سے جہنم کی آگ میں گرم کر کے اس کے پہلو، پیشانی اور پشت کو داغ دیں گے اور یہ عمل بار بار اس کے ساتھ قیامت کے اس دن برابر جاری رہے گا جو پچاس ہزار سال کا ہوگا۔ یہاں تک کہ تمام بندوں کا فیصلہ کر دیا جائے گا۔ جنتی جنت میں داخل ہوں گے اور دوزخی دوزخ میں بھیج دیے جائیں گے۔ اسی طرح جو اونٹ گائے اور بکری کی زکوٰۃ نہ دے گا اس کو وہ جانور اپنے سُموں سے پچاس ہزار سال تک ایک ہموار میدان

میں کچلیں گے۔ (صحیح مسلم طویل حدیث)۔ اور کسی کو اس کا مال بے زکوٰۃ گنجا سانپ بن کر دونوں جبڑوں سے ڈسے گا اور کہے گا کہ میں تیرا مال ہوں اور تیرا خزانہ ہوں۔ (صحیح بخاری)

تارکین زکوٰۃ کے خلاف جہاد: حضرت ابوبکر صدیقؓ نے کہا تھا۔ واللہ میں اس سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا۔ یہ زکوٰۃ مال کا حق ہے۔ یعنی جس طرح نماز بدن کا حق ہے۔ (صحیحین)

فائدہ: امام (خلیفۃ المسلمین) کی طرف سے جب زکوٰۃ وصول کرنے والا آئے تو زکوٰۃ دینے والا اس کو راضی رکھے۔ (مسلم) پوچھا گیا وہ اگر انصاف نہ کریں۔ فرمایا: أَرْضُوا مُصَدِّقِيكُمْ وَإِنْ ظُلِمْتُمْ۔ یعنی تم ان کو خوش رکھو گو تم پر ظلم ہو۔" (سنن ابوداؤد) نیز تعدی (دست درازی) کے خوف سے مال چھپانے کو آپؐ نے منع فرمایا ہے۔ اور جو شخص درست طریقے سے مالِ زکوٰۃ وصول کرتا ہے وہ غازی کی طرح راہِ خدا میں ہوتا ہے۔ (جامع ترمذی)

حضرت عائشہؓ مرفوعاً بیان کرتی ہیں کہ جس مال سے زکوٰۃ نہ نکالی جائے اور یوں اس میں زکوٰۃ مل جائے تو وہ حصہ (زکوٰۃ) اس دوسرے مال کی ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے (بخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ زکوٰۃ فرض اگر ادا نہ کی جائے تو اس طرح یہ حرام، حلال مال کو بھی ہلاک کر ڈالتا ہے۔ (غالباً اسی وجہ سے) ائمہ ثلاثہ (امام مالکؒ، امام ابوحنیفہ، امام شافعی) کہتے ہیں کہ زکوٰۃ میں عین وہی مال نکالے، اس کی قیمت نہ دے۔ امام احمدؒ کہتے ہیں کہ خلطِ زکوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ آسودہ حال اور تونگر ہو کر بھی زکوٰۃ وصول کرے تو اس طرح اس کا مال برباد ہو جائے گا، کیونکہ زکوٰۃ تو صرف فقراء کے لیے ہے۔

کن مالوں میں زکوٰۃ نہیں: امام شوکانیؒ کہتے ہیں۔ بہت سے اہل علم نے ایسے اموال پر زکوٰۃ واجب کر دی ہے جس کو اللہ نے فرض نہیں کیا۔ بلکہ آنحضرتؐ نے بالصراحت ان میں زکوٰۃ کی فرضیت سے انکار کیا ہے۔ جیسے غلام اور گھوڑوں سے متعلق آپؐ نے فرمایا ہے کہ ان میں زکوٰۃ نہیں۔ صحابہؓ کے پاس اموال و جواہر و تجارات[1] و خضراوات تھے۔ لیکن آنحضرتؐ نے ان کو

---

[1] راجح اور با دلیل مذہب یہ ہے کہ تجارت کے مال میں زکوٰۃ فرض ہے۔ فتاویٰ نذیریہ میں جمہور کے دلائل بیان ہوئے ہیں۔ خود نواب صاحب ایک اردو رسالہ میں لکھتے ہیں کہ اگر کسی نے مالِ تجارت کی بھی زکوٰۃ دے دی ←

ان میں سے زکوٰۃ نکالنے کا حکم نہیں دیا۔ نہ ان سے ان اموال کی زکوٰۃ طلب فرمائی۔ اگر ان میں زکوٰۃ فرض ہوتی تو آپ ضرور بیان فرماتے۔

مویشیوں کی زکوٰۃ کا بیان: زکوٰۃ صرف اونٹ گائے اور بکری پر واجب ہے، ان کے علاوہ دوسرے جانور جیسے گھوڑے، خچر اور گدھے پر نہیں ہے

اونٹ کا نصاب زکوٰۃ پانچ اونٹوں پر ایک بکری زکوٰۃ نکالی جائے گی۔ پھر پچیس اونٹوں تک ہر پانچ اونٹوں میں ایک بکری کے حساب سے زکوٰۃ دی جائے گی۔ پچیس اونٹ پورے ہونے کی صورت میں ایک بنت مخاض (ایک سالہ مادہ) یا ایک ابن لبون (دو سالہ نر) نکالا جائے گا۔ اسی طرح ۳۶ اونٹوں میں ایک بنت لبون (دو سالہ مادہ) اور ۴۶ میں ایک حقہ (سہ سالہ مادہ) اور ۶۱ میں ایک جذعہ (چار سالہ) اور ۷۶ میں دو بنت لبون اور ۹۱ میں ۱۲۰ تک دو حقے۔ جب ۱۲۰ سے زیادہ ہوں تو پھر ہر چالیس میں ایک بنت لبون اور ہر پچاس میں ایک حقہ ہوگا۔ یہ تفصیل حضرت ابو بکر صدیق رضؓ کے ایک مکتوب میں مرفوعاً آئی ہے۔ ابن حزم نے اس مکتوب کو نہایت صحیح کہا ہے۔ ابو بکر صدیق نے اس پر علماء صحابہؓ کے سامنے عمل کیا تھا مگر کسی نے ان کی مخالفت نہیں کی۔

(صحیح ابن حبان)

گائے کا نصاب زکوٰۃ: ۳۰ گایوں میں ایک تبیع (ایک سالہ نر) یا تبیعہ (ایک سالہ مادہ) چالیس گایوں میں ایک مُسِنّہ (دو سالہ) پھر جب چالیس سے زیادہ ہوں تو ستر تک کچھ نہیں، جب ستر پوری ہو جائیں تو پھر ۸۰ تک ایک تبیع اور مسنہ ہے اور پھر پوری اسی گایوں میں دو مسنہ ہیں۔ اس طرح اس کی پوری تفصیل معاذ بن جبلؓ کی حدیث میں آئی ہے جس کو امام احمد اور اہل سنن وغیرہ نے روایت کیا ہے۔ ابن عبد البر کہتے ہیں کہ اس میں علماء کا کچھ اختلاف نہیں ہے سب کا اس نفی پر اجماع ہے۔

بکری کا نصاب زکوٰۃ: ۴۰ سے ۱۲۰ بکریوں تک ایک بکری ہے اس سے زائد ۲۰۰ تک میں دو بکریاں ہیں، ۲۰۱ میں ۳۰۰ تک تین بکریاں ۴۰۱ میں چار بکریاں ہیں اس کے بعد ہر ۱۰۰ میں ایک بکری ہے۔

تو کچھ ڈر نہیں ہے اس لیے زکوٰۃ کے مال کے سوا اور بھی حق مال میں ہوتا ہے۔ (وسیلۃ النجاۃ باداء الصلوۃ والصوم والحج والزکوٰۃ ص ۲)

یہ تفصیل حضرت انس اور ابن عمر کی حدیث میں ہے أخرجه أحمد والبخاري ورواه أحمد والترمذي وحسنه۔

امام شوکانیؒ کہتے ہیں: اس پر اجماع ہو چکا ہے۔

مختلف قسم کے مویشی

جو شے مقدار فرض سے کم ہو اس پر کچھ زکوٰۃ نہیں ہے اور نہ اوقاص پر یعنی دو فریضوں کے درمیان جو مقدار ہو۔ اگر دو خلیط یعنی شریک ہوں تو باہم برابر تقسیم کر لیں۔ زکوٰۃ میں بوڑھا عیب دار، کانا، بچّا، بیمار، خردسال، خانہ پرور نر اور بانجھ مویشی دینا بھی جائز نہیں۔ یہ تفصیل حدیث ابوبکرؓ اور کتاب عمرؓ سے جو سنن ابوداؤد اور طبرانی میں بسند جید آئی ہے، منقول ہے۔

سونے چاندی کی زکوٰۃ

سونے چاندی پر جب ایک سال گزر جائے تو چالیسواں حصہ دے۔ سونے کا نصاب ۲۰ دینار (یعنی ۷½ تولہ) اور چاندی کا ۲۰۰ درہم (یعنی ۵۲½ تولہ) یا اتنی ہی نقدی ہیں۔ رواہ احمد والسنن۔ امام بخاریؒ نے اس کو صحیح کہا ہے۔ اس سے کم مقدار میں زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔

زیور کی زکوٰۃ میں مختلف حدیثیں آئی ہیں۔ اختلاف سے نکلنا احوط ہے۔ عموم قرآن مجید اور احادیث صحیحہ صریحہ کی رُو سے زیور سونے کا ہو تو اس کے حساب سے، چاندی کا ہو تو اس کے ... حساب سے زکوٰۃ ضروری ہے (ع۔ح) صحیح اور قوی دلیل اور مذہب کی بنا پر مال تجارت پر زکوٰۃ لاگو ہوگی (ع،ح)

زمین کی پیداوار

گیہوں، جو، جوار، خشک کھجور اور زبیب پر دسواں حصہ فرض ہے، بنجر زمین پر کچھ نہیں ہے۔ مزروعہ پر ہوگا سینچی زمین پر نصف عشر (۲۰ واں حصہ) اور بارانی پر ایک عشر (دسواں حصہ) اس کا نصاب پانچ وسق ہے۔ ایک وسق ساٹھ صاع کا ہوتا ہے۔ (۵ وسق کے تقریباً ۷۵۰ کلوگرام (۷½ کنٹل) ہوتے ہیں جس سے مقدار زکوٰۃ بیسواں حصہ ہو تو ۳۷½ کیلو، دسواں حصہ ہو تو ۷۵ کلو ہوگی) شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ایک کنبہ کو اتنی مقدار ایک سال کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اور اقل اہل بیت (کم سے کم اہل خانہ) شوہر، بیوی، بچہ اور خادم ہے اور عام طور پر ایک انسان کی خوراک ایک رطل (آدھ سیر) ایک مُد طعام (تقریباً اتنا ہی ہے) اس حساب سے پانچ وسق پورے سال کے لیے کافی ہیں، جو کچھ بچ رہتا ہے وہ سالن وغیرہ

کے آسکتا ہے ۔ اس مقدار سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے اور نہ ترکاریوں میں زکوٰۃ ہے ۔ ہاں شہد میں عشر واجب ہے

اور زکوٰۃ کی پیشگی ادائیگی بھی جائز ہے ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ سے ایک سال کی پیشگی زکوٰۃ لے لی تھی (کتب حدیث)

امام یعنی مسلمانوں کے خلیفہ پر واجب ہے کہ ہر مقام کے مالداروں سے زکوٰۃ لے کر اسی جگہ کے فقراء میں تقسیم کرے ۔ یہ زیادہ اولیٰ اور بہتر ہے ۔ (جامع ترمذی)

صاحب مال نے جب بادشاہ کو زکوٰۃ دیدی تو وہ بری الذمہ ہو گیا، اگرچہ بادشاہ ستمگر ہو، متفق علیہا جمہور اسی طرف گئے ہیں اور انھوں نے کہا ہے کہ بادشاہ عادل ہو یا ظالم یا غیر مصرف میں خرچ کرے، زکوٰۃ بہر حال ادا ہو جاتی ہے ۔

زکوٰۃ کے آٹھ مصارف ہیں جن کا ذکر خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرما دیا ہے

مصارف زکوٰۃ : کسی نبی یا غیر نبی کے بیان پر اس کو موقوف نہیں رکھا ۔ فرمایا : إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ (توبہ)

یہ آٹھ قسمیں ہیں ۔ ایک فقیر جس کے پاس نہ مال ہو اور نہ کوئی کام ۔

یہ امام شافعی کی تعریف ہے ۔ امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک فقیر وہ ہے جس کے پاس مال تو ہو لیکن نصاب سے کم ہو ۔ یا اگر بقدر نصاب ہو تو وہ غیر نامی (یعنی اس سے آمدنی نہ ہوتی ہو) اور کسی حاجت میں مستغرق ہو (یعنی کل کا کل مال کسی ناگزیر ضرورت میں لگا ہوا ہو)

دوسرا مسکین ۔ امام شافعیؒ کے نزدیک مسکین وہ ہے جس کے پاس مال یا ہنر تو ہو لیکن اس کے لیے کافی نہ ہو ۔ اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو اور روٹی کپڑے کے لیے بھی دست سوال دراز کرنا پڑے ۔

تیسرا مصرف عامل ہے ۔ عامل (تحصیلدار) یعنی زکوٰۃ وصول کرنے والا چاہے فقیر ہو یا غنی ، بقدر کام کے اسے زکوٰۃ میں سے معاوضہ دینا چاہیے ۔ یہی اہل علم کا مسلک ہے ۔

چوتھا مؤلفۃ القلوب ۔ اس کی دو قسمیں ہیں ۔ ایک وہ جو مسلمان تو ہو گیا مگر اس کی نیت ضعیف ہو ۔

(یعنی اسلام میں ابھی پختہ نہ ہو۔ ڈانواڈول ہو) دوسرا کوئی معتد بہ اور اثر ورسوخ والا شخص کہ اس کو کچھ دینے میں دوسروں کے مسلمان ہونے کی امید ہو۔ امام شافعیؒ کے صحیح مذہب کے مطابق ان کو دینا چاہیے۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ غلبۂ اسلام کی وجہ سے اب مؤلفۃ القلوب کا یہ حصہ ساقط ہوگیا ہے اور اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ لیکن میں کہتا ہوں کہ سقوط سہم (حصہ ساقط ہوجانے) کی اگر یہی علت ہے تو اب چونکہ پھر غربت (کمزوری) اسلام کا دور ہے لہٰذا آج تالیف قلب کی ضرورت ہے۔ گویا یہ علت پھر موجود ہوگئی جس کی وجہ سے اب بھی مؤلفۃ القلوب کو مالِ زکوٰۃ سے دیا جانا چاہیے۔

پانچواں گردن چھڑانے (یعنی غلام آزاد کرانے) جیسے مکاتبین[1] ہیں۔ احناف و شوافع دونوں کے نزدیک ان پر مالِ زکوٰۃ صرف ہوسکتا ہے۔

چھٹا غارم، یعنی وہ شخص جو مقروض ہو اور اتنے نصاب کا مالک نہ ہو جو قرض سے زائد ہو، یا اس نے ایسے لوگوں نے مال لے رکھا ہو جن سے وہ وصول نہیں کرسکتا۔ یہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے۔ امام شافعی کہتے ہیں کہ قرض دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ شخص جس نے غیر معصیت میں اپنی ذات کے لیے قرض لیا ہو، لیکن اس میں حاجت شرط ہے۔ دوسرا وہ جس نے باہم صلح کرانے کے لیے قرض لیا ہو تو اس کو بھی باوجود مالدار ہونے کے مالِ زکوٰۃ میں سے دیا جاسکتا ہے۔

ساتواں مصرف فی سبیل اللہ ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس سے مراد وہ غازی ہیں جن کو مالِ فیے نہیں ملتا ہے (مالِ فیے وہ مال ہے جو بغیر جہاد کے حاصل ہوا ہو) اور امام شافعیؒ کے نزدیک ان کو باوجود غنا کے دینا چاہیے۔ میں کہتا ہوں اگرچہ راہِ خدا (فی سبیل) سے مراد اکثر جہاد ہوا کرتا ہے لیکن یہ لفظ عام ہے، اس لیے جس چیز پر عرفاً، شرعاً اور لغۃً لفظ فی سبیل اللہ صادق آئے گا وہ بھی زکوٰۃ کا مصرف ہوسکتی[2] ہے۔ بالخصوص

---

[1] یعنی ایسے غلام جن کو ان کے آقاؤں نے کچھ مال کے عوض آزاد کرنے کو کہا ہو اور وہ اس کی نوشت دیدیں (ضوء الشمس ص ۹۸ از مولف)

[2] حضرت مولف کی کتاب عرف الجادی ص ۷۱ میں ہے "وسبیل اللہ مختص بجہاد نیست اگرچہ از اعظم طرق الی اللہ است پس در ہر چہ راہے بسوئے خدا باشد، صرف زکوٰۃ دراں صحیح است۔ این است معنی آیت لغۃً و واجب بماند بجائے کہ نقل صحیح و سنت ہم نہ دہد و توقف ست بر معانی لغویہ ... و منجملہ سبل خدا صرف صدقہ

اس حالت میں جب کہ یہ سب اقسام میسر نہ آسکیں۔ جس طرح ہمارے زمانے کا حال ہے۔ واللہ اعلم۔ مثلاً عمارت مساجد، رباط (فوجی چھاؤنی) خانقاہات (یعنی الگ تھلگ رہنے والے عبادت گزار) مراط (سڑکیں، جسر بہ رفاہِ عام کے لیے کنویں کھدوانا، نشر مصاحف وکتب حدیث والتفسیر ونحوہا (قرآن وسنت اور تفسیر وغیرہ خالص دینی کتابوں کی نشر واشاعت)

آٹھواں مصرف۔ ابن السبیل ہے۔ حنفیہ کے نزدیک اس سے مراد وہ شخص ہے جو مسافر ہو اور سفر کی وجہ سے اپنے وطن اور مال سے منقطع ہو گیا ہو۔ اور شافعیہ کے نزدیک وہ شخص ہے جو کسی بھی حاجت کی بنا پر سفر کو جانا چاہتا ہو۔

فائدہ: مذکورہ آٹھوں قسموں میں اہلِ علم کے نزدیک اسلام شرط ہے۔ پھر امام شافعیؒ کے نزدیک ان کا استیعاب واجب ہے۔ استیعاب کا مطلب یہ ہے کہ اگر عامل موجود ہو تو زکوٰۃ ان آٹھوں کو دے۔ یہ نہ ہو کہ بعض کو دے دے اور بعض کو نہ دے اور برابری آٹھوں قسموں کے درمیان واجب ہے۔ نہ کہ درمیان احاد وانواع کے[1]۔

← در اہلِ علم ست کہ قیام دارند بمصالح دینیہ مسلین۔ پس ایشاں را نصیبے در مالِ خدا ست خواہ توانگر باشد یا گدا بلکہ صرف آں دریں جہت از اہم امور است بنا بر آنکہ علماء ورثہ انبیاء وحفظ بیضہ اسلام وشریعت خیر الانام اند۔» خلاصہ ترجمہ: بقدر مناسب مقام یہ ہے کہ سبیل اللہ جہاد وغزوہ سے خاص نہیں اگرچہ یہ افضل ترین راہِ خدا ہے۔ علمائے دین پر صرف صدقات بھی اس میں داخل ہے کہ خالص دین کی حفاظت کے لیے یہ حضرات وقف ہوتے ہیں اور علوم انبیاء کی وراثت انہی کے پاس ہے اور اس کا آخری حصہ ترجمہ ہے امام شوکانی کی عبارت کا جسے دلیل الطالب ص ۴۴۳ میں حضرت مولف نے نقل فرمایا ہے۔ ومن جملۃ سبیل اللہ الصرف فی العلماء الذین یقومون بمصالح المسلمین الدینیۃ فان لھم فی مال اللہ نصیباً سواء کانوا اغنیاء وفقراء بل الصرف فی ھذہ الجھۃ من اھم الامور لان العلماء ورثۃ الانبیاء وحملۃ الدین وبھم تحفظ بیضۃ الاسلام۔ الخ

[1] یعنی اگر سب قسمیں موجود ہوں تو سب میں تقسیم ہوگا۔ یہ مطلب نہیں کہ ہر شخص کو مساوی دی جائے گی۔ کیونکہ مسلمانوں کے خلیفہ کو حق حاصل ہے کہ ہر مستحق زکوٰۃ فرد کی ضرورت کے مطابق کم وبیش کر دے۔ (ع۔ ح)

اور امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک اگر سارا مالِ زکوٰۃ ایک ہی نوع پر صرف کر دے یا ایک ہی شخص کو دیدیا جائے تب بھی جائز ہے۔ میں کہتا ہوں آج کل مذہبِ شافعی پر عمل مشکل ہے۔ اس لیے کہ اس زمانے میں اقسامِ ہشت کا میسر آنا دشوار ہے۔ اسی لیے امام غزالیؒ نے کہا ہے کہ ایسے موقع پر مذہبِ حنفی پر ہی عمل ہو سکتا ہے۔ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک زکوٰۃ کی تقسیم مسلمانوں کے (صحیح) حاکم کے اجتہاد (یعنی صوابدید) پر چھوڑ دینی چاہیے۔ جس نوع کی ضرورت اور تعداد زیادہ ہو۔ اپنی صوابدید کے مطابق حسبِ حال ہر ایک کو دیدے۔ اس بنا پر ہر سال دو سال کے بعد کسی نوع کو کم کسی کو زیادہ کا تبادلہ ہوتا ہے تو درست ہوگا، غرضیکہ حاجت و تعداد کے پیشِ نظر زکوٰۃ کی تقسیم عمل میں لائی جائے۔

اس کے بعد امام مالک نے کہا: "وعلی هذا ادرکت من ارضی من اهل العلم۔ (موطا امام مالکؒ ص ۲۶) اسی پر میں نے (اپنے ہاں) کے قابلِ اعتماد اہلِ علم کو پایا ہے۔"

امام شوکانیؒ کا کہنا ہے کہ ائمہ تفسیر و حدیث و فقہ و کلام نے ان آٹھوں قسموں پر طویل مباحث لکھے ہیں کہ کس نوع میں کیا معتبر ہے لیکن حق بات یہ ہے کہ شرعاً ولغۃً معتبر مصداق وصف ہے۔ مثلاً جس کسی پر لفظِ فقیر صادق آئے وہی اس کا مصرف ہے۔ یہی حال باقی اوصاف کا ہے اور جب کسی وصف کی حقیقتِ شرعیہ کا پتہ نہ چلے تو مدلولِ لغت کی طرف رجوع کرے اور اسی کو تفسیر جانے اور اہلِ علم نے جو شروط و اعتبارات بیان کیے ہیں اگر وہ لغت یا شرع کے مدلول میں داخل ہو یا کوئی دلیل ان پر دلالت کرتی ہو تو وہ معتبر ٹھہریں گے ورنہ ایسی شروط و اعتبار کا کوئی اعتبار نہیں۔

فائدہ ۲: بنو ہاشم اور ان کے لونڈی غلاموں پر زکوٰۃ حرام ہے۔ ابو ہریرہؓ کی حدیث میں آتا ہے۔ انا لا تحل لنا الصدقة۔ (صحیحین) یعنی بلاشبہ ہمارے لیے صدقہ حلال نہیں ہے۔"

اور ابو رافع کی حدیث میں آپ نے فرمایا: ان الصدقة لا تحل لنا وان موالی القوم من انفسهم اخرجه احمد وصححه الترمذی وابن حبان وابن خزیمة۔ یعنی بلاشبہ ہمارے اور ہمارے غلاموں کے لیے صدقہ حلال نہیں۔ مطلب یہ کہ غلام کا حکم اس کے آقا کا ہے۔

ابن قدامہ کہتے ہیں: ہمیں اس مسئلے میں کسی اہلِ علم کا اختلاف معلوم نہیں ہے اور ابن ارسلان نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ واضح رہے کہ بنو ہاشم سے مراد حضرت علیؓ، عقیلؓ، جعفرؓ اور حضرت عباسؓ کی اولاد ہے۔

ان کے موالی (غلام) بھی انھیں کے حکم میں ہیں۔

فائدہ ۳: تونگر (غنی) قوی اور مکتسب کو زکوٰۃ لینا حرام ہے۔ البتہ تونگر کے مفہوم میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں ہر وہ شخص تونگر کے حکم میں ہے جس کے پاس صبح و شام کی خوراک موجود ہو۔ بعض کہتے ہیں کہ جس کے پاس ایک اوقیہ (۴۰ درہم، ہمارے حساب سے کم و بیش چالیس پچاس روپے) یا پچاس درہم ہوں ان میں درحقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ لوگ متفرق الحال اور مختلف پیشہ والے ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی حرفت والا (کسی بھی قسم کا کاریگر) ہے جب تک اسے آلاتِ حرفہ نہ ملیں وہ معذور رہے گا۔ کاشت کار اس وقت تک معذور ہے جب تک اسے آلاتِ کاشت کاری نہ میسر ہوں۔ تاجر سرمایہ کے بغیر معذور ہوتا ہے۔ یا مجاہد (راہِ خدا کا فوجی) جس کا رزق (ذریعۂ معاش) صبح و شام وہی ہے جو غنیمت میں سے ملے۔ جس طرح کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گزران تھی۔ تو ضابطہ اس جگہ ایک اوقیہ یا پچاس درہم کا ہوگا اور جو شخص حمال ہے، یعنی بازار سے سامان لاد کر لاتا ہے یا لکڑی فروش ہے یا اور اس قسم کے ہیں تو ایسی جگہ ضابطہ صبح و شام کی خوراک ٹھہرے گا۔

فائدہ ۴: موطا میں مرفوع حدیث ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سوائے پانچ شخصوں کے کسی غنی (دولت مند) کے لیے صدقہ حلال نہیں۔ ایک اللہ کی راہ میں لڑنے والا غازی۔ دوسرا عامل (زکوٰۃ کا تحصیلدار) تیسرا قرضدار۔ چوتھا وہ جو کسی صدقے کو اپنے مال سے خرید لے۔ پانچواں ایسے ہمسایہ مسکین کا ایسا ہدیہ جس کو وہ بطورِ زکوٰۃ ملا ہو لیکن اپنے پڑوسی کو (جو دولت مند ہو) وہی ہدیہ بھیج دیا ہو تو اس ہدیے کی صورت۔ ہدیٰ الیہ کے لیے صدقہ حلال ہوگا۔ مسوّیٰ (شرح موطا) میں ہے کہ تبدل ایدی (قبضہ کے بدل جانے) کی صورت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسی طرح عامل اور مسافر کے بارے میں بھی اختلاف نہیں ہے البتہ غارم (مقروض) اور غازی کے بارے میں اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ کے نزدیک باوجود تونگری کے ان کے لیے صدقہ حلال ہے اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ان دونوں صورتوں میں فقیر ہونا شرط ہے۔ بظاہر امام شافعیؒ کا مسلک قرآن کریم کے موافق ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے غازی اور غارم کو مسکین اور فقیر کا قسیم قرار دیا ہے، اگر یہ فقر کے ساتھ مشروط ہوتے تو پھر تو یہ مسکین اور فقیر ہی میں شامل ہوتے نہ کہ ان کے قسیم (متقابل کی قسم) واللہ اعلم۔

صدقۃ الفطر: صدقہ فطر ہر غلام، آزاد مرد، عورت اور بچے کی طرف سے ضروری ہے۔ صدقہ فطر کی مقدار قوت معتاد (قوتِ معتاد جو خوراک عام طور پر مستعمل ہو) کا ایک صاع

بقیہ ص ۱۳ پر

فتاوے متعلقہ احکامِ زکوٰۃ

سوال: کیا فرماتے ہیں علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین اس مسئلہ میں کہ مال تجارت میں زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

جواب: مالِ تجارت میں زکوٰۃ فرض ہے بدلیل اس آیت کے: اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ ۔ واضح ہو کہ کسب میں دستکاری اور بیع و شریٰ داخل ہے۔ بدلیل روایت احمد بن حنبل کے رافع بن خدیج سے: قال قيل يا رسول الله اَىُّ الكسب اطيب قال عمل الرجل بيده وكل بيع مبرور رواه احمد كذا فى المشكوٰة ۔ بنا بریں امام بخاری نے ایک باب منعقد کیا ہے۔ زکوٰۃ کسب اور تجارت میں یعنی ان دونوں صورتوں میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے یعنی جو مال کسب و دستکاری اور بیع و شریٰ سے بقدر نصاب کے حاصل ہو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔ اس لیے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے کسب مطلق میں کسب تجارت کو شامل کیا اور آیت اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ سے فرضیت زکوٰۃ کی اظہر من الشمس ہے۔ اجماعاً تو کسوبہ تجارت میں بھی زکوٰۃ بلا شبہ واجب ہوگی اسی واسطے اس پر بھی اجماع منعقد ہوا۔ منکر اور مخالف اس کا مذاق قرآن مجید اور محاورہ لسانِ عرب سے محظوظ و ماہر نہ ہوا۔ اللہم اغفرلہ وارحمہ۔

باب صدقة الكسب والتجارة لقول الله تعالىٰ: يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْاَرْضِ إلىٰ قوله غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ۝ انتهى ظاهر الآية يدل على وجوب الزكوٰة فى كل مال يكتسبه الانسان فيدخل فيه زكوٰة التجارة وزكوٰة الذهب والفضة وزكوٰة النعم لان ذلك مما يوصف بانه مكتسب كذا فى التفسير الكبير ۔ وهٰذه الآية سند الاجماع وحجة للجمهور على داؤد حيث

قال لا یجب الزکوٰۃ الا فی الانعام والنقود وعند الجمهور یجب فی العروض والعقار ایضاً اذا کان للتجارۃ وانما شرطوا فیه التجارۃ لان النمو شرط لوجوب الزکوٰۃ بالاجماع ولا نمو فی العروض الا بنیة التجارۃ۔ وعن ابن عمر لیس فی العروض زکوٰۃ الا ما کان للتجارۃ رواہ الدارقطنی ومما یدل علی وجوب الزکوٰۃ فی العروض ما روی عن حماس قال مررت علی عمر بن الخطاب وعلی عنقی ادمة احملها فقال الا تؤدی زکوٰتك یا حماس فقال مالی غیر هذا واهبة فی القرظ قال ذلك مال فضعها فوضعتها بین یدیه فحسبها قد وجبت الزکوٰۃ فیها فاخذ منها الزکوٰۃ رواہ الشافعی واحمد وابن ابی شیبة وعبد الرزاق وسعید بن منصور والدارقطنی انتهی ما فی التفسیر المظهری للقاضی ثناء اللہ پانی پتی۔[1]

---

[1] باب کمائی اور تجارت کا صدقہ۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اے اہل ایمان تم نے جو پاکیزہ چیزیں کمائی ہیں اور جو کچھ ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے اس میں سے خرچ کرو ......

ظاہر آیت ہر اس مال میں زکوٰۃ کی فرضیت پر دلالت کرتی ہے جسے انسان کماتا ہے، لہٰذا اس میں تجارت کی زکوٰۃ سونے اور چاندی کی زکوٰۃ اور چوپایوں کی زکوٰۃ سبھی داخل ہے۔ کیوں کہ یہ سب چیزیں کمائی ہوئی ہیں۔ (تفسیر کبیر) اور یہ آیت اجماع کی سند ہے اور امام داؤد جو کہتے ہیں کہ چوپایوں اور نقود کے سوا کسی چیز میں زکوٰۃ نہیں، ان کے خلاف حجت ہے۔ جمہور کے نزدیک سامان اور غیر منقولہ جائداد اگر تجارت کے لیے ہو تو اس میں بھی زکوٰۃ فرض ہے۔ نیت تجارت کی اس لیے شرط لگائی ہے کہ زکوٰۃ کی فرضیت کے لیے نمو (بڑھوتری) بالاجماع فرض ہے اور تجارت کی نیت کے بغیر سامانوں میں بڑھوتری نہیں ہو سکتی اور ابن عمر سے مروی ہے کہ سامان میں زکوٰۃ نہیں مگر جو تجارت کے لیے ہو۔ (دار قطنی) اور سامان میں وجوب زکوٰۃ کی دلیل وہ روایت بھی ہے جو حماس سے مروی ہے۔ انھوں نے کہا میں حضرت عمر بن خطاب کے پاس سے گزرا اور میں اپنی گردن پر ایک چمڑا لادے ہوئے تھا، انھوں نے کہا اے حماس کیا تم اپنی زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔ میں نے کہا میرے پاس اس کے سوا کچھ نہیں اور ایک چمڑا ہے جو دباغت میں ہے۔ کہا یہ مال ہے، اسے رکھو۔ میں نے ان کے سامنے رکھا۔ انھوں نے حساب لگایا تو اس میں زکوٰۃ واجب ہو رہی تھی تو انھوں نے اس کی زکوٰۃ لی۔ اسے امام شافعی، احمد اور ابن ابی شیبہ نے روایت کیا ہے۔ عبد الرزاق، سعید بن منصور اور دارقطنی کے نزدیک بھی مروی ہے (تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ پانی پتی)

اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی والد ماجد شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ازالۃ الخفا میں فرماتے ہیں:

الشافعی عن ابن عمر وابن حماس ان اباہ قال مررت بعمر بن الخطاب وعلی عنقی ادمۃ احملھا فقال عمر الا تودی زکوتک یا حماس فقلت یا امیر المومنین مالی غیر ھذہ التی علی ظہری واھبۃ فی القرظ قال ذلک مال فضع فوضعتھا بین یدیہ فحسبھا فوجدھا قد وجبت فیھا الزکوۃ فاخذ منھا الزکوۃ ۔ انتہی ما فی ازالۃ الخفا ۔ ؎۱

یہ روایت حضرت عمر کی اگرچہ لفظاً موقوف ہے مگر باعتبار حکم کے مرفوع ہے ۔ کیونکہ جس امر میں رائے کو دخل نہیں اس کو صحابی اپنی طرف سے نہیں کہہ سکتا جب تک حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ سنا ہو جیسا کہ اہل حدیث اور فقہ پر مخفی نہیں ۔ اور اس آیت کریمہ : وَالَّذِيْنَ فِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ؎۲ سے بھی مال تجارت میں فرضیت زکوۃ ثابت ہوتی ہے ۔ کیونکہ "فی اموالہم" میں مال تجارت بلاریب شامل ہے ۔ بدلیل اس آیت کے ۔ لَا تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً ای الا ان تکون الاموال اموال تجارۃ صادرۃ عن تراضٍ مِّنْكُمْ ۔ ؎۳

چنانچہ تفسیروں میں مذکور ہے لہذا تفسیر عزیزی میں پہلی آیت کا اس طرح پر ترجمہ کیا ہے ۔

والذین فی اموالہم یعنی وکسانیکہ در جمیع انواع اموال ایشان از نقد ومحصول زراعت ومال تجارت وبردہ حق معلوم یعنی حقے است مقرر کردہ شدہ ومعین نمودہ کہ آن زکوۃ است وصدقہ فطر ۔ انتہی مختصراً ۔ ؎۴

اور ماہرین شریعت پر واضح ہے کہ صلوۃ حق بدن ہے اور زکوۃ حق مال ہے ۔ اور مال تجارت جنس اموال میں بلاریب شامل ہے ۔ اسی واسطے ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مانعین زکوۃ سے جہاد کیا ۔

؎۱ پچھلی عبارت میں حماس کا جو واقعہ ہے وہی یہاں بھی منقول ہے ۔

؎۲ جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق ہے

؎۳ تم اپنے اموال آپس میں باطل کے ساتھ نہ کھاؤ مگر اس صورت میں کہ وہ اموال تجارت ہوں ، تمہاری باہمی رضامندی سے ۔

؎۴ یعنی وہ لوگ جن کے ہر قسم کے مال میں چاہے وہ نقد ہوں یا کھیتی کی پیداوار اور مال تجارت ہوں اس پر ایک مقررہ حصہ ہے جسے زکوۃ اور صدقہ فطر کہا جاتا ہے ۔

جیسا کہ صحاح ستہ سے معلوم ہوتا ہے اور اکتساب تین وجہ سے حاصل ہوتا ہے۔ یا مواشی سائمہ یا زراعت یا تجارت سے لہٰذا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں۔ الاموال النامیۃ ثلٰثۃ اصناف الماشیۃ المتناسلۃ السائمۃ والزروع والتجارۃ ولما کان دوران التجارۃ من البلدان النائیۃ وحصاد الزروع وجنی الثمرات فی کل سنۃ وھی اعظم انواع الزکوٰۃ قدر الحول لھا ولانھا تجمع مختلفۃ الطبائع وھی مظنۃ النماء وھی مدۃ صالحۃ لمثل ھذہ التقدیرات۔ انتھی کلامہ۔ لہ

اور سابق معلوم ہو چکا ہے کہ بیع کسب میں داخل ہے۔ بدلیل روایت امام احمد کے رافع بن خدیج سے اور بیع عبارت ہے دوران مال تجارت سے تو نص قرآنی سے زکوٰۃ مال تجارت میں بھی فرض ہوئی کیونکہ صیغۂ انفقوا کا آیت انفقوا من طیبات ما کسبتم میں واسطے وجوب فرض کے ہے علی الاطلاق۔ تو فرضیت زکوٰۃ مال تجارت میں قرآن مجید سے ثابت ہوئی۔ باقی رہی حدیث ابوداؤد کی جو در بارہ زکوٰۃ مال تجارت کے وارد ہے اور وہ حدیث یہ ہے۔ عن سمرۃ بن جندب قال کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یامرنا ان نخرج الصدقۃ من الذی نعدہ للبیع رواہ ابوداؤد واسنادہ لین کذا فی بلوغ المرام۔ لہ

سو یہ حدیث دلیل مستقل فرضیت زکوٰۃ مال تجارت پر نہیں ہے بلکہ وہ دلالت کرتی ہے نص آیت انفقوا من طیبات ما کسبتم اور سند اجماع پر اور یہ حدیث سند اجماع کے لیے کافی ہے، اگرچہ سند اس کی لین وضعیف ہے اور فی نفسہٖ قوی نہیں کہ موجب اسکات ہو۔ البتہ اجماع سے اس میں قوت آگئی چنانچہ تفصیل اور تشریح اس کی بحث اجماع میں مذکور ہے۔ کما لا یخفی علی الماھر باقوال العلماء من المتقدمین والمتاخرین واللہ اعلم بالصواب فاعتبروا یا اولی الالباب حررہ السید محمد نذیر حسین عفی عنہ ۳ ربیع الثانی ۱۲۹۸ھ۔

لہ بڑھوتری والے مال تین قسم کے ہوتے ہیں۔ مویشی جن سے نسل چلتی ہے اور جو چرنے پر رہتے ہیں، کھیتی اور تجارت اور چونکہ دور دراز شہروں سے تجارت کی آمد و رفت اور کھیت کی کٹائی اور پھلوں کی توڑائی ہر سال ہوا کرتی ہے اور یہی زکوٰۃ کی سب سے بڑی قسمیں ہیں، اس لیے ان کا حساب سال بھر رکھا گیا اور اس لیے بھی کہ یہ مختلف مزاج کی جامع ہے اور نمو کا مظنہ ہے لہٰذا اس قسم کی تقدیرات کے لیے یہی مدت درست ہے۔ لہ سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم جس چیز کو بیچنے کے لیے تیار کریں اس سے زکوٰۃ نکالیں (ابوداؤد، سند کمزور ہے۔ بلوغ المرام)

سوال: تیس روپئے (چاندی کے، جو وزن میں چاندی کے آدھے نصاب کے برابر یا اس سے کچھ زیادہ ہوتے ہیں) زید کے پاس حاجت ضرورت سے فاضل ہیں اور سونا بھی (چاندی کے) تیس روپیہ (کے برابر) کا ہے یا فقط سونا (چاندی کے) تیس روپیہ (کے برابر) کا ہے اور چاندی بھی اسی قدر ہے۔ آیا اس وقت پر زید کو زکوٰۃ فرض ہے یا نہیں؟ بینوا توجروا

جواب:۔ صورتِ مسئولہ میں چاندی اور سونا دونوں کو ملا کر نصاب پورا کرنا اور اس میں زکوٰۃ کا فرض ہونا اتفاقی مسئلہ نہیں ہے بلکہ مختلف فیہ ہے۔ بعض علماء کے نزدیک (اس صورت میں زکوٰۃ) فرض ہے اور بعض کے نزدیک فرض نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر فتح الباری صفحہ ۲۴۹ جلد ۳ میں لکھتے ہیں: واستدل به (ای بقوله صلی اللہ علیه وسلم لا یجمع بین متفرق) علیٰ ان من کان عنده دون النصاب من الفضة ودون النصاب من الذهب مثلا انه لا یجب ضم بعضه الی بعض حتی یصیر نصابا کاملا فتجب فیه الزکاۃ خلافا لمن قال یضم علی الاجزاء کالمالکیه او علی القیم کالحنفیة ۔ (یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قول لا یجمع بین متفرق (الگ الگ کو اکٹھا نہ کیا جائے) سے یہ دلیل پکڑی گئی ہے کہ جس کے پاس نصاب سے کم چاندی اور نصاب سے کم سونا ہو تو ایک کو دوسرے کے ساتھ ملانا ضروری نہیں ہے کہ اس طرح پورا نصاب بن جائے اور اس میں زکوٰۃ واجب ہو بخلاف ان لوگوں کے جو کہتے ہیں کہ اجزاء کی بنیاد پر اکٹھا کیا جائے گا۔ جیسے مالکیہ۔ یا قیمت کی بنیاد پر اکٹھا کیا جائے گا جیسے حنفیہ۔)

اور ظاہراً انھی لوگوں کا قول ہے جو کہتے ہیں کہ صورتِ مسئولہ میں زکوٰۃ فرض نہیں کیونکہ چاندی اور سونا دونوں ملا کر نصاب پورا کرنا اور زکوٰۃ فرض بتانا محتاجِ دلیل ہے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

کتبہ محمد عبدالرحمن المبارکفوری عفا اللہ عنہ

فتاویٰ نذیریہ ج۱ ص۵۰۱

سوال:۔ ہمارے یہاں مالدار اور صاحبِ نصاب لوگوں کے گھروں پر کچھ افراد مزدوری کرتے ہیں، ان کی باقاعدہ ماہانہ تنخواہ یا روزمرہ کی اجرت مقرر ہے جو انھیں پوری پوری دی جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر ان مزدوری کرنے والوں کو یا ان کے بال بچوں کو رمضان یا تہوار وغیرہ کے مواقع پر مزدوری کرانے والا الگ سے

کچھ کو کی رقم دیدے یا زکوٰۃ کی رقم کے کپڑے بنوا دے یا کچھ سامان وغیرہ دیدے تو ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟۔

جواب :۔ قرآن میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف مقرر کیے گئے ہیں، جن میں سب سے پہلے فقراء اور مساکین کا نام لیا گیا ہے۔ اگر مذکورہ مزدوری کرنے والے افراد فقراء یا مساکین کے ضمن میں آتے ہیں۔ یعنی ان کا خرچ باوجود کوشش اور کفایت شعاری کے مزدوری کی آمدنی سے کسی طرح پورا نہیں ہو پاتا اور وہ زکوٰۃ لیے بغیر اپنی ضرورت پوری نہیں کر سکتے تو وہ زکوٰۃ لینے کے مستحق ہیں اور انھیں زکوٰۃ کی رقم دی جا سکتی ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ آدمی اپنے مزدور کو زکوٰۃ کا مال دے سکتا ہے یا نہیں، تو جواب یہ ہے کہ اگر مزدور زکوٰۃ کا مستحق ہے تو یقیناً دے سکتا ہے۔ صحیح بخاری میں ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے ایک لمبی حدیث متعدد طرق سے مروی ہے، جس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو اجازت دی ہے کہ وہ اپنے صدقہ کا مال اپنے شوہر اور بیٹوں اور اپنے زیر پرورش یتیموں پر خرچ کرے۔ (دیکھیے صحیح بخاری) ج۱ ص ۱۹۷، ۱۹۸۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان پر جس شخص کا خرچ شرعاً واجب نہیں ہے اسے اپنی زکوٰۃ اور صدقے کا مال دے سکتا ہے۔ لہٰذا اپنے مزدور کو زکوٰۃ دینے میں کوئی حرج نہیں۔ البتہ زکوٰۃ دیتے وقت یہ وضاحت ضرور کر دینی چاہیے کہ یہ زکوٰۃ کا مال ہے۔ عمدہ کارگزاری کا انعام یا تہواری نہیں ہے۔ نیز اس زکوٰۃ کی ادائیگی سے محض اس مزدور کی ضرورت کی تکمیل ہونی چاہیے اور یہ مقصد ہرگز نہ ہونا چاہیے کہ اس طرح مزدور کو خوش کر کے اس سے زیادہ محنت لی جائے ورنہ یہ زکوٰۃ کو اپنے مقصد پر خرچ کرے اور اس سے خود فائدہ اٹھانے کے ہم معنی ہوگا۔ ھٰذا ما عندی واللہ اعلم

صفی الرحمن مبارکپوری۔

حضرت ابن مسعودؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ابن آدم کے قدم (قیامت کے روز اپنی جگہ سے) ہٹ نہ سکیں گے جب تک کہ اس سے پانچ باتوں کے بارے میں سوال نہ کر لیا جائے، اس کی عمر کے بارے میں کہ اسے اس نے کن کاموں میں گزارا، اس کے شباب کے بارے میں کہ اس نے اسے کہاں صرف کیا اور اس کے مال کے بارے میں کہ اس نے اسے کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا اور جو علم اسے حاصل تھا اس پر کہاں تک اس نے عمل کیا۔ (ترمذی)

مَسْجِدْ : حیاتِ انسانی کا مرکز !

مولانا نور العین سلفی مدرس جامعہ محمدیہ مالیگاؤں

یہ حقیقت ہے کہ کسی قوم و مذہب کی بقا و تحفظ کے لیے شیرازہ بندی اور مرکزیت کا ہونا ایسا ہی ضروری ہے جیسے زندگی کی بقا کے لیے رگوں میں خون ضروری ہے۔ اس لیے ہر مذہب و ملت نے اپنا ایک مذہبی شعار اور ایک مرکزی مقام ضرور متعین کیا ہے اور تاریخ شاہد ہے کہ جب تک قومیں اپنے مرکز سے وابستہ رہتی ہیں اس وقت تک ان کے اندر قوت و شجاعت، ہمت و جرأت، اقدام و پیش قدمی، حوصلہ و اقبال مندی، ظفر و کامرانی اور حیات و زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ لیکن جب قومیں اپنے مرکز سے جدا ہو جاتی ہیں تو ان کی جماعتی تنظیم کی گرہیں کھل جاتی ہیں۔ ان کا قومی اور ملی شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے اور ان کے اندر غلامانہ ذہنیت کمزوری و بزدلی، خود غرضی و نفس پرستی، مرعوبیت اور محکومی جیسی برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ وہ قوم جسد بے روح کی طرح زمین کا بوجھ بن جاتی ہے۔ اقوام عالم کی نگاہ میں اس کی قدر و منزلت گھٹ جاتی ہے، غیروں کا رعب و دبدبہ اس پر مسلط ہو جاتا ہے اور وہ قوم ذلت و نکبت کی حالت میں غلاموں کی طرح غیروں کی اطاعت کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

مسجد اسلام کا مرکز :

بالکل یہی حال عصر حاضر کے مسلمانوں کا ہے، کبھی ان کا اتحاد و اتفاق مثالی تھا اور آج ان کا اختلاف و انتشار ضرب المثل بن گیا ہے، اس کا سبب بڑا سبب یہ ہے کہ مسلمان اپنی مرکزیت سے کوسوں دور ہو چکے ہیں، جبکہ اسلام نے مسلمانوں کو باہم متحد رکھنے کے لیے ان کا مذہبی شعار نماز اور مرکزی مقام مساجد کو قرار دیا ہے اور دونوں کو باہم اس طرح مربوط کر دیا ہے کہ نماز کو مسجد سے

اور مسجد کو نماز سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ نماز اسلام کے ہر فرد امیر و غریب، مرد و عورت، آزاد و غلام اور بیمار و تندرست سب پر فرض ہے۔ نماز کی پابندی کرنے کی صورت میں افراد کے اندر تقویٰ، تزکیۂ نفس، اتحاد و اتفاق، خلوص و محبت عقیدت و وحدت، اخوت و مروت اور شورائیت و اجتماعیت جیسی کریمانہ صفات پیدا ہوتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے نماز کو تمام عبادتوں سے افضل ترین عبادت قرار دیا ہے۔ نماز اسلام اور کفر کے درمیان خط امتیاز اور حد فاصل ہے جو مسلمان قصداً نماز ادا نہیں کرتا وہ کفر کی سرحد سے جا ملتا ہے: اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (نماز قائم کرو اور مشرکین میں سے نہ ہو)۔ یہی حقیقت حدیث پاک میں اس طرح بیان کی گئی ہے: بين العبد وبين الكفر ترك الصلوٰة۔ (بندے اور کفر کے درمیان نماز کا ترک ہے۔) حضرت عبداللہ بن شقیق فرماتے ہیں کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے علاوہ کسی عمل صالح کے ترک کو کفر نہیں سمجھتے تھے۔ كان اصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم لا يرون شيئاً من الاعمال تركه كفر غير الصلوٰة۔

مسجد درحقیقت تعلق باللہ، بندگیٔ محض، سپردگیٔ کامل، خشوع و خضوع، توبہ و انابت اور روح و نفس کی پاکی و طہارت کا مقام ہے۔ نماز کی حالت میں بندہ پاک بدن پاک کپڑے، پاک جگہ پر ہاتھ باندھے ادب سے نظریں جھکائے اپنے منعم حقیقی کے حضور کھڑا ہو کر اپنی بے بسی اور رب کی عظمت و کبریائی کا اعتراف کرتا ہے اور اپنے خالق کی تقدیس کا ترانہ اسی کے الفاظ اور اسی کے دربار میں گنگنا کر اپنی اطاعت و بندگی کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ۔ (اللہ کے لیے پوری تابعداری کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ) اس طرح اسلام اپنے متبعین اور شیدائیوں کو دن میں پانچ مرتبہ اپنے مرکز پر اکٹھا کرتا ہے، اسلام کا یہ مرکز یہی مساجد ہیں، جن کو بیت اللہ اور خانۂ خدا کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ موذن شب و روز میں پانچ مرتبہ نعرۂ تکبیر کے شیریں نغمات کے ساتھ ان اسلامی مراکز میں جمع ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ مسجد مذہبی، اخلاقی، سیاسی، تمدنی، ثقافتی مقاصد اور ملی جدوجہد کا مرکز ہے۔ اسی لیے شریعت نے مسجد کو دنیا کا سب سے مقدس اور عنداللہ محبوب ترین مقام قرار دیا ہے: احب البلاد الى الله مساجدها وابغض البلاد الى الله اسواقها۔ (مسجد یں اللہ کے نزدیک روئے زمین کا سب سے محبوب ٹکڑا ہیں، اور بازار اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ ٹکڑا ہیں۔)

... ...

مسجد اور جماعتی تنظیم: مساجد میں شب و روز کی حاضری نے ہمیں جماعتی تنظیم کا درس دیا، باہمی اختلاف کو مٹانا اور جماعتی ہستی کی وحدت میں فنا ہونا سکھایا۔ مسجد میں پہنچ کر ہم نے اپنا ایک امام اور ایک قائد تسلیم کیا، جس کے جھکنے اور اٹھنے پر ہم نے جھکنا اور اٹھنا سیکھا۔ اس سے ہم نے اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد کیا، صف بہ صف، شانہ سے شانہ اور ٹخنوں سے ٹخنے ملا کر بغض و حسد اور نفرت و عداوت کی گرہیں کھولیں اور اس کی جگہ پاکیزہ الفت و محبت کا پیمان باندھا۔ بنابریں نماز کے لیے جماعت کی حاضری بغیر کسی عذر شرعی کے واجب اور ضروری قرار دی گئی اور کسی فرد مومن کو یہ اجازت نہیں دی گئی کہ وہ جب چاہے جہاں چاہے جیسے چاہے اور جدھر چاہے اپنا منہ کر کے نماز پڑھ لے۔ بلکہ اس کو اصول و ضوابط کا پابند کیا گیا تاکہ اس کی ایک ایک حرکت ایک ایک ادا اور ایک ایک جنبش سے وحدت و یکتائی کا نظم آشکارا ہو اور آپس میں تعاون ہمدردی، غمخواری اور میل جول کا جذبہ پیدا ہو، اسی لیے نماز با جماعت سے سستی اور کاہلی کرنا نفاق کی علامت قرار دی گئی ہے: واذا قاموا الی الصلٰوۃ قاموا کسالٰی۔ (اور یہ منافقین جب نماز کی طرف اٹھتے ہیں تو سست بنے ہوئے اٹھتے ہیں۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لیس صلوۃ اثقل علی المنافقین من الفجر و العشاء ولو یعلمون ما فیھما لاتوھما ولو حبوا (منافقین پر کوئی نماز فجر اور عشاء سے زیادہ بوجھل نہیں اور اگر یہ جان لیں کہ ان دونوں میں کیا ہے تو ضرور آویں گے اگرچہ گھٹنوں کے بل۔)

مسجد میں جہاں اللہ کی عبادت مقصود ہے وہیں جماعت کی شیرازہ بندی، سمع و طاعت، اجتماعیت اور تنظیم بھی مقصود ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد سب سے پہلے جو کام کیا تھا وہ مسجد قبا اور مسجد نبوی کی تعمیر تھی۔

مسجد درسگاہ نبوت صدر اول میں مساجد اسلام کی تعلیم و تبلیغ کا مرکز اور ملت اسلامیہ کی علمی سیاسی ثقافتی تنظیمی، اخلاقی اور روحانی قوتوں کا منبع اور سرچشمہ ہوا کرتی تھیں۔ یہیں سے ہر قسم کے علم و فن کی تعلیم دی جاتی تھی اور ہر قسم کی سرگرمیوں کے نقشے اور خاکے مرتب کیے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوت و ارشاد کا ہر کام پوری دنیائے اسلام میں یہیں سے کیا جاتا تھا۔ عہد رسالت میں طالبان علم نبوت کے لیے مسجد نبوی کے ایک حصہ میں ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔ جہاں وہ رہا کرتے تھے اور زبان رسالت

سے علم نبوت کا درس لیا کرتے تھے۔ ان اصحاب کو اصحاب صفہ کہا جاتا ہے وقت کے لحاظ سے ان کی تعداد کم و بیش ہوا کرتی۔ خصوصیت کے ساتھ جب مکہ فتح ہوا تو سن نو ہجری میں نہایت سرعت کے ساتھ اسلام پورے عرب میں پھیل گیا اور دین کے مسائل سیکھنے کے لیے بکثرت وفود آپ کی خدمت میں آنے لگے اسی لیے اس سال کو سال وفود کہا جاتا ہے۔ یہ تمام وفود عہد رسالت کے طلبہ ہوتے تھے۔ ان کا قیام اور رہائش عموماً مسجد نبوی کی چٹائی یا اس کا صفہ ہوتا تھا۔ ضروری مسائل سیکھنے کے بعد یہ وفود اپنے وطن واپس جاتے اور اپنی قوم و برادری میں دعوت وارشاد کا فریضہ انجام دیتے وما کان المؤمنون لینفروا کافة فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذروا قومهم اذا رجعوا الیهم لعلهم یحذرون۔ (ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ سارے ہی مومنین نکل پڑیں، کیوں نہ ہر گروہ سے ایک جماعت نکلے تاکہ دین کی سمجھ حاصل کرے اور جب اپنی قوم کی طرف پلٹے تو انھیں انجام سے ڈرائے تاکہ لوگ ڈریں۔)

حضرت عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عمرو بن عاص جیسے زاہد اور متقی، عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس جیسے مجتہد اور فقیہ ابوہریرہ اور ابوالدرداء جیسے حامل علم نبوت، خالد بن ولید اور حضرت علی جیسے بہادر اور ابوبکر و عمر جیسے مفکر، مدبر اور قائد و رہبر رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین اسی مسجد نبوی کے صفہ و منبر سے تیار کیے گئے تھے۔ انھوں نے براہ راست زبان نبوت سے فیض حاصل کیا اور آفتاب و ماہتاب بن کر آسمان اسلام پر ابھرے اور اپنے علم و فن سے دنیا کو رشد و ہدایت کی روشنی بخشی اور دنیا نے اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیادت و قیادت کو تسلیم کیا

مسجد عاصمة الاسلام یہ مساجد وحدت اسلام کا قلعہ اور علم دین کی مرکزی درس گاہ ہونے کے ساتھ درحقیقت اسلامی دارالسلطنت ہیں عویمر عجلانی کے لعان کا قضیہ اسی مسجد نبوی میں طے کیا گیا تھا۔ ثمامہ بن اثال اور ابولبابہ کو اسی مسجد کے ستون سے باندھا گیا۔ کعب بن مالک اور عبداللہ بن حدرد کے قرض کا مسئلہ اسی مسجد میں حل کیا گیا۔ حبشیوں نے فن حرب کا مظاہرہ اسی مسجد نبوی کے صحن میں کیا۔ غزوات و سرایا کی تیاری و مشورے اسی مسجد میں ہوا کرتے تھے۔ حدود و تعزیرات کے قضایا اسی مسجد میں سنائے جاتے۔ غرباء اور فقراء کی امداد کی اپیل اور وفود سے ملاقات اسی مسجد میں کی جاتی۔

اس لیے دراصل یہ مساجد عہد نبوی میں بیک وقت خانۂ خدا، درس گاہ نبوت، اسلام کا مرکز، میدانِ جنگ کا دفتر، دارالامارہ، دارالقضاء، دارالشوریٰ، دارالامن بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ عاصمۃ الاسلام تھیں۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے: واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس وامنا - اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کا مرجع اور مقام امن بنایا۔

مسجد کی آبادی کا مفہوم

مسجد سے تعلق، اس کی تطییب، اس کی حفاظت و نگرانی، نماز باجماعت کی ادائیگی اور مسجد میں بکثرت آمد و رفت ایمان کی علامت قرار دی گئی ہے

انما یعمر مساجد اللہ من امن باللہ والیوم الاخر واقام الصلوٰۃ واتی الزکوٰۃ ولم یخش الا اللہ فعسیٰ اولٰئک ان یکونوا من المھتدین۔ اللہ کی مسجدیں وہی آباد کرتے ہیں جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تو ایسے لوگ قریب ہے کہ ہدایت یاب ہوں۔

مسجد کی آبادی کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کے لیے ہر طبقہ سے لوگ وہاں پہنچیں اور آپس میں اخوت و بھائی چارگی کا ماحول قائم کریں۔ نہ یہ کہ صرف بوڑھے اور بچے جائیں اور ایک دوسرے پر تنقید و تبصرہ اور طعن و تشنیع کریں جس سے آپس میں اتحاد و اتفاق کے بجائے کدورت اور اختلاف کی فضا قائم ہو۔

اللہ کے وہ نیک بندے جو حسبۃً للہ مسجد کی تعمیر کرتے ہیں یا اس کی تعمیر میں حصہ لیتے ہیں، ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ جنت میں ایسا مقام عطا کرے گا جو مسجد ہی کی طرح جنت کا سب سے مقدس اور عنداللہ محبوب ترین مقام ہوگا۔

من بنیٰ للہ مسجداً بنی اللہ لہٗ بیتاً فی الجنۃ۔ جو اللہ کے لیے مسجد بنائے اللہ اس کے لیے جنت میں اسی جیسا گھر بنائے گا۔

مسجد کا حاضر اور ماضی

یہ حقیقت واضح طور سے سامنے آچکی ہے کہ مساجد صدر اول میں بالخصوص عہد نبوی میں، دینی، ثقافتی، اجتماعی و سیاسی قوتوں کا مرکز ہوا کرتی تھیں۔

نماز، روزہ اور حج و زکوٰۃ کی تعلیم بھی انہی مساجد سے دی جاتی تھی اور حکومت و سیاست، جنگ و جہاد اور حقوق و معاملات کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ اسی لیے اس زمانے میں مسجد کا امام اور حکومت کا امیر ایک ہی شخص

ہوتا تھا، اور وہ قوم کا ایک ایسا شخص ہوتا تھا جو اپنے ماحول کا اور معاشرے کا بہترین شخص ہوا کرتا تھا۔ نیز اپنے وقت کا نہایت مدبر سیاست داں اور اسرارِ شریعت سے واقفیت رکھنے والا ہوتا تھا

جب تک اس اصول پر عمل ہوتا رہا مساجد کی مرکزیت باقی رہی اور سیاست دین کی پہرہ داری سے آزاد نہیں ہو سکی۔ لیکن بعد کے دور میں جب دین و سیاست میں بٹوارہ ہوگیا اور حکومت و سیاست پر امراء اور اغنیاء کا ایک طبقہ مسلط ہوگیا جو دین و شریعت سے کم ہی واقفیت رکھتا تھا۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ سیاست دین کی پہرہ داری سے آزاد ہو کر فیل بے زنجیر بن گئی اور اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔

دوسری طرف مساجد میں جاہل ائمہ کی کثرت اور بے نمازی، خود غرض متولیوں کی اجارہ داری نے مساجد کا نظام درہم برہم کر کے رکھ دیا، اور یہ مساجد جو رشد و ہدایت اور دعوت و ارشاد کا سرچشمہ تھیں جدال و قتال اور بدعات و خرافات کا ذریعہ بن گئیں۔ اس لیے آج ضرورت ایسی جامع تبدیلی کی ضرورت ہے جو مسجدوں کو ان کا وہ صحیح مقام دلا سکیں جو انہیں صدر اسلام میں حاصل تھا۔

اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ کم از کم مرکزی شہروں کی اہم مساجد یا ہر بستی کی جامع مسجد کے ائمہ ضروری طور سے ایسے ہوں جو امورِ شریعت سے اچھی طرح واقف ہوں اور امت کی دینی و سیاسی قیادت سنبھالنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور اس کے لیے ضرورت ہے کہ ملک کے متعدد شہروں میں ایسے بنیادی مراکز قائم کیے جائیں جہاں ایک مناسب اور متوازن نصاب کے تحت مساجد کی امامت کے لیے تعلیم و تربیت دی جائے تاکہ وہ اس منصب کا حق بخوبی ادا کر سکیں۔

مفتی عتیق الرحمان صاحب: ۱۲ رمئی ۱۹۸۴ء کو سہ پہر ملت اسلامیہ ہند کی رزم و بزم کے شہسوار اور فضلاء دیوبند کے گوہر آبدار جناب مولانا مفتی عتیق الرحمان صاحب عثمانی رح ۸۴ سال کی عمر میں رحلت فرما گئے۔ انا للہ۔ ۱۳ رمئی کو ٹھیک دس بجے درگاہ شاہ ولی اللہ میں سپرد خاک کیے گئے۔

موصوف کو چند بار دور و نزدیک سے دیکھا اور ان کا علم، حلم، رواداری، وقار و مروت، فراخ دلی اور شرافت و نجابت کا مرقع پایا۔ موصوف کی ہستی تعارف سے بالاتر تھی۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

ماہِ رمضان

نسیم بنارسی

مومنو! تم شوق سے روزہ رکھو رمضان کا — دین کا یہ رکن ہے اور حکم ہے قرآن کا
رحمتیں نازل ہوا کرتی ہیں ان پر رات دن — جن کو رہتا ہے خیال اسلام کے ارکان کا
ہے قیام اللیل رمضاں میں بڑا کارِ ثواب — دور ہوتا ہے اسی میں پارۂ قرآن کا
پہلا عشرہ مژدۂ رحمت کا دیتا ہے پیام — دوسرے عشرے میں بخشش فضل ہے غفران کا
تیسرے عشرہ میں ملتی ہے جہنم سے نجات — ہے خلاصہ یہ رسول اللہ کے فرمان کا
بارگاہِ حق سے نازل اس مہینہ میں ہوا — رشتہ ہے اس ماہِ اقدس سے بہت قرآن کا
تم رہو اس ماہ میں ہر شر سے بالکل دور دور — ماہِ رمضاں میں لڑائی کام ہے شیطان کا
متقی بن جاؤ تم سب ہے یہ روزہ کی غرض — نفس پر قدرت ہو تم کو درس ہے قرآن کا
آخری عشرہ میں آجاتی ہے ایسی ایک رات — ہے نہیں پاسنگ ہزاروں رات جس کی شان کا
جو نہ چھوڑے جھوٹ باتیں اور عمل اس پہ کرے — فائدہ کچھ بھی نہیں بھوکی پیاسی جان کا
حالتِ روزہ میں رکھو ہر عبث سے اجتناب — دور رکھو پھر زباں پر ہر گھڑی سبحان کا
جان کر اس کے مسائل مومنو روزہ رکھو — کام دیں کا جو کرو وہ ہو اسی کی شان کا
نیکیاں ہر حرف پر اللہ دیتا ہے اسے — دور جو کرتا ہے دل سے رات دن قرآن کا
بھر لو دامن آج ہے اللہ کی رحمت وسیع — کون پائے پھر اسے کیا ہے بھروسہ جان کا
زندگی کو اس مہینہ کی غنیمت جان لو — کیا بھروسہ پھر ملے گا ماہ یہ رمضان کا
شرک و بدعت سے بچو اے مومنو تم رات دن — ہے تقاضا تم سے ہر دم دین کا ایمان کا
ہے مبارک یہ مہینہ اس کو نعمت جان کر — بس گلا ہی گھونٹ دو تم ہر غلط ارمان کا۔

اس مہینہ کی عبادت کا صلہ اللہ نے   لے لیا ہے اپنے ذمہ خود نرالی شان کا
آٹھ دروازے کھلے ہیں جنت الفردوس کے   روزہ داروں کے لیے یہ فضل ہے رحمان کا
ہوں گے داخل خاص دروازے سے سارے روزہ دار
اے نسیم اس باب کو کہتے ہیں در ریّان کا

اللہ کی راہ میں خرچ :

سورۃ البقرۃ کی ۲۱۹ ویں آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ ایک مسلمان کو اللہ کی راہ میں کیا کچھ خرچ کرنا چاہیے وَيَسْئَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ ط كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ٥ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ط "پوچھتے ہیں ہم راہ خدا میں کیا خرچ کریں؟ کہو جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو، اس طرح اللہ تمہارے لئے صاف صاف احکام بیان کرتا ہے۔ شاید کہ تم دنیا اور آخرت دونوں کی فکر کرو،، اسی سورۃ البقرہ کی ۲۴۵ ویں آیت میں اللہ تعالیٰ نے دین کی خدمت میں مال خرچ کرنے کو اپنے ذمہ قرض قرار دیا ہے اور قرض بھی ایسا جو کئی گنا بڑھا چڑھا کر ایسے وقت واپس کیا جائے گا جس وقت دنیا کا کوئی مال بجز اس قرض کے کام نہ آئے گا، مالک الملک مسلمانوں سے سوال کرتا ہے مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً ط وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ٥ "تم میں کون ہے؟ جو اللہ کو قرض دے قرض حسن۔ تاکہ اللہ اسے کئی گنا بڑھا چڑھا کر واپس کرے، اللہ ہی ہے جو تنگی بھی دیتا ہے اور کشادگی بھی اور اسی کی طرف تمہیں پلٹ کر جانا ہے،، اور اس قرض حسن کو بڑھا چڑھا کر واپس کرنے کی مثال ۲۶۱ ویں آیت میں اس طریقہ سے بیان کی گئی ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ط وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ٥ "جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں انکے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس سے سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے ہوں اس طرح اللہ جس کے عمل کو چاہتا ہے فزونی عطا فرماتا ہے وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی،،۔۔۔۔ (البقرہ ۲۶۱)

افغانستان کی وادیٔ نورستان میں تحریک اہلحدیث

___ آغازِ دعوت سے قیامِ حکومت تک کی داستان

ہم نے گذشتہ ماہ اکتوبر ۱۹۸۲ء کے شمارے میں ص ۴۴ پر روزنامہ جنگ لاہور کے حوالے سے یہ خبر شائع کی تھی کہ افغانستان کی مشہور وادی نورستان کو وہاں کے مجاہدین نے روسی پنجۂ استبداد سے آزاد کرا کر وہاں ایک باقاعدہ آزاد اسلامی حکومت قائم کی ہے جس کے سربراہ مولانا محمد افضل ہیں۔ بعد میں اس اسلامی حکومت کی اکا دکا خبریں بھی اخبارات کے ذریعہ موصول ہوئی تھیں۔ لیکن کوئی تفصیل فراہم نہ ہو سکی تھی الحمد للہ کہ حال ہی میں ہمیں دو کتابچے موصول ہوئے ہیں۔ جن سے یہاں کے پچھلے اور موجودہ حالات کا بہت کچھ علم ہوتا ہے۔ اور مستقبل کے عزائم اور منصوبوں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ذیل میں ہم ایک کتابچہ مکمل اور دوسرے کتابچے کی تلخیص پیش کر رہے ہیں۔ پہلے کتابچے کا نام ہے "اسلامی انقلاب کی مکمل روئیداد و آئینہ نورستان" اس کے مرتب محترم ذکی الرحمٰن بن حافظ عزیز الرحمٰن ساکن گکھڑ (پنجاب۔ پاکستان) ہیں۔ یہ کتابچہ ۲۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ چار صفحات ابتدائیہ کے عنوان سے بطور تمہید ہیں۔ اور بقیہ میں رودادِ تحریک بیان کی گئی ہے۔ دوسرا کتابچہ حکومت نورستان کی طرف سے شائع کیا گیا ہے اور اس کا نام ہے "دولت انقلابی اسلامی افغانستان کا نصب العین" تو پہلے "آئینۂ نورستان" ملاحظہ فرمائیے:

ابتدائیہ

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین وبعد۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جو قوم اللہ کے دین کی سربلندی اور کفر کے انسداد کے لیے سرگرم ہوجاتی ہے اس قوم کی اللہ تبارک وتعالیٰ ضرور مدد کرتا ہے۔ اگرچہ تمام باطل قوتیں اس قوم اور جماعت کو دنیا سے مٹانے کے لیے متحد ہوجائیں اس پرخلوص اور کفن بردوش قوم کو شکست نہیں دے سکتیں ہاں اس قوم کو بظاہر جب بھی شکست کا سامنا کرنا پڑا ہے تو وہ یا تو اس وجہ سے کہ انھی کا لبادہ اوڑھنے والے لوگ انھیں دھوکا دیتے رہے یا مسلمان نما حاسدوں کے حسد کی وجہ سے انھیں نقصان پہنچا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب سے شرر بولہبی چراغِ مصطفوی سے ستیزہ کار رہا ہے اس وقت سے آج تک یہ چراغ پھونکوں سے بجھایا نہیں جاسکا۔

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اور جب بھی طاغوتی قوتوں نے اللہ کی سرزمین پر بغاوت کا علم بلند کیا تو ان بغاوت کے استیصال کیلئے قرآن وحدیث کے شیدائی اپنی جانوں کو ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں نکل آئے اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کی یقیناً مدد فرمائی اور جب بھی کسی ملک میں طاغوتی قوتوں نے سر اٹھایا تو کتاب وسنت کے علمبردار انکی سرکوبی کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہر طرف سے جاہدوا کی صدائے دلنواز آنے لگی۔

تاتاریوں نے اقوام عالم پر ظلم وبربریت کا آغاز کیا تو امام ابن تیمیہؒ سے یہ ظلم وعدوان دیکھا نہ جاسکا۔ انھوں نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور ان کے دلوں میں جہاد کا ایک نیا ولولہ پیدا کرکے انھیں عملی میدان میں لے آئے، جس سے تاتاریوں کا عالمگیر خواب خاک میں مل گیا۔

جب ترکوں نے حرمین شریفین میں شرک وبدعت پھیلا کر لوگوں کے دلوں سے اللہ کی کبریائی اور وحدت کو نکال کر قبروں اور غیر اللہ کی بڑائی جاگزیں کردی تو شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ نجد کے ریگستانوں میں لوگوں کے دلوں میں اللہ کی توحید وعظمت بٹھانے اور اس کا نقش قائم کرنے کے لیے شب وروز جدوجہد کی اور جاں گسل کارنامے انجام دیے۔ بے سروسامانی کے باوجود اللہ کی مدد سے ترکوں کے مشرکانہ

غرور کو توڑ کر اللہ تعالیٰ کی وحدت کے علم کو بلند کر دیا۔

جب ہندوستانی مسلمانوں پر مرہٹوں، سکھوں، انگریزوں اور فرانسیسیوں کے چار گونہ ظلم و ستم نے جینا تنگ کر دیا تو مسلمانوں کو مذکورہ بالا اقوام کے ظلم و ستم سے نجات دلانے کے لیے سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ اور شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ میدانِ جہاد میں نکلے اور مسلمانوں میں اسلام کی سربلندی کے لیے ایک نئی روح پھونک دی۔

اسی طرح افغانستان میں جب سامراجی نظام اپنے ظلم و استبداد کے پنجے گاڑ رہا تھا، اس وقت سے علمائے حق قرآن و سنت اور توحید کے متوالوں کے دلوں کو کتاب و سنت کے نور سے منور کرنے میں کوشاں تھے اور سامراجی قوتیں اس نور کو بجھانے میں مصروف رہیں۔ ان طاقتوں کی معنوی کشمکش میں بالآخر روسی دیوِ استبداد نے افغانستان کو آ دبوچا تو پھر کتاب و سنت کے پروانے روس سے ٹکرانے کے لیے بے خطر میدانِ جہاد میں کود پڑے۔

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق
عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

چنانچہ نورستان کی پہاڑیوں اور درہ پیچ کی وادیوں سے کتاب و سنت کے یہی علمبردار اٹھے اور روس کی طاغوتی طاقت کے سامنے سینہ سپر ہو گئے۔ تاریخ گواہ ہے کہ افغانستان پر یلغار کرنے والی طاغوتی طاقت کے سامنے سب سے پہلے نورستان کے جاں نثار ہی سینہ سپر ہوئے۔ چنانچہ اتحاد اسلامی مجاہدین افغانستان کے کمیٹہ فرہنگی انجمن تاریخ سال ۱۳۶۲ھ شمسی[1] میں لکھا ہے کہ ۱-۷-۱۳۵۷ (۱۳۹۸ھ) قیام حماسہ آفرین درہ ویگل نورستان یعنی کہ درہ ویگل نورستان کے لوگوں نے انقلاب کے چوبیسویں دن سامراجی طاقت کے سامنے آواز اٹھائی نیز اسی کیلنڈر میں ہے کہ ۱۲ میزان ۱۳۵۷ ش ھ قیام مردم مسلمان نورستان یعنی یہ نورستان شرقی کے لوگوں کا سامراجی قوت کے بالمقابل آنے کا بیان ہے گویا شرقی نورستان کے لوگ انقلاب کے پانچویں ہفتے میں افغانستان کی سوشلسٹ حکومت کے خلاف میدانِ جہاد میں اتر آئے۔ ان کے علاوہ پورے افغانستان کے مسلمان اس عملِ جہاد میں حصہ لینے پر مبارکباد کے قابل ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی نصرت اور مدد فرمائے سوشلسٹ حکومت کے خلاف عملاً ایک سال بعد ۱۳۵۸ھ ش (۱۳۹۹ھ) میں اٹھ کھڑے ہوئے نورستان اور درہ پیچ

---

[1] یہ افغانستان و ایران میں رائج ہجری کا شمسی سال ہے جو قمری سال کے حساب سے ۱۴۰۳ھ کے مطابق ہے۔

کے جیالے مسلمان اس وقت اس روسی طاقت سے نبرد آزما تھے جبکہ ان کو کھانے پینے کے لیے کسی طرف سے کسی قسم کی امداد میسر نہیں تھی۔ یہ مجاہد بے سروسامانی کے عالم میں فقط خداوند قدوس کی نصرت پر ایک سپر طاقت کے ساتھ شب وروز جہاد میں معروف تھے۔

الحمدللہ ایسے کٹھن وقت میں مسلمانوں کے کام صرف قرآن وسنت والے ہی آتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت سے لے کر آج تک جبکہ ۱۳۵۷ (۱۹۷۸ء) میں نورستان میں افغانستان کی سطح پر ایک مملکت بنام دولت انقلابی اسلامی افغانستان قائم ہو چکی ہے جو بحمد اللہ بر احسن وخوبی اپنے فرائض سرانجام دے رہی ہے اب تک اس کی امداد پاکستان کے اہلحدیث بھائیوں نے کی ہے۔ چنانچہ راقم الحروف کے توسط سے نورستان شرقی وغربی، دروہ پیچ جو نورستان وسطی کی ابتدا ہے درہ نوہ وغیرہ تک نقدی کپڑے ادویات، مورچوں میں کھانے کے لیے چینی، چائے، گڑ، اور دریا عبور کرنے کے لیے جالوں اور ٹیوب وغیرہ کی امداد پہنچائی گئی ہے۔
میں ان تمام معاونین حضرات کا شکر گزار ہوں، خاص کر جناب مولانا محمد یوسف صاحب مرحوم گکھڑوی، جناب مولانا خالد صاحب گرجاکھی جناب قاری محمد یحییٰ خان صاحب اور حکیم محمود صاحب وغیرہ کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے اپنے مسلک یعنی قرآن وسنت کی اعانت واشاعت کے لیے اپنے شب وروز ایک کر کے کسی قسم کی امداد سے دریغ نہیں کیا۔

یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ قرآن وسنت کے علمبرداروں کو کسی قسم کی مالی امداد نہیں دی گئی جو دوسرے ملکوں سے ان مفلوک الحال افغانیوں کی امداد کے لیے آ رہی ہے۔ ان کی نگاہیں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی اعانت اور اپنے سلفی بھائیوں کی پرخلوص دعاؤں کی منتظر ہیں۔

آخر میں دعا ہے کہ رب کائنات سرزمین افغانستان کو روس اور روس کی ہمنوا حکومت کے تسلط سے پاک کر کے اس سرزمین کی مکمل زمام اقتدار قرآن وحدیث کے عاملین کے ہاتھ میں دیدے اور دنیا کے کونے کونے میں جہاں مسلمان کسی بھی غیر مسلم ظالم کے شکنجے میں کسے ہوئے ہیں ان کو نجات دے کر تمام عالم کی زمام حکومت قرآن وحدیث کے عاملین کے ہاتھ میں دے دے۔ آمین یارب العالمین

احقر: ابو عمر عبدالعزیز النورستانی

نورستان کا محل وقوع

نورستان، صوبہ بدخشاں کے جنوب میں صوبہ کنڑ اور لغمان کی شمالی تین وادیوں پر مشتمل ہے۔ نورستان کے مغرب کی طرف پنج شیر (صوبہ کاپیسا) اور مشرق کی طرف پاکستان کا علاقہ چترال اور دیر ملا ہوا ہے۔ یہ علاقے زیادہ تر پہاڑوں پر مشتمل مشہور سلسلہ کوہ ہندوکش کے دامن میں واقع ہیں، تینوں وادیوں کی مشرقی وادی کو شرقی نورستان، درمیانی وادی کو وسطی نورستان، پھر اس کے تین حصے ہیں۔ ایک کو باروٹ دوسرے کو کینتوا اور تیسرے کو وادی وائیگل کہتے ہیں۔ اور مغرب میں واقع نورستان کو غربی نورستان کہتے ہیں یہ بھی چار چھوٹی چھوٹی وادیوں میں بٹا ہوا ہے۔ پہلی وادی کو کلم دوسری کو شتوک تیسری کو پوشال اور چوتھی کو پارونش کہا جاتا ہے۔

نورستانی قوم

نورستانیوں کا دعویٰ ہے کہ وہ نسلاً خاندانِ قریش سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی تہذیب وتمدن، عادت اور مزاج اس بات پر شاہد ہیں کہ یہ آبائی طور پر عرب مہاجرین ہیں۔ اس دعویٰ پر ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ اپنی تہذیب کے لحاظ سے یہ قوم اپنے اردگرد کے قریبی علاقوں کی قوموں سے بالکل مختلف ہے فتح مکہ کے وقت اسلام سے فرار ہو کر عراق میں داخل ہوئے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے تعاقب کیا تو بھاگتے ہوئے کابل پہنچ گئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کی کمان میں کابل تک مجاہدین آئے تو انھوں نے جلال آباد کے نواح میں حکامنہ نامی جگہ پر پناہ لی کچھ عرصہ بعد مقامی لوگوں سے تعلقات خراب ہوئے تو مذکورہ بالا وادیوں میں پناہ لے کر یہیں کے ہو رہے۔

تہذیب وتمدن

تمام نورستان میں لوگوں کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی بھیڑ بکریاں اور گائے پالنا ہے۔ دوسرے علاقوں سے بلند پہاڑوں کی وجہ سے کٹا ہوا ہونے کی بنا پر افغانستان کی کرنسی بھی وہاں بہت کم چلتی ہے۔ زیادہ تر لین دین گائے بکری اور بھیڑوں کے ذریعہ سے کرتے ہیں، پسماندگی کا یہ حال ہے کہ پڑا، جوتا، چینی، نمک، ماچس، مٹی کا تیل اور دیگر تمام مصنوعی اشیاء صرف چترال (پاکستان) سے درآمد ہوتی ہیں۔ داؤد کے دور میں کابل سے برگ متال تک سڑک آتی تھی جو مسلسل سوفلٹ لشکروں کی تباہی کی وجہ سے کچھ تو ٹوٹ گئی اور کچھ مجاہدین نے مزید خطروں سے بچنے کے لیے کاٹ کاٹ کر بند کر دی ہے۔ نورستان کو چترال سے ملانے والے دو راستے دسمبر سے اپریل تک

گرم چشمے والا اور بصیرت والا۔) ہر قسم کی آمدورفت کے لیے برف باری کی وجہ سے بند رہتے ہیں۔ نگر ایک راستہ روسی چوکی کے قریب سے گزر کر جاتا ہے جو کچھ وجوہات کی بنا پر دو سال بند رہنے کے بعد اب کھلا ہے یہ راستہ سال بھر کھلا رہتا ہے مگر جب روسی چوکی کے قریب سے گزرنا ہوتا ہے تو کسی بھی اچانک حملہ کے پیش نظر پر خطر بھی ہے۔ نورستان کے بعض پہاڑوں میں نیلم، بیرج اور لاجورد قسم کا قیمتی پتھر پایا جاتا ہے بغیر ڈرل مشینوں کے نکالنا جان جوکھوں کا کام ہے اور مشینری وہاں بالکل ناپید ہے۔ لوگ مٹی کا تیل روشنی کے لیے بڑی مشکل سے لے کر جاتے ہیں، کجا یہ کہ یہ مشینیں مہیا کریں۔

پیداوار پورے نورستان میں برف کی وجہ سے سارے سال میں ایک فصل کاشت کی جاتی ہے، صرف وادی وائیگل میں دو فصلیں کاشت کی جا سکتی ہیں۔ شرقی نورستان میں زیادہ تر مکئی اور سبزیات میں سے آلو، حلوہ کدو، لوبیا اور مٹر کاشت کیا جاتا ہے۔ سرد علاقے کا ہر قسم کا پھل وہاں پایا جاتا ہے مگر لوگ زیادہ تر توت، اخروٹ، خوبانی، سیب، انگور، آلوچہ، آڑو انار اور عناب وغیرہ کی باغبانی کرتے ہیں۔

وسطی نورستان میں زیادہ تر گندم کاشت کی جاتی ہے اور سبزیات میں سے آلو، حلوہ کدو پھلوں میں سے مذکورہ پھلوں کے علاوہ خودرو جنگلی بادام اور چلغوزہ تو بہت ہوتا ہے مگر لوگ ذخیرہ کرنے کے شوقین نہیں ہیں۔

یہ لوگ گرمیوں میں اپنے اپنے ریوڑ لے کر بلند چراگاہوں کی طرف نکل جاتے ہیں اور گھاس اگا کر سردیوں کے لیے ذخیرہ کر لیتے ہیں۔ دودھ کی پیداوار بہت ہے جس سے پنیر، گھی اور کروت تیار کرتے ہیں۔ گرمیوں میں کروت اور پنیر سالن کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور سردیوں میں گوشت کثرت سے کھاتے ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ نورستان میں زیادہ تر علاقہ پہاڑی ہے۔ نقشے میں آپ اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ آبادی کے قابل علاقہ کس قدر ہے اور جو علاقہ آبادی کے قابل ہے اس میں سے بھی آبادی صرف ان علاقوں میں ہے جو چوڑائی میں دوسروں کی بہ نسبت زیادہ فراخ ہے لوگ اپنے گھر نہایت مختصر اور خوبصورت بناتے ہیں جنگلوں میں دیار کی لکڑی عام پائی جاتی ہے۔ پتھروں اور بڑے بڑے شہتیروں کی مدد سے دیواریں بناتے ہیں اور لکڑی کی نہایت مضبوط چھتیں تیار کرتے ہیں جیسا کہ برصغیر کے دیہاتوں میں بیگار کا رواج ہے اسی طرح وہاں بھی رواج ہے۔ مکان بناتے وقت صرف لکڑی پہ

اخراجات اٹھتے ہیں۔

کفر سے اسلام تک

آج سے تقریباً پون صدی قبل ۱۸۹۶ء تک یہ لوگ بت پرست تھے۔ جنات سے امداد طلب کرتے، ان کے نام پر مال کی قربانی دیتے، ہر وادی میں ایک جن کو ذمہ دار بناتے۔ گو جس طرح کہ عرب قبائل مشرک اور بت پرست تھے یہی حال ان کا تھا۔ اولاد نرینہ کو بہت پسند کرتے حتی کہ اپنی لونڈیوں کو اظہار خوشی میں آزاد کر دیتے۔ عورتوں کی خرید و فروخت کرتے اموال کی تقسیم بالاقلام کرتے دوسری قوموں کے ساتھ لڑائی میں غلام بنا کر ان سے جبری کام لیتے۔ غرض کہ عقائد، سماج اور معاش کی برائیوں میں اپنے آباء و اجداد سے کسی طرح کم نہ تھے۔

۱۸۹۶ء میں امیر عبدالرحمٰن (والی افغانستان) نے ان قبائل کو زیر کرنے کے لیے غربی نورستان پر حملہ کر دیا، اگرچہ یہ نہتے تھے مگر امیر عبدالرحمٰن کی سپاہ کو بھاگنے کی پڑی۔ جب برفباری شروع ہوئی تو امیر عبدالرحمٰن نے پھر حملہ کر دیا، راستوں کے مسدود ہو جانے، ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ نہ ہونے اور پھر نہتے ہونے کی وجہ سے مغلوب ہو گئے۔ والیٔ افغانستان ان میں سے تقریباً دو سو افراد اپنے ساتھ کابل لے گیا تاکہ انھیں دین سے آشنا کروا سکے۔ آنے والے سال اس نے نورستان وسطی پر چڑھائی کر کے فتح کر لیا اور بہت سے مبلغین لا کر ان میں چھوڑ دیے کچھ سال بعد شرقی نورستان پر یلغار کر دی کافی جد و جہد کے بعد انھیں بھی مغلوب کر لیا اور کچھ مبلغین بھیج دیے مگر بعض قبائل نے کچھ مبلغین کو قتل کیا اور پاکستانی علاقہ بمبرت اڑمبور گرم چشمہ گابور اور دروش کے علاقہ کو سدھار گئے اور وہیں آباد ہو رہے۔ بعد میں اپنے قبائل سے میل ملاپ کی وجہ سے انھوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔

امیر عبدالرحمٰن کے مذکورہ واقعہ کے بعد یہ تمام قبائل حنفی المسلک ہی چلے آ رہے تھے مگر آج سے تقریباً تیس سال قبل ایک ایسی تحریک اٹھی جس نے ان لوگوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ اس سلفی تحریک کے مجددین میں سے سر فہرست مولانا محمد ابراہیم صاحب، مولانا محمد افضل صاحب، مولانا محمد اسحاق صاحب ہیں۔

مولانا محمد افضل صاحب کے مختصر حالات

آپ کا آبائی گاؤں نیک موک (سابقہ نام بدموک) شرقی نورستان میں برگ متال سے کامدیش کی طرف ایک گھنٹہ کے پیدل فاصلے پر واقع ہے۔ آپ کے والد کا نام سید محمد تھا جو جید حنفی عالم تھے۔

آپ کے بھائی مولانا محمد انور صاحب حال قاضی محترق (سول جج) ہیں جب آپ تقریباً دس سال کے ہوئے تو آپ کے والد نے آپ کو دینی تعلیم کے لیے آپکے بڑے بھائی مولانا محمد انور صاحب کے پاس بھیج دیا۔ تین سال تک ابتدائی فنون کی کتابیں پڑھتے رہے پھر پاکستان کے شمالی علاقہ میگورہ اور سوات کے مختلف مدارس میں تین سال تک ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے۔ مدرسہ سے چھٹیاں ہونے پر وطن واپس آئے اور پھر کچھ عرصہ گھر رہنے کے بعد بوگرا اور کابل کے مدارس کو روانہ ہوئے، دو اڑھائی سال کے بعد دوبارہ پاکستان کو چل نکلے اور پشاور مردان کے مختلف مدارس میں زیر تعلیم رہے اور پھر آٹھویں سال دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک میں دورہ حدیث مکمل کر لیا اس دوران صرف کتاب وسنت کا ہی مطالعہ کیا۔

تعلیمی عرصہ کے دوران مولانا محمد ابراہیم صاحب سے آپ کی ملاقاتیں ہوتی رہیں مولانا محمد ابراہیم چونکہ مولانا موصوف سے قبل سلفی عقیدے کا زیور پہن چکے تھے۔ اس لیے آپس کی ملاقاتوں سے مولانا موصوف دورہ حدیث کے دوران ذاتی مطالعہ اور کچھ بحث وتمحیص سے سلفی عقیدہ اپنا چکے تھے۔ مولانا محمد افضل صاحب جب تعلیم سے فارغ ہو کر وطن واپس آئے تو آبائی گاؤں نیک موک میں فرداً فرداً تبلیغ کا کام شروع کر دیا حقیقت پسندی کا وہ جذبہ جو دل میں پیدا ہو چکا تھا پروان چڑھ گیا اور سلفی عقیدہ میں اس قدر یگانہ ہو گئے کہ جس کسی نے بحث کرتے تو لاجواب کر دیتے۔

مولانا محمد ابراہیم کے مختصر حالات

آپ لورستان کے سرحدی گاؤں پشاور میں ۱۹۳۲ء میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام خان محمد تھا جو علمی لحاظ سے حقیقت میں صرف سوجھ بوجھ رکھتے تھے۔ بیس سال کی عمر سے قبل اپنے ماموں محمد اسلم سے مختصر میں ہدایہ تک تعلیم مکمل کر لی پھر پاکستان کے شہر پشاور کے نواح میں واقع گاؤں تہکال کے مدرسہ میں دو سال تک صرف نحو اور ابتدائی منطق کی کتب پڑھنے کے بعد وطن واپس آگئے آئندہ سال تہکال بالا میں مولانا عبدالہادی کے والد ماجد مولانا عبداللہ خان کے پاس قرآن مجید کا ترجمہ مع تفسیر اور مشکوٰۃ کا کچھ حصہ تین ماہ میں پڑھا مولانا عبداللہ جان صاحب سے عقیدہ سلف میں زانوئے تلمذ تہ کرنے کے بعد فرط مسرت میں جذبۂ حق گوئی کے ساتھ وطن واپس ہوئے اور خوب دعوت حق دینی شروع کر دی۔ کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ تعلیم کے لیے کراچی میں مولانا عبدالستار صاحب کے ساتھ دو سال تک حدیث پڑھتے رہے۔ پھر گوجرانوالہ میں شیخ الحدیث والتفسیر

حافظ محمد صاحب سے تین ماہ تک بخاری پڑھتے رہے اس کے بعد سوات میں تین سال تک منطق، حکمت، ریاضی اور علم ادب پڑھتے رہے اور پھر وطن لوٹ آئے آبائی گاؤں میں درس حدیث شروع کر دیا۔ جب لوگوں نے درس حدیث سنا اور فقہ حنفی کی کارفرمائیاں واضح ہوئیں تو گاؤں کے پیش امام ملا جان محمد ترکستانی کو سوالیہ نظروں کا سامنا کرنا پڑا تو اس نے مسجد سے چراغ اٹھوا لیا تاکہ درس جاری نہ رہ سکے۔ مولانا موصوف نے اپنے چند شاگردوں سے چترال سے تیل اور چراغ منگوا کر درس جاری رکھا۔ جب پیش امام نے کام بنتا نہ دیکھا تو آبائی علاقہ ترکستان کو فرار ہو گیا، ادھر شرپسند عوام نے ضلعی حکام پھر صوبائی حکام کو مولانا کی رپورٹیں دینی شروع کر دیں جن کے ایما پر آپ کو جیل بھیجدیا گیا۔ کافی صعوبتیں جھیلنے کے بعد اس شرط پر رہا کر دیئے گئے کہ آئندہ درس حدیث سے باز رہیں گے ورنہ پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔[1] گاؤں واپس آنے کے بعد خفیہ طور پر درس جاری رکھا مگر جب دوبارہ کابل رپورٹ کر دی گئی کہ یہ شخص باز نہیں آتا تو آپ نے اپنے عزیز و اقارب کی جانوں کے خوف سے ہجرت کر کے پارون (نورستان وسطی) کو چل دیئے اور اس وادی کے مشہور گاؤں اشٹیوم میں درس حدیث کا سلسلہ جاری کر دیا۔ مقامی عوام کی طرف سے دوبارہ کابل رپورٹ ہونے پر پولیس کی ایک گارڈ گرفتار کرنے کو پہنچ گئی پولیس کی آمد سے قبل آپ کو اطلاع ہو چکی تھی۔ آپ مسجد میں درس حدیث دے رہے تھے کہ ایک مخبر حالات کا جائزہ لینے کے لیے آیا۔ آپ کو درس حدیث میں مصروف پا کر چل دیا۔ ادھر مولانا موصوف نے بھی اس کے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ مخبر نے انسپکٹر کی راہ لی مگر مولانا نے اپنا راستہ ایک اونچی چٹان کی طرف کر لیا۔ اور اس پر بیٹھ کر پولیس کے گھیراؤ کا نظارہ کرنے لگے۔ پولیس نے مسجد کے گھیراؤ کے بعد جب مسجد کی تلاشی لی تو مولانا موصوف کے علاوہ صرف شاگردوں کو محو مطالعہ پایا۔ شاگردوں کو گرفتار کرنے کے بعد پورے گاؤں کا محاصرہ کر لیا گیا۔ صبح کے وقت جب گاؤں میں آپ کو نہ پایا گیا تو گاؤں سے نکلنے والے راستوں کی ناکہ بندی کر دی گئی مگر مولانا موصوف نے ایک انتہائی پرخطر راستے سے دوسری وادی کینتوا کی راہ لی۔ پولیس جب آپ کو گرفتار کرنے میں ناکام رہی تو ناکامی کا بدلہ رپورٹیں دینے والے لوگوں کی گرفتاری اور پٹائی کی صورت میں دیا۔ آخر جب رہا ہوئے تو انہوں نے آئندہ شکایت کرنے سے توبہ کر لی حالات معمول پر آئے تو آپ بھی دوبارہ واپس آئے۔

[1] آہ! تقلید کی تنگ نظری اور اسلام سے دوری کہ درس حدیث پر پھانسی کی سزا۔ انا للہ ۔ ۔ ۔

تحریک کی ابتدا اور آزمائش

ہندوستان وسطی میں مولانا ابراہیم صاحب آوازۂ محمدی کے لیے اپنا تن من، دھن وقف کیے ہوئے تھے ادھر مولانا محمد فضل صاحب اپنے گاؤں میں دعوت حق دیے جا رہے تھے اور تیسرے مرد مجاہد مولانا محمد اسحاق صاحب اپنے آبائی گاؤں پیر پڑوک میں فرض کی ادائیگی میں کوشاں تھے۔ قرآن و سنت کا یہ فیضان دیکھ کر جامد قسم کی تقلید تلملا اٹھی، جسمانی تکالیف اور اذیت سے آزمائش شروع ہو گئی۔ قتل کی دھمکیاں دی گئیں مساجد سے دھکے دے کر نکال دیا گیا اور جب علاقہ کے بڑے بڑے علمائے حنفیہ آوازِ حق کی تاب نہ لا سکے تو گورنر کے پاس جا پہنچے اور شکایت کی کہ تین ملحدین (نعوذ باللہ) ملک کے سرکاری مذہب کے خلاف آواز اٹھا کر آئے دن لوگوں کو ملحد بنا رہے ہیں۔ گورنر کے فوری حکم پر تینوں مبلغین حق کو فاناً فاناً حاضر کر دیا گیا مگر جب اس نے یہ محسوس کیا کہ وہ اپنے اندر حقائق کو جھٹلانے کی جرأت نہیں پاتا تو یہ مقدمہ کابل روانہ کر دیا چونکہ انھوں نے سرکاری مذہب کے خلاف آواز اٹھائی تھی اس لیے ان کے خلاف کابل سپریم کورٹ میں توہین عدالت کا مقدمہ دائر کر کے جیل بھیج دیا۔ جب عدالتی کارروائی ہوئی تو گورنمنٹ افغانستان کی نگرانی میں کئی مناظرے بھی ہوئے جس میں بڑے بڑے شہ زور علمائے احناف کو دلائل کی تاب نہ لانے پر سخت پشیمانی کا سامنا کرنا پڑا۔ بار بار موصوفین کو پکڑا گیا۔ زدوکوب کیا گیا مگر حق کا جذبہ دبایا نہ جا سکا۔ اسی دوران مولانا محمد ابراہیم صاحب کو ظاہر شاہ نے کہا کہ ملک کے

احناف کے احساسات

دستور کے مطابق ہر سربراہِ مملکت کے لیے ضروری ہے کہ وہ مسلکاً حنفی ہو۔ مولانا نے فرمایا کہ ایسا کرنا سربراہ مملکت کے لیے ضروری ہے میں تو سربراہ نہیں ہوں۔ آخر جب گورنمنٹ نے موصوفین کے دلائل مضبوط پائے اور ان کو کوئی سزا نہ دے سکے مگر اسٹامپ پر یہ لکھوایا گیا کہ آئندہ تم لوگ آوازۂ حق بلند نہیں کرو گے ورنہ پھانسی کے پھندے تمھارے لیے تیار ہیں۔ اسی وجہ سے موصوفین اپنا اپنا علاقہ چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں منتقل ہو گئے۔ ایک سال پردیس میں گزارنے کے بعد جب حالات نے کچھ پلٹا کھایا تو اپنے اپنے گاؤں واپس آ گئے۔ اب چونکہ افرادی قوت بڑھ چکی تھی اور خدا کی مدد سے حمایت میں لوگ پیش پیش تھے۔ اس لیے اب پہلے سے زیادہ سرگرمی سے قرآن و حدیث کی تبلیغ شروع کر دی ابتدا کے

تحریک میں موصوفین کی سخت مخالفت کی گئی تھی مگر ایک دور ایسا بھی آیا کہ بعض علمائے احناف نے بھی شرک وبدعت غیر اسلامی رسومات کے خلاف موصوفین کا بھرپور ساتھ دیا اور اب تک اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے ان کے تعاون میں کوشاں ہیں۔

انقلاب

ظاہر شاہ کے دور میں ہر سو علمائے حق سلفی دعوت کی اشاعت میں مصروف تھے۔ اسی طرح بعض حق گو قسم کے علمائے احناف بھی شرک وبدعت کے خلاف ان کے ساتھ اتحاد کر چکے تھے تو اس وقت ظاہر شاہ کی منافقانہ پالیسیوں سے نمٹنے کے لیے تمام شرقی نورستان کے علماء اکٹھا ہوئے اور مولانا افضل صاحب کو اصلاح احوال کے لیے اپنا مشترکہ امیر چن لیا۔ کام جاری تھا کہ داؤد خلق اور پرچم کی شہ پر کرسی اقتدار پر براجمان ہوا تو علمائے اسلام کو فکر ہوئی کہ خدانخواستہ یہ انقلاب سوشلسٹ زور نہ پکڑ جائے تو انھوں نے دوبارہ اجلاس میں مولانا محمد افضل صاحب کو اپنا امیر مقرر کر کے تجدید عہد کیا اور عوام میں زور و شور سے کام شروع کر دیا اور پھر اچانک نور محمد ترکئی کرسئ اقتدار پر نمودار ہوا تو اس نے کھلم کھلا ملحدانہ کام کرنے شروع کر دیے اور روسی مشیروں کو آزادانہ عمل دخل کی اجازت دے دی تو میزان" ۱۳۵۷ شمسی ہجری میں شرقی نورستان کے تمام علمائے سلف اور احناف اکٹھا ہوئے اور مولانا محمد افضل صاحب کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہوئے یہ عہد کیا کہ ہم ان شاء اللہ تعالیٰ افغانستان میں اسلامی جھنڈا بلند کرتے ہوئے کتاب وسنت کے نفاذ کا عملی قدم اٹھائیں گے اور پھر باقاعدہ تحریک بندی شروع ہو گئی۔ ابھی یہ تحریک ابتدائی مراحل میں تھی کہ کابل میں اطلاع ہو گئی کہ بغاوت ہونے والی ہے تو گورنمنٹ نے دو گاؤں جو کامدیش چھاؤنی کے متصل تھا اور جہاں سے بغاوت کی ابتدا ہونے والی تھی کو تہس نہس کرنے کا پروگرام بنایا۔ خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ یہ خبر علماء کو پہنچ گئی تو پیشتر اس کے کہ روسی ایجنٹ اور کمیونسٹ دشمن گورنمنٹ حملہ کرتی مجاہدین نے تحصیل کامدیش پر حملہ کر دیا اور ساتھ ہی مذکورہ چھاؤنی کی شاخ برگ متال پر بھی بلہ بول دیا۔

اس اجمال کی مکمل تفصیل یوں ہے: کامدیش چھاؤنی پر حملہ کرتے وقت مولانا عبداللہ طویل کی کمان میں مجاہدین کی تعداد تقریباً چار سو تھی ان کے پاس صرف ایک سو عدد تیرے کی بنی ہوئی نہایت پرانے ماڈل کی ایک

فائر کرنے والی رائفلیں تھیں اور باقی مجاہدین کے پاس کلہاڑے، بیلچے، ڈنڈے اور کچھ مجاہدین کے پاس دستی بم تھے۔ ادھر چھاؤنی کے اندر چار سو سے زائد افراد کلاشن کوفوں، مشین گنوں، راکٹ لانچروں، ہلکی مشین گنوں اور بکتر بند گاڑیوں سے مسلح تھے۔ تین دن مجاہدین نے چھاؤنی کا گھیراؤ رکھا اور خوب مقابلہ ہوتا رہا۔ آخر تیسری رات کو دو مجاہد دستی بموں سے لیس ہو کر چھاؤنی کے اندر گھس گئے۔ پھر خوب گھمسان کا رن پڑا اور ایک سو ستر سوشلسٹ تمام اسلحہ اور بیس مقتولین کچھ زخمی چھوڑ کر بھاگ گئے اور بعض کو گرفتار کر لیا گیا۔ ادھر برگ متال میں جس میں سپاہیوں اور سوشلسٹوں کی تعداد تین سو کے لگ بھگ تھی جو ہر قسم کے ہلکے اسلحہ سے مسلح تھے، ان کو صرف اڑھائی سو مجاہدین نے مذکورہ رائفلوں اور دستی بموں سے ایک رات میں مغلوب کر لیا۔

جب مجاہدین نے مذکورہ دونوں چھاؤنیوں کو فتح کر لیا تو شرقی نورستان کی آخری حدود میں واقع سوشلسٹ افغانستان کی صوبہ کنڑھا میں سب سے بڑی چھاؤنی کو چل دیے۔ ابھی راستے ہی میں تھے کہ جلال آباد نے بہت بڑا بکتر بند دستہ مجاہدین کی سرکوبی اور کامدیش کو بچانے کے لیے پہنچ گیا۔ نہایت تنگ وادی میں مجاہدین اور ان کے درمیان ایک دن رات مسلسل جنگ ہوتی رہی۔ آخر یہ دستہ تیس مقتولین اور بہتر قیدیوں کو مع اسلحہ مجاہدین کے ہاتھوں چھوڑ کر بھاگ گیا۔

ادھر افغانی حکومت کے دارالحکومت میں سخت افراتفری پھیل چکی تھی۔ پھر انھوں نے جلال آباد سے لے کر صوبہ کنڑھا تک کے تمام علاقے کے لوگوں کی حمایت حاصل کرتے ہوئے تقریباً پچیس ہزار مسلح افراد کے ساتھ مجاہدین پر حملہ کر دیا۔ اسی مذکورہ تنگ وادی میں تین ماہ زبردست معرکہ ہوتا رہا، جس میں مجاہدین کا بھی بہت جانی نقصان ہوا۔ آخر اسلحہ کی قلت اور مسلسل جنگ کی تھکاوٹ نے مجاہدین کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا تو انھوں نے دوبارہ کامدیش چھاؤنی پر قبضہ کر لیا۔ دوبارہ منظم تیاری کے بعد مجاہدین نے جلال آباد سے کامدیش کو آنے والا راستہ بند کر کے کامدیش چھاؤنی کی امداد روک دی، جب افغان سوشلسٹ فوج نے اپنا ناطقہ بند ہوتا دیکھا تو جلال آباد سے ایک اور لشکر ان کی امداد کے لیے روانہ کیا، چونکہ مجاہدین نے راستہ مسدود کر رکھا تھا اور مذکورہ آنے والی کمک کی گھات لگائے بیٹھے تھے۔ جونہی لشکر ان کی زد میں آیا تو انھوں نے اچانک حملہ کر دیا، چالیس کے لگ بھگ فوجی گاڑیاں تباہ کر دیں۔ بیس سوشلسٹوں کو قتل کیا، ایک سو بیس کو گرفتار کیا اور باقی راہِ فرار اختیار کر گئے۔ جب محصور فوج نے یہ صورت حال دیکھی تو بجز پسپا ہوتے بن نہ پڑی۔

اس کے بعد صوبہ کنرھا کی بہت بڑی چھاؤنی بری کوٹ درہ پیچ اور اسمار پر یکے بعد دیگرے حملے شروع کر دیئے آئندہ سال برج جوزا ۱۴۰۵ ش میں صوبہ بدخشاں کو وسطی نورستان سے مولانا میر عالم کی امارت اور مولانا عبدالحئی سلفی (جو شہید ہو چکے ہیں) کی کمان میں دو سو افراد روانہ ہوئے۔ ابھی یہ دستہ حق نو نامی گاؤں میں پہنچا تھا کہ سوشلسٹ فوج نے گاؤں کا گھیراؤ کر لیا۔ ایک دن کے زبردست معرکہ کے بعد مجاہدین نے ان کا محاصرہ توڑ دیا اور ان کا تعاقب کرتے ہوئے وادی منجان اور کران کو فتح کر لیا پھر لاجورد پتھر کی کان جو گورنمنٹ کے کنٹرول میں تھی پر حملہ کر کے دو سو سوشلسٹ افراد کو قتل کر دیا بعد ازاں شرقی نورستان سے تین سو افراد کا لشکر بھی ان کے پاس پہنچ گیا اور پھر انھوں نے جرم زیباک اور بارک وغیرہ کو فتح کر لیا۔ مجاہدین تھکاوٹ کی وجہ سے واپس آرہے تھے کہ سوشلسٹ فوج نے دوبارہ جرم پر قبضہ کر لیا بعد ازاں شرقی نورستان سے مولانا محمد اللہ صاحب کی کمان میں دو سو افراد کا دستہ برف باری کا موسم وہاں گزارنے کے لیے وہاں پہنچ گیا تاکہ مفتوحہ علاقے کی حفاظت کر سکے۔ موصوفین سارے صوبہ کو فتح کرتے ہوئے مرکز صوبہ بدخشاں فیض آباد تک پہنچ گئے اس دوران ایک ہوائی حملے سے مولانا محمد اللہ صاحب شہید ہو گئے اور یہ دستہ صوبہ بدخشاں کا تمام چارج جمعیت اسلامی افغانستان کو دے کر واپس ہو گیا۔ ابھی واپس ہی ہو رہا تھا کہ سوشلسٹوں کو اطلاع ملی کہ نورستانی مجاہدین واپس جا چکے ہیں تو انھوں نے دوبارہ اپنے چھینے ہوئے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

صوبہ بدخشاں کے معرکے کے دوران پندرہ سو سوشلسٹ جہنم رسید ہوئے اور ساٹھ مجاہدین نے درجۂ شہادت پایا۔ اس علاقے میں جتنے بھی شرک کے مرکز اور مقبرے مجاہدین کے راستے میں آئے انھوں نے ان کو زمین بوس کر دیا۔ ان چند واقعات کے علاوہ چھوٹے بڑے ایسے حیرت انگیز اور روح پرور واقعات ہیں جن کا تحریر میں لانا مشکل ہے۔

علاقہ کی مکمل کامیابی کے بعد امیر المومنین مولانا محمد افضل صاحب نے ۱۳۵۹ھ میں دولت انقلابی اسلامی افغانستان کے امور کی طرف توجہ دی، بہت بڑے اجلاس میں علمائے سلف اور احناف کتاب و سنت کو اپنی اجتماعی اور انفرادی زندگی کے لیے ماخذ تسلیم کیا اور پھر کتاب و سنت کے عین مطابق امیر المومنین نے ایک مکمل اسلامی سلطنت کا اعلان کر دیا۔ اجتماعی اور انفرادی زندگی کے تمام مسائل کا حل کتاب و سنت کی روشنی میں پیش کیا گیا جیسا کہ اعلان الدولۃ الانقلابیۃ الاسلامیۃ الافغانیہ میں تمام نکات پر اجمالاً روشنی ڈالی گئی ہے۔

تبدلئے تحریک سے قبل

سلفی تحریک سے قبل پورے علاقہ میں کوئی بھی موحد نہ تھا ہر طرف شرک وتوہمات کا دور دورہ تھا۔ جامد قسم کی حنفیت پھیلی ہوئی تھی اب وسنت کی بجائے ہر طرف شرک کے اڈے بنے ہوئے تھے پورے معاشرہ میں عملاً غیر اسلامی رسم ورواج زور تھا۔ جاہلیت کے طور طریقے عام تھے، جیسے تعویذ، گنڈے، جھاڑ پھونک وغیرہ۔ عورتوں اور مردوں کا ن سے بے بہرہ ہونا۔ گانے باجے کا عام ہونا، شادی کے لیے حق مہر کے نام پر لاکھوں روپے وصول کرنا۔ سندیدہ عورتوں کا اغوا کرنا، چوری کرنا، بدکاری کرنا۔ اکثر کا ڈاڑھی منڈوانا۔ منشیات کا عام استعمال کرنا ے پردگی کا عام ہونا۔ صاحب حیثیت کا اپنے سے کمزور پر ظلم کرنا، غرضیکہ پورے کا پورا معاشرہ انتہائی بگاڑ النقشہ پیش کر رہا تھا۔

الحمد لِلّٰه

تحریک کے پچیس تیس سالوں میں خدا نے ان لوگوں کی کایا پلٹ کر رکھ دی ہے۔ عقیدۃً آپ ن لوگوں کو نہایت سلفی پائیں گے، جہاں پہلے رسم ورواج اور شرک و بدعت کا عروج تھا اب وہاں ان یزوں کا نام ونشان تک نہیں بلکہ غیر مسنون قسم کے عادات واطوار تقریباً چھوڑے جا چکے ہیں۔ تعویذ گنڈا وب چلتا تھا اب آپ پورے نورستان میں کسی ایک بچے کے گلے میں بھی تعویذ نہ ڈھونڈ پائیں گے۔

شرقی نورستان میں اب اسی فیصد، مرکزی نورستان کی وادی پارون سو فیصد اور وادی کیتوا ں نوے فی صد اہلحدیث ہیں اور وادی وائیگل میں پچاس فی صد اور غربی نورستان میں تقریباً چالیس فیصد لحدیث موجود ہیں۔ ان تمام علاقوں میں جتنے بھی احناف ہیں وہ سب کے سب شرک سے پاک عقیدہ رکھتے ہیں ں گاؤں میں صرف ایک مسجد اور ایک جماعت ہوتی ہے اور ہر مسجد میں جمعہ کا اہتمام ہوتا ہے۔ بعض مسجدوں میں عورتیں ی نماز باجماعت ادا کرتی ہیں۔ برف باری کے موسم میں اکثر مساجد میں روزانہ درس قرآن ہوتا ہے۔ اسی وجہ ے اکثر لوگ قرآن کا فہم ضرور رکھتے ہیں اور بعض علاقوں میں عورتوں کی تعلیم کا انتظام ہونے کی بنا پر بلوغ المرام ور مشکوٰۃ کی عالمہ عورتیں پائی جاتی ہیں۔ بیاہ شادی جان جوکھوں کا کام تھا اب دولت کے کنٹرول کی وجہ سے دس ہزار روپے سے زیادہ حق مہر کا تصور بھی نہیں ہے۔ ہر قسم کے معمولی جرائم پر بھی حدود وتعزیرات قائم ہیں۔ مثلاً یکم جمادی الاول ۱۴۰۴ھ مطابق ۲ر فروری ۱۹۸۴ء کو ایک شخص محمد عمر ولد حاجی محمد رحیم اور

اور سماۃ بی بی کبریٰ زنا کے مرتکب ہوئے ارتکاب کے بعد احساس جرم اور بارگاہ الٰہی کی عظیم عدالت کے د
سنگین جرم کے ساتھ پیش ہونے کے خوف سے مرتکبین کو دولت انقلابی اسلامی افغانستان کی وادی کنتو
و قاضی مولانا عبداللہ بن الفضل کے حضور پیش ہونے پر مجبور کر دیا۔ مولانا عبداللہ بن فضل صاحب کے قرآ
کی روشنی میں کیے گئے فیصلے کے مطابق دونوں تائبین کو پوری وادی کے لوگوں کی عظیم تعداد نے رجم کر دیا

حدود شرعی کے نفاذ کا دوسرا واقعہ یوں رونما ہوا کہ ۲۹ فروری ۱۹۸۴ء بروز بدھ مطا
۲۸ جمادی الاول ۱۴۰۴ھ کو ایک شخص بہلول ولد عبدالحمید ساکن منڈا گل اپنے ہی گاؤں کے ایک آد
ولد بہادر کو چھری کے ساتھ قتل کر کے فرار ہو گیا۔ دولت انقلابی اسلامی کی پولیس نے اسے گرفتار کر کے جیل
بند کر دیا۔ مجلس قضاۃ کے سامنے گواہوں نے اپنا عینی مشاہدہ بیان کیا بعد ازاں قاتل نے بغیر کسی جبر کے ا
جرم کر لیا۔ قاتل کے ورثا نے دیت دینے کی بہت کوشش کی مگر مقتول کے اقارب کی رضامندی نہ ہ
پر قاضی مولانا محمد اسحٰق صاحب نے قرآن و سنت کی روشنی میں فیصلہ کرتے ہوئے قاتل کو مقتول کے ورثا
حوالے کر دیا، جنھوں نے بہت بڑے اجتماع میں اسی آلہ کے ساتھ قاتل کو اس کی جزا تک پہنچا دیا۔ بایں ہم
فرد عبدالعزیز کو ایک لڑکی کے اغوا کرنے پر سو دُرّے اور ایک سال جلاوطنی کی سزا دی جا چکی ہے۔ دا
کو تہمت لگانے پر اسی کوڑے لگائے جا چکے ہیں۔ یہ خطہ جو خطہ خدا کے عذاب کو دعوت دے رہا ت
ب وہاں رحمتیں برستی ہیں۔ دولت کی طرف سے تمام نورستان میں نسوار اور سگریٹ کی ممانعت کے
جاری کیے جا چکے ہیں اور عوام کو متنبہ کیا جا چکا ہے کہ ان کے استعمال کا ترک نہ کرنے پر تعزیرات کا نفاذ
جائے گا۔ بلکہ اسلام پیرک نامی گاؤں میں نسوار اور سگریٹ استعمال کرنے پر دُرّے بھی لگائے جاتے ہ
علاوہ ازیں پورے نورستان میں ڈاڑھی منڈوانے کی سزا مقرر کی جا چکی ہے صرف کٹوانے کی وبا عام
جس کی وجہ بعض علمائے احناف کے وہ فتوے ہیں جو انھوں نے ڈاڑھی کٹوانے کے جواز میں دیے ہیں
بعض مصلحتوں کی وجہ سے اس بارے میں ابھی پوری طرح سختی اختیار نہیں کی جا سکی بلکہ دولت اس مسئلہ
یہ موقف اپنائے ہوئے ہے کہ ڈاڑھی کٹوانے والے کو کسی عہدہ پر فائز نہیں کرتی۔

کوئی نووارد وہاں چلا جائے تو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے کہ اس دور میں بھی اس طرح کے اسلامی معا
والی دنیا ہے؟ جہاں ہر طرح سے امن ہے، چوری، ڈاکہ، قتل، برائی، بے حیائی سب ختم ہو چکی ہے۔ مسجدیں آباد

لوگوں کو رات میں بھی پہرے کی ضرورت نہیں ہوتی ۔ ایک آدمی ایک نیک ہوک کا کہنا ہے کہ اس اسلامی مملکت کے وجود میں آنے سے قبل میں نے اپنی دوکان کی چوکیداری کے لیے دو چوکیدار رکھے تھے ۔ جو رات کو باقاعدہ چوکیداری کرتے تھے ۔ جب سے یہ مملکت وجود میں آئی ہے ہمارا چوکیداری کا خرچ ختم ہوگیا ۔ دنیا آرام و چین سے گھروں میں سوتی ہے، کہیں کسی قسم کا ڈر خطرہ نہیں ہے ۔ تمام لوگوں کے جان، مال، عزت کی ذمہ داری مملکت نے اٹھا رکھی ہے اور امن و سکون کا یہ عالم ہے کہ وہ واقعات جو کبھی خلافت راشدہ کے دور کے سنے جاتے تھے اس پر ان واقعات کا شبہ ہونے لگتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ تمام اسلامی ملکوں کو ان جیسا امن و جذبہ عطا فرمائے (آمین یا رب العالمین)

ذکی الرحمٰن لکھوی

... ...

«آئینۂ لوزستان» تمام ہوا ۔ آئیے اب دوسرے کتابچے یعنی «دولت انقلابی اسلامی افغانستان کا نصب العین» کے ضروری اجزاء ملاحظہ فرمائیے ۔ جس سے معلوم ہوگا کہ لوزستان کی اس حکومت کے اصول کیا ہیں ۔ وہ کن خطوط پر کام کر رہی ہے ۔ اور آئندہ وہ کیا کرنا چاہتی ہے ۔ اس سے مزید یہ بھی معلوم ہوگا کہ ایک «اسلامی حکومت» کے خط و خال کیا ہوا کرتے ہیں ۔ اس کتابچے میں بھی پہلے ایک تمہیدی ٹکڑا ہے، اس میں اصل مقاصد بیان کیے گئے ہیں ۔ افادہ کے پیش نظر ہم تمہید بھی نقل کر رہے ہیں ۔ جو یہ ہے :

... ...

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم و
علی آل ابراھیم انک حمید مجید ۔ وما خلقت الجن والانس
الا لیعبدون ۔

تمام انسان اپنی جسمانی ساخت کے لحاظ سے برابر ہیں کیونکہ ان کا خالق ایک اللہ ہے اور حرکت و عمل کے لحاظ سے بھی برابر ہیں ۔ کیونکہ وہ سب ایک ہی مادے یعنی آب و گل سے پیدا ہوئے ہیں اور نشو و نما کے لحاظ سے بھی ایک جیسے ہیں کیونکہ سب آدم و حوا کی اولاد ہیں اور فطری و خلقی لحاظ سے بھی یکساں ہیں ۔ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔ مگر پرورش کے وقت اس کے ماں باپ اسے یا تو یہودی بنادیتے ہیں یا عیسائی۔ (متفق علیہ)

تمام انسانی فطرت بلا استثنا مقتضا رکے لحاظ سے سب کے سب ایک ہیں جو کہ فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے اسلام و ایمان ہے۔ علاقائی، شہری، اجتماعی، اقتصادی، سیاسی اتفاق و اتحاد کے لحاظ سے بھی ایک ہی ہیں۔ اسی اتفاق و اتحاد کے بنا پر انسان اپنی انسانیت میں تمام حیوانات سے ممتاز ہے۔ کیونکہ دیگر حیوانات کے اندر اتفاق و اتحاد کا وہ مادہ نہیں پایا جاتا جو بشری طبیعت کے اندر پایا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطرتِ انسانی کے بارے میں فرمایا کہ لوگ ایک ہی جماعت تھے تو اللہ تعالیٰ نے خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔

مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کے ہموار کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا تاکہ مخلوق کے درمیان وحدت کے روابط اور رشتے اور مضبوط فرمائیں نیز مشق و تجربہ کے لحاظ سے بھی تاکہ مخلوق اپنی قوت کو اپنے دشمن کے لیے جمع کرے اور دشمن کو اسی ایک ہی فطری کسبی وحیِ الٰہی کے تجربہ اور مشق کی بنا پر شکست دیں۔

بنیادی اور بہترین وحدت یہی ہے کہ مقتضا، اسلام کی بنیاد دین اور شرعی فلسفہ کی قوت پیدا ہو۔

لہٰذا اے میرے مہاجر اور مجاہد بھائیو! اے اسلامی پیشواؤ اور لیڈرو! یاد رکھو کہ وہ دین کہ جس کی طلب کے ہم درپے ہیں۔ وہ اتحاد و ارشاد، امن و امان، محبت و یگانگی، رحم و نرمی، اتحاد و اتفاق، عفو و پاکدامنی ایمان و اطمینان، صبر و حلم، احسان و دلیل، سلامتی و خندہ پیشانی، عقل اور ایک دوسرے کے تعارف، قوت و دفاع، خیر اور نیکی پردہ اور پردہ پوشی، خیر خواہی اور مساوات، رحمت اور نعمت، رحم اور علم، حکمت و نصیحت، بھائی چارگی اور مروت، نرمی اور شرافت، ترقی و بلندی، جامع اور امانت، مشورہ اور خوشخبری، رعایت اور چشم پوشی، اقتصاد و عدت، ثقافت و قناعت، انفرادی و اجتماعی انصاف اور فیصلہ، صلح اور اصلاح کمال و جمال بیداری اور حکومت۔ تدبیر اور صبر، فکر و ذکر، شفا اور علاج، خلوص و اخلاص، دوستی و آشتی آسانی و نصرت۔ فلاح اور نجات، تعاون اور یقین، آزادی اور قوت، قضا اور رضا۔ پاکی و نظافت، بلندی اور ترقی، فہم اور کمال کا دین ہے۔

لہٰذا ہم تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ ہم اپنی نیتوں کو مختلف دنیاوی جاہ طلبی، مادہ پرستی تعصب لسانی قومی

جیسی علاقائی، نسوبائی ہر قسم کی آلائشوں سے پاک وصاف رکھیں کیونکہ یہ سب کی سب آلائشیں کافرانہ ہیں۔ اور فرقہ واریت بے اتفاقی کے اسباب میں سے ہے۔ اور اتحاد و یکجہتی قدمی کی نعمت عظمیٰ کے لیے بدترین رکاوٹ ہیں

اسی اتحادِ عالم اسلامی کے اغراض ومقاصد پر دولتِ انقلابِ اسلامی افغانستان کا وجود افغانستان کے اس آزاد علاقہ میں جو خونخوار کمیونسٹ حکومت کے پنجہ رعامدی سے آزاد ہے رونما ہوا ہے۔

دولتِ انقلابی اسلامی افغانستان کا وجود صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے کلمہ کی بلندی اور اللہ تعالیٰ کے احکام وقوانین و حدود کی تطبیق وتنفیذ اور اسلامی قوتوں کو وثنی اشتراکی الحادی اور تمام طاغوتی قوتوں کے خلا جو روئے زمین پر ہیں اکٹھا کرنے کے لیے ہوا ہے نیز اسلامی قوتِ مبارزہ کو بروئے کار لانے اور تمام مجاہدین کی جہاں ہوں گے امداد کے لیے وجود میں آئی ہیں۔ اس میں کسی قسم کا نفاق وشقاق یا شک وشبہ نہیں۔

اے پیارے مسلمان اور اسلامی سرفروش مجاہد بھائیو! ہم تمہیں اس اسلامی وحدت کی طرف دعوت دیتے ہیں تاکہ تم ایک خالص اور صاف قیادت کے تحت اللہ کے کلمہ کے سربلندی کے لیے جام شہادت نوش فرما کر اللہ کے ہاں سرخرو ہو۔

اس ایک قیادت کے تحت کام کرو تو دولتِ انقلابی اسلامی بھی تمہارے ساتھ ہو گی یا تم دولتِ انقلابی اسلامی افغانستان کے معاون اور اس کے تابع ہو اس قیادت کے تحت اور اس کی تنظیم فوجی اور سول کے تحت رہ کر زندگی بسر کرو۔ اللہ تعالیٰ تم پر دنیا اور آخرت میں رحم کرے گا۔ اگر نیکی کرو گے تو اپنے لیے ورنہ جو بھلا ہے اس ہی لیے ہے۔ وما علینا الا البلاغ

(مولانا) محمد افضل

امیر دولت انقلابی اسلامی افغانستان

ان تمہیدی کلمات کے بعد اصل کتابچہ شروع ہوتا ہے۔ جو یہ ہے:

چونکہ اسلامی حاکمیت اور کسی مملکت کی زمین مقدس کا تعلق اسی مملکت کے افراد سے وابستہ ہے لہذا کسی فرد یا کسی ایسی پارٹی جو کہ اس مملکت سے غیر وابستہ عناصر کی وفادار ہو ان کے لیے اس سرزمین میں حاکم

بغیر وہاں کے باشندوں کی خود مختاری کے ممکن نہیں، لیکن غیر ملکی ایجنٹوں کے زلہ خوار سرخ خونی سامراجی قوتوں کی وساطت سے تمام زمین مقدس افغانستان پر غاصبانہ قبضہ جما چکے ہیں اور سامراجی فوج اپنے پروردہ الحادی نظریات کے حامل عناصر کے توسط سے افغانستان کی مقدس زمین پر آج تک مسلط ہے اور پے در پے کشت و خون اور غارت گری میں ایسا ریکارڈ قائم کر رہی ہے جو تاریخ کے کسی دور میں نہیں ملتا ہے۔ اس سرخ فوج کی سنگدلی کی وجہ سے افغانستان کے مظلوم عوام جن کے جسموں سے ٹکڑے ٹکڑے ہو رہے ہیں، اور ٹینکوں تلے پیسے جا رہے ہیں، توپوں اور مشین گنوں کی گولیوں سے چھلنی ہو رہے ہیں۔ لاکھوں بے گناہ شہری شہادت کے جام نوش فرما چکے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے دینی مقدسات سے کھیل رہے ہیں اور روحانی پیشواؤں اور مجاہدین کے بچوں کو زندہ دفنا رہے ہیں۔ ہزاروں بے گناہوں کو آتشگیر مادوں سے جلایا جا رہا ہے۔ بر سر عام مسلمان دوشیزاؤں کی بے حرمتی کی گئی ہے۔ نوجوانوں کے دماغوں میں زبردستی اپنے الحادی نظریات ٹھونسنے کے لیے ماسکو بھیجا جا رہا ہے کہ ان کو اپنے مقدس دین سے گمراہ کر کے اپنے الحادی نظریہ کے سایہ تلے نشو و نما دی جائے۔

غرضیکہ روسی سامراج افغانستان کی سرزمین پر مختلف طریقوں سے کشت و خون اور سنگدلی کے مظاہرے کر رہا ہے۔

(اس کے بعد آٹھ صفحات سے زائد میں افغانستان کی موجودہ کٹھ پتلی حکومت کے زیر سایہ وہاں کی اقتصادی و اجتماعی بدحالی کا نقشہ کھینچنے اور حکومت کی پُر فریب اور قاہرانہ داخلی و خارجی پالیسی کی تصویر پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔)

ان کے اس مہلک جراثیم آلود اور کفری و الحادی پودے کو زمین مقدس افغانستان سے نہیں نکالا جا سکتا۔ مگر اللہ تعالیٰ کی طاقت و قوت اور اس جہاد اسلامی کے ساتھ جس کی بنیاد کامل ایمان، خلوص سے اتفاق اور عملی تقویٰ کے ساتھ ہو تو دولت کے ارکین کو چاہیے کہ وہ گزشتہ تمام نقصانات کی تلافی کے لیے کوشش کریں، خواہ اجتماعی میدان میں ہو، خواہ فردی اقتصادی یا سیاسی میدان میں ہو اور ان تمام اختلافات و تفرقات کو دور کر کے الحادی اشتراکی سیلاب کے مقابلے کے لیے ایک مضبوط حصار کی صورت اختیار کریں۔

نیز اس بوجھ کو اٹھانے کے لیے ایک چٹان بن جائیں جو اقتصادی اور سیاسی و اجتماعی خلا کے خلا کو پُر کرنے کے لیے ہمارے کاندھوں پر پڑتا ہے۔ اس طرح ان ہزاروں ملکی دشواریوں کو برداشت کرنے کے لیے جس کا

ہموار کرنا اپنے مناسب مقام پر کھڑا کرنا ممکن نہیں کہ ایک جاذب اور روشن فکر کے ساتھ کیا ہم سردست ان تمام ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھا سکتے ہیں۔ کیا ہم اس قلیل مدت میں ملکی پروگراموں کی ذمہ داری لے سکتے ہیں۔

گزشتہ تاریخ اس پر شاہد عدل ہے کہ نقصان کی تلافی کے لیے ان امور کی طرف ہاتھ بڑھانا جن کا حصول دشوار ہو۔ بچگانہ کھیل اور طفلانہ سوچ ہے۔

لہٰذا مناسب یہ ہے کہ ہم بہت سنجیدگی، غور و خوض اور شرائط کی تکمیل کے ساتھ اپنے ہدف کی طرف بڑھیں۔ جو اجتماعی اور انفرادی فوائد کے لیے ہوں۔ اس میں اجتماعی اصلاح اور عوام کی حاجت برآری کا خاص خیال رکھیں ہو سکتا ہے کہ اس بلندی تک پہنچیں، جس کی بنا پر ان تمام ذمہ داریوں کو برداشت کر سکیں جو ہماری ترقی اور کامیابی کے لیے ضروری ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کے لیے ہم کیا کر سکتے ہیں، اس کام کو کہاں سے شروع کریں اور کہاں کھڑے ہوں۔

جواب ... یہ ہے کہ حالات حاضرہ اس امر کے متقاضی ہیں کہ ان تمام مسائل کو چھوڑ کر سب سے پہلے ہم اس کفری اور الحادی جماعت اور گروہ کی بیخ کنی کریں جو افغانستان میں استعمار کے بیج بو چکے ہیں۔ یہ صرف اور صرف صحیح جہاد کے ذریعے ہوگا۔ جہاد کے بعد ہم اپنے ملک عزیز پر قبضہ کے بعد امن و امان پیدا کر کے اسلامی اغراض و مقاصد اور قانون کی پاسداری کر کے اس کی خدمت بجا لا کر مملکت کے ہر فرد کے لیے اس کے اطمینان اور امان کے شرائط کا سامان کریں اور ان افراد کی توجہ اور فکر و نظر کے لیے اتفاق اور کینہ و بغض کے رجحان سے ہٹا کر محبت و الفت اور یگانگت کی طرف مائل کر دیں۔

دولت انقلابی اسلامی افغانستان کا بنیادی پروگرام موجودہ افغانستان کے اجتماعی اور سیاسی و اقتصادی بے سرو پا نظام کو یکسر بدلنا ہے۔ اور دولت کا نصب العین مندرجہ ذیل اسلامی داخلی و خارجی پالیسیوں کو پورا کرنا ہے۔

اسلامی نظریاتی پالیسی :

۱۔ دولت انقلابی اسلامی کی بنیادی پالیسی کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کو مکمل طور پر نافذ کرنا ہے۔

۲۔ ان تمام قوانین اور رسم و رواج کا یکسر خاتمہ کرنا ہے جو قرآن و سنت کے خلاف ہوں۔

۳۔ تمام لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا شعور اور توحید کے ادراک سے ہر قسم کے شرک کی بیخ کنی کرنی ہے۔

۴۔ ملک میں خدا اور رسول کا قانون برپا کرکے ایسا نظام عدل و انصاف قائم کرنا ہے کہ تمام افراد دولت ایک دوسرے کے ساتھ شیر و شکر بن کر ایک دوسرے کو اپنے مال و دولت اور خون کا امین اور شریک سمجھیں۔

۵۔ اسلامی حدود کو نافذ کرکے افراد دولت سے تمام کے تمام فسق و فجور اور چور بازاری، رشوت ستانی دھوکہ فریب اور ہر قسم کے مخرب اخلاق کا قلع قمع کرنا ہے۔

۶۔ لوگوں میں خدا، رسولؐ اور آخرت کی فکر پیدا کرنا ہے۔

۷۔ لوگوں کو اسلام کی تعلیم سے آراستہ کرنا ہے۔

داخلی پالیسی:

۱۔ یاد رکھیے کہ کسی مملکت اسلامی کے لیے ترقی اور کامیابی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک قرآن و سنت پر عمل نہ ہو۔ اس لیے کہ قرآن و سنت کی صراحت سے معلوم ہوا ہے کہ ترقی و کامیابی کامرانی ایمان اور عمل صالح پر موقوف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا "تم ہی بلند و بالا ہوگے بشرطیکہ تم مومن ہو۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابن عباس سے فرمایا "بیٹا اللہ تعالیٰ کے حقوق کی پاسداری کرنا۔ اللہ تعالیٰ تیری حفاظت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کے حقوق کا خیال رکھو تو اللہ تعالیٰ کو ہر معاملے میں امداد کے لیے اپنے سامنے پاؤگے۔"

تاریخ بھی اس بات کی گواہ ہے کہ کامیابی و کامرانی مسلمانوں کو اس وقت تک نصیب ہوتی رہی جب تک وہ قرآن و سنت پر گامزن رہے اور عمل صالح کرتے رہے اور جب انھوں نے اپنے دین حق پر عمل درآمد چھوڑا، اس دن سے ان پر انحطاط ذلت آنے لگا۔ کیونکہ انھوں نے اپنے اسلامی نزلیت و خاست اور طرز عمل کے بجائے غیر ملکی تربیت گاہوں کی طرف توجہ کی۔ اسلامی قانون کے بجائے وضعی قانون کو پڑھایا اور سمجھایا گیا، تو ان کے دل و دماغ سے اسلامی نظریۂ حیات نکل کر غیر اسلامی نظریات راسخ ہوگئے۔ اسلامی نظریۂ حیات مسلمانوں کے ہاتھ اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک وہ اسلامی دعوت کو خالص اسلامی نظریہ کی قیادت کے تحت نہ اپنائیں۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ دعوتِ اسلامی کو آج اس طریقے سے اٹھائیں جو اس سے پہلے صحابہ نے اٹھایا تھا دعوت کی کلیات و جزئیات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یوں اقتدا کریں کہ بال برابر ادھر ادھر نہ ہوں۔

دور حاضر کے اختلافات کو یکسر نظر انداز کردیں، کیونکہ یہ اختلافات وسائل و مصالح میں ایک ہی ہیں اور اصل اسلامی جوہر میں کوئی اختلاف نہیں۔ اصل اسلام کبھی کسی زمانہ کسی جگہ کسی قسم کے لوگوں کسی قسم کے قبیلے کے لیے مختلف نہیں ہوسکتا، جیسے خود اللہ تعالیٰ دور زمانہ اور اختلافِ الوان و لسانِ مخلوق کے لحاظ سے نہیں بدلتا، اسی طرح اللہ تعالیٰ کے دین میں تبدیلی و اختلاف ممکن نہیں۔ دین اسلامی کو اللہ نے مقرر کیا ہے۔ اللہ ہی اس کا حافظ و نگہبان ہے۔ ہر فردِ انسان اس دین کے بارے میں مسئول ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا "یہ دین (قرآن پاک) تیرے اور تیری قوم (امت) کے لیے ذکر ہے۔ عنقریب اس کے بارے میں تم سے پوچھا جائے گا۔ لہٰذا۔ دعوتِ اسلامی کا ابلاغ حق بر صراحت اور باطل پر جرأت چاہتا ہے۔ مطلق غلبہ چاہتا ہے، خواہ پبلک کی اکثریت موافق ہو یا مخالف، لوگوں کے رسم و رواج کے موافق ہو یا مخالف۔

اب میں آپ کے سامنے چند اسلامی بنیادیں پیش رکھتا ہوں۔ کوئی مملکت بغیر اس کے نہیں قائم ہوسکتی ہے۔ اور نہ ہی اس مملکت کو مملکت کہا جاسکتا ہے جب تک وہ اپنی داخلی پالیسیوں میں ان باتوں پر عمل نہ کرلے۔

۱۔ ہماری بدنصیبی کی وجہ سے افغانستان کو بعض جاہ پسندوں نے محض دنیاوی ہوس کی خاطر خونخوار روس کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اور افغانستان کے ہزاروں فوجیوں اور عوام کو تہِ تیغ کردیا، اس لیے اس غاصب ظالم روس کے ہاتھ سے افغانستان کو آزاد کرانا۔ اسلامی اقدار سے دفاع کرنا اور اس ظالم سفاک روس پر گہری اور کاری ضرب لگانا ہمارے کاندھوں پر بہت اہم ذمہ داری ہے۔

۲۔ افغانستان میں مسلح افواج کے توازن کو معلوم کرکے اس کی تقویت کے ذرائع پیدا کرنا خونخوار سرخ فوج کو سرنگوں کرنے کے لیے فوج میں اضافہ اور فوجی نظام کو بہتر بنانا، دولتِ انقلابی افغانستان کے اہم مسائل میں سے ہیں۔ اس لیے کہ دولتِ انقلابی اسلامی افغانستان کی بنیاد اللہ کے کلمے کی سربلندی، ایمان اور اسلام کی حمایت پر رکھی گئی ہے

۳۔ دولتِ انقلاب اسلامی افغانستان کی بنیاد اسلام اور امتِ مسلمہ کے منافع پر ہے انشاءاللہ یہ بعینہٖ تحریکِ اسلامی کا نتیجہ اور ایمانی ثمرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دولتِ انقلابی اسلامی افغانستان جزئیات و کلیات اسلام سے سرِمو بھی نہیں ٹکراتے۔

۴۔ دولت انقلابی اسلامی اپنے مادی ومعنوی ترقی اور اپنے دائرہ اختیار کی توسیع کی کوشش کرے گی مگر اس کی کوشش کی بنیاد شرعی حلال وحرام کی تمیز پر ہوگی۔ اسی طرح اس دولت کے لیے تمام امت مسلمہ کے امور میں حدود اسلام سے نکلنا جائز نہیں ہوگا۔

(۵) دولت انقلابی اسلامی کا موقف یہ ہے کہ روس کے الحادی اور کفری نظام و مظالم سے امت مسلمہ افغانستان کی نجات کے لیے کبھی ان وسائل کو بروئے کار نہیں لائے گی جو اسلامی منافع ومصالح کے برخلاف ہوں۔

۶۔ دولت انقلابی اسلامی ہر فرد کے نظریہ کا یہ خمیر بنائے گی کہ وہ اپنے اوپر دوسرے کو ترجیح دے۔ یہ طریقہ فتح و نصرت کے اسباب میں سب سے اہم سبب ہے۔

۷۔ دولت انقلابی اسلامی افغانستان کی یہ کوشش ہوگی کہ افراد اپنے اعمال میں اخلاص پیدا کرکے صرف اور صرف اللہ کے لیے عملی میدان عمل میں آئیں۔ ان کے اقوال و اعمال میں کسی قسم کی شہرت وریاست و جاہ طلبی نہ ہو۔ نیز کسی نسلی تفوق اور لسانی تعصب کو مدار عزت یا حصول منصب کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔

(۸)۔ دولت انقلاب اسلامی افغانستان کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ حرکت اسلامی کے میدان میں صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کو مدنظر رکھے۔

(۹) قانون عدل و انصاف میں فرد و جماعت یکساں ہوں گے۔

۱۰۔ امیر اور دولت انقلاب اسلامی کے ہر اولی الامر کی اطاعت فرض عین ہوگی، کیونکہ کوئی نظام بغیر اطاعت کے نہیں چل سکتا۔

۱۱۔ امانت کو صاحب مال تک پہنچانا یہ ایک عظیم دستور ہے جس پر عمل کرنا ملکی پالیسی اور پروگرام چلانے کے لیے نہایت ضروری ہے۔

۱۲۔ حکم مطلق صرف اور صرف اللہ رب العلمین کی ذات ہے، لہٰذا دولت انقلابی اسلامی افغانستان میں تشکلات و تنازعات کے خاتمہ کے لیے صرف کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ حصے جو صحیح سند کے ساتھ ثابت ہوں گی۔

۱۳۔ وعدہ اور معاہدوں کا پورا کرنا فرض ہوگا۔

۱۴۔ انسانی زندگی کے میدان میں اور دین اسلامی کے مقاصد میں اتحاد اہم مقصد ہے، جہاں اختلاف ہوگا۔

یہاں قوم میں ضعف پیدا ہوگا۔

مسلمانوں کے اندر اختلافات کو دیکھ کر دشمنانِ اسلام کو موقع ملتا ہے کہ ان کے اندر پھوٹ ڈالیں اور ان میں کینہ اور بغض بھریں۔ یہ ایک ایسا ہتھیار ہے جس سے وہ مسلمانوں کو شکست دے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اتفاق و اتحاد کو اسلام کے قوام کے لیے ایک مضبوط بنیاد بنایا ہے۔ اراکینِ اسلام اور قواعدِ اسلام کو تفرقہ اور اختلافات سے روک کر دشمنانِ اسلام کے ہتھیار کو ختم کر دیا ہے۔ لہٰذا دولتِ انقلابی اسلامی افغانستان کے اہم اغراض و مقاصد سے آپس میں اتحاد و اتفاق پیدا ہوگا۔

۱۵۔ اسلامی دعوت فرائض اسلام میں سے ایک فریضہ ہے اس کی دعوت لابدی ہے۔ کیونکہ یہی دعوت عالم کی بقا کی خصوصاً عالمِ اسلام کی بقا کی بنیادی وجہ ہے۔ اسلام اپنی جگہ پر نہیں ٹھہر سکتا، اور کوئی نسل اسلامی نہیں بھی جا سکتی مگر دعوتِ اسلام کے ساتھ۔ کوئی گناہگار اپنے گناہ سے متنبہ اور کوئی غافل اپنی غفلت سے بیدار نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ دعوت ہی بیمار روح کے لیے دوا اور زنگ خوردہ بشریت کے لیے صیقل ہے۔ داعیانِ اسلامی ہی اسلام کے ستون اور جمعیت و فرد کے حامی ہیں۔ یہی داعیانِ اسلام ہی غضب و قہرِ الٰہی کو ٹھنڈا کرنے والے ہیں۔ یہی بقاءِ عالم کے اسباب میں سے بہت بڑا سبب ہے۔ لہٰذا دولتِ انقلابی اسلامی کے فرائضِ منصبی میں سے ایک فریضہ دعوت الی اللہ کا ہوگا۔

۱۶۔ تقویٰ فتح و نصرت کے اسباب میں سے ایک سبب ہے، مومن کا ایمان ہی اس تقویٰ سے پورا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی اس تقویٰ کی بنیاد پر مخلوق پر نازل ہوتی ہے۔ کوئی مملکت اس وقت تک اپنے پاؤں پر کھڑی نہیں ہوتی، جب تک کہ اس مملکت کے اصحابِ حل و عقد متقی و پرہیزگار نہ ہوں، لہٰذا دولتِ انقلابی اسلامی افغانستان کے ہر اہلِ کار کے لیے تقویٰ لازمی ہوگا۔

۱۷۔ مسائلِ سیاسیہ میں سے اہم مسئلہ اللہ پر توکل ہے، لہٰذا دولتِ انقلاب اسلامی افغانستان کا بھروسہ صرف اور صرف اللہ پر ہوگا۔

۱۸۔ اللہ کی طرف سے فتح و نصرت کے حصول کے لیے عملِ صالح ضروری چیز ہے۔

۱۹۔ دشمن کے ساتھ حرب و ضرب کے مراحل میں سے آخری مرحلہ صبر و استقامت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دین زمین پر قائم نہیں ہو سکتا مگر صبر و استقامت کے ساتھ دشمن سے جنگ و جدال کے راستے میں جو بھی

مصائب آجائیں اس کو صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کیا جائے۔

۲۰۔ ضعیفوں اور مصیبت زدوں کی امداد اللہ تعالیٰ کی امدادی آلات میں سے سب سے بڑا آلہ ہے۔

مذکورہ بالا امور سیاست شرعیہ کے ان اصولوں میں سے ہیں جن کو بروئے عمل لائے بغیر کسی مملکت کی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا تمام مسلمانوں پر علی العموم اور دولت انقلابی اسلامی افغانستان کی رعایا پر بالخصوص فرض ہے کہ وہ مذکورہ بالا قانونی ضوابط کی ذرا بھی خلاف ورزی نہ کریں۔

اقتصادی ڈھانچہ:

۱۔ افغانستان اقتصادی لحاظ سے تمام ممالک میں سے پسماندہ ملک ہے اور فوری طور پر ایک ایسی وسیع پیمانے کی امداد کا مستحق ہے جس سے وہ اقتصادی اور معاشی ضروریات میں خود کفیل ہو سکے۔

۲۔ دولت انقلابی اسلامی پر لازم ہے کہ وہ اقتصاد کے بنیادی محرکات اور اسباب کو اپنائے۔

۳۔ دولت انقلابی اسلامی ایسی ملکی اقتصاد کی بنیاد ڈالے گی جو ترقی پذیر ہو اور بنیادی تنظیم اور علوم طبعی و ٹیکنالوجی کی بنیادوں پر استوار ہو۔

۴۔ دولت انقلابی اسلامی افغانستان اپنے ملکی حالات سے تقاضوں اور اپنے بجٹ کے پیش نظر چھوٹے بڑے کارخانے لگائے گی۔

۵۔ دولت انقلابی اسلامی افغانستان ملکی اقتصاد کے پیش نظر اسلامی دائرہ کے تحت خصوصی سرمایہ کاری کی سرپرستی کرے گی۔ جو اسلامی حدود کے اندر رہ کر ہو گی۔

۶۔ دولت انقلابی اسلامی مختلف طریقوں امداد باہمی کی ایسی بنیاد رکھے گی کہ وہ اسلامی اصولوں پر فردی اور اجتماعی اقتصاد کے لیے کامل ترقی کا سبب ہو

۷۔ تمام چھوٹے بڑے کارخانوں اور ٹیکنالوجی کی حفاظت اور حوصلہ افزائی دولت انقلاب اسلامی کے فرائض میں سے ہو گا۔ جو ملک کی ترقی کے اسباب میں سے ہو۔

۹)۔ دولت انقلابی اسلامی ایک بیت المال بنائے گی جس میں عشر و زکوٰۃ و دیگر شرعی اموال کا جمع و تصرف قانون اسلام کے مطابق کیا جائے گا۔

۱۰۔ دولت انقلابی اسلامی ایک بیت المال بنائیگی جس میں عشر و زکوٰۃ اور دیگر شرعی اموال کا جمع و تصرف قانون اسلام کے مطابق کیا جائیگا۔

۱۱ - دولتِ انقلابی اسلامی زرعی زمین کے سلسلے میں ایسی اصلاحات کو بروئے کار لائے گی جو عوام الناس کے مفاد میں ہو نیز زراعتی ترقی کی حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

۱۲ - دولتِ انقلابی اسلامی مواشی کے کارخانہ سرمایہ داروں اور مواشی کے مالکان کے تعاون سے ان کے استفادے کے لیے اصلاحات نافذ کرے گی جس سے مال مویشیوں کی افزائش نسل کی بہتر ضمانت ہو۔

۱۳ - دولتِ انقلابی اسلامی دورِ حاضر کے فنِ تعمیر کے موافق تعمیرات کا انتظام کرے گی اور رفاہی پروگراموں اور مواصلاتی پروگراموں کو دورِ حاضر کے ترقی یافتہ وسائل کے تحت عملی جامہ پہنائے گی۔

اجتماعی اصلاحات:

افغانستان کے موجودہ حالات نہایت ابتر ہیں۔ ان کی اصلاح اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کے بغیر ممکن نہیں کیونکہ اکثر لوگوں کو اپنے مادی، معنوی حقوق سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ان کو اجتماعی حقوق حاصل کرنے کے لیے میدان میں بہت ہی سخت شرائط کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ ان کو وہ حقوقِ اجتماعی حاصل نہیں جو دیگر اسلامی ممالک کو مادی و معنوی طور پر حاصل ہیں۔ اس لیے دولتِ انقلابی اسلامی کی ذمہ داری ہے کہ وہ مندرجہ ذیل اجتماعی اصلاحات کو مدنظر رکھے۔

۱ - دولتِ انقلابی اسلامی کاریگروں اور سرکاری ملازمت پیشہ لوگوں کے وقت کی ضرورتوں کے پیش نظر خیال رکھے گی۔

۲ - دولتِ انقلابی اسلامی ملازمین کی شرائط ملازمت کو مستحکم کرے گی اور ان کو انتقام کا نشانہ بننے سے محفوظ رکھے گی۔

۳ - دولتِ انقلابی اسلامی کم از کم سرکاری ملازمین اور آفیسروں کی تنخواہیں اور اوقاتِ کار کے لیے تحدیدِ وقت کا تعین، حالات اور وقت کی ضرورت کے مطابق کرتی رہے گی۔

۴ - دولتِ انقلاب اسلامی کارخانوں زمینداری اور دیگر اجتماعی اور شخصی کاروبار میں کاریگروں کے حقوق کی حفاظت اور میدانِ عمل میں شرائطِ عمل کے لیے ایسے قانون وضع کرے گی جو کامیابی اور ترقی کے اصولوں پر مبنی ہوں۔

۵ - دولتِ انقلاب اسلامی کارخانوں کی حدود میں ایسے کوارٹر وغیرہ بنوائے گی جو اجتماعی طور پر آفیسروں اور کارکنوں کی رہائش کے لیے کارآمد ہوں۔ یہ کام دولتِ انقلابی اسلامی کے اقتصادی حالات کے پیش نظر کیا جائے گا۔ اسی طرح انسانی زندگی کی سہولتوں کے لیے دوکانوں، ہوٹلوں اور دیگر ریستورانوں کو بھی سہولت فراہم کرے گی۔

۶ - دولتِ انقلابی اسلامی تعلیمی اداروں کے پروگراموں پر بھی نظر رکھے گی تاکہ ان تعلیمی اداروں سے ایسا نصاب

خارج کر دیا جائے گا، جو کیمونزم، سوشلزم اور دیگر کفری اور الحادی نظریوں کا حامل ہو۔ نیز عوام کی ناخواندگی کو اس طرح سے دور کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ جدید تعلیم اسلامی اصولوں پر مبنی ہو۔

۷۔ نوجوانوں کی تربیت اس طرح کی جائے گی کہ وہ ایمان، عمل صالح اور تقوے کے حامل ہوں اور جسمانی و روحانی طور پر اتنے توانا ہوں کہ وہ ملک و ملت پر آنے والی ہر ابتلا کا مقابلہ کرنے کے اہل ہوں۔ ان کو اسلام کے فدا کار اور اللہ تعالیٰ کے سچے سپاہی بنا دیا جائے گا تاکہ مملکتِ اسلامی میں کلمۃ اللہ کے شجرۂ طیبہ و مضبوط بنیادوں پر نصب کریں۔

۸۔ دولتِ انقلابی اسلامی عوام کو قرآن و سنت کی روشنی میں تعلیم سے مزین کرنے کے لیے سکول، مدرسے، کالج، یونیورسٹیاں بنائے گی۔

۹۔ دولتِ انقلابی اسلامی اطلاعِ عامہ کے پیشِ نظر دینی پروگرام اور اشاعتِ دین کے لیے پریس اور ریڈیو اسٹیشنوں کا بندوبست کرے گی

۱۰۔ دولتِ انقلابی اسلامی تمام مملکت میں فنی تعلیم کے دفاتر کھولنے کی کوشش کرے گی۔

۱۱۔ دولتِ انقلابی اسلامی ہر قسم کی فحاشی، عریانی اور منشیات پر پابندی لگائے گی جو اسلام بطورِ انسانی اخلاق اور شرافت کے خلاف ہو۔

۱۲۔ دولتِ انقلابی اسلامی صحتِ عامہ کے لیے ہسپتال اور دیگر طبی مراکز قائم کرے گی

۱۳۔ دولتِ انقلابی اسلامی عورتوں کے حقوق کو دائرۂ اسلام کے اندر متعین کرے گی۔ اسی طرح ان تمام سہولتوں کی فراہمی کی کوشش کرے گی۔ جو تمام انسانی زندگی میں کار آمد ہوں۔ خواہ اجتماعی ہو یا انفرادی۔ اقتصادی ہو یا صنعتی۔ لیکن دائرۂ اسلام میں رہ کر۔ اسی طرح ان تمام اہم سیاسی قوانین کی پابندی دولتِ انقلابی کے فرائض میں ہوگی۔ جس میں ہر طرح کی بے غرضی، خلوص، اور صفائے نیت شامل ہوگی۔

یاد رکھیے کہ افغانستان کی آزادی اللہ کی امداد اور خلوصِ نیت و ایمانِ کامل اور عملِ صالح کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

خارجہ پالیسی :

دولتِ انقلابی اسلامی تمام اسلامی اور غیر اسلامی ممالک کے ساتھ امن و آشتی چاہتی ہے۔

۲۔ دولت انقلابی اسلامی بین الاقوامی معاہدات کی پابند رہے گی۔ دولت اقوام متحدہ کمیٹی کے ارکین اور ان ممالک سے جو صلح پسند اور بین الاقوامی صلح کے خواہاں ہوں۔ ان کے تعاون پر یقین رکھتی ہے اور نیز تمام انسانوں کی بقائے باہمی کو اولیت دیتی ہے۔ پڑوسی ممالک کے ساتھ تنازعات کو قوت سے نہیں بلکہ باہمی سیاسی گفتگو سے حل کرنے پر یقین رکھتی ہے۔ یہ مملکت علاقائی سرحدوں کا احترام کرتی ہے اور بیرونی قوت بیرونی مداخلت کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔

۳۔ دولتِ انقلابی اسلامی یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ انشاء اللہ وہ ایک دن اللہ تعالیٰ کی نصرت سے روسی جارحیت کو ختم کرے گی اور اس کے حاشیہ برداروں کو سیاست کے نقطہ انجماد پر لا کھڑا کرے گی

۴۔ دولت اسلامی کی اہم ترین کوشش افغانستان میں اسلامی اقدار کی بازیابی اور امت مسلمہ کے حقوق کا احیاء اور اس اشتراکی الحادی انقلاب کے جرائم کا قلع قمع کرنا ہے۔ نیز آپس میں معاہدے والے ممالک کے اجتماعی اور سیاسی پروگراموں پر دوست کڑی نظر رکھے گی۔

(۵) دولت انقلابی اسلامی کے ذمے اسلامی ممالک پر روسی سامراج کے ان بنیادی تحولی انقلابی پروگراموں کو ناکام بنانے کے درپے ہونا ہوگا۔

۶۔ دولتِ انقلابی اسلامی ان ممالک پر کڑی نظر رکھے گی جو آپس میں معاہدے والے ہیں اور ان کے اجتماعی پروگراموں پر عمل درآمد کرانے میں مدد دے گی۔

۷۔ دولت حتی الامکان اس نظریے پر کاربند رہے گی کہ سیاسی مسائل کو تشدد اور مسلح ٹکراؤ کے ذریعے حل نہ کیا جائے۔ بلکہ باہمی مفاہمت مذاکرات کے مطابق اسلام وا فہام و تفہیم کے راستے تلاش کرتی رہے گی۔

۸۔ دولتِ انقلابی اسلامی بنیادی سیاست کے طور پر غیر جانبدارانہ پالیسی کو اپنائے گی اور ممالک مستعمرہ کی طرف نہیں جھکے گی۔ نیز اقوام متحدہ کے قوانین کا احترام کرے گی اور آزاد ممالک کا حتی الامکان ساتھ دے گی۔ تمام ممالک سے اچھا رابطہ رکھنے کی کوشش کرے گی۔ اقتصادی منہج اور اسلامی ثقافتی سرچشموں کو ترقی دینے کی کوشش کرے گی۔

بین الاقوامی معاہدات کی پابند رہے گی بشرطیکہ وہ طرفین کے لیے مفید ہو اور اسلام سے متصادم نہ ہو۔

۹۔ دولتِ انقلابی اسلامی اپنے افراد کی آزادی کے لیے تہ دل سے یہ اعلان کرتی ہے کہ افغانستان میں سیاست مطلقہ کی بنیاد، جہاد فی اللہ امت مسلمہ افغانیہ اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت و حدود اور اسلامی قوت لوٹانے پر ہوگی۔

لہٰذا اسلامی اجتماعی زندگی کا لوٹانا اور عالمی سطح پر اسلامی اور غیر اسلامی بلاک کے دوطرفہ تعلقات کو فروغ دینا جو صلح اور امن کی خاطر ہوں۔ ہماری دلی خواہش ہے۔

۱۰۔ افغانستان کی سرزمین میں اگرچہ مختلف زبان و رنگ ونسل کے لوگ رہتے ہیں مگر یہ سب کے سب افغانستان کی قدیم تاریخ سے لے کر آج تک دین کی حفاظت اسلام کی حمایت اسلامی اور ملکی امداد کی ضمانت، علاقائی اور اسلامی ترقی اپنی عزت و شرافت کی آزادی اور دینی اور ثقافتی علوم کے اعیار میں متفق اور متحد رہے ہیں۔ لہٰذا دولت انقلابی اسلامی پر لازم ہے کہ وہ ایسے حقیقی اتحادی قندیل روشن کرے جو امت مسلمہ کے درمیان مادی اور معنوی اور روحانی اتحاد اور اسلامی اخوت کی متقاضی ہو۔ اور اس سے دینی محبت کی روشنی اس طرح پھیلے کہ اس سے متنازعہ مسائل خوش اسلوبی سے حل ہوں۔ اور ان تمام جھگڑوں اور کانٹوں کی بیخ کنی ہو جائے جو کمیونسٹوں نے بو رکھے ہیں۔ نیز امت مسلمہ میں اپنے اقدار اور حقوق ایمانی کے تحفظ کا احساس پیدا ہو۔ اس کے نتیجے میں یہ معزز امت مسلمہ اپنی مجاہدانہ کارگزاریوں سے عنقریب اس خونخوار روس کو مزا چکھائے گی۔ انشاء اللہ اگر اس دولت مسلمہ کے قدم اپنی قوت پر مستحکم ہو گئے۔ تو اس روسی سامراج کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔ جس کا تجربہ انگریز بھی ہماری گزشتہ تاریخ سے کر چکا ہے۔

۱۱۔ دوسری حکومتوں کے ساتھ ہمارے تعلقات وہ خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، خالص کتاب و سنت کی بنیاد پر ہوں گے۔ بشرطیکہ وہ امن پسند ہوں۔ یہ تعلقات سیاسی، تجارتی اور دیگر تمام باہمی مفادات کے میدان میں استوار کیے جائیں گے۔

۱۲۔ ہماری خارجہ پالیسی کا محور خالص اسلامی عقائد و شعائر ہوں گے۔

۱۳۔ دولت انقلابی اسلامی غیر مسلم اور دیگر ممالک خصوصاً پڑوسی ممالک کے ساتھ معاہدات و صلح اور دوستانہ تعلقات اس وقت تک جاری رکھے گی جب تک دوسری طرف سے اس کی آزادی اور غیر جانبداری کو خطرہ نہ لاحق ہو۔

دولت انقلابی اسلامی تجارتی معاہدے کا ہر ملک سے کرنے کے مجاز ہوگی، لیکن فوجی معاہدہ کسی ملک سے نہیں کرے گی۔

۱۴۔ دولت انقلابی اسلامی ہر اس ملک سے دعوت اسلامی کے مقتضاء کے موافق معاملہ کرے گی جو اس سے برسر پیکار نہ ہوں

۱۵۔ دولت انقلابی اسلامی ان ممالک کے لوگوں کو دولت انقلابی اسلامی میں داخل ہونے کی اجازت دے گی جو دولت کے ساتھ

بر سر جنگ نہ ہو اور ان کے پاسپورٹ ہو۔ ان کی رہائش اس وقت تک ہوگی جو داخلہ کے وقت ویزہ میں مقرر کیا ہو، بشرطیکہ حسن سلوک سے رہتا ہو اور ہمارے قوانین کا احترام کرتا ہو۔

۱۶۔ علمی مواد کے درآمدت خواہ وہ مجلے ہوں یا جرائد یا دیگر نظریاتی اور سائنسی رسائل ہوں ان کی اجازت دولتِ انقلابی اس صورت میں دے گی۔ جبکہ وہ رسائل و جرائد اسلامی تعلیمات کی میزان پر پورا اترتے ہوں، ان کی منظوری اسلامی آئیڈیالوجی کے ماہر علماء کی سفارشات پر دی جائے گی۔

۱۷۔ غیر ممالک کے وفود، سربراہان اور عمائدین کی آمد کے وقت ان کے استقبال اور ملاقاتوں کے پروگرام تمام کے تمام اسلامی اصولوں کے موافق ہوں گے۔ دورِ حاضر کے غیر اسلامی رسم و رواج جو ایسے مواقع پر رائج ہیں دولت اسلامی میں زیر عمل نہیں لائے جائیں گے۔ موسیقی کے پروگرام اور کلچرل شو وغیرہ کا کوئی اہتمام نہیں کیا جائے گا اور نہ عورتوں اور مردوں کے مشترکہ اجتماع کی اجازت دی جائے گی۔

۱۸۔ تجارتی درآمد و برآمد کے معاہدے، نقد و جنس کا لین دین اور بینک کا کاروبار تمام تر شرائط اسلامی کے اصولوں کے موافق عمل میں لایا جائے گا۔

۱۹۔ ذی روح اشیاء کی تصویریں اخبارات مجلات و ٹیلی ویژن اور دیگر درآمدات و برآمدات و مواصلات اور دیگر عالمی رابطوں میں شدید ضرورت کے علاوہ بالکل ممنوع ہوں گے۔

۲۰۔ غیر ممالک سے آنے والے وفود اور زعماء اور مہمانوں اور دیگر سیاحوں کے اعزاز ان اصولوں پر ہوں گے جن کی اجازت اسلام نے دی ہے۔

۲۱۔ کافر معاہد او مستامن کے ساتھ عدل و انصاف اسلام کی مہمات میں سے ایک اہم امر ہے۔

۲۲۔ احسان اور الفت و محبت اسلام کے اغراض و مقاصد میں سے ہے نیز اس دستور کا منشا یہ ہے کہ خارجہ پالیسی کے حدود میں اسلام کی مقرر کردہ رواداری اور پابندیٔ عہد کو ملحوظ رکھا جائے۔

نظامِ حکومت:

نظامِ اسلام میں کوئی صدر یا بادشاہ اور وزیرِ اعظم نہیں ہوتا، بلکہ مسلمانوں کے لیے ایک خلیفہ ہوتا ہے جو تمام مسلمانوں سے کتاب اللہ و سنت رسول کے تحت زندگی اپنی امارت میں گزارنے کی بیعت لیتا ہے۔

اس طرح نظام میں ملوکیت کی طرح خلیفہ کا کوئی وارث نہیں ہوتا۔ بلکہ مسلمان خلیفہ کے فوت ہونے پر صاحب رائے مسلمان کسی دوسرے خلیفہ کو منتخب کرتے ہیں۔ نیز خلیفہ کے عہد اقتدار کے لیے کوئی مدت مقرر نہیں ہوتی۔ جیسے جمہوری حکومتوں میں صدر اور وزیراعظم ایک مخصوص مدت کے بعد پھر انتخاب کے ذریعے چنے جاتے ہیں۔ بلکہ خلیفہ اسلام تادم حیات حاکم ہوتا ہے۔ بشرطیکہ اس سے کفر بواح ظاہر نہ ہو یا نماز ترک نہ کرے

نظام اسلام میں تمام عالم اسلامی کا ایک ہی خلیفہ ہونا چاہیے جو کہ تمام روئے زمین کے مسلمانوں کا حاکم ہو

۲۔ دولت خلافت کا احیاء تمام مسلمانان عالم کا اجتماعی فریضہ اور دینی امانت ہے۔ اس خلافت کے بغیر کوئی دین نہیں۔ تمام لوگوں میں سے پرہیزگار شخص کو امامت وخلافت کے لیے مقرر کرنا بھی فرائض اسلام میں سے ایک فریضہ ہے۔ تقرر امام وخلیفہ کے بغیر کوئی حکومت اسلامی حکومت ہی نہیں۔

۳۔ ہر ایک رکن اماراتی نظام کے تحت ہر کام کے بارے میں اپنے امیر کے سامنے جواب دہ ہوگا۔

۴۔ نظام اسلام میں ہر رکن پر اپنے امیر سے ہر حیثیت میں تعاون کرنا فرض ہے۔

۵۔ نظام اسلام میں ہر رکن کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنے سپرد کیے گئے فرائض پورا کرے اور اس طریقے سے کرے جو امیر حکم دے جبکہ امیر کا حکم شرعی حدود کے اندر ہو، نیز اس کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے۔

۶۔ نظام اسلام میں ہر رکن پر لازم ہے کہ وہ اپنی حکومت کے مقدرات اور حقوق کا احترام کرے۔

۷۔ نظام اسلام میں ہر رکن پر لازم ہے کہ وہ اپنی حکومت کی اغراض ومقاصد کو پورا کرے اور اس کے ترقیاتی پروگراموں پر کاربند رہے۔

۸۔ نظام اسلام میں ہر رکن پر لازم ہے کہ وہ اس پوشیدہ بیعت پر کاربند رہے۔ ان پوشیدہ رازوں کو پوشیدہ ہی رکھے جو اسلامی حکومت اسلامی اجتماعی زندگی کے مفاد کی تدابیر کے سلسلے میں لیتی ہے۔

۹۔ نظام اسلام میں ہر رکن کا لازم ہے کہ وہ الحادی مارکسسٹ اور تمام طاغوتی قوتوں کے خلاف اپنی جد وجہد اس حد تک کرے یا تو اس راہ میں اپنی جان کی بازی لگا دے کہ مقابل دشمن یا تو ہتھیار ڈال دے، یا مسلمان ہو کر اسلامی فوج سے آملے۔ یعنی اس راستے میں یا شہادت کا مرتبہ حاصل کرے یا غازی بن کر رہے۔

۱۰۔ اسلامی نظام میں ہر ایک افسر بالا پر لازم ہے کہ وہ اپنے ماتحتوں سے شفقت ورحمت سے پیش آئے اور ان سے ہر وقت تعلق اور رابطہ قائم رکھے۔

۱۱۔ نظام اسلام میں ہر ماتحت کارکن پر لازم ہے کہ وہ آفیسر بالا کی حدود شرعی کے تحت اطاعت میں ہمہ تن مصروف ہو تاکہ اسلامی مقدرات وکرامات کی بازیابی میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ رہے۔

۱۲ نظام اسلام میں ہر رکن پر فرض ہے کہ وہ عالمی سطح پر فرائض ضروریہ اور ضروری مہمات اور حکومتی نظام کی تحسین کے ہر جزو وکل کے حصول میں ہمہ تن کوشاں رہے۔

۱۳۔ نظام اسلام میں ہر فرد اللہ کے ہاں اللہ تعالیٰ کے حقوق کے بارے میں جواب دہ ہوگا۔

۱۴۔ نظام اسلام کے تحت ہر فرد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے یہاں جواب دہ ہوگا۔

۱۵۔ نظام اسلام میں ہر فرد اللہ تعالیٰ کے ہاں مسلمانوں کے اجتماعی حقوق کے بارے میں جواب دہ ہوگا۔

۱۶۔ نظام اسلام میں ہر فرد اللہ کے ہاں اس کے خاندان کے حقوق مادی اور معنوی کے بارے میں جواب دہ ہوگا

۱۷۔ نظام اسلام میں ہر فرد دوسرے فرد کے حقوق کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہ ہوگا۔

۱۸۔ اسلامی نظام کے تحت مسلمانوں کا ہر فرد مہمانوں کے حقوق خاص کر حکومت کے متعینہ وفود کے حقوق کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے ہاں جواب دہ ہوگا۔

۱۹۔ اسلامی نظام میں ہر فرد اپنے دین اور اسلام کے بارے میں اللہ کے ہاں جواب دہ ہوگا۔

۲۰۔ اسلامی نظام میں ہر فرد اپنے نفس و اعضاء کے حقوق کے بارے میں اللہ کے ہاں جواب دہ ہوگا۔

۲۱۔ نظام اسلام میں ہر فرد اپنے اقتصاد و مال کے بارے میں اللہ کے ہاں جواب دہ ہوگا۔

۲۲۔ نظام اسلام میں ہر فرد اپنے اور اپنی اولاد اور پڑوسیوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں اللہ کے ہاں جواب دہ ہوگا۔

۲۳۔ نظام اسلام میں ہر فرد اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کے صحیح استعمال اور ان کے شکر کی ادائیگی کا جواب دہ ہوگا۔

ومن الله التوفیق۔

والسلام

... ...

دوسرے کتابچے کے جزو بھی مختص تمام ہوئے۔ دونوں کتابچوں کے اخیر میں اس دعوت کا خلاصہ ان الفاظ میں درج ہے۔

ہماری دعوت:

(۱) اشتراکیت اور طاغوت کے خلاف جہاد (۲) کتاب و سنت کی طرف رجوع اور سلف صالحین کے انداز پر سمجھنے کی مساعی (۳) مسلمانوں کو دین حق کی پہچان کرانا، احکام الٰہیہ پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دینا اور لوگوں کو آداب دین سے آراستہ کرنے کی پیہم کوشش جاری رکھنا۔ (۴) مسلمانوں کو شرک و بدعات افکار باطلہ اور منکرہ و موضوع احادیث سے بچانا، جس کی وجہ سے اسلام کا جمال ماند پڑ گیا اور مسلمانوں کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہوگئی (۵) اسلامی قیود میں رہتے ہوئے حریت فکر کا احیاء اور فکری جمود کا ازالہ جس سے مسلمانوں کی عقل زنگ آلود ہوگئی اور اسلام کے صاف شفاف چشمہ سے انھیں دور ہٹا دیا۔ (۶) روئے زمین پر حکم الٰہی کے نفاذ، اسلامی معاشرے کے قیام اور اسلامی زندگی گزارنے کے لیے جہد مسلسل۔

یہ ہماری دعوت ہے! ہم یہ بار امانت اٹھانے کے لیے اپنے تمام مسلمان بھائیوں سے دست تعاون بڑھانے کی اپیل کرتے ہیں تاکہ اسلام کا پیغام چہار دانگ عالم پھیلتا چلا جائے۔

...   .

اللہ سے دعا ہے کہ یہ تحریک اور یہ حکومت اپنے محولہ مقاصد میں کامیاب و کامران ہوکر عالم اسلام کی خودی و سربلندی اور کامیابی و سرفرازی اور خود اسلام کے احیاء و نشاۃ ثانیہ کا ذریعہ بنے۔ - (آمین)

وفیات:

(۱) جامعہ فیض عام مئو کی آخری جماعت کے ایک طالب علم مولوی مشتاق احمد گونڈوی - جو علاج کے لیے بنارس لائے گئے تھے - ۶ اپریل کو سر شام انتقال کر گئے - مرحوم کے چچا مولانا عبدالرؤف ندوی نے تلشی پور گونڈہ سے ان کی وفات پر جذبات غم کی شدت سے بڑی المناک اور پرسوز تحریر بھیجی ہے - ادارہ موصوف کے غم میں شریک ہے اور دعاگو ہے کہ اللہ مرحوم کو جنت الفردوس نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر و نعم البدل عطا فرمائے - آمین۔

(۲) ۳ مئی ۱۹۸۲ء کو جماعت اہلحدیث مئوناتھ بھنجن کی ایک معروف شخصیت جناب عبدالرؤف صاحب سردار انتقال کر گئے - موصوف علماء کی قدردانی، حسن خلق اور شرافت عمل و کردار کے مالک اور جماعتی کاز میں گہری دلچسپی رکھتے تھے -

امام ابن تیمیہ

ساتویں صدی ہجری کا ایک عظیم مجدد

محمد ہاشم شکور محمد شنکر نگری گونڈوی ★

اسلام کے زندہ معاشرے نے ایسے ایسے جلیل القدر اور باکمال نابغہ روزگار پیدا کئے ہیں جنکی روح بے قرار، حریت افکار، اور دمکتے ہوئے کردار انسانی تاریخ کے حسین نقش ونگار بناتے رہے ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ انھیں تاریخ ساز شخصیتوں میں سے ایک تھے۔ جنکا ستارۂ فضل وکمال ساتویں صدی ہجری کے اخیر میں ضوفشاں ہوا جنھوں نے علمی، فکری، ادبی، اصلاحی میدان میں تحقیق وتدقیق، افکار ونظریات کے وہ گلشن کھلائے کہ آج بھی نسیم صبح وہیں سے مہک لاتی ہے، آپ کی ذات گرامی گوناگوں اور متنوع خصوصیات کی حامل تھی، آپ خطیب اور صاحب قلم وبیان ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب سیف وسنان بھی تھے، آپکے نوک شمشیر نے دشمنان اسلام کے سینہ پر جو لکیریں کھینچیں ہیں وہ تاریخ کی زینت ہیں، آپ جہاد کے داعی ہونے کے ساتھ مجاہد صف شکن بھی تھے اسی لئے ہم اس عنوان کے تحت ان کے مختصر حالات اور زرین کارناموں کی چند جھلکیاں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

نام ونسب :- امام ابن تیمیہ کا نام احمد، لقب تقی الدین ہے والد محترم کا نام عبدالحلیم ابن عبدالسلام ہے۔ ان کے دادا عبدالسلام کی پردادی کا نام تیمیہ تھا انھیں بزرگ خاتون کی طرف منسوب ہوکر آپ ابن تیمیہ کے نام سے مشہور ہوئے آپکے خاندان میں بہت سے بزرگ ہوئے جو ابن تیمیہ کے نام سے مشہور تھے۔ اس خاندان کی بعض خواتین بھی تقویٰ کے ساتھ ساتھ صاحب علم وفضل گذری ہیں، مثلاً ام البدر فخر الدین ابن تیمیہ بنت عبداللطیف، زینب بنت عبداللہ بن تیمیہ، زینب امام ابن تیمیہ کی استاذ بھی تھیں،

تاریخ ولادت :- امام ابن تیمیہؒ دوشنبہ ۱۰ ربیع الاول ۶۶۱ھ کو مقام حران میں پیدا ہوتے اسی لئے آپ کو حرانی بھی کہا جاتا ہے، حران شام کے علاقہ میں ایک مقام کا نام ہے

آپکے آباء واجداد بھی یہیں کے رہنے والے تھے، چھ سال تک امام صاحب یہیں مقیم رہے سات سال کے ہوئے تو تاتاریوں نے اس شہر پر غارتگری کرنی شروع کی جس سے تنگ آکر امام صاحب کا خاندان دمشق چلا آیا اور یہیں ان کے جوہر کھلنا شروع ہوئے۔

ابتدائی تعلیم وتربیت:- امام صاحب کے خاندان کو پہلے ہی سے علم وفضل میں نمایاں مقام حاصل تھا اسی لئے ان کے خاندان والوں نے ان کو حصول علم کے لئے وقف کردیا، چونکہ آپکے والد محترم خود بھی بڑے پایہ کے عالم اور اپنے وقت کے شیخ الحدیث تھے، اس لئے آپ نے سب سے پہلے والد محترم ہی سے کسب فیض کیا، پہلے قرآن حفظ کیا، پھر حدیث ولغت اور احکام فقہیہ کی معرفت حاصل کی۔ فقہ کا وافر حصہ یاد کیا، حدیث میں سب سے پہلے امام حمیدی کی کتاب "الجمع بین الصحیحین" حفظ کی، کچھ اور بڑے ہوکر مسند احمد، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابی داؤد، سنن النسائی، سنن ابن ماجہ دار قطنی کی کئی بار سماعت کی، ساتھ ہی دوسرے علوم وفنون کے حصول پر بھی پوری طرح متوجہ رہے، چنانچہ علوم ریاضی وغیرہ میں بھی خاصی مہارت پیدا کرلی، علوم عربیہ پر خاص توجہ رہی، یہ علم اس طرح حاصل کیا جیسے وہی آپ کا اصل مطلوب ومقصود تھا، اسی لئے آپکو عربی کے بے حساب محاورے اور نظم ونثر ازبر تھیں۔ تفسیر قرآن کے اسرار ورموز کی گرہ کشائی بھی آپ کا خاص مقصود تھا، ایک ایک آیت کا مطالعہ اس طرح کرتے کہ احادیث صحیحہ اور آثار صحابہ سے کچھ بھی مخالف نہ ہونے پایا۔

اس طرح امام صاحب ۲۱ برس تک اپنے والد محترم کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوتے رہے، پھر جب والد محترم کا انتقال ہوگیا تو تحصیل علم کے لئے آپ نے دمشق کے کسی بھی جیّد عالم کو نہیں چھوڑا جو جس میں یگانہ ویکتا تھا امام صاحب اس کے پاس گئے، اور اس سے علم حاصل کیا۔ عربیت کا درس آپ نے نحویوں اور زبان دانوں سے لیا، علم منطق کو ائمۂ منطق سے حاصل کیا، علم تفسیر کو اصحاب تفسیر سے سیکھا، فقہ حنبلی کا سبق حنبلی فقہاء اور شیوخ سے لیا، امام صاحب کے بعض معاصرین کا بیان ہے کہ انھوں نے جن شیوخ سے سماعت حدیث کی ان کی تعداد دو سو سے متجاوز رہے۔

امام صاحب علماء فضلاء کی مجلسوں میں بھی شرکت کرتے رہتے، جہاں وہ علماء کے مذاکرات سنتے، ادیبوں کے سوال وجواب سے استفادہ کرتے، اہل علم اور اصحاب فکر ونظر کے ان محاضرات سے پوری طرح بہرہ ور

ہوتے، جن کا سلسلہ مساجد و مدارس میں برابر جاری رہا کرتا تھا، خود آپ کا گھر بھی آپ کے والد محترم کے باعث اہل علم و فن کا مرجع بنا ہوا تھا، یہاں کے علمی اجتماعات سے آپ پورا استفادہ کرتے پیچیدہ مسائل کو بغور سنتے اور حقائق علمیہ پر گہری نظر ڈالتے، اور اس کے کھرے کھوٹے کا موازنہ کرتے پھر جو بات قبول کرتے اسے جانچ پرکھ کر قبول کرتے ورنہ رد کر دیتے۔

جب امام صاحب نے درسی علوم و فنون میں پوری طرح استعداد پیدا کر لی تو مطالعہ کتب کی طرف متوجہ ہوئے اور اس میں بالکل منہمک ہو گئے۔ اس طرح آپ نے ان شیوخ و اساتذہ سے بھی استفادہ کر لیا جن سے ملاقات نہیں تھی۔ اگر کہا جائے کہ آپ نے اپنے اساتذہ و شیوخ سے زیادہ کتابوں کے مطالعہ سے علم حاصل کیا تو یہ کچھ بیجا نہ ہوگا۔ آپ کے اندر بڑی خود اعتمادی تھی، اسی لئے کہا جاتا ہے کہ آپ نے مطالعہ کتب سے جو بصیرت حاصل کی وہ اس علم کی بہ نسبت بہت زیادہ تھی، آپنے اپنے اساتذہ و شیوخ کی خدمت میں حاضر ہو کر حاصل کیا تھا۔ اور یہ اپنے دیگر معاصرین اور ساتھیوں پر آپکی فوقیت اور خصوصیت کا خاص سبب ہے آپ کا قوت حافظہ عہد طفولیت ہی سے بہت تیز تھا۔ اس لئے آپ مسائل پر خوب بحث کرتے تھے، درس و تدریس کا یہ عالم تھا کہ کبھی کبھی ایک ہی مسئلہ کے حل کرنے میں کئی کئی روز لگا دیتے۔ اور پیچیدگی دور کر کے امر مطلوب تک پہونچ کر ہی دم لیتے، اس سلسلے میں آپ خاص طور سے قرآنی آیات اور احادیث نبویہ سے کام لیتے اس غور و فکر اور تحقیق نے آپکو طالب حقیقت بنا دیا، احادیث نبویہ اور قرآنی آیات سے استنباط معانی میں بھی آپ کو دوسرے علماء پر غیر معمولی امتیاز حاصل تھا، آپ مسائل پر سرسری نظر نہیں ڈالتے بلکہ بار بار غور و فکر کرتے اس کے بعد ایسے نکات نکالتے کہ عقلیں حیران اور مخالف انگشت بدنداں رہ جاتے تھے۔

زریں کارنامے :-

امام ابن تیمیہؒ نے اپنی پوری زندگی احیاء دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے وقف کر دی تھی، اسلام کی سربلندی اور اسکی اشاعت کے لئے آپ ہمیشہ کوشاں رہے اور اس سلسلے میں آپ کو جتنی بھی تکلیفیں پہونچی آپ نے خندہ پیشانی کے ساتھ انھیں برداشت کیا، آپکے چند نمایاں کارنامے جو سرفہرست ہیں یہ ہیں :-

● آپ نے شرک و بدعت اور اعتقادی گمراہی کے خلاف زبردست جہاد کیا اور اسلام کے چشمۂ صافی کو ہر قسم کی غلط آمیزش سے پاک کیا۔

● خالص کتاب وسنت اور سلف صالحین کے طریقے کی حمایت کی اور اسکی تائید میں بے نظیر دبے مثال دلائل فراہم کئے۔

● اسلامی عقائد واحکام کے لئے زبردست دلائل و براہین یکجا کئے اور اصطلاحی معقولات کی راہ چھوڑ کر وہ راہ اپنائی جو کتاب وسنت کے عین مطابق اور موافق تھی۔

● یونانی منطق وفلسفہ پر سخت تنقید کی اور اسکی خرابیوں کی اسطرح نشاندہی کی ذہنوں سے اس کا رعب وتسلط جاتا رہا۔

● خالص اسلام اور اتباع رسول کی ایسی دعوت دی کہ آج تک اسکی صدا کوچہ بکوچہ سنائی دے رہی ہے۔

● صرف زبان وقلم ہی سے نہیں بلکہ تلوار سے بھی جہاد کر کے دین وملت میں اجتہاد اور جہاد دونوں کی روح پھونکی۔

● آپ نے اسلامی علوم وفنون کو تازگی وبالیدگی عطا کی۔ اور انھیں غیر اسلامی عناصر سے پاک کیا۔

● مسلمانوں کو فکری گمراہیوں اور عملی بدعتوں سے پاک کرتے ہوئے انکی فکری اور اخلاقی وعملی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔

● اسلام کا ہر محاذ پر دفاع کیا اور اس کے ظاہری وباطنی دشمنوں یعنی نصرانیوں، تاتاریوں، نصیریوں، اور دروزیوں کا مقابلہ قلم اور تلوار دونوں سے کیا

یہ تو آپ کے کارناموں کے چند مجمل عنوانات تھے، آیئے بعض باتوں کا قدرے تفصیلی نقشہ پیش کریں۔

علمی خدمات:- امام صاحب ہمیشہ اپنی ذمہ داری اور فرائض کی بجا آوری میں مصروف رہتے تھے کیونکہ جب ہم آپ کے حالات وکوائف پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ آپ نے حصول علم کے بعد اپنی ساری صلاحیتیں علم کے لئے وقف کر دیں آپ کا کام صرف بحث وافتا رہا، حقائق اسلامیہ کا علم اور دفاع آپ کی زندگی کا مقصد تھا۔ جب آپ نے اپنی زندگی علم کے لئے وقف کر دی تو آپ پر دو اہم ذمہ داریاں آ پڑیں۔

① ایک یہ کہ آپ ان دشمنان اسلام کے مقابلہ میں سیف وسنان کا جوہر دکھائیں جو صلیبی حملوں کے بعد قبرص وغیرہ میں اسلام کے خلاف بری قسم کے افواہیں پھیلا رہے تھے، اور غلط سلط باتیں مشہور کر رہے تھے،

(۲) دوسرے ان نام ونہاد اسلامی گروہوں کے خلاف بھی میدان میں آنا پڑا جنھوں نے لباس تو اسلام کا پہن رکھا تھا، لیکن وہ باطنی خیالات وعقائد رکھتے تھے، اور ان کے اسلام کی بنیاد مکروفریب پر تھی، ان فرقوں کے مقابلہ میں جب امام صاحب میدان میں اترے تو آپ کو شمشیر وسنان اور زور بیان سے کام لینا ناگزیر ہوگیا عیسائیوں اور مسلمانوں کے فرق باطلہ کا مقابلہ کرنے کے لئے ضروری تھا کہ امام صاحب ان کے خیالات اور مزعومات ان کی کتابوں سے جانتے اور ان کے فلسفہ اور علم کلام سے واقفیت حاصل کرتے چنانچہ آپ نے یہ سب کچھ کیا، اناجیل کی تحریفات کا عمیق مطالعہ کیا، ان کے تمام مختلف الخیال گروہوں کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور پھر ان کے رد کے لئے میدان میں اتر پڑے۔

اسی طرح آپ نے ان اصولوں کا مطالعہ کیا جن پر اسلام کے گمراہ فرقوں کی بنیاد تھی تاکہ ان کے مذاہب کو اسلام سے ہٹا ہوا ثابت کریں۔ اس سلسلے میں آپ نے ان کی کتابوں کا تعمق نظری سے مطالعہ کیا، اور پوری مستعدی وتیاری کے ساتھ مناظرہ کے میدان میں کود پڑے، یہاں پر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ امام صاحب کی اپنی اس آزادانہ تحقیقات میں سوائے احکام خداوندی اور سنت نبویہ کی پیروی کے اور کوئی دوسرا مقصد پیش نظر نہ تھا، مدت مدید سے جو گرد وغبار اسلام کے روشن چہرے پر پڑتا چلا آرہا تھا اس کا ازالہ کرنا ہی آپ کی زندگی کا نصب العین تھا، اور جمود وتعطل کا ایک سلسلہ جو چلا آرہا تھا اسے دور کرنا ہی آپ کا مقصد خاص تھا، اس سلسلے میں امام صاحب کو سخت مخالفتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا، اور زیادہ تر یہ مخالفتیں مخاصمت کی صورت میں ظہور پذیر ہوئیں مگر آپ نے کبھی ہمت نہ ہاری، ہمیشہ مخالف کا مقابلہ کرنے کے لئے میدان میں آئے اور حق وصداقت کے لئے سینہ سپر رہے، جو بات خلاف شرع نظر آئی اس کے خلاف ڈٹ گئے اور اس سلسلے میں اگر حکام وعمال کے پاس جانا ضروری سمجھا تو بلا جھجک ان کے پاس جاکر فریضۂ تبلیغ حق سے عہدہ برآ ہوئے۔

۶۹۳ھ میں موثوق ذرائع سے یہ خبر امام صاحب پہونچی کہ ایک نصرانی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف گالی گلوج کی، پھر وہ رائے عامہ کے اشتعال سے خوف زدہ ہوکر ایک بدوی کے ہاں پناہ گزیں ہوگیا اس نے عوام کے جوش غضب سے اسکی حفاظت کی، امام صاحب کے لئے یہ بات ناقابل برداشت تھی، جس پر سکوت کسی طرح بھی اختیار نہیں کیا جاسکتا تھا، چنانچہ وہ شیخ الحدیث کو لیکر دمشق کے نائب السلطنت کے پاس پہونچے اور اس سے ماجرا بیان کیا، اس نے نصرانی کو حاضر کرنے کا حکم دیا، وہ حاضر ہوا اسکے ساتھ وہ

بدوی بھی تھا جس نے انھیں پناہ دی تھی، بدوی نے مظاہرہ کرنے والوں کے خلاف دُشنام طرازی شروع کردی۔ لوگ مشتعل تو تھے ہی، انھوں نے نصرانی اور بدوی اور اسکے ساتھیوں پر سنگ باری شروع کردی۔ حاکم دمشق نے امام صاحب اور شیخ الحدیث سے اس الزام میں کہ انھوں نے لوگوں کو نصرانی کے خلاف بھڑکا کر امن عامہ کو درہم برہم کیا تھا، تشدد کا برتاؤ کیا۔ مگر تفتیش سے نصرانی کی برأت جب ثابت ہوگئی تو (غالباً اس واقعہ کے نتیجے میں) وہ مسلمان ہوگیا۔ حاکم دمشق کو بھی اپنے سخت برتاؤ پر ندامت ہوئی، اس نے ان دونوں بزرگوں — امام صاحب اور شیخ الحدیث — سے معذرت کی اور انھیں رضامند کرلیا"۔

(حیات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ ص۷۶،۷۷)

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام صاحب کو درس و تدریس کی پابندیوں نے بھی دین و مذہب کے مسائل عامہ سے بے پروا نہیں رکھا تھا، وہ دین کی حمایت و نصرت کے لئے کسی سے بھی ٹکر لینے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتے تھے بلکہ مسند درس سے اٹھ کر میدان میں آتے تھے، اور دشنام رسول کے مجرموں کے خلاف لوگوں کی رہنمائی کرتے ہوئے تکلیف و اذیت اور پریشانی و مصیبت کا بے باکی سے مقابلہ کرتے تھے۔

مجاہدانہ کارنامے:- ٦٩٩ھ میں جب تاتاریوں نے شام پر حملہ کرکے والیٔ مصر کے لشکر کو شکست دیدی تو اس شکست نے سب کو حواس باختہ کردیا اور لشکر میں بھگدڑ مچ گئی، یہاں تک کہ تاتاریوں کا لشکر دمشق کے دروازے پر پہونچ گیا، جسکی وجہ سے لوگ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوگئے۔ علماء اور اکابر بھی خوف و دہشت سے فرار ہوگئے، اور حالت یہ ہوگئی کہ شہر تمام بڑے لوگوں سے خالی ہوگیا نہ کوئی حاکم تھا جو نظم دمشق کو برقرار رکھتا نہ کوئی عالم تھا جو وعظ و نصیحت کرتا، اور لوگوں کے حوصلے بلند ہوتے، مگر ہاں ابن تیمیہؒ تھے جو بے سہارا عوام کے درمیان پوری جوانمردی کے ساتھ موجود تھے۔ آپ کے قدم میدان سے نہیں اکھڑے اور نہ ہی آپ نے یہ مناسب سمجھا کہ مسلمانوں کو آشفتہ حال چھوڑ کر اپنے لئے عافیت کا سہارا لیں۔ اور مسلمانوں کو بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے جائیں۔ اس موقع پر امام صاحب نے بچے کھچے اعیان شہر کو جمع کیا اور رائے و مشورے کے بعد طے پایا کہ ایک وفد کی صورت میں چل کر شاہ تاتار سے بات چیت کی جائے اور اسے راضی کیا جائے کہ وہ شہر میں داخل نہ ہو جائے۔ ابن تیمیہؒ وفد کے ساتھ تاتاریوں کے لشکر میں پہنچے شاہ قازان اور لشکر کے دوسرے سرداروں

سے ملاقات کی اس وقت آپ پر ہیبت اور جلال کی خاص کیفیت طاری تھی، وہاں پہونچ کر آپ نے سلطان کے سامنے سب سے پہلے آیات قرآنی کی تلاوت کی اور احادیث رسول کا بیان عدل والصاف کے موضوع پر شروع کر دیا۔ آپ کا لہجہ بلند تر ہوتا جا رہا تھا پھر بھی کیفیت یہ تھی کہ سلطان ہمہ تن گوش آپ کی تقریر سن رہا تھا، وہ اپنی بدخلقی اور سخت مزاجی کے باوجود بالکل سہما ہوا تھا۔ اور محبت بھری نگاہ سے آپ کی طرف متوجہ تھا، آخر میں اس نے پوچھا یہ بزرگ کون ہیں؟ میں نے آج تک اس جگر کا آدمی نہیں دیکھا۔ نہ ہی کسی کے سامنے میں نے اپنے آپکو ایسا بے لبس پایا، سلطان کو بتایا گیا کہ یہ امام ابن تیمیہؒ ہیں جو بڑے پایہ کے انسان ہیں۔ دربار میں امام صاحب نے ترجمان کی مدد سے سلطان تاتار قازان سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا! اے قازان تیرا دعویٰ ہے کہ تو مسلمان ہے تیرے ساتھ قاضی ہیں اور شیخ بھی ہیں جو خدا کے نام پر لوگوں کو بلاتے ہیں تیرے باپ دادا کافر تھے، مگر سیرت وکردار میں تجھ سے اچھے تھے۔ کیونکہ جو کچھ تو نے مسلمان ہو کر کیا، تیرے باپ دادا نے کافر ہو کر نہیں کیا تھا۔ اگر انھوں نے کبھی کوئی عہد و پیمان کیا تو اس کو پورا کیا، مگر ایک تو ہے کہ پیمان وفا باندھا تو اس کو توڑ دیا جو بات تو نے اپنی زبان سے کہی اسے عملی جامہ نہیں پہنایا۔

امام صاحب نے یہ تقریر کی اور پھر عزت واکرام کے ساتھ اپنے علم کدہ میں تشریف لے آئے، آپکی یہ تقریر اگرچہ مختصر تھی مگر پھر بھی نتیجہ خیز ثابت ہوئی، اسکے نتیجہ میں ایک مدت تک دمشق میں تاتاری داخل نہ ہوئے قازان نے امن وامان کا اعلان کر دیا لوگوں نے اطمینان وسکون کی زندگی بسر کی، اور خوف و دہشت کا دور ختم ہو گیا۔

اسی طرح ۷۰۲ھ میں تاتاری جب دوبارہ اپنا لشکر جرار لیکر دمشق تک پہونچ گئے اور یہ عزم کر لیا کہ دمشق فتح کر کے دم لیں گے تو انھیں دیکھ کر دمشق کے لوگ مایوس اور خوف زدہ ہو گئے لیکن ابھی بار مصر و شام کی فوجیں مقابلہ کا تہیہ کر چکی تھیں، اور علماء و حکام بھی طے کر چکے تھے کہ اس مرتبہ دشمن کو منھ توڑ جواب دیا جائے گا۔ اور ہم میں سے کوئی بھی دمشق نہیں چھوڑے گا، کیونکہ اس بار امام صاحب نے لوگوں کا حوصلہ بلند رکھنے کی کوشش بڑی سرگرمی سے کی تھی، آپکی زبان پر اللہ تعالیٰ کے قول "ثمّ بُغِیَ علیہ لینصرنّہ اللہ" کی تلاوت جاری تھی، اور آپ لوگوں کو یقین دلا رہے تھے کہ فتح تمہارے ہی حصہ میں آئے گی۔ دشمن پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے ان حالات میں شکست خوردہ ذہنیت رکھنے والوں نے ایک دوسرا فتنہ کھڑا کیا کہ تاتاری نو مسلمان ہیں، ہم

ان سے کیسے مقابلہ کر سکتے ہیں، کیا مسلمان کا مسلمان سے مقابلہ کرنا جائز ہے، ایسے لوگ یہ احمقانہ باتیں کر رہے تھے گویا تاتاریوں کے حملے نے انھیں دفاع پر مجبور نہیں کیا ہے، تو اس موقعہ پر بھی امام صاحب نے آگے بڑھ کر اس معاملہ میں دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ کر دیا اور آپکی اس کوشش نے لوگوں میں اپنے حفظ ودفاع کا ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا کیا، اور اس کا نتیجہ مسلمانوں کی فتح کی شکل میں برآمد ہوا۔

یہ ہیں ساتویں صدی ہجری کے عظیم مجدد امام ابن تیمیہؒ جنھوں نے اسلام کی سربلندی کی خاطر ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دیئے جو اب بھی تاریخ کے روشن باب ہیں۔

وفات:- امام صاحب کو اخیر وقت میں دوبارہ جیل میں ڈالا گیا جسکی وجہ سے آپ کو سخت مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، آپکے غور وفکر پر بندش لگ گئی، جیل میں آپ سے کتاب، قلم کاغذ چھین لیا گیا، تو آپ کوئلوں سے جیل کی دیوار پر اپنے قلبی واردات لکھتے رہے جب یہ سامان بھی ختم ہو گیا تو آپ نے صرف قرآن مجید کی تلاوت کا شغل جاری رکھا، یہاں تک کہ ۳۰ سال کی مجاہدانہ زندگی بسر کرنے کے بعد ۷۲۸ھ میں یہ عالم جلیل اپنے رب کی رحمت ورضوان کے سایہ میں پہونچ گیا۔ اور علم وعمل کا یہ پروانہ شمع حق پر قربان ہو گیا۔ عنفوان شباب سے لیکر اخیر وقت تک اس کا جوہر شمشیر آبدار کی طرح چمکتا ہی رہا۔ وہ تا حیات اوج وعروج کی منزلیں درجہ بدرجہ طے کرتا رہا، یہاں تک کہ موافق ومخالف سب کو اس کے فضل وکمال کا اعتراف چار وناچار کرنا پڑا۔

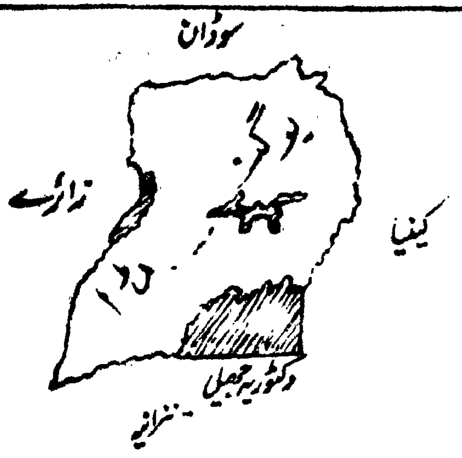
نور اللہ مرقدہ واعلیٰ درجتہ فی عبادہ الصالحین ●●

انجمن تعلیم البیان مدرسہ دار التعلیم مبارکپور کے طلبہ کا تقریری مقابلہ و اجلاس عام

مورخہ ۸ اپریل ۱۹۸۲ء یوم چہارشنبہ کو انجمن تعلیم البیان مدرسہ عربیہ دار التعلیم مبارکپور کے زیر اہتمام طلبہ کا ایک تقریری مقابلہ منعقد ہوا بعدہٗ مولانا مقبول احمد صاحب رحمانی مبارکپوری اور مولانا محمد نعیم صاحب بستوی مدرس مدرسہ عالیہ عربیہ مئو نے ڈیڑھ بجے رات تک خطاب عام فرمایا

دوسرے دن صبح سات بجے سے دوسری نشست ہوئی جس میں طلبہ کے علاوہ مولانا محمد نعیم صاحب اور مولانا عبد الرحمٰن صاحب رحمانی مبارکپوری نے خطاب کیا پھر صدر مولانا مجاہد اعظمی نے شرکاء مقابلہ میں انعامات تقسیم کیے۔

از ہر مبارکپوری سکریٹری انجمن طلبیان



عالم اسلام

یوگنڈا کے مسلمان

انیسویں صدی یوگنڈا کی تاریخ اور تمدنی ارتقا کا نقطۂ انقلاب ہے۔ اس صدی کی ابتدا میں مسلم تاجروں نے یوگنڈا میں زبردست اقتصادی اور دینی انقلاب برپا کیا ۱۸۴۴ء میں لوگوں نے کثرت سے اسلام قبول کیا۔ ۱۸۷۵ء کے قریب یوگنڈا کے بادشاہ "موتیسا" نے اسلام قبول کرلیا۔ وہ خود نماز کی امامت کرتا ملک میں دینی محاسبوں کو بھیج کر عوام کی دینی حالت کی نگرانی کرتا۔ اس نے اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب قرار دیا۔

خدیوی اسماعیل نے مصری پاہیوں کو فراز نیل دریافت کرنے کے لیے بھیجا، یوگنڈا میں ان کی اقامت نے تعلیمات اسلام کی اشاعت و تفہیم میں اہم رول ادا کیا

اسلام کی اس ترقی کو دیکھ کر عالم صلیب تڑپ اٹھا پھر ۱۸۷۷ء میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک ادریسیوں کی ایک کھیپ سرزمین یوگنڈا پر اترنے لگی۔ مزید برآں برطانوی سامراج نے بھی اسے اپنی تگ و تاز کا نشانہ بنایا تجارتی و تعلیمی دام فریب بچھایا اور ہر طرح سے مسلمانوں کو اسلام سے بیگانہ کرنے کی کوشش کی۔

۱۹۶۲ء تک یہی کھیل کھیلا جاتا رہا۔ ۱۹۶۲ء میں یوگنڈا کو استقلال نصیب ہوا۔ لیکن ایک صدی تک مسلمانوں کو جس طرح مراکز علم و اقتصاد سے دور رکھا گیا تھا اس کے سبب وہ حکومت میں کوئی اہم رول ادا نہیں کر سکتے تھے۔

لیکن عیدی امین کے دور حکومت (۱۹۷۱ - ۱۹۷۹ء) میں اسلام کی راہ کے روڑے ہٹنے لگے، مسلمانوں کو تعلیم، فوج اور اقتصاد میں مواقع ملنے لگے۔ ان کی حالت میں سدھار ہونے لگا وہ اہم مراکز قوت پر زیادہ سے زیادہ عمل دخل کے قابل ہونے لگے۔ اس مرد جری نے اپنے وطن عزیز سے صیہونیت کے قدم اکھاڑ دیے اور عالمی قوتوں کو چیلنج کرکے ان کی دسیسہ کاریوں کا پردہ فاش کر دیا۔ یہ ساری چیزیں عالم صیہونیت اور عالم صلیب کو لرزہ دینے کا

باعث بن گئیں۔ انہوں نے عیدی امین کے خلاف اتنا پروپیگنڈا کیا کہ اسے ایک درندہ بے رحم، خونی وغیرہ وغیرہ کا نام دیا۔ حالانکہ عیدی امین کے دورِ حکمرانی سے پہلے تک یوگنڈا انگریزوں کے کاروبار بردہ فروشی کی سب سے بڑی منڈی تھی۔ انگریزوں نے دو لاکھ سے زیادہ یوگنڈی نوجوانوں کو یوگنڈا سے شکار کیا۔

بہر حال عیدی امین کی جرات وغیرت سے استعماری قوتیں بلبلا اٹھیں انہوں نے ۱۹۷۹ء میں یوگنڈا تنزانیہ تنازع کا کھڑاگ کھڑا کر کے ۴۵ ہزار یمی تنزانی فوجوں سے یوگنڈا پر حملہ کرا دیا اور زمام اقتدار جوزیف لولی کو جو فریب میں آکر مسلمان سے عیسائی بنا تھا، سونپا اس کے بعد پھر کیا ہوا اسے مختصراً ملاحظہ کیجیے۔

تنزانی استعمار نے مساجد اور مدارس کو مسمار کر دیا اور بڑی بے رحمی سے مسلمانوں کا اجتماعی قتل کیا۔ قرآن کے نسخوں کو پھاڑ کر سڑکوں پر پھینکا گیا، پاخانوں میں ڈالا گیا اور سور کا گوشت پیک کرنے کے لیے بازاروں میں بیچا گیا۔ اس انقلاب سے قبل بازار میں سور کا گوشت بیچنا ممنوع تھا، اس کی عام چھوٹ دی گئی اور اب گائے اور بکریوں کے پہلو بہ پہلو یہ حرام گوشت بھی بکتا ہے۔

موجودہ حکومت نے "بیرا، شمالی یوگنڈا۔ موجودہ صدر مملکت میلٹن اوبوٹے کی جائے پیدائش) کی جامع مسجد کو شراب خانے میں بدل دیا ہے اور میتانیا جنوبی یوگنڈا کی جامع مسجد کو حکمران پارٹی یو بی سی کا دفتر بنا دیا ہے اور سوروتی، مشرقی یوگنڈا کی جامع مسجد کو فوج کی مشرقی یونٹ کا ہیڈ کوارٹر بنا دیا ہے۔

گزشتہ سال یوگنڈا حکومت نے مسلمانوں کے فریضۂ حج ادا کرنے پر پابندی لگا دی، موجودہ حکومت کے ۵۰ وزراء میں ایک بھی مسلم وزیر نہیں ہے حالانکہ مسلمانوں کی تعداد اوسطاً ۴۰ فیصد ہے۔ یوگنڈا حکومت نے مسلمانوں کے ہائی کمان مرکز پر قبضہ کر لیا ہے۔ یہ مرکز عیدی امین حکومت کی طرف سے اسلامی امور کی مجلس اعلیٰ کو ملا تھا سرکاری چھٹیوں کی فہرست سے مسلمانوں کے ایام تہوار کو نکال دیا گیا ہے۔ موجودہ حکمران مسلمانوں کے متعلق پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی پر عمل پیرا ہے تاکہ اس کی ظالمانہ کارروائیوں کو چیلنج نہ کیا جا سکے۔

یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن ابھی تک "موتمر الدول الاسلامیہ" سے اس کی رکنیت ختم نہیں ہوئی ہے اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ اس تنظیم میں رہ کر اسے عالم اسلام کے خلاف جاسوسی کا موقع ملتا رہے اور اسے اسلامی بنک اور ادارہ نقد اسلامی سے قرض ہاتھ آتے رہیں۔

آج یوگنڈا میں اسلام یتیم ہے۔ اس سے خون ٹپک رہا ہے۔ ابھی ابتدا ہے اگر اس کی خبر گیری اس وقت نہ

نہ ہوئی تو پھر آخرت تک اس کا خون بہتا ہی رہے گا۔

افغانستان: وادی پنجشیر کی جنگ

افغان مجاہدین نے پچھلے جمعہ کو اعلان کیا ہے کہ ۲۱ اپریل ۱۹۸۴ء کو کابل کے شمال مشرق میں وادی پنجشیر کے اندر افغان مجاہدین اور روسی فوجوں کے درمیان جو لڑائی شروع ہوئی۔ اس کے نتیجے میں ۱۶۰۰ کمیونسٹ فوجی مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ اسی ٹینک تباہ ہوئے ۵۳ فوجی گاڑیاں برباد ہوئیں۔ ۱۲ ہیلی کاپٹر گن شپ مار گرائے گئے۔ اور دو مگ طیارے بھی زمیں بوس ہوئے۔

افغان ذرائع نے یہ بھی بتایا ہے کہ سوویت جنگی جہازوں کی اندھا دھند بمباری سے پندرہ سو مکانات تباہ ہوئے۔ کل پشاور میں پروفیسر برہان الدین ربانی نے کابل حکومت کے اس دعوے کی تردید کی ہے کہ وادی پنجشیر کے افغان مجاہدین کے کمانڈر سید احمد شاہ مسعود کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ربانی نے کہا ہے سید مسعود شاہ آزاد ہیں اور وادی پنجشیر میں سوویت فوج کے خلاف بدستور اپنے افغان مجاہدین کی کمان کر رہے ہیں۔

یاد رہے کہ وادی پنجشیر کو فتح کرنے کے لیے ۲۱ ہزار سے زیادہ روسی فوج بھیجی گئی تھی، جس نے اس وادی کو ملنے والے تمام راستوں اور دروں کی ناکہ بندی کر دی تھی اور کسی ایک مقام پر سوویت روس کا یہ حملہ افغانستان میں مداخلت کے بعد سے اب تک کا سب سے بڑا حملہ تھا۔

مجاہدین کا بیان ہے کہ وہ اس حملے کے مقابلے کے لیے پہلے سے مستعد تھے اور جنگی پلان اور حکمت عملی کے تحت پہاڑوں میں چلے گئے تھے تاکہ سوویت روس کے خلاف کامیاب جوابی حملہ کیا جا سکے۔

(اخبار العالم الاسلامی مکہ مکرمہ ۳۰ اپریل ۱۹۸۴ء)

وادئ پنجشیر کی یہ جنگ وادی سے باہر تک پھیل گئی۔ مجاہدین نے چار مقامات پر درہ سالانگ والی شاہراہ بند کر کے کابل ماسکو کا زمینی رابطہ کاٹ دیا، جس کے نتیجے میں سوویت طیاروں نے مجاہدین کے ٹھکانوں پر اندھا دھند بمباری کی۔ مجاہدین کی خبر ایجنسی کا کہنا ہے کہ انہوں نے سالانگ شاہراہ پر اپنی

گرفت مضبوط کرنے کے لیے ماتاک کا مرکزی پل اڑا دیا۔ اسی طرح سالانگ شاہراہ کے شمالی علاقے کے مزید تین اہم پل بھی تباہ کر دیے گئے۔ (الدعوۃ ریاض، مئی ۱۹۸۴ء ص ۸)

روس نے اس سب سے بڑی جنگ میں پہلی بار بہت سے جدید اسلحے استعمال کیے ٹی یو-۱۶ بمبار طیارے کام میں لائے گئے، تاہم حملے کے دسویں دن یہ خبر آئی کہ روس بالآخر اس حملے میں ناکام رہا، جس سے جز بز ہو کر روسیوں نے مویشیوں پر غصہ اتارا اور انہی کو قتل کاٹ نہ بنایا اور غلے اور پیداوار میں آگ لگا دی۔ (الفائق ۹)

ایران: گرجے اور مندر بنانے کی اجازت۔ مسجد بنانے کی ممانعت

تہران جہاں ۵ لاکھ سنی مسلمان آباد ہیں انھیں آج تک اپنی مسجد تعمیر کرنے کی اجازت نہیں ملی جبکہ وہاں عیسائیوں کے بارہ گرجے، ہندوؤں کے ۲ مندر سکھوں کے ۲ گردوارے، یہودیوں کے ۲ عبادت خانے اور مجوسیوں کے ۲ آتشکدے موجود ہیں، جبکہ سنی مسلمانوں کی ایک بھی مسجد نہیں ہے۔

شاہ کے زمانے میں عیدین کی نماز تہران کے سنی مسلمان ایک پارک میں پڑھتے تھے لیکن جب سے مذہبی حکومت قائم ہوئی ہے عید کے دن اس پارک پر مسلح افواج کا پہرہ بٹھا دیا گیا اور انھیں نماز پڑھنے سے روک دیا گیا۔

جمعہ کی نماز کے لیے مذہبی حکومت سنیوں کو مجبور کرتی ہے کہ وہ تہران یونیورسٹی کے میدان میں شیعہ امام کی اقتدار میں جمعہ کی نماز پڑھیں، لیکن اس کے باوجود سنی حضرات وہاں نماز نہیں پڑھتے بلکہ پاکستانی سفارتخانہ میں نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔ واضح رہے کہ تہران یونیورسٹی کے میدان میں جمعہ کی نماز ایران کے صدر جمہوریہ پڑھاتے ہیں جو شیعہ فرقہ کے مذہبی رہنما بھی ہیں۔

ایران کے سنی مسلمان اپنی مذہبی تبلیغ و اشاعت اور اپنی اجتماعی فلاح و بہبود کے لیے نہ کوئی جلسہ کر سکتے ہیں اور نہ اپنی کوئی تنظیم قائم کر سکتے ہیں۔ پچھلے دنوں شوریٰ مرکزی اہلسنت کے نام سے سنیوں نے ایک تنظیم بھی قائم کی تھی تو اسے مذہبی حکومت نے خلاف قانون قرار دیدیا۔

مسلمانانِ اہلسنت اپنی مذہبی کتابیں منگواتے تھے لیکن مذہبی حکومت کے قیام کے بعد اس پر طرح طرح کی پابندیاں لگادی گئیں۔

سرکاری اسکولوں کا نصاب بدلا جارہا ہے اور نئے نصاب میں شیعہ مذہب کے عناصر شامل کیے جا رہے ہیں تاکہ سینوں کے بچے غیر شعوری طور پر شیعہ مذہب کے پیرو بن جائیں۔

زاہدان کے صوبہ میں جہاں ۹۵ فیصد سنی مسلمان ہیں۔ وہاں کے سرکاری اسکولوں میں ابھی پانچ سو اساتذہ مقرر کیے گئے ہیں جن میں صرف ۳۶ اساتذہ سنی ہیں باقی ۴۶۴ اساتذہ شیعہ ہیں۔ ایسا اس لیے کیا جارہا ہے تاکہ سنی بچوں کو شیعہ مذہب میں آسانی سے تبدیل کیا جاسکے۔

ایران میں اہلسنت کی تعداد ۲۵ فیصد ہے شاہ کے سامراجی نظام کے خلاف لڑی جانے والی جنگ آزادی میں شیعوں کے دوش بدوش ہزاروں سینوں نے جانی و مالی قربانیاں دی ہیں لیکن جمہوری حکومت میں انھیں جو حصہ ملا ہے وہ ان کی آبادی کے تناسب کے لحاظ سے بالکل نہیں کے برابر ہے مثال کے طور پر ۲۷۰ ممبران پارلیمنٹ میں اہلسنت کی تعداد صرف ۹ ہے جبکہ تناسب آبادی کے حساب سے ۱/۳ سے زیادہ کے وہ حقدار تھے۔ یعنی پارلیمنٹ میں ان کی تعداد کم از کم اسی ہونی چاہیے تھی۔

انتظامیہ اور عدلیہ میں اہلسنت کا وجود بالکل صفر کے برابر ہے۔ صوبائی اور ضلعی سطح کا کوئی ذمہ دار عہدہ تو بڑی بات ہے سنی فرقے کا کوئی آدمی تھانیدار بھی نہیں ہے۔ ایران کے تیس لاکھ پاسداران انقلاب میں جو حکومت کے ہر شعبہ پر حاوی ہیں اہلسنت کا ایک نمائندہ بھی نہیں ہے

ایران کے سنی مسلمانوں میں تعلیم یافتہ افراد کا تناسب صرف ۲ فی صد ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ علمی صلاحیتوں کی بنیاد پر کبھی بھی اس قابل نہیں ہو سکیں گے کہ ایک جمہوری حکومت میں وہ اپنا واجبی حصہ پاسکیں گے۔ اور حکومت کی موجودہ پالیسی کے پیش نظر امید بھی نہیں ہے کہ آئندہ اہلسنت کا تعلیمی تناسب بڑھ سکے گا۔ کیونکہ اپنا مذہبی تشخص برقرار رکھتے ہوئے ان کا اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا بہت مشکل ہے۔

ہمارے وفد نے حکومت کے ذمہ دار افراد کو مشورہ دیا کہ آپ حضرات ہند و پاک کے شیعہ حضرات کو تبرا سے روک دیں تو یہ دعوتِ اتحاد کی طرف بہترین پیش قدمی ہوگی۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ ہم اس پر غور کریں گے۔

(ہفت روزہ دہلی ۵ راپریل میں شائع شدہ رپورٹ سے ماخوذ، تعمیرِ حیات لکھنؤ ۲۵ رمئی ۱۹۸۴ء
ایشیا لاہور ۲۱ راگست ۱۹۸۴ء

جماعت و جامعہ

جامعہ رحمانیہ ڈھلیان کی تاسیس

محدث ماہ مئی ۱۹۸۴ء کے شمارے میں یہ اطلاع شائع کی جا چکی ہے کہ ۲۴، ۲۵ مارچ ۸۴ء کو صوبائی جمعیت اہلحدیث مغربی بنگال کے زیر اہتمام ڈھلیان ضلع مرشد آباد میں صوبے کی ایک عظیم اور مرکزی درسگاہ کی بنیاد رکھی گئی اور اس سلسلہ میں ایک زبردست اجلاس عام منعقد ہوا۔

بنگال کی تاریخ میں یہ اجلاس اپنی متعدد خصوصیات کے لحاظ سے منفرد تھا۔ مسلمان اتنی بڑی تعداد میں کھنچ کھنچ کر یہاں پہنچ گئے تھے کہ بعد میں جگہ نایاب کر بیٹھنے والوں کا اندازہ لگایا گیا تو ڈھائی لاکھ تک جا پہنچا۔ اس کے باوجود مجمع اس قدر منظم اور پرسکون تھا کہ تقریر کے دوران گویا لوگوں کے سروں پر چڑیا بیٹھی ہو۔ اس کے علاوہ کھانے، نماز اور سنگِ بنیاد رکھنے کے مواقع پر بھی مجمع نے نظم و ضبط اس طرح برقرار رکھا کہ والینٹیروں کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ جامعہ رحمانیہ کا سنگِ بنیاد مولانا عبدالوحید صاحب سلفی، امیر جمعیت اہلحدیث ہند (ناظم اعلیٰ جامعہ سلفیہ (مرکزی دارالعلوم) بنارس) کے ہاتھوں رکھا گیا۔ آپ جب بنگال پہنچے تو آپ کو گارڈ آف آنر پیش کیا گیا اور فرخا اسٹیشن سے جلسہ گاہ تک کاروں اور موٹر سائیکلوں کے جلو میں لے جایا گیا۔ سنگِ بنیاد رکھنے کے بعد آپ نے خطاب فرمایا۔ مجمع اتنا بڑا تھا کہ پیچھے کے لوگ آپ کو دیکھ نہ سکتے تھے اور ہر شخص کی آرزو تھی کہ وہ امیر جماعت کو ایک نظر دیکھ لے۔ لہٰذا کھلی جیپ میں آپ کا پورے مجمع میں ایک چکر لگایا گیا۔

اس اجلاس میں بنگال کے چھوٹے بڑے تقریباً تمام ہی علماء اہلحدیث اور دینی مدارس کے منتظمین و مدرسین شریک تھے۔ کلکتہ کے متعدد روزناموں اور ہفتہ وار اخبارات کے نمائندے بھی تشریف فرما تھے، بنگلہ دیش

سے جماعت کے اکابر و اعیان دو موٹروں میں بھر کر تشریف لائے تھے۔

مختلف دینی موضوعات پر اردو اور بنگلہ میں تقریریں ہوئیں۔ شرکاء اجلاس نئے عزم و حوصلے اور جوشِ عمل کے ساتھ واپس ہوئے۔ جامعہ رحمانیہ کے لیے عام لوگوں نے ۵۰ ہزار کے عطیات دیے جن میں خواتین کا چندہ اٹھارہ ہزار تھا۔ (یاد رہے کہ اجلاس میں تقریباً پچیس ہزار خواتین نے بھی شرکت کی تھی، جن کا باقاعدہ علیحدہ انتظام تھا۔)

جامعہ رحمانیہ کا قیام دھلیان ڈاک بنگلہ کے متصل عمل میں آرہا ہے اور یہ مقام کلکتہ کے شمال مغرب میں ۱۸۴ کلومیٹر اور فرخا بیراج کے مشرق میں دس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ اس پروگرام کے محرک جناب مولانا حافظ شیخ عین الباری صاحب مدرس مدرسہ عالیہ کلکتہ تھے اور مجلس استقبالیہ کے صدر جناب محمد رستم علی صاحب اور سکریٹری ماسٹر واجد علی صاحب اور دوسرے سارے ہی اراکین و منتظمین شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اللہ مزید توفیق دے اور شرفِ قبولیت سے نوازے۔ آمین۔

مالیگاؤں اور بمبئی میں اجتماعات اور جماعتی سرگرمیاں

جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں محتاجِ تعارف نہیں، مولانا مختار احمد صاحب ندوی کی کوششوں نے اسے شہرت کے بام عروج پر پہنچا دیا ہے۔ جامعہ کی عظیم جامع مسجد (جو مسجدِ عائشہ الراجحی کے نام سے موسوم ہے) کی تکمیل ۱۳ راپریل ۱۹۸۴ء کو اس کے افتتاح کے سلسلے میں جامعہ کی سرزمین پر نہایت عظیم الشان اجتماع ہوا جس میں ہندوستان کے مشہور و معروف علماء کے علاوہ متعدد اکابر عرب شیوخ نے شرکت کی۔

شیخ عبدالرحمٰن عبدالخالق نے جمعہ کا خطبہ دیا اور نماز پڑھائی۔ موصوف نہایت بلند پایہ اور پختہ کار سلفی عالم ہیں آپ نے کوئی ۲۰ برس سے کویت کو اپنا مسکن بنا رکھا ہے اور اپنی ٹھوس سنجیدہ اور منظم تبلیغ کے ذریعہ کویت کے نوجوانوں میں ایک انقلابی روح پھونک دی ہے۔ اور ان کے دم قدم سے کویت میں سلفی تحریک بڑے عروج پر ہے۔ شریعت کی پابندی کے آثار نوجوانوں کے چہروں سے عیاں ہیں۔

مالیگاؤں کا پروگرام ختم ہوتے ہی عرب شیوخ، علماء، فضلاء اور اعیان کا قافلہ مختلف ذرائع سے بمبئی روانہ ہوا۔ ۱۴ اپریل کی صبح ۸ بجے المالطیفی ہال شیفرڈ روڈ بمبئی میں اہلحدیث کنونشن شروع ہوا۔

جماعت اہلحدیث کی تنظیم، کتابی ضروریات کی تکمیل، مکمل نصاب تعلیم کی تیاری، باہمی نزاعات واختلافات کے تصفیہ اور مدارس ومساجد کی تنظیم پر نہایت اہم دور رس اور طویل المیعاد قرار دادیں منظور کی گئیں۔ اور انھیں زیر عمل لانے کے لیے باقاعدہ بورڈوں اور کمیٹیوں وغیرہ کی تشکیل ہوئی۔ اخیر میں عرب مشائخ کی تقریریں ہوئیں جن میں جناب شیخ صالح الحویتی قاضی محکمہ شرعیہ شارجہ، جناب ڈاکٹر محمد جمیل غازی۔ نائب صدر انصار السنۃ المحمدیہ مصر، جناب شیخ عبدالرحمن عبدالخالق کویت اور جناب شیخ محمد عمر فلاتہ سابق جنرل سکریٹری اور موجودہ صدر امور دعوت وتبلیغ، مدینہ یونیورسٹی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ رات میں نماز عشاء کے بعد مولانا عبدالوحید صاحب سلفی امیر مرکزی جمعیۃ اہلحدیث ہند کے زیر صدارت اجلاس عام ہوا، جس میں بمبئی کی خلقت امڈ آئی تھی۔ مشائخ عرب اور علماء ہند کی تقریریں ہوئیں۔

دوسرے دن یعنی ۱۵ر اپریل ۸۴ء کو صبح ۹ بجے اللطیفی ہال میں ادارہ اصلاح المساجد کے تحت مساجد کانفرنس شروع ہوئی، جس میں علماء اعیان اور اکابر کے علاوہ ہندوستان کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے ائمہ وخطباء نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں مساجد کی تعمیر کے علاوہ ائمہ وخطباء کی خستہ حالی دور کرکے انھیں معاشرے میں معزز مقام دینے کے علاوہ ان کی تربیت کے پروگرام پر خصوصیت سے غور کیا گیا اور طے پایا کہ جامعہ سلفیہ بنارس، جامعہ محمدیہ مالیگاؤں، جامعہ دارالسلام عمرآباد اور جامعہ احمدیہ سلفیہ دربھنگہ میں ان کی تربیت کے ایک ایک مراکز کھولے جائیں۔ ائمہ کو قرآن کی ایک خاص مقدار حفظ کرائی جائے اور تجوید کے ساتھ پڑھنا سکھایا جائے۔ نماز کے ضروری مسائل وآداب سے واقف کرایا جائے۔ خطیبوں کو ان کے علاوہ تمام اسلامی اور معاشرتی موضوعات پر خاص خاص مقدار میں آیتیں اور حدیثیں مع ترجمہ حفظ کرائی جائیں تاکہ وہ حسب ضرورت ہر موضوع پر خطبہ دے سکیں اور درس وغیرہ کا اہتمام کرسکیں۔ آج رات کو بھی نماز عشاء کے بعد اجلاس عام ہوا اور کیفیت وہی رہی جو پہلے دن تھی۔

ان پروگراموں کے روح رواں مولانا مختار احمد صاحب ندوی اور ذمہ داران جمعیۃ اہلحدیث بمبئی، شکریے اور تحسین کے مستحق ہیں۔

مشرقی جمعیۃ اہلحدیث مشرقی یوپی کی صوبائی کانفرنس بھدوہی:

۱۰ر ۱۱ر شعبان ۱۴۰۴ھ مطابق ۱۲ر ۱۳ر مئی ۱۹۸۴ء یوم شنبہ ویکشنبہ کو جمعیۃ اہلحدیث مشرقی یوپی کی طرف سے ضلع بنارس کے مشہور صنعتی قصبہ بھدوہی میں ریاستی پیمانے کا دو روزہ عظیم الشان اجلاس عام

منعقد ہوا۔ جس میں بیشتر اضلاع کی جمعیتوں کے نمائندے اور جماعت کے اکابر و اعیان اور عوام بڑے پیمانے پر شریک ہوئے۔ ۱۲ رمئی کو نماز عشار کے بعد اجلاس عام کی شکل میں پہلی نشست مولانا عبدالوحید صاحب سلفی امیر مرکزی جمعیۃ اہلحدیث ہند کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔ تلاوت کلام پاک کے بعد (مولانا) عبدالحفیظ صاحب سلفی ناظم ریاستی جمعیۃ اہلحدیث خان یوپی نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا بعد ازاں صدر محترم نے اپنا مطبوعہ خطبۂ صدارت پڑھا، جو مسلک اہلحدیث کے تعارف اور تاریخ اہلحدیث کے جملہ ادوار پر مشتمل تھا اس کے بعد دو بجے رات تک متعین موضوعات پر تقریروں کا سلسلہ چلتا رہا

دوسرے دن صبح نماز فجر کے بعد جلسہ گاہ میں درس قرآن اور درس حدیث ہوا پھر ۸ بجے ریاستی جمعیۃ کی میٹنگ شروع ہوئی جس میں جماعت کی تعمیر و ترقی کی مختلف تجاویز پر غور کیا گیا اور خصوصیت سے دعوت و تبلیغ کے بارے میں یہ طے کیا گیا کہ اس جمعیۃ کے دائرے میں جتنے مدارس ہیں ان کو تبلیغی مقصد کے لیے اس طرح منظم کیا جائے کہ ہر ہفتے یا پندرہ دن پر کسی جگہ تبلیغ کا پروگرام رکھا جائے اور اس علاقے کے مدارس باری باری ایک ایک مدرس دیتے رہیں۔ اس طرح تبلیغ کا سلسلہ بھی جاری رہے گا اور کسی ایک مدرسے یا ایک شخص پر اس کا مسلسل بار بھی نہیں پڑے گا۔ (یہ میٹنگ شہر بھدوہی کے قالین کے ایک مشہور تاجر جناب حاجی محمد ایوب صاحب کے نئے مکان کے حجرے میں ہوئی۔)

۹ بجے جمعیۃ کی میٹنگ ختم ہوتے ہی حاجی محمد ایوب صاحب کے نئے مکان کے وسیع ہال میں "اسلام کا مالیاتی نظام" اور خصوصاً "زکوٰۃ" کے موضوع پر سمپوزیم شروع ہوا۔ جس میں ہر دو موضوع پر متعدد علماء نے اظہار خیال کرتے ہوئے اس میدان میں اسلامی نظام کی خوبیوں اور اس کے برکات و ثمرات کا ذکر کیا اور یہ بتلایا کہ آج ہمارے مالیاتی نظام اور زکوٰۃ کی وصولی و تقسیم وغیرہ میں کہاں کہاں کونسی کونسی خامیاں ہیں اور ان کی وجہ سے ہمیں کیا کیا مشکلات جھیلنی پڑ رہی ہیں۔ نیز ان خامیوں کو کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں کیسی کیسی خیر و برکت کی امیدیں ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جناب حاجی محمد ایوب صاحب کے زیر انتظام ایک مدرسہ بھی چل رہا ہے جس میں حفظ اور دینیات کی تعلیم کا معقول انتظام ہے۔ ۱۱ بجے سمپوزیم ختم ہوتے ہی وہیں مدرسہ کے فارغ حفاظ کی دستار بندی ہوئی اور اس سلسلے میں تلاوت حمد و نعت اور مدرسہ کی رپورٹ وغیرہ پیش

کی گئیں۔ ۵/۲ بجے یہ مجلس ختم ہوئی۔

انھی اوقات میں جبکہ ہال میں یہ دونوں پروگرام چل رہے تھے ایک دوسری جگہ خواتین میں تبلیغ کا علیحدہ پروگرام چل رہا تھا۔ دنیورہ بنارس کے مولوی شاہد جنید کی والدہ انھیں خطاب کر رہی تھیں۔ خواتین کا یہ پروگرام چار گھنٹے جاری رہا۔

نماز عصر کے بعد حاجی ایوب صاحب کے اسی ہال میں مشرقی یوپی کے اہلحدیث مدارس کے طلبہ کے درمیان "نوجوانان اسلام کا کردار اور ان کی ذمہ داریاں" کے موضوع پر تقریروں کے انعامی مقابلے کا پروگرام شروع ہوا۔ اس سلسلے میں ریاستی جمعیتہ کے دفتر سے ذمہ داران مدارس کو پہلے ہی یہ اطلاع دیدی گئی تھی کہ بھدوہی کانفرنس میں مذکورہ موضوع پر طلبہ کے درمیان تقاریر کا ایک انعامی مقابلہ ہوگا۔ ہر مدرسہ مقابلے کے لیے اپنا ایک طالبعلم پیش کرسکتا ہے۔ اول، دوم، سوم آنے والوں کو خصوصی انعامات دیے جائیں گے۔

اس اطلاع کے نتیجے میں نو مدارس سے ایک ایک طالب علم نے شرکت کی، جنکی تقریریں تلاوت کلام پاک کے بعد شروع ہوگئیں۔ فیصلے کے لیے پانچ علماء مقرر کیے گئے تھے، جن کے اسمار گرامی یہ ہیں مولانا عبدالروف صاحب رحمانی جھنڈا نگری، مولانا ڈاکٹر مقتدی حسن صاحب ازہری، مولانا صفی الرحمن صاحب مبارکپوری، مولانا محمد عمر صاحب گونڈوی اور مولانا حافظ محمد سلیمان صاحب میرٹھی۔ فیصلے کا طریقہ یہ مقرر کیا گیا تھا کہ ہر تقریر کا مفروضہ (آخری) نمبر سو۱۰۰ ہوگا جن میں سے ہر حکم کے پاس ۲۰، ۲۰ نمبرات ہوں گے ہر حکم اپنے اپنے طور پر مقرر کو ۲۰ میں سے جتنے نمبرات کے لائق سمجھے گا اتنے نمبرات دے دے گا، پھر مقابلہ ہو جانے کے بعد پانچوں حکم میں سے ہر ایک نے جس طالب علم کو جتنے نمبرات دیے ہوں گے انھیں یکجا جوڑ دیا جائے گا اور اس طرح معلوم ہو جائے گا کہ مجموعی طور پر اس طالب علم نے سو میں سے کتنے نمبرات حاصل کیے۔ نمبر دینے کے لیے ہر حکم کو چار باتوں کا لحاظ رکھنا ہوگا (۱) مضمون کا مواد اور اس کی جامعیت (۲) ترتیب کی خوبی و تمامی (۳) الفاظ اور جملوں کی سلاست، نشست اور دروبست (۴) ادائیگی اور خطیبانہ انداز وقار۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا، مقابلہ عصر بعد شروع ہوا تھا مغرب تک، مقررین فارغ ہو چکے تھے، دو تقریریں مغرب بعد ہوئیں۔ پھر اسی وقت حکم صاحبان کے دیے ہوئے نمبرات جوڑ کر امیر مرکزی جمعیتہ جناب مولانا عبدالوحید صاحب ناظم اعلیٰ مرکزی دارالعلوم بنارس نے نتائج کا اعلان کیا، جو یہ تھا۔

(۱) مولوی ابوالمکرم متعلم جامعہ سلفیہ بنارس۔ اول (۲) مولوی عبدالمتین متعلم جامعہ اثریہ دارالحدیث مئو، دوم ۔ (۳) مولوی انوارالحق متعلم جامعہ فیض عام مئو۔ سوم (۴) مولوی سلام الدین متعلم مدرسہ انوارالعلوم املو۔ چہارم ۔

نماز عشاء کے بعد اجلاس عام شروع ہوا تو پہلی تقریر کے بعد مقابلہ میں شریک تمام طلبہ کو انعامات دیے گئے۔ اول آنے والے کو ایک ہزار روپئے نقد، دوم آنے والے کو پانچ سو ایک روپئے نقد اور سوم آنے والے کو دو سو اکیاون روپئے نقد (یہ تینوں انعامات جناب محمد صالح صاحب انصاری بنارس نے اپنی جیب خاص سے عنایت فرمایا تھا۔ چہارم آنے والے کو ایک سو روپئے نقد انعام دیا گیا۔ باقی شرکاء کو مولانا صفی الرحمٰن صاحب مبارکپوری کے حاشیہ کے ساتھ جامعہ سلفیہ کی شائع کردہ بلوغ المرام دی گئی ۔

اس کے بعد پھر تقریروں کا سلسلہ شروع ہوا اور رات کے ۱ بجے تک بعد شکریہ کے ساتھ جلسے کے خاتمے کا اعلان کیا گیا۔ الحمدللہ کانفرنس کے اثرات عوام و خواص اور اپنوں اور غیروں پر نہایت اچھے پڑے ۔ متعدد افراد نے مسلک اہلحدیث قبول کیا اور بہت سے افراد نے اپنی غلط فہمیاں دور ہونے کا کھلا اعتراف کیا اور اب الحمدللہ ان کے دل میں اس دعوت حق کی بڑی قدر ہے اس کانفرنس کا ایک اثر یہ بھی ہوا کہ اہل بھدوہی نے ۳۰ رمئی ۱۹۸۴ء کو پھر ایک اجلاس عام کا پروگرام رکھا ۔

ذمہ داران بھدوہی جناب رشیدالدین خاں صاحب ، جناب حاجی محمد ایوب صاحب، جناب حاجی اشفاق صاحب وزیری جناب حاجی عبدالوکیل صاحب ، جناب قمرالدین صاحب اور دوسرے تمام اخوان نے اس کانفرنس کو کامیاب بنانے کے لیے جس جانفشانی ، دلجمعی اور ایثار سے کام لیا اللہ سے دعا ہے وہ اسے حسن قبول سے نوازے اور ان سب کو اس کا بہترین اجر دے ۔ ذمہ داران جمعیۃ خصوصاً اور تمام برادران جماعت عموماً ان کے بہت بہت شکر گزار ہیں اور توقع رکھتے ہیں کہ آئندہ بھی اس قافلے کو آگے بڑھانے میں اسی محنت و جانفشانی سے کام لیں گے ۔

عبدالحفیظ سلفی
ناظم جمعیۃ اہلحدیث
مشرقی یوپی

.رسہ عائشہ صدیقہ میں داخلہ کی خواہش مند طالبات :

مدرسہ عائشہ صدیقہ منصورہ مالیگاؤں لڑکیوں کی تعلیم کے لئے قائم کیا گیا ھے س میں عربی اور دینی علوم کے ساتھ ساتھ انگریزی ، حساب ، سائنس اور امور مانہ داری کی تعلیم دی جاتی ھے ، لڑکیوں کی دیکھ بھال اور تربیت کے لئے فاضل ستانیوں کی خدمات حاصل ھیں ، لڑکیوں کا قیام و طعام مستقل ھوسٹل میں ھوگا ۔

داخلہ محدود ھے ، لھذا خواھشمند حضرات جلد سے جلد فارم حاصل کر کے ضروری کاروائی کے بعد ادارہ کو واپس بھیجیں ۔

داخلہ صرف ان ھی بچیوں کا ھوگا جو کم سے کم پانچویں پاس ھوں فارم منگوانے کے لئے سادہ لفافہ پر پتہ لکھیں اور پچاس پیسے کا ڈاک ٹکٹ بھی روانہ کریں ۔ پتہ : جامعہ محمدیہ ، منصورہ **P. B. 144** مالیگاؤں ، ضلع ناسک مہاراشٹر **423203**

اجلاس عام ایلم بازار :

یہ ضلع بیر بھوم مغربی بنگال میں ایک مشہور مقام ھے یہاں ۲۹ اپریل ۸۴ء کو ایک عظیم الشان جلسہ ھوا ، اور ایک مدرسہ اور یتیم خانہ کی بنیاد رکھی گئی ، ایڈیٹر محدث نے جامعہ کی طرف سے شرکت کی ۔

جامعہ محمدیہ رائے درگ (اے . پی .) :

۷ شعبان ۱۴۰۴ ھ ۔ ۹ مئی ۸۴ ء کو اس ادارہ کا ۵۸ واں عظیم الشان سالانہ اجلاس ھوا ۔ صبح ۹ بجے ختم بخاری کی تقریب ھوئی ۔ عصر بعد علماء کی تقریریں ھوئیں ۔ اور ممتاز طلبہ میں انعامات تقسیم کئے گئے ۔ عشاء بعد سے ایک بجے رات تک اجلاس عام ھوا ۔ (جامعہ میں ۲۰ شوال تک داخلہ ھوگا ، فارم ابھی سے طلب کیا جا سکتا ھے) ۔

جمعیۃ اھلحدیث مبارکپور کا انتخاب !

۲۴ اپریل کو جمعیۃ مذکور کا انتخاب جدید ھوا ۔ قاری محمد زبیر صاحب امیر ، مولوی عتیق الرحمن صاحب سکریٹری اور حکیم سیف الرحمن صاحب خازن منتخب ھوئے مشتاق احمد ولد برکت اللہ نائب امیر . فیضان احمد نائب سکریٹری ، ماسٹر عبد الرحمن . ماسٹر عبد الولی ، عبید اللہ ، محمد مصطفی ، آفتاب احمد ولد یحیی صاحبان رکن منتخب ھوئے ۔

June & July **MOHADDIS** 1984

THE ISLAMIC CULTURAL & LITERARY MONTHLY MAGAZINE

AL-JAMIATUS SALAFIAH (AL-MARKAZIYAH) VARANASI (INDIA)

ہماری عربی مطبوعات

١ — مرعاة المفاتيح فى شرح مشكاة المصابيح (حصه ششم)	Rs. 35/00
(بقیه اجزاء زیر طبع ہیں) (حصه ہفتم)	Rs. 30/00
٢ — بين الامامين : مسلم والدارقطنى	Rs 55/00
٣ — انعام المنعم البارى بشرح ثلاثيات البخارى	Rs. 8/00
٤ — اتحاف الكرام شرح بلوغ المرام	Rs 35/00
٥ — دراسات فى الجرح والتعديل	Rs. 30/00
٦ — كتاب الأباطيل للجورقانى (جلد ١)	Rs 50/00
(جلد ٢)	Rs 45/00
٧ — البيان المكمل فى تحقيق الشاذ والمعلل	Rs. 5/00
٨ — المحدث شمس الحق العظيم آبادى : حياته و آثاره	Rs. 16/00
٩ — مختصر التحفة الاثنا عشرية	Rs 35/00
١٠ — نزهة النظر فى توضيح نخبة الفكر	Rs. 15/00
١١ — الحسام الماحق لكل مشرك ومنافق	Rs. 10/00
١٢ — معدل الصلاة	Rs. 5/00
١٣ — حصول المأمول من علم الأصول	Rs. 7/00
١٤ — جهود أهل الحديث فى خدمة القرآن الكريم	Rs. 9/00
١٥ — إخبار الكرام بأخبار المسجد الحرام	Rs 10/00
١٦ — تاريخ التشريع الاسلامى	Rs. 24/00
١٧ — عروة بن اذينة : حياته وشعره	Rs 10/00
١٨ — مجموعة من النظم والنثر	Rs. 5/00
١٩ — شذا العرف فى فن الصرف	Rs. 8/00
٢٠ — القول السديد فى كشف حقيقة التقليد	Rs 15/00
٢١ — تسهيل الوصول الى فهم علم الأصول .	Rs. 10/00

مکتبہ سلفیہ ریوڑی تالاب وارانسی

Published from Markazi Darul-Uloom
Printed by Abdul Waheed
At Salafiah Press, Reori Talab, Varanasi.

مرکزی دار العلوم بنارس کا دینی علمی اور ادبی ماہنامہ

Vol. 3 No. 8 28/8/84

مُحدّث

ادارۃ البحوث الاسلامیۃ والدعوۃ والافتاء بالجامعۃ السلفیۃ بنارس

★

عدد مسلسل ۲۱ ⊙ ذی القعدہ ۱۴۰۴ھ ⊙ اگست ۱۹۸۴ء

برگ وبار

جامعہ سلفیہ کا علمی ادبی اور اصلاحی رسالہ

ماہنامہ

محدث

بنارس

ذیقعدہ ۱۴۰۴ھ • اگست ۱۹۸۴ء

بدل اشتراک

سالانہ: ۲۵ روپے

ششماہی: ۱۳ روپے

فی پرچہ: ۲/۵۰ روپے

بیرون ملک سے سالانہ: ۱۵ ڈالر

ناشر: جامعہ سلفیہ بنارس

طابع: عبدالوحید

مطبع: سلفیہ پریس بنارس

کاتب: انور جمال

ترتیب

صفی الرحمن مبارکپوری

:- پتہ :-

خط و کتابت کے لیے: ایڈیٹر محدث، جامعہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس

بدل اشتراک کے لیے: مکتبہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس

→ MAKTABA SALAFIAH REORITALAB VARANASI-10

ٹیلی گرام: "دارالعلوم" وارانسی • ٹیلی فون: ۶۳۵۷۷

ڈاکٹر اقبال

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہمنشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز گرمیٔ محفل نہ کر قبول

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دِل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقشِ راہ

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُکُمْ

پھر تمہارے دل سخت ہوگئے

بمبئی، بھیونڈی اور اس کے اطراف و نواح میں جو قیامت صغریٰ برپا ہوئی اس کے مختلف گوشوں پر اس قدر روشنی ڈالی جاچکی ہے کہ ہمیں کچھ کہنے اور لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ ہنگامہ و فساد کی اس خونین لہر سے صرف اسی علاقے کے لوگ متاثر نہیں ہوئے۔ بلکہ ہمارے علاقے مشرقی یوپی میں بھی بستی بستی کہرام مچا ہوا تھا۔ کیونکہ مہاراشٹر کے ان علاقوں میں ہمارے اس نواح کے بیشمار افراد رہ رہے تھے۔ اور پے بہ پے تشویشناک خبریں چلی آرہی تھیں۔

اس فساد — بلکہ سارے ہی فسادات — کا ایک پہلو ایسا ہے جس پر مسلمان عموماً توجہ نہیں کرتے۔ حالانکہ توجہ کرنے کا اصل پہلو یہی ہے۔ ہمارا اور سارے مسلمانوں کا ایمان ہے کہ اس کائنات کا ایک پتہ بھی ہل نہیں سکتا، جب تک کہ پروردگار عالم کی طرف سے اسے ہلنے کا اِذن اور حکم نہ مل جائے۔ اس لیے ہم پر جو افتاد پڑتی ہے، یقیناً وہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے اور قضا و قدر کے تحت پڑتی ہے۔ اس کا ارشاد ہے قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا۔ (اے پیغمبر!) آپ کہہ دیں کہ ہم پر ہرگز کوئی آفت نہیں آسکتی مگر وہی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھدی ہے — اور اللہ جو کچھ کرتا ہے اور جو فیصلے صادر فرماتا ہے وہ عین عدل و انصاف ہوا کرتا ہے۔ اس میں ظلم کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ خود فرماتا ہے وما انا بظلام

لِلْعَبِيْد ۔ (میں (اللہ) بندوں پر ذرا بھی ظلم نہیں کرتا۔

اس اعتبار سے ہمارے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اگرچہ کرنے والوں کے تعلق سے ظلم ہے اور اس پر یقیناً ان سے مواخذہ اور باز پرس ہونی چاہیے، لیکن قانونِ قدرت کے جامع اور وسیع دائرے میں اسے ظلم سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا، پھر آخر یہ کیا ہے ؟ اس کی وضاحت خود قرآن مجید نے فرمادی ہے۔ جو لوگ واقعی ایمان و عملِ صالح کی صفات سے آراستہ ہیں ان کے لیے یہ ایک آزمائش ہے، جس سے اس بات کا اظہار مقصود ہوتا ہے کہ یہ لوگ واقعۃً اللہ کے بندے ہیں۔ ان کے ظاہری اطوار و آداب محض بناوٹی نہیں ہیں بلکہ عقیدے کی گہرائیوں سے پھوٹے ہیں۔ پھر اس آزمائش میں ثابت قدم رہنے کا صلہ انھیں اس طرح مل جائے گا کہ تلافی مافات ہی نہیں بلکہ اصل استحقاق سے بڑھ کر ہوگا۔ ارشاد ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ	اور ہم یقیناً تمھاری آزمائش کریں گے، کچھ خطرات
وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ	اور بھوک سے اور جان و مال اور پھلوں کی کمی سے۔
وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۔	اور ثابت قدم رہنے والوں کو خوش خبری سنا دو۔

ان کے برعکس جو لوگ صاحبِ ایمان نہیں ہیں یا ضعیف الایمان ہیں اور عملاً فسق و فجور اور بدعملی و فحش کاری میں مبتلا ہیں، اس طرح کے واقعات ان کے لیے ایک طرح کی غیبی تنبیہ ہیں۔ ان کو اشارۃً یا خدائی زبان میں سمجھایا جا رہا ہے کہ سنبھل جاؤ، صحیح راستے پر آجاؤ، اللہ کے باعزاز اور مخلص بندے بن جاؤ ورنہ ابھی جو کچھ تمھارے سامنے آ رہا ہے وہ بہت معمولی اور مختصر ہے۔ آگے جو کچھ پیش آنے والا ہے وہ اتنا سنگین ہے کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ارشاد ہے:

وَلَنُذِيقَنَّهُم مِّنَ الْعَذَابِ الْأَدْنَىٰ دُونَ الْعَذَابِ الْأَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (حم السجدۃ ۲۱)	اور ہم یقیناً فاسقوں کو عذابِ اکبر کے بجائے معمولی یا قریب ترین عذاب چکھائیں گے، تاکہ وہ باز آجائیں۔
ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيقَهُم بَعْضَ الَّذِي عَمِلُوا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ۔ (الروم: ۴۱)	لوگوں کے ہاتھوں نے جو جو حرکتیں کیں ان کی وجہ سے بحر و بر میں فساد برپا ہوگیا تاکہ لوگوں نے جو کچھ کیا ہے اس کے کچھ نتائج اللہ تعالیٰ انھیں چکھادے، ہوسکتا ہے وہ باز آجائیں۔

یعنی فسق و فجور اور بدعملی کی حالت میں جو افتاد پڑتی ہے وہ خدائی گرفت ہوتی ہے اور اس کے ذریعہ تنبیہ مقصود ہوتی ہے کہ راست بازی اور سلامت روی کا راستہ پکڑ لو۔

اس وقت اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمانوں کی جو عملی کیفیت ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ مسلم سماج میں یقیناً بہت سی امتیازی خوبیاں باقی ہیں جن میں کوئی دوسرا سماج ان کا شریک و سہیم نہیں لیکن یہ بہت چھوٹے پیمانے پر ہیں، غلبہ اور کثرت فسق و فجور کو حاصل ہے۔ بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ہماری بہت سی خوبیاں دوسروں نے اپنا لیں اور ہم ان سے تہی دست ہو گئے۔ اور دوسروں کی بہت سی برائیاں ہم نے اپنا لیں اور ان سے آگے نکل گئے۔ ان حالات میں جو کچھ ہو رہا ہے اسے قدرت کی طرف سے آزمائش کے بجائے تنبیہ ہی کہا جا سکتا ہے اس تنبیہ کا تقاضا یہ تھا کہ ہم سنبھل جاتے۔ اور اپنے آپ کو درست کر لیتے لیکن یہ کتنی افسوسناک بات ہے کہ ہم نے اس افتاد پر آہ و بکا اور سینہ کوبی تو کی۔ چیخ پکار تو مچائی۔ لیکن وہ کام نہ کیا جو کرنے کا تھا۔ یعنی اللہ کی طرف نہیں جھکے۔ اس کے آستانے پر سر نہیں ٹیکا، اس سے مدد نہیں مانگی، اس کے سامنے ظلم و بربریت کے خلاف فریادی نہیں بنے۔ اور جب تک یہ نہ کریں گے ہمارے مرض کا علاج نہیں ہوگا۔ اللہ نے اس علاج کے دو پہلو رکھے ہیں اور دونوں میں سے کسی سے بھی ہم غفلت برتیں گے تو ظلم و تشدد کا شکار بننے سے نہ بچ سکیں گے۔

ایک پہلو یہ ہے کہ ہم اللہ سے صحیح تعلق استوار کریں اور اس کے سچے اور نیک بندے بن کر رہیں۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہم اپنے دفاع اور بچاؤ کے لیے پوری طرح تیار رہیں۔ اور اس میں کسی بھی وقت کسی بھی طرح کا خلل نہ آنے دیں۔ اس کے بعد ان شاء اللہ حالات مکمل طور پر ہمارے حق میں ہوں گے۔ ورنہ وہی ہوگا جس کی نظیریں ہم سے پہلے اور خود ہماری تاریخ کے پچھلے دور میں بھی گزر چکی ہیں۔

زیب عنوان آیت کا ٹکڑا بنو اسرائیل کے اسی طرح کے حالات کا نتیجہ بیان کرتا ہے۔ ان پر اللہ تعالیٰ نے احسان و انعام بھی کیا، انہیں معجزات و نشانات بھی دکھلائے۔ ظلم و تشدد کے پنجے سے آزادی بھی بخشی، پھر انھیں ان کی غلط حرکتوں پر تنبیہ کے لیے مختلف حوادث سے دوچار بھی کیا۔ لیکن ان کی عملی حالت یہ رہی کہ جس برائی میں ملوث ہوئے ملوث ہی رہے۔ اپنی اصلاح نہ کی۔ نہ خدائی انعامات کے نتیجے میں شکر کے جذبات پیدا ہوئے۔ نہ خدائی گرفت اور تنبیہ پر توبہ و انابت کا ظہور ہوا۔ دل کی یہی سختی اور بے حسی تھی جس کی طرف اللہ نے اشارہ فرمایا ہے اور جس کی وجہ سے ان پر قیامت تک کے لیے ذلت و مسکنت کی مار پڑی۔ سوال یہ ہے کہ کیا ہم بھی وہیں کھڑے ہونا چاہتے ہیں، جہاں بنو اسرائیل کھڑے تھے۔

فکرِ ساعۃٍ خیر

ڈاکٹر محمد معین فاروقی
شعبۂ حیوانیات، مسلم یونیورسٹی

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ ؕ اِنَّمَا یَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ ۝

پھر ایک دوسرے مقام پر عقل والوں کی تعریف یوں بیان فرمائی۔

اَلَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (۳:۱۹۱)

مندرجہ بالا آیات میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا علم رکھنے والے عاقل بندوں کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو کھڑے بیٹھے، کروٹ کروٹ اللہ کو یاد کرتے ہیں اور پھر اللہ کی مخلوقات کی عمیق گہرائیوں میں اتر کر اس کی حکمتِ بالغہ اور قدرتِ کاملہ کا اعتراف کر کے بے ساختہ ملتجی ہوتے ہیں کہ اے میرے رب تو نے یہ سب کچھ عبث نہیں بنایا، تو عیب سے پاک ہے، ہم کو دوزخ کی آگ سے بچا۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی عظمت کا علم رکھتے، اسی علم کو اخروی سعادت کا ذریعہ سمجھتے اور صحیح معنوں میں اللہ سے ڈرتے ہیں۔

ان ارشاداتِ ربانی کی روشنی میں مسلمان اگر اپنی دینی زندگی کا اجمالی جائزہ لیں تو یہ جان کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ دن کے چوبیس گھنٹے میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جبکہ کسی نہ کسی جگہ اللہ کا ذکر نہ ہوتا ہو۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ قابلِ افسوس بات یہ ہے۔ جو علوم خداوند کریم کی آیات اور مخلوق میں اس کے افعال کی معرفت کا ذریعہ بن سکتے تھے،

ان سے ہم تقریباً نا آشنا ہیں۔ صدیوں سے ہمارے شعور کا یہ گوشہ خالی ہے۔ قرآنی تعلیم کا مقصد ایک صاحب ذکر و فکر شخصیت کی تعمیر ہے جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

جب کلام مجید کی ان آیات پر غور کیا جائے جو کائناتی مظاہر پر تفکر اور تدبر کی ترغیب دلاتی ہیں تو ایک عامی بھی یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کس طرح اطراف و جوانب میں بکھری ہوئی مادی اشیاء کی جانب ہماری توجہ مبذول کرائی جا رہی ہے۔ کہیں اجرامِ فلکی کے مداروں کی طرف اشارہ کر کے نظامِ کائنات پر غور و خوض کی ترغیب ہے، کبھی پکتے ہوئے پھل اور پھوٹتے ہوئے بیجوں پر نت نئے سوال چھیڑ کر فکر میں تحریک پیدا کی جا رہی ہے، کہیں مویشیوں اور پرندوں کی ساخت پر غور و خوض کی دعوت ہے، اس فکری دعوت کی اہمیت کا اندازہ یوں بھی ہو سکتا ہے کہ قرآن حکیم میں جتنی آیتیں شرعی احکام و فرائض سے متعلق ہیں ان سے تقریباً پانچ گنا زیادہ عجائباتِ قدرت پر غور و فکر کی دعوت دے رہی ہیں۔ ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے وہ یہ کہ جن اشیاء و مظاہر کی طرف اشارے کیے گئے ہیں وہ سارے کے سارے مادی ہیں جن کا احاطہ قطعاً ہمارے فہم و ادراک سے ممکن ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ فکری زاویے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ ایک دور تھا جبکہ روحانیت کا غلبہ تھا آج اس کا دائرہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ الحاد و بے دینی روز افزوں ترقی پر ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جدید علوم کے تعلیم یافتہ مسلمان قرآن سے تقریباً ناواقف ہیں اور دوسری طرف دینی علوم کے عالم عصری علوم کی زبان تک سے واقف نہیں۔ ایک طبقہ موضوعی طرز پر کائناتی مظاہر کو اپنا محورِ فکر بناتا ہے اور اس طرح اپنی عقل کو مطمئن کرتا ہے دوسرا طبقہ استدلال کے ان رموز سے تقریباً ناآشنا ہے، کتنے حضرات ایسے ہوں گے جنھوں نے مدرسوں کی حدود سے نکل کر آسمان کے اس وسیع سائبان کے نیچے اللہ کی تخلیق کے وافر نمونوں پر اس نیت سے نظر ڈالی ہوگی کہ ان میں اللہ کی نشانیاں موجود ہیں۔ قرآن کی تاکید ہے کہ نا واقف، اہلِ علم کی طرف رجوع ہوں، لیکن کتنے ایسے ہیں جنھوں نے اس ارشادِ ربانی کو آویزۂ گوش بنایا۔ اور ان لوگوں کے علم سے استفادہ کیا جنھوں نے اپنی پوری زندگی کائنات کے اسرار و رموز کو سمجھنے کے لیے وقف کر دی۔ علمائے قدیم اور جدید الگ الگ راہوں پر چلتے رہے، اگر یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے تو یہ آیاتِ آفاق و انفس کی گرہ کشائی انسانیت کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتی۔ یہ تو قرآن حکیم کا اعجاز اور اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا بین ثبوت ہے کہ جن قوموں نے شعوری یا غیر شعوری طور پر قرآن کی اس فکری دعوت پر عمل کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو اس دنیا میں سرفراز کیا۔ حاملینِ قرآن نے جب تک

مقدس کتاب سے روشنی لی اس وقت تک علم و تحقیق کی امامت کے بلند منصب پر فائز رہے اور جب اس سے روگردانی کی دوسروں کے دست نگر ہو کر رہ گئے۔

یہ دنیا عالم اسباب ہے۔ اس کا نظام اس نہج پر وضع کیا گیا ہے کہ مادہ میں اس وقت تک کوئی حرکت ممکن نہیں جب تک کوئی سبب اس سے وابستہ نہ ہو، جب کائنات میں سبب اور نتیجہ کا قانون کام کر رہا ہو تو حوادث و واقعات کے اسباب دریافت کیے بغیر دنیا کے ذخائر سے کس طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، انھیں اسباب میں تسخیر کائنات کا جواز موجود تھا۔ یہ مقدس راہ قرآن نے تجویز کی تھی، اس سبق کو بھلا کر سب سے بڑا خسارہ یہ ہوا کہ جو دین پوری زندگی پر محیط تھا وہ چند بے جان عبادات تک محدود ہو کر رہ گیا، آج انبیاء کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے، خرق عادات کے نمونے ظاہر نہیں ہوتے، نفس پر عقل کی حکمرانی ہے۔ یہ سچ ہے کہ عقل ہی نے انسان کو اشرف بنایا مگر یہی عقل کبھی کبھی بے راہروی اور گمراہی کے اسباب بھی فراہم کرتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس عقل کی کجروی کا سدباب کیا جائے۔ عقل کی رسائی محدود ہے اور انسانی تجربات غلطیوں سے بالکل محفوظ نہیں ہوتے۔ مشاہدات میں بھی بسا اوقات دھوکا ہوتا ہے۔ دراصل وحی کے سوا علم کا کوئی ذریعہ بھی بے خطا نہیں ہے، کتاب الٰہی کے ساتھ کائنات ربانی پر غور و خوض، نتائج و انکشافات کو حقیقت سے دور نہیں ہونے دیتا ورنہ عقل بے زمام کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے۔ البتہ غور و خوض جمود و تنگ نظری سے پاک ہو، حالیہ حیاتیاتی اور طبعیاتی انکشافات سے فائدہ اٹھائیں لیکن شرط یہ ہے کہ ان سے خالص علمی حد تک ہی اخذ و استفادہ کیا جائے اور ان کی نظریاتی و مفروضاتی توجیہات پر بے چون و چرا اعتماد نہ کیا جائے۔ بنیادی عقائد میں ثبات و استحکام ہو، اس کے بعد عقل اور تجربہ کی روشنی میں اللہ کی عظیم تخلیق کا مطالعہ کیا جائے۔ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا باعث کوئی بے شعور مادہ نہیں ہے بلکہ ایک علیم و بصیر ذات کی کارفرمائی ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ سب ان مقررہ اصول و قوانین کے مطابق ہوتا ہے جو خالق کائنات نے وضع کیے ہیں۔ مگر چونکہ ذات حقیقی پردۂ غیب میں نہاں ہے، اس عالم اسباب میں نظر نہیں آسکتی، اس لیے لازم ہے کہ اس کے حکم کے مطابق اس کی نشانیاں اس کی قدرت کے مظاہر میں تلاش کی جائیں جن کا ادراک قطعی طور پر ہمارے حواس سے ممکن ہے، یہی نشانیاں اس کے وجود، اس کی حکمت اور اس کی تدبیر و تقدیر پر پوری پوری دلالت کرتی ہیں اور یہی قوت دلالت انسان کے سوئے ہوئے ذہن کو جھنجھوڑ کر بیدار کر سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے عالم ارواح میں جملہ بنی نوع انسان سے یہ عہد لیا تھا کہ میں تمہارا رب ہوں۔ (الست بربکم) اور ان سب نے بیک زبان اقرار کیا تھا کہ بیشک تو ہمارا رب ہے (قالوا بلیٰ شہدنا) اب یہاں جب کائناتی نظام کی پیچیدگیوں پر غور کیا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس عالم اسباب میں انسانی عقل کے ذریعہ اُسی عہد کی تجدید کرانا چاہتا ہے، یہی عقل کا منتہیٰ ہے اور خلق کائنات کا راز بھی اسی میں مضمر ہے۔ واضح رہے کہ اس امر کی تصدیق اسی وقت ممکن ہے جب خلوص نیت اور مذہبی تقدس کے ساتھ مظاہر کا مطالعہ کیا جائے اور ان اصول و قوانین کا پتہ لگایا جائے جو نہایت نظم و ضبط کے ساتھ ذرات سے کائنات تک جاری و ساری ہیں۔ جن لوگوں نے اس جذبہ کے ساتھ قدرت کا مطالعہ کیا ہے، انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اس کائنات پر تصرف کرنے والی ایک عظیم قوت ہے جو عقلِ انسانی سے ماوراء ہے۔ آئن سٹائن نے ایک موقع پر کہا تھا:

"میرا مذہب اس لامحدود، اعلیٰ قوت کے اعتراف سے عبارت ہے جس کی ہلکی سی رمق ہمارے نحیف و ناتواں ذہنوں پر منکشف ہوتی ہے۔"

در اصل اسلامی فکر کا منبع وہ یقین محکم ہے جو وجود باری تعالیٰ کے اقرار سے متعلق ہے، جب تک اس اقرار کا حق ادا نہ ہو جائے اس وقت تک عقیدہ اور عمل میں خلوص پیدا نہیں ہوتا، حق اس کا یہ ہے کہ ہم اللہ کو اس طرح مانیں جیسے کہ آنکھ سے دیکھ رہے ہوں اور اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو سکے تو اتنا ضرور ہو کہ وہ ہم کو دیکھ رہا ہے۔

ہمارے دینی مراکز یقیناً قابلِ تحسین، ان کی گوناگوں علمی خدمات سے انکار نہیں کیا جا سکتا، البتہ قرآنی تعلیم کا وہ اہم حصہ جس کا تعلق علوم کائنات سے ہے اور جس کے حصول کے لیے قرآن نے بار بار توجہ دلائی ہے نیز جسے عبادت کا مقام بھی حاصل ہے۔ (فکر ساعۃ خیر من عبادۃ ستین عاماً۔ بحوالہ حجۃ اللہ البالغہ، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) نظر انداز ہو گیا ہے۔ نہ معلوم وہ کون سے عوامل مانع رہے کہ صدیوں سے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی اور نہ اس کو نصاب میں شامل کرنے کا کوئی منصوبہ بظاہر نظر آتا ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ مظاہر قدرت کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل کی جائیں۔ جن کے بغیر تفکر کی راہ ہموار نہیں ہو سکتی۔ شب و روز کی تحقیقات سے علم کا دریا وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، کیا اچھا ہوتا کہ ان حقائق کو دینی نصاب میں شامل کر کے ایک ایسی فضا موجود میں

لائی جاتی جو ہمارے طلباء کے لیے فکر کا مواد اور اس کی مشق کے لیے ذرائع فراہم کرتی، ان سطور سے ہمارا مقصد نہ تو مروجہ تعلیمی نظام پر کوئی تخریبی تنقید ہے . . . اور نہ ہی کسی قسم کی نشتر زنی سے شخصیتوں کو مجروح کرنا ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ یہ قرآن کریم کے ساتھ بڑی بے انصافی ہوگی۔ اگر ہم فکری دعوت کو نظر انداز کر کے عصری تقاضوں کو پورا نہ کر سکیں۔ اے دین حق کے علمبرداران! اٹھو اور خلائی پرواز کی تیاریوں میں مشغول ہو جاؤ۔

بچوں کی دینی تعلیم کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ ماہر نفسیات ایرکسن کے خیال کے مطابق ۱۱-۶ سال کے بچے میں اتنی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ چیزوں کی بناوٹ اور طریقہ کار پر غور کر سکے۔ نیز استخراجی عمل (Deductive reasoning) کی صلاحیت بھی اسی عمر سے شروع ہو جاتی ہے۔ عمر کا یہی وہ نازک دور ہے جسے ہم جس رنگ میں چاہیں رنگ سکتے ہیں، مزید برآں تجسس انسان کا ایک فطری تقاضا ہے، کسی بھی ماحول کا پروردہ ایک سات سالہ بچہ ہر نئی چیز دیکھ کر کس قدر بے چین نظر آتا ہے وہ اپنی استطاعت کے مطابق اس کی گہرائیوں میں اترنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ صفت کسی قوم یا نسل سے وابستہ نہیں اور نہ کسی ملک کا اجارہ ہے۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کا عطیہ عام ہے۔ یہ صلاحیت تربیت پاکر پروان چڑھتی ہے اور اگر اس کو جلا نہ دی جائے تو معدوم ہو جاتی ہے۔ ذمہ داران یہ دیکھیں کہ یہ شمع جو قدرت نے بچوں کے دل میں روشن کی ہے اس کی تابناکی عمر کے ساتھ بڑھتی جائے۔ اس کے تجسس میں اضافہ ہو، غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو اور اس کے تحت الشعور کی صف اول میں اللہ کی عظمت کا ایسا نقش قائم ہو جو عمر کے ساتھ ابھرتا آئے اور یہی رنگ منظاہر قدرت کی توجیہ کرتے وقت غالب رہے، تدریسی عمل کے دوران اس عام اصول کا بھی خیال رکھا جائے کہ طلبہ کی ذہنی حرکت معلوم سے نامعلوم کی طرف خصوصیت سے عمومیت کی طرف، مرئیات سے غیر مرئیات کی طرف ہونی چاہیے۔

رسمی طور پر بچوں کی اسلامی زندگی کی بنیاد اس مفروضہ پر قائم کی جاتی ہے کہ مسلمان گھر میں پیدا ہونا ہی دائرہ اسلام میں داخلے کی ضمانت ہے۔ اس طرز استدلال کے تحت اگر فکری توجیہات کے بغیر روز اول سے شرعی احکامات کا سلسلہ نازل ہونا شروع ہو جائے اور اس کو بزور نافذ کیا جائے تو بسا اوقات عنفوان شباب میں اس کا ردعمل شدید بغاوت کی شکل اختیار کرتا ہے، کیونکہ یہ دین بچے کو وراثت میں ملا۔ وَمَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا) اس کی شعوری فکر کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ اکثر پرہیزگار خاندانوں کے ذہین فرزند اسی سبب سے لادینیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک بڑا المیہ ہے۔

خوردسالی میں کلمۂ طیبہ کے قولی اقرار سے بلا شبہ بچہ مسلمان تو ہو جاتا ہے مگر ایمان والوں سے آمنوا کا جو تقاضا کیا جا رہا ہے وہ اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جبکہ بچہ سن شعور کو پہنچے، اس کی عقل بالغ ہو جائے اور اس پر فہم و فراست کے دروازے کھلنا شروع ہو جائیں۔ یہی وہ مناسب وقت ہے جبکہ خداوند تعالیٰ کی تلاش ہو، ہم مخلوقات کے ذریعہ اپنے خالق سے متعارف ہوں، غور و فکر، تجزیہ اور تجربہ کر کے اس کی عظمت، اس کی صناعی، اس کی ربوبیت کا دل سے اقرار کریں۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں اپنے آبائی مذہب کا جائزہ لیں، افراط و تفریط سے منحرف ہوں اور دین حق پر اس طرح سوچ سمجھ کر دوبارہ ایمان لائیں کہ اللہ کے اس فرمان کا جیتا جاگتا نمونہ بن جائیں۔

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّىْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّىْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ؀ (۴۶ : ۱۵)

اگرچہ یہ کیفیت توفیق الٰہی کی محتاج ہے پھر بھی مناسب تعلیم و تربیت اور سازگار ماحول کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ قوم کے باشعور افراد — جدید و قدیم علوم پر نظر رکھنے والے حضرات — کا فرض ہے کہ ایسا سازگار ماحول پیدا کریں۔

بقیہ ص ۱۶ کا :

جس سے بڑھ کر کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی کسی لیڈر کی زہر افشانیوں اور فتنہ سامانیوں کے جواب میں اگر دو قوموں کے درمیان تصادم اور بلوہ و فساد شروع ہو جائے تو فریقین کو زبردست جانی اور مالی نقصانات کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لیکن اس کے برعکس اگر امن و امان کو درہم برہم کئے بغیر کسی حکمت عملی سے صرف اس طرح کے مفسد لیڈر کا صفایا کر دیا جائے تو دونوں فریق اس وقت تک امن و امان کی نیند سو سکیں گے جب تک دوبارہ اسی طرح کا کوئی دوسرا مفسد لیڈر پیدا نہ ہو جائے۔ یہ ہے وہ خصوصی سبق جو مسلمانوں کے لیے اس پیغمبرانہ طرز عمل میں پوشیدہ ہے۔ اور جس کی پیروی فلاح و کامیابی کی ضامن ہے۔

منہاج نبوّت

بچاؤ کا پیغمبرانہ طریقہ

ابو ہشام اعظمی

"کون ہے جو کعب بن اشرف سے نمٹے؟ اس نے اللہ اور اس کے رسول کو اذیت پہنچا رکھی ہے۔"
یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کرب انگیز لہجے میں صحابہ کرام کے ایک مختصر سے مجمع کے اندر کہی۔

"میں اس کے لیے مستعد ہوں" محمد بن مسلمہ نے جواب دیتے ہوئے عرض کیا: "کیا آپ کی خواہش یہ ہے کہ اسے قتل کر دیا جائے؟"

"ہاں! میں یہی چاہتا ہوں" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اثبات میں جواب دیا۔

"اچھا تو آپ اپنی شان میں کچھ کہنے کی اجازت فرمائیں؟" محمد بن مسلمہ نے جنگی حکمت عملی کا خاکہ مرتب کرتے ہوئے کعب بن اشرف کے پاس آپ کی شان کے خلاف کچھ کہنے کی اجازت چاہی۔

"کہہ سکتے ہو" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد تھا۔

اس کے بعد محمد بن مسلمہ نے اپنے خاکے میں رنگ بھرنا شروع کیا۔ وہ کعب بن اشرف کے بھائی لگتے تھے۔ بے دھڑک اس کے پاس پہنچے اور بولے "بھئی! اس شخص نے (اشارہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تھا) ہم سے صدقہ مانگا ہے، جان بیرن میں ڈال رکھی ہے۔ ہم تمہارے پاس اس لیے آئے ہیں کہ ہمیں کچھ قرض دیدو۔"

"ابھی کیا ہے؟ ابھی تو اور درگت بنے گی" گویا

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا   آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

یہ کعب بن اشرف کا جواب تھا۔

"بھئی وہ تو ٹھیک ہی کہتے ہو لیکن ہم نے اسے مان لیا ہے اور اس کے پیروکار بن چکے ہیں تو مناسب

نہیں معلوم ہوتا کہ اتنی جلدی ساتھ چھوڑ دیں۔ اب ذرا دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟ اچھا خیر! ہم اس لیے آئے ہیں کہ ہمیں ایک وسق یا دو وسق (ڈیڑھ کوئنٹل یا تین کوئنٹل) غلہ ادھار دیدو۔ محمد بن مسلمہ نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ مگر کوئی چیز رہن رکھ دو" کعب بن اشرف نے کہا۔

"اچھا تم ہی کہو کیا چیز رہن رکھیں؟" محمد بن مسلمہ نے دریافت کیا۔

"اپنی عورتیں رہن رکھ دو" کعب بن اشرف کا جواب تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ تم عرب کے سب سے خوبصورت آدمی ہو" محمد بن مسلمہ کا جواب تھا۔

"اچھا تو اپنے بیٹوں کو ہی رہن رکھ دو" کعب بن اشرف نے دوسری تجویز پیش کی۔

"یہ بھی ناممکن ہے۔ ذرا سوچو! لوگ ہماری اولاد کو گالی دیں گے۔ کہیں گے ایک وسق یا دو وسق کے بدلے رہن رکھا گیا تھا۔ البتہ ہم رہن کے طور پر تمہیں اپنے ہتھیار دے سکتے ہیں" محمد بن مسلمہ نے متبادل تجویز پیش کرتے ہوئے کہا۔

بات طے ہو گئی اور محمد بن مسلمہ نے کعب بن اشرف سے وعدہ کیا کہ وہ جلد ہی آئیں گے ہتھیار دے جائیں گے اور غلہ لے جائیں گے۔

محمد بن مسلمہ کا تیر نشانے پر بیٹھا اور ان کی حکمتِ عملی کا پہلا مرحلہ پوری طرح کامیاب رہا۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اس گفتگو کے بعد اگلی بار ہتھیار سمیت محمد بن مسلمہ کی آمد پر کوئی شبہ نہیں گزر سکتا تھا

اس کے بعد اس واقعے کے دوسرے کردار ابو نائلہ نے بھی تقریباً اسی طرح کا معاملہ طے کیا۔ وہ کعب بن اشرف کے رضاعی بھائی تھے۔ اس کے پاس جا کر کچھ دیر تک ادھر اُدھر کے اشعار سنتے سناتے رہے۔ اس کے بعد اچانک رُخ بدلتے ہوئے بولے "بھئی میں ایک خاص ضرورت سے آیا تھا، اسے کہنا چاہتا ہوں لیکن پردہ فاش نہ کرنا۔"

"ٹھیک ہے" کعب بن اشرف نے کہا۔

ابو نائلہ نے داستان شروع کی "بھئی اس شخص (اشارہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تھا) کی آمد

تو ہمارے لیے وبال جان بن گئی ہے، سارا عرب دشمنی پر اتر آیا ہے۔ اور سب نے ہم پر ایک کمان سے تیر چلا دیا ہے اور ہماری راہ کاٹ دی ہے۔ اہل وعیال برباد ہو رہے ہیں۔ برا حال ہے۔ ہم سب مشکلات سے دوچار ہیں۔"

اس کے بعد دونوں میں اسی طرح کی بات چیت چلی، جیسی محمد بن مسلمہ کے ساتھ ہو چکی تھی۔ ابونائلہ نے اثنائے گفتگو میں یہ بھی کہا کہ میرے کچھ رفقاء کی بھی وہی رائے ہے جو میری ہے۔ میں چاہتا ہوں انھیں بھی تمہارے پاس لاؤں، تم ان کے ہاتھ بھی کچھ غلہ بیچو اور احسان کرو۔

اس طرح ابونائلہ نے اس تجویز کے خاکے میں ایک اور رنگ بھرا۔

ربیع الاول ۳ھ کی چودھویں تاریخ تھی۔ رات کا وقت اور صاف شفاف آسمان۔ ہر طرف چاندنی چھٹک رہی تھی۔ محمد بن مسلمہ، ابونائلہ، حارث بن اوس، عباد بن بشر اور ابوعبس بن جبر۔ پانچ افراد کا ایک مختصر سا دستہ ایک پُراسرار مہم کے لیے تیار ہو کر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوا۔ آپ نے جنت البقیع اس کی مشایعت فرمائی اور وہاں سے رخصت کرتے ہوئے فرمایا: بسم اللہ، آگے بڑھو۔ یا اللہ ان کی مدد فرما۔ اس کے بعد گھر واپس آ کر دعا ومناجات میں مشغول ہو گئے۔

دستہ محمد بن مسلمہ کی قیادت میں آگے بڑھا۔ اور قبا کے پیچھے کوہ عیر کے مشرق میں واقع کعب بن اشرف کے قلعے کی فصیل کے دامن میں پہنچا۔ ابونائلہ نے ہانک لگائی۔ کعب بن اشرف نئی نویلی دلہن کی آغوش میں تھا۔ مانوس آواز سن کر قلعے سے باہر آنے کے لیے اٹھنا چاہا تو دلہن نے دامن تھام لیا "اس وقت کہاں جا رہے ہیں؟ اس آواز سے تو خون ٹپکتا محسوس ہو رہا ہے؟" یہ دلہن کی فریاد تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ یہ میرے رشتے کا بھائی محمد بن مسلمہ اور میرا رضاعی بھائی ابونائلہ ہے" "اگر شریف آدمی کو نیزے کی ضرب کی طرف بلایا جائے تو بھی وہ اس پکار پر لبیک کہتا ہے" کعب بن اشرف نے عربی جانبازی وجوانمردی اور انفعالئے عہد کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا اور نیچے آگیا۔ یوں بھی وہ خوشبو لگانے کا عادی تھا۔ مگر آج تو معمول سے بڑھ کر اس کے جسم سے خوشبو پھوٹ رہی تھی۔

یہاں پوری حکمتِ عملی پہلے سے طے تھی۔ ابونائلہ نے کہہ رکھا تھا کہ میں خوشبو سونگھنے سونگھانے کے بہانے اس کے بال کو چھونے اور پکڑنے کا کھیل کروں گا۔ جب دیکھو کہ میں نے اچھی طرح قابو کر لیا ہے

تو اس پر پل پڑنا ۔ چنانچہ جب کعب بن اشرف نیچے آیا تو پہلے کچھ دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں، پھر ابونائلہ نے کہا: کیوں نہ شعب عجوز تک چلیں اور کچھ مزید باتیں کریں ۔

اگر تم لوگوں کی یہی خواہش ہے تو چلو چلیں ۔ کعب بن اشرف کا جواب تھا

تفریحی انداز میں قدم آگے بڑھنے لگے ۔ راستے میں ابونائلہ نے کہا ۔ آج جیسی خوشبو تو میں نے دیکھی ہی نہیں ۔ کعب کا سینہ فخر سے تن گیا بولا ۔ میرے پاس عرب کی سب سے خوشبودار عورت ہے ۔

ابونائلہ نے کہا: اجازت ہو تو ذرا سر سونگھ لوں ۔

ہاں، ہاں! سونگھ سکتے ہو ۔ کعب بن اشرف نے جھک کر کہا ۔

ابونائلہ نے بالوں میں ہاتھ ڈالا ۔ اور سونگھنے لگے، پھر ساتھیوں کو بھی سونگھایا ۔

چند قدم اور چلے تو پھر سونگھنے کی خواہش ظاہر کی ۔ اور پھر اجازت ملی ۔ مزید چند قدم آگے چل کر تیسری بار اجازت چاہی ۔ اور اب کی بار بھی اجازت ملی ۔ اب ابونائلہ نے چوٹی میں ہاتھ ڈالا اور مضبوطی سے تھام کر بولے: لے لو اللہ کے اس دشمن کو ۔ اچانک کعب بن اشرف پر کئی تلواریں پڑیں، لیکن بے سود ۔ محمد بن مسلمہ نے جھپٹ کر ایک کدال اٹھائی اور اس کے پیڑو پر رکھ کر اتنا بوجھ ڈال دیا کہ کدال آرپار ہو گئی ۔ اور کعب بن اشرف ایک خوفناک چیخ کے ساتھ دم توڑ بیٹھا ۔

دستہ واپس ہوا تو بقیع کے پاس پہنچ کر فرطِ مسرت سے نعرۂ تکبیر بلند کیا ۔ آج اس نے مسلمانوں کے حلق میں پیوست ایک منحوس ہڈی ہمیشہ کے لیے نکال دیا تھی ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تکبیر سنی تو سمجھ گئے کہ آپریشن کامیاب رہا ۔ آپ کا چہرہ مسرت سے دمک اٹھا اور آپ نے جوابی تکبیر کہی ۔ اتنے میں یہ پراسرار دستہ آپ کی خدمت میں پہنچ چکا تھا ۔ آپ نے انھیں دیکھ کر فرمایا، یہ چہرے کامیاب رہیں...

...... اور آپ کا چہرہ بھی اے اللہ کے رسول ۔ یہ دستے کا جواب تھا ۔ اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس طاغوت اکبر ۔ کعب بن اشرف ۔ کا سر آپ کے سامنے ڈال دیا ۔

یہ کعب بن اشرف کون تھا؟ اور اس کی کیا کارستانیاں تھیں کہ اس کے لیے اس طرح کا اہتمام کرنا پڑا؟ اس کی ایک طویل داستان ہے جو اپنے دامن میں ایک بڑا عبرت آموز او راہم سبق رکھتی ہے ۔

درحقیقت کسی قوم کو امن وامان یا جنگ وفساد کی راہ پر لگانے والے اس کے لیڈر ہوا کرتے ہیں ۔

یہ اپنی دماغی ساخت کی بنا پر بعض دفعہ ایسی صورتحال پیدا کر دیتے ہیں کہ شہر کے شہر ویران و تاراج ہو جاتے ہیں اور مختلف قوموں اور قبیلوں کے درمیان فتنہ و فساد، لوٹ، مار، ہنگامہ و بلوہ اور قتل و غارت گری کا ایسا سلسلہ چل پڑتا ہے کہ مدتوں تباہی و بربادی کا دور دورہ رہتا ہے۔ کعب بن اشرف ایسا ہی ایک یہودی لیڈر تھا وہ اصلاً قبیلہ طے کی ایک شاخ بنو نبہان سے تعلق رکھتا تھا۔ مگر اس کی ماں بنو نضیر کی ایک یہودن تھی۔ اس لیے وہ بھی اسی قبیلے کا ایک فرد شمار کیا جاتا تھا۔ یہ بڑا مالدار تھا اور خوبصورت اور شاعر بھی۔ بنو نضیر کی آبادی کے پیچھے اس کی حویلی تھی، جو مکمل طور پر چھوٹا سا ایک قلعہ تھی۔

اس شخص کو مسلمانوں سے عناد و اسلام کی دشمنی تھی۔ بدر میں مسلمانوں کی فتح ہوئی اور صنادید قریش مارے گئے تو اس کی خبر سن کر یہ شخص اس قدر تلملایا کہ بے ساختہ بول پڑا۔ اگر محمد نے ان اشراف عرب اور بادشاہان قوم کو مار لیا ہے تو زمین کا شکم اس کی پشت سے بہتر ہے۔

پھر اسی پر بس نہ کیا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی مستقلاً ہجو شروع کر دی اور دشمنان اسلام کی مدح سرائی میں قصیدے کہنا اور انہیں مسلمانوں کے خلاف بھڑکانا شروع کیا۔ جذبہ عناد اور بڑھا تو مکہ گیا۔ اور مقتولین بدر کے مرثیے کہہ کہہ کر اور قریش کا جذبۂ انتقام بھڑکا بھڑکا کر ہر طرف آگ لگا دی پھر مدینہ واپس آیا تو صحابہ کرام کی عورتوں کے نام لے لے کر عشقیہ اشعار کہے۔ اور اپنی زبان درازی سے سخت اذیتیں پہنچائیں۔

اس طرز عمل نے مکہ اور مدینہ دونوں جگہ کی فضا مسلمانوں کے خلاف کر دی۔ مشرکین اور یہود میں مسلمانوں کے خلاف عام جوش و خروش پیدا ہو گیا اور ہر طرف فتنہ و فساد کے بادل منڈلانے لگے۔

یہی صورتحال تھی جس سے تنگ آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ کعب بن اشرف سے کون نمٹے گا۔ ؟ اور محمد بن مسلمہ نے اس سے نمٹ لیا۔ اگر اس سے بروقت نہ نمٹا جاتا تو خدا جانے مدینہ کے اندر یہ شخص کیسے کیسے ہنگامے اور فساد کرتا۔ لیکن جب اسے مار دیا گیا تو کسی کو دم مارنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اور سارے یہودی اپنی اپنی جگہ چپ چاپ پڑے رہ گئے۔

... ...

حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی تحفظ اور قومی سلامتی کی یہ پیغمبرانہ تدبیر ایسی جامع اور کامیاب تدبیر ہے

(باقی ص ۱۱ پر)

بزعم خویش

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری

اسلامی دعوت کی تاریخ اسلام ہی کی طرح قدیم ہے ، جب سے اسلام آیا اللہ کے بندوں میں سے جنھیں توفیق ملی اسے قبول کیا اور پھر دوسروں تک اسے پہنچایا ۔ اسلام کی دعوت دوسروں تک پہنچانے کا کام انتہائی اہم اور بڑا پاکیزہ ہے اور غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہی اس امت کا امتیاز اور اس کی برتری کا سبب ہے۔ امت کو یہ کام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ورثہ میں ملا ہے ، جس کام کے لیے سید المرسلین نے اپنی زندگی وقف کردی تھی اسی کام کو اب امت کے علماء اور دعاۃ انجام دے رہے ہیں ۔

اس عظیم ذمہ داری کی حقیقت اور اس کے مقصد پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس کو انجام دینے والوں میں اخلاص و تواضع اور بے نفسی وغیرہ صفات کا وجود اشد ضروری ہے ۔ اس باب میں ہر داعی کی یہ کوشش ہونی چاہیے کہ وہ داعی اول (ص) کی زندگی سے کسب فیض اور آپ کے اسوۂ حسنہ کی مکمل پیروی کرے ۔ چنانچہ اس میں نہ تو کبھی ریا پیدا ہو نہ تعلی و تکبر کا شائبہ آئے ۔ نہ اپنے کارناموں کی اہمیت کا احساس ہو ۔ جو کچھ وہ کر رہا ہے اس کا سرچشمہ توفیق الٰہی کو سمجھے ۔ اور ہر لحظہ یہ یقین رکھے کہ جو کام باقی ہے وہ انجام پذیر ہو جانے والے کام سے بہت زیادہ ہے ۔ داعی کے ذہن میں جب یہ تصور زندہ رہے گا تو اسے دوسروں پر نظر کرنے کا موقع نہیں ملے گا ۔ اور اس طرح وہ دعوت کے میدان میں کبر و غرور اور دوسروں کی تصغیر و تحقیر کے مرض سے محفوظ رہے گا ۔

موجودہ دور میں دعوت کا المیہ یہ ہے کہ اس میدان میں کچھ لوگ مستقل طور پر دوسروں کے دعوتی کاموں کو اپنی تنقید کا ہدف بنائے ہوئے ہیں اور یہ کوشش کرتے ہیں کہ ان کے کارناموں کو نتائج یا منہج عمل کے اعتبار سے

بے سود ثابت کریں۔ معلوم نہیں ایسے لوگ اپنے کام کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور اپنے دعوتی اسلوب و انداز میں انھیں کوئی نقص یا غلطی نظر آتی ہے یا نہیں؟ اور پھر جو محکمۂ احتساب انھوں نے قائم کیا ہے اس کی کیا ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ ہم نے ابتک تو یہ سنا تھا کہ:

جوں جوں بلند ہم ہوئے پستی نظر پڑی

لیکن مذکور رجحان کے لوگ اپنی قدآوری کے زعم میں پستی کو صرف دوسروں کا نصیب تصور کرتے ہیں اور انھیں ہر شخص اپنے قد سے چھوٹا ہی نظر آتا ہے۔

دعوت و تبلیغ کی کوششوں کے جو نتائج آج سب کے نزدیک مسلّم ہیں اگر صرف انھی کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ پیش رو دعاۃ نے جو خدمات انجام دی ہیں وہ رد و قدح کے دائرہ سے بالاتر ہیں۔ آج جس آئینہ و زاویہ سے ہم ان کی خدمات کو دیکھ رہے ہیں، یا جس پیمانہ سے ان کے کارناموں کو ناپ رہے ہیں، معلوم نہیں اس دور میں ان کی کیا حقیقت رہی ہو گی۔ کسی کی غلطی و صحت اور کامیابی و ناکامی کا فیصلہ اس کے دور کے احوال و متعلقات سے الگ ہو کر کرنا قرین انصاف نہیں، یہ بڑا نازک مسئلہ ہے۔ خصوصاً کسی ایسے آدمی کے لیے جو اسلامی دعوت اور مسلمانوں کی خدمت کا مدعی ہو۔

دعوتی موضوعات پر موجودہ دور میں اردو میں جو لوگ لکھ رہے ہیں ان میں ایک نام مولانا وحیدالدین خاں صاحب کا ہے۔ موصوف کے صاحبزادے نے بعض کتابوں کا عربی میں ترجمہ کیا ہے جن سے بلادِ عربیہ میں بھی مولانا کو شہرت حاصل ہو گئی ہے۔

اپنے ماہوار پرچہ "الرسالہ" میں مولانا "خواطر" کی صورت میں صفحہ دو صفحہ کا جو انشائیہ پیش کرتے ہیں ان میں کبھی کبھی ایسی عبارتیں، جملے، اور خیالات آجاتے ہیں جن کی افادیت دعوت کے لیے واضح نہیں ہوتیں، حالانکہ مولانا موصوف دعوت کا جس قدر نام لیتے ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان کا پرچہ اس طرح کی تحریروں سے خالی ہو۔

پیشرو دعاۃ کی خدمات اور کارناموں کا مقام و مرتبہ مولانا اپنے نقطۂ نظر سے متعین فرماتے ہیں، لیکن اسے پیش اس طرح کرتے ہیں کہ گویا ایک مسلّمہ ہے، جس میں دو رائے ہونے کا سوال نہیں۔ اپنے نقطۂ نظر کے اظہار میں "یقیناً" ہر انسان کو آزادی ہے، لیکن یہ سوچنا بھی ضروری ہے کہ اس سے دوسرے لوگ کس حد تک متفق ہوں گے۔ اور

واقعات و حقائق کا اس کے بارے میں کیا فیصلہ ہوگا؟

مذکورہ انشائیوں میں جن اسلامی شخصیات پر مولانا نے رائے زنی کی ہے، ان میں پرانے علماء بھی ہیں اور نئے بھی، قدیم علماء میں امام ابن حنبل اور امام ابن تیمیہ اور جدید میں مولانا شبلی اور مولانا ابوالکلام وغیرہ کے نام آئے ہیں۔ امت کا کوئی فرد یقیناً یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ بزرگ معصوم عن الخطاء تھے یا ان کے منہجِ فکر و عمل پر تنقید کی گنجائش نہیں، لیکن یہ ضرور تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایسی شخصیتوں پر رائے زنی کا ایک انداز و اسلوب ہوتا ہے اور ان کے کارناموں کو کسی مخصوص پیمانہ سے ناپتے ہوئے ذہن میں یہ رکھنا ضروری ہے کہ اسی پیمانہ سے جب ہمارے کام کو ناپا جائے گا تو اس کی کیا قدر و قیمت متعین ہوگی۔؟

- خلق قرآن کے مسئلہ میں امام ابن حنبل نے جس ایمانی بصیرت اور استقلال و پامردی کا ثبوت دیا وہ مولانا کی نظر میں اہمیت نہیں رکھتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ نہ یہ مسئلہ اس اصرار کا مستحق تھا نہ اس وقت اس کی ضرورت تھی

یہاں وہی پیمانہ والی بات صادق آتی ہے، کیونکہ اولاً تو مذکورہ مسئلہ عقائد کے مسائل سے تعلق رکھتا ہے ثانیاً اس مسئلہ کا ایک پس منظر تھا، جن لوگوں نے سے کھڑا کیا تھا ان کے کچھ رجحانات و مقاصد تھے اور پھر ان کے دعوے کو کتاب و سنت کی دلیل کے بغیر تسلیم کر لینے کے کچھ یقینی اثرات تھے جن کو اگر آج ہم محسوس نہ کر سکیں تو یہ مطلب نہیں کہ اس دور کے اہلِ حق بھی انھیں محسوس نہیں کرتے تھے اور شریعت میں ان کو اہمیت نہ تھی۔ عقلیت اور تفلسف کی رو میں اقتدار کے سہارے جو بات جس طرح چاہی جائے منوالی جائے تو پھر شریعت کی بالادستی اور اس کے احکام کی پیروی کا کیا مطلب ہوگا؟ ایک داعی و امام جب بصیرت سے کوئی کام انجام دیتا ہے۔ اس کام کے فوائد اور اس کی اہمیت کے ادراک کے لیے بھی یقیناً اسی درجے کی بصیرت کی ضرورت ہے۔ شرعی مسائل کی اہمیت و حکمت کے سلسلہ میں اگر لوگوں کی ذاتی رائے اور انفرادی نقطۂ نظر کو معیار بنا دیا جائے تو معلوم نہیں بات کہاں سے کہاں پہنچ جائے گی۔ اور احکام شریعت کے سلسلہ میں لوگ کیسی کیسی بوالعجبیوں کا اظہار کرنے لگیں گے۔ تحکم و تخبط کے منافذ کو بند کرنے کے لیے کتنا معنی خیز و دور رس ہے وہ جملہ جو امام ابن حنبل نے اس آزمائش کے موقع پر ادا فرمایا تھا۔

"ایتونی بشیئ من کتاب اللّٰہ او سنۃ رسولہ حتی اقول بہ" یعنی خلق قرآن کے ثبوت میں اگر کتاب و سنت سے کوئی دلیل پیش کر سکو تو میں تمھاری ہمنوائی کے لیے تیار ہوں۔

- اسلامی تاریخ میں امام ابن تیمیہؒ کی اہمیت سب پر روشن ہے، انھوں نے اسلامی شریعت کے دفاع اور

اس کی نشر و اشاعت کے باب میں جو کارنامہ انجام ہے وہ کئی نسلوں کے کام کے برابر بلکہ اس سے افضل ہے ان کی خدمات کی تاثیر کا یہ عالم ہے کہ جو لوگ ان کی تحریروں کو پڑھنے کی توفیق پا جاتے ہیں، ان کو حق و باطل کے مابین تمیز کا سلیقہ آ جاتا ہے اور ان کی زندگی میں انقلاب پیدا ہو جاتا ہے۔ ابن تیمیہ کی کوششوں کا رخ کسی ایک جانب نہ تھا، بلکہ انھوں نے ایک طرف یہود و نصاریٰ اور دیگر باطل نظریات و مذاہب کی تلبیسات و تحریفات کا پردہ چاک کیا تو دوسری طرف اسلام کے اندر پیدا ہونے والے گمراہ فرقوں کا قدم بقدم جائزہ لیا اور ان کی ہوا پرستی و کجروی کے اسباب و نتائج پر اس طرح روشنی ڈالی کہ شیعہ متصوفین اور اہل بدعت و خرافات میں سے جن کو حق کی تلاش تھی ان کی اصلاح ہو گئی، اور جن کو اس کی توفیق نہ ہوئی وہ آج تک ابن تیمیہؒ کی تحریروں پر پیچ و تاب کھانے کے سوا کچھ اور نہ کر سکے۔

ابن تیمیہؒ صفحہ دو صفحہ میں کسی موضوع کو سرسری ذکر نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کے یہاں علم کا سمندر تھا جب کسی بھی موضوع پر قلم اٹھاتے تو پھر قرآن و حدیث کی تمام معلومات کو جو اس سے متعلق ہیں پیش کر کے نتیجہ بھی نکال کر قاری کے سامنے پیش کر دیتے تھے۔

اسلام کا یہ مرد مجاہد ہم لوگوں کی طرح کمروں میں بیٹھ کر تبلیغ دین کو کافی نہیں سمجھتا تھا، بلکہ اس کی زندگی میں ہمیں صریر کلک کے ساتھ ہی تلواروں کی جھنکار بھی سنائی دیتی ہے، ان کے ضمیر نے انھیں اجازت نہ دی کہ کہ صرف علمی جہاد پر اکتفا کریں اور اہل دنیا کے سامنے سرخرو بن جائیں۔ اس لیے وہ تلوار لے کر میدان میں نکلے اور تاتاریوں سے باقاعدہ جہاد کیا۔

اس دور میں ہم دعوت کا ٹوٹا پھوٹا کام انجام دیکر خوش ہوتے ہیں اور ہمیں اس کا یہ صلہ ملتا ہے کہ مختلف ممالک کی کانفرنسوں میں بلائے جاتے ہیں، نام کی تشہیر ہوتی ہے، محلات خرید لیے جاتے ہیں، لوگ خوشامدانہ جملے کہتے ہیں، بڑے بڑے القاب کیا ہے لکچروں کا اعلان ہوتا ہے، اس اعلان کے فوٹو ہم اپنے پرچوں میں شائع کر کے یہ تاثر دیتے ہیں کہ ہماری مقبولیت آسمان کو چھو رہی ہے۔

ان حالات میں ظاہر ہے کہ ہم اس انسان کی قیمت و مرتبہ کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں، جسے راہ حق میں ہر طرح کے اتہامات کا سامنا کرنا پڑا . . اربابِ اقتدار و عوام دونوں نے مخالفت کی حتیٰ کہ زنداں کی آہنی سلاخوں کے پیچھے زندگی کا ایک حصہ گزارنا پڑا۔

قلم اگر ہاتھ میں ہو تو انسان جس کی جیسی تصویر چاہے پیش کر دے، لیکن اگر خود ابن تیمیہ سے ان کی خدمات اور راہِ حق کی قربانیوں کا حال سنا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان کی زندگی کے صحیح خدوخال کیا ہیں۔؟

مولانا وحید الدین خاں نے ابن تیمیہ پر لکھتے ہوئے ان کے تمام کارناموں اور قربانیوں کو نظر انداز کر کے مختصر طور پر کچھ ایسے جملے کہے ہیں جن سے ان کی باکمال و قدآور شخصیت کی صحیح ترجمانی نہیں ہوتی بلکہ ان کے سارے کارناموں پر پانی پھر جاتا ہے۔ ہمیں اس پر اصرار نہیں کہ ہر ایک شخص ابن تیمیہ کا قائل و مداح بن جائے لیکن یہ بھی گوارا نہیں کہ معروضیت و موضوعیت کے مدعیان اس طرح کی شخصیتوں کے بارے میں کوئی ایسا تاثر دیں جس سے تنقیص و استخفاف کی بو آتی ہو۔

عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ انسان اپنے مقصد کے لیے غلط کار افراد، جماعت یا حکومت کا ساتھ دیتا ہے اور اس کی ہمنوائی و تائید کرتا ہے اور جب اس رویہ پر گرفت ہوتی ہے تو تاویل کر کے اپنے موقف کی تصویب کر دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا اس طرح کی تاویل ان ائمہ دین و بزرگانِ دین کے کاموں کی نہیں کی جا سکتی جنھوں نے دعوت کی خدمت بہر صورت تم سے اچھے انداز اور زیادہ بے نفسی کے ساتھ کی ہے اور مصلحت پرستی سے ان کا دامن بہر صورت پاک ہے۔

انسان دعوت کے میدان میں اُترتے ہی دوسروں سے اعتراف و پذیرائی کا مطالبہ کرتا ہے اور اس میں کچھ دیر ہوتی ہے تو طرح طرح کے وسائل اختیار کر کے اپنے کام کی اہمیت و عظمت کا اظہار کرتا ہے۔ لوگوں کے جملے اور تاثرات نقل کرتا ہے اور ہر سطر میں یہ دکھاتا ہے کہ فلاں نے ہمیں اس طرح داد دی اور فلاں نے اس طرح پذیرائی کی۔

مگر ایک داعی کو غور کرنا چاہیے کہ کیا انبیاء کرام کا یہی طریقہ تھا، کیا وہ بھی اپنی دعوت سے اسی طرح کی توقع رکھتے تھے اور کیا ان کی نظر میں بھی سابقہ کوششوں کا وہی مقام تھا اور ان کے اسوہ میں اپنی خدمات کے اظہار کا بھی کوئی پہلو ملتا ہے؟

ہر داعی کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس کو ٹٹولے اور کرید کر دیکھنے کی کوشش کرے کہ نفس کے خفیہ گوشوں میں غرور و تکبر اور ظاہر داری و ریاکاری کے جراثیم تو لپٹے نہیں ہیں، کیونکہ اگر ایسا ہوگا تو پھر اس کی نظر اپنے کام کے بجائے دوسروں کے کام پر لگی رہے گی اور اسے انھی کا نقص نظر آتا رہے گا۔

اب ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے، مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک مضمون کا اقتباس بحوالہ ذکرِ آزاد از مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی پیش کرنے کے بعد مولانا وحید الدین خاں رقمطراز ہیں:

"مولانا ابوالکلام آزاد نے ٹیگور اور چٹرجی جیسے لوگوں پر تعجب کیا ہے، حالانکہ اصل تعجب کے قابل خود مولانا آزاد اور ان کے جیسے دوسرے اکابر ہیں، جو آزادیٔ وطن اور قومی حکومت جیسے مقاصد کے لیے زندگی بھر سرگرم رہے۔ ان کی سمجھ میں یہ نہ آیا کہ اصل کام اسلام کے صحیح تعارف کا ہے نہ کہ آزادی اور قومیت کا جھنڈا بلند کرنے کا۔

آج کا انسان اس مذہب کی تلاش میں ہے جس میں انسان کو خدا نہ بنایا گیا ہو جس میں خدا کو خدا کی جگہ رکھا گیا ہو اور انسان کو انسان کی جگہ، مگر یہی وہ کام ہے جس کو مجاہدین اسلام میں سے کوئی بھی کرنے کے لیے نہیں اٹھتا۔

دنیا اگر خدا کے سچے دین سے بے خبر ہے تو سوال یہ ہے کہ اس صورتحال کی ذمہ داری ان لوگوں پر نہیں ہے جو بے خبر ہیں، بلکہ اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہے جو اس سے باخبر تھے مگر انھوں نے بے خبروں کو خبردار نہ کیا۔"

(الرسالہ مئی ۱۹۸۴ء ص ۴۰)

اس تحریر میں بھی وہی ذہنیت نمایاں ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، مولانا آزاد کی طول طویل دعوتی، اصلاحی، علمی، اور صحافتی زندگی میں مولانا وحیدالدین کو اپنا ریمارک چسپاں کرنے کے لیے یہی ایک تحریر نظر آئی جسے ذکر کر کے انھوں نے اپنی چٹکلہ نما تعلیق ثبت کر دی۔ مولانا نے الرسالہ میں ایک صفحہ ایک مضمون والا اسلوب شاید اسی لیے اختیار کیا ہے کہ کوئی اقتباس پیش کرنے کے بعد تجریح و تنقیص کے دو چار جملے کہتے کہتے صفحہ ختم ہو جائیگا اور پھر موضوع کے کسی اور پہلو پر کچھ اور کہنے کے لیے جگہ باقی نہ رہے گی۔

جب مولانا کی زد سے ابن حنبل، ابن تیمیہ اور شبلی جیسے ائمہ و علماء نہ بچ سکے تو یقیناً ابوالکلام کے بچنے کا سوال نہیں۔ لیکن افسوس و حیرت اس پر ہے کہ مولانا آزاد نے جس بات کا تذکرہ کیا ہے وہ اپنی جگہ بالکل صحیح اور ہر شخص کے لیے قابل توجہ ہے کیونکہ جو لوگ بھی اسلام پر کچھ لکھتے ہیں ان کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے اصول و مبادی کے جاننے کے بعد کہیں، کسی ابوالکلام کے دعوت پہنچا لینے یا نہ پہنچانے سے اس میں کچھ فرق نہیں پڑتا، مولانا وحیدالدین اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام سے متعلق "تیر تکے" چلانے کا جو اصل محرک ہے وہ دعوت کی راہ کی کوتاہی نہیں بلکہ عناد و حسد کی وہ ذہنیت ہے جس کا شکار ہر دور میں انسانوں کا ایک طبقہ رہتا ہے، کیا مولانا

بتا سکتے ہیں کہ انبیاء کرام جو دعوت و تبلیغ کے لیے وقف ہو کر آئے تھے اور ہر فرد تک اخلاص و للّٰہیت کے ساتھ دعوت پہنچاتے تھے، ان کے دور میں دین حق کے سلسلے میں اس طرح کی بے سروپا باتیں اڑانے والے نہیں تھے۔ معلوم نہیں رجماً بالغیب اسلام کے خلاف بولنے والے سے مولانا کو کیوں ہمدردی ہے اور علماء اسلام سے سوء ظن؟ اب خود مولانا دعوت کے میدان میں آئے ہیں، ہمیں اس وقت کا انتظار ہے جب ان کی مخلصانہ کوششوں اور دوراندیشیوں سے دعوت کا ایسا کام ہوگا کہ اسلام سے متعلق ہر طرح کی جہالتوں، عصبیتوں اور الزام تراشیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور تمام لوگ اسلام کی حقانیت کا کلمہ پڑھنے لگیں گے۔

مولانا ابوالکلام نے سیاست، آزادی، اور قومی حکومت کے چکروں میں وقت ضائع کرنے کے باوجود جو خدمت انجام دی، جس طرح ان کی علمی خدمات سے ذہن و فکر کے دریچے کھلے۔ جمود و تقلید اور شرک و بدعت کے بڑھتے ہوئے رجحان کی حوصلہ شکنی ہوئی اس کا اعتراف اگر کوئی نہ کرے تو اس سے ان خدمات کی اہمیت پر حرف نہیں آسکتا۔ یقیناً ایسے متعدد گوشے نظر آسکتے ہیں جن پر ہمارے خیال میں مولانا آزاد کو توجہ دینی چاہیے تھی، لیکن اگر انھوں نے توجہ نہ دی تو اس کے اسباب کیا تھے، ہم نہیں بتا سکتے۔ کوئی ان کی زندگی میں اس طرح کے کسی مسئلہ کی جانب ان کو توجہ دلاتا تو یقیناً وہ جواب دیتے اور اپنے موقف کی توجیہہ کرتے، لیکن ان کے بعد اس طرح کے سوال یا مشورے سے کیا فائدہ؟ اب تو ہر فکر ہونی چاہیے کہ ہمارے بعد بھی کہیں کوئی دفتر احتساب لے کر نہ کھڑا ہو جائے اور ہماری کوتاہیوں پر فرد جرم عائد کرنے لگے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سوچنا اور جاننا چاہیے کہ زندگی ہی میں لوگ ہمیں کیا کہتے اور ہمارے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

پچھلے اقتباس کے دوسرے پیراگراف میں وحیدالدین خاں کے اس جملہ کو پھر پڑھیے، "مگر یہی وہ کام ہے جس کو مجاہدین اسلام میں سے کوئی بھی کرنے کے لیے نہیں اٹھتا۔"

مولانا آزاد سے متعلق گفتگو کے دوران اس جملے کے استعمال کا یہ تقاضا ہے کہ اس سے ان کی طرف بھی اشارہ ہے لیکن ہم نہیں سمجھ سکتے کہ خود ابوالکلام نے اپنے آپ کو مجاہد اسلام کہا یا ان کے معتقدین نے، کہ مولانا کو یہ درد پیدا ہوا اور انھوں نے طنز سے بھرا ہوا یہ جملہ استعمال کر ڈالا۔

"مجاہدین اسلام" کی تعبیر میں کھلا ہوا طنز ہے۔ معلوم نہیں مولانا اس سے کن مجاہدین کو مراد لے رہے ہیں چونکہ ذکر کوتاہیوں کے شمار کا ہے، اس لیے شاید اس سے مولانا کے علاوہ بھی علماء اسلام مراد ہوں گے۔ کیونکہ

دامن پر نقص و قصور کے دھبوں کے سوا اور کیا ہے ؟

مولانا اگر آنکھیں کھول کر دیکھیں تو ان کو نظر آئے گا کہ جن بزرگوں پر وہ "مجاہدین اسلام" کی اصطلاح چسپاں کرتے ہیں، انھوں نے جس طرح انسان کو خدا نہ بنانے والے مذہب کا تعارف کرایا ہے، ابھی مولانا کے کارنامے بہمہ ادعا و دعوت ابھی اس کی گرد کو نہیں پہنچ سکے ہیں۔ حیرت ہے کہ دعوت کے میدان میں اترنے کے بعد انسان میں اس قدر ادعا باقی رہتا ہے اور وہ خود کو دوسروں سے اس طرح برتر و اعلیٰ گردانتا ہے۔

اس بوالعجبی یا ستم ظریفی پر بھی حیرت ہوتی ہے کہ جو جماعتیں اس بات پر توجہ دیتی ہیں کہ انسان کو خدا نہ بنایا جائے بلکہ خدا کو خدا کی جگہ اور انسان کو انسان کی جگہ رکھا جائے، ان پر اس دور کے اثبات و موضوعیت پرست اپنی ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ دعوت کا کامیاب اسلوب نہیں، لیکن جب لوگوں پر اپنی کارکردگی کا سکہ بٹھانا ہوتا ہے اور دوسروں کے کام کی تنقیص مقصود ہوتی ہے تو انسان کو خدا بنانے کی تردید کی بات کرتے ہیں۔

پیچھے دین سے دنیا کی بے خبری کی ذمہ داری مولانا وحید الدین نے دین سے باخبر لوگوں پر ڈالی ہے ذمہ دار کون ہے اور کس قدر، یہ تو بعد کا سوال ہے، یہاں تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ دنیا کی بے خبری کی بات جس زور و شور سے کہی جا رہی ہے اور واقعہ بھی ویسا ہی ہے یا اس تصویر کشی کے پیچھے کوئی اور مقصد پوشیدہ ہے۔ عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ کسی مسئلہ کی سنگینی کا اظہار کر کے انسان دوسروں کو متاثر کرتا اور ان کی توجہ مبذول کرا لیا جاتا ہے اصل واقعہ کیا ہے اور اس سے نمٹنے کے لیے کس کی کوشش کتنی مفید ہے، اس کا سوال نظروں کے سامنے نہیں آتا۔

دین اسلام سے دوسروں کو باخبر کرنے کی بات نکلی تو یہ عرض بھی کرنا ضروری ہے کہ تقسیم ہند سے پہلے اور اس کے بعد بھی ہمیں متعدد ایسی کتابیں نظر آتی ہیں جن میں اسلام کا مثبت تعارف کرایا گیا ہے۔ ان کتابوں کے مصنفین نے غیر مسلم افراد کو ذہن میں رکھ کر اسلام کا تعارف کرایا ہے اور دین برحق کے ان پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے جن میں دوسروں کے لیے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ ان میں سے کچھ کتابیں عربی و اردو کے علاوہ ملک کی دوسری زبانوں میں بھی لکھی گئی ہیں۔

اس موقع پر ان مولفات کو بھی ذہن میں رکھنا ضروری ہے جو غیر مسلموں کے اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض کتابیں اپنے موضوع پر حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہیں، اور عوام پر ان کا اثر بھی

انتہائی خوشگوار ہوا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ جب انسان اپنے ذہن میں کوئی مفروضہ قائم کر کے معاملات و مسائل پر نظر ڈالتا ہے تو پھر ساری چیزیں اس کو اسی رنگ میں نظر آتی ہیں، لہٰذا وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ ہمارا خیال دنیا کا خیال اور ہمارا نقطۂ نظر دنیا کا نقطۂ نظر ہے، لیکن یہ خود فریبی ہے اس سے تمام دعاۃ کا پرہیز کرنا ضروری ہے۔

ہوس سینے میں چھپ چھپ کر بنا لیتی ہے تصویریں

مولانا آزاد نے وطن کی آزادی اور قومی حکومت کے قیام کے لیے عمر کھپا دی، اس کا مولانا وحیدالدین خاں کو بہت غم ہے، لیکن اس کی وجہ سمجھنے کے لیے انھوں نے اگر خود اپنی زندگی کے سفر اور اس میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور نشیب و فراز کو ذہن میں رکھا ہوتا تو مولانا آزاد کے رویہ کا جواز مل گیا ہوتا۔

مولانا کتنی سادہ لوحی سے فرماتے ہیں کہ: "ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اصل کام اسلام کے تعارف .... کا ہے نہ کہ آزادی اور قومیت کا جھنڈا بلند کرنے کا۔"

کام تو اسلام کے تعارف کا ہے، اسے تو ہم بھی مانتے ہیں، لیکن اس کی کیا دلیل کہ یہ بات مولانا آزاد کی سمجھ میں نہ آسکی؟ اس طرح کا جملہ یقیناً اسی آدمی کے قلم سے نکل سکتا ہے جو اپنی برتری و بالغ نظری سے غیر معمولی حد تک مطمئن ہو اور اپنے پیشروؤں کو بنظر استخفاف دیکھنے کا عادی بن چکا ہو۔ مولانا صحافت و تالیف دونوں میدانوں میں کام کے مدعی ہیں انھیں مذکورہ تاثر دینے سے پہلے سوچ لینا ضروری تھا کہ مولانا آزاد کی صحافت کا کیا مقام اور ان کے پرچوں اور مولفات کو کس قدر قبولیت ملی تھی؟ یہ سب معروف باتیں ہیں اور ان کا چرچا اکثر لوگوں کی زبانی ہوتا رہتا ہے لیکن افسوس ہے کہ مولانا کے بقول، ابوالکلام کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ اصل کام کیا ہے۔

ابوالکلام اس دنیا سے جا چکے ہیں، ان کے کام کا وزن مولانا کو یا کسی دوسرے کو محسوس نہ ہو تو یہ ان کے لیے مضر نہیں، اب ان کا فیصلہ خدا کے ہاتھ میں ہے، وہ جس حال میں چاہے انھیں رکھے۔ یہاں جو لوگ ان کے کام کو بے وقعت اور ان کی سمجھ کو ناقص تصور کر رہے ہیں اپنے ظرف کے مطابق بات کر رہے ہیں۔ اگر نیت میں اخلاص ہوتا تو اس طرح ایک مرے ہوئے انسان پر اظہار خیال نہ کیا جاتا اور خود اس خلا کو پُر کرنے کی کوشش کی جاتی جو ابوالکلام آزاد اور دیگر علمائے اسلام کی تعمیر سے پیدا ہو گیا ہے۔

•••

اسلامی تہذیب میں فن تعمیر

محمد مسعود عالم قاسمی
ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ۔

قومیں اپنی تہذیبی اور تمدنی اوضاع و اقدار کا اظہار مختلف شکلوں میں کرتی ہیں۔ فن تعمیر کو اس طریقہ اظہار کی موزوں بلکہ اہم ترین شکل قرار دیا جاتا ہے۔ بعض قومیں ایسی بھی گزری ہیں جن کی تہذیب و تمدن کی عظمت کا راز اونچے محلات بلند و بالا برجیوں اور مزین محرابوں سے وابستہ رہا ہے، عہد رفتہ کے تحریری دور میں ہم ان قوموں کی داستان انتہائی حیرت و استعجاب سے پڑھتے ہیں جو پہاڑوں کی چوٹیوں کو کاٹ کاٹ کر بام و قصور تعمیر کرتی تھیں اور پتھروں کو تراش تراش کر خوشنما محلات بناتی تھیں، ان کی باقیات آج بھی کہیں کہیں پائی جاتی ہیں جو اپنے صناعوں کے تمدن کی عظمت رفتہ کا ثبوت فراہم کرتی ہیں۔ ارشادِ باری ہے:

تَتَّخِذُونَ مِن سُهُولِهَا قُصُورًا وَتَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا۔ (الاعراف ۷۴)

تم اس کے ہموار میدانوں میں عالیشان محل بناتے ہو اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو

غالباً اسی لیے معیاری عمارتوں کو تہذیب و تمدن کی علامت کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں کے تعمیری کارنامے بھی اپنی گوناگوں خصوصیات کی بنا پر قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اپنے ایام عروج میں جو تعمیری کارنامے انجام دیئے ان میں سے بیشتر کے نام و نشان بھی مٹ چکے ہیں یا مٹائے جا چکے ہیں تاہم کچھ ایسے آثار بھی ہیں جو زمانے کی دست برد سے محفوظ رہ گئے ہیں۔ صدر اسلام کی بیشتر عمارات کے متعلق اب ہم صرف تاریخ کی کتابوں ہی میں تھوڑا بہت پڑھ لیتے ہیں، جن کے سلسلے میں نہ کوئی تحقیق ہوئی اور نہ ان کی قیمتی

حیثیتوں کا تجزیہ کیا گیا۔ بقول سرجی یوکے "افسوس ہے کہ اس وقت کوئی نام تحقیق ان عمارات کی جو عربوں نے شام و عراق، ایران اور نیز ہندوستان میں اپنی حکومت کے مختلف زمانوں میں بنائی ہیں، نہیں ہوئی ہے۔ ان میں یقیناً وہ باتیں ہوں گی جن کا ٹھیک معلوم کرنا نہایت مفید ہے۔"[1]

بعد کے ادوار کی جو عمارات اپنی اصلی حالت میں باقی ہیں ان پر بھی ایک عرصہ گزر جانے کے باوجود ان کی شان و شوکت، وقار اور حکمت و صناعی نمایاں ہے۔ یہاں موقع نہیں کہ ان عمارات کی فنی خوبیوں پر مختلف پہلوؤں سے گفتگو کی جائے[2] مقصود صرف اسلامی تہذیب میں ان کے مقام و مرتبے کا تعین ہے۔

مسلمانوں کے فن تعمیر کی داستان اقصائے عالم کے طول و عرض سے تعلق رکھتی ہے۔ جہاں جہاں مسلمان گئے وہاں اپنے ساتھ عظیم تہذیبی قوت لے کر گئے اور جہاں سے ان کو گردشِ ایام نے واپس کیا وہاں انھوں نے زبردست تہذیبی اثرات چھوڑے۔ شام، عراق، ایران، مصر، اندلس، ماوراء النہر، ہندوستان اور ان جیسے دوسرے ممالک میں ان کے جو حیرت انگیز تعمیری کارنامے ہیں ان کے متعلق ایک رائے تو یہ ہو سکتی ہے کہ ان میں مسلمانوں کا اپنا کوئی Contribution نہیں ہے بلکہ وہاں کے موجودہ معیار تمدن کی وہ آئینہ دار ہیں۔ دوسری رائے یہ ہو سکتی ہے کہ وہ سب کے سب اسلامی فن تعمیر کا نمونہ ہیں۔ مگر دونوں رائیں معتدل نہیں کہی جا سکتیں۔ کیوں کہ تاریخ ان دونوں کی نفی کر دیتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ طلوع اسلام سے پہلے حجاز و عرب میں فن عمارۃ کو رواج حاصل نہ تھا۔ نہ تو وہاں کے لوگ غرفات اور محلات میں رہنے کے عادی تھے، اور نہ ایسی کسی عمارت کا سراغ ملتا ہے جو فن تعمیر کا نمونہ ہو۔ اس کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو حجاز و عرب کی جغرافیائی حالت جو ریگستان پر مشتمل ہے۔ جو اس کے لیے سازگار نہ تھی دوسرے وہاں کے باشندوں کا مزاج بھی اس سے کچھ ہم آہنگ نہ تھا، ان کی بدویت یعنی تمدنی بدحالی اور خانہ بدوشی جن میں ان کی زندگی محصور تھی اس سے میل نہ کھاتی تھی۔ رہا عرب کا وہ علاقہ جو حیرہ اور یمن وغیرہ پر مشتمل تھا۔ تو وہاں ایسی عمارات اور دیگر تمدنی ترقی کا ضرور پتہ چلتا ہے۔ مگر اس کی وجہ ان کا متمدن علاقوں کے پہلو میں واقع ہونا ہے۔ اسلام کے ابتدائی ایام میں بھی ایسی عمارتوں کا پتہ نہیں چلتا جن کو بطور مثال پیش کیا جا سکے۔ جہاں تک مسجد نبوی اور مسجد قبا وغیرہ کا تعلق ہے ہم ان میں بھی کوئی فنی خصوصیت

---

[1] تمدن عرب ص ۵۶۵ گستاؤلی بان [2] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو العمارۃ فی صدر الاسلام اور العمارۃ فی الاسلام، کمال الدین سامح۔

نہیں پاتے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ مسجد نبوی عہد رسالت میں کچی اینٹ سے بنائی گئی تھی، جس کی چھت کھجور کے پتوں اور ستون کھجور کے درخت کے تھے۔ ابوبکرؓ نے اس میں کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ علیٰ حالہ رہنے دیا۔ عمر فاروقؓ نے اضافہ تو کیا مگر سابقہ بنیاد پر بنایا اور وہی کچی اینٹ کی دیوار، برگ کھجور کی چھت صرف ستون لکڑی کے دیئے۔ پھر حضرت عثمانؓ نے اس میں کافی اضافہ کیا، دیوار منقش پتھر اور سمنٹ (گچ) سے، ستون بھی منقش پتھروں کے اور چھت ساج کی لکڑیوں کی تیار ہوئی۔ [1] اموی دور حکومت میں عمر بن عبدالعزیزؒ کے زیر نگرانی ۸۸ھ میں اس کی تعمیر جدید ہوئی، جس کے معمار روم سے بلائے گئے، اس وقت عمر بن عبدالعزیزؒ مدینہ منورہ کے گورنر تھے۔ [2]

پروفیسر کمال الدین سامح لکھتے ہیں:

لم یکن فی بلاد العرب قبل الاسلام اسالیب فنیة اصلیة وکل ما کان فیها من فنون انما نقل من المدنیات المجاورة فقد کانت هناك فی بلاد العرب الجنوبیة قصور کما وجدت قصور اخری فی بادیة الشام بین الاملاك البزنطینیة وبین الحجاز ونجد وکان هناك فن نبطی فی شمال شرقی فی شبه جزیرة سیناء وبخاصة فی مدینة البتراء وهی المدینة المنحوتة فی الصخر بین العقبة وبین معان [3]

اسلام سے پہلے ممالک عرب میں کوئی اور یجنل فنی اسلوب نہ تھا، وہاں جو بھی فنون تھے وہ پڑوسی تمدنوں سے ماخوذ تھے۔ عرب کے جنوبی شہروں میں محلات تھے اسی طرح بازنطینی ممالک اور حجاز و نجد کے درمیان وادیٔ شام میں کچھ اور محلات تھے۔ عرب کے شمال مشرق میں جزیرہ نمائے سینا میں اور خاص کر شہر پیٹرا میں فن نبطی کا رواج تھا یہ شہر عقبہ اور معان کے درمیان پہاڑ کو تراش کر بنایا گیا تھا۔

اسلامی فن تعمیر کی شروعات اس وقت سے ہوتی ہے جب مسلمان حجاز سے نکل کر دوسرے ممالک میں داخل ہوئے یہ (ساتویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے)۔ تیرہویں اور چودھویں صدی عیسوی میں یہ فن اپنے عروج کو پہنچا۔ اٹھارہویں صدی عیسوی میں اس پر زوال آیا۔ یہ وہ وقت تھا جبکہ مغربی فن تعمیر اپنا جگہ بنا رہا تھا۔

اسلامی فن تعمیر کے اصلاً تین سرچشمے تسلیم کیے گئے ہیں۔

۱۔ مشرقی مسیحی فن تعمیر، جس کا مرکز سوریا (شام) تھا

۲۔ ساسانی طرز تعمیر جس کا مرکز عراق اور ایران تھا۔

---

[1] بخاری باب بنیان المساجد۔ [2] جذب القلوب باب ہم۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی [3] العمارۃ فی صدر الاسلام ص ۳

۳۔ قبلی اسلوب عمارت جس کا مرکز مصر تھا

مسلمانوں نے انھی تین اسلوبوں میں اس طرزِ عمارت کا خاکہ تلاش کیا جو ان کی تعمیرات کے لیے موزوں ہو سکتا تھا، چنانچہ انھوں نے جس طرزِ تعمیر کو جنم دیا وہ اپنے سرچشموں سے تعلق رکھتے ہوئے بھی ان سے بہت حد تک مختلف تھا۔ بلکہ ایک نئے تصور کی نمائندگی کرتا تھا۔ اس کا سب سے اہم اور نمایاں مظہر مساجد تھیں جو مسلمانوں کی اولین مذہبی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو جہاں عارضی قیام کا بھی موقع ملا فوراً ہی ان کو مسجد بنانے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ ان مساجد میں انھوں نے پوری فراخی سے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ فلپ کے حتی نے لکھا ہے:

"عرب مسلمانوں میں آرٹ نے مذہبی فنِ تعمیر کو اظہار کا سب سے بڑا ذریعہ بنایا۔ مسلمان ماہرینِ تعمیرات یا ان کے مقرر کیے ہوئے ملازموں نے تعمیر کا ایک ایسا منصوبہ بنایا جو سادہ اور پروقار تھا۔ یہ برانے نمونوں پر مبنی تھا لیکن نئے دین کی روح کی نمایاں عکاسی کرتا تھا۔ بین النسلی اور بین الاقوامی رشتے میں اسلامی تہذیب کی ترقی کی تاریخ کا خلاصہ ملاحظہ کرنا ہو تو مسجد کو پیشِ نظر رکھیے۔" [1]

چنانچہ بعد کی مسجد نبوی، دمشق کی جامع مسجد، اندلس کی جامع قرطبہ، ترکی کی جامع مسجد، مصر کی جامع ازہر، لاہور کی بادشاہی مسجد، دلی کی جامع مسجد، ڈھاکہ کی ستارہ مسجد، ایران کی جامع مسجد وغیرہ اس کا بہترین نمونہ قرار دی گئی ہیں۔ مسجد کی تعمیر میں وسعت، نظافت، روشنی، سادگی، وقار، بلندی اور ایسے ہی محاسن کا لحاظ رکھا جاتا ہے۔ آپ مسجد کا مطالعہ دیگر قوموں کے معابد کے پس منظر میں کیجیے تو آپ دونوں میں نمایاں فرق محسوس کریں گے۔

غیر مسلموں کے معابد تنگ، تاریک اور پراسرار قسم کے ہوتے ہیں۔ مساجد میں جا کر یا ان کو دیکھ کر جو احساس جاگتا ہے وہ یہاں قطعاً نہیں رہے گا۔ جناب عبدالمجید سالک نے لکھا تھا "مندر میں جہاں دیوتا کی مورتی قائم کی جاتی ہے وہ ایک چھوٹا سا تاریک پراسرار کمرہ ہوتا ہے جس میں مورتی کے خط و خال دھندلے دکھائی دیتے ہیں اور پجاری ایک ایک کر کے اس کمرے میں داخل ہو کر آرتی اتارتے ہیں اور پوجا کرتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ مندروں کے اردگرد خاصی وسیع عمارتیں بنائی جاتی ہیں لیکن وہ معبد کا حصہ نہیں ہوتیں۔" [2]

علاوہ ازیں غیر مسلم اپنی عبادت گاہوں سے لے کر رہائشی مکانوں کو بھی انسان یا جانور کی مورتی اور بھدی تصویروں

---

[1] عربوں کا عروج و زوال۔

[2] مسلم ثقافت ص ۳۵۵

سے آراستہ کرتے ہیں جبکہ مسلمان ایسا نہیں کر سکتے ہیں۔ وہ سادہ ہلکی لطیف اور محرابی گلکاریوں کا استعمال کرتے ہیں۔ اہل کتاب کے معابد گو کہ مندروں سے مختلف ہوتے ہیں مگر مساجد کی شان ان میں بھی نہیں ہوتی۔ ان معابد میں حسن و آرائش کی زیادتی بے جا اسراف تکلفات کی بھرمار ان کی روحانی فضا کو مکدر کر دیتی ہے۔ ان میں داخل ہوتے ہی پہلا احساس یہ ہوتا ہے کہ شاید یہ خانۂ خدا نہیں جہاں ایک روحانی مریض شفایاب ہو بلکہ یہ کسی بادشاہ کا شبستان ہے یا کسی رئیس کا میوزیم۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مساجد کی تزئین و آرائش اور یہود کی اتباع سے شدت سے منع فرمایا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ:

ارا کم ستشرفون مساجدکم کما شرفت الیہود کنائسھا والنصاریٰ بیعھا۔[1]

مجھے لگتا ہے کہ تم لوگ بھی اپنی مسجدوں کو اس طرح مزین کرو گے جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنے اپنے معابد کو کیا ہے

مسجد کے اس مزاج نے پورے فن تعمیر کو متاثر کیا ہے تا آنکہ مسلمانوں کے رہائشی مکانات اور دوسری رفاہی عمارتوں میں بھی اس کا رنگ دیکھا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ مسلمانوں کی تعمیر کردہ عمارتیں ازاول تا آخر اسلامی تہذیب کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں۔ بلکہ کچھ امراء ایسے بھی ملیں گے جنھوں نے اپنی عمارتوں میں انسانوں اور جانوروں کی مورتیں بنوائیں جو اسلام کے مزاج کے منافی ہے اور بہت سے لوگ ایسے بھی ملیں گے جنھوں نے اس فن کا اظہار مقبرہ اور امام باڑہ وغیرہ بنانے میں کیا جن کی اجازت شرعاً نہیں ہے۔ یہ بات اگرچہ ہند و پاک کے مسلمانوں پر گراں گزرے گی مگر حق ہے کہ ممتاز محل کی آخری آرام گاہ تاج محل بھی اسی حکم میں ہے۔ تاج محل کی صناعی اور فنی خوبصورتی اس کو آٹھواں عجوبہ کیوں نہ بنا دے لیکن اسلامی نقطہ نظر سے اس کی ذرا بھی اہمیت نہیں۔ بلکہ بقول انور اعظمی مرحوم

عقل کچھ کہتی ہے دل کا اور ہی پیغام ہے
تاج بھی تو باعث رسوائی اسلام ہے!

بایں ہمہ اسلامی تہذیب میں بنیادی اہمیت محلات و قصور کی تعمیر کی نہیں بلکہ سیرت و کردار کی تعمیر کی ہے۔ پہلی شے انسان کی ضرورت ہے اور دوسری انسان کا مقصد زندگی۔ عمارات اسی وقت تک قابل قدر ہیں جب تک وہ تہذیب کے مبادی اور نصب العین سے جڑی ہوئی ہوں۔ یا کم از کم ان سے متصادم

---

[1] ابن ماجہ تشیید المساجد۔

نہ ہوں ۔ اگر یہی عمارتیں بنیادی مقاصد کے حصول میں حصار بن جائیں اور آدمی کی توجہ تعمیر سیرت سے ہٹ کر صرف مکانوں کی تعمیر پر مرکوز ہو جائے تو اسلامی تہذیب میں نہ صرف یہ کہ اس کی اہمیت گر جائے گی بلکہ مذموم قرار پائے گی ۔

اندلس کا نامور اموی خلیفہ عبدالرحمن ثالث ۳۵۰ھ سلاطین میں سے سب سے بڑا عالم اور آداب صنعت وحرفت کا ماہر اور سرپرست تھا۔ اس نے اندلس کا مشہور محل "قصر الزہراء" تعمیر کرایا، اس کی تعمیر اور استحکام، رنگ و روغن اور تزئین و آرائش میں اس کو اتنا انہماک ہو گیا کہ وہ کچھ دنوں تک جمعہ کی نماز میں نہ جا سکا اور ایک دن جب وہ گیا تو قاضی منذر بن سعید بلوطی نے جو قرطبہ میں امام تھے عبدالرحمن کی تنبیہ کے لیے ایک خطبہ دیا، جس کا آغاز قرآن کریم کی اس آیت سے کیا۔

اتبنون بکل ریع آیة تعبثون وتتخذون مصانع لعلکم تخلدون ۔ واذا بطشتم بطشتم جبارین ۔ فاتقوا اللہ واطیعون واتقوا الذی امدکم بما تعلمون ۔ امدکم باموال وبنین وجنت وعیون انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم ۔ [1] (کیا تم ہر اونچے مقام پر لاحاصل ایک یادگار عمارت بنا ڈالتے ہو اور بڑے بڑے قصر تعمیر کرتے ہو، گویا تمھیں ہمیشہ رہنا ہے اور جب کسی پر ہاتھ ڈالتے ہو تو جبار بن کر۔ پس تم لوگ اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو، ڈرو اس سے جس نے تمھیں وہ کچھ دیا ہے جو تم جانتے ہو، تمھیں جانور دیے، اولاد دی، باغ اور چشمے دیے، مجھے تمھارے بارے میں ایک بڑے دن کے عذاب کا ڈر ہے ۔)

اس کے بعد عمارتوں کی تزئین و آرائش اور اسراف مال کے لیے یہ آیت پڑھی ۔

افمن اسس بنیانہ علی تقوی من اللہ ورضوان خیر ام من اسس بنیانہ علی شفا جرف ھار فانہار بہ فی نار جھنم واللہ لا یھدی القوم الظلمین لا یزال بنیانھم الذی بنوا ریبة فی قلوبھم الا ان تقطع قلوبھم واللہ علیم حکیم ۔ [2] (کیا بہتر انسان وہ ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد خدا کے خوف اور اس کی رضامندی کی طلب پر رکھی ہو یا وہ جس نے اپنی عمارت ایک وادی کی کھوکھلی بے ثبات کگر پر اٹھائی اور وہ اسے لے کر ...... سیدھی جہنم میں جا گری ایسے ظالم لوگوں کو اللہ کبھی ہدایت نہیں دیتا ۔ یہ عمارت جو انھوں نے بنائی ہے، ہمیشہ ان کے دلوں میں بے یقینی

(باقی ص ۵۶ پر)

[1] الشعراء ۱۲۸-۱۳۵ ، [2] التوبہ ۱۰۹-۱۱۰

قسط اوّل

شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب نجدی

نواب صدیق حسنؒ اور مولانا حسین احمد مدنی کی نظر میں

مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی، جامعہ فیض عام مئو۔

مشہور حدیث ہے کہ: "اللہ تعالیٰ ہر صدی میں ایسے لوگوں کو بھیجتا رہے گا جو اس امت کے لیے اس کے دین کے کام کی تجدید کرتے رہیں گے۔"

انہی اصحاب دعوت و عزیمت مجددین اور پر خلوص مصلحین میں سے ایک تاریخ ساز اور عہد آفریں شخصیت عظیم مصلح و مجدد شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب نجدی رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔ وہ تاریخ کے ان چند گنے چنے نابغۂ روزگار افراد میں تھے جو انتہائی ذکی و فطین، قوی و جری، مخلص و غیور اور دین میں پہاڑ کی طرح سخت اور مضبوط اور عقیدۂ توحید کے اظہار و اعلان میں مومنانہ عزم و بصیرت اور استقامت کے مالک تھے۔

شیخ الاسلام کے مختصر حالات

شیخ الاسلام کی ولادت ۱۱۱۵ھ میں نجد (کے ایک گاؤں عیینہ) میں ہوئی اور ان کی نشو و نما اور تربیت بھی اسی صحرائے عرب میں ہوئی۔ تحصیل علم کے لیے مدینہ منورہ اور البصرہ تک سفر کیے۔ شیخ کی ولادت کے وقت یعنی ۱۲ ویں صدی ہجری کے آغاز میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ بہ ہو رہی تھی۔ دین کے ہر شعبہ میں نجد و عرب کے کلمہ گو انحطاط پذیر تھے اور ایک عرب ہی پر کیا موقوف ساری اسلامی دنیا شرک و بدعات کی دلدل میں پھنسی ہوئی تھی، کوئی سیاسی شعور باقی نہ رہا تھا، جہاں کچھ طاقت بھی تھی استبداد کا دار دورہ تھا، یہ حالات دیکھ کر شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب کے دل میں تڑپ پیدا ہوئی اور جوانی ہی میں اصلاح و تجدید شروع کر دی، اپنے گرد و نواح کے

مسلمانوں کو کتاب و سنت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا اور اس سلسلہ میں تکلیفیں نہیں، اپنے بوڑھے باپ کی خفگی برداشت کرنا پڑیں۔ اپنے آبائی وطن۔ عیینہ — سے نکلنے پر مجبور ہونا پڑا۔ آخر چند برسوں کے ابتلاء کے بعد درعیہ (نجد) کے امیر محمد بن سعود (م ۱۱۷۹ھ) کے ہاں پناہ ملی۔ امیر اور اس کے عزیز دعوت توحید کے سرگرم حامی بن گئے اور ان کی مدد اور معاونت سے شیخ الاسلام نے اور زور دوں پر تبلیغ شروع کر دی، تا آنکہ کامیابی ان کے قدم لینے لگی۔ شمع توحید کے پروانے اطراف و اکناف سے آ آ کر شیخ الاسلام کے حلقہ درس میں حاضر ہوتے اور پھر لوٹ کر اپنے اپنے علاقوں میں اللہ کا پیغام پہنچاتے۔ [۱]

آخر آپ کی دعوت و تبلیغ سے خاک عرب کے وہ ذرے جو جہل و شرک کی طغیانی کے باعث ماند پڑ گئے تھے، پھر چمک اٹھے اور نجد کے چمنستان سے توحید و کلمۂ حق کی ایسی خوشبو پھیلی جس نے تمام عالم کو زعفران زار بنا دیا......

اور جہاں تک اس مرد مجاہد کی آواز پہنچ سکتی تھی، اس نے حق و صداقت کا پیغام پہنچایا۔ [۱]

شیخ نے بانوے سال کی عمر پا کر ۱۲۰۶ھ میں وفات پائی۔

شیخ الاسلام کی دعوت

شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ دین کو اس کی اصل شکل میں دیکھنا چاہتے تھے، عقائد و اعمال ہر چیز میں وہ سلف صالحین کی اتباع کرتے تھے اور لوگوں کو اسی کی دعوت دیتے تھے، ان کی دعوت کا خلاصہ اگر بیان کیا جائے تو اس کے درج ذیل نقاط ہوں گے۔

- توحید، شیخ کی دعوت کی اصل بنیاد توحید اور لا الٰہ الا اللہ ہے۔ اللہ کے کلمہ کو بلند کرنا اور طاغوت کے کلمہ کو پست کرنا وہ اساس ہے جس پر آپ کی دعوت کی بنیاد تھی۔ آپ کا پیغام تھا کہ عبادت خواہ کسی قسم کی ہو کسی شکل میں ہو سب اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ اللہ کا نہ کوئی ذات میں شریک و سہیم ہے نہ صفات میں۔
- لوگوں کو پیر پرستی، قبہ پرستی، قبر پرستی، شجر پرستی وغیرہ ساری پرستیوں سے ہٹا کر صرف خدا پرستی پر لگانا آپ کا مشن تھا، غیر اللہ کے آگے جھکنا، قبروں اور ولیوں سے مدد مانگنا اور فریاد چاہنا، منتیں مرادیں مانگنا ان کے نام کی نذریں ماننا قسمیں کھانا، وغیرہ وغیرہ مشرکانہ اعمال تھے، جن کی بیخکنی کا شیخ نے بیڑا اٹھایا تھا۔

---

[۱] ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک (ص ۱۶، ۱۷) - محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح (ص ۱۱)

● بدعات کی بیخ کنی اور سنت کا احیاء یعنی زندگی کے تمام معاملات، عقائد و عبادات اور اخلاق سے لے کر معاشرت و معیشت اور سیاست و حکومت تک میں دین کے نام سے جو بے دینی گھس آئی تھی اسے اکھاڑ پھینکنا اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور شریعت اسلامی کو فکر و عمل دونوں میں جاری کرنا۔

● امر بالمعروف و نہی عن المنکر، یعنی ان تمام بھلائیوں کا حکم دینا جن کو اسلام بھلائی قرار دیتا ہے اور ان تمام برائیوں سے باز رکھنا جن کو اسلام برائی اور ممنوع قرار دیتا ہے۔

غرض شیخ کے پیش نظر اول اور آخر اسلام اور صرف اسلام تھا، وہ ہمہ پہلو دین کا احیاء اور تمام امور میں کتاب و سنت کا اتباع چاہتے تھے۔

چنانچہ (جیسا کہ ذکر کیا گیا) شیخ نے بدو شعور ہی سے ماحول کی تطہیر اور معاشرہ کی اصلاح کے لیے کوششیں شروع کر دیں اور حقیقت یہ ہے کہ ممدوح کی دعوت و عزیمت نے آخر ش اہل نجد و حجاز کی زندگی اور عقائد و اخلاق میں ایک غیر معمولی انقلاب برپا کیا۔ خوش قسمتی سے انھیں آل سعود جیسے اولوالعزم مجاہد اور فرمانروا ملے جنھوں نے شیخ کے مشن کی تکمیل میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔

دعوت کے اثرات: علامہ نواب والا جاہ صدیق حسن خان رحمۃ اللہ علیہ کے رفیق کار محدث و محقق حضرت مولانا بشیر صاحب سہسوانی رحمہ اللہ (متوفی ۱۳۲۶ھ) شیخ کی دعوت کے اثرات پر تبصرہ کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں۔

" اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعوت کے ذریعہ شرک کے شعائر و مقامات مٹا دیے، طاغوتوں اور ملحدوں کو روسیاہ کیا۔ یہاں تک کہ اللہ کا دین ظاہر و غالب ہوگیا۔ آپ کی دعوت سے شریعت اسلامی و سنت کی راہ واضح ہوگئی۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا نظم قائم ہوگیا، شرعی حدود نافذ اور دینی تعزیرات جاری ہوئیں، جہاد کا علم بلند ہوا۔ اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے اہل شرک و اہل فساد سے رزم آرائی ہوئی۔ یہاں تک کہ آپ کی دعوت پھیل گئی اور اللہ کے واسطے اور اس کے دین کے واسطے عام مسلمانوں اور ان کے ائمہ کے واسطے موصوف کی خیر خواہی ثابت ہوگئی، اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعہ ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا اور عداوتیں الفت سے بدل گئیں اور اللہ کے فضل سے لوگ بھائی بھائی ہوگئے۔"

(صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیخ دحلان ص ۲۳۴ طبع جدید)

سعودی حکومت: شیخ الاسلام کی دعوت اور آل سعود کی معاونت کا نتیجہ یہ ہوا کہ نجد کے اندر صحیح معنی میں ایک اسلامی ریاست قائم ہوگئی ..... اور اب نجد و حجاز کی موجودہ سعودی حکومت آل سعود کی اسی حکومت کی وارث و جانشین ہے۔ یہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ کو اسی طرح اپنا دینی رہنما اور امام سمجھتی ہے، جس طرح ان کے پیشرو سمجھتے تھے ..... اگرچہ آج دولت کی فراوانی اور مغربی ملکوں کے ساتھ تعلیم اور دوسرے روابط کے زہریلے جراثیم نے سعودی معاشرہ میں بہت ساری خرابیاں پیدا کردی ہیں، لیکن ان سب کے باوجود یہ امر واقعہ ہے کہ سعودی عرب ہی ایک ایسا ملک ہے جو ان بدعات و شرکیہ رسوم سے پاک ہے جن سے دنیا کا کوئی ملک محفوظ نہیں۔ اور اس دور میں روئے زمین پر صرف سعودی حکومت ہی ایک ایسی حکومت ہے جس میں صرف قرآن و حدیث کی فرمانروائی ہے اور شریعت سرکاری قانون ہے۔ یہ حکومت پوری دنیا میں اسلام کی دعوت و تبلیغ اور علوم دینیہ کی اشاعت و ترویج کا بیڑا اٹھائے ہوئے ہے اور "تعاونوا علی البر والتقوی" کے بمصداق دنیا بھر میں پھیلے ہوئے دینی اداروں اور اسلامی تحریکوں اور تنظیموں کی سرپرستی اور ہر ممکن مادی و معنوی مساعدت کو اپنا فرض سمجھتی ہے۔

شیخ کے خلاف پروپیگنڈہ: بہرحال شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمۃ اللہ علیہ کی دعوت کوئی نئی چیز نہیں تھی، وہ کتاب و سنت کی صحیح اور خالص تعلیم کے سوا کچھ پیش نہیں کرتے تھے۔ لیکن ذاتی مفاد اور سیاسی اغراض کے ماتحت مختلف اشخاص اور مختلف حکومتیں اور جماعتیں ہاتھ دھو کر آپ کے پیچھے پڑ گئیں اور آپ کی دعوت کو "وہابیت" کا نام دے کر اس طرح پیش کیا گیا، جیسے اسلام کے علاوہ کسی دوسرے مذہب کی دعوت دی جارہی ہے۔ سوء اتفاق سے اہل نجد، شیخ الاسلام اور آل سعود کو بدنام کرنے میں تین حکومتیں شریک ہوگئیں، ترکی اور مصری حکومتوں سے تو براہ راست ٹکر اٹھی اور جنگ و پیکار کا سلسلہ ایک عرصہ تک جاری رہا۔ حکومت برطانیہ سے بھی ایک دو جگہ خاصی ٹکر ہوگئی تھی، اس لیے وسط عرب میں ترقی اور تجدید کی لہر ان سب کے گلوں کی پھانس بن گئی تھی! اور وہ طبعاً اہل نجد کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ میں مصروف ہوگئے۔ ان کے علاوہ اشراف مکہ اور ان کے حواری "علماء سوء" اپنے نذرونیاز کی بندش پر الگ برہم تھے اور انھوں نے بھی شیخ الاسلام اور آل سعود کے خلاف زبردست پروپیگنڈہ مہم چلائی اور ان پر طرح طرح کے بے سروپا الزامات عائد کرکے عالم اسلام میں انھیں بدنام کرنے کی کوشش کی، ترکوں اور انگریزوں کا یہ

پروپیگنڈہ خالص سیاسی حیثیت رکھتا تھا مگر اہل حجاز نے اسے مذہبی رنگ دیدیا تھا تاکہ مشائخ اور خوش عقیدہ مسلمانوں کو شیخ کے خلاف آسانی سے مشتعل کیا جا سکے[1]

خود ہندوستان میں بھی شیخ اور ان کی جماعت کے خلاف بڑے پیمانے پر پروپیگنڈہ کیا گیا اور مولوی فضل رسول بدایونی (م ۱۲۹۷ھ) وغیرہ اہل بدعت نے افترا پردازیوں بہتان طرازیوں کا انبار لگادیا "وہابی" کا لفظ ہندوستان میں انہی حضرات نے رائج کیا اور اسے اتنا بدنام کیا کہ اہل بدعت آج بھی سلفیوں کے لیے لفظ "وہابی" کو ایک مغلظ گالی کے طور پر استعمال کرتے ہیں . . . . . بدقسمتی سے بعض ثقہ علمائے ہند۔ مثلاً مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (۱۳۷۷ھ/۱۹۵۷ء) وغیرہ کی تحریروں سے بھی اس پروپیگنڈہ کو بڑی تقویت ملی۔ مولانا حسین احمد مرحوم نے مولوی احمد رضا خاں بریلوی کے لگائے ہوئے الزام وہابیت سے اپنے اکابر کی برأت ثابت کرنے کے لیے اپنی مشہور "مدافعانہ" تالیف "الشہاب الثاقب" میں بقول معذرت کنندگان محض افواہوں اور مخالفین کی کتابوں پر اعتماد کرکے "بلا تحقیق" شیخ کی طرف وہ ساری خرافات منسوب کردیں جو ان کے دشمنوں نے اختراع کی تھیں اور ان ہی بنیاد پر شیخ کے خلاف "بہت بری رائے" ظاہر کی

اکابر دیوبند کی برأت میں مولانا نعمانی کی تصنیف :

مولانا مدنی وغیرہ کی وہ تحریریں جن میں شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی جماعت کے بارے میں بالکل خلاف واقعہ باتیں لکھی گئی ہیں اور بری رائے ظاہر کی گئی ہے اور شیخ کو بدعقیدہ اور فاسق وغیرہ کہا گیا ہے، ان تحریروں کے بارے میں محترم مولانا منظور نعمانی دامت برکاتہم کی خدمت میں ان کے کسی عزیز نے اپنا اشکال پیش کیا تھا اور لکھا تھا کہ، "دریافت طلب امر یہ ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی دعوت کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے؟ اگر آپ کے نزدیک وہ اہل حق میں سے ہیں تو پھر ان اکابر کی ان تحریروں کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، اور آپ کے نزدیک ان کی کیا بنیاد ہے؟ سائل نے یہ درخواست بھی کی تھی کہ وضاحت اور جواب "الفرقان" ہی میں تحریر فرمادیں، اس طرح فائدہ عمومی ہوگا اور وہ محفوظ بھی ہو جائے گا۔"

مولانائے محترم نے مذکورہ سوال کا جواب بسط و تفصیل سے تحریر فرمایا ہے، جو اولاً ماہنامہ "الفرقان"

---

[1] ماخوذ از ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک۔

لکھنؤ کی چار اشاعتوں میں شائع ہوا اور بعد میں اسے کتابی شکل دے کر "شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ اور علماء حق پر اس کے اثرات" کے نام سے شائع کیا گیا۔ گزشتہ دنوں ناچیز کو اس کتاب کے مطالعہ کا اتفاق ہوا اس میں حضرت مولانا نعمانی مدظلہ نے مولانا حسین احمد مدنیؒ اور دیگر اکابر علماء دیوبند۔ نور اللہ مرقدہم ۔۔ کی طرف سے صفائی پیش کی ہے اور ان اسباب و حالات پر روشنی ڈالی ہے جن کی بنیاد پر یہ حضرات شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ کے خلاف پروپیگنڈہ سے متاثر ہوئے تھے اور ان کے بارے میں بہت بری رائے ظاہر کی تھی نیز بیان کیا گیا ہے کہ بعد میں جب ان حضرات پر اصل حقیقت منکشف ہوئی تو انھوں نے اپنی پہلی رائے سے رجوع کرلیا۔ کتاب اپنے موضوع و مقصود کے

نواب صاحب والاجاہ کے بارے میں مغالطہ :

لحاظ سے بلاشبہ مفید ہے، لیکن ناچیز راقم الحروف (بلکہ ہر صاحب انصاف) کی نگاہ میں یہ بات بہرحال افسوسناک اور موجب شکایت ہے کہ اس کتاب میں اکابر علماء دیوبند کے جس جرم پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے، اسی کا مرتکب محدث کبیر مجدد علوم دینیہ امیر الملک نواب والاجاہ سید صدیق حسن خاں قنوجی بھوپالی رحمۃ اللہ علیہ کو قرار دیا گیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ محترم مولانا نعمانی مدظلہ نے شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ کے خلاف پروپیگنڈہ سے متاثر ہونے والے علماء اکابر کے سلسلہ میں نواب صاحب مرحوم کا بھی ذکر کیا ہے اور اس سلسلہ میں ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے واضح طور پر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ شیخ الاسلام کے بارے میں نواب والاجاہ بھی مولانا مدنی مرحوم جیسی ہی رائے رکھتے تھے اور شیخ کو (علی الاطلاق گویا عقائد وغیرہ میں بھی) مجروح و مطعون کرنا ضروری سمجھتے تھے اور مولانا مدنیؒ سے پہلے وہ شیخ کو بدعقیدہ اور فاسق وغیرہ قرار دے چکے تھے بلکہ مولانا مدنیؒ نے اپنی کتاب "الشہاب الثاقب" میں شیخ اور ان کے متبعین کی طرف جو بے بنیاد باتیں منسوب کی ہیں اور ان کو فاسد العقیدہ، شان رسالت میں گستاخی کرنے والا اور فاسق و خبیث وغیرہ لکھا ہے تو بقول محترم مولانا نعمانی صاحب عام شہرت کی بناء پر اور شیخ احمد زینی دحلان کی اور نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم جیسے اہل علم کی تحریروں پر اعتماد کرکے ان "خرافات" اور "افترات" کو "حقائق" اور "واقعات" سمجھ کر نقل کر دیا ہے بلکہ مولانا نے نواب صاحب مرحوم کی کتاب کا حوالہ بھی دیا ہے [۱]، یعنی مولانا مدنیؒ تو محض ناقل ہیں اور ۔ نقل کفر کفر نباشد ۔

---

[۱] شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ .... ص ۸۹

اصل قصور تو نواب صاحب وغیرہ کا ہے جنہوں نے ان خرافات کو اولاً قلمبند کیا اور اپنی کتابوں میں جگہ دی مگر حقیقت یہ ہے کہ نواب صاحب کے بارے میں یہ تاثر ــ جو مولانا نعمانی کی تحریروں میں دیا گیا ہے: "واقعہ کے خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ "عمومی تکفیر اور قتل مخالفین" کے باب میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کا جو مسلک بتایا جاتا ہے۔ نواب صاحب کو اس سے اختلاف ضرور ہے لیکن مولانا مدنی اور شیخ دحلان کی ہفوات کا جن کی طرف نعمانی صاحب نے اشارہ کیا ہے۔ نواب صاحب کی تحریروں میں (میرے ناقص علم و مطالعہ کی حد تک) کوئی وجود نہیں بلکہ اس کے برعکس ممدوح کی متعدد تصنیفات میں شیخ الاسلام کے عقائد و افکار اور اخلاق و اعمال کے متعلق نہایت عمدہ تاثرات، پاکیزہ خیالات اور حقیقت کے قریب تر رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ بلکہ ان کے معاندین کی تردید بھی کی گئی ہے۔ لیکن مولانا نعمانی نے اپنی کتاب میں نواب صاحب کی ان تحریروں کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ حالانکہ یہ تحریریں مولانا موصوف کی نظر سے یقیناً گزری ہوں گی ـــ . . . اب ظاہر ہے جو شخص بھی مولانا نعمانی کی کتاب پڑھے گا اور یہ دیکھے گا کہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کے تئیں نواب والا جاہ کو بھی شیخ دحلان اور مولانا مدنی ہی کی صف میں ذکر کیا گیا ہے اور شیخ کے متعلق نواب صاحب کے پاکیزہ احساسات اور عمدہ خیالات کا کوئی ذکر نہیں ہے تو لازماً وہ یہی سمجھے گا کہ شیخ کے بارے میں ان کے خیالات بھی نہ صرف یہ کہ اچھے نہیں تھے بلکہ وہ بھی شیخ دحلان اور مولانا مدنی کی طرح شیخ کو فاسد العقیدہ وغیرہ سمجھتے تھے اور ان کی تحریروں میں بھی وہ سب خرافات و افتراءات موجود ہیں جو زینی اور مدنی صاحبان کی تحریروں میں ہیں اور پھر وہ نواب صاحب کے بارے میں بھی اسی غلط فہمی و بدگمانی کا شکار ہو جائے گا جس قسم کی غلط فہمی و بدگمانی کو اکابر علماء دیوبند سے دور کرنے کے لئے مولانا نعمانی نے مذکورہ بالا کتاب لکھی ہے۔

ان سطور کی تحریر کا مقصد و منشا: ناچیز راقم سطور کا علم و مطالعہ بہت ہی محدود ہے اور مولانا نعمانی صاحب مدظلہ کی علمی حیثیت کا دل سے معترف ہے ان سطور کی تحریر کا مقصد مولانا نعمانی کی کتاب کا جواب لکھنا یا اس پر کوئی تفصیلی تبصرہ کرنا نہیں ہے۔ بلکہ انتہائی ادب و احترام کے ساتھ صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ ـ

عیب مے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو

یعنی مذکورہ کتاب میں نواب والا جاہ رحمۃ اللہ علیہ کا تذکرہ کرنا ضروری ہی تھا تو تصویر . . کا دونوں

رُخ پیش کر دینا چاہیے تھا، تاکہ نہ کوئی غلط فہمی پیدا ہوا نہ مولانا نعمانی جیسے بزرگ پر تلبیس کا الزام عائد ہو سکے۔ یا پھر سرے سے نواب صاحب کا تذکرہ ہی نہ کیا جاتا کیونکہ جس سوال کے جواب میں مولانا نعمانی محترم نے کتاب لکھی ہے اس میں نواب صاحب مرحوم کے متعلق سرے سے کوئی استفسار کیا ہی نہیں گیا تھا

بہر حال ہم اس کے مدعی نہیں کہ نواب صاحب والاجاہ مرحوم کو شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب سے کسی مسئلہ میں کوئی اختلاف ہی نہیں تھا ... بلکہ ہم یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ شیخ الاسلام کے احوال و عقائد کے بارے میں نواب صاحب اور مولانا مدنی کی معلومات اور خیالات یکساں نہیں تھے، بلکہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ نواب صاحب نے اپنی متعدد تصنیفات سے اندر شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں نہایت عمدہ خیالات اور پاکیزہ تاثرات کا اظہار کیا ہے اور یہ بات تو کسی طرح صحیح نہیں کہ وہ تمام خرافات افترامات جن کو مولانا مدنی مرحوم نے حقائق و واقعات سمجھ کر "الشہاب الثاقب" میں درج کیا ہے ان کا ایک ماخذ نواب صاحب کی تحریریں بھی ہیں۔ یہ قطعاً غلط ہے اور اسے حقیقت پسندی کے دائرے میں رہتے ہوئے ہرگز ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

آئندہ سطور میں شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمۃ اللہ علیہ کے احوال و عقائد کے بارے میں دونوں بزرگوں کی تحریریں اور ان کے تاثرات ایک دوسرے کے بالمقابل قلمبند کیے جا رہے ہیں تاکہ ناظرین بآسانی فیصلہ کر سکیں کہ کیا ان تحریروں میں ایک دوسرے کا ماخذ بننے کی کوئی گنجائش بھی ہے؟

یہ کتاب نواب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ۱۲۹۱ھ کی تصنیفات میں

حجج الکرامہ فی آثار القیامہ سے ہے اور فارسی زبان میں ہے۔ آثار قیامت کے موضوع پر انتہائی مبسوط اور عمدہ کتاب ہے، اس کی ایک فصل میں امام مہدی آخر الزماں کی شرعی حیثیت اور ان کے حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور آخر فصل میں چند "مدعیان مہدویت" کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اسی سلسلہ میں ضمناً ایک جگہ سید احمد شہید اور شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کا یکجا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان حضرات نے کبھی مہدی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ ۱؎ اور پھر ان کے بارے میں اپنے عمدہ تاثرات کا اظہار یوں کیا ہے:

۱؎ سید احمد شہید کی غیبوبت اور ایک دیوبندی روایت: مولانا سید عبدالحی (م ۱۳۴۱ھ) تحریر کرتے ہیں کہ ہم سے حافظ ابن احمد بن مولانا محمد قاسم اور مولوی حبیب الرحمٰن اور شیخ محمد حسن نے بیان کیا۔

(نواب صاحب کی تحریر)

" ان دونوں حضرات کے جو حالات ثقہ اہل عرب اور اہل ہند سے معلوم ہوئے ہیں وہ از روئے شرع کسی نکتہ چینی اور شرعی جرح کے محل نہیں ہیں بلکہ ان کی معلوم سیرت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ حضرات علماء و صلحاء اور دیندار عابدوں میں تھے، خدا پرست اور انصاف دوست تھے ....

... دنیا دار علماء سوء جو بدعات اور آبائی رسوم کے خوگر ہوتے ہیں ان کی مخالفت مقصود کے لیے چنداں مضر نہیں واللہ تعالیٰ اعلم ... .. البتہ نجدی فوج کے متعلق لوگوں کو کچھ شکایتیں ہیں، معلوم نہیں حقیقت کیا ہے ۔ مگر شیخ کے عقائد جو انھوں نے اپنے رسائل میں تحریر فرمائے ہیں، شرک و بدعت کے رد میں ہیں، اور ظاہر شریعت کے مطابق ہیں ۔" (ص ۳۹)

(اس کے بالمقابل شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں مولانا مدنیؒ کے خیالات و تاثرات سنیے مولانا مدنیؒ "الشہاب الثاقب" میں تحریر فرماتے ہیں :)

" صاحبو! محمد بن عبدالوہاب ابتداءِ تیرہویں صدی (؟) میں نجد عرب سے ظاہر ہوا اور چونکہ خیالات باطلہ اور عقائد فاسدہ رکھتا تھا اس لیے اس نے اہلسنت و الجماعت سے قتل و قتال کیا ....

..... ان کو قتل کرنے کو باعث ثواب و رحمت شمار کرتا رہا ..... سلف صالحین اور اتباع کی شان میں نہایت گستاخی اور بے ادبی کے الفاظ استعمال کیے ...

... الحاصل وہ ایک ظالم و باغی خونخوار فاسق شخص تھا ۔ (ص ۴۲)

عقائد وہابیہ اور ان اکابر دیوبند کے معتقدات و اعمال میں زمین و آسمان بلکہ اس سے زائد کا فرق ہے ۔ ص ۴۳ "

نواب صاحبؒ کی یہ کتاب بھی فارسی زبان میں ہے اور ۱۲۹۱ھ کی تالیف ہے، اس میں ایک سو سے زائد

ہدایۃ السائل الی ادلۃ المسائل :

سوالات کا جواب اور مسائل کی تحقیق کی گئی ہے ۔ بیالیسواں سوال امام محمد بن عبدالوہابؒ نجدی کے متعلق ہے کہ عبدالوہاب نجدی، جس کی طرف وہابیہ منسوب ہیں، کون شخص تھا، اس کے عقائد مذہب اہل سنت و جماعت

یہ شیخ ... ثقہ ہیں، کہ ہم سے مولانا رشید احمد گنگوہی نے بیان کیا، ان سے مولانا مظفر حسین کاندھلوی نے کہا کہ میں نے ... مولانا سید احمد سے دس باتیں سنی ہیں ۔ جن میں سے نو کا ظہور ہو چکا ہے ۔ ایک جو باقی ہے وہ آپ کی شہادت ہے ۔" (ارمغان احباب معارف ج ۳۴ ص ۱۷۱) بحوالہ مولانا سندھی کے افکار و خیالات پر ایک نظر ص ۷۷، ۷۸ ۔ ماخوذ از ہفت روزہ الاعتصام لاہور، ۲۷ جنوری ۱۹۸۰ء)

کے مطابق تھے یا نہیں ؟ ،،

جواب میں والا جاہ نے اولاً ،، وہابیہ ،، نسبت پر گرفت کی ہے اور لکھا ہے کہ ،، جن لوگوں نے وہابیہ کو عبدالوہاب کی طرف منسوب کیا ہے، یہ ان کی غلطی ہے۔ کیونکہ صاحب دعوت عبدالوہاب نہیں بلکہ ان کے صاحبزادے (شیخ الاسلام) محمد بن عبدالوہاب تھے، انھوں نے لوگوں کو اتباع سنت کی دعوت دی اور رسوم شرکیہ وکفریہ اور بدعات و محدثات کی بیخ کنی کی ،، اس کے بعد شیخ کے نام ونسب اور صحیح صحیح تاریخ ولادت (۱۱۱۵ھ) و تاریخ وفات (۱۲۰۶ھ) اور سلسلۂ تعلیم و تربیت کو بیان کر کے شیخ کے عقائد نیز بعض دوسرے مسائل مثلاً اہل قبلہ کی تکفیر اور ان کو مباح الدم قرار دینے وغیرہ کے اصول پر روشنی ڈالی ہے، شیخ کے احوال وعقائد کے متعلق تحریر فرماتے ہیں۔

،، محمد بن عبدالوہاب عالم اور متبع سنت تھے،
سنت مطہرہ کی اتباع ان کے نفس پر غالب تھی،
ان کے رسائل مشہور ہیں مگر دیار ہند میں ان کی تالیفات
عموماً دستیاب نہیں ہیں۔ ،، (ص ۱۱۴)

آگے لکھتے ہیں:

،، غرض کہ صاحب نجد شیخ محمد بن عبدالوہاب کا مسلک وہی تھا جو شیخ الاسلام ابن تیمیہ اور ان کے شاگرد علامہ ابن القیم کا تھا[1] شیخ نے زبان و بیان اور شمشیر و سنان کے ذریعہ راہِ خدا میں جہاد کیا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیا، چونکہ اکثر لوگ ہوائے نفسانی میں گرفتار اور بدعات میں مبتلا تھے اس لیے ان پر شیخ کا طریقہ گراں گزرا اور دنیا طلب علماء سوء اور جاہل عوام ہاتھ دھو کر ان کے

(اس کے بالمقابل الشہاب الثاقب کے کچھ اور اقتباسات پڑھیے، حضرت مولانا مدنی تحریر فرماتے ہیں:)

،، یہ (احمد رضا خاں بریلوی) مردود بھی مثل اپنے شیخ نجدی کے ان جملہ کاربرداروں سے مناکحت مجالس وغیرہ حرام جانتا ہے ان کو ایذا دہی اور عزت ہتک کرنی اور تکالیف نفسی و مالی پہنچانی واجب کہتا ہے ..... پس درحقیقت یہ پورا پورا متبع اپنے شیخ نجدی کا ہوا اور خود وہ (احمد رضا) اور اس کے اتباع وہابی ہیں۔ ،، (ص ۴۳)

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو
ایک مجددِ بدعت کو قامعِ بدعت کا پیرو کہہ قرار دیا جاتا ہے۔)

[1] مولانا نعمانی نے بھی یہی بات کئی جگہ لکھی ہے، ملاحظہ ہوں صفحات ۵۰، ۵۱، ۶۵

پیچھے پڑ گئے اور ان پر طرح طرح کے افتراءات اور
جھوٹ اور بہتان باندھے۔ اور ان کو بدنام کرنے کی
کوششیں کیں۔ اور لوگوں کو ان کی باتوں اور ان
کے اقوال و افعال سے دور رہنے کی سخت تاکید کی
اور عوام کے ذہن میں یہ بات پیوست کر دی کہ
محمد بن عبدالوہاب ایک نئے مذہب و مسلک کے پیرو
ہیں، حالانکہ یہ بات حقیقت کے بالکل خلاف تھی۔
شیخ تو مسلکاً حنبلی تھے اور حنابلہ — امام احمد بن حنبل
کے متبعین — سنت کی اتباع کے سلسلہ میں پوری
امت کے اندر سب سے زیادہ پیش قدم ہیں، کیونکہ
یہی راہ ان کے امام، امام اہلسنت احمد بن حنبل رحمۃ
اللہ علیہ کی بھی تھی۔ ان کا مذہب یہ تھا کہ وہ کتاب و
سنت کے ساتھ تمسک کرتے تھے، اگرچہ حدیث ضعیف
ہو، اور حدیث کے مقابلہ میں وہ آراء رجال کی
تقلید نہیں کرتے تھے، وہ رائے قوی ہی کیوں نہ ہو۔

(ص ۱۱۵)

شیخ محمد بن عبدالوہاب درحقیقت شیخ الاسلام
ابن تیمیہ اور علامہ ابن القیم کے نقش قدم پر گامزن تھے
انھوں نے خلق خدا کو اتباع سنت کی راہ پر لگایا،
امت کو اتباع کی دعوت دینا فی نفسہ امر محمود ہے
اللہ جس کو اس کی توفیق ارزانی فرمائے اور جسے اس
سعادت عظمیٰ سے نوازدے۔ اور یہ سلسلہ دعوت

مدنی صاحب کے مزید ارشادات پڑھیے:

"وہابیہ (شیخ محمد بن عبدالوہاب کے متبعین)
مسئلہ شفاعت میں ہزاروں تاویلیں اور گھڑنت
کرتے ہیں اور قریب قریب انکار شفاعت کے
بالکل پہنچ جاتے ہیں۔" (ص ۴۷)

نیز "شان نبوت و حضرت رسالت علی صاحبہا الصلاۃ و
السلام میں وہابیہ نہایت گستاخی کے کلمات استعمال
کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مماثل ذات سرور کائنات
خیال کرتے ہیں۔ اور نہایت تھوڑی فضیلت زمانۂ تبلیغ
کی مانتے ہیں اور اپنی شقاوت قلبی و ضعف اعتقادی کی
وجہ سے جانتے ہیں کہ ہم عالم کو ہدایت کر کے راہ پر
لا رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ رسول مقبول علیہ السلام
کا کوئی حق اب ہم پر نہیں اور نہ کوئی احسان اور فائدہ
ان کی ذات پاک سے بعد وفات ہے۔"

(ص ۴۷)

(مدنی صاحب محبت نبوی کے ثبوت میں مولانا نانوتوی
کے چند اشعار نقل کرنے کے بعد رقمطراز ہیں۔

"کیا یہی حالت وہابیہ خبیثہ کی ہے، کیا یہی کلمات
ان کی گندی زبانوں سے نکلتے ہیں۔ کیا اسی قسم کی لطیف
اور دلآویز تحریرات ان کے ناپاک قلموں سے شائع
ہوتی ہیں۔؟
ہرگز نہیں۔ وہ خبثاء اس قسم کی گفتگو کو معاذاللہ

شیخ کے لشکریوں سے جو سنت کے خلاف اقوال و افعال سرزد ہوئے ہوں مثلاً اپنے علاوہ دیگر مسلمانوں کی تکفیر اور مخالفین کو مباح الدم قرار دینے میں تشدد تو وہ بلاشبہ خطا ہے۔ لیکن اگر امیر عسکر نے اس کی اجازت نہ دی ہو اور وہ اس سے واقف اور راضی نہ ہو تو وہ اس کے حق میں باعثِ مذمت نہیں ہو سکتی۔"

(ص ۱۱۶)

بد دینی و شرک خیال کرتے ہیں۔ ان مضامین کو واہیات و خرافات میں مندرج کرتے ہیں۔"

(ص ۵۱)

نواب صاحب کسی کی تکفیر کرنے اور اس کو خارج از اسلام قرار دینے کے اصول پر بحث کرنے اور اس سلسلہ میں بہت زیادہ احتیاط کی تاکید کرنے کے بعد پھر لکھتے ہیں۔

اگر محمد بن عبدالوہاب کے بعض ساتھیوں کے اس معاملہ میں بد احتیاطی ہوئی ہو تو وہ بہر حال خطا ہے لیکن یہ شیخ کا مذہب نہ تھا نہ وہ اس چیز کو پسند کرتے تھے، ان کے عقائد اور ان کے مقالات سب کے سب اہلسنت والجماعت کے موافق ہیں بلکہ ان کو سلف امت اور ائمہ کی اتباع کی بنا پر ان تمام لوگوں پر فضیلت حاصل ہے جو خلف امت اور اَرار رجال کے مقلد ہیں، شیخ کی دعوت سے نجد و حجاز اور یمن میں شریعت اسلامیہ کا احیاء اور بہت سے باطل امور کا استیصال ہوا۔ اللہ آپ کی خطا کو معاف فرمائے اور نیکیوں پر بہترین جزا سے نوازے۔"

بہت سے عوام اور دنیا طلب علماء سوء جنھیں شیخ کے حالات کی اطلاع نہیں ہے اور محض سنی سنائی

(مولانا مودتی کی تقریبا)

فتاوی رشیدیہ میں متعدد مقامات پر مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے طائفہ وہابیہ غیر مقلدین کو فاسق تحریر فرمایا ہے اور ان کی اقتدار کو مکروہ کہا کہ سلف صالحین و ائمہ مجتہدین رحمہم اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرنے کی وجہ سے فسق عاید ہوتا ہے۔"

(شہاب ثاقب ص ۶۴)

"وہابیہ خبیثہ کثرتِ صلوٰۃ وسلام و درود بر خیر الانام علیہ السلام اور قرأت دلائل الخیرات و قصیدہ بردہ و قصیدہ ہمزیہ وغیرہ اور اس کے پڑھنے اور اس کے استعمال کرنے و ورد بنانے کو سخت قبیح و مکروہ جانتے ہیں۔"

(ایضاً ص ۶۶)

"ان جہلاء وہابیہ کے نزدیک معاذ اللہ زنا اور

افواہوں پر اعتماد کرکے بلا دلیل آپ کی اور آپ کے متبعین کی تکفیر و تضلیل کرتے ہیں۔ یہ لوگ درحقیقت نفس امارہ کے اغوا اور ابلیس کی تضلیل میں گرفتار ہوگئے ہیں۔ اللہم سب کو معاف فرمائے۔"

(شیخ الاسلام) محمد بن عبدالوہاب کے صاحبزادے (شیخ) عبداللہ کا ایک رسالہ ہے جو انھوں نے اسی وقت لکھا تھا جب (۱۲۱۸ھ میں) حرمین شریفین کو امیر محمد ابن سعود نے فتح کیا تھا۔ اور (شیخ) عبداللہ بھی اس کے ہمراہ تھے۔ وہ رسالہ اس بات کا شاہد عدل ہے کہ عبداللہ اور ان کے والد (محمد بن عبدالوہاب) پر لوگوں نے جو الزام و افترآت لگائے ہیں اور اس بنا پر ان کے خلاف ہنگامے کھڑے کیے ہوئے ہیں۔ یہ حضرات ان سے بالکل بری ہیں۔ ان کا طرز فکر و عمل وہی ہے جو محدثین اور سلف صالحین کا ہے پس باوجود اس کے یہ حضرات ان عقائد فاسدہ سے (جو ان کی طرف غلط طور پر منسوب کیے جاتے ہیں) انکار کرتے ہیں، انھیں اسلام کی راہ اور سلف کی راہ کی مخالفت کرنے اور دین جدید اور مذہب نا سدید ایجاد کرنے والا قرار دینا اور عرب و عجم کے ہر متبع سنت کو ان کا پیرو (مقلد) اور ان کے مسلک کی ترویج کرنے والا سمجھنا اور ان کا نام وہابی رکھنا انصاف پر ظلم اور حق کا خون بہانا ہے اور بہتان تراشی و دروغ گوئی کا گناہ سمیٹنا ہے نعوذ باللہ

سرقہ کرنے والا اس قدر ملامت نہیں کیا جاتا اور وہ اعلیٰ درجے کے فجار و فساق سے وہ نفرت نہیں کرتے جو تمباکو کے استعمال کرنے والے سے کرتے ہیں۔"

(ایضاً ۴۲)

مولانا مدنی نے شیخ الاسلام کے متبعین کو بار بار "وہابیہ خبیثہ" کے لقب سے یاد کیا ہے مثلاً ص ۳۵ پر ایک جگہ لکھتے ہیں:

"مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متبعین کا عقیدہ بہ نسبت حضرت سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کے، وہ نہیں جو وہابیہ خبیثہ رکھتے ہیں۔"

(نیز ملاحظہ ہو ص ۵۱، ۶۵، ۶۶)

وہابیوں کے فقہی مسلک کا ذکر کرتے ہوئے مولانا مدنی لکھتے ہیں:

"وہابیہ کسی خاص امام کی تقلید کو شرک فی الرسالۃ جانتے ہیں اور ائمہ اربعہ اور ان کے مقلدین کی شان میں الفاظ واہیہ خبیثہ استعمال کرتے ہیں، اور اس کی وجہ سے مسائل میں وہ گروہ اہل سنت والجماعت کے مخالف ہو گئے۔ چنانچہ غیر مقلدین ہند اسی طائفہ شنیعہ کے پیرو ہیں۔۔۔۔"

"۔۔۔۔۔ ان کا (وہابیہ نجد عرب کا) اکابر امت کی شان میں الفاظ گستاخانہ بے ادبانہ استعمال

من جمیع اکرہ اللہ۔ یہ سچ فرمایا اللہ پاک نے
وکذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ولما یاتہم
تاویلہ"

پھر نواب صاحب یہ جتانے کے بعد کہ ہم شیخ محمد بن
عبدالوہاب یا ان جیسے کسی عالم بلکہ متقدمین علماء امت
میں سے بھی کسی کے مقلد نہیں ہیں، بلکہ ہمارا شیوہ
کتاب وسنت کی پیروی ہے۔ آگے لکھتے ہیں۔

"غایت الامر یہ کہ وہ (شیخ محمد بن عبدالوہاب)
مرد صالح اور عالم متبع (کتاب وسنت کی پیروی
کرنے والے) تھے۔ ان کے احوال کا صحیح علم رکھنے والے
ان کے ساتھ غائبانہ محبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ حدیث
میں ہے "الحب للہ والبغض للہ" لیکن یہ بات
نہیں کہ حق کو شیخ کے اندر منحصر اور ان کی تقلید کو
واجب سمجھتے ہوں اور ان کے علاوہ لوگوں کو گمراہ
اور کافر قرار دیتے ہوں۔"

(ص ۱۱۸، ۱۱۹)

معمول بہ ہے۔"

(ص ۶۲، ۶۳)

شہاب ثاقب سے ایک اقتباس اور ملاحظہ فرمائیں
مولانا مدنی نے اکابرین دیوبند اور وہابیوں میں
آٹھویں وجہ اختلاف یوں بیان کی ہے:

"خود احقر نے (حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی
رحمۃ اللہ علیہ سے) سوال کیا کہ بعد چالیس روز کے
جالی شریف میں اندرون حجرہ مطہرہ اہل مدینہ بچوں
کو داخل کرتے ہیں اور خادم روضہ مطہرہ اس کو لیجا کر
سامنے روضہ اقدس کے قبلہ کی طرف لٹا دیتا ہے۔
اور دعا مانگتا ہے، یہ فعل کیا ہے؟ تو آپ نے استحسان
فرمایا اور پسند کیا۔ ذرا غور کرنے کی بات ہے کہ کیا
وہابیہ خبیثہ ان افعال کو جائز کہتے ہیں، کیا ان کو وہ
شرک وکفر وبدعت وغیرہ نہیں سمجھتے، ؟ اسی وجہ سے
ہم نے اپنے بچوں کو بارہا حجرہ مطہرہ نبویہ میں داخل
کیا ہے"

(ص ۵۳، ۵۴)

نجد سے متعلق ایک حدیث کی غلط تاویل کر کے یاروں نے نجد اور اہل نجد کی مذمت ومنقصت کا پہلو نکال لیا تھا، اور شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کو اس کا مصداق ٹھہراتے اور آپ کو مطعون کرتے تھے۔ نواب صاحب ایسے بدخو غلط لوگوں کی تردید کرنے اور اس سلسلہ میں متعدد روایات نقل کر کے ان کا صحیح معنی ومصداق بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"ان تمام روایات سے معلوم ہوا کہ حدیث نجد کا مصداق وہ ہے جو فتنے پیدا کرے
نہ کہ جو سنتوں کو زندہ کرے۔ اس لیے حدیث نجد کو ابن عبدالوہاب نجدیؒ پر چسپاں کرنا

غلط ہے۔ اور موصوف کا حسنِ کردار و صدق گفتار اس سے مانع ہے۔ کیونکہ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت محمد رسول اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے کی دعوت تھی، نہ کہ اس کے خلاف چلنے کی۔ ان کا طریقہ سلف صالحین کے طریقہ کے مطابق تھا، نہ کہ اہل بدعت کے جیسا کہ ان کے احوال کی صحیح خبر و واقفیت رکھنے والوں کو معلوم ہے۔ پس وہ ہرگز اس حدیث نجد کا مصداق نہیں ہو سکتے۔" (ص ۱۴۴)

اتحافُ النبلاء: یہ نواب والا جاہ کی بہت مشہور کتاب ہے۔ پورا نام ہے "اتحاف النبلاء المتقین باحیاء مآثر الفقہاء المحدثین"۔ یہ بھی فارسی زبان میں ہے اور موضوع نام سے ظاہر ہے۔ یہ مذکورہ بالا کتابوں سے پہلے یعنی ۱۲۸۶ھ کی تالیف ہے۔ اس میں بھی شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کا اچھے انداز میں تذکرہ موجود ہے۔ مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم نے بھی لکھا ہے کہ "اتحاف النبلاء میں ان کا بیان ایک حد تک اچھا اور حقیقت سے قریب تر ہے"۔ لائق عبرت بات یہ ہے کہ اتحاف النبلاء میں شیخ کا یہ تذکرہ اس وقت بھی محترم مولانا نعمانی کے پیش نظر تھا جب وہ اپنی کتاب "شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈہ..." کی تالیف کر رہے تھے، کیونکہ اتحاف النبلاء کے ان ہی صفحات سے جن میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کا تذکرہ ہے۔ مولانا نے اپنی مذکورہ کتاب میں اقتباسات نقل کیے ہیں۔ اگر ہم سے غلطی نہ ہو تو مولانا نعمانی ہی بتائیں کہ وہ کون سا معیار انصاف ہے جس کی بنا پر موصوف نے "حقیقت سے قریب تر" اس تذکرہ کا کوئی تذکرہ نہیں کیا بلکہ تصویر کا یہ روشن رخ پیش کرنے سے ہر جگہ پرہیز کیا۔

بہر حال نواب والا جاہ نے شیخ کا تذکرہ علامہ شوکانیؒ کے ایک فاضل شاگرد شیخ محمد بن ناصر حازمی متوفی ۱۲۸۳ھ کی ایک کتاب سے اخذ کر کے لکھا ہے۔ خود نواب صاحب لکھتے ہیں:

"سید داؤد بن سلیمان بغدادی (م ۱۲۹۹ھ) نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کے رد میں ایک رسالہ "صلح الاخوان" کے نام سے لکھا تھا، اس کے جواب میں شیخ محمد بن ناصر حازمی نے بطور محاکمہ ایک رسالہ لکھا جس کا نام ہے "فتح المنان فی ترجیح الراجح و تزییف الزائف من صلح الاخوان"۔ شیخ کے حالات جو یہاں درج کیے جا رہے ہیں اسی سے ماخوذ ہیں۔"

پھر نواب صاحب نے اس کتاب کا ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے جس میں مصنف شیخ حازمی اپنے

اولاً شیخ کی مختصر سوانح حیات کا اچھے انداز میں تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب عالم متبع تھے۔ اتباع (کتاب وسنت) ان پر غالب تھی، ان کی دعوت سے حجاز اور یمن میں بڑی حد تک شریعت کا احیاء اور بہت سے باطل کا استیصال ہوا۔ اور رسالہ صلح الاخوان کے بارے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ تکفیر اور قتال کے متعلق سید داؤد نے شیخ کے خلاف جو کچھ لکھا ہے، وہ صحیح اور درست ہے۔ البتہ شیخین۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم۔ کے سلسلہ میں سید داؤد کے خیال کی پوری تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ دونوں بزرگ جلیل القدر امام، عالم باعمل، صاحب تقویٰ اور بے لوث ثقہ اور صاحب علم وانصاف تھے۔ انھوں نے دین کی راہ میں مشقتیں برداشت کیں اور اپنا فرض ادا کیا۔ نواب صاحب اس اقتباس کو نقل کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:

"بہت سے اہل علم شیخ محمد بن عبدالوہاب کے حالات سے ناواقف ہونے کی وجہ سے یا تعصب و نفسانیت کی بنا پر ان کی تکفیر و تضلیل کرتے ہیں، حالانکہ قرآن وحدیث سے ان کے پاس شیخ کی تکفیر و تضلیل کی کوئی دلیل نہیں ہے۔" (ص ۴۱۳)

اس کے بعد نواب صاحب نے ابن عابدین شامی کے بعض الزامات کا ذکر کیا ہے اور اس کی تردید کے لیے شیخ الاسلام کے صاحبزادے شیخ عبداللہ کے ایک رسالہ کا خلاصہ نقل کیا ہے۔ یہ رسالہ بقول مولانا نعمانی شیخ کی دعوت اور مسلک کی وضاحت اور بہتانوں کی تردید میں بہت اہم اور جامع اور واضح رسالہ ہے۔ یہ رسالہ شیخ عبداللہ نے اس وقت لکھا تھا جب ۱۲۱۸ھ میں اس وقت کی سعودی حکومت کا پہلی دفعہ حرمین پر اقتدار قائم ہوا تھا۔ رسالہ میں اس وقت کی پوری روداد بھی ہے اور اپنی دعوت ومسلک کی وضاحت بھی، اور جیسا کہ بیان کیا گیا، بہتانوں کی تردید بھی۔

رسالہ مذکور کا خلاصہ پیش کرنے کے بعد نواب صاحب شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں ابن عابدین شامی صاحب رد المحتار حاشیہ درمختار کے خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس سے ابن عابدین شامی کی (شیخ الاسلام کے بارے میں) اس رائے کا کمزور ہونا ثابت ہوگیا کہ شیخ الاسلام اپنے (اور اپنی جماعت کے) علاوہ سب کو مشرک گردانتے ہیں اور اسلام کو اپنے طریقے کے اندر منحصر سمجھتے ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ شیخ الاسلام کا عقیدہ تمام تر اہل سنت وجماعت کے موافق تھا اور ان کی

طرف جو بہت سی نامعقول باتوں اور باطل عقائد کی نسبت کی جاتی ہے وہ سب بالکل جھوٹ اور شیخ پر افترا ہے۔ یہ بہتان تراشیاں اور دروغ گوئیاں شیخ کی زندگی میں بھی ان کے متعلق کی جاتی رہیں اور وہ ان کا انکار اور ان سے برأت کا اظہار کرتے رہے۔ الغرض شیخ محمد بن عبدالوہاب کو کسی ناپسندیدہ مذہب اور نئے دین کا ایجاد کرنے والا قرار دینا اور پھر شرک و بدعت کے ہر مخالف کو ان کا پیرو اور متعلد سمجھنا، راہ انصاف سے دور ہے۔

(ص ۶۱۷)

یہ ۱۲۹۸ھ کی تصنیف ہے اور نواب صاحب کی انتہائی مشہور و مقبول کتابوں

التاج المکلل میں ہے۔ اس میں شیخ محمد بن عبدالوہاب کے تذکرہ میں جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ سب قاضی شوکانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "البدر الطالع" سے ماخوذ ہے اور قاضی شوکانی، محترم مولانا نعمانی مدظلہ کے لفظوں میں "شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت اخلاص توحید و اتباع شریعت اور اس راستہ میں ان کی جدوجہد اور اس کے مبارک اثرات و نتائج کے معترف اور بڑے قدرداں ہیں" چنانچہ انھوں نے، البدر الطالع میں شیخ الاسلام کا عمدہ الفاظ میں تذکرہ کیا ہے۔ اور ان شاندار القاب کے ساتھ ملقب فرمایا ہے:

"الشیخ العلامہ محمد بن عبدالوہاب الداعی الی التوحید المنکر علی المعتقدین فی الاموات"

البتہ شیخ کے مسلک کے بارے میں بعض امور کی بابت قاضی شوکانی کو صحیح معلومات و اطلاعات نہیں مل سکی تھیں جس کے وہ خود بھی شاکی ہیں۔ جیسے تکفیر و قتال کا مسئلہ، اسی لیے انھوں نے ان امور کا تذکرہ شک کے ساتھ کیا ہے۔ نیز اہل نجد کے خارجی ہونے کے الزام کی نفی و تردید بھی کی ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

> "بعض لوگوں کا خیال ہے کہ صاحب نجد (امیر عبدالعزیز بن محمد بن سعود) خارجیوں کے عقائد رکھتے ہیں، مگر میں اس کو صحیح نہیں سمجھتا کیونکہ یہ لوگ محمد بن عبدالوہاب کے بتائے ہوئے طریقہ پر عمل کرتے ہیں اور وہ حنبلی المذہب تھے۔ مدینہ منورہ کے شیوخ سے حدیث کا علم حاصل کیا اور نجد واپس آکر بعض متاخرین حنبلی علماء جیسے ابن تیمیہؒ و ابن قیمؒ وغیرہ کے اجتہادات کے مطابق سرگرم عمل ہو گئے اور یہ حضرات بدعتیوں کے خلاف سخت ترین لوگوں میں تھے" (التاج المکلل ص ۴۴۳)

نواب صاحب نے قاضی شوکانی کے تمام بیانات کو تصدیق کی شکل میں نقل فرمایا ہے۔ پھر یہ بات ہماری فہم سے بالاتر ہے کہ محترم نعمانی صاحب نے کس اصول کی بنا پر قاضی شوکانی کو شیخ محمد بن عبدالوہاب کا قدرداں بتایا ہے اور نواب صاحب کو توہین کنندہ اور مخالف؟

(ماخوذ از انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا، شمارہ ۱۲۱ مورخہ ۱۲ مئی ۸۴ء بروز پیر)

گذشتہ سال آسام میں نیلی کے بعد ...

.... اب مہاراشٹر میں بھیونڈی

۲/جون ۱۹۸۴ء

جناب محترم ایڈیٹر محدث، دارالحدیث
السلام علیکم ورحمۃ اللہ

ٹائمس آف انڈیا مورخہ ۲۱ مئی کے صفحہ اول پر جو بھیونڈی کے حالیہ فسادات سے متعلق مضمون چھپا تھا اس کا اردو ترجمہ آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ اگر مناسب سمجھتے ہوں تو اسے محدث میں چھاپ دیں تاکہ قارئین کو کچھ معلومات حاصل ہو۔ ہمارے اردو اخباروں کا تو رویہ بہت نامعقول رہا۔ بیچاروں میں اتنی بھی ہمت نہیں کہ واقعہ جوں کا توں چھاپتے۔ یہ تو ٹائمس جیسے جن سنگھی اخبار نے چھاپا ہے۔ جس سے بربریت اور مظالم کا معمولی سا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

الحمدللہ ہمارے علاقے میں کسی حد تک امن رہا، مگر اب بھی یہاں کے ماحول میں سکون نہیں ہے۔ اللہ مدد کرے۔

احقر عبدالواحد

بیشک بھیونڈی اس سے کہیں زیادہ بربریت کا نمونہ بن گئی ہے، گو کہ مرنے والوں کی تعداد اس سے کم ہے، تقسیم ہند کے نقصان کے بعد آزاد ہندوستان کی تاریخ میں اس طرح کے کسی واقعہ کا مشاہدہ نہیں کیا گیا ہے اس جرم کے پس پردہ جو نفسیات ہے وہ اتنی خطرناک ہے جسے بیان کرنے سے الفاظ بھی قاصر ہیں، یہ کہنا کہ

بمبئی کے اس صنعتی مضافات میں فرقہ وارانہ فسادات ایک روایت بن چکی ہے ۔ موجودہ صورتحال سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ جس سے تائد ہندوستانی ساتھیوں کو زندہ بھون ڈالنا صرف ایک اور فرقہ وارانہ تصادم نہیں ہے ، بلکہ یہ تو زمین پر جہنم بپا کرنا ہے ۔ جبکہ بربریت ایک حقیقت ہے ۔ یہ یقین کرنا ناممکنات میں سے ہے اس طرح کا واقعہ کسی مہذب سوسائٹی میں واقع ہو ۔ اسے تو صرف ایک خوفناک خواب سے تعبیر کیا جاسکتا ہے لیکن ہم نے تو اس سے کہیں زیادہ خوفناک بربریت کا ثبوت دیا ہے یعنی بھیونڈی کے اس المناک سانحہ کی نظر اندازی کی ہولناکی ۔

اگر ہماری اخلاقی حیات ۔ جیسا کہ ظاہر ہو رہی ہے ۔ اتنی بے حس نہ ہوتیں تو سینچر کی دو پہر میں دو باتیں ضرور ہوتیں ۔ جبکہ بھیونڈی کے ایک سرے پر واقع اس بھیانک جرم کی بات ہر طرف عام ہو چکی تھی اول یہ کہ ان جزروں نے کم از کم بمبئی شہر اور اس کے مضافات ہی میں ، رنج والم اور غصہ کی لہریں دوڑادی ہوتیں کہ جن سے بدترین فرقہ پرستوں اور گروہ پرستوں نے بھی (جو باہم مل جل کر کام کرتے ہوں ۔) اپنے مارنے اور جلانے کے منصوبوں کو ترک کر دیا ہوتا ، مگر ایسی کوئی بات نہیں ہو سکی اس کے برعکس بمبئی میں سینچر کی شب میں حالات بد سے بدتر ہو گئے ، یہاں تک کہ ایک موقع پر یہ ظاہر ہونے لگا کہ پولیس حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتی اور حکومت کو فوج طلب کرنی ہوگی ۔ دوم یہ کہ وزیر اعلیٰ نے اس سانحہ کی ذمہ داری قبول کر لی ہوتی اور اپنی اور اپنی کابینہ کی جانب سے استعفا پیش کیا ہوتا ، اس کے برعکس وہ چند اردو اخباروں کی تنقید میں مصروف رہے جنھوں نے فرقہ وارانہ جذبات کو مشتعل کرنے میں حصہ لیا تھا ۔ ان کی اس تنقید کو منصفانہ کہا جاسکتا ہے لیکن یہ بات یہاں بے محل ہے اور اسے حکومت کی اس ناکامی کی پردہ پوشی کے لیے اختراع کیا گیا ہے ۔

ہم نے ماضی میں وسنت دادا پاٹل کی حمایت کی ہے ۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ موجودہ برسراقتدار کانگریس پارٹی کے حالات میں وہ صوبہ کے لیے بہترین شرطیہ امیدوار ہیں لیکن موجودہ صورتحال میں بھیمڑی اور اطراف وجوانب میں بربریت کی وجہ سے انھیں اپنا فرض سمجھتے ہوئے گورنر کو اپنے کاغذات پیش کرنا چاہیے تھے ۔ شاید انھیں یہ سوجھا تک نہیں کہ انھیں ایسا کرنا چاہیے ۔ یہ دوسری نشاندہی ہے اس سفر کی جو ہم آزادی کے بعد سے اب تک غلط سمت میں طے کر چکے ہیں ۔ یہ اخلاقی حیات کی بے حسی کی دوسری علامت ہے ۔ ایک لحاظ سے یہ اتنی ہی بھیانک ہے جتنی کہ بھیونڈی میں ہمارے ساتھی شہریوں کو زندہ بھون ڈالنا ۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسٹر پاٹل کا یہ اقدام کسی فائدہ مند مقصد کو حاصل نہ کرتا۔ مگر یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے۔ اول تو ان کا یہ اقدام بذاتِ خود معنی خیز ہوتا اور ثابت کرتا کہ اب تک اس ملک میں ایسے سیاستداں موجود ہیں جو ایسی باتوں کی اخلاقی ذمہ داری تسلیم کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان کا یہ اقدام نفرت کی فضا کو منہدم کرنے میں مددگار ثابت ہوتا اور دوسروں کے ضمیر کو بیدار کرتا۔ جناب لال بہادر شاستری کو لوگ اب تک یاد کرتے ہیں جبکہ ۱۹۵۰ء میں ریل کے ایک حادثہ کے بعد وہ ریلوے کی وزارت سے مستعفی ہو گئے تھے۔ جیسا کہ ان حالات سے واضح ہوا پاٹل کو نمایاں طور پر ذمہ دار بتلایا جا سکتا ہے۔ انھوں نے ابتداء بات سے کی کہ انھوں نے بھیونڈی میں شیوجینتی کے جلوس کی اجازت دی اور اس طرح جو دہ سال عمل پیرا پالیسی کو پلٹ دیا اور پھر ان کی انتظامیہ نے اردو، مراٹھی پریس کے مابین ہونے والے تنازعہ کو نظرانداز کیا۔ یعنی شیوسینا کے لیڈر بال ٹھاکرے کے مبینہ مسلم دشمن بیانات اور اس کے نتیجہ میں ہونے والا تناؤ پیدا ہوا۔ چنانچہ جو کچھ ہوا اس کی ذمہ داری سے وہ سبکدوش نہیں ہو سکتے۔

مزید خرابی :

لیکن پاٹل صاحب کا رویہ وسیع تر خرابی کی نشاندہی کرتا ہے۔ مہاراشٹر میں سیاسی زندگی ہندوستان کے دیگر بیشتر حصوں کی طرح حالیہ سالوں میں جدید سے جدید تر گہرائیوں کو چھو رہی ہے۔ ذہن میں دو مثالیں آتی ہیں۔ ایک نیرو کا موسیقی کھیلنا جب کہ روم جل رہا تھا اور دوسرا مغلیہ سلطنت کا آخری دور جبکہ شہزادے، شہزادیاں اور درباری رقص و سرود کی محفلوں میں محو تھے حالانکہ برطانیہ آگے بڑھ چکا تھا اور اپنی حکومت کے قدم مضبوطی سے جما چکا تھا۔ اب برطانیہ کی جگہ ہمارے ہاں لا حکومت کی طاقتیں پیش پیش ہیں اور برسرِاقتدار طاقتوں کا رویہ بعینہ وہی ہے۔ چنانچہ جب بمبئی اور مضافات کے علاقے آگ کے شعلوں میں بھڑکنے کے لیے تیار رہتے تو ریاستی کانگریسی [illegible] تمام پورے طور سے اپنے ایسی جماعتی تنازعات میں مشغول تھے اور بیشک لوٹ مار میں جو آج کل حکومت کا [illegible] چکا ہے۔ اس پر تو صرف ایک معصوم ہی متعجب ہوگا۔ اس بات سے کہ انتظامیہ نظم و نسق کو لاحق خطرات کے اندازہ سے کتنا غافل رہی۔ اس وقت بھی جبکہ یہ بمبئی میں منسوب کردہ ایک کانگریسی کارکن سے بال ٹھاکرے کی توہین کے باعث بمبئی کے مختلف

مقامات بدھ اور جمعرات مسلسل دو دن بند رہے۔ اس سے قبل کہ جمعہ کو فسادات پھوٹ پڑے۔ بیشک مہاراشٹر میں انتظامیہ کی بابت بولنا بے محل ہے۔ چند سال پیشتر اس طرح کی کوئی چیز کا وجود نہ تھا جو کہ چوٹی کے سیاسی رہنماؤں کی عملی کارکردگی کے نتیجہ سے پیدا ہوا تھا۔

ایسی صورتحال میں یہ انتہائی فطری بات ہے کہ ایک عام شہری جو اپنی جائداد اور زندگی کے خطرات سے دوچار ہے۔ اپنی مدد کے لیے اندرا گاندھی اور فوج کی طرف نظر اٹھائے۔ ہم بذات خود التدعاؤں اور التجاؤں کے سیلاب سے دوچار ہیں کہ فوری طور پر اندرا گاندھی کو بمبئی آنے پر آمادہ کریں اور مصیبت زدہ علاقوں میں فوج کو متعین کرایا جائے۔ مہاراشٹر کی پولیس کا رویہ بے انتہا مایوسانہ رہا۔ ہم ایسی اطلاعات کو اہمیت نہیں دیتے ہیں کہ بعض علاقوں میں پولیس نے لیڈروں کا ساتھ دیا۔ وہ مستقل طور پر غیر متاثرہ علاقوں سے آتے ہیں۔ لیکن ان میں جوش وخروش کے فقدان نے اتنا متاثر کیا کہ اسے زائل نہیں کیا جا سکتا۔ شاید جمعہ کے دن کسی بدمعاش کے ہاتھوں ذاتی پرخاش کی بنا پر پولیس کے سب انسپکٹر اور ہیڈ کانسٹیبل کا مارا جانا کسی حد تک اس کی وجہ بتلائی جا سکتی ہے۔ مگر اسے اگر صحیح تصور کیا جائے تو بھی ہمارے ملک کی سلامتی کا دارومدار بمبئی کے جلد از جلد معمول پر آنے میں ہے جو کہ پوری قوم کے لیے گویا ایک صنعتی اور تجارتی دل ہے۔ یہ مرکزی شہر مسلسل تین طویل دنوں تک چٹانی ساحل سے ٹکراتا رہا۔ ہم اسے تباہی کی عمیق گہرائیوں میں ڈوبتا نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ ایسے المیہ کو ہر قیمت پر بچانا چاہیے چاہے فوج کا زبردست استعمال ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ حکومت کے موثر ہونے میں لوگوں کے یقین کو کافی نقصان پہنچ چکا ہے۔ اب مزید وقت ضائع کرنے کے لیے نہیں ہے۔

ضرورت مدرسین

مدرسہ سلفیہ مولانگر کے لیے دو عالموں کی ضرورت ہے جو مسلکاً اہلحدیث ہوں، ان کے ذمے امامت وخطابت کے علاوہ مدرسہ میں بچوں کی ابتدائی تعلیم کا کام ہوگا۔

حق المحنت فی الوقت قیام وطعام کے علاوہ مبلغ تین سو روپیے ماہوار دیئے جائیں گے۔ ان کی استطاعت اور اہلیت کے مطابق بعد ازاں اضافہ کیا جائے گا۔ پتہ ذیل پر خط وکتابت کریں۔

محمد مقصود عالم ۔ مدرسہ سلفیہ ۔ مولانگر، پوسٹ جگنا تھ پور ضلع سنگھ بھوم بہار

صوبائی جمعیۃ اہلحدیث بمبئی کی ریلیف خدمات

بھیونڈی تھانہ واگلے اسٹیٹ اور گونڈی کے مسلم کش فسادات میں ریلیف اور فساد زدگان کی امداد کے لیے سب سے پہلے جس جماعت نے لبیک کہا وہ صوبائی جمعیۃ اہلحدیث بمبئی ہے۔ صوبائی جمعیۃ کے امیر جناب مولانا عبدالحق صاحب نے فوراً جماعت کے ذمہ داران واہل خیر سے رابطہ قائم کیا اور عوامی اپیلیں بھی کیں جن کا خاطر خواہ اثر ہوا اور عوام وخواص نے دل کھول کر مظلومین کی امداد و ریلیف میں حصہ لیا۔ جمعیۃ کے امیر باقاعدہ ایک وفد کی شکل میں متعدد بار بھیونڈی تھانہ اور گونڈی وغیرہ تشریف لائے اور وہاں کی مقامی جمعیتوں کے توسط سے مصیبت زدگان میں سے تقریباً چار سو خاندانوں کے لیے برتن کپڑے، راشن، دوا اور مکان وغیرہ کا بندوبست کیا، بہت سے لوگوں کو سلائی مشینیں دی گئیں۔ چھوٹے کاروبار والوں کو کام شروع کرنے کے لیے نقد رقم دی گئی۔ جو لوگ تھانہ واگلے اسٹیٹ وغیرہ سے بھاگ کر کرلا آگئے تھے۔ ان کے لیے کھانے کپڑے اور کیمپ کا انتظام کیا گیا، جو لوگ اپنے ملک جانا چاہتے تھے ان کو ڈھارس بندھا کر واپس ٹھکانوں پر بھیجا گیا اور جو جانے پر مجبور تھے، ان کے لیے کرایہ کا انتظام کیا گیا، بھیونڈی تھانہ واگلے اسٹیٹ اور گونڈی کے تباہ شدہ خاندانوں کو دو سو اور تین سو روپیے فی خاندان کے حساب سے مزدوری اخراجات کے لیے نقد رقم دی گئی۔

اس طرح صوبائی جمعیۃ اہلحدیث بمبئی ابتک ریلیف پر ایک لاکھ بیس ہزار روپیے سے زائد رقم خرچ کر چکی ہے دیگر سامان کپڑے، راشن وجنس وعمارت کا سامان وغیرہ بھی کئی ٹرکوں میں ریلیف کیمپوں میں پہنچایا گیا۔

جمعیۃ اہل حدیث بمبئی قابل مبارکباد ہے جس نے مظلومین کی امداد کے لیے سب سے پہلے لبیک کہا اور ضرورت مندوں کی ضروریات کی چیزیں مہیا کیں اور وہ حضرات بھی مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے جمعیۃ کے ریلیف فنڈ میں دل کھول کر حصہ لیا، جمعیۃ پر اعتماد کیا اور اسلامی فرض اور انسانی ہمدردی

کے جذبہ کے تحت مظلومین کی امداد وغم گساری کی۔ ہم جمعیۃ کے امیر کو بھی مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ انھوں نے رات دن ایک کرکے انتھک جدوجہد سے ریلیف اکٹھا کی اور اپنی نگرانی میں مصیبت زدگان کو پہنچائی۔

آخر میں جمعیۃ اہل حدیث کے ان پروگراموں پر بھی ہم جمعیۃ کو مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ وہ بے گھر لوگوں کو بسانے کے لیے پختہ مکانات تعمیر کرنے کا ارادہ رکھتی ہے اور ساتھ ہی ڈسپنسری و ہسپتال بنانے کا ارادہ رکھتی ہے، نیز جو بچے اس موقع پر یتیم ہوئے اور عورتیں بیوہ ہوئیں ان کے لیے ماہانہ وظائف کا بھی جمعیۃ اہلحدیث انتظام کررہی ہے۔ جو بہت ہی خوش آئند اور مفید پروگرام ہیں، امید ہے کہ ملت کے بہی خواہ ان پروگراموں میں بھی اپنا پورا تعاون دیتے رہیں گے، اس طرف اہل خیر حضرات کی خاص توجہ کی ضرورت ہے۔

عبدالنور راغب سلفی

ناظم نشر واشاعت صوبائی جمعیۃ اہل حدیث بمبئی۔

مولانا احسان اللہ صاحب کو صدمۂ عظیم

صوبائی جمعیۃ اہلحدیث بمبئی کے معاون اور جمعیۃ اہلحدیث کرلا کے صدر اور مالک سلیم نعیم اینڈ کمپنی جناب مولانا احسان اللہ صاحب کی والدہ (متوطن بونڈھیار گونڈہ) کا اچانک ۵ر جولائی ۱۹۸۴ء کو دس بجے شب میں انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحومہ صوم وصلوٰۃ کی پابند اور علمائے کرام کی بہت زیادہ خدمت گزار تھیں۔ مدرسہ سراج العلوم بونڈھیار کے طلبہ سے بڑی شفقت ومحبت رکھتی تھیں۔ صوبائی جمعیۃ اہلحدیث بمبئی مولانا کے اس غم میں برابر کی شریک ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

ناظرین اور احباب جماعت سے دعائے مغفرت اور نماز جنازہ غائبانہ کی درخواست ہے۔

محمد امین ریاضی　ناظم صوبائی جمعیۃ اہلحدیث بمبئی۔

آہ ایک شمع فروزاں بجھ گئی!

یہ دلخراش خبر کہ حاجی محمد دانی شوپیانی مورخہ ۴ر جولائی ۱۹۸۴ء رات کے ۱/۲ ۳ بجے اپنے

خالقِ حقیقی سے جاملے ، یہ سن کر ان کا کوئی بھی شناسا آنسو بہائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مرحوم لگ بھگ گزشتہ پچاس سال تک وادی کے اس خوبصورت پہاڑی قصبے کی دینی اور تعلیمی فضا پر کچھ اس طرح چھائے رہے کہ آج یہاں ان کی غیر موجودگی تمام مسلمانوں کو عموماً اور جماعت اہلحدیث کو خصوصاً ایک ناقابلِ تلافی نقصان کا احساس دلارہی ہے۔ وہ اگرچہ ایک کامیاب تاجر تھے لیکن ان کی شکل وصورت، اخلاق وشمائل اور ذوق وشوق کو دیکھ کر کوئی بھی یہ باور نہیں کرسکتا تھا کہ وہ ایک تاجر ہوں گے۔ سڈول جسم، خوش پوش اور وجیہہ، سر پر سفید عمامہ، سیاہ شیروانی زیب تن، سفید پاجامہ ٹخنوں کے اوپر، ریش دراز اور نورانی شکل ہر ملنے والے کو اس کے مناسب حال کوئی قرآنی آیت یا حدیث شریف سنا کر نصیحت کرنا، نیک کام کی ترغیب دینا اور ناجائز حرکات سے بچنے کی تاکید کرنا، مرحوم کا وظیفہ حیات تھا۔ جامع اہلحدیث میں ہمیشہ جمعہ کو صف اول کے وسط میں حاضر ہونا، مسجد کے انتظام میں فعال کردار ادا کرنا اور افراد جماعت کو دینی امور کی طرف متوجہ کرنا آپ کا خاص مشغلہ تھا۔

علمائے ربانی سے لگاؤ آپ کی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو تھا، خوش قسمتی سے آپ مولانا سید حسین شاہ صاحب مولانا محمد انور صاحب اور مولانا عبدالغنی صاحب تینوں کے مصاحب رہے ہیں۔ علم دوستی کا یہ حال تھا کہ ہندوستان کی دوسری ریاستوں سے جو بھی اہلحدیث عالم کشمیر تشریف لاتا وہ ضرور شوپیان آکر آپ کے یہاں ٹھہرتا تھا۔ علماء اور طالب علموں کی خدمت گزاری مسجدوں کی تعمیر وترقی کے علاوہ آپ بچوں کی دینی تعلیم وتربیت میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتے تھے چنانچہ یہ آپ ہی کی جانفشانی اور ایثار کا نتیجہ ہے کہ قصبے میں ایسی درسگاہ قائم ہوئی جس میں اول جماعت سے لے کر آٹھویں جماعت تک چھ سو (۶۰۰) سے زائد طلبہ اور طالبات مروجہ تعلیم کے علاوہ دینی تعلیم حاصل کررہے ہیں۔

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

جماعت اہلحدیث کو اس غم میں خوشی کی ایک کرن یہ دکھائی دے رہی ہے کہ مرحوم کے فرزند اکبر حاجی عبدالرحمن وانی صاحب نے جو اللہ کے فضل وکرم سے اپنے قابلِ فخر والد کے ہر لحاظ سے جانشین ہیں۔ مدرسہ محمدی شوپیان کی صدارت کا بار سنبھالنے کی پیشکش قبول کی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ہمیں اسلام پر ثابت قدم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

طالب خیر محمد عبداللہ طادی۔

صوفی عبدالرحمٰن صاحب جوارِ رحمت میں

یہ خبر نہایت افسوس کے ساتھ سپردِ قلم کی جارہی ہے کہ الحاج صوفی عبدالرحمٰن صاحب کلکتہ جمعۃ الوداع ۲۸ رمضان ۱۴۰۴ھ مطابق ۲۹ جون ۱۹۸۴ء کو انتقال فرماگئے۔ مرحوم مولانا آزاد کے پرانے رفیق اور دینی و ملی تحریکات کے نہایت سرگرم و فعال کارکن، توحید و سنت کے پرجوش شیدائی اور جامعہ سلفیہ کے نہایت اہم اور قدیم ترین رکن رکین تھے، علماء کی قدردانی اور مہمان نوازی میں موصوف کی نظیر بس کم ہی دیکھنے میں آتی ہیں، اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور ان کے اہل خانہ اور جماعت و ملت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین۔

بقیہ ص ۱۳ کا:

کی جڑ بنی رہے گی، بجز اس کے ان کے دل ہی پارہ پارہ ہوجائیں اور اللہ نہایت باخبر حکیم و دانا ہے۔)

اس کو سن کر حاضرین اور خلیفہ زار و قطار رونے لگے، مسجد سے واپسی کے بعد عبدالرحمٰن نے اپنے لڑکے حکم سے قاضی منذر کی شکایت کی اور قسم کھائی کہ آئندہ اس کے پیچھے نماز نہیں پڑھے گا۔ حکم نے باپ سے کہا: قاضی منذر کو ہٹاکر ان کی جگہ کسی دوسرے کو آپ کیوں نہیں امام بنادیتے۔ گو کہ عبدالرحمٰن کو قاضی سے تکلیف پہنچی تھی (کہ نصیحت تلخ تھی) مگر اس کا دل حق پرست تھا، اس نے حکم کو ڈانٹا اور کہا قاضی منذر جیسے عالم، متقی اور حلیم کو ایک گمراہ نفس کی خواہش اور رضامندی کے لیے معزول نہیں کیا جاسکتا، مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ اس کے اور میرے درمیان نمازِ جمعہ کے بارے میں قاضی منذر جیسا شخص سفارشی نہ ہو۔ اگرچہ انھوں نے مجھ پر کاری ضرب لگائی ہے، مگر کاش میں اپنی قسم کے کفارہ میں اپنا پورا ملک دے سکتا۔[1]

ایک ایسی قوم جو خدا، رسولؐ اور یوم آخرت پر یقین رکھتی ہو اس کا نصب العین یقیناً رضائے الٰہی کا حصول ہونا چاہیے نہ کہ محلات و قصور کی تعمیر۔

---

[1] اسلام اور عربی تمدن

اراکین « ندوۃ الطلبہ » کا انتخاب جدید

سابقہ روایات کے مطابق امسال بھی ۲۶ جولائی ۸۴ء بروز جمعرات کو جامعہ کی پرشکوہ مسجد میں مربی انجمن استاذ محترم مولانا عبد الوحید صاحب شیخ الجامعہ اور دیگر اساتذۂ کرام کی نگرانی میں « ندوۃ الطلبہ » کے جدید اراکین کا انتخاب ہوا جس کی تفصیل حسب ذیل ہے :

(۱) اصغر علی ف ۲ صدر
(۲) ارشد سراج ف۲ نائب صدر
(۳) محمود الحسن ف ۱ ناظم
(٤) ضمیر احمد ف ۱ نائب ناظم
(٥) عبد العزیز ف ۲ محاسب
(٦) عبد السلام ف ۲ خازن
(۷) فضل اللہ ف ۱ معتمد صحافت
(۸) شاھد کاظم ف ۱ نائب
(۹) ارشد فہیم الدین ف ۲ معتمد خطابت عربی
(۱۰) جاوید مصطفی ع ۳ نائب
(۱۱) محمد رضوان ف ۱ معتمد خطابت عربی
(۱۲) غیاث الدین ع ٤ نائب
(۱۳) عبد السلام ع ٤ معتمد خطابت عربی
(۱٤) ذبیح اللہ ع ٤ نائب
(۱٥) مشتاق احمد ف ۲ معتمد خطابت اردو
(۱٦) عبد المنان ع ٤ نائب
(۱۷) ارشاد احمد ف ۱ معتمد خطابت اردو
(۱۸) محمد فرخ ع ۳ نائب
(۱۹) نیاز احمد ف ۱ معتمد خطابت اردو
(۲۰) اعجاز احمد ع ۲ نائب
(۲۱) حمید اللہ ع ٥ معتمد دار الکتب
(۲۲) نوشاد عظیم ع ٤ نائب
(۲۳) ارشد حسین ع ۳ معاون
(۲٤) لطف الرحمن ع ۳ معاون
(۲٥) محمد حسین ع ۱ معاون
(۲٦) عطاء الرحمن ع ۲ معتمد دار الاخبار
(۲۷) عبد الحلیم ع ۳ نائب
(۲۸) محمد اسلم ع ۱ معاون
(۲۹) شکیل احمد ع ۱ معاون

محمود الحسن گونڈوی
سکریٹری ندوۃ الطلبہ ، جامعہ سلفیہ بنارس

Reg. No. R. N. 40352/81

August **MOHADDIS** 1984

THE ISLAMIC CULTURAL & LITERARY MONTHLY MAGAZINE
AL-JAMIATUS SALAFIAH (AL-MARKAZIYAH) VARANASI (INDIA)

ہماری اردو مطبوعات

(١) قادیانیت اپنے آئینہ میں	Rs. 16/00
(٢) فتنۂ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ امرتسری	Rs. 16/00
(٣) تاریخ ادب عربی (حصہ اول)	Rs 10/00
(۴) " " (حصہ دوم)	Rs. 15/00
(۵) وسیلۃ النجاۃ	Rs. 7/50
(٦) اللمحات الی مافی انوار الباری من الظلمات (جلد اول)	Rs. 28/00
(٧) " " " (جلد دوم)	Rs. 28/00
(٨) رسالت کے سایے میں	Rs. 15/00
(٩) کتاب الکبائر	Rs. 27/00
(١٠) رمضان المبارک کے فضائل واحکام	Rs. 3/00
(١١) اتباع سنت اور تقلید	Rs 12/00
(١٢) قیاس ایک تقابلی مطالعہ	Rs. 10/00
(١٣) رکعات تراویح کی صحیح تعداد اور علماء احناف	Rs. 1/25
(١۴) جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات	Rs. 9/00
(١۵) جماعت اہلحدیث کی تدریسی خدمات	Rs. 11/00
(١٦) قبروں پر مساجد کی تعمیر اور اسلام	Rs. 15/00
(١٧) تقلید اور عمل بالحدیث	Rs. 8/50
(١٨) خاتون اسلام	Rs. 9/00

مکتبہ سلفیہ، ریوری تالاب، بنارس

Published from Markazi Darul-Uloom
Printed by Abdul Waheed
At Salafiah Press, Reori Talab, Varanasi.

محدث

مرکزی دارالعلوم بنارس کا دینی علمی اور ادبی ماہنامہ

ادارۃ البحوث الاسا

برگ وبار

جامعہ سلفیہ کا علمی ادبی اور اصلاحی رسالہ

ماہنامہ محدث بنارس

ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ • ستمبر ۱۹۸۴ء

بدل اشتراک

سالانہ : ۲۵ روپے

ششماہی : ۱۳ روپے

فی پرچہ : ۲/۵۰ روپے

بیرون ملک سے سالانہ : ۱۵ ڈالر

ترتیب

صفی الرحمن مبارکپوری

ناشر : جامعہ سلفیہ بنارس

طابع : عبدالوحید

مطبع : سلفیہ پریس بنارس

کاتب : انور جمال

پتہ :-

خط وکتابت کے لیے : ایڈیٹر محدث، جامعہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس

بدل اشتراک کے لیے : مکتبہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس

→ MAKTABA SALAFIAH REORITALAB VARANASI-10

ٹیلی گرام : دارالعلوم، وارانسی • ٹیلی فون : ۶۳۵۷۷ ،

یادگارِ خلیلؑ

شوق اعظمی

خلیل اللہ یعنی وہ رضائے رب کا دیوانہ
ازل سے مست تھا پی کر مئے وحدت کا پیمانہ
وہی جس کے لیے تھی آتشِ نمرود بھی گلشن
وہی جس نے کیا مسمار باطل کا صنم خانہ
وہ مردِ حق خلیل اللہ کا جس نے لقب پایا
حریم قدس سے جس کو ملا خلعت کا پروانہ
دیا سارے زمانے کو سبق توحید کا جس نے
وہ تھا اہلِ صفا حق آشنا باطل سے بیگانہ
غروب شمس سے ذاتِ الوہیت کو پہچانا
حریم قدس کا محرم مئے وحدت کا مستانہ
پکارا اپنے رب کو لا احب الآفلین کہہ کر
ہمیشہ غرق تھا عشقِ الٰہی میں وہ فرزانہ
وہی جس نے کیا نورِ یقیں روشن زمانے میں
وہی جو تھا محیطِ معرفت کا دُرِّ یکدانہ
کیا قربان بیٹے کو فقط اوحیٰ اشارے پر
نہ دیکھا اس نے بہتر بارگاہِ حق میں نذرانہ
رضائے رب کے آگے سر فگندہ ہو گئے دونوں
پدر تھا حق کا شیدائی پسر بھی رب کا دیوانہ
جگر کا خون ہو جائے اسی میں لطف آتا ہے
محبت کا تقاضا سب سے ہوتا ہے جداگانہ
اسی کی یادگار اب تک ہے باقی بزمِ دنیا میں
اسی کی یاد میں اسے شوق ہے یہ عید سالانہ!

نقشِ راہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور عدم تشدد

بنارس راجگھاٹ کے پاس گنگا اور برنا ندی کے سنگم پر گاندھی جی کے فلسفہ کی تشہیر و تبلیغ کیلیے گاندھین انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم ہے، جہاں دیگر پروگراموں کے علاوہ وقتاً فوقتاً مقررہ عنوانات پر تقریریں بھی کرائی جاتی ہیں۔ ۹ راگست ۸۳ء کو مذکورہ عنوان پر ایڈیٹر محدث سے تقریر کرائی گئی۔ ذیل میں اس تقریر کی ایک قسط پیش کی جارہی ہے۔" (ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم،

امابعد! میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے گاندھی جی کے ایک اصول کے تعلق سے ہنسا اور اہنسا یا تشدد اور عدم تشدد کا لفظ بار بار سنا ہے۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ ڈکشنری میں اس لفظ کا جو معنی آتا ہے گاندھی جی اسی معنی میں اہنسا کو مانتے تھے یا ان کے یہاں اس کے کچھ اصول، ضابطے، شرطیں اور حدیں بھی تھیں۔ لیکن آج کی مجلس میں مجھے اس کی تلاش بھی نہیں۔ بلکہ مجھے ہنسا اور اہنسا کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر سے گفتگو کرنی ہے البتہ اصل معاملے پر کچھ کہنے سے پہلے ایک بات واضح کر دینا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ دینِ فطرت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے اندر پیدائشی طور پر جو تقاضے رکھے گئے ہیں۔ اسلام نے ان سب کی رعایت کی ہے، یعنی انھیں کچل کر ختم نہیں کیا ہے بلکہ ان کے لیے ایسا صحیح راستہ بتایا ہے کہ

انسان کی فطرت کے تقاضے بھی پورے ہوجائیں اور انسانی سماج میں اس سے کوئی برائی بھی جنم نہ لے، بلکہ انسانی سماج کو فائدہ ہی پہنچے۔

اس بات کو سامنے رکھ کر پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ تشدد اور عدم تشدد کے بارے میں انسان کی فطرت کیا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ کوئی بھی انسان یہ نہیں چاہتا کہ اس کی جان ماری جائے، اس کے ہاتھ پاؤں توڑے جائیں، اسے مارا پیٹا جائے، یا اس کا دھن دولت چھین لیا جائے یا اسے بے عزت کیا جائے، مثلاً اسے گالی دی جائے۔ اس پر کوئی برا الزام لگایا جائے۔ اور انسانی سوسائٹی میں اسے رسوا کیا جائے۔ یعنی ہر انسان اپنی تین چیزوں کا بچاؤ چاہتا ہے، ایک یہ کہ اس کا جسم اور جان محفوظ رہے۔ دوسرے یہ کہ اس کا مال محفوظ رہے اور تیسرے یہ کہ اس کی عزت محفوظ رہے۔ یہ انسان کی فطرت نیچر ہے۔

مگر یہ انسان کی فطرت کا صرف ایک پہلو ہے، اس کے علاوہ ایک دوسرا پہلو یہ بھی ہے کہ اگر کسی انسان کو جان سے مار ڈالا جائے تو اس کے باپ بیٹے اور گھرانے کے لوگ یہی چاہیں گے کہ مارنے والے سے اس کا بدلہ لیں۔ یہ لوگ چاہے جتنے بھی کمزور ہوں اور مارنے والے جتنے بھی طاقتور ہوں مگر جہاں تک ہوسکے گا بدلہ لینے کی کوشش اور جتن کریں گے اور اگر حالات سے مجبور ہو کر چپ سادھ بھی لیں تو ان کے دل میں اس کی حسرت اور کسک برابر باقی رہے گی اور انہیں ذرا بھی چھیڑ دیجیے تو اپنا دکھڑا رونا شروع کر دیں گے اور دل کی آہ زبان پر آجائے گی۔ لیکن اگر بدلہ مل جائے تو ان کے دل میں حسرت نہیں رہ جائے گی۔ بلکہ انہیں اطمینان ہوجائے گا کہ انصاف مل گیا۔

یہی صورت اس وقت بھی ہوتی ہے جب کسی کا ہاتھ پاؤں توڑ دیا جائے یا اسے مارا پیٹا جائے یا اس کا مال چھین لیا جائے۔ یہ مظلوم جب تک ظالم سے بدلہ نہ لے لے اسے چین نہیں ملتا اور اس کی آہ نہیں جاتی۔ اسی طرح کوئی کسی کو گالی دے دے، یا مثلاً اس کی ماں پر تہمت لگا دے یا اور کسی ذریعہ سے بے عزت کر دے تو وہ اسے آسانی سے برداشت نہیں کر سکتا، بلکہ جوابی کارروائی کرے گا اور اگر نہ کر سکا تو کڑھ کڑھ کر رہے گا اور من ہی من میں گالیاں دے گا۔ یہ ایسی حقیقتیں ہیں جنھیں جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جہاں انسان کی فطرت یہ ہے کہ اس کا جسم و جان، مال و دولت اور عزت و آبرو محفوظ رہے، وہیں انسان کی فطرت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص ان تینوں میں سے کسی ایک چیز پر حملہ کرے تو

اس سے بدلہ لیا جائے اور اگر وہ خود بدلہ نہ لے سکے تو اس کو بدلا دلایا جائے۔ اس لیے اگر انسانی سماج کو کوئی ایسا نظام دیا جائے جس میں انسانی فطرت کے ان دونوں پہلوؤں کی رعایت کی گئی ہو تو وہ نظام تو کامیابی سے چل سکتا ہے لیکن اگر کوئی ایسا نظام بنایا جائے جس میں ان دونوں میں سے کسی ایک بھی پہلو کو چھوڑ دیا گیا ہو تو وہ نظام فیل ہو جائے گا۔ اور کسی قیمت پر نہیں چل سکے گا۔

اس وضاحت کے بعد اب میں بتانا چاہتا ہوں کہ اس بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ جیسا کہ میں نے عرض کیا اسلام چونکہ دین فطرت ہے، اس لیے اس نے انسانی فطرت کے ان دونوں پہلوؤں کی پوری پوری رعایت کی ہے۔ یعنی آپ پہلے پہلو کو لیجیے تو اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں کہ کوئی شخص کسی کی جان مال یا آبرو پر حملہ کرے۔ بلکہ اسلام نے نہایت سختی سے اس کی ممانعت کی ہے اور اسے بہت ہی بُرا اور گھناؤنا جرم قرار دیا ہے۔ میں اس بارے میں اسلام کی اصل کتاب قرآن مجید اور حدیث سے دو تین حوالے پیش کر دینا چاہتا ہوں، تاکہ معلوم ہو سکے کہ اسلام کے نزدیک ان جرائم کی حیثیت کیا ہے۔ قرآن میں پچھلے زمانے کی ایک قوم کا ذکر کرتے ہوئے ایک اصول بیان کیا گیا ہے:

انہ من قتل نفساً بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعاً و من احیاھا فکانما احیا الناس جمیعاً۔

(سورہ مائدہ)

یعنی جس نے کسی ایک جان کو بھی قتل کر دیا اور ایسا تو کسی جان کے بدلہ لینے کے لیے کیا اور نہ زمین میں پھیلے ہوئے فساد سے نمٹنے کے لیے کیا تو اس نے گویا سارے انسانوں کو قتل کر دیا۔ اور جس نے ایک جان کو زندہ بچا لیا تو اس نے گویا سارے انسانوں کو زندہ بچا لیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی آدمی شروعات کے طور پر کسی ایک بھی آدمی کو قتل کر دے تو وہ اتنا بڑا جرم ہے کہ گویا اس نے سارے انسانوں کو قتل کر دیا، کیونکہ اس نے انسان کے قتل کا دروازہ کھولا۔ یہ ہے اسلام میں انسانی جان کا احترام۔

اسی طرح اسلام میں دوسرے کا مال کھانا بھی سخت حرام ہے، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ایک بار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک جائداد کا مقدمہ آیا۔ آپ نے سمجھایا کہ دیکھو میں بھی انسان ہوں، ہو سکتا ہے کہ کسی کے زور بیان کی وجہ سے اس کو ڈگری دے دوں اور حقیقت میں مال اس کا نہ ہو تو پھر سن لو کہ میں نے

آگ کا ٹکڑا دے رہا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کورٹ سے ڈگری بھی مل جائے تب بھی دوسرے کا مال کھانا اسلام کی نظر میں حرام اور نہایت ہی خطرناک جرم ہے۔ ایسا آدمی اس دنیا میں اگر بچ بھی جائے تو آس دنیا میں نہیں بچ سکتا۔

اب آدمی کی عزت و آبرو کا معاملہ لیجیے۔ اسلام میں اس کی کتنی اہمیت ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ایک بار محمد صلی اللہ علیہ وسلم چند آدمیوں کے ساتھ جا رہے تھے۔ پیچھے دو آدمیوں نے آپس میں باتیں کرتے کرتے ایک آدمی کو جو ایک سزا میں مارا گیا تھا، کتا کہہ دیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کان میں یہ آواز پڑ گئی۔ آپ تھوڑی دور گئے تو دیکھا کہ ایک گدھا مرا پڑا ہے اور اتنا پھول گیا ہے کہ ٹانگیں تن گئی ہیں، آپ رک گئے اور ان دونوں سے کہا جاؤ اس گدھے کا گوشت کھاؤ۔ وہ دونوں ہکا بکا رہ گئے کہ آخر ہم سے کیا جرم ہو گیا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ ابھی تم دونوں نے ایک آدمی کو جو کتا کہا تو وہ اس سڑے ہوئے گدھے کی لاش کھانے سے بھی زیادہ برا تھا۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ کسی کی عزت پر بٹہ لگانا اسلام میں کتنا بڑا جرم ہے۔

ابتک کی گفتگو اس پہلو سے تھی کہ اسلام میں کسی کی جان یا مال یا آبرو پر حملہ کرنے کی قطعاً اجازت اور گنجائش نہیں، لیکن اگر کوئی آدمی اس ممانعت کے باوجود کسی کی جان یا مال یا آبرو پر حملہ کر بیٹھے تو اسلامی حکم یہ ہے کہ حملہ آور کو ایسی سزا دی جائے کہ مظلوم کو پورا پورا بدلہ مل جائے، لیکن حملہ کرنے والے پر ظلم بھی نہ ہو۔ یعنی اس نے جتنا بڑا جرم کیا ہے اس سے بڑی سزا نہ دی جائے۔ اس بارے میں یہ بھی طے کر دیا گیا ہے کہ عدالت اور کورٹ کو یا ملک کے سربراہ کو مثلاً صدر، راشٹرپتی، راجا، بادشاہ، گورنر جنرل وغیرہ کو اس بات کا کوئی اختیار نہ ہوگا کہ ایسے مجرم کی سزا معاف کر دیں یا کم کر دیں بلکہ یہ اختیار صرف ان لوگوں کو ہوگا جن پر حملہ اور ظلم کیا گیا ہو۔

بیجا نہ ہوگا کہ اس موقع پر یہ بھی بتاتا چلوں کہ ان جرائم کی اسلامی سزا کیا ہے؟ سزا یہ ہے کہ قاتل نے اگر جان بوجھ کر قتل کیا ہے تو اسے بھی قتل کر دیا جائے اور اگر غلطی سے قتل کیا ہے تو اس پر بھاری مالی تاوان لگایا جائے اور تاوان مقتول کے گھر والوں کو دیا جائے۔ اگر کسی نے کسی پر حملہ کیا ہے تو حملہ آور نے جیسی چوٹ لگائی ہے اسے بھی ویسی ہی چوٹ لگائی جائے یا چوٹ کی نوعیت کے لحاظ سے کڑا مالی تاوان لگایا جائے، کسی نے کسی کا مال چوری کیا ہے تو کچھ خاص شرطیں پوری ہونے کی صورت میں چور کا ہاتھ کاٹ لیا جائے ورنہ جج اپنی صوابدید سے مناسب سزا دے، اور مال برآمد ہو جائے تو اسے اصل مالک کے حوالے کر دیا جائے۔ اسی طرح اگر کسی نے کسی کی

عزت پر بٹہ لگایا ہے تو ملزم کی حالت کا اندازہ کر کے جج کوئی ایسی سزا دے کہ ملزم آئندہ ایسی حرکت نہ کرے۔

ہاں اگر کوئی شخص کسی بدمعاش یا ڈکیت سے اپنی جان یا مال یا آبرو کی حفاظت کرتا ہوا مارا جائے تو وہ مظلوم ہے ۔لیکن اگر وہ خود حملہ آور کو مار ڈالے تو ظالم نہیں ہے ، لہذا اس سے بدلہ نہیں لیا جائے گا۔ دونوں کے متعلق محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ایک ارشاد سناتا ہوں ۔ ایک بار آپ نے فرمایا؛ جو اپنی جان بچانے میں مارا جائے وہ شہید ہے ،جو اپنا مال بچانے میں مارا جائے وہ شہید ہے ، اور جو اپنی آبرو بچانے میں مارا جائے وہ شہید ہے

(بخاری، مسلم، مشکوٰۃ ص ۳۰۵)

اور ایک بار ایک آدمی نے آکر سوال کیا کہ اے اللہ کے رسول! یہ بتائیے کہ اگر کوئی آدمی آکر میرا مال چھیننے لگے تو ... ؟ آپ نے فرمایا : اسے اپنا مال نہ دو ، اس نے کہا اگر وہ مجھ سے لڑائی کر بیٹھے تو ؟ آپ نے فرمایا تم بھی اس سے لڑ جاؤ ، اس نے کہا اگر وہ مجھے قتل کر دے تو ؟ آپ نے فرمایا : تم شہید ہو گئے ۔ اس نے کہا اگر میں اسے قتل کر دوں تو ؟ آپ نے فرمایا وہ جہنم میں جائے گا۔ (صحیح مسلم مشکوٰۃ ص ۳۰۵)

ان دونوں کا حاصل یہ ہے کہ اپنا بچاؤ کرنا ہر شخص کا حق ہے ۔ اگر بچاؤ کرنے والا خود مارا گیا تو مظلوم ہے اور حملہ آور سے اس کا بدلہ لیا جائے گا ۔لیکن اگر حملہ آور مارا گیا تو وہ ظالم تھا اس لیے اس کا خون رائیگاں جائے گا اور بدلہ نہیں لیا جائے گا۔

یہاں اسلامی قانون کے ایک ایک ٹکڑے کی تفصیل بتانے کی گنجائش نہیں ، مختصر یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے دائرے میں کوئی بھی آدمی مظلوم مارا جائے تو اس کا خون رائیگاں نہیں جائے گا اگر کسی بھی طرح قاتل کا پتہ نہ چل سکا تو مقررہ مالی تاوان حکومت کے خزانے سے دیا جائے گا۔

ابتک کی گزارشات کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام تشدد شروع کرنے کی اجازت نہیں دیتا لیکن جو تشدد کرے ، اسے آزاد بھی نہیں چھوڑتا اور نہ معمولی سزائیں دے کر اس کی ہمت کو بڑھا دالنے کا موقع دیتا ہے بلکہ جیسا جرم ہے ٹھیک اسی کے مطابق سزا دیتا ہے اور اس طرح تشدد کی جڑ کاٹتا رہتا ہے ۔ دراصل پوری انسانی تاریخ کا تجربہ ہے کہ انسانی سماج سے اس طرح کے جرائم کبھی بھی ایکدم ختم نہیں ہو جاتے ، مجرم انسان ہمیشہ پائے گئے ہیں اور ہمیشہ پائے جائیں گے ، اس لیے اس کا علاج صرف یہی ہے کہ سزا اتنی کڑی دی جائے کہ ایسے جرائم کم سے کم ہو کر نہیں کے برابر رہ جائیں ۔

کڑی سزا کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اور نرم سزا کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اس کا پتہ مختلف ملکوں میں ہونے والے جرائم کے شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔ امریکہ اپنے آپ کو انسانی حقوق کا علمبردار و پاسبان اور تہذیب و تمدن کا لیڈر کہتا ہے مگر وہاں کے جرائم کے متعلق سات سال پہلے کی رپورٹ یہ ہے کہ:

امریکہ میں ہر ۲۳ منٹ میں ایک قتل، ہر ۱۹ منٹ میں ایک عورت کا جبری اغوا، ہر دو منٹ میں ایک چوری ہر بیس سکنڈ میں گھر پر حملہ، ہر ۴۸ سکنڈ میں بس یا کار پر حملہ اور ہر بیس سکنڈ میں ایک ڈاکہ کا کیس پیش آتا ہے۔

یہ سات سال پہلے کی رپورٹ ہے، اب ان جرائم میں کچھ اور اضافہ ہوا ہے اس کے برعکس سعودی عرب کو دیکھیے جہاں اسلامی سزائیں نافذ ہیں جنھیں موجودہ علمبرداران تہذیب کڑی ہی نہیں وحشیانہ بھی کہتے ہیں۔ ان سزاؤں کے نفاذ کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں سال کے سال گزر جاتے ہیں، اور قتل اور چوری ڈاکے وغیرہ کی شاید باید ہی کوئی واردات ہوتی ہے اور وہ بھی عموماً باہری لوگوں کے ہاتھوں۔

آئیے ذرا اس معاملے کا جائزہ اس پہلو سے بھی لیں کہ امریکہ کے دور اندیش شہری اپنے یہاں کی مذکورہ صورتحال کے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں اور ان کے نقطۂ نظر سے اس کا علاج کیا ہے؟ چند سال پہلے کی بات ہے کہ پاکستان میں کچھ اخلاقی مجرموں کو مجمع عام میں کوڑوں کی سزا دی گئی، اس پر نیویارک ٹائمز نے استہزا اور تمسخر کا انداز اختیار کیا اور اس موضوع پر اپنے یہاں مراسلات کا ایک کالم کھول دیا۔ اس کالم میں شکاگو کی رہنے والی ایک امریکن خاتون ۔ ایلا شارکا بھی ایک خط چھپا، وہ لکھتی ہیں:

"اسلام کے عدل و انصاف کے نام پر ہی میرا خیال ہے کہ ہمیں بھی اس قسم کی سزا کو رائج کرنا چاہیے جو فوری اور سنگین طور پر مجرموں کی گوشمالی کر سکے۔ اگر ہمارے یہاں اس قسم کا نظام رائج ہو تو ہم بھی آبروریزی، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کے خوف سے بے نیاز ہو کر کوچہ و بازار میں چل پھر سکیں اور ممکن ہے ہمارے جیل خانے مجرموں سے اتنا نہ بھریں جتنا آجکل بھرے ہوتے ہیں۔" (ریاست جدیدہ کانپور ۱۲ر دسمبر ۱۹۷۹ء)

اسی سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ آج کل کا ہے۔ کویت کی ایک خاتون جن کا نام ام المثنیٰ ہے، کچھ دنوں امریکہ میں رہیں۔ ان کا ایک تازہ بیان کویت کے ایک مشہور ہفت روزہ رسالہ المجتمع نے ۷ر جولائی ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں شائع کیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

"امریکہ میں اپنے قیام کے دوران کچھ دنوں کے لیے میں ایک ہسپتال میں بھرتی ہوئی، وہاں ایک

امریکن نرس سے میرا میل جول بڑھ گیا، چونکہ میں پابندی سے اسلامی چادر اوڑھتی تھی، اس لیے وہ مجھ سے بار بار میرے ملک اور میرے مذہب کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔ ایک دن اس نے مجھ سے اسلامی سزاؤں کے بارے میں پوچھا کہ یہ سزائیں کیا ہیں؟ میں نے کہا قاتل کو قتل کر دیا جائے، چور کا ہاتھ کاٹ لیا جائے۔ حرام کاری کرنے والے کو پتھر مار کر ختم کر دیا جائے یا کوڑے مارے جائیں ...

اور ... یہ سن کر اس نے بڑی حیرت اور خوشی ظاہر کی۔ کہنے لگی میری آرزو ہے کہ میرے ملک میں بھی اسلامی شریعت لاگو کی جائے۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ کے ملک میں یہ سزائیں دی جاتی ہیں؟ میں نے کہا نہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ بعض لوگ انھیں موجودہ زمانہ کے لائق نہیں سمجھتے اور خلاف تہذیب مانتے ہیں۔

پھر میں نے اس سے کہا: مجھے تعجب ہے کہ تم اسلامی شریعت کو لاگو کرنے کے بارے میں اتنی گرمجوش کیوں ہو۔ جب کہ خود میرے ملک کے بعض لوگ اس پر نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں؟ اس نے کہا کہ جو شخص اتنی بہترین سزاؤں کو نشانہ بناتا ہے وہ غلطی کرتا ہے، ہم لوگ اپنے ملک میں قتل، چوری، ڈکیتی، اغوا، وغیرہ کے روز مرہ بے انتہا جرائم کی وجہ سے امن وامان کی بربادی اور لاقانونیت کی کڑی سزا جھیل رہے ہیں اور ان جرائم کی وجہ صرف ایک ہی ہے کہ کافی ثبوت مہیا ہو جانے کے بعد بھی مجرموں کو کوئی ایسی کڑی سزا نہیں دی جاتی کہ وہ آئندہ جرم کرنے کی ہمت نہ کریں۔

اس کے بعد اس نرس نے بتایا کہ اس کا شوہر پولیس میں ہے اور اس معاملے کی وجہ سے سخت مشکل سے دوچار رہتا ہے، کیونکہ مجرم کو پکڑنے کے لیے پولیس یونٹ جس قدر محنت ومشقت کرتی ہے ان سب پر اس وقت پانی پھر جاتا ہے جب جج اس کو بے گناہ قرار دے دیتا ہے یا معمولی سزا دے کر چھوڑ دیتا ہے۔ اس سے مجرموں کی ہمت اور بڑھ جاتی ہے اور وہ نئے سرے سے جرم کر کے شہریوں کا امن وامان تہ وبالا کرتے رہتے ہیں۔

یہ باتیں کہتے کہتے وہ نرس اداس ہو گئی اور رخصت ہونے سے پہلے بولی: تمھارے ملک کے جو لوگ ان سزاؤں کو لاگو کرنے کی مخالفت کرتے ہیں وہ غلطی پر ہیں، انھیں چاہیے کہ ہمارے ملک کی جو درگت بن چکی ہے اس سے سبق سیکھیں اور اپنے ملک میں اس کی نوبت آنے سے پہلے ہی

ان سزاؤں کو لاگو کروادیں ۔ "

دور کیوں جائیے اپنے ملک میں باغپت (ضلع میرٹھ) میں جو حادثہ پیش آیا تھا کہ پولیس نے ایک عورت کو ننگا کرکے گھمایا تھا اور اس پر سخت ہیجان پھیل گیا تھا ۔ اس کے بعد اچھے اچھے ماہرین قانون نے تجویز دی تھی کہ عورتوں کے ساتھ اس طرح کا معاملہ کرنے والوں کو پھانسی کی سزا دی جائے اور اس طرح کے کیس بند کمرے میں سنے جائیں اور عورتوں سے بیان لینے والی جج عورتیں ہوں ۔

سسوا بازار ضلع گورکھپور ، اسی طرح دیوریا اور بستی ضلع کے بعض بعض دیہاتوں میں پولیس نے جس بے دردی سے عورتوں کی آبرو لوٹی ، بیلچھی اور دوسری جگہوں پر جس سنگدلی کے ساتھ ہریجنوں کو اور جبل پور بھیونڈی وغیرہ میں مسلمانوں کو آگ کے اندر زندہ جلایا گیا ، مجھے یقین ہے کہ اگر ہمارے ملک میں انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے مجرموں کو کڑی سزائیں دی جاتیں تو بڑے سے بڑا سورما بھی مجبوروں اور نہتوں پر اس طرح کا ظلم کرنے کی ہمت نہ کرتا ۔ کڑی سزاؤں سے صرف بڑے بڑے جرائم ہی بند نہیں ہوتے بلکہ چھوٹے چھوٹے جرائم بھی ختم ہوجاتے ہیں ۔ سعودی عرب میں جس کا ذکر پیچھے آچکا ہے ، میں نے خود دیکھا کہ دکان کے نمونہ کا سامان رات بھر سڑک کے کنارے دکان کے باہر لٹکتا رہتا ہے ، مگر کسی کو آنکھ اٹھاکر دیکھنے کی ہمت نہیں پڑتی ۔ دوکان کھلی چھوڑکر لوگ نماز پڑھنے چلے جاتے ہیں ، مگر ایک معمولی سا سامان بھی غائب نہیں ہوتا ۔ دنیا بھر کی کرنسیاں بدلنے والوں کی دوکان کے پھاٹکوں پر ہر طرف نوٹوں کی گڈیاں اس طرح لگی رہتی ہیں کہ ہمارے یہاں پان کی دوکان والے بھی اس سے زیادہ احتیاط سے رہتے ہیں ۔ مگر اس کے باوجود ایک نوٹ بھی غائب نہیں ہوتا ۔ لوگ بینکوں سے لاکھوں لاکھ کے نوٹوں کی گڈیاں اس طرح مٹھی میں لے کر چلتے ہیں جیسے معمولی ترکاری لے جارہے ہوں ، مگر مجال نہیں کہ کوئی بری نیت سے تاک سکے ۔ عورتیں دن یا رات میں کسی بھی وقت کہیں بھی جارہی ہوں ، انہیں کوئی خطرہ نہیں ۔

ہمارے سامنے پڑوس کے ملک پاکستان کی تازہ مثالیں موجود ہیں ۔ جنرل ضیاء الحق نے جب پہلی بار اعلان کیا کہ اب پاکستان میں اسلامی سزا لاگو ہوگی اور چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا تو اس کے ایک مہینے کے بعد قومی آواز لکھنؤ میں میں نے ایک چھوٹی سی خبر پڑھی کہ پہلے شہر کراچی میں ہر رات ۲۷ چوریاں ہوتی تھیں جن میں سے اکثر چوریاں بہت بڑی ہوا کرتی تھیں ۔ مگر جنرل ضیاء کے مذکورہ اعلان کے بعد ۲۷ روز میں صرف ۷ چوریاں ہوئیں اور وہ بھی بہت معمولی قسم کی ۔

اسی طرح جنرل ضیاء کی فوجی حکومت کے شروع دنوں کی بات ہے۔ تین بدمعاشوں نے مل کر سات آٹھ سال کے ایک بچے کو اغوا کیا، اور اس کے باپ کو فون پر نوٹس دی کہ فلاں دن فلاں جگہ غالباً چالیس ہزار روپئے پہنچا دو ورنہ بچے کو قتل کر دیا جائے گا۔ بیٹا بیٹا ہی ہوتا ہے، اس کے سامنے روپئے پیسے دھن دولت کی کیا حیثیت۔ باپ نے روپئے بھجوا دیے، مگر کوئی لینے نہ آیا، اور پھر بچے کی لاش پائی گئی۔ خفیہ پولیس مجرموں کی تلاش میں تھی۔ آخر تینوں پکڑے گئے، عدالت سے پھانسی کا فیصلہ ہوا، اور تینوں کو لاہور کے ایک چوراہے پر پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا گیا اور لوگوں کے دیکھنے کے لیے دیر تک لٹکتا چھوڑ دیا گیا۔ اس کے بعد یہ حال ہوا کہ جیسے دوسرے بدمعاشوں کی ہمت ہی جواب دے گئی ہو۔

اس طرح کی مثالیں تو بہت سی ہیں، مگر ہم مثالوں کے بجائے نتائج کی طرف توجہ دلانا چاہتے ہیں، نتائج یہ ہیں کہ کڑی سزا دیجیے تو جرائم گھٹ کر نہیں کے برابر رہ جاتے ہیں اور سزا نرم کر دیجیے تو لاکھوں اور کروڑوں تک جا پہنچتے ہیں۔ امریکہ میں جرائم کے جو اعداد و شمار بتلائے گئے[1] ذرا ان کا سالانہ حساب جوڑیے تو معلوم ہوگا کہ وہاں سال بھر میں ۱۲،۲۲۳ آدمی مارے جاتے ہیں۔ ۲۷،۳۹۸ عورتیں زبردستی اٹھا لے جائی جاتی ہیں، ۔۔۔ ۶،۶۲،۸۰۰ چوریاں ہوتی ہیں۔ ۱۵،۷۶،۸۰۰ ڈاکے پڑتے ہیں اور گھروں، کاروں، بسوں پر ۲،۶۵،۲۰۰ حملے ہوتے ہیں۔ یعنی مجموعی طور پر سال بھر میں ۲۱،۴۴،۴۶ حادثے ہوتے ہیں۔ اور یہ کھلی بات ہے کہ اسی حساب سے خونی، ڈاکو، چور اور مجرم بھی تیار ہوتے ہیں۔

اب سوچیے کہ تشدد کو روکنے اور پبلک کو سکھ چین پہنچانے کے لیے یہ نظام اچھا ہے یا سعودی عرب جیسا وہ نظام جس کے نتیجے میں قاتل مقتول دونوں کو ملا کر مشکل سے دو چار جانیں جاتی ہیں اور مشکل سے چوری وغیرہ کے دس پانچ حادثے ہوتے ہیں اور خونی، ڈکیت چور وغیرہ تیار ہی نہیں ہونے پاتے، بلکہ فوراً ہی ان کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

اگر دنیا کو تشدد سے بچنا ہے تو اس پہلو پر ٹھنڈے دل سے سوچنا پڑے گا۔

• • •

---

[1] ایک دو سال پہلے کی رپورٹ میں سالانہ قتل کی واردات ایک لاکھ بتائی گئی ہے

مردے کی طرف سے قربانی

ابوہشام اعظمی

محدث ماہ اکتوبر ۱۹۸۳ء کے شمارے میں ایصالِ ثواب سے متعلق ایک فتویٰ کے ضمن میں میت کی طرف سے قربانی کے جواز کا بھی ذکر آیا تھا، پھر اس پر کئی سمتوں سے سوالات کیے گئے۔ عید الاضحیٰ کی مناسبت سے ان سوالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس مسئلے کی وضاحت کی جا رہی ہے۔ واللہ الموفق

میت کی طرف سے قربانی درست ہے یا بے فائدہ؟ اس بارے میں علماء امت کی دو رائیں ہیں۔ تمام علماء نے درست مانا ہے، اور کچھ لوگ اس کے قائل نہیں۔ درست ماننے والوں نے دو مضمون کی روایتوں سے استدلال کیا ہے۔ ایک مضمون کی دو روایتیں یہ ہیں:

(۱) عن ابی رافع ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا ضحّٰی اشتری کبشین سمینین اقرنین املحین فاذا صلی وخطب الناس اتی باحدھما وھو قائم فی مصلاہ فذبحہ بنفسہ بالمدیۃ ثم یقول اللھم ھذا عن امتی جمیعا من شھد لک بالتوحید وشھد لی بالبلاغ ثم یوتی بالآخر فیذبحہ بنفسہ فیقول ھذا عن محمد وآل محمد فیطعمھما جمیعا المساکین ویاکل ھو واھلہ منھما۔ (مسند احمد)

یعنی ابو رافع کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جب قربانی کرنی ہوتی تو دو موٹے سینگدار چتکبرے مینڈھے خریدتے، جب نماز پڑھ لیتے اور لوگوں کو خطبہ دے لیتے تو ایک مینڈھا لایا جاتا اور آپ اپنی نماز گاہ میں کھڑے موجود ہوتے، اسے خود چھری سے ذبح کرتے اور فرماتے اے اللہ یہ میری ساری امت کی طرف سے ہے، جس نے تیرے لیے توحید کی اور میرے لیے تبلیغ کی شہادت دی ہے۔ پھر دوسرا مینڈھا لایا جاتا، اسے بھی آپ خود ہی ذبح فرماتے، پھر کہتے، یہ محمد اور آل محمد کی طرف سے ہے۔ پھر دونوں مینڈھوں میں سے مسکینوں کو بھی کھلاتے اور خود

آپ اور آپ کے اہل و عیال بھی کھاتے ۔

(۲) دوسری روایت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہے اور مختصر ہے ، الفاظ یہ ہیں : ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا اراد ان یضحی اشتری کبشین عظیمین سمینین اقرنین املحین موجوئین فذبح احدھما عن امتہ من شھد للہ بالتوحید وشھد لہ بالبلاغ وذبح الآخر عن محمد وعن آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم (سنن ابن ماجہ ۲/۳۴۳، ۱۰۴۳)

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب قربانی کا ارادہ فرماتے تو دو زبردست، موٹے، سینگدار، چتکبرے، خصی کیے ہوئے مینڈھے خریدتے پھر ان میں سے ایک کو اپنی امت کی طرف سے یعنی ان لوگوں کی طرف سے ذبح فرماتے جنھوں نے اللہ کے لیے توحید کی اور آپ کے لیے تبلیغ کی شہادت دی ہے اور دوسرا محمد اور آل محمد کی طرف سے ذبح کرتے ۔

ان روایتوں سے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلا جانور اپنی اس پوری امت کی طرف سے ذبح کیا تھا جو اس وقت تک توحید و رسالت کی شہادت دے چکی تھی اور معلوم ہے کہ اس میں ایسے افراد کی بھی ایک معتد بہ تعداد تھی جو اس دنیا سے گزر چکے تھے ۔ لہٰذا آپ کی یہ قربانی امت کے اس وقت کے موجودہ افراد کے علاوہ ان مردہ افراد کی طرف سے بھی ہوئی ۔ پس مردے کی طرف سے قربانی کرنا درست ہے ۔

اس استدلال پر عموماً دو اعتراض کیے جاتے ہیں ۔ ایک یہ کہ یہ قربانی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص تھی ۔ دوسرے یہ کہ اس قربانی میں زندہ اور مردہ دونوں کو شریک کیا گیا تھا ۔ اس لیے زندوں کو شامل کیے بغیر صرف مردے کی طرف سے قربانی کی مشروعیت ان دونوں روایتوں سے ثابت نہیں ہوتی لیکن اگر دقت نظر سے دیکھا جائے تو ان دونوں اعتراضات میں کچھ زیادہ وزن نہیں ہے ۔

پہلے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ یہ قربانی ہر اعتبار سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص نہ تھی ۔ بلکہ صرف اس اعتبار سے مخصوص تھی کہ یہ پوری امت کی طرف سے کی گئی تھی ۔ جبکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی اور شخص پوری امت کی طرف سے ایک مینڈھے کی قربانی نہیں کر سکتا باقی رہے دوسرے اعتبارات ، اور دوسرے پہلو مثلاً یہ کہ اس سے فی الجملہ مردوں کی طرف سے بھی قربانی کی مشروعیت ثابت ہوتی ہے تو اس کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص قرار دیے جانے کی نہ کوئی وجہ ہے ، نہ دلیل ، لہٰذا اسے آپ کے ساتھ مخصوص نہیں مانا جائے گا ۔ جس طرح زندوں کی طرف سے قربانی کرنے کو آپ کے ساتھ مخصوص نہیں مانا گیا ہے ۔

حالانکہ وہ بھی آپ کی اس قربانی کا ایک پہلو ہے۔

دوسرے اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اتنی بات مسلم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ قربانی میں زندوں اور مردوں دونوں کو شریک کیا گیا تھا، لیکن یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی اور نہ دور دور تک اس کا کہیں اتہ پتہ یا اشارہ ہی موجود ہے کہ زندوں کو اس لیے شریک کیا گیا تھا کہ ان کو شریک کیے بغیر مردوں کی طرف سے قربانی درست نہیں ہوگی لہٰذا اس کو شرط قرار دیے جانے کی جب تک کوئی دلیل فراہم نہ کر دی جائے اس وقت تک اسے بطور شرط قبول نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ صرف امر واقعہ کی حیثیت سے اس کیفیت کے وجود کو تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ اگر کوئی کام اصولاً ناجائز ہو لیکن کسی مخصوص حالت و کیفیت میں شارع سے اس پر عمل کا ثبوت مل جائے تو وہ کام عام حالات میں ناجائز اور اس مخصوص حالت و کیفیت میں جائز ہوگا لیکن اگر کوئی کام اصولاً ناجائز نہیں ہے تو شارع نے جس کیفیت کے ساتھ اس پر عمل کیا ہے۔ اس کیفیت کو اس کام کے جائز ہونے کے لیے شرط اور قید احترازی نہیں قرار دیں گے۔ سوائے اس صورت کے کہ کوئی قرینہ یا دلیل موجود ہو۔ اس بات کو زیر بحث روایتوں ہی سے سمجھ لیجیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو دوسرا مینڈھا اپنی طرف سے ذبح کرتے تھے اس میں اپنے گھر والوں کو بھی شامل کرتے تھے، لیکن اس کا کوئی شخص قائل نہیں کہ اگر قربانی کرنے والا اپنے گھر والوں کو شامل نہ کرے تو اس کی قربانی درست نہ ہوگی۔

بالکل اسی طرح چونکہ مردے کی طرف سے قربانی کرنا اصول شریعت کے خلاف نہیں، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے مینڈھے کی قربانی میں جو زندوں اور مردوں دونوں کو شریک کر لیتے تھے، اس سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ مردوں کی طرف سے کی جانیوالی قربانی میں زندوں کو شریک نہ کیا جائے تو وہ قربانی درست نہ ہوگی بلکہ زندہ اور مردہ دونوں کا شریک کرنا محض قربانی کی ایک شکل ہے، قربانی کے صحیح ہونے کی شرط نہیں ہے۔ یاد رہے کہ قربانی زندہ اور مردہ دونوں کی طرف سے مشترکہ طور پر کریں یا صرف مردہ کی طرف سے کریں دونوں صورتوں میں، کوئی جوہری فرق نہیں۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں ذبح برائے تقرب جو ایک فعل ثواب ہے اس کا ثواب مردے کو پہنچانا مقصود ہے۔

ان روایات کے سلسلے میں محاکم شرعیہ قطر کے رئیس شیخ عبداللہ بن زید المحمود نے مزید دو باتیں کہی ہیں (جن کا حوالہ مردے کی طرف سے قربانی کی مخالفت کے سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ دیا گیا ہے۔)

شیخ کی ایک بات یہ ہے، کہ زیر بحث قربانی زندوں اور مُردوں کے علاوہ قیامت تک پیدا ہونے والے مسلمانوں کی طرف سے بھی تھی جو اس وقت اپنے باپ دادا کی پشت میں نطفہ تھے اور معلوم ہے کہ آئندہ پیدا ہونے والوں کی طرف سے قربانی کی مشروعیت کا کوئی قائل نہیں۔ لہٰذا یہ قربانی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہوئی، اور اس سے امت کے لیے مرنے کی طرف سے قربانی کرنے کی مشروعیت ثابت نہیں ہوتی۔

لیکن ہم نے اوپر جو لکھا ہے اس سے سمجھا جا سکتا ہے کہ شیخ کا استدلال صحیح نہیں، کیونکہ اولاً تو یہ ہی صحیح نہیں کہ اس قربانی میں قیامت تک پیدا ہونے والوں کو شریک کیا گیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لفظ یہ تھا۔ اللھم ھذا عن امتی جمیعا من شھد لك بالتوحید الخ۔ اس میں لفظ شھد فعل ماضی ہے جس کا تعلق صرف گزشتہ زمانے سے ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ نے وہ قربانی امت کے صرف ان سارے افراد کی طرف سے کی تھی جو اس وقت تک توحید و رسالت کی شہادت دے چکے تھے۔ باقی رہے وہ افراد جو ابھی پیدا ہی نہیں ہوئے تھے تو یہ قربانی ان کی طرف سے نہیں تھی۔

ثانیاً بالفرض اگر تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس میں قیامت تک پیدا ہونیوالوں کو شریک کر لیا گیا تھا تو اس قربانی کے اس پہلو کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ماننے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ مرنے کی طرف قربانی کی مشروعیت کے پہلو کو بھی آپ کے ساتھ مخصوص مانا جائے۔

شیخ نے دوسری بات یہ کہی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں میں سے کوئی مینڈھا تنہا اور علی سبیل الانفراد امت کی طرف سے ذبح نہیں کیا تھا بلکہ دونوں مینڈھے اصلاً اپنی طرف سے قربان کیے تھے اور تبعاً و ضمناً ایک میں امت کو اور ایک میں اپنے اہل و عیال کو شریک کر لیا تھا، اور جو چیز ضمناً و تبعاً صحیح ہو ضروری نہیں کہ وہ اصلاً اور مستقلاً بھی صحیح ہو۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مذکورہ عمل براہ راست اور نہ بحیثیت اصل مرنے کی طرف سے قربانی کی صحت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ اس سے بس اتنا ثابت ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص اصلاً اپنی طرف سے جانور قربان کرے اور اس میں ضمناً مرنے کی شمولیت کی نیت کر لے تو ایسا کر سکتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ ابتدائے مضمون میں مسند احمد اور ابن ماجہ کی جو دو روایتیں ذکر کی گئی ہیں ان دونوں میں یہ واضح صراحت ہے کہ آپ نے ایک مینڈھا اپنی امت کی طرف سے اور دوسرا مینڈھا اپنی اور اپنے اہل و عیال کی طرف سے ذبح کیا تھا۔ اور اس صراحت سے شیخ کا مذکورہ دعویٰ اور اس پر مبنی اعتراض اور

نکتہ دونوں ہی لغو ہو جاتے ہیں۔

یہ وضاحت بھی بیجا نہ ہوگی کہ شیخ نے یہاں سخت غفلت سے کام لیا ہے۔ موصوف نے اپنے مذکورہ دعویٰ کے ثبوت میں مسند احمد کی روایت نقل فرمائی ہے۔ مگر اس میں: اللّٰھم ھٰذا عن امتی جمیعاً والی عبارت میں عن امتی سے پہلے لفظ عنی خود بڑھا دیا اور اسی سے ثابت کیا ہے کہ یہ قربانی اصلاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے تھی۔ حالانکہ لفظ عنی جس پر شیخ کے دعویٰ کے ثبوت کا سارا دار ومدار ہے مسند احمد کی اس عبارت میں سرے سے ہے ہی نہیں۔ مگر ستم ظریفی دیکھیے کہ شیخ نے اسے اپنی طرف سے بڑھا کر نہ صرف یہ کہ اس پر اپنے استدلال کی عمارت کھڑی کی ہے بلکہ اسی بنیاد پر مولانا شمس الحق ڈیانوی کو مطعون کیا ہے کہ انھوں نے حدیث کی اصل عبارت دیکھے بغیر استدلال کرلیا۔ حالانکہ شیخ نے خود یا تو حدیث کی اصل عبارت نہیں دیکھی یا دیکھی تو اس میں ان سے چوک یا غفلت ہوئی۔

"مقطع میں آپڑی ہے سخن گسترانہ بات"، تو شیخ کے چند اور "کمالاتِ علمیہ" سن لیجیے۔ غنیۃ الالمعی جو میت کی طرف سے قربانی کے ثبوت میں مولانا ڈیانوی کی نہایت مفید تالیف ہے، شیخ نے اسے علامہ زین الدین قاسم بن قطلوبغا متوفی ۸۷۹ھ کی تالیف بتایا ہے جبکہ ان کی تالیف کا نام منیۃ الالمعی ہے، جو نصب الرایہ مصری کے اخیر میں چھپی ہے اور اس پر طرہ یہ کہ شیخ نے پوری بے نیازی کے ساتھ لکھ دیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے صاحب غنیۃ الالمعی نے اس سلسلے کی اصل نصوص نہیں دیکھیں اور عام فقہاء کی طرح حقیقت جانے بغیر محض لوگوں سے سنے سنائے الفاظ پر اپنے فیصلے کی بنیاد رکھ دی۔ حالانکہ مولانا ڈیانوی نے غنیۃ الالمعی میں زیر بحث مضمون کی تقریباً تمام روایات کو پورے متن وسند کے ساتھ کتب حدیث کے مکمل حوالے دیکر درج کیا ہے اور ہر ایک روایت کے راویوں اور دیگر فنی نکات ومباحث پر نہایت فاضلانہ اور محققانہ انداز پر محدثانہ شان سے بحث کرکے ان کے صحیح حسن یا ضعیف ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ شیخ عبداللہ بن زید المحمود نے غنیۃ الالمعی سرے سے دیکھی ہی نہیں اور اسی لئے مولانا ڈیانوی پر نصوص سے غفلت کا الزام رکھدیا۔ حالانکہ یہ کتاب معجم صغیر طبرانی کے اخیر میں ہمیشہ طبع ہوتی رہی ہے اور حدیث کے طلبہ بھی اس سے واقف ہیں۔ حیرت ہوتی ہے کہ ایسے سہل انگار لوگ مسند تحقیق پر کیوں براجمان ہو جاتے ہیں۔

ہم نے شیخ کے ان کمالات علمیہ کا اظہار اس لیے کردیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ کتنی گہرائی سے بات کر رہے ہیں اور جن لوگوں نے ان کی تحقیق پر اعتماد کیا ہے ان کا اعتماد کہاں تک صحیح ہے۔

میت کی طرف سے قربانی کی مشروعیت کے سلسلے میں دوسرے مضمون کی روایت یہ ہے کہ، حضرت علیؓ ایک مینڈھا اپنی طرف سے اور ایک مینڈھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ذبح کیا کرتے تھے۔ یہ روایت ترمذی اور ابوداؤد کے علاوہ مسند احمد ۱/ ۱۰۷، ۱۴۹ مستدرک حاکم ۴/ ۲۲۹، ۲۳۰، سنن بیہقی ۹/ ۲۸۸ میں بھی مروی ہے۔ ہم اکتوبر ۱۹۸۳ء کے محدث میں بتلا چکے ہیں کہ اس حدیث کو مخصوص ماننا یا حالتِ وصیت کے ساتھ خاص قرار دینا صحیح نہیں۔ اس پر ایک صاحب نے سوال کیا ہے کہ حضرت علی کے علاوہ کسی اور صحابی یا تابعی یا تبع تابعی سے اس کا ثبوت فراہم کیجیے۔ یعنی اگر یہ حضرت علی کے ساتھ خاص نہیں تو ان لوگوں نے اس پر عمل کیوں نہیں کیا؟۔

جواباً عرض ہے کہ اولاً اگر خدانخواستہ کسی صحابی یا بعد کے لوگوں سے نام بنام اسے کرنے کا ذکر نہ ملے تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ ثانیاً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قول و فعل بذاتِ خود دلیل ہے یعنی وہ دلیل بننے کے لیے صحابی یا تابعی یا تبع تابعی کی طرف سے عملی تصدیق کا محتاج نہیں۔ ثالثاً امام ترمذی نے بیان کیا ہے کہ کچھ اہل علم میت کی طرف سے قربانی کے قائل ہیں اور کچھ قائل نہیں ہیں۔ اور یہ معلوم ہے کہ امام ترمذی جب اہلِ علم کا مسلک یا اختلاف بیان کرتے ہیں تو اس سے صحابہ یا تابعین یا تبع تابعین اور ائمہ مجتہدین ہی کو مراد لیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ امام ترمذی کو صحابہ یا تابعین یا کم از کم تبع تابعین میں سے ایک گروہ کے متعلق معلوم تھا کہ وہ میت کی طرف سے قربانی کے قائل تھے۔ اس کے بعد امام ترمذی نے حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا یہ قول بیان کیا ہے کہ میرے نزدیک یہ زیادہ پسندیدہ ہے کہ آدمی میت کی طرف سے صدقہ کر دے قربانی نہ کرے، اور اگر قربانی کرے تو اس میں سے خود کچھ نہ کھائے بلکہ سارا گوشت صدقہ کر دے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس وقت یہ مسئلہ زیرِ بحث تھا، اور میت کی طرف سے قربانی کرنے کے قائل اور منکر دونوں طرح کے اہلِ علم تھے۔ اور حضرت ابن مبارک نے اسے ناجائز قرار دینے کے بجائے صدقہ کو زیادہ پسند کیا۔ یاد رہے کہ امام ابن مبارک تبع تابعی تھے۔

حضرت علی کی اس روایت کے بارے میں دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ یہ ضعیف ہے۔ بعض لوگوں نے خصوصاً اس پہلو سے بڑا تردد ظاہر کیا ہے کہ مولانا عبدالرحمان صاحب مبارکپوریؒ نے اسے تحفۃ الاحوذی میں ضعیف قرار دیا ہے۔

عرض ہے کہ مولانا نے یقیناً اس روایت کو ضعیف قرار دیا ہے، لیکن مولانا مرحوم نے جس زمانہ میں ترمذی کی شرح لکھی علم حدیث کی بہت سی اعلیٰ فنی کتابیں اور مخطوطے نایاب تھے جو اب منظر عام پر آچکے ہیں، لہٰذا تحقیق کا کام مزید آگے بڑھ سکتا ہے۔

اس بنیاد پر عرض ہے کہ مولانا نے جس خاص راوی کی بنا پر اس حدیث کو ضعیف قرار دیا ہے وہ ابوالحنار ہے اور اس کی خامی یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ مجہول ہے، یعنی کچھ پتہ نہیں کہ وہ قابل اعتماد تھا یا نہیں؟ لیکن اب ابوالحنار کے متعلق مزید تحقیقات سامنے آچکی ہیں۔ جامع ترمذی کا جو نسخہ بولاق (مصر) سے شائع ہوا تھا۔ اس کی جلد اول کے ص ۲۸۲، ۲۸۳ میں اور اسی طرح ترمذی کا جو نسخہ شیخ عطوہ عوض مدرس جامع ازہر (مصر) کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ المکتبۃ الاسلامیہ سے شائع ہوا ہے، اس کی جلد چہارم کے ص ۵۸ میں حضرت علیؓ کی زیر بحث روایت کے ضمن میں امام ترمذی کا جو کلام منقول ہے، اس کے اخیر میں یہ عبارت بھی ہے۔ (اور یہ ہندوستانی نسخوں میں نہیں ہے) قال محمد قال علی بن المدینی وقد رواہ غیر شریک قلت له ابوالحسناء ما اسمه فلم یعرفه قال مسلم اسمه الحسن۔ یعنی محمد (امام بخاری) نے کہا کہ علی بن مدینی نے کہا کہ اسے شریک کے علاوہ نے بھی روایت کیا ہے۔ میں نے ان سے کہا ابوالحنار کا نام کیا ہے تو انھوں نے اسے نہ جانا، مسلم نے کہا اس کا نام حسن ہے۔

مصر کے مشہور محدث علامہ شیخ احمد شاکر مرحوم نے مسند احمد کی تعلیق ج ۲ ص ۱۵۲ میں لکھا ہے کہ یہ زیادتی، ہمارے ترمذی کے صحیح مخطوطے میں بھی ثابت ہے، اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ابوالحنار کا ترجمہ تہذیب میں موجود ہے لیکن اس کے بارے میں کوئی جرح یا تعدیل ذکر نہیں کی ہے اور یہ کہا ہے کہ اس کا نام حسن ہے اور کہا جاتا ہے کہ حسین ہے۔ ابوالحنار کا ترجمہ امام ذہبی نے بھی میزان میں کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ شخص پہچانا نہیں جاتا۔ لیکن اس حدیث کو امام حاکم نے روایت کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ صحیح الاسناد حدیث ہے اور امام بخاری اور مسلم نے اس کی تخریج نہیں کی ہے۔ اور ابوالحنار حسن بن حکم نخعی ہے۔ امام ذہبی نے بھی حاکم کی موافقت کی ہے۔ میرے نزدیک بھی حاکم ہی کی بات راجح ہے۔ حسن بن حکم نخعی کوفی کی کنیت ابوالحسن ہے اور حافظ ابن حجر نے تہذیب ۲/۲۷۰ میں اس بات کو ترجیح دی ہے کہ اس کی کنیت ابوالحکم ہے۔ یعنی اس کی کنیت میں اختلاف ہے اور ظاہر یہ ہے کہ بعض لوگوں نے اس کی کنیت ابوالحنار بھی رکھ دی ہے۔

یہ شریک کے اساتذہ میں سے ہے۔ اور اسے امام احمد اور ابن معین نے ثقہ کہا ہے اور امام بخاری نے تاریخ کبیر میں اس کا ترجمہ ذکر کیا ہے۔ اور اس کے بارے میں کوئی جرح نہیں ذکر کی ہے۔

(مسند احمد مع تعلیق شیخ احمد شاکر ۲/۱۵۲)

شیخ احمد شاکر کی اس تحقیق سے واضح ہوتا ہے کہ ابوالحسناء مجہول نہیں ہے۔ بلکہ دو دو ائمہ فن نے اسے ثقہ قرار دیا ہے اور اس کے بارے میں کوئی جرح نہیں پائی جاتی۔ چونکہ مولانا مبارکپوریؒ نے حدیث کو اس بنا پر ضعیف قرار دیا تھا کہ ابوالحسناء مجہول ہے۔ یعنی اس کے ثقہ یا ضعیف ہونے کا کچھ پتہ نہیں چلتا لیکن اب معلوم ہوگیا کہ وہ ثقہ ہے تو اس حدیث کو ضعیف ٹھہرانے کی وجہ ختم ہوگئی۔

اس تحقیق کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس مسئلہ میں مولانا مبارکپوریؒ کا فتویٰ نقل کردیا جائے۔

آپ لکھتے ہیں۔ لم اجد فی التضحیۃ عن المیت منفردا حدیثا مرفوعا صحیحا واما حدیث علی المذکور فی الباب فضعیف کما عرفت فاذا ضحی الرجل عن المیت منفردا فالاحتیاط ان یتصدق بھا کلھا واللہ تعالیٰ اعلم۔ (تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۳۵۴)

یعنی تنہا میت کی طرف سے قربانی کرنے کی مجھے کوئی صحیح مرفوع حدیث نہیں ملی۔ رہی حضرت علیؓ کی حدیث جو اس باب میں مذکور ہے تو وہ ضعیف ہے۔ اس لیے احتیاط یہ ہے کہ جب آدمی تنہا میت کی طرف سے قربانی کرے (یعنی اس میں زندہ کو شریک نہ کیا ہو) تو کل کا کل صدقہ کردے۔ واللہ تعالیٰ اعلم۔

یعنی مولانا مردے کی طرف سے قربانی کا بالکلیہ انکار نہیں کرتے، بلکہ زندہ مردہ دونوں کی طرف سے قربانی کریں تو ایسی قربانی کرنے اور اس کا گوشت کھانے کو بالکل درست مانتے ہیں۔ البتہ صرف مردے کی طرف سے قربانی کریں تو احتیاطاً یہ قرار دیتے ہیں کہ گوشت صدقہ کردیا جائے وہ بھی اس بنا پر کہ ان کے نقطۂ نظر سے یہ حدیث ضعیف ہے اور ہم بتلا چکے ہیں کہ اس نقطۂ نظر پر سارے محققین کا اتفاق نہیں بلکہ متعدد کبار ائمہ نے اس حدیث کو صحیح مانا ہے۔ مثلاً امام ابوداؤد نے میت کی طرف سے قربانی کا باب مقرر کرکے یہی روایت ذکر کی ہے اور اس پر خاموشی اختیار کی ہے۔ ان کی خاموشی کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث ان کے نزدیک صحیح یا حسن ہے یعنی قابل اعتبار ہے۔ امام حاکم کا قول ابھی نقل ہوچکا ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ امام ذہبی نے بھی اس کو صحیح قرار دیا ہے اور معلوم ہے کہ ان کا معیار کڑا تھا اور رجال کے پرکھنے میں ان کا پایہ نہایت بلند تھا۔ امام بغوی نے اسی حدیث کی

(بقیہ ص ۲۶ پر)

ایک نقطۂ نظر

دورِ حاضر میں اسلام کی تعبیر و تشریح

از ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری

موقر ماہنامہ محدث کی مئی ۸۴ء کی اشاعت میں محترم ایڈیٹر صاحب نے جناب عبداللطیف اعظمی صاحب کے مکتوب گرامی کے دو اقتباسات نقل فرمائے ہیں۔ دوسرے اقتباس کا تعلق عصر حاضر میں اسلامی احکام و تعلیمات کی تشریح و تعبیر سے ہے۔

اس مراسلت میں مداخلت کی جرأت چند امور اور اپنے نقطۂ نظر کی توضیح کے لیے کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ یہ مداخلت "بیجا" نہ تصور کی جائے گی۔ پھر توفیق ہوئی تو ایڈیٹر صاحب نے جس پہلو پر اظہار خیال کی دعوت دی ہے اس سے متعلق بھی کچھ عرض کروں گا۔

کچھ عرض کرنے سے پہلے محترم اعظمی صاحب کا وہ اقتباس نقل کرنا مناسب ہے جو ان سطور کی تحریر کا محرک ہے۔ موصوف فرماتے ہیں:

"اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی اور معاشرتی نظام پر اسلام کے نام پر جو مواد پیش کیا جا رہا ہے اس سے جدید تعلیم یافتہ اور مسلمانوں کا باشعور طبقہ مطمئن نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ موجودہ ضروریات اور حالات کے پیش نظر پوری غیر جانبداری کے ساتھ اسلام کے اصل سرچشموں کی مدد سے ان مسائل پر روشنی ڈالی جائے۔"

مغرب کی مادی تہذیب سے اہل مشرق کا جب سے سابقہ پڑا بہت سی نئی اصطلاحات ہمارے سامنے آئی ہیں، جنھیں مخصوص پس منظر میں متعین مقاصد پر دلالت کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ ممکن ہے کچھ ایسے افراد ملیں جو ان اصطلاحات کو ان کے پس منظر اور مقاصد سے خالی الذہن ہو کر استعمال کرتے ہوں لیکن

عام حالات میں وہ اصطلاحات اپنے متعینہ مقاصد کی جانب ضرور اشارہ کرتی ہیں۔ انھی اصطلاحات میں سے "باشعور" اور "دانشور" کی اصطلاحیں بھی ہیں۔

عزم اعظمی صاحب نے مسلمانوں کے جس باشعور طبقہ کی بے اطمینانی کا اظہار کیا ہے۔ معلوم نہیں ان کی مراد کس طبقہ سے ہے، لیکن بسا اوقات دیکھا جاتا ہے کہ جو طبقہ باشعور و دانشور کہا جاتا ہے اس کا مذہب کے ساتھ رشتہ بہت مضبوط نہیں ہوتا بلکہ مذہبی احکام اس کے لیے اختیاری امور کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آج کے انشا پرداز باشعور و دانشور کس کو کہتے ہیں اور کیوں؟ ہم اس سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔ ایک خیال یہ ہے کہ خدا کے دین کی تعلیمات کو مکمل یقین کے ساتھ قبول کرکے اس پر قلبی سکون کے ساتھ جو لوگ عمل کرتے ہیں وہی دانشور اور باشعور ہیں۔ قرآن کریم میں جن لوگوں کو "دانشور" و "باشعور" کہا گیا ہے ان کے اوصاف پر نظر ڈالنے سے مذکورہ خیال کی تائید ہوتی ہے اور یہ واضح ہوتا ہے کہ قرآن جس کو دانشور قرار دیتا ہے یہ تقریباً وہی لوگ ہیں جنھیں موجودہ دور کے ترقی پسند لوگ "رجعت پسند" کہتے ہیں۔ سورۂ آل عمران کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۴ کے ترجمہ پر غور فرمائیں۔

اسی سورہ کی آیت ۱۹۹ کا مضمون ان لوگوں کے لیے دعوتِ فکر و تدبر ہے جو اسلام کی ابتک کی تعبیر و تشریح سے مطمئن نہیں ہیں بلکہ انھیں کسی نئے مناسب انداز کی تلاش ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

(اور بعض اہلِ کتاب بھی اللہ کو مانتے ہیں اور جو کچھ تمھاری طرف اور ان کی طرف اللہ کے ہاں سے اتارا گیا ہے اس کو بھی اللہ سے ڈر کر مانتے ہیں اور اللہ کے حکموں کے عوض تھوڑے تھوڑے پیسے حاصل نہیں کرتے، ان ہی لوگوں کے لیے اللہ کے ہاں بدلہ ہے، بے شک خدا اچھا بدلہ دینے والا ہے۔)

اسی طرح ملاحظہ ہوں سورۂ رعد کی آیات ۱۹ تا ۲۲۔

...

مذکورہ مکتوب میں یہ جملہ اپنی عمومیت کی وجہ سے محلِ غور ہے کہ "مسلمانوں کے مذہبی و معاشرتی نظام پر اسلام کے نام پر جو مواد پیش کیا جا رہا ہے اس سے جدید تعلیم یافتہ اور مسلمانوں کا باشعور طبقہ مطمئن نہیں ہے۔" موجودہ دور میں اسلام کی ترجمانی متعدد مکاتبِ فکر کی جانب سے کی جا رہی ہے۔ معلوم نہیں تمام مکاتبِ فکر

حکم لگایا جارہا ہے یا کوئی مستثنیٰ بھی ہے۔

پھر مذکورہ جملے سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ مواد پیش کرنے والے اسلام کی ترجمانی اپنی طرف سے بغیر کسی دلیل کے کرتے ہیں، اگر ایسا ہو تو یقیناً ان کی بات ناقابلِ التفات ہے۔ لیکن جہاں تک ہمارے علم کا تعلق ہے متعدد حلقے ایسے ہیں جو اسلام کے نام پر جو کچھ بھی پیش کرتے ہیں، اس کی شرعی دلیل رکھتے ہیں، جس کی روشنی میں حلال و حرام یا صحیح و غلط کا فیصلہ ہوتا ہے۔

ایک بات یہ بھی قابلِ غور ہے کہ جدید تعلیم یافتہ اور باشعور طبقہ کے عدم اطمینان کا اصل سبب کیا ہے؟ کیا جو نظام ان کے سامنے پیش کیا جارہا ہے اس میں کوئی کمی محسوس ہو رہی ہے؟ یا کسی ذہنی پس منظر کی وجہ سے مذکورہ عدم اطمینانی وجود پذیر ہوئی ہے۔؟

یہ شکوہ گاہے گاہے سننے میں آتا ہے کہ علماء دین تنہا اپنے آپ کو اسلام کی تشریح و ترجمانی کا مجاز و مستحق سمجھتے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھا جائے تو واضح ہوگا کہ یہ کوئی طبقاتی امتیاز نہیں ہے جو علماء کو دیا گیا ہے بلکہ عربی زبان و اسلامی علوم سے واقفیت کے باعث علماء کو یہ حق حاصل ہوا ہے اور اس ذمہ داری سے متعلق ان کو خدا کے یہاں جواب دینا ہے۔ پھر علماء جو کچھ کہتے ہیں اس کی صحت و سقم کو سمجھنے کے لیے کسی بھی باہوش آدمی کے پاس دلیل موجود ہے۔ کیونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ اسلامی احکام کا اصل ماخذ کتاب و سنت ہے۔ اسی طرح شرعی ادلہ میں اجماع و قیاس کو بھی معتبر مانا گیا ہے، بشرطیکہ قرآن و سنت کے کسی حکم سے ان کا تعارض نہ ہو۔ ایسی صورت میں مسلمانوں کے مذہبی و معاشرتی نظام پر کوئی ایسا مواد پیش کیا جائے جس کی سند کتاب و سنت سے نہ ہو تو یقیناً امت اسے قبول نہیں کر سکتی۔

...

اسلام کی اشاعت و ترقی سے جن لوگوں کو دلچسپی ہے وہ بجا طور پر یہ خواہش رکھتے ہیں کہ اسلامی احکام و تعلیمات کی حقانیت و صداقت کا تحقیقات و تجربات سے اس طرح ثبوت فراہم ہو جائے کہ انکار کی گنجائش باقی نہ رہے۔ اور ہر شخص اسلام کو ماننے پر مجبور ہو جائے۔

اسلام کے دینِ فطرت ہونے اور تحقیق و تجربہ کی تحریک کے دن بدن قوی ہونے کے باعث مذکورہ خیال کو امر مستبعد نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن سوچنے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ اسلام کے ظہور سے آج تک کی طویل مدت میں

اس کی جن تعلیمات کو تحقیق و تجربہ کی دنیا سے سند توثیق حاصل ہو چکی ہے کیا ان میں لوگوں کے لیے عبرت و نصیحت کے پہلو کم ہیں کہ مزید تصدیق و توثیق کا انتظار ہے؟

تحقیق و تجربہ سے ثابت ہونے والی اسلامی تعلیمات کے بارے میں انسانوں کے ایک طبقہ کا موقف چونکہ حوصلہ افزا نہیں رہا ہے، اس لیے جب کبھی ایسی آواز کسی طرف سے اٹھتی ہے تو اسے بہت زیادہ توجہ کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کا سبب تحقیقی کوششوں کا استخفاف نہیں بلکہ منکرین اسلام کا منفی موقف ہے۔

بہت سے ذہن تجربات کو اسلام کے کسوٹی بنانے کا تصور رکھتے ہیں، اور اس کی تردید اسلام نہیں کرتا لیکن اس سلسلہ میں ایک بات ذہن میں رکھنا مفید ہوگا کہ واقعہ معراج کے بعد جب مشرکین خوشی خوشی حضرت ابوبکرؓ کے پاس پہنچے اور اس توقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات دہرائی کہ ابوبکرؓ یہ سن کر ضرور نبی علیہ السلام کی تکذیب کردیں گے، تو حضرت ابوبکرؓ نے بڑے اطمینان سے جواب دیا کہ: اگر یہ دعویٰ نبی نے کیا ہے تو پھر میں اس کی تصدیق کرتا ہوں، ایسا ہونا عین ممکن ہے۔ بات جذبہ کی نہیں بلکہ امر واقعہ ہے کہ آج اسلام کو اسی طرح کا ایمان رکھنے والے مسلمانوں کی ضرورت ہے، اور ایسے ہی ایمان سے دنیا کو گمراہیوں کے مہلک اثرات سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔ تحقیق و تجربہ کے ناخن سے کریدتے اور عقلی موشگافیوں کا طول طویل سفر طے کرنے کے بعد جو ایمان حاصل ہوتا ہے اس میں عام طور پر وہ گرمی نہیں ہوتی جس کی اس وقت انسانیت کو ضرورت ہے اور جس سے انسانی سیرت کو تعمیر کرنے میں مدد حاصل ہوتی ہے۔

...

ضروریات و حالات کے پیش نظر غیر جانبداری کے ساتھ اسلام کے اصل سرچشموں کی مدد سے پیش آمدہ مسائل پر روشنی ڈالنے کی تحریک یقیناً خوش آئند ہے۔ لیکن عملی طور پر اس خدمت کی انجام دہی اور کسی ایسی تشریح تک رسائی جس سے ہر طبقہ مطمئن ہوسکے بڑی مشکل بات ہے۔

آج مختلف حلقوں کی طرف سے یہ آواز اٹھائی جارہی ہے کہ دین پر عمل کے لیے کتاب و سنت کے اصل سرچشموں سے روشنی حاصل کرنا چاہیے اور دین کے نام پر جن غلط رسم و رواج کو تقدس و احترام کا مقام دیدیا گیا ہے ان سے امت کو نجات دلائی جائے۔

اسی طرح پچھلے سالوں میں عالم اسلام کے مختلف حصوں میں دینی بیداری کے آثار نمایاں ہوئے ہیں۔ اس بیداری

ے سہارے بعض ممالک کو سیاسی مقاصد کے حصول اور مذہبی عصبیت کی ترویج کے لیے کوشاں ہیں۔ لیکن
ر ملکوں میں یہ جذبہ سچا اور مخلصانہ نظر آتا ہے۔ اسی لیے مختلف حلقوں سے شرعی احکام کی تنفیذ کے مطالبے
منے میں آرہے ہیں۔ ساتھ ہی ان احکام کی تنفیذ کے امکانات اور ان کے محاسن ومصالح پر تحقیقی انداز میں
با دلۂ خیال بھی ہو رہا ہے، علمی مذاکرات اور بحث ومباحثے کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ آج کی یہ صورتحال
قیناً اس وقت سے مختلف ہے جب مغرب کی مادی تہذیب سے اسلام کا سابقہ نیا نیا تھا اور اس مذہب پر
یمان رکھنے والے ایک عجیب آزمائش اور سخت قسم کی کشمکش میں مبتلا تھے۔ کیونکہ ایک طرف غیر اسلامی حلقے
سلام کی صحیح صورت مسخ کرنے کی کوشش کر رہے تھے اور دوسری طرف مغرب سے متاثر ہونے والے مسلمان اسلامی
شریعت کو شک وشبہ کی نظر سے دیکھ رہے تھے اور ان کے ذہن میں یہ تصور تھا کہ اسلام موجودہ دور کی چیز نہیں۔
آج خدا کا فضل ہے کہ ایک بڑے طبقہ اور بالخصوص تعلیم یافتہ نوجوانوں میں یہ تصور قوی ہو چکا ہے کہ مذہب کی
مکمل پابندی انسان کی عین سعادت ہے اور مذہب ہی کے زیرسایہ انسانیت کو امن وسکون کی زندگی حاصل ہو سکتی ہے
ان حالات میں اسلام کی مناسب تعبیر وتشریح کے لیے منتظر بیٹھے والوں کو اپنے رویے پر خود نظرثانی کرنا چاہیے
اور اس حقیقت کا پتہ لگانا چاہیے کہ انسانیت مختلف نظریات ومذاہب کا تجربہ کرلینے کے بعد کیوں اسلام ہی کی
طرف پلٹ کر آ رہی ہے، اور جو لوگ اسلامی تعلیمات سے مطمئن نہ تھے ان کے دلوں میں اسلام کے لیے کیوں جگہ
پیدا ہو رہی ہے۔؟

جدید تعلیم یافتہ طبقہ جن مسائل میں موجودہ تشریحات سے مطمئن نہیں ہے، ان میں عورتوں کے حقوق وفرائض کا
مسئلہ سرفہرست ہے، اس موضوع پر باشعور لوگوں کو علماءِ اسلام سے بڑی شکایتیں ہیں، ان کا کہنا ہے کہ علماء نے
عورتوں سے متعلق ایسے فتاوے صادر کیے ہیں جن سے ان کی کھلی حق تلفی ہوئی ہے اور معاشرہ میں ان کا مرتبہ
گھٹا۔
انداز سے بار بار ہرائی گئی کہ اصل صورتحال کو سمجھنے اور معاملہ کا وسیع نظر سے جائزہ
نے اسلام میں عورتوں کو مظلوم سمجھ لیا اور ان کی آزادی وسماجی بہتری وخوشحالی کی آوازیں

ے مغرب دنیا کا سب سے بڑا ملک اور تہذیب وثقافت کے لحاظ سے ممتاز حیثیت

کا ملک ہے، وہاں پر آزادئ نسواں کے نام سے جو تحریک چلائی گئی اور اس کے جو نتائج رونما ہوئے وہ دوسر ممالک کے لیے باعثِ عبرت ہیں، صرف یہی ایک مثال اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ اسلامی احکا کی مصلحتوں کو سمجھے بغیر حالات کے غلط دباؤ سے مذہب کے خلاف جو اقدامات کیے جاتے ہیں ان کے نتائج کیسے ہوتے ہیں۔

مغرب سے اتصال کے بعد جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے قاسم امین کی قیادت میں آزادیٔ نسواں کی تحریک چلا دلیل وہی تھی جسے ہم اور آپ اکثر سنتے رہے ہیں۔ ازہر کے علماء نے اس تحریک کی مخالفت کی، لیکن رجعت پسندی و جمود کا الزام ان پر پہلے ہی سے تھا اس لیے ان کی آواز صدا بصحرا ہوگئی۔ تحریک نے بال و پر نکالا عورتوں کو ہر میدان میں گھسا یا گیا۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ یہی ترقی کا عنوان ہے۔ ہر طرف مصر کی اس تحریک کا چرچا تھا۔ کتابیں اور مقالات لکھے گئے اور لوگوں نے مصر کے حالات کو بطور نمونہ دوسرے ممالک کے سامنے پیش کیا۔

عورتوں کو ضروری اور غیر ضروری طور پر مردوں کے دوش بدوش ہر میدان میں لانے کا مقصد تحریک کے کارکنوں کی نظر میں معلوم نہیں کیا تھا اور کس حد تک اس کی تکمیل ہوئی۔ لیکن زمانہ نے یہ دیکھا کہ مذہبی و معاشرتی طور پر کچھ ایسے نتائج رونما ہوئے جن کو دیکھ کر بڑے بڑے روشن خیال پکار اٹھے کہ عورتوں کو اس طرح ہر شعبہ میں گھسانا خود عورتوں پر صریح ظلم ہے۔ مصر میں قیام کے دوران ایک باہوش و دردمند شخص سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال ہوا تو اس نے تھوڑی دیر بعد بڑے جوش سے کہا کہ: بخدا اگر آج قاسم امین بھی ہوتے تو عورتوں کی موجودہ آزادی کی مخالفت کرتے اور جس تحریک کی قیادت کو انھوں نے ملت کی خدمت سمجھا تھا اس سے دست برداری کا اعلان کر دیتے۔

مذکورہ رائے روزمرہ کے واقعات کے مشاہدہ پر مبنی ہے، قاسم امین کی تحریک کے صحیح یا غلط ہونے کا سوال الگ ہے لیکن یہ بات ہر آدمی کہنے پر مجبور ہوگا کہ مسلم قوم کے سماجی حالات کی اصلاح کا مقصد رکھنے والا انسان کبھی یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ ملت کی مائیں اور بہنیں زندگی کے میدان میں ان ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لیے مجبور ہوں جن کی وہ ذہنی و جسمانی طور پر متحمل نہیں۔

اسلام کو قرآن حکیم اور صحیح حدیث میں دینِ فطرت کہا گیا ہے اس طرح اس کے کسی حکم کی مخالفت،

فطرت کی مخالفت ہے ، اور فطرت کے خلاف کسی عمل کا جو نتیجہ ہوگا وہ ظاہر ہے ۔ مصری معاشرہ نے عورتوں کے سلسلہ میں جو قدم اٹھایا تھا وہ اسلامی تعلیمات و آداب کے خلاف تھا ، اس لیے تھوڑے ہی دنوں بعد لوگوں کی زبانیں کھلنے لگیں اور ان خرابیوں کا ذکر شروع ہوگیا ۔ جو عورتوں کی غیر ضروری بلکہ تفریحی آزادی سے پیدا ہوئی تھیں ۔ پھر ایک وقت آیا جب مصری عورتوں نے باقاعدہ نقاب کا استعمال شروع کر دیا اور جن عورتوں کو اس کی ہمت نہ ہوئی انھوں نے کم از کم اپنا نیم عریاں لباس ترک کر کے مہذب و ساتر لباس اختیار کر لیا ۔ آزادیٔ نسواں کے نام پر جن بدعنوانیوں کو فروغ دیا گیا تھا اب انھی کے خلاف لوگ کھڑے ہو گئے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ عورتیں معاشرہ میں وہی مقام اختیار کریں جسے اسلام نے ان کے لیے متعین کیا ہے ۔ قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ آزادیٔ نسواں کی مذکورہ تحریک اور موجودہ دور میں اس کا ردِ عمل دونوں چیزیں علماءِ دین کے دائرۂ اثر و رسوخ سے باہر تھیں ۔ تحریک کی قیادت تو ان لوگوں کے ہاتھوں میں تھی جنھیں ترقی پسند کہا جاتا ہے اور موجودہ ردِ عمل میں مسلمانوں کی نئی نسل پیش پیش ہے ، جس کے دلوں میں یہ تڑپ ہے کہ مسلمانوں سے ادبار و پسماندگی کی لعنت دور ہو ، دنیا میں اپنے معاملات کا فیصلہ وہ خود کریں اور جس دین کا کلمہ پڑھنے کے جرم میں انھیں ہر طرف سے سازشوں کا نشانہ بنایا جا رہا ہے اس پر وہ صحیح معنوں میں اخلاص کے ساتھ عمل کریں ۔

عام طور پر یہ سوچا جاتا ہے کہ عورتوں کے پردہ کی حمایت اور بغیر ضرورت باہر نکلنے کی مخالفت صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو تنگ نظر اور انسانوں کی نفسیات سے بے خبر اور ظاہر پرست ہوتے ہیں ، لیکن مصر ہی میں ایک ایسی مثال قائم ہوئی جس سے مذکورہ خیال کی تردید ہوگئی ۔ مصر کے نامور اسلامی مفکر ، ادیب اور ناقد عباس محمود عقاد کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ، اسلامی لٹریچر میں انھوں نے عبقریات کے نام سے جو گرانقدر اضافہ کیا ہے وہ اپنی نوعیت کی منفرد کوشش ہے جس سے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا ہے ۔ تہذیب و تمدن اور مذہب و سیاست کے موضوعات و مسائل پر لوگ موصوف کی رائے جاننے کے منتظر رہا کرتے تھے ، وہ جو رائے بھی قائم کرتے ، دلیل کی بنیاد پر قائم کرتے اور کبھی عدمِ توازن کا شکار نہیں ہوتے ۔ انھوں نے بہت سے پیچیدہ مسائل پر قلم اٹھایا اور انھیں بڑی مہارت سے حل کر کے رکھ دیا ، مصر میں انگریزوں کی آمد کے بعد اسلام کے خلاف تشکیک و توہم کی جو لہر پیدا ہوئی تھی اسے علمی اسلوب میں فرو کرنے میں موصوف کا کردار بڑا نمایاں ہے ۔ عورتوں کے موضوع پر بھی موصوف کا ایک نظریہ تھا ، جس پر وہ عمر بھر قائم رہے ، یہ نظریہ اس رائے سے ملتا جلتا تھا جو

اس ملا میں علماء اسلام نے قائم کی تھی۔ موصوف کا خیال تھا کہ عورت کا دائرۂ عمل بنیادی طور پر گھر کے اندر ہے باہر کی کسی سرگرمی سے اس کو وابستہ کرنا غلط ہے۔ زندگی کے آخری دور میں جب موصوف نے اپنی مذکورہ رائے کا اعادہ کیا تو ترقی پسند حلقہ میں اس کا بڑا چرچا ہوا، ان جرائد و اخبارات نے جو بے پردگی کے حامی تھے عقاد کو سخت سست بھی کہا۔ لیکن وہ اپنی رائے پر تاحیات قائم رہے۔ آج اگر وہ زندہ ہوتے تو دیکھتے کہ کس طرح مصری معاشرہ کے ایک بڑے طبقہ نے ان کی رائے کی پذیرائی کی اور عورتوں کی بے پردگی سے پیدا ہونے والے مفاسد کے خلاف عملی قدم اٹھایا۔

(باقی آئندہ)

بقیہ: کیرلا

ج: ہر مسجد میں خطیب مرکز کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے۔

س: پورے کیرالا میں مجاہدین (اہلحدیث) کی کتنی مسجدیں ہیں؟

ج: تقریباً پورے کیرالا میں مجاہدین کی دوسو مسجدیں ہیں۔

س: ندوۃ المجاہدین کے ماتحت چلنے والے کتنے عربی اسکول مدارس اور نرسری ہیں؟

ج: ندوۃ المجاہدین کے ماتحت چلنے والے ۲۲ عربی اسکول اور اٹھارہ اورینٹل اسکول ہیں۔ مدارس کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے۔ نرسری اسکول کی تعداد تیس ہے۔ ٹیچر ٹریننگ اسکول اور کلیۃ البنات ایک ایک ہیں۔

مجاہدین کے تین میگزین نکلتے ہیں، ۱ "الشباب"، یہ پندرہ روزہ اسلامی میگزین ہے۔

۲ "اقرأ"، یہ ماہنامہ علمی اور ادبی رسالہ ہے جو حرکۃ الطلبۃ المجاہدین کی طرف سے نکلتا ہے۔

۳ المنار، یہ ندوۃ المجاہدین کا علمی ادبی اور وقیع ماہنامہ رسالہ ہے۔

رات چونکہ کافی گزر چکی تھی اس لیے انہی چند نکات پر اکتفا کرتے ہوئے عمری صاحب کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کیا گیا۔

محمد یونس (مدرس جامعہ سلفیہ بنارس)

شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب نجدی رح

...ب صدیق حسن خان اور مولانا حسین احمد مدنی کی نظر میں

مولانا محفوظ الرحمن فیضی جامعہ فیض عام مئو

...ان وہابیہ اور اس کی تالیف کا پس منظر: وہابیت کے باب میں نواب صاحب کو مطعون کرنے کے لیے چونکہ مولانا نعمانی نے نواب صاحب
...تمام تالیفات کو نظر انداز کرکے نہایت چابکدستی سے اسی کتاب "ترجمان وہابیہ" کا انتخاب کیا ہے۔
...اس کے بارے میں ذرا تفصیلی گفتگو مناسب ہے۔ نواب صاحب کی یہ کتاب ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۸۸۴ء
...ی گئی ہے۔ یہ زمانہ نواب والا جاہ کے لیے انتہائی پُر آشوب تھا، آپ کو بدنام اور معتوب کرانے کے لیے،
...ں و مبغضین نے آپ پر انواع واقسام کے مذہبی و انتظامی الزامات قائم کرکے حکام گورنمنٹ برطانیہ تک آپ
...تیں پہنچائیں۔ جن شکایتوں سے انگریز افسروں کے کان بھرے گئے ان میں بڑی شکایت یہ تھی۔ کہ

"نواب صدیق حسن خاں انگریزی حکومت کے خلاف جہاد کرنے کی ترغیب دیتے ہیں
اور وہابیت کی تبلیغ کرتے ہیں۔"

ان دونوں الزامات کی روح ایک ہی تھی یعنی حکومت کے خلاف بغاوت، اس زمانے میں وہابیت
...اوت، ہم معنی لفظ تھے، چنانچہ کتنے ہی اہلحدیث تھے جو صرف کسی کے وہابی کہہ دینے پر مواخذہ میں آئے
...ں دوام بعبور دریائے شور کی سزا اور طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بنے۔ نواب صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں

"جو لوگ فسادی تھے انھوں نے حکام کے ذہن میں یہ بات ڈالدی تھی کہ جو لوگ
وہابی کہلاتے ہیں وہ سرکار انگریزی کے دشمن ہیں۔ سرکار نے جو غور فرمایا تو یہ دریافت
کیا کہ مطلق وہابی کے کہنے سے کوئی ہمارا دشمن نہیں سمجھا جاتا جب تک کوئی جرم بغاوت

اس سے صادر نہ ہو۔ مگر یہ بات مدتِ دراز کے بعد سرکار نے سمجھی، ورنہ ایک زمانہ میں صرف کسی کے وہابی کہہ دینے پر مواخذہ ہو جاتا تھا۔" (ترجمان وہابیہ ص ۶۵)

اور اس مواخذے کی سختی کا عالم یہ تھا کہ نواب صاحب ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

"کسی وہابی کے لیے عدالتہائے قانونی میں انصاف پانا ناممکن ہے، کیونکہ اس علتِ وہابیت کے معلوم ہوتے ہی حاکم عدالت اس کے خلاف پر آمادہ ہو جاتا ہے۔" (ترجمان وہابیہ ص ۶۶)

دشمنانِ والا جاہ کی ریشہ دوانیوں نے حالات کو آپ کے خلاف کس قدر نازک موڑ پر پہنچا دیا تھا اس کی تصویر کشی ممدوح کے خلف الرشید نواب زادہ محمد علی حسن خان صاحب نے یوں کی ہے:

"بھوپال محشرستانِ آشوب بنا ہوا تھا (حاسدین اور سرکاری حکام کے نزدیک) والا جاہ سے بڑھ کر کوئی غیر وفادار اور بدخواہ ملک و گورنمنٹ نہ تھا۔ دار و گیر کی صدائیں بلند ہو چکی تھیں ..... دستِ ستم دراز ہو چکا تھا، تیغِ بیداد بے نیام ہو چکی تھی اور ایک آلِ رسول قربان گاہِ آزمائش میں فیصلہ سر و تن کا منتظر کھڑا تھا اور وہ وقت قریب آ چکا تھا کہ یہ صدا لئے سرمدی بلند ہو۔

عمریست کہ آں جلوۂ منصور کہن شد ۔۔۔ من از سرِ نو جلوہ دہم دار و رسن را

کہ ناگاہ مشیتِ ایزدی نے آگے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا، تیغِ بیداد خمیدہ ہو کر سرِ بسجود ہو گئی۔

طفلانِ نازنیں کہ جگر گوشۂ خلیل ۔۔۔ آمد بزیرِ تیغ و شہیدش نمی کنند

جب گورنمنٹ آف انڈیا کے سامنے باضابطہ مقدمہ پہنچا تو اس نے بعد تحقیق ناواجب مطالبات کو رد کر کے مصلحتاً ... والا جاہ کے انتزاعِ خطابات و اختیارات پر قناعت کی اور ۱۳۰۲ھ کو انتزاعِ خطاب کا اعلان عام کیا اور نظم ریاست میں ممدوح کو دخل دینے سے ممانعت کر دی گئی۔"

اس ہنگامۂ رستخیز میں والا جاہ مرحوم کا نہ کوئی یار و غمگسار تھا، نہ کوئی معاون و صلاح کار، صرف خدائے حافظِ حقیقی کی حفاظت و نصرت اور رئیسہ عالیہ (ریاست بھوپال شاہجہان بیگم، شریکِ حیات نواب صاحب) کی سچی رفاقت اور بے نظیر وفاداری ان کی پشت پناہ تھی۔"

یہ تھے وہ نازک و پُرآشوب حالات جن میں نواب صاحب نے

تالیف کا مقصد و موضوع : "ترجمانِ وہابیہ" لکھی جس کا مقصد و موضوع درحقیقت بغاوت کے الزام کی تردید تھی ، چنانچہ خود مصنف نے اس کے تالیف کی غرض و غایت اور اس کا موضوع صراحتاً بیان کیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:

"یہ رسالہ اس غرض سے لکھا گیا ہے کہ سرکار عالیہ برٹش کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ مسلمانان ریاستہائے ہند و رعایائے ہند میں کوئی بدخواہ اس دولتِ عظمیٰ کا نہیں ہے ، اور جن مسلمانان ریاست وغیرہ پر دشمن ان کے تہمت وہابیت کی لگاتے ہیں وہ ہرگز وہابی نہیں اور اصل مذہب صحیح اسلام میں مسئلہ جہاد کس طرح ہے اور غربا پر اہلِ اسلام بلکہ بعض امرار مسلمین جن کی ایسی مخبری غلط بیشتر کبھی ہوئی ہے یا اب ہوئی ہے وہ اس راہ و رسم سے بالکل بری ہیں۔" (ص ۶) ...... پھر سرگزشت اپنی آخر رسالہ میں جو ایک سبب اصلی تالیف اس مقالہ کا بھی ہے لکھوں گا۔ (ص ۸)

اور فی الواقع یہی امور اس کتاب کے اندر بیان کئے گئے ہیں۔ مگر اس صراحت کے برخلاف محترم مولانا منظور صاحب نعمانی مدظلہ لکھتے ہیں کہ :

(نواب صاحب نے) شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی دعوت و مسلک سے اپنی اور جماعت اہلحدیث کی برأت ظاہر کرنا اور ان کو مطعون و مجروح کرنا اور فسادی تک قرار دینا ضروری سمجھا ان کی کتاب "ترجمان وہابیہ" کا یہی مقصد اور موضوع ہے۔" (ص)

آپ ایک طرف اصل حقیقت دیکھیے اور دوسری طرف مولانا نعمانی کا بیان ، پھر

ببیں تفاوتِ رہ از کجا است تا بکجا

نعمانی صاحب نے یہ تو بجا فرمایا کہ نواب صاحب ممدوح نے "ترجمانِ وہابیہ" میں "وہابیت" سے برأت ظاہر کی ہے۔ لیکن ہاتھ کی صفائی اور ہیرا پھیری سے یہاں بھی باز نہ آئے۔ نواب صاحب نے وہابیت کے دو رائج الوقت معانی درج کیے ہیں۔ ایک وہابیت بمعنی بغاوت اور دوسرے وہابیت بمعنی تقلید محمد بن عبدالوہاب۔ پھر دونوں سے اپنی برأت ظاہر کی ہے۔ خواہ وہابیت بمعنی بغاوت ہو یا بمعنی تقلید و پیروی محمد بن عبدالوہاب۔

اور ایک اپنی ہی برأت کیا انھوں نے تو اسی "ترجمان وہابیہ" میں صاف صاف اور بار بار لکھا ہے کہ،
ہندوستان میں وہابی کوئی نہیں، کیونکہ وہابی ہونے کی جو وجوہ ہو سکتی ہیں وہ ان میں پائی نہیں جاتیں، ہندوستانی مسلمانوں میں شیعی و حنفی تو ظاہر ہے کہ اپنے اپنے خاص امام کے پیرو اور مقلد ہیں نہ کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے (جن کی طرف وہابی منسوب ہیں) اور رہے اہلحدیث تو وہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کیا ائمہ متقدمین میں سے بھی کسی ایک معین امام کے پیرو اور مقلد نہیں ہیں ان لوگوں کا شیخ سے نہ تقلیدی رشتہ ہے نہ شاگردی و مریدی کا علاقہ، ہندوستان کی تحریک اہلحدیث و تحریک شہیدین نجدی تحریک سے نہ تاثر کا نتیجہ ہے نہ اس سے وابستہ ہے بلکہ وہ مستقل تحریک ہے جس کی بنیاد کتاب وسنت کی اتباع اور عدم تقلید شخصی پر ہے اس لیے اہلحدیث نیز شیعی و حنفی بھی کسی طرح اپنے لیے "وہابی" کا لقب پسند نہیں کرتے۔

نواب صاحب نے "ترجمان وہابیہ" کی فصل سوم میں اہلحدیث کے "وہابی" نہ ہونے کی متعدد وجوہ بیان کی ہیں۔ وجہ سادس میں۔ جس کا اقتباس مولانا نعمانی نے پیش کیا ہے۔ یہ بیان کیا ہے کہ:

"اہلحدیث کے احوال و طبقات کی صدہا ہزارہا کتابیں بطور تاریخ مذہب اسلام میں موجود ہیں، ان کی نسبت کسی کتاب میں کسی جگہ حال فساد و غدر کا نہیں لکھا ہے۔ بخلاف محمد بن عبدالوہاب کے کہ حال اس کے فساد کا تاریخ مصر و دیگر کتب مولفہ علماء عیسائی مطبوعہ بیروت وغیرہ میں مفصل تحریر ہے۔" (ص ۳۰)

اس تحریر سے نواب صاحب کا مقصد بالکل واضح ہے کہ ہم پر "وہابیت" کا الزام لگانا اور ہمیں "وہابی" قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ہم اپنے مخالفین یا حکومت وقت سے جنگ و قتال نہیں کر رہے ہیں۔ اور شیخ محمد بن عبدالوہاب کی ان کے مخالفین امراء و شیوخ سے حرب و ضرب اور جنگیں ہوئیں۔

یہاں نواب صاحب کی یہ احتیاط بھی ملحوظ رہے کہ وہ محمد بن عبدالوہاب کو خود فساد سے متصف نہیں کرتے بلکہ انگریز گورنمنٹ کو یہاں یہ بتا رہے ہیں کہ تمہارے عیسائی مصنفین نے ان کے فساد کا جو حال لکھا ہے ویسا حال اہلحدیث لوگوں کا کسی کتاب میں بھی نہیں مل سکتا۔ پس خود گورنمنٹ کے مسلمات کی رو سے اہلحدیث کو وہابی قرار دینا کیونکر قرین انصاف ہو سکتا ہے؟ یعنی نواب صاحب نے نہ اس کا دعویٰ کیا ہے اور نہ اسے اپنی ذاتی رائے قرار دی ہے کہ محمد بن عبدالوہاب واقعۃً فسادی تھے۔ بلکہ یہ بتایا ہے کہ دوسرے لوگوں نے ان کے بارے میں ایسا لکھا ہے۔ مگر مولانا نعمانی کا کمال دیکھیے کہ انھوں نے یہ "فساد" جڑ دیا کہ نواب صاحب شیخ کو مجروح و مطعون کرنا اور فسادی قرار دینا ضروری سمجھتے تھے اور یہی ترجمان وہابیہ کا موضوع ہے۔

پھر نعمانی صاحب کو اس تلبیس سے اس قدر دلچسپی ہے کہ انھوں نے طعن و فساد کے دائرے کی حد بندی کی وضاحت مناسب بھی نہ نواب صاحب ان تحریروں کی طرف اشارہ کرنا مناسب سمجھا جن میں شیخ ممدوح کی خوبیوں اور اصلاحی اقدامات کا اعتراف ہے، حالانکہ نواب صاحب کے اس بیان کو موصوف کی دوسری تحریروں کے سیاق و سباق میں رکھ کر ہی پڑھنا چاہیے۔ انصاف اور معقولیت کا تقاضا بھی ہے۔ کوئی کسی شخص کی خوبیوں کا زبردست اعتراف و ذکر کرنے کے ساتھ اس کے کسی ایک اقدام سے اختلاف کا اظہار کرے اور اس کو فساد سے تعبیر کرے تو اس کو اس کے حقیقی پس منظر میں دیکھنا چاہیے اور اس کا جو واقعی مقصد ہے اسے ظاہر کرنا چاہیے۔ نہ یہ کہ اس پر تہمت تراشی کر کے اس کی معمولی بات کو بھیانک شکل دیدی جائے اور اسے مجرم کے کٹہرے میں کھڑے کرنے کی کوشش کی جائے جیسا کہ نعمانی صاحب نے کیا ہے۔

نواب صاحب نے ترجمانِ وہابیہ میں محمد بن عبد الوہاب کو بذاتِ خود مطعون و مجروح نہیں کیا ہے نہ فسادی کہا ہے۔ بلکہ الزامی جواب کے طور پر دوسروں کی بات نقل کی ہے اور پھر دوسروں کے الزام کو بھی صرف جنگ و قتال کے معاملے میں نقل کیا ہے۔ رہا جنگ و قتال کے علاوہ دیگر عقائد و اعمال کے اعتبار سے مجروح و مطعون کرنے کا معاملہ تو آپ ترجمانِ وہابیہ کی آٹھوں فصلیں، مقدمہ اور خاتمہ پڑھ جائیے۔ کہیں بھی آپ کو شہاب ثاقب کی سی خرافات و افترات اور جرح و طعن نہیں ملیں گی یعنی کسی بھی فصل میں شیخ الاسلام کو شہاب ثاقب کی طرح بدعقیدہ، فاسق، خبیث، مخالف اہلسنت والجماعت، ظالم و خونخوار وغیرہ لکھا ہوا نہیں ملے گا حتی کہ اس کتاب میں نواب صاحب نے وہ مشہور عام الزام بھی بطور خود وثوق کے ساتھ کہیں ذکر نہیں کیا ہے کہ شیخ اپنے اور اپنی جماعت کے علاوہ تمام مسلمانوں کو کافر و مباح الدم سمجھتے تھے۔ بلکہ اس سب کے برخلاف کئی جگہ یہ صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ:

"نیا مذہب نکالنے کی نسبت ان کی طرف کرنا (یعنی شیخ محمد بن عبد الوہاب کی طرف)
بظاہر غلط محض ہے۔ اس لیے کہ وہ مذہبِ حنبلی میں پہلے سے آخر تک رہے۔" (ص ۱۵)

اس کے باوجود معلوم نہیں مولانائے نعمانی نے کس بنیاد پر یہ لکھ دیا کہ ترجمانِ وہابیہ کا مقصد خود شیخ کو (علی الاطلاق) مجروح و مطعون کرنا ہے۔

مولانا کو اپنے اس دعوے کے ثبوت میں شیخ کے متعلق مذکورہ بالا اقتباس کے علاوہ اور کوئی عبارت نہیں ملی تو فصل ششم سے جس میں امرائے آلِ سعود کا مختصر ترجمہ و تذکرہ اور مخالفین امرائے وقت سے ان کی جنگوں کا حال لکھا ہے امیر سعود بن عبد العزیز (م ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴م) کے حالات میں سے اس حصہ

اقتباس نقل کیا ہے، جس میں ان کے مدینہ میں داخلہ اور قبضہ کا حال مذکور ہے جو بقول مولانا نعمانی صاحب انتہائی اشتعال انگیز ہے اور یہ سعود بن عبدالعزیز شیخ محمد بن عبدالوہاب ہی کے فیض یافتہ بلکہ ساختہ پرداختہ تھے۔ اسی لیے یہ اشتعال انگیزی گویا شیخ کے خلاف ہے مگر مولانا کے محترم نے اس کو نظرانداز کر دیا کہ اسی فیض یافتہ کے بارے میں اس کی سیرت و کردار کے بارے میں پہلے یہ لکھا ہے کہ:

" اور اس میں تدین اور حلم اور عدل تھا، اس لیے خاص اور عام اس کی طرف میلان رکھتے تھے اور اجرائے احکام میں ایک شمشیر برہنہ تھا اور مجرموں کو سخت سزا دیتا تھا اور ابطال طلاق میں اس نے بہت کوشش کی اور فریضۂ رمضان کی محافظت میں بہت کوشش کی۔" (ص ۵۰)

بات اصل یہ ہے کہ جیسا کہ نواب صاحب نے لکھا ہے کہ مفسدانِ فتنہ پردازے۔ حکام انگلشیہ کے خیال میں یہ امر جما دیا تھا کہ یہ لوگ جو "وہابی" ہیں سب حکومت کے "باغی" ہیں اور یہ اہلحدیث نواب صدیق حسن خاں وغیرہ بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں اور سب "وہابی" ہیں۔ نواب صاحب ممدوح نے اپنی متعدد تصنیفات میں بالعموم اور ترجمانِ وہابیہ میں بالخصوص اس الزام کی تردید کی ہے اور واضح کیا ہے کہ "ہر محدث (اہلحدیث) اہلسنت پر لفظ "وہابی" بولنا اور "وہابی" کے معنی "باغی" ٹھہرانا خلافِ عقل و نقل ہے (ص ۸۹)

اور "وہابی" کی نسبت چونکہ محمد بن عبدالوہاب کی طرف ہے، اس لیے نواب صاحب نے اپنے اور اپنی جماعت اہلحدیث کے "وہابی" نہ ہونے کے ثبوت میں اہلحدیث کے طرز عمل اور شیخ کے شہرت یافتہ اور عیسائی مصنفین کی کتابوں کے اندر بیان کردہ طرز عمل کے درمیان جو فرق و اختلاف تھا اس کو بیان کیا ہے۔ مگر اس معاملے میں بھی نواب صاحب نے یہ احتیاط برتی ہے کہ ان کے عقیدے اور مذہب پر کوئی حملہ نہیں کیا ہے۔ اس کے برخلاف مولانا مدوح نے اپنے اکابر پر لگائے گئے اسی الزام وہابیت کی تردید کرنی چاہی اور اپنے بزرگوں کی اہلِ نجد سے بے تعلقی اور ان کے درمیان فرق و اختلاف کو بیان کیا تو شیخ کی طرف بہت کچھ "خرافات و افتراآت" پورے وثوق کے ساتھ منسوب فرما دیں اور یوں ان سے اپنے اکابر کی براءت ثابت کی۔

ترجمانِ وہابیہ اور الشہاب الثاقب میں اس واضح فرق کے باوجود مولانا نعمانی "مدظلہ" کا دعویٰ یہ ہے کہ ترجمانِ وہابیہ کا مقصد و موضوع ہی شیخ کو مطعون و مجروح کرنا ہے، حالانکہ یہ دعویٰ جیسا کہ بیان کیا گیا واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔

نواب صاحبؒ کی تحریروں کا خلاصہ:

یہ ہیں نواب صاحب والا جاہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحریروں کے چند اقتباسات جن میں انھوں نے شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اپنے تاثرات وخیالات کا اظہار کیا ہے، ان میں شیخ الاسلام کے عقیدہ ومذہب کی وضاحت بھی ہے اور ان پر لگائے گئے الزامات کی تردید بھی، ان تحریروں کو پڑھنے کے بعد ایک منصف مزاج قاری شیخ کے بارے میں جو کم از کم تاثر اور رائے قائم کرے گا وہ شیخ مشائخ دیوبند حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی م ۱۳۲۳ھ کے اس تاثر سے کچھ بہتر ہی ہوگا جس کا اظہار مولانا گنگوہی نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

"ان کے (یعنی شیخ محمد بن عبد الوہاب کے) عقائد عمدہ تھے اور مذہب حنبلی تھا، البتہ ان کے مزاج میں شدت تھی مگر وہ اور ان کے مقتدی اچھے ہیں۔ مگر ہاں جو حد سے بڑھ گئے ان میں فساد آگیا۔"

(فتاوی رشیدیہ ج ۱ ص ۷)

اور محترم مولانا نعمانی صاحب کے نزدیک یہ رائے انتہائی متوازن اور نہایت مبصرانہ اور محققانہ ہے۔ (ملاحظہ ہو مولانا نعمانی کی کتاب ص ۴۹) پھر معلوم نہیں نواب صاحب کی رائے جو اس سے بھی بہتر ہے مولانا نعمانی کے نزدیک جرم کے خانے میں کیوں آگئی؟ اور مدنی صاحب کی غیر متوازن اور "نہایت بری رائے" کا ماخذ کیسے بن گئی۔؟

نواب صاحبؒ کی تحریر کو مولانا مدنی کا ماخذ قرار دینا صحیح نہیں۔

نواب صاحبؒ کی مسطورۂ بالا تحریروں اور ان کے تاثرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کیا کوئی انصاف پسند یہ کہہ سکتا ہے کہ ممدوح بھی ان لوگوں میں تھے جو شیخ الاسلام سے نفرت وعداوت رکھتے تھے یا ان کو عقائد کے لحاظ سے بھی مجروح ومطعون قرار دینا ضروری سمجھتے تھے۔ یا یہ کہ یہ تحریریں بھی ان خرافات وافترآت" کا ایک ماخذ ہیں جن کو مولانا مدنی مرحوم نے "حقائق وواقعات" سمجھ کر اپنی کتاب "الشہاب الثاقب" میں نقل کیا ہے اور اس کتاب نے ہندوستان میں شیخ الاسلام کے خلاف پروپیگنڈہ مہم میں بہرحال ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ چنانچہ یہی کتاب ہے جس نے حلقۂ دیوبند کے عوام ہی نہیں خواص کے بھی نہ جانے کتنوں ذہنوں کو

شیخ اور ان کے متبعین کے بارے میں مسموم کیا اور کر رہی ہے، کیونکہ حلقہ دیوبند سے اس کی اشاعت کا سلسلہ ابھی تک بند نہیں ہوا ہے۔ ناظرین مذکورہ بالا دونوں قسم کی تحریروں میں جو بالمقابل درج کر دی گئی ہیں، موازنہ و مقابلہ کر کے بیک نظر فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کیا الشہاب الثاقب کی ہفوات کے لیے نواب صاحب کی پاکیزہ تحریروں میں کوئی گنجائش ہے؟ شتان بین مشرق و مغرب۔

مولانا نعمانی محترم نے اگر صرف "تکفیر و قتال" کے معاملے میں نواب صاحب کی کتاب کو بھی مولانا مدنی مرحوم کا ایک ماخذ قرار دیا ہوتا تو یہ بات کسی قدر سہل ہو سکتی تھی کیونکہ خود مولانا مدنی نے شہاب ثاقب میں شیخ الاسلام پر لگائے گئے الزامات کی فہرست میں صرف اسی ایک الزام کے متعلق پیراگراف میں نواب صاحب ممدوح کا حوالہ دیا ہے لیکن مولانا نعمانی نے بڑی بے ہمتی سے "گواہ چست" کے مصداق نواب صاحب اور ان کی تحریروں کو جس طرح علی الاطلاق مولانا مدنی کی غلط فہمی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے وہ بہرحال حقیقت کے بالکل برعکس اور مکمل طور پر مغالطہ انگیز ہے، اس سے ہر قاری پر یہ تاثر قائم ہوتا ہے کہ نواب والا جاہ کی تحریروں میں بھی شیخ کے متعلق وہ ساری بے سروپا باتیں، جھوٹے الزامات اور خرافات و لغویات موجود ہیں جو الشہاب الثاقب کا طرۂ امتیاز ہیں، بلکہ جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا مولانا نعمانی کی تحریروں کا اصل منشاء اور اشارہ یہی ہے کہ قصور در اصل نواب صاحب اور زینی دحلان کی وغیرہ کا ہے۔ اور مولانا مدنی محض ناقل ہیں۔ انھوں نے اگر حقیقت حال کی جستجو و تحقیق نہیں کی بلکہ اس کی ضرورت بھی نہ سمجھی اور محض افواہوں اور مخالفین کے اقوال پر اعتماد کر کے اتنے سنگین الزامات لگا دیے تو یہ نہ قصور ہے نہ تعجب انگیز و ناقابل فہم۔ مولانا نعمانی کی وہ عبارت پہلے بھی نقل کی جا چکی ہے۔ ناظرین ایک دفعہ پھر پڑھ لیں۔ مولانا نعمانی لکھتے ہیں۔

"تو جیسا کہ بار بار عرض کیا گیا واقعہ یہی ہے کہ..... مولانا حسین احمد مدنی صاحب نے بھی اسی عام شہرت کی بنا پر اور شیخ احمد دحلان مکی اور نواب صدیق حسن خاں صاحب مرحوم جیسے اہل علم کی تحریروں پر اعتماد کر کے ان خرافات و افترا آت کو حقائق و واقعات سمجھ کر نقل کر دیا، بلکہ مولانا نے نواب صاحب مرحوم کی کتاب کا حوالہ بھی دیا ہے۔"

(ص ۸۸، ۸۹)

دیکھیے! کیا اس تحریر کا صاف اور واضح مقصد یہ نہیں ہے کہ مولانا نعمانی کسی ایک الزام کی بابت

نہیں بلکہ ان ساری ہی خرافات وافترارات کی بابت جن کا "الشہاب الثاقب" میں ذکر ہے، یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ سب کا یا اکثر کا ماخذ نواب صاحب کی تحریریں بھی ضرور ہیں، ..... باقی رہا یہ سوال کہ مولانا نعمانی نے یہ تاثر دینے میں حقیقت پسندی سے کام لیا ہے یا فریب کاری و مغالطہ دہی اور الزام تراشی و دروغ بافی سے؟ تو ہماری تفصیلی وضاحت کے بعد اس کا فیصلہ ناظرین خود کر سکتے ہیں۔

تنبیہ: ممکن ہے بعض ناظرین کو یہ شبہ ہو کر راقم الحروف نے یہاں نواب صاحب والاجاہؒ کی محولہ بالا کتب سے صرف وہی تحریریں اقتباس کرکے پیش کی ہیں جن میں شیخ الاسلامؒ کے بارے میں عمدہ خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اور وہ تحریریں جن میں شہاب ثاقب کے "الزامات" کا ذکر ہے، عمداً نظر انداز کردی ہیں۔ مگر میں یقین دلاتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔ محولہ بالا کتب میں زیر بحث الزامات کا واقعی ذکر نہیں ہے، ان کتابوں کا مطالعہ کرکے دیکھا جا سکتا ہے۔ واللہ علی ما نقول وکیل۔

نواب صاحب اور مولانا مدنی کی تحریروں میں اختلاف وتضاد:

اگر مولانا نعمانی مدظلہ کا یہ خیال صحیح ہے اور انھیں اس پر اصرار ہے کہ شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہابؒ کے خلاف "الشہاب الثاقب" میں جو بے سروپا باتیں لکھی گئی ہیں، ان کو لکھتے وقت نواب والاجاہؒ کی تحریریں بھی مولانا مدنیؒ کے پیش نظر تھیں اور ان پر انھوں نے اعتماد اور ان سے اخذ واقتباس کیا ہے تو ہر معقول آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہوگا کہ پھر ان دونوں کی تحریروں میں اس درجہ اختلاف کیوں ہے؟ کہ:

- نواب صاحبؒ، شیخ الاسلام کو عالم متبع کتاب وسنت، دیندار، عابد، خدا پرست، ماحی شرک و بدعت، فریضۂ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کو ادا کرنے والا، اور شریعت اسلامیہ کا احیاء کرنے والا لکھتے ہیں اور دل سے ان کی خوبیوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ _____ اور مولانا مدنیؒ، شیخ ممدوح اور ان کے ساتھیوں کو ..... شقی القلب، خبیث، ضعیف الاعتقاد، بدعقیدہ، رسول کریم اور سلف صالحین کی شان میں گستاخ و بے ادب، ظالم و فاسق وغیرہ وغیرہ لکھ رہے ہیں۔ (معاذاللہ)
- نواب صاحبؒ، شیخ الاسلام کو اہل سنت وجماعت کے موافق بتاتے ہیں ___ اور مولانا مدنیؒ ان کو گروہ اہلسنت وجماعت کا مخالف کہتے ہیں۔

• نواب صاحبؒ ان کو حنبلی المذہب اور امام احمد بن حنبل کا پیرو اور مقلد لکھتے ہیں ــــ مگر مولانا مدنی لکھتے ہیں کہ وہ مقلد نہیں تھے بلکہ تقلید کو شرک فی الرسالہ جانتے تھے۔

• نواب صاحب اپنے اور اپنی جماعت کے بارے میں بار بار اور صاف صاف لکھتے ہیں کہ ہم اہلحدیث ہیں، کتاب و سنت کے پیرو ہیں، اور محمد بن عبدالوہاب کیا متقدمین علماء و ائمہ میں سے بھی کسی کے مقلد نہیں ہیں ــــ مگر مولانا مدنی اس کے بالکل برخلاف لکھتے ہیں کہ یہ غیر مقلدین ہند اسی طائفہ شنیعہ (وہابیہ نجدیہ) کے پیرو ہیں۔

• نواب صاحب، شیخ کے حالات لکھتے ہوئے اپنی متعدد کتابوں میں صحیح صحیح تاریخ درج کر رہے ہیں کہ شیخ ۱۱۱۵ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰۶ھ میں وفات پائی۔ ــــ مگر مولانا مدنی کی معلومات کا یہ حال ہے کہ وہ لکھتے ہیں: "صاحبو! محمد بن عبدالوہاب نجدی ابتداء تیرہویں صدی میں نجد سے ظاہر ہوا۔"

نواب صاحبؒ کے عمدہ تاثرات کیوں نظر انداز کر دیے گئے؟:

نیز یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر واقعی مولانا مدنیؒ نے نواب صاحب مرحوم کی تحریروں پر اعتماد کیا ہے تو نواب صاحب ممدوح کی مسطورہ بالا قسم کی تحریریں کیوں کسی درجہ میں درخور اعتنا نہیں سمجھی گئیں؟۔ مولانا مدنی مرحوم نے نواب صاحب کا جو ایک جگہ حوالہ دیا ہے، تو ان کی کسی کتاب کا نام نہیں لیا ہے، مگر مدنی صاحب موصوف کے اس جملہ سے کہ "نواب صدیق حسن خاں نے خود اس کے ترجمہ میں ان دونوں باتوں (تکفیر و قتل مخالفین) کی تصریح کی ہے[1]" (ص ۴۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب کی کسی ایسی کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے جس کا موضوع "ترجمہ و تذکرہ" ہے۔ اس سے گمان ہوتا ہے کہ وہ کتاب "اتحاف النبلاء" یا "التاج المکلل" ہوگی مگر ان دونوں میں سے کسی میں بھی شہاب ثاقب کی زیر بحث لغویات موجود نہیں ہیں اول الذکر میں تو صرف یہی نہیں کہ شیخ الاسلام کا ترجمہ عمدہ اور اچھے انداز میں لکھا گیا ہے جو بقول مولانا

---

[1] مولانا کے انداز تحریر اور لفظ "خود" کی تصریح سے یہ مفہوم نکلتا ہے کہ مولانا کو معلوم ہے کہ نواب صاحب بنیادی طور پر شیخ کے موافق و موید ہیں مگر اس کے باوجود چونکہ وہ بھی "تکفیر و قتال" کے باب میں ان سے اختلاف رکھتے ہیں، اس لیے اس کا حوالہ دیا گیا کہ گویا یہ ایک شیخ کے حمایتی کی ان کے خلاف شہادت ہے۔

خود تاریخی حقیقت سے قریب تر ہے بلکہ اس میں شیخ عبداللہ بن محمد بن عبدالوہاب کے رسالہ کا جو خلاصہ درج ہے اس کے اندر مولانا مدنی کے ذکر کردہ الزامات کی تردید بھی ہے پھر نواب صاحب کی یہ کتاب حقیقت سے بعید تر تالیفات کا ماخذ کیسے ہوسکتی ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات ہویدا ہو جاتی ہے کہ یہ کہنا بالکل صحیح نہیں، کہ مولانا مدنی مرحوم نے شیخ الاسلام کے خلاف جو کچھ لکھا ہے اس سلسلہ میں انھوں نے نواب صاحب مرحوم کی بھی تحریروں پر اعتماد کیا ہے اور ان کو بھی اپنا ماخذ بنایا ہے۔

مولانا مدنی کی تحریر میں اس کا قرینہ:

بلکہ خود مولانا مدنی رح کے رجوع سے متعلق جس اخباری بیان کا حوالہ دیا جاتا ہے [۱] اس میں بھی اس کا قرینہ موجود ہے، کیونکہ مولانا نے اس میں صراحت کے ساتھ بیان کردیا ہے کہ شیخ کے خلاف ان کے ماخذ جو ہیں "افواہیں" اور "مخالفین کے اقوال" اور نواب صاحب شیخ کے مخالفین میں نہیں کہے جاسکتے۔ ان کو بعض مسائل میں شیخ سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن "اختلاف" اور "مخالفت" میں بہت فرق ہے ضروری نہیں کہ جو کسی سے بعض مسائل میں اختلاف رکھے وہ اس کا مخالف بھی ہو جیسے محترم مولانا نعمانی صاحب کو حضرت مولانا قاری طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے بعض امور میں اختلاف تھا اور گزشتہ دنوں دارالعلوم دیوبند کے قضیہ میں انھوں نے اس کا پوری بے باکی کے ساتھ کھل کر اظہار بھی کیا، اور آج بھی قاری صاحب مرحوم کی غلطی کو مولانا نعمانی غلطی ہی کہہ رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود مولانائے محترم یہ پسند نہیں کریں گے کہ انھیں قاری صاحب مرحوم کے مخالفین میں شمار کیا جائے اور خود مولانا مدنی مرحوم سے حضرت قاری صاحب کو بعض امور میں شدت کے ساتھ "اختلاف تھا، مگر آپ کو ان کے مخالفین میں مولانا نعمانی صاحب بھی غالباً شمار نہیں کرتے ہوں گے"۔

(باقی آئندہ)

---

[۱] واضح رہے کہ یہ اخباری بیان صحیح نہیں۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

تمباکو، بیڑی اور سگریٹ نوشی

خورشید احمد سلفی استاذ جامعہ سراج العلوم جھنڈانگر نیپال

ملت اسلامیہ کا یہ انتہائی زبردست المیہ ہے کہ آج اس کی گاڑھی کمائی کا ایک معتد بہ حصہ خلاف اسلام امور اور منکرات و منہیات میں ایسی بے دردی سے صرف ہو رہا ہے کہ جس کے لیے شریعت اور عقل و منطق کے نقطۂ نظر سے کوئی جواز نہیں ہے۔ ہمدردانِ ملت کو اس مہلک ترین مرض کے عام ہونے کا غم ہے اور مداوا کی کوششیں بھی جاری ہیں۔ لیکن یہ مرض ایسا ہے کہ روز بروز بڑھتا ہی جا رہا ہے۔ تمباکو، بیڑی، سگریٹ نوشی بھی اسی قبیل سے ہیں۔ آج ان کا اس قدر زور ہے کہ خرد و کلاں پیر و جواں، فقراء و اغنیاء سبھی اس میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اور مقام تعجب بلکہ مقام حسرت ہے کہ علماء کرام جنھیں ملت کی رہبری و پیشوائی کا شرف حاصل ہے وہ بھی اس سے دوچار ہیں اور ان کے جواز پر ایسی لاطائل دلیلیں پیش کرتے ہیں جن کو سن کر سر دھننا پڑتا ہے اور بے ساختہ یہ مصرعہ زبان پر جاری ہوجاتا ہے ؎

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

لیکن یہ پختہ تجربہ ہے کہ جب کوئی فعل قبیح کسی قوم و معاشرے میں عموم بلویٰ کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو اس کی قباحت کا احساس دلوں سے جاتا رہتا ہے اور کھلے عام اس کا ارتکاب ہوتا ہے۔ بس یہی معاملہ یہاں بھی ہے ورنہ شریعت سے ان چیزوں کے جواز پر کوئی دلیل نہیں ہے۔

البتہ علماء نجد و حجاز نے اس لایعنی کام کی سنگینی اور برے اثرات کو محسوس کیا اور کتاب و سنت کی روشنی میں مسئلہ کی پوری چھان بین کر کے ان کی حرمت کا فتویٰ صادر فرما دیا ہے۔ برصغیر ہند و پاک میں بھی یہ بات خوش آئند ہے کہ نوجوان سلفی علماء بھی ان چیزوں کے استعمال کی شناعت کو کتاب و سنت کی روشنی میں واضح کرتے دکھائی پڑتے ہیں، اگر کوشش برابر جاری رہی تو امید ہے کہ افرادِ امت ضرور اس کو سمجھنے اور عمل کرنے

کی طرف توجہ مبذول کریں گے۔ وما ذالك على الله بعزيز۔ زیر نظر مضمون میں اسی مسئلہ پر چند پہلوؤں سے روشنی ڈالی جارہی ہے۔ لعل الله يحدث بعد ذالك امرا۔

تمباکو کا فروغ: سولہویں صدی عیسوی سے قبل لوگ تمباکو سے ناواقف تھے۔ پہلے پہل تمباکو براعظم امریکہ کے ملک میکسیکو کے علاقہ تباکو میں پایا گیا، اسی مناسبت سے اس کا نام تمباکو پڑ گیا۔

۱۵۳۰ء میں اہل اسپین نے اس کی کاشت شروع کی پھر آہستہ آہستہ یہ خبیث پودا بلاد یورپ سے پھیلتا ہوا چین وجاپان پہنچا اور پھر وہاں سے ایشیا وافریقہ میں پھیلا، اور ایسی قبولیت عامہ حاصل کی کہ جزو زندگی بن گیا اس کے رسیا کی زندگی اسی پر منحصر ہوکے رہ جاتی ہے اور پھر ؎

چھٹتی نہیں ہے منھ سے یہ کافر لگی ہوئی

تمباکو کے استعمال میں جتنے مضرات پنہاں ہیں اگر ان پر تفصیلی بحث ونظر کی جائے تو ایک کتابچہ تیار ہوجائے۔ یہاں صرف مختصر طور پر چند باتیں پیش کی جارہی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ عامۃ الناس جس چیز کو کوئی اہمیت نہیں دیتے وہ ان کی معیشت اور صحت وغیرہ کے لیے کتنی ضرر رساں ہے۔

فتور: شریعت اسلامیہ کی کوشش ہے کہ اس کے پیروکار دانشمندی کی روش پر برقرار رہیں، وہ کسی ایسی چیز کا استعمال نہ کریں جس سے ان کا ذہن ماؤف اور اعضاء وجوارح مضمحل ہوں۔ چنانچہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں: نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن كل مسكر ومفتر۔ (مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۱۸) یعنی رسول پاک نے ہر نشہ آور اور فتور آور چیز کے استعمال سے منع فرمایا ہے۔ تمباکو نشہ آور ہو نہ ہو لیکن اس کے مفتر ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہے۔ ایسا شخص جس نے تمباکو کا استعمال نہ کیا ہو اگر تھوڑا سا بھی اسے کھلا دیا جائے تو اس کی حالت دگرگوں ہوجائے گی، اور وہ قے، چکر، ضعف اعضاء ورعشہ کا شکار ہوجائے گا۔ لہٰذا اس حدیث پاک سے بیڑی، سگریٹ، تمباکو کا منہی عنہ ہونا بالکل واضح ہے۔

تبذیر: باری تعالیٰ کا فرمان ہے: وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ

لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا (بنی اسرائیل) یعنی ناطے والوں اور مسکینوں اور مسافروں کے حقوق ادا کیا کرو اور فضول خرچی میں مال و دولت ضائع مت کرو، کچھ شک نہیں کہ فضول خرچ شیطان کے ساتھی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بالکل ناشکرا ہے۔

گویا کہ فعل تبذیر شیطان کا بھائی ہونے کو مستلزم ہے تو جو اس کا کسی بھی حیثیت سے بھائی ہوگا تو شیطان ہی کی طرح اپنے رب کا ناشکرا ہوگا۔

تبذیر کہتے ہیں بے محل خرچ کو جیسے کوئی شخص اپنا روپیہ سمندر میں پھینکے۔ تو تمباکو کا معاملہ اس سے کچھ الگ نہیں ہے۔ کیونکہ اگر تمباکو کے خوگروں سے اس کے فوائد کو دریافت کیا جائے تو سوا اس کے کہ جناب! ایک چسکا لگ گیا ہے اور کوئی جواب نہ دے سکیں گے۔

ہلاکت آفرینی: اسلام صراطِ مستقیم ہے اور اس کا فطری تقاضہ ہے کہ اپنے ماننے والوں کی صحت جسمانی وصحت روحانی کا بھرپور خیال رکھے۔ انھیں کسی ایسی چیز کی اجازت نہ دے، جس سے انھیں بلا وجہ ضرر پہنچے، اور ہلاکت و بربادی سے دوچار ہوں۔ چنانچہ اسلامی احکام و اعمال کا تجزیہ کرنے والے بخوبی واقف ہیں کہ ان میں کس قدر صحت و توانائی کا لحاظ کیا گیا ہے۔ نیز سیرت کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ طب نبوی میں کس قدر حفظانِ صحت کی تعلیم موجود ہے۔ زاد المعاد وغیرہ میں اس تعلیم کو بتفصیل دیکھا جاسکتا ہے بہرحال اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ۔ (سورۂ بقر) یعنی اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اور آج دنیا کے تمام اطبا کا اتفاق ہے کہ تمباکو میں نکوٹین پائی جاتی ہے جو ایک نہایت زہریلا مادہ ہے۔ ایک سیر تمباکو میں تقریباً ایک تولہ زہر ہوتا ہے۔ اور یہی نکوٹین عموماً کینسر کا سبب بنتا ہے نیز گلے پھیپھڑے وغیرہ کی دوسری مہلک بیماریوں کا محرک ہوتا ہے۔ چنانچہ امریکہ وغیرہ میں کینسر کی سوسائٹیاں وقتاً فوقتاً سگریٹ کے زہر سے مرنے والوں کی تعداد شائع کرتی رہتی ہیں۔ ۲۶ سال پہلے کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ امریکہ میں گزشتہ پانچ سالوں میں ۱۱۰۸۷ سگریٹ نوش سرطان سے مرگئے ہیں۔ (منہاج لاہور ۹ جولائی ۱۹۵۸ء)

اور اب امریکی وزارت صحت کے بیان کے مطابق امریکہ میں ہر سال ساڑھے تین لاکھ انسان سگریٹ کے سبب مرتے ہیں۔ (الاہرام قطر جنوری ۱۹۸۲ء)

علاوہ ازیں دوسری جنگ عظیم کے بعد صرف برطانیہ میں دس لاکھ انسان سگریٹ کے سبب فوت ہوئے۔

نظافت: اسلام میں جہاں اور بیشمار خوبیاں ہیں وہیں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ صفائی و ستھرائی کا مذہب ہے، اس نے صفائی و نظافت پر جتنا زور دیا ہے دنیا کے کسی مذہب میں اس کی نظیر نہیں ملتی ہے۔ حدیث کی تمام کتابوں میں طہارت کا مستقل باب موجود ہے۔ طہارت ہی پر زور دیتے ہوئے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لولا ان اشق علی امتی لأمرتھم بالسواك عند كل صلوٰة ۔ یعنی اگر میری امت پر شاق نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے وقت مسواک کا حکم دیتا۔ طہارت و نظافت ہی کے پیش نظر آپ نے کچا پیاز اور لہسن کھا کر مسجد میں آنے سے منع فرمایا ہے۔ قرآن پاک میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق فرمایا گیا ہے یامرھم بالمعروف وینھاھم عن المنکر ویحل لھم الطیبات ویحرم علیھم الخبائث ۔ یعنی آپ لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔ ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتے ہیں اور خبیث چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں۔ تمباکو کو کوئی صاحب ذوق آدمی پاکیزہ چیزوں میں شمار نہیں کر سکتا ہے۔ انکا استعمال کرنے والوں کے منہ سے عجیب کریہ بو آتی ہے تو جب لہسن و پیاز کھا کر مسجد میں آنے سے منع کیا کہ جس کی بو تھوڑی دیر باقی رہتی ہے تو تمباکو خور و سگریٹ نوش کا منھ ہر دم بدبو کرتا ہے اور اس کو مسجد میں آنے کی اجازت کیوں کر مل سکتی ہے۔

سوال کی ذلت: اسلام عزت و وقار، شرافت و خود داری کا مذہب ہے اور اپنے ماننے والوں کو ہر طرح کی ذلت و رسوائی سے محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ ولا تسألن احدا شیئا وان سقط سوطك کسی سے ہرگز کوئی چیز نہ مانگنا، اگرچہ تمہارا کوڑا ہی کیوں نہ گر گیا ہو۔ اور ادھر حال یہ ہے کہ ان حقیر چیزوں کے شوقین ہر کس و ناکس کے سامنے سفر و حضر میں دست سوال دراز کرتے دکھائی پڑتے ہیں۔ (اعاذنا اللہ منہا)

قابل عبرت واقعہ: جماعت اہلحدیث ہند کے مشہور و پایہ ناز عالم استاذ الاساتذہ حضرت مولانا حافظ عبداللہ صاحب غازیپوری رحمۃ اللہ علیہ نے مدرسہ ریاض العلوم دہلی میں مدرسی کے زمانہ میں اپنے ایک شاگرد کو اس بنا پر مارا تھا کہ وہ پان کھا کر درس میں آیا تھا۔ بعد میں پان خوری کی بابت نصیحت کرتے ہوئے طلبہ کو حافظ صاحب نے فرمایا کہ تم پان کھاتے ہو، میرا اس میں کوئی نقصان نہیں۔

نہ میرا پیسہ خرچ ہوتا ہے۔ محض تمہاری بھلائی مقصود ہے۔ کسی چیز کی عادت ڈالنا خطرناک ہے، اگر تمہارے پاس پیسہ نہیں ہے تو اپنی عادت سے مجبور ہو کر چوری کر کے کھانے کی کوشش کرو گے، چوری کرنے والے کی سزا کیا ہوتی ہے تم کو خوب معلوم ہے اور اگر چوری نہیں کرتے تو طلب پوری نہ ہونے کی وجہ سے تمہارے بیمار پڑ جانے کا اندیشہ ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم کسی چیز کے عادی نہ بنو۔ اور سنو میں خود پان کھاتا تھا، حقہ کا بھی عادی تھا اور کھینی (چونے میں ملا ہوا تمباکو) بھی کھایا کرتا تھا۔ ایک دفعہ دہلی سے لڑکی کی علالت کا تار آیا اور میں عجلت میں دہلی جانے کے لیے گاڑی میں سوار ہو گیا۔ راستے میں ایک غیر مسلم کو کھینی کھاتے دیکھا تو میرا بھی جی چاہا شکم میں قرار بھی تھا۔ تھیلی ڈھونڈی تو معلوم ہوا کہ وہ گھر بھول آیا۔ مانگنا خودداری کے خلاف سمجھتا تھا۔ لیکن مجبور ہو کر اس غیر مسلم سے کھینی طلب کی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ اور کہا کہ کھینی کھانے کا شوق ہے تو پیسے خرچ کرو۔ یہ سن کر میرے دل کو شدید چوٹ لگی اور اسی وقت عہد کیا کہ اب کبھی تمباکو نہیں کھاؤں گا چنانچہ اس تاریخ سے آج تک بھول کر بھی تمباکو نہیں کھائی۔ تو میں اسی لیے تم کو تمباکو خوری سے منع کرتا ہوں۔

(اخبار اہلحدیث دہلی یکم اگست ۱۹۵۹ء)

حضرت حافظ صاحب کو جو اعلیٰ مرتبہ علمی و دینی حلقوں میں حاصل تھا وہ ارباب علم سے مخفی نہیں، لیکن اس حقیر تمباکو کی بنا پر سوال کرنا پڑا اور دل کو ٹھیس لگوانی پڑی۔ معلوم ہوا کہ کبھی اچھے اور باوقار آدمیوں کو ایسی معمولی چیزوں کی بنا پر رسوا ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا ایسی چیز جو باعث رسوائی ہو، اس کا استعمال کسی طرح زیب نہیں دیتا۔

خواب

شریعت کا یہ ایک اصولی مسئلہ ہے کہ خواب کے ذریعہ احکام وغیرہ ثابت نہیں ہوتے۔ البتہ ان سے استیناس کیا جا سکتا ہے، اس لیے ہم بھی یہاں بعض بزرگوں کے خواب محض تقویت کے لیے پیش کر رہے ہیں، کیونکہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: الرؤیا الصالحۃ جزء من ستۃ واربعین جزء من النبوۃ۔ (مشکوٰۃ ج ۲ ص ۳۹۴) یعنی نیک خواب نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اپنے والد حضرت شاہ عبدالرحیم سے نقل کرتے ہیں کہ وہ فرماتے تھے کہ لاہور میں دو درویش رہتے تھے۔ ایک تمباکو نوش عالم تھے، دوسرے درویش ان پڑھ تھے جو تمباکو نوشی سے پرہیز کرتے تھے

دونوں خواب میں حضور کی بارگاہ میں پہنچے اور اس عالم میں یوں محسوس ہوا کہ ان پڑھ درویش تو حضور کی مجلس میں بیٹھے ہیں لیکن تمباکو نوش عالم دین کو مجلس میں آنے کی اجازت نہیں ملتی۔ ان پڑھ درویش نے اسی عالم رویا میں شرکاء مجلس سے اس کی وجہ پوچھی تو انھوں نے بتایا کہ چونکہ تمباکو حضور کو ناپسند ہے اور عالم دین تمباکو نوش ہے اس لیے اس کو اجازت نہیں دی گئی۔ جب صبح ہوئی تو ازراہ نصیحت یہ شخص اس صورتحال سے آگاہ کرنے کے لیے عالم دین کے پاس گیا، گھر میں داخل ہونے سے پہلے اس کو اس کے رونے اور آہ و فغاں کی آواز نائی دی جب اندر داخل ہوا تو رونے کی وجہ پوچھی۔ اس نے رات والے خواب کی تفصیل بتائی، ان پڑھ درویش نے سن کر کہا، میں نے شرکاء مجلس سے اجازت نہ دینے کی وجہ پوچھی تھی، انھوں نے آپ کی تمباکو نوشی کو اس کا سبب بتایا تھا پھر اس عالم دین نے حقہ اور تمباکو نوشی کے سارے لوازمات توڑ پھوڑ کر اللہ کے حضور میں اس سے سچی توبہ کی۔ اب کی رات ہوئی سو پھر خواب کا وہی عالم پیش آیا گویا کہ دونوں حضور کی مجلس میں ہیں، اور عالم دین سب سے زیادہ حضور کے قریب بیٹھے ہیں اور حضور کی خصوصی عنایات و الطاف سے سرفراز ہو رہے ہیں۔

(سہ روزہ منہاج لاہور ۱۷ جولائی ۱۹۵۸ء بحوالہ انفاس العارفین ص ۷۹)

معروضات بالا سے معلوم ہوا کہ جس چیز میں اس قدر دینی و دنیاوی، طبی و روحانی اضرار پوشیدہ ہوں اس کا استعمال مسلمانوں کے لیے کسی بھی طرح درست نہیں۔ امید ہے کہ قارئین با تمکین نہایت سنجیدگی سے اس مسئلے پر غور فرمائیں گے اور ملت کے سرمایہ کو اس فضول و لایعنی چیز میں صرف ہونے سے بچائیں گے۔

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے: لا تزال قدما عبد یوم القیامۃ حتی یسئل عن أربع، عن عمرہ فیما افناہ وعن شبابہ فیما ابلاہ وعن مالہ من این اکتسبہ وفیما انفقہ وعن علمہ ماذا عمل فیہ۔ یعنی قیامت کے دن کسی بھی بندے کے پیر ٹس سے مس نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ اس سے چار چیزوں کے متعلق سوال کر لیا جائے، اس کی عمر کے بارے میں کہ اس کو کہاں گنوایا، اس کی جوانی کے بارے میں کہ اس کو کہاں صرف کیا اور اس کے مال کے بارے میں کہ اس کو کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا، اور علم کے متعلق کہ اس پر کتنا عمل کیا۔

بس بیڑی، سگریٹ، تمباکو میں مال کو دھڑلے سے صرف کرنے والوں کو بڑے غور سے سوچنا چاہیے کہ قیامت کے روز کیا جواب دیں گے۔ (وما ارید الا الاصلاح)

•••

بزمِ طلبہ

اردو نثر کا ارتقاء اور ولی اللّٰہی تحریک

مظہر علی انصاری
(متعلم جامعہ)

انیسویں صدی کی سب سے جاندار اثر انگیز اور مشہور و معروف تحریک کو ولی اللّٰہی تحریک کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے کیونکہ اس تحریک کا سرچشمہ درحقیقت شاہ ولی اللّٰہ ہی کے افکار و خیالات تھے اور اس وقت سے لے کر آج تک جتنی بھی موثر تحریکات برصغیر میں اٹھی ہیں، سب پر اسی کی چھاپ نظر آتی ہے۔

شاہ صاحب کی ولادت عالمگیر کی وفات سے چار سال قبل ۱۱۱۴ھ میں ہوئی اور وفات شاہ عالم کے عہد میں ۱۱۷۶ھ میں۔ اس طرح شاہ صاحب کو دس سلاطینِ دہلی اور ان کے عہدِ حکومت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس عہد میں ہند اور مسلمانانِ ہند کی کیا حالت تھی اور انھیں کن کن لرزہ خیز واقعات و حوادث سے گزرنا پڑا۔ اس سے کون واقف نہیں۔ شاید تہذیبی اور ثقافتی تاریخ کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ اس طرح کی عبقری شخصیتیں تاریخ کے ایسے ہی دور میں پیدا ہوتی ہیں جسے دورِ زوال و انحطاط کہا جاتا ہے تہذیب کے سرکھنڈر پر ہمیں کچھ نہ کچھ رونے والے ملتے ہیں، جن کے گریہ نیم شبی اور آہِ سحرگاہی نے قوموں کو دل و جگر کی گرمی عطا کی ہے انھیں نئے سرے سے جوش و جذبے اور ولولوں سے روشناس کیا ہے، ان میں نئی زندگی کی روح پھونکی ہے۔ اس طرح کے لوگوں کی پیدائش کا زمانہ قوموں کا دورِ زریں نہیں ہوتا بلکہ عموماً دم توڑتی ہوئی تہذیب کے کھنڈر اور بگڑے ہوئے سماج کے ملبے پر کسی عمر بن عبدالعزیز کا، کسی ابن تیمیہ کا، کسی صلاح الدین ایوبی کا، کسی محمد بن عبدالوہاب کا، کسی شاہ ولی اللّٰہ کا اور کسی اسماعیل شہید کا وجود ہوتا ہے۔

کچھ ایسی ہی صورتحال اس برصغیر کی تھی۔ سادات بارہ کی فتنہ انگیزی، ان کا تسلط و زوال، ایرانی و تورانی

امراء کی رقابت و رسہ کشی، شاہانِ مغل کی بے کسی، سکھوں کی غارت گری، مرہٹوں کی بغاوت، یوروپین اقوام کی ہندوستان پر حریصانہ نگاہیں۔ انگریزوں کا بنگال و بہار میں عمل دخل اور پورے ہندوستان پر حکومت کی کوشش مسلمانوں کی زبوں حالی، مذہب سے دوری، اخلاقی گراوٹ و پستی، اقتصادی بدحالی، امراء کی عیش پرستی اور علماء کی بے حسی۔ یہ تھے حالات و انقلابات اور اٹھارہویں صدی کے اخیر اور انیسویں صدی کے آغاز کا ہندوستان جس میں شاہ ولی اللہ نے آنکھ کھولی، شاہ صاحب نے علوم ظاہری و باطنی سے فراغت کے بعد قوم و ملک کے زوال اور علمی و فکری انحطاط کے اسباب کا جائزہ لیا اور سوسائٹی کا مطالعہ کرتے ہوئے اپنا اہم بالاتر تحریک شروع کی، جو سیاسی، مذہبی، اقتصادی اور سماجی بھی تھی۔ زبان و قلم، تصنیف و تالیف اور درس و تدریس کے ذریعہ امت مسلمہ کو بیدار کیا۔ انھیں اتحاد اور خالص اسلام کی طرف لوٹنے اور عملی زندگی میں اسے اپنانے کی دعوت دی اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی دعوت و تحریک کو آگے بڑھانے اور اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنے صاحبزادگان اور رفقاء کی ایک عظیم جماعت بھی تیار کی، جس نے تعلیم و ارشاد اور تصنیف و تالیف کے ذریعہ انقلابی تحریک کو آگے بڑھا کر اسے عمل کا راستہ دکھایا۔ اس کے بعد شاہ صاحب کے پوتے شاہ اسماعیل شہید نے ان کے افکار و نظریات کی تنقیح و تہذیب اور عقائد میں راستگی و پختگی پیدا کرتے ہوئے سید احمد شہید کی رفاقت و امارت میں وعظ و تبلیغ کے ذریعہ رسوم و معاشرت کی اصلاح کے ساتھ ساتھ عوام میں رابطۂ اتحاد اور ولولۂ جہاد پیدا کیا، اور اس تحریک کو ایک متحرک عوامی، جہادی اور انقلابی تحریک میں بدل دیا۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک پر چھا گئی اور آج برصغیر میں جہاں کہیں بھی کچھ روشنی نظر آتی ہے اسی تحریک کا جہاد کا پرتو اور عکس ہے۔

یہ تحریک اگرچہ اصلاً دینی، تجدیدی، اصلاحی اور احیائی تحریک تھی، تاہم اس کی صنوف فی سے اردو ادب بھی سنورتا رہا۔ یعنی جدید اردو نثر کی تاریخ اور اس کے ارتقاء میں اس کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ آئندہ سطور میں اسی پہلو کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جدید نثر کی تعمیر و ترقی میں اس تحریک کا کیا رول رہا ہے۔ مناسب ہوگا کہ جدید اردو نثر کی ہیئت کذائی کا پتہ لگانے کے لیے اردو نثر کی ابتدائی نشو و نما پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے۔

مورخین زبانِ اردو کا عام خیال ہے کہ نثر کی ابتدائی نشو و نما کا فخر دکن کو حاصل ہے، شمال میں فضلی کی دہ مجلس ۱۱۴۵ھ اور کربل کتھا اردو کی پہلی تصنیفیں خیال کی جاتی تھیں مگر موجودہ تحقیق نے حضرت سید

محمد گیسو دراز کی تصنیف معراج العاشقین کی عبارت کے پیش نظر یہ فیصلہ کیا کہ اردو نثر کی تخم ریزی نویں صدی ہجری سے قبل ہو چکی تھی اور نشو و نما نویں صدی ہجری میں ہوئی ۔ چنانچہ دکن کے ایک بزرگ میراں جی شاہ م ۹۰۲ھ کے کئی رسالے ملتے ہیں اور ادبی نقطۂ نگاہ سے اس دور کی کتابوں میں وجہی کی "سب رس" قابلِ ذکر ہے ، جس کا سن تصنیف ۱۰۴۵ھ ہے اور قدیم اردو میں خاص ممتاز حیثیت رکھتی ہے ۔ اس کی عبارت مقفیٰ و مسجع ہے ۔ انیسویں صدی سے قبل اردو نثر کا عام انداز یہی تھا اور یہی کمالِ فن تصور کیا جاتا تھا ، قافیہ پیمائی اور سجع کی رعایت کی جاتی تھی ، بعید از کار تشبیہات و استعارات کا استعمال ، فارسی و عربی الفاظ سے عبارت کی تزئین کاری اور پر تکلف اندازِ بیان عبارت کو پیچیدہ سے پیچیدہ تر بنا دیتا تھا ۔ اس دور کی نثر اور عوام کی پسندیدگی کا اندازہ رجب علی بیگ سرور کی مشہور و معروف کتاب فسانۂ عجائب سے لگایا جا سکتا ہے اور اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ نادر شاہ کا قاصد جب ہندوستان آیا تو محمد شاہ کے منشیوں نے القاب و آداب کی جستگی کی سوچ میں تین سال صرف کر دیے ۔ اس طرزِ نگارش اور اسلوب کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہاں فارسی کا غلبہ و اقتدار تھا ، جس سے اردو نثر کا متاثر ہونا لازمی تھا ۔ دوسری وجہ تھی شعر و شاعری کا چسکا ، نظم و شعر کی ہر دلعزیزی و دلکشی چنانچہ فضلی کی دہ مجلس اور مرزا حسین خاں تحسین کی نو طرزِ مرصع (چہار درویش (ترجمہ)) وغیرہ کی عبارت کچھ اسی قسم کی مقفیٰ و مسجع ہے اور ان کا اندازِ بیان پوری طرح پر تکلف ہے ۔ لیکن تکلفات نثری کا یہ طلسم تادیر باقی نہ رہ سکا اور رفتہ رفتہ یہ انداز و اسلوب بالکل متروک ہو گیا بلکہ اسے ایک عیب سمجھا جانے لگا اور اب ترقی پذیر یا ترقی یافتہ اردو ادب میں سلاست و روانی ، سہل و آسان اسلوب کو فنی حیثیت سے باعثِ کمال سمجھا جاتا ہے اور مفہوم و معانی کو اولیت اور طرزِ ادا کو ثانوی درجہ دیا جاتا ہے ۔

سر سید احمد خاں کو اس جدید نثر کے اولین معماروں میں شمار کیا جاتا ہے کہ انھوں نے جدید نثری اسلوب کی بنیاد ڈالی ، اُن کی پرانی رسموں کو توڑا ، پر تکلف اسالیب فارسی سے اردو نثر کو آزاد کرتے ہوئے اسلوب میں جدید رجحانات کے لیے راستہ صاف کیا ۔ نری عبارت آرائی کے خلاف آواز اٹھائی اور طرزِ ادا کے مقابلے میں مدعا نویسی اور مطلب نگاری کو مقصدِ اولین ٹھہرایا اور پھر فورٹ ولیم کالج اور دہلی کالج نے جدید نثری اسلوب اور سادہ و سلیس عبارتوں کو رواج دیا ۔ لیکن یہ بات تاریخی حیثیت سے صحیح نہیں ۔ مولانا الطاف حسین حالی کا بیان ہے کہ سر سید کے یہاں بھی جو آزادیِ خیال ، جرأتِ گفتار اور بے باکی ہے ، اس کا سرچشمہ بھی دراصل

اسماعیل شہیدؒ کی تحریریں اور تقریریں ہیں۔" میرے خیال میں اس پر تھوڑا سا یہ اضافہ بھی تاریخی حقیقت کے خلاف نہ ہوگا کہ سرسید کے یہاں جو سادگی، بے تکلفی، مدعا نویسی اور طرز ادا کی ثانوی حیثیت پائی جاتی ہے وہ دراصل مولانا اسماعیل شہید اور ان کی تحریک کے مجاہدین کے قلم کی صدائے بازگشت ہے۔

جیسا کہ بیان کیا گیا یہ تحریک دراصل ایک تجدیدی اور احیائی تحریک تھی، جس کا مقصد اصلاح رسوم معاشرت، احیاء اسلام اور تجدید دین تھا، اس مقصد کے حصول کے لیے اصحاب تحریک نے زبان و قلم دونوں کا سہارا لیا۔

اس تحریک کے راہ نماؤں نے بڑی تعداد میں رسالے اور کتابچے لکھے اور عوام و خواص میں ان کی خوب خوب اشاعت کی، ان رسالوں اور کتابچوں کی مذہبی اور تاریخی حیثیت مسلم مگر ان کا ادبی پہلو بھی کم اہم نہیں۔ ... نوک قلم کا مقصد وہی تھا جو تیغ زبان کا تھا یعنی سنت نبوی کی اشاعت، بدعات و خرافات کی مخالفت، اصلاح رسوم و معاشرت اور اپنے خیالات کو واضح اور موثر انداز میں پیش کرنا، اس لیے باتیں مدلل اور طرز تحریر منطقی ہوتا، جذباتی اور پر تکلف نہیں۔ نثر سیدھی سادی اور سلیس ہوتی، علمیت کا تکرار اور تصنع و تکلف کا بوجھل نہیں۔ چنانچہ یہ کہنا پڑتا ہے کہ سب کوتاہیوں اور خامیوں کے باوجود نثر کو نثر بنانے اور شاعری سے خلاصی حاصل کرنے اور اس سادہ و سلیس نثر کو رواج دینے میں ان رسالوں اور کتابوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

پروفیسر کلیم الدین "اپنی تلاش میں" لکھتے ہیں:

"یہ رسالے یہ کتابیں ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہنچیں جو موافق تھے انھوں نے پڑھا ہی اور مخالفین نے بھی پڑھا اور اپنے اپنے طور پر متاثر ہوئے۔ ان رسالوں اور کتابوں کا اردو نثر کو نثر بنانے اور تصنع سے پیچھا چھڑانے میں بہت بڑا ہاتھ تھا، جس کو اردو ادب کے مورخ نے ابھی نہیں سمجھا.........."

"..... یہاں نثر سے نثر کا ہی کام لیا گیا اور ایسا ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے، جس کو آگے چل کر نو قلموں شکل میں پیش کیا جا سکے اور یہی اس نثر کی اہمیت ہے۔"

اس تحریک کی بدولت اردو نثر میں گراں قدر اضافے اور ترجمے بھی ہوئے۔ شاہ ولی اللہؒ نے ترجمہ قرآن کے ذریعہ قرآن فہمی کی جو بنیاد ڈالی تو یہ سلسلہ و روایت ان کے خاندان میں قائم رہا۔ آپ کے صاحبزادے

مولانا رفیع الدین نے سب سے پہلے قرآن کا ترجمہ اردو زبان میں کیا، اس کے بعد انھی کے برادر بزرگوار شاہ عبدالقادرؒ نے ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۰ء میں زبان کے صحیح اصول اور تبلیغی تقاضوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن کا اردو ترجمہ کیا جو زبان و بیان کے لحاظ سے انتہائی قدر و قیمت اور اہمیت کا حامل ہے، ترجمے کے ساتھ ساتھ موضح القرآن کے نام سے تفسیری حاشیہ بھی چڑھایا، بطور نمونہ موضح القرآن کے دیباچے سے ایک دو جملے ہدیۂ ناظرین کیا جا رہا ہے، جس سے ان کے زبان و بیان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

"اس نبی امت پر درود اپنی رحمت کامل سے درجات اعلیٰ نصیب کر جو حد نہ ہو کسی مخلوق کی، اور اپنی عنایت ہمیشہ ان پر روز افزوں رکھ، دنیا و آخرت میں۔"

قرآنی ترجمے اور مذہبی خدمت کے یہ پہلے نمونے ہیں جو اردو نثر میں پائے جاتے ہیں، اس طرح زبان اردو جو اب تک مذہبی سرمایہ سے تہی دامن تھی، اس تحریک کی بدولت مذہبی عناصر سے مالامال ہو گئی۔

البتہ اتنا ضرور ہے کہ ترجمے میں کچھ الفاظ کے اندر بے ترتیبی اور کہیں کہیں الفاظ کی نشست میں کچھ ڈھیلا پن نظر آئے گا۔ مگر اس کی اصل وجہ زبان کا ابتدائی زمانہ اور فارسی و عربی سے لفظی ترجمے کا خیال ہے لیکن اس سے انکار نہیں کہ ترجمہ تبلیغی ضرورتوں کے پیش نظر اصول زبان کو ملحوظ رکھتے ہوئے انتہائی سادہ، سلیس اور آسان اسلوب میں کیا گیا ہے، تاکہ عوام اس کے معنی و مفہوم کو بآسانی سمجھ سکیں جیسا کہ خود ان کے دیباچہ موضح القرآن سے معلوم ہوتا ہے ـــــ "اس بندۂ عاجز کو خیال آیا ہے کہ ہندی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ کرے۔ ترجمہ لفظ بہ لفظ نہیں ـ کیونکہ ہندی ترکیب عربی ترکیب سے مختلف ہے، یہ ترجمہ ہندی[1] متعارف میں ہے"

اس تحریک کی تصانیف، رسالے، اور لٹریچر تبلیغی و دعوتی ضرورتوں کے تحت لکھے گئے تھے، اس لیے کہ اس کے مخاطبین براہ راست عوام اور اکثر دیہی علاقوں میں اس تحریک کے اثر و نفوذ کی وجہ سے دیہی باشندے بھی تھے۔ اس لیے یہ ضرورت اس بات کی متقاضی تھی کہ تصانیف میں عام فہم اور سادہ و سلیس زبان ہی اختیار کی جائے چنانچہ ان لوگوں نے قدیم تکلفات نثری کے طلسم کو توڑتے ہوئے سادہ اور آسان طرز کو اپنایا، جو نہایت مقبول رہا۔ شاہ اسماعیل شہیدؒ کی تقویۃ الایمان، سیکڑوں مرتبہ شائع ہوئی۔ اتنی مقبولیت اردو کی کسی دوسری کتاب کو حاصل نہ ہو سکی۔

---

[1] اس تحریک کے علماء اس عہد کی اردو کو ہندی ہی کا نام دیتے تھے۔

شاہ اسماعیل شہید کی یہ تصنیف ایسی سلیس، صاف ستھری اور مربوط اردو میں لکھی گئی ہے کہ اس عہد کی اردو کی چند ہی کتابیں اس کا مقابلہ کر سکتی ہیں، ذرا اس عہد کی زبان کو ذہن میں رکھتے ہوئے تقویۃ الایمان کے اقتباس زیرین کو ملاحظہ فرمایئے۔ حدیث: انی لا ارید ان ترفعونی فوق منزلتی التی انزلنیہا اللہ تعالیٰ انا محمد بن عبد اللہ ورسولہ کی تشریح میں رقمطراز ہیں۔

"پیغمبر خدا اپنی امت کے بڑے مربی و شفیق تھے اور ان پر بہت مہربان اور رات دن ان کو اپنی امت کے دین ہی درست کرنے کی فکر تھی، سو جب انھوں نے معلوم کیا کہ میری امت کے لوگ مجھ سے بڑی محبت رکھتے ہیں اور بہت احسان مند ہیں۔ اور یہ دستور ہے کہ جب کسی کو کسی کی محبت ہوتی ہے تو اپنے محبوب کے خوش کرنے کو اس کی تعریف میں حد سے بڑھ جاتا ہے۔ اور جو پیغمبروں کی تعریف میں حد سے بڑھے گا تو خدا کی بے ادبی کرے گا اور اس سے اس کا دین بالکل برباد ہو جاوے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ مجھ کو مبالغہ خوش نہیں آتا، سو میرا نام محمد ہے نہ اللہ نہ خالق نہ رزاق۔ اور سب آدمیوں کی طرح اپنے باپ ہی سے پیدا ہوا ہوں۔ اور بندہ ہی ہونا میرا فخر ہے۔"

سرسید احمد خاں کے یہاں جو خصوصیات نثر، سادگی بے تکلفی، مدعا نویسی بیان کی جاتی ہے اور اس بنا پر انھیں جدید نثری اسلوب کے اولین معماروں میں شمار کیا جاتا ہے، تو کیا یہ خصوصیات جس درجہ تقویۃ الایمان میں موجود ہیں اس سے بھی زیادہ مکمل شکل کے اندر پائی جا سکتی ہیں؟

مولانا خرم علی جو اس تحریک سے وابستہ تھے، انھوں نے شاہ ولی اللہ کی کتاب "القول الجمیل فی بیان سواء السبیل" کا سلیس اردو ترجمہ کیا۔ ان کی دوسری کتابیں "ہدایۃ المسلمین" اور "نصیحۃ المسلمین" وغیرہ بھی ہیں جن کی زبان سادہ، سلیس، شگفتہ اور عام فہم ہے۔

غرضیکہ ولی اللہی تحریک کی تصانیف اور رسالے اردو نثر کے ارتقاء میں انتہائی قدر و قیمت کے حامل ہیں انھوں نے جدید نثری اسلوب کے لیے زمین ہموار کی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کے اصحاب قلم کا اسلوب تحریر ایسا انوکھا اور زبان ایسی صاف سلیس اور سہل تھی کہ وہ خاصی مقبول رہی اور لوگوں نے اس کا تتبع کیا، اس طرح اس کی سرحدیں مستقبل سے مل گئیں اور اس تحریک نے اس سادہ نثر کے رواج میں جو حصہ لیا وہ فورٹ ولیم کالج یا دہلی کالج سے کسی طرح کم نہیں۔ فورٹ ولیم کالج کی نثر قصوں اور کہانیوں سے آگے نہ بڑھ سکی مگر تحریک نے اسے جملہ حقائق و واقعات کے اظہار کا ذریعہ بنا دیا۔

• • •

کیرالا میں چند دن

جنوبی ہند کے شہر کالی کٹ میں اتحاد الشبان المجاہدین کے زیر اہتمام ۱۲/۱۳ مئی ۱۹۸۴ء کو منعقدہ کی جانے والی دو روزہ کانفرنس میں مجھے اور مولانا احسن جمیل صاحب مدنی کو جامعہ سلفیہ کے مندوب کی حیثیت سے شرکت کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

پورے کیرالا میں اہلحدیث کو "مجاہدین" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے اور اس وقت کیرالا میں جو سلفی تحریکیں کام کر رہی ہیں انھیں مندرجہ ذیل ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

(۱) کیرالا ندوۃ المجاہدین (۲) کیرالا جمعیۃ العلماء (۳) اتحاد الشبان المجاہدین (۴) حرکۃ الطلبۃ المجاہدین

جمعیۃ العلماء اور ندوۃ المجاہدین کے زیر اہتمام نوجوانوں کے لیے اتحاد الشبان المجاہدین اور طلبہ کے لیے حرکۃ الطلبۃ المجاہدین کی تنظیم تشکیل دی گئی ہے۔

یہ دونوں تنظیمیں پورے کیرالا میں بڑے شد و مد اور خلوص کے ساتھ اسلام کی صحیح روشنی عوام و خواص میں پھیلا رہی ہیں۔ یہ دونوں تنظیمیں اپنے قیام کے بعد ہی سے پورے جوش و خروش اور مستعدی سے میدانِ تبلیغ میں سرگرم عمل ہیں اور الحمدللہ لوگوں کے دل میں ان کی دعوتِ حق کی بڑی قدر ہے، یہی وجہ ہے کہ شب و روز مجاہدین کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

اس دو روزہ پروگرام میں پہلے روز یعنی ۱۲ مئی ۸۴ء کو بوقت ۱۰ بجے دن ایک وسیع ہال میں کنونشن کا انعقاد اے پی عبدالقادر مولوی کی زیر صدارت ہوا، جس کا آغاز محمد ضمیر صاحب کی تلاوت پاک سے ہوا۔

کنونشن کا مقصد: اس کنونشن کا مقصد یہ تھا کہ پورے ہندوستان میں دین کی دعوت و تبلیغ متحد و منظم ہو کر کی جائے۔ دعوتِ دین اور تبلیغی کاموں کے لیے

تمام مسلمانوں کے لیے کر نوجوانوں کو تیار کیا جائے تاکہ وسیع پیمانہ پر ملک میں تبلیغی پروگراموں کا انتظام کیا جا سکے۔

کنونشن میں سب سے پہلے اتحاد الشبان المجاہدین کے سکریٹری کنج محمد مدنی (متخرج مدینۃ العلوم کیرالا) نے ملیالم زبان میں تعارفی کلمات پیش کیے، اس کے بعد ڈی کے محی الدین صاحب عمری نائب صدر جمعیۃ اہلحدیث ہند نے کنونشن کے مقاصد پر روشنی ڈالی اور جناب ڈاکٹر محمد عثمان ایم جی بی ایس رئیس ندوۃ المجاہدین نے انگریزی زبان میں مقالہ پیش کیا جس میں ندوۃ المجاہدین کی کارکردگی کا جائزہ لیا اور اس طرح سے پہلی نشست برخاست ہوئی۔

دوسری نشست کا قیام بوقت تین بجے مولانا محمد مجھری امیر جماعت اہلحدیث آندھرا پردیش کے زیر صدارت ہوا۔ آغاز حافظ عبدالماجد صاحب کی تلاوت پاک سے ہوا اس کے بعد علماء کرام نے کنونشن کی تجاویز کے سلسلے میں اپنی آراء کا اظہار کیا۔

سب سے پہلے جناب مولانا احسن جمیل صاحب مدنی مدرس جامعہ سلفیہ بنارس نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے بتلایا کہ وقت کی اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کو صحیح اسلامی عقیدے کی دعوت دی جائے اور اس کام کے لیے نوجوانان اہلحدیث کو منظم کیا جائے۔ اور اخیر میں مجاہدین کے کارنامے کو سراہتے ہوئے کنونشن کی تمام امور سے اتفاق کیا۔ اس کے بعد بندۂ خاکسار نے عربی میں "شباب الاسلام" کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ جس میں بتلایا گیا کہ اسلام کے ابتدائی دور میں جبکہ وہ دار الارقم میں محصور تھا تبلیغ دین و اشاعت اسلام کے لیے جوانوں کی ایک منظم جماعت تھی اور اس وقت بھی جبکہ اسلام کو پھلنے پھولنے کا موقع ملا، اکثریت نوجوانوں کی تھی اور دور حاضر میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ نوجوانان اسلام اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرتے ہوئے میدان عمل و تبلیغ میں قدم بڑھائیں اور خالص کتاب و سنت کی روشنی میں اسلامی دعوت پیش کریں تاکہ جماعت ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے اور سب کے اندر اسلام کی تعلیم سیکھنے سکھانے کا جذبہ پیدا ہو۔ بعد ازاں مولانا عبدالقیوم صاحب فیضی نے نوجوانان اسلام کو اتفاق و اتحاد کی دعوت دیتے ہوئے اس موضوع پر پُر مغز اور مفید تقریر کی پھر ملیالم اور تامل زبان میں کئی تقریریں ہوئیں اور اخیر میں صدر صاحب کی رہنمائی اور دعائیہ کلمات پر دوسری نشست کا اختتام ہوا۔

قرارداد: مذکورہ دونشستوں میں جو قابل قدر تجاویز پاس ہوئیں ان پر غور و فکر کرنے اور تنظیم

کی تشکیل کے لیے تیسری نشست جناب محی الدین عمری صاحب کے زیر صدارت ہوٹل نگیت میں منعقد ہوئی جس میں باتفاق رائے مندرجہ ذیل قراردادیں پاس ہوئیں ۔

(۱) امیر مرکزی جمعیۃ اہلحدیث ہند سے درخواست کی جائے کہ نوجوانانِ مسلک اہلحدیث کی ایک ہند گیر تنظیم قائم کرنے کی اجازت دیں تاکہ نوجوانانِ ملت میں دعوت و تبلیغ کے لیے کام کرنے کا جذبہ پیدا کیا جاسکے اور یہ کام منظم طور پر پورے ہندوستان میں جاری کیا جائے ، چنانچہ اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے فی الحال مولانا احسن جمیل صاحب السلفی مدرس جامعہ سلفیہ کو کنوینر اور جناب حافظ عبدالماجد صاحب پرنام بٹ کو جوائنٹ کنوینر باتفاق رائے مقرر کیا گیا ۔

(۲) مذکورہ بالا اغراض و مقاصد کی تکمیل کے لیے امیر مرکزی جمعیۃ اہلحدیث ہند سے درخواست کی جاتی ہے کہ نوجوانانِ اہلحدیث کا ایک آل انڈیا کنونشن طلب کرنے کی اجازت دیں جس میں ہر صوبہ میں ۲۰ سے ۲۵ کے درمیان نمائندگان شرکت کریں جو صوبہ کی ہر ضلعی جمعیت کی نمائندگی کریں ۔ نامزد کردہ نمائندگان کی رہنمائی صوبائی جمعیت اہلحدیث کے امیر یا ناظم کریں ۔

(۳) یہ کنونشن اواخر ستمبر یا اوائل اکتوبر میں طلب کیا جائے

(۴) کنونشن کم از کم دو روزہ ہو ۔

(۵) کنونشن جس مقام پر طلب کیا جائے وہاں کی صوبائی جمعیت اس کے انتظام اور ضیافت کی ذمہ دار ہوگی ۔

(۶) کنونشن میں شرکت کرنے والے وفود کے سفر خرچ کی ذمہ داری صوبائی اور ضلعی جمعیتوں پر ہوگی ۔

دوسرے روز ۱۳/ مئی ۱۹۸۴ء کو اجلاسِ عام بوقت ۵ بجے شام کارپوریشن

اجلاسِ عام : کے میدان میں زیر صدارت جناب پی زیڈ مولوی ناظم جمعیۃ العلماء کیرالا منعقد ہوا ۔ اجلاس کا آغاز قاری محمد سالم صاحب کی تلاوت کلام پاک سے ہوا ۔ سامعین کی اتنی کثرت تھی کہ ہر طرف ہجوم ہی ہجوم نظر آرہا تھا ۔ اندازے کے مطابق تقریباً پچاس ہزار یا کچھ کم و بیش لوگ موجود تھے ۔ لیکن ہجوم کے باوجود مجمع پر مکمل سکوت طاری تھا اور سامعین غور سے مقررین کی تقریریں سماعت فرما رہے تھے ۔ نظم و نسق انتہائی قابل تحسین تھا ۔

تلاوتِ پاک کے بعد کے پی محمد بن احمد امین عام ندوۃ المجاہدین نے افتتاحی تقریر کی ۔ بعد ازاں [illegible]

نے اپنا مقالہ پیش کیا اور ڈاکٹر محمد عثمان ایم بی بی ایس نے مجمع کو خطاب کیا اور مغرب کی نماز کا وقت ہو گیا۔ نماز مغرب ڈی کے محی الدین عمری صاحب کی امامت میں میدان میں ادا کی گئی۔ بعد نماز مغرب یہ سلسلہ دوبارہ حافظ عبدالماجد صاحب کی تلاوت کلام پاک سے شروع ہوا اور مندرجہ ذیل علمائے کرام نے مختلف موضوع پر مجمع سے خطاب کیا۔

(۱) مولانا احسن جمیل صاحب مدنی مدرس جامعہ سلفیہ بنارس۔ (۲) مولانا عبدالحمید صاحب مدنی (متخرج مدینۃ العلوم کیرالا) (۳) مولانا شاہ الحمید صاحب (۴) مولانا محمد سلمی صاحب (متخرج سلم العلوم کیرالا۔) (۵) مولانا اے پی عبدالقادر مولوی۔

دس بجے کے بعد تک یہ سلسلہ جاری رہا اس کے بعد دعائیہ کلمات پر اجلاس کا اختتام ہوا۔

کانفرنس ختم ہونے کے بعد ہم لوگ مزید دو روز ٹھہر گئے، مقصد یہ تھا کہ

مزید قیام کا مقصد: مجاہدین کی سرگرمی اور ان کی کارکردگی کا جائزہ لیں، چنانچہ اس کے لیے ہم لوگوں کو ڈی کے محی الدین عمری صاحب اور کچھ نوجوانوں نے پوری جانفشانی کے ساتھ "کالی کٹ" کے اطراف وجوانب کا دورہ کرایا۔ دورے کے درمیان بہت سے کلیات و مدارس اور یتیم خانے دیکھنے میں آئے۔ یہاں پر چند اہم کلیات و مدارس اور یتیم خانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) مدینۃ العلوم عربی کالج (۲) سلم السلام عربی کالج، (۳) روضۃ العلوم عربی کالج، (۴) پی او فاروق کالج (۵) جامعہ ندویہ اڈوننا (۶) انوار الاسلام عربی کالج (۷) کے ایم ایم او عربی کالج (۸) انصار عربی کالج (۹) بستان العلوم کالج۔ (۱۰) مجاہدین عربی کالج۔

یتیم خانے کئی ایک دیکھنے میں آئے لیکن ہم یہاں پر صرف سب سے اہم یتیم خانہ، ترورنگاڈی یتیم خانہ کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔

ترورنگاڈی کا یہ یتیم خانہ جس کو ترورنگاڈی مسلم آرفینیج کمیٹی چلا رہی ہے اور جو سعود آباد میں واقع ہے دیکھنے کا موقع ملا اور اس کے دار السلام نامی دار الاقامہ کا بھی معائنہ کیا گیا۔ الحمد للہ یتیم خانہ میں ۵۰۰ لڑکے اور لڑکیاں ہیں جن کی تعلیم و تربیت کا بہترین انتظام ہے۔ ساتھ ہی ساتھ بچیوں کے لیے چار سلائی مشینیں ہیں اور بچوں کے لیے مختلف زبانوں میں گیارہ ٹائپ رائٹر۔ علاوہ ازیں اور بھی دوسرے ہنر سکھاتے

جاتے ہیں۔ ان یتیم بچوں کے لیے ایک ڈسپنسری ہے جس میں ہر قسم کی دوائیں موجود ہیں اور ایک تجربہ کار حکیم صاحب کی خدمات حاصل ہیں۔

ٹی کے محی الدین صاحب عمری سے ایک انٹرویو :

نائب صدر جمعیۃ اہلحدیث ستودہ صفات، خوش اخلاق، اور وجیہ شخصیت کے مالک ہیں۔ ملنساری آپ کی طبیعت ثانیہ ہے اسی لیے آپ چھوٹے بڑے سب کی نگاہ میں ہر دلعزیز ہیں۔ مولانا محترم کا انٹرویو قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

سوال : مولانا! مجاہدین کے کتنے ممبر ہیں؟

جواب : عمری صاحب : مجاہدین کے ۱۵۰۰ ہزار ممبر ہیں۔

سوال : نوجوانانِ مجاہدین کس طرح تبلیغ کرتے ہیں اور ان کا ذریعۂ معاش کیا ہے؟

ج : مجاہدین کے نوجوان دن میں روزی کماتے ہیں اور رات کو راہِ خدا میں نکل پڑتے ہیں تاکہ خدمتِ خلق اور تبلیغ کا فریضہ انجام دیں، خصوصاً موسم گرما میں یہ تبلیغی پروگرام بڑے اوج پر ہوتا ہے اور سارے نوجوان بڑی مستعدی اور جانفشانی سے یہ فریضہ انجام دیتے ہیں، یہاں تک کہ ہفتہ کے چھ روز تبلیغ میں گزار دیتے ہیں اور ایک روز گھر پر قیام کرتے ہیں۔

س : کیرالا میں ہر رات مجاہدین کا کتنا تبلیغی پروگرام ہوتا ہے؟

ج : پورے کیرالا میں ہر رات مجاہدین کا تقریباً دس تبلیغی پروگرام ہوتا ہے

س : شہر کالی کٹ میں مجاہدین کی کتنی مسجدیں ہیں؟

ج : کالی کٹ میں مجاہدین کی تقریباً بیس مسجدیں ہیں۔

س : تمام مساجد میں ایک موضوع پر خطبہ ہوتا ہے یا مختلف موضوع پر؟

ج : تمام مساجد میں ایک موضوع پر خطبہ ہوتا ہے اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تمام مساجد کے خطبا رجمعہ کی رات کو مرکز میں اکٹھا ہوتے ہیں اور کسی ایک موضوع کے چند نکات پر اتفاق کرکے اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔

س : خطیب جمعہ کس کی جانب سے مقرر ہوتا ہے؟

(باقی ص ۲۷ پر)

ہماری نظر میں

ایام خلافت راشدہ

تالیف مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈانگری — قیمت ۳۰ روپئے، صفحات ۴۸

ملنے کا پتہ: (مولانا جھنڈانگری سے) جامعہ سراج العلوم پوسٹ بڑھنی بازار، ضلع بستی (یوپی)

مولانا جھنڈانگری کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ آپ مضمون ومقاصد کو واقعات کے ذریعہ بیان کرنے میں ید طولی رکھتے ہیں، زیر تبصرہ کتاب مولانا کی اسی مہارت کا ایک نمونہ ہے۔ واقعات کی زبان سے خلافت راشدہ کے عہد کے سماجی ومعاشی عدل وانصاف ترفہ وخوشحالی اور امن وامان کی جو ایمان افروز تصویر آپ نے پیش کی ہے وہ مسلمانوں کے لیے اسوۂ دعوت وعمل اور آئین اقبال وسعادت ہے اور باقی انسانوں کے لیے پیغام حیات اور راہِ نجات۔ اللہ مولف کی کوششوں کو بارآور اور مفید بنائے۔ آمین۔

دلائل ہستی باری تعالیٰ

تالیف: مولانا عبدالرؤف رحمانی، جھنڈانگری — قیمت درج نہیں، صفحات ۲۷، پتہ سابق

دنیا میں کچھ ایسے نام عقل بھی ہوتے رہے ہیں، جو سرے سے اللہ تعالیٰ کے وجود ہی کے منکر ہیں۔ مولانا نے اس کتاب میں انہی کے نقطۂ نظر کا ابطال کیا ہے اور مختلف پہلوؤں سے اللہ کا وجود ثابت کیا ہے اس سلسلے میں موصوف نے قرآن سے بھی مدد لی ہے، ائمۂ اسلام سے بھی، سائنسدانوں سے بھی، دنیا کے مشہور غیر مسلم دانشوروں سے بھی اور کچھ غیر مشہور لوگوں سے بھی کتاب اپنے موضوع پر مفید اور دلچسپ ہے۔

بقیہ: مُردے کی طرف سے قربانی

بنیاد پر میت کی طرف سے قربانی کے جواز کا حکم لگایا ہے (شرح السنۃ ۴/ ۳۵۸) اور امام ابن تیمیہ نے اگرچہ اس حدیث کا حوالہ نہیں دیا ہے لیکن میت کی طرف سے قربانی کے جواز کا فتویٰ انھوں نے بھی دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں وتجوز الاضحیة عن المیت کما یجوز الحج عنه والصدقة عنه (فتاوی شیخ الاسلام ابن تیمیہ ج۲۶/ ص۳۰۶) یعنی میت کی طرف سے قربانی کرنا جائز ہے جس طرح اس کی طرف سے حج اور صدقہ کرنا جائز ہے

•••

نجات کی صرف ایک ہی راہ ھے :

تحریر : ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی ترتیب محمد عنایت اللہ ندوی

پتہ : ادراہ تحریک اسلامی 11-3 926/4 نزد تاج محل ٹاکیز ملے پلی حیدرآباد

اس کتابچے میں یہ بتاتے ہوے کہ شرک سے دامن کشی کے بغیر نجات نہیں مختصراً مسلمانوں میں پھیلے ہوے انواع واقسام کے شرک کی وضاحت کی گئی ھے۔ مثلا اللہ کی ذات میں شرک، اللہ کی صفات علم، تصرف، قدرت واختیار، دعاء پکار میں شرک، مالی وبدنی عبادت میں شرک اور وسیلہ کا شرک وغیرہ، عقیدے کی درستگی کے لئے یہ کتابچہ نہایت مفید اور ضروری ھے۔ اسے زیادہ سے زیادہ پھیلانا چاھئے۔ مذکورہ پتے سے بلا قیمت طلب کیا جا سکتا ھے۔

حاجی محمد یعقوب صاحب :

جامعہ سلفیہ بنارس کے قدیمی ھمدرد اور حضرت مولانا قمر صاحب مبارکپوری کے والد محترم حاجی محمد یعقوب صاحب ۱۸/جولائی بدھ کی سہ پہر کو اپنے خالق حقیقی سے جا ملے شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی نے نماز جنازہ پڑھائی مرحوم نے کافی عمر پائی، اور آخری ایام میں قدرے طویل معذوری کے باوجود ھر قسم کی پریشانیوں سے محفوظ رھے۔ آپ دینی امور میں بڑھ چڑھکر حصہ لیا کرتے تھے۔ ناظرین سے دعائے مغفرت کی درخواست ھے۔

حاجی عبد الحفیظ ناظم مدرسہ دار التعلیم، مبارکپور، ضلع اعظم گڈھ

درخواست دعاء :

متحدہ عرب امارات کی مرکزی جماعت اھلحدیث کے ناظم اعلی اور رام القیوین کورٹ کے ترجمان جناب محمد منیر صاحب سیالکوٹی نے اطلاع دی ھے کہ انکے والد صاحب پاکستان میں عارضہ قلب سے دوچار ھین۔ ناظرین محدث شفائے کامل وعاجل کیلئے دعا فرمائیں۔

معذرت۔ ماہ اگست کا محدث وقت پر چھپ کر تیار ہونے کے باوجود بائنڈر کے گھر اچانک حادثے کے سبب غیر معمولی تاخیر سے جا سکا۔ ادارہ معذرت خواہ ھے۔

Reg. No. R. N. 40352/81

September **MOHADDIS** 1984

THE ISLAMIC CULTURAL & LITERARY MONTHLY MAGAZINE

AL-JAMIATUS SALAFIAH (AL-MARKAZIYAH) VARANASI (INDIA)

ہماری اردو مطبوعات

(۱) قادیانیت اپنے آئینہ میں	Rs. 16/00
(۲) فتنۂ قادیانیت اور مولانا ثناء اللہ امرتسری	Rs. 16/00
(۳) تاریخ ادب عربی (حصہ اول)	Rs 10/00
(۴) " " (حصہ دوم)	Rs. 15/00
(۵) وسیلۃ النجاۃ	Rs. 7/50
(۶) اللمحات الی مافی انوار الباری من الظلمات (جلد اول)	Rs. 28/00
(۷) " " " (جلد دوم)	Rs. 28/00
(۸) رسالت کے سائے	Rs. 15/00
(۹) کتاب الکبائر	Rs. 27/00
(۱۰) رمضان المبارک کے [illegible] احکام	Rs. 3/00
(۱۱) اتباع سنت اور تقلید	Rs. 12/00
(۱۲) قیاس ایک تقابلی مطالعہ	Rs. 10/00
(۱۳) رکعات تراویح کی صحیح تعداد اور علماء احناف	Rs. 1/25
(۱۴) جماعت اہلحدیث کی تصنیفی خدمات	Rs. 9/00
(۱۵) جماعت اہلحدیث کی تدریسی خدمات	Rs. 11/00
(۱۶) قبروں پر مساجد کی تعمیر اور اسلام	Rs. 15/00
(۱۷) تقلید اور عمل بالحدیث	Rs. 8/50
(۱۸) خاتون اسلام	Rs. 9/00

مکتبہ سلفیہ ریوری تالاب، بنارس

Published from Markazi Darul-Uloom

Printed by Abdul Waheed

At Salafiah Press, Reori Talab, Varanasi.

مُحدّث

مرکزی دارالعلوم بنارس کا دینی علمی اور ادبی ماہنامہ

ادارۃ البحوث الاسلامیۃ والدعوۃ والافتاء بالجامعۃ السلفیۃ بنارس

★

عدد مسلسل ۳۳ ◎ محرم ۱۴۰۵ھ ◎ اکتوبر ۱۹۸۴ء

برگ وبار

جامعہ سلفیہ کا علمی ادبی اور اصلاحی رسالہ

ماہنامہ

محدث

بنارس

شمارہ: ۱۰

جلد: ۳

محرم الحرام ۱۴۰۵ھ • اکتوبر ۱۹۸۴ء

بدل اشتراک

سالانہ: ۲۵ روپیے

ششماہی: ۱۳ روپیے

فی پرچہ: ۲/۵۰ روپیے

بیرونی ملک سے سالانہ: ۱۵ ڈالر

ترتیب

صفی الرحمن مبارکپوری

ناشر: جامعہ سلفیہ بنارس

طابع: عبدالوحید

مطبع: سلفیہ پریس بنارس

کاتب: انور جمال

:- پتہ :-

خط و کتابت کے لیے: ایڈیٹر محدث، جامعہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس

بدل اشتراک کے لیے: مکتبہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس

MAKTABA SALAFIAH REORITALAB VARANASI-10

ٹیلی گرام: دارالعلوم، وارانسی • ٹیلی فون: ۶۳۵۷۷

نشاطِ روح

تابش حجازی

زباں پہ آیتِ قرآں نہیں تو کچھ بھی نہیں
نشاطِ روح کا ساماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ترے سفینے میں لعل و گہر سہی لیکن
متاعِ سنت و قرآں نہیں تو کچھ بھی نہیں

تمام دانش و حکمت، تمام علم و شعور!
یقیں کی شمعِ فروزاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ خانقاہ یہ مسجد یہ منبر و محراب
چراغِ کعبۂ ایماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ہر ایک شے کی تجھے ماہیت کا علم سہی
خود اپنی ذات کا عرفاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

گلوں نے اپنے گریباں تو چاک کر ڈالے
ترا ہی چاک گریباں نہیں تو کچھ بھی نہیں

وہ تیغ جس سے لرز اٹھے قیصر و کسریٰ،
تری حیات کا عنواں نہیں تو کچھ بھی نہیں

ابھی ہے دل ترا سوزِ یقیں سے بیگانہ
ادائے بوذر و سلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

خودی کی آگ سے روشن منیر کر اپنا
اس انجمن میں چراغاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

شکوہ دینِ محمدؐ کے راز دار اگر
کلاہ و طرۂ افغاں نہیں تو کچھ بھی نہیں

وہ شعر لاکھ ہو سحرِ حلال، اے تابش
سخن میں گرمیٔ ایماں نہیں تو کچھ بھی نہیں۔



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور عدم تشدد

تشدد کے مذہبی اسباب

(گاندھین انسٹی ٹیوٹ بنارس میں کی گئی تقریر کی دوسری قسط)

اب تک ہم نے جو گفتگو کی ہے اس میں تشدد کے اسباب پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ چونکہ انسان پر مذہب اور عقیدے کی گرفت سب سے مضبوط ہوتی ہے۔ اس لیے بیجا نہ ہوگا کہ ہم تشدد کے چند موٹے موٹے اسباب کی نشاندہی کرکے ان کے بارے میں اسلام کے موقف کی تعیین و توضیح کردیں۔

انسانی تاریخ کا جائزہ لیجیے تو اندازہ ہوگا کہ تشدد کے اسباب مذہبی بھی ہیں، سماجی بھی اور اقتصادی بھی۔ مذہبی اسباب میں تشدد یا ہنسا کی ایک خاص وجہ مورتی پوجا ہے۔ ہندوستان، یونان، مصر اور عراق جو مورتی پوجا کے خاص خاص گڑھ رہ چکے ہیں۔ اور ہمارا ملک اب بھی ہے، ان کے بارے میں تاریخ نے دو باتیں خاص طور سے نوٹ کی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر جگہ کوئی نہ کوئی ایسی دیوی مانی گئی ہے، جس کے متعلق عقیدہ تھا کہ اس کی مورتی پر انسان کا بلدان کیا جائے تو وہ بہت خوش ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ہر جگہ انسانوں کو مورتیوں کی بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔ ہمارے ملک میں جب اس طرح کی بھینٹ چڑھانے کا رواج حد سے بڑھ گیا تو مہاویر، وردھمان اور گوتم بدھ نے اپنے اپنے وقت میں اس کے خلاف آواز اٹھائی۔ اور چونکہ یہ مذہبی پیشواؤں کے ہاتھوں تشدد کے شکار عوام کے دل کی آواز تھی اس لیے بہت کامیاب رہی۔ ہندوستان میں نہایت تیز رفتاری سے بدھ مذہب کے پھیلنے کی وجہ یہی تھی کہ لوگ بھینٹ چڑھانے کی ان مسلسل کارروائیوں سے تنگ آچکے تھے۔ اب بھی کبھی

کبھی اخباروں میں خبر آتی ہے کہ کسی نے فلاں دیوی کو خوش کرکے دھن دولت حاصل کرنے کے لیے کسی لڑکے کو پکڑ کر بھینٹ چڑھا دیا۔ یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ مجرم آدمی جب یہ سوچتا ہے کہ دیوی دیوتا ہم سے خوش ہو کر ہمارا سب کام بنا دیں گے تو وہ کچھ زیادہ ہی ڈھیٹ اور مجرم ہو جاتا ہے۔

مورتی پوجا والے ملکوں کے بارے میں تاریخ نے دوسری بات یہ نوٹ کی ہے کہ وہاں کے مندر اور پوجا خانوں میں پجاریوں کے علاوہ دیوداسیاں بھی رہتی تھیں۔ عام طور پر ان دیوداسیوں سے پجاریوں کا ناجائز تعلق ہوتا تھا جس کے نتیجے میں ناجائز بچے پیدا ہوتے تھے اور سماجی عار سے بچنے کے لیے ان بچوں کا گلا گھونٹ کر مار دیا جاتا تھا۔ بلکہ بہت سے حالات میں خود بچہ جننے والی دیوداسیوں کو بھی جان سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا۔ پھر اس طرح کی ہوس ناکی اور حرام کاری کے عادی پجاریوں کا جذبۂ ہوس کچھ اور ترقی کرتا تو وہ زیارت اور عبادت کی غرض سے آنے والی عورتوں کو بھی اپنی ہوس کا نشانہ بناتے اور اگر عورت کسی ایسے خاندان سے ہوتی جس سے انتقام کا اندیشہ ہوتا تو اسے حرامکاری کے بعد قتل بھی کر دیتے تھے اور اس مقصد کے لیے خفیہ قتل گاہیں بھی بنی ہوتی تھیں۔ ہمارے شہر بنارس کی گیان واپی سے متصل مندر کے سلسلے میں اس طرح کے واقعات تاریخ بنارس کا ایک مشہور باب ہیں۔ اور اسی طرح کے لیلے کے نتیجے میں اس مسجد کو ان قتل گاہوں کے کھنڈر پر خود ایک ماتحت ہندو حکمراں نے تعمیر کرایا تھا۔

یورپ میں عیسائی گرجوں کے اندر ننوں کے رکھنے کا رواج نکلا تو اس کا بھی یہی حشر ہوا جو مندروں میں دیوداسیوں کے رکھنے کا ہوا تھا۔

اسلام نے اس طرح کے اسباب کی سرے سے جڑ ہی کاٹ دی ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ پوجا صرف اللہ کی جائے کیونکہ اللہ کے سوا جو کچھ ہے محض نام ہے۔ کسی کے پاس کچھ طاقت اور اختیار نہیں۔ ان کے پوجنے سے مرنے کے بعد والی دنیا تو برباد ہوتی ہی ہے، اس دنیا میں بھی جو کچھ ان کے لیے خرچ کیا جاتا ہے سب برباد جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام میں یہ تصور ہی نہیں کہ کوئی آدمی سادھوؤں کی طرح پجاری بن کر مستقل طور پر عبادت خانوں میں رہے۔ اور وہاں عبادت کے لیے جانے والے اسی کے واسطے سے عبادت کر سکیں۔ نیز عورتوں کو صرف نماز با جماعت میں شرکت کی اجازت ہے۔ اور یہ ایسا موقع ہوتا ہے جب کوئی خطرہ اور اندیشہ نہیں۔

ہنسا (تشدد) کی ایک اور بڑی وجہ مذہبی عصبیت اور جوش و جنون ہے۔ جب ایک مذہب کا ماننے والا دوسرے مذہب کے لوگوں کو زبردستی اپنے مذہب میں لانا چاہتا ہے تو ہنسا اور تشدد کی واردات ہوتی ہیں۔

ہمارے ملک میں جب آرین قوم آئی تو اس نے مذہبی اور نسلی اونچ کے غرور میں یہاں کے اصلی باشندوں کو اتنی بڑی تعداد میں قتل کیا، لوٹا، مارا اور زندہ جلایا کہ انھیں دکھن ہندوستان کے جنگلوں میں پناہ لینی پڑی اور وہ اُدھر ہی کے ہو کر رہ گئے۔ گوتم بدھ کی کوششوں سے جب بدھ مت نے عروج پکڑا تو ویدک دھرم کے آریوں کی جنونانہ کارروائیاں رک گئیں۔ مگر جب بدھسٹوں کی حکومت کمزور ہوئی تو ویدک دھرم نے کھتری قوم کی جگہ تھوڑا سا روپ بدل کر راجپوت قوم تیار کی۔ اور بدھوں کے خلاف قتل، غارت گری اور لوٹ پھونک کا ایسا بازار گرم کیا کہ انھیں ہمالیہ کے اس پار بھاگنا پڑا۔ آج چین، جاپان، برما وغیرہ ملکوں میں بدھ مت کی اکثریت ہے لیکن یہ ہندوستان میں صرف نام کے لیے رہ گیا ہے۔ ان لڑائیوں میں مارے جانے والوں کا اندازہ کروڑوں تک کیا گیا ہے۔ یہ مذہبی جنون تھا اور اس کے پیچھے مذہبی تعلیم کام کر رہی تھی۔ ستیارتھ پرکاش سمولاس ص ۵۹ میں لکھا ہے:

جو شخص وید اور وید کے مطابق بنائی ہوئی کتابوں کی بے عزتی کرتا ہے۔ اس ویدکی برائی کرنے والے منکر کو ذات، جماعت اور ملک سے باہر نکال دینا چاہیے۔

اور خود یجر وید ۲۸/۱ میں لکھا ہے "اے جاہ و جلال والے راج پرش! آپ دھرم کے مخالفوں کو آگ میں جلا ڈالیں وہ ہمارے دشمنوں کو حوصلہ دیتا ہے۔ آپ اسے الٹا لٹکا کر خشک لکڑی کی طرح جلا ڈالیں۔"

اس طرح کی تعلیم سے جو مذہبی جنون پیدا ہوگا وہ ظاہر ہے اور اس کا جو نتیجہ ہوگا اس کی طرف ہم ابھی اشارہ کر چکے ہیں۔

اسی طرح کا جنون دور وسطیٰ کے عیسائیوں میں بھی پایا جاتا تھا۔ لبنان اور فلسطین پر ان کا قبضہ ہوا تو انھوں نے نہتے مسلمان مردوں، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو اتنی بڑی تعداد میں قتل کیا کہ سڑکوں اور گلیوں میں گھٹنوں سے اوپر تک خون بہ رہا تھا۔ اسپین میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی تو وہاں کے کروڑوں مسلمانوں کو مارا اور زندہ جلایا گیا۔ مسلمان تو خیر عیسائیوں سے الگ ایک دوسرے دین و مذہب کے لوگ تھے مگر عیسائی عدالت نے خود اپنے ملک کے عیسائیوں کو معمولی سے مذہبی اختلاف کی بنا پر ایک کروڑ بیس لاکھ کی تعداد میں ہلاک کیا۔ اکیلے اسپین میں تین لاکھ چالیس ہزار عیسائیوں کو قتل کیا گیا جن میں سے ۳۲ ہزار زندہ جلائے گئے تھے۔

یہ مذہبی جنون کے نتیجے میں ہونے والے ہنسا اور تشدد کی چند مثالیں ہیں۔ اسلام نے مسلمانوں کے اندر سے

اس کی بھی جڑ کاٹ دی ہے۔ اسلام کا اعلان ہے کہ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّین دین میں زبردستی نہیں۔ یعنی جو شخص اپنی مرضی سے جس دین اور مذہب میں چاہے رہے، اسے زبردستی دینِ اسلام میں داخل نہ کیا جائے گا، بلکہ اسلام نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ اگر کوئی شخص زبردستی محض اسلام کا کلمہ پڑھ لے اور دل سے مسلمان نہ ہو تو وہ سرے سے مسلمان ہی نہیں۔ اس لیے کسی کو زبردستی مسلمان بنانا سرے سے بیکار ہے۔ ظاہر ہے اس وسعتِ قلبی اور رواداری کے بعد مذہبی عصبیت اور جبر و دباؤ کا نہ کوئی وجود رہے گا نہ اس کی وجہ سے انفرادی یا اجتماعی تشدد پھوٹے گا۔ بشرطیکہ دوسرے دین دھرم کے ماننے والے بھی یہی اصول اپنا لیں۔

مذہبی عصبیت کی اسی راہ سے (ہنسا) تشدد کی ایک اور وجہ بھی جنم لیتی ہے، یعنی دوسرے مذہب کی توہین اور بے عزتی۔ اسلام نے اس سے سختی کے ساتھ روکا ہے۔ قرآن میں حکم ہے۔ ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم۔ اللہ کو چھوڑ کر دوسری جن چیزوں کی لوگ پوجا کرتے ہیں، ان چیزوں کو برا بھلا مت کہو ورنہ وہ لوگ نادانی سے اللہ ہی کو برا بھلا کہیں گے۔

اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان نہ دوسرے دین کے مذہب کی توہین کرتے ہیں، نہ ان کے پیشواؤں اور بزرگوں کی۔ اور نہ ان کے مندروں اور عبادت خانوں کی۔ آپ ہندوستان پر مسلمانوں کی گیارہ سو سالہ تاریخ دیکھ ڈالیے انھیں اتنی قوت حاصل تھی کہ وہ یہاں جو کچھ چاہتے کر ڈالتے۔ مگر نہ انھوں نے مندر توڑے نہ بت۔ نہ دوسرے دھرم کے بزرگوں کو برا بھلا کہا۔ نہ ان کے ماننے والوں کو زبردستی مسلمان بنایا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج بھی مسلمانوں کی تعداد سرکاری اعداد و شمار کے مطابق صرف اگیارہ، بارہ فیصد ہے۔ پنجاب محمود غزنوی کے زمانہ میں فتح ہوا تھا۔ اور بنگال مغلوں سے پہلے۔ لیکن ان دونوں علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت اس وقت ہوئی جب مسلمانوں کے بجائے بنگال پر انگریزوں کی اور پنجاب پر سکھوں پھر انگریزوں کی حکومت تھی۔ آپ یہ بھی دیکھ لیجیے کہ تین ساڑھے تین سو برس تک سکھ اور مسلمان ایک دوسرے سے اکثر لڑتے رہے مگر مسلمانوں نے نہ کبھی گرنتھ صاحب کو جلایا، نہ گرونانک کی مورتی توڑی، نہ ان کے کسی گردوارے میں قدم رکھا۔ گولڈن ٹیمپل کی بات تو بہت دور کی رہی، اس کی وجہ یہی تھی کہ مسلمان اگرچہ اپنے مذہب سے بہت کچھ دور جا پڑے تھے تاہم ان پر ان کے دین کی اس تعلیم کا کچھ نہ کچھ اثر باقی تھا کہ دوسرے مذہب کی مقدس کتابوں، عبادت خانوں اور بزرگوں کی توہین کر کے اس مذہب والوں کی دلآزاری نہیں کرنی چاہیے۔

مگر آپ ۴۷ء کے بعد کا حال دیکھیے ابھی ۳۷ برس بھی پورے نہیں ہوسکے کہ گولڈن ٹمپل ڈھا دیا گیا۔ حالانکہ اس کی سپلائی کاٹ کر سامنے لڑنے والوں کو زندہ گرفتار کیا جاسکتا تھا۔ اس کے علاوہ سیکڑوں گردوارے روند دیے گئے۔ اور مسلمانوں کے ساتھ جو اندھیر نگری مچی ہے اس کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ ملک آزاد ہوتے ہی مسلمانوں پر جو حملہ ہوا اس کے نامکمل اعداد و شمار یہ ہیں کہ ہندوستانی علاقے میں دس لاکھ ساٹھ ہزار مسلمان مارے گئے اور اس کے بعد سے آج تک خون کی جو ہولی کھیلی جارہی ہے اسے کہاں تک گنائیں۔ تنہا دہلی میں سرکاری اعداد و شمار تین ہزار اور غیر سرکاری دس سے تیرہ ہزار ہے۔ جبلپور، راؤرکیلا، تھانہ، احمد آباد، جمشید پور، بھیونڈی بمبئی وغیرہ وغیرہ ہزاروں فسادات کے اعداد و شمار الگ ہیں۔ پھر بربریت کا عالم یہ کہ سرکاری فورس تک کے بارے میں سنا گیا کہ انھوں نے زندہ انسانوں کی آنکھ نکال لی اور ہاتھ پاؤں کاٹ کر زندہ لٹکا دیا۔ کسی کا بھاری پتھر سے گھٹنا اور کہنی توڑ کر زندہ چھوڑ دیا گیا۔ عورتوں کی بے حرمتی کر کے ان کی شرمگاہ پر تیزاب ڈال دیا گیا۔ قرآن کی الگ بے حرمتی کی گئی۔

مسجدوں کا حال یہ ہوا کہ ۴۷ء میں ساڑھے تین سو سے اوپر مسجدیں صرف دہلی میں ڈھا دی گئیں یا انھیں رہائشی مکان میں تبدیل کرلیا گیا۔ دہلی کی ۹۰ سے اوپر مسجدوں میں آج تک تالا پڑا ہوا ہے۔ جن میں سے غالباً دو چار مسجدیں آجکل امام عبداللہ بخاری کے سخت پروٹسٹ کے بعد کھول دی گئی ہیں۔

مراد آباد کی عیدگاہ میں جو طوفان قیامت اٹھا اور چھوٹے بچوں تک کو جس طرح بھون دیا گیا وہ سب کو معلوم ہے ہمارے مورخین (اتہاس لیکھکوں) نے مسلمانوں کے گیارہ سو سالہ دورِ حکومت کے متعلق جتنے افسانے گھڑ رکھے ہیں، اگر ان سب کو اکٹھا کرلو اور صحیح مان لو تب بھی وہ کل کے کل مل کر اس چھتیس سینتیس برس میں ہونے والے ظلم اور اتیاچار کا سواں کیا ہزارواں حصہ بھی نہیں ہوسکتے۔

جہاں تک دوسرے مذہب کے بڑوں اور پرکھوں کی عزت اور قدر کا سوال ہے تو ذرا بازار میں نکلو، دکانوں پر بکنے والی کتابوں کو دیکھو، بلکہ اتہاس کے نام پر سرکاری کورس کے اندر جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اور ابھی تازہ بتازہ چھپ کر آیا ہے، اسی کو دیکھ لو۔ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جنھوں نے انسانیت کو ظلم و قہر اور گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر رشد و ہدایت اور انسانیت کی روشنی میں پہنچایا اور جن کے متعلق ان کے دشمنوں نے بھی مانا ہے کہ انسانیت کی پوری تاریخ میں اتنا بڑا انسان پیدا نہیں ہوا، ان کے متعلق دیکھو کہ یہاں کے لکھنے والے کیا لکھتے ہیں۔ کتنی بری زبان ہے، کیسا دل آزار بیان ہے اور کیسی جھوٹ کی بھرمار ہے۔ میں مسلمان ہوں۔ لیکن سچ کہتا ہوں کہ

میرے نہیں بلکہ دوسرے دھرم کے پیشوا کے بارے میں ایسی باتیں لکھی جائیں تو میں انھیں اپنی زبان پر لانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ گاندھی جی کی روح یقیناً کھڑی فریاد کر رہی ہوگی ــ اگر وہ کھڑی ہو سکتی ہوگی ــ کہ یہ کیا اندھیر نگری ہے جو گاندھی بھگتوں کے ہاتھوں ان کے دیش میں ہو رہی ہے۔ مگر یاد رہے کہ یہ مذہبی عصبیت و جنون اور دیوانگی کا اثر ہے۔ اور کسی کی روح فریاد کر کے اس کو ختم نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ اس کا صحیح علاج نہ ہو۔ جب تک ہنسا کرنے والوں کے ہاتھ نہ پکڑے جائیں اور نہتے مردوں عورتوں بوڑھوں بچوں پر گولیاں چلانے والے سورماؤں کو تمغے دینے کے بجائے ان کا احتساب نہ کیا جائے۔ موٹی سی مثال سامنے ہے، یہاں ہر سال آدھے ہزار کے قریب چھوٹے بڑے فساد ہوتے ہیں۔ پاکستان میں اس کا کہیں نام و نشان نہیں۔ آخر کیوں؟ اس کی وجہ کھوج کر اس کو اپنائیے۔ اگر گاندھی بھگتی سے علاج نہیں ہوتا تو خدا بھگتی سے کیجیے۔ بیمار کو دوا چاہیے۔ ڈاکٹر کون ہے اسے اس سے کیا مطلب؟

ہو سکتا ہے کہ اس مرحلہ پر ہمارے کچھ بھائی سومنات اور کچھ اور مندروں کا حوالہ دیں۔ اس بارے میں صحیح تاریخی حقیقت سمجھنے کے لیے ایک سوال پر غور کرنا ضروری ہے۔ محمود غزنوی کی فوجیں بنارس کے قریب تک آئیں۔ دریائے سندھ سے یہاں تک سیکڑوں مندر اور ہزاروں بت رہے ہوں گے۔ خود سومناتھ مندر کا حال یہ تھا کہ دو ہزار برہمن اس مندر کے پجاری تھے اور بڑے بڑے ہندو سرداروں کی پانچ سو جوان بیٹیاں اس مندر میں رہتی تھیں، لہٰذا لازماً اس مندر میں بھی بڑے بت کے علاوہ سیکڑوں اور بت تھے، پھر کیا وجہ ہے کہ محمود غزنوی کی فوجوں نے تھانیسر، متھرا اور سومنات کو چھوڑ کر باقی پورے ہندوستان میں کہیں بھی نہ کسی مندر کو ہاتھ لگایا نہ کسی بت کو توڑا، یہاں تک کہ ان تینوں جگہ بھی کوئی بڑی توڑ پھوڑ نہیں مچائی، بلکہ صرف ایک دو بت کو توڑا۔ پھر سومنات میں تو لاکھوں کروڑوں کا دھن دولت بھی بت بچانے کیلیے پیش کیا گیا۔ لیکن غزنوی نے ان سب کو ٹھکرا کر بت ہی کو توڑا۔ کھلی بات ہے کہ اگر محمود غزنوی کو بت توڑنے سے دلچسپی ہوتی تو وہ ہر جگہ کے سارے بت توڑتا جاتا۔ اور اگر دھن دولت سے دلچسپی ہوتی تو اسے اتنی دولت دی جا رہی تھی کہ بت توڑنے میں اس کا پاسنگ بھی ملنے کی امید نہ تھی۔ بس اتنی سی بات پر آپ غور کریں تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ بت نہ دولت کے لالچ میں توڑا گیا تھا نہ مذہبی دشمنی کی بنا پر بلکہ اس کی تہ میں گولڈن ٹیمپل کی طرح کا کوئی اور معاملہ کار فرما تھا۔

اس کی مختصر روداد یہ ہے کہ محمود غزنوی کے جو بارہ یا سترہ حملے مشہور ہیں، ان میں سے ابتدائی کئی لڑائیاں ہندوستان کی اس وقت کی سرحد کے اس پار سیکڑوں میل دور غزنی اور ملتان کے علاقوں میں ہوئیں۔ یعنی یہ حملے، غزنوی حکمرانوں نے نہیں کیے بلکہ ہندوستان نے کیے اور وہ بھی اس طرح کہ غزنوی حکمرانوں کو ترکستان و خراسان

میں الجھا ہوا پاکر سارے ہندوستان کی بے شمار فوجوں نے مہاراجہ پنجاب کی متحدہ کمان میں بے روک ٹوک پیش قدمی کرکے راجدھانی غزنی تک کو خطرے میں ڈال دیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس طرح کے ہر حملے میں ہندوستان کا ٹڈی دل لشکر غزنی کی مٹھی بھر فوج کے مقابل بری طرح شکست کھا گیا۔ چونکہ ہر حملہ راجہ پنجاب کی قیادت میں ہوتا تھا۔ اس لیے راجہ پنجاب نے ہر بار شکست کے بعد غزنوی حکمرانوں سے معافی مانگی اور اسے ہر بار معاف کر دیا گیا۔ مگر اس نے ہر بار غداری اور بدعہدی کی، اس طرح جب سلطنت غزنی پر چار حملے ہو چکے اور چار بار معافی مانگ کر غداری و بدعہدی کی جا چکی تب محمود غزنوی نے پنجاب پر جوابی حملہ کیا اور اسے اپنی سلطنت میں شامل کیا۔

اس عرصے میں باوجودیکہ محمود غزنوی نے راجہ پنجاب کو بے حد رعایتیں دے رکھیں اور اس کی نہایت، خوفناک سازشوں اور بدترین غداریوں اور بدعہدیوں کو معاف کرتا رہا۔ مگر اس شریفانہ برتاؤ کا جواب ہندوستانی راجاؤں کے پاس یہ تھا کہ ان "ملیچھوں" (مسلمانوں) کو نیست و نابود کر ڈالو۔ یہ مذہبی جنون تھا۔ جسے اسلام دشمنی نے دوآتشہ کر دیا تھا۔ اسی جوش جنون میں بدھ مت اور ویدک دھرم نے باہمی عداوت بھلا کر کاندھے سے کاندھا ملا لیا اور ایک مشترکہ اور دونوں کے لیے قابل قبول دھرم کی حیثیت سے وشنو دھرم کی ایجاد عمل میں آئی اور اسی اسلام دشمنی کے جنون میں ہندوستانی راجاؤں اور برہمن پیشواؤں نے مسلمانوں کے بدترین دشمن قرامطہ سے سازباز کی اور حضرت علی کو دسواں اوتار مان کر قرامطہ کو بھی ہندو جاتی میں شامل کر لیا اور ان کے ذریعہ محمود غزنوی کے خلاف کی سازش میں بحرین کے قرامطہ اور مصر کے عبیدیوں تک سے سانٹھ گانٹھ کی۔ اس سازش کا سب سے پہلا گڑھ تھانیسر تھا۔ پھر متھرا مہابن اور سومنات۔ اور چونکہ اس کی لگام برہمن پیشواؤں کے ہاتھ میں تھی، اس لیے یہ کام مذہبی دربار یعنی مندر میں انجام پاتا تھا۔ ان مندروں کے بڑے بتوں کے متعلق عوام کو یہ بھی یقین دلا رکھا گیا تھا کہ یہ محمود غزنوی کو نسٹ کر ڈالیں گے۔ اور یہی یقین دہانی عوامی جوش و خروش کا سبب تھی اور یہ جوش و خروش اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ مالدار تو مالدار غریب اور بیوہ عورتیں تک چرخے کات کات کر اور اپنے زیور بیچ بیچ کر فوجوں کی تیاری میں مدد دے رہی تھیں۔

بار بار کے تجربے کے بعد محمود غزنوی اس کا انتظار نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی سلطنت پر پھر حملہ ہو۔ چنانچہ مجبوراً اس نے پیش قدمی کرکے پہلے تھانیسر کا سازشی گڑھ ختم کیا، پھر متھرا اور مہابن کا۔ یہاں کے بتوں کو توڑنا اس لیے ضروری تھا کہ جب تک وہ باقی رہتے ہندوؤں کا یہ یقین برقرار رہتا کہ محمود غزنوی نسٹ ہو جائے گا۔

اور اس کی وجہ سے ایک نہ ختم ہونے والی جنگ اور بے پناہ قتل و خونریزی کا سلسلہ جاری رہتا۔ اس کے برعکس بت توڑ دینے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان علاقوں سے جنگ کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

تھانیسر اور یوپی کے ان دو تین بتوں کے ٹوٹنے کے بعد عام ہندؤوں کا جنگی جنون تو سرد ہو چلا تھا، لیکن ابھی سازشی گروہ کے دم خم باقی تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ پھر جنگی جوش و خروش پیدا کرنے اور غزنوی سلطنت کے خلاف قتل و غارت گری کی متحدہ آگ بھڑکانے کے لیے برہمنوں نے تمام ملک میں اس بات کو شہرت دی کہ سومنات کا بت تھانیسر اور متھرا کے بتوں سے ناراض تھا، لہٰذا اس نے موقع دیا کہ محمود ان بتوں کو توڑ دے اور اسی لیے سومنات نے محمود کی مخالفت میں کوئی کام نہیں کیا۔ لیکن اب سومنات ایک چشم زدن میں محمود کا کام تمام کردے گا کیونکہ وہ تمام بتوں کا بادشاہ ہے اور سمندر اس کی عبادت کے لیے مقررہ اوقات میں حاضر ہوتا ہے چونکہ جوار بھاٹا کی وجہ سے سمندر کا پانی کبھی مندر سے میلوں پرے ہوتا اور کبھی مندر تک آجاتا۔ اس لیے سادہ لوح عوام کو بیوقوف بنایا جاتا کہ دیکھو یہ سمندر بت کی عبادت کرنے آیا ہے۔

بہرحال یہ کوشش اتنے بڑے پیمانے پر ہوئی کہ ایک بار پھر غزنی کے خلاف جنگ کا جوش بھڑک اٹھا، جس کا عالم یہ تھا کہ ہر روز ہردوار سے گنگا کا پانی سومنات پہنچتا تھا، اور اس کے ساتھ ہی سومنات میں ایک زبردست فوجی طاقت بھی جمع ہوگئی تھی بالآخر محمود غزنوی کو اس نئے خطرے کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس نے سومنات فتح کرکے خاص اس بت کو توڑ دیا، جس کے ہاتھوں محمود غزنوی کے نسٹ ہونے کی امید میں لاکھوں جانیں داؤں پر لگی ہوئی تھیں۔ اس تفصیل سے یہ حقیقت سمجھی جاسکتی ہے کہ ہزاروں بتوں اور مندروں کے ہجوم میں سے محمود غزنوی نے جو دو تین بت توڑے تو اس کی یہ کارروائی مذہبی نہیں تھی۔ بلکہ گولڈن ٹیمپل کے واقعہ سے بھی زیادہ سیاسی قسم کی تھی۔

محمود غزنوی کے متعلق یہ تفصیل محض برسبیل تذکرہ آگئی ہے۔ مقصود صرف یہ بتلانا ہے کہ اسلام مذہبی رواداری کا قائل ہے، نہ وہ دوسرے مذہب کے بڑوں کی توہین کرتا ہے نہ ان کے مذہبی کاموں میں رخنے ڈالتا ہے، نہ ان کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کرتا ہے، نہ کسی کو بجبراً مسلمان بنالینے کی اجازت دیتا ہے اور وہ دوسروں سے بھی یہی رواداری چاہتا ہے، اسی لیے اسے یہ گوارا نہیں کہ کوئی طاقت اپنی طاقت کے زعم میں مسلمانوں کو اسلام کی تبلیغ سے روکے یا الٹے زبردستی غیر مسلم بنالے یا جو اپنی آزاد مرضی سے مسلمان ہونا چاہے اسے مسلمان نہ ہونے دے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر دوسرے مذاہب کے ماننے والے بھی اپنے اندر اتنی سی رواداری پیدا کرلیں تو مذہب کی وجہ سے کسی طرح کی ہنسا اور تشدد نہیں ہوسکے گا۔

دینِ کامل اور اس کی معین صورت

صوفی نذیر احمد کاشمیری

فاقم وجھک للدین حنیفا فطرت اللہ التی فطر الناس علیھا لا تبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون ۔" (القرآن)

(اپنی پوری ہستی کو کامل یکسوئی سے دین کی طرف کر دے ۔ (یہ دین) وہ فطرتِ انسانی ہے، جس پر اللہ پاک نے نوعِ انسانی کو پیدا کیا ہے ۔ اللہ کی اس پیدائش میں تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے ۔ لیکن اکثر لوگ اسے نہیں جانتے ۔)

دینِ انسانی اخلاقی و روحانی قدروں پر مشتمل ہے اور یہ مستقل اقدار ہیں جن میں تغیر و تبدل کی گنجائش نہیں ہے، اور کج فطرت انسان اس بات کو نہیں جانتے ۔

حیوانی جبلت (جسے حیوانی شعور کہنا چاہیے) صرف مفید و مضر کی تمیز کرتی ہے، اسی پر اس کی بقا کا دارومدار ہے اور یہ جبلت اپنی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے زیادہ تر جبر و اکراہ، لوٹ کھسوٹ اور مار دھاڑ سے کام لیتی ہے قانونی و غیر قانونی صحیح و غلط اور نیک و بد طریق کار کا حیوانی جدوجہد میں نام و نشان نہیں ہے ۔ یہ وہ چیز ہے جسے حیوانی لاء آف جنگل (Law of Jungle) کہا جاتا ہے ۔

اس کے مقابل فطرتِ انسانی وہ اخلاقی شعور و احساس ہے جو انسان کو مفید و مضر کی حیوانی جبلت کے علاوہ نیک و بد اور خبیث و طیب کے امتیاز کا پابند کرتا ہے یہی اخلاقی شعور دینِ انسانی کی کل حقیقت ہے اور شرافتِ انسانی کی کل بنیاد ہے ۔ اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے، اس لیے کہ اسے

انانیت کی اکثریت مطلقہ نہیں جانتی جیسا کہ قرآن مجید کا بیان ہے۔

دینِ انسانی کے متعین اصول:

(۱) توحیدِ خدا۔ اس کائنات کا خالق وہ ہستی مطلق ہے جو تمام اخلاقی صفاتِ کمال سے متصف ہے اور ہر نقص و زوال سے پاک ہے۔ انسان کا اس ہستی مطلق سے دعا و مجاہدے کے ذریعہ رابطہ ہم پہنچانا عبادتِ خداوندی ہے۔ " الدعاء ھو العبادۃ " (دعا ہی عبادت ہے) ، الدعاء مخ العبادۃ" (دعا عبادت کا مغز ہے) لہذا دین کے معنی کلی ریاست بتانا جیسا کہ مشہور مفکر ہیگل نے کیا ہے اور ایسے ایک عالمگیر نظام فکر و عمل بنا کر دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور پوری کائنات کو بھی کا کر دیا ہے ایک باطل خیال ہے، اور اس کی دینی تعبیر و تشریح کر کے اسی کلی ریاست کو دین کے نام پر رواج دینا "کل باطل" کو کل حق کی جگہ رائج کرنے کے مساوی ہے اور مطلق ایک غیر اخلاقی (Secular) نظام ہے اور فطرت انسانی کے اخلاقی شعور کے بجائے جبلت حیوانی کے غیر اخلاقی شعور مفید و مضر پر مبنی ہے۔ لہذا وہ قطعاً غیر اخلاقی وغیر دینی نظام ہے اور اخلاقی ذرائع کے ذریعہ چلنے کے بجائے وہ جبر و قہر، مکر و فن، مکاری و دغابازی سے چلتا ہے۔ کیمونزم نے جس طرح تمام اخلاقی ذرائع کا انکار کر کے اور ساری دنیا میں انسانوں کو فوجی قطار بندی میں جکڑ کر ساری دنیا کو دارالحرب بنا دیا ہے اور وہ کسی وقت بھی جوہری جنگ شروع کر کے نوع انسانی کو ایک بھولا بسرا خواب بنا سکتا ہے۔ اس پر نظر رکھی جائے اور کلی ریاست کے فلسفے کو کل کفر قرار دیکر اس سے کامل اجتناب کیا جائے۔
جماعتِ اسلامی اور اس کی قسم کی متعلقہ تنظیموں سے درخواست ہے کہ وہ اس کفرِ عالمگیر (کلی ریاست) کو دینِ انسانی قرار دینے کے مغالطے اور سراب سے یکسر باہر آجائیں۔ اور فطرتِ انسانی کی جو تشریح اسلام نے کی ہے۔ اور جسے عالمگیر نظام اخلاق کہنے کے سوائے کوئی چارہ نہیں ہے، اسے پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ قبول کر لیں۔ دینِ انسانی صرف اخلاقی و روحانی فطرتِ انسانی کا نام ہے اور وہ ساری کائناتِ انسانی کے لیے ایک ہے۔ ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاعبدون ، ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاتقون کان الناس امۃ واحدۃ ......

(یہ پوری کائناتِ انسانی ایک ہی امت ہے، اور میں تمہارا پروردگار ہوں پس میری عبادت کرو... مجھ ہی سے ڈرو۔)

اخلاقی و روحانی اقدار کا فرق :

انسان کا شعور نیک و بد جب اپنی تربیت و تقویت کے لیے خالق کائنات کی صفات کمال سے بذریعہ عبادت اپنا رابطہ قائم کرتا ہے تو اسی مقام پر اسے انسانی روحانیت کہا جاتا ہے۔ انی وجہت وجہی للذی فطر السموات والارض حنیفاً وما انا من المشرکین۔ میں اپنی پوری ہستی کو اس ذات کی طرف کامل یکسوئی سے متوجہ کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔ یہ ہے انسانی روحانیت کی پوری حقیقت۔ انسان کی اخلاقی صلاحیتوں کی تربیت کا ذریعہ یہی توجہ الی اللہ ہے۔

اور جب اس شعور نیک و بد پر تمام انسانی تعلقات کی بنیاد قائم کی جائے تو پھر یہ اخلاقی اقدار کہلاتا ہے اپنی ماہیت کے لحاظ سے چیز ایک ہی ہے مگر ایک رخ پر کام کرتے ہوئے اسے روحانیت اور دوسرے رُخ پر کام کرتے ہوئے اسے اخلاقیت کہا جاتا ہے

عام کائنات سے انسانی تعلق کی نوعیت :

انسان جب اپنی مادی بقا کا سامان کرنے کے لیے کائنات کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس مقام پر وہ معاملہ انسانی معیشت کہلاتا ہے اور اس معیشت کے لیے مل جل کر کام کرنے کو انسانی معاشرت کہا جاتا ہے۔ انسانی روحانیت، انسانی اخلاقیت، انسانی معیشت اور انسانی معاشرت کی مختصر حقیقت یہ ہے اور اسلام نے ان چاروں چیزوں کی بحیثیت ایک نظام کے کامل ترین شکل معین کی ہے اور چونکہ آج اسلام اپنی صحیح اور جامع شکل میں برسر عمل نہیں ہے۔ اُدھر آج ساری انسانیت کو اپنی مادی بقا کے لیے بھی اس عالمگیر و متوازن اور مبنی بر اعتدال نظام کی ضرورت ہے لہٰذا امت اسلامیہ کے تمام علماء و صلحا کا فرض ہے کہ وہ اسلام کی عالمگیر تجدید کا سامان کریں اور ہر قسم کے تفرقے کو چھوڑ کر اجتماعی اعتصام بحبل اللہ کریں۔ چونکہ امت کے ہر فرد کا انفرادی فرض ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا اجتماعی فرض بھی اعتصام باللہ ہے لہٰذا اس طرف امت کا متوجہ ہونا عین وقت کی بات ہے۔

مجھے آج کائنات انسانی نارِ نمرود کی بھٹی محسوس ہو رہی ہے جس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے لہٰذا

(باقی ص ۴۵ پر)

ایک نقطۂ نظر قسط نمبر (۲)

دورِ حاضر میں اسلام کی تعبیر و تشریح

ڈاکٹر مقتدیٰ احسن ازہری

آج کچھ لوگ یہ تمنا کرتے ہیں کہ موجودہ دور میں اسلام کی ایسی تشریح و تعبیر ہو جس سے جدید تعلیم یافتہ اور باشعور طبقہ مطمئن ہو جائے۔

یہ ایک بجا تمنا ہے، تمنا کے باب میں چونکہ ہر شخص کو آزادی ہے۔ اس لیے ہم تو یہ تمنا کرتے ہیں کہ دین سے بیزاری اور دینی اقدار کے سلسلہ میں تشکیک و استخفاف کے اس دور میں کوئی ابن حنبلؒ اور ابن تیمیہؒ پیدا ہوتا، اور اسلام کے دامن سے شرک و بدعت اور رسم و رواج کے غباروں کو جھاڑ کر اس کی وہ تصویر دنیا کے سامنے پیش کر دیتا جو عصرِ نبوت اور عصرِ صحابہ میں تھی، اس طرح شریعت کے ان احکام کو تقویت حاصل ہو جاتی جن کو آج کے دور میں ناقابلِ اطمینان تصور کیا جاتا ہے۔

قرآن کریم میں جہاں پر محکم اور متشابہ آیات کا ذکر ہے وہاں پر ان دونوں اقسام سے متعلق انسانوں کے بھی دو موقف بتائے گئے ہیں، ان پر غور کرنے سے اسلامی احکام سے متعلق اپنے موقف کو متعین کرنے میں ہمیں رہنمائی ملتی ہے۔ شریعت کا منشا یہ ہے کہ جن احکام پر انسان کا دل مطمئن ہو جائے اور جن پر ایسے اطمینان نہ ہو دونوں پر عمل کرتا رہے، ساتھ ہی خدا سے انشراح قلب اور دینی مسائل میں بصیرت کے لیے دعا کرتا رہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ اسے فکری کجی سے محفوظ رکھے۔

قرآن کے مذکورہ بیان میں ہمیں بڑے لطیف انداز سے تعلیم دی گئی ہے اور انسانوں کے ایک طبقہ کی

نفسیات کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ انسانوں میں کچھ لوگ دل کی کجی اور انحراف کے باعث شریعت پر عمل کی توفیق سے محروم رہتے ہیں۔ ان کی نظر صاف اور واضح احکام پر کم جاتی ہے۔ اس کے برخلاف جن مسائل میں کسی طرح کی پیچیدگی ہو، ان کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور اس کے لیے بحث وتحقیق وغیرہ الفاظ کا سہارا لیتے ہیں۔

آج شریعت کے جن احکام و تعلیمات کی مصلحتیں بالکل واضح ہیں اور یہ بھی عیاں ہے کہ انسانی معاشرہ کو ان کی شدید ضرورت ہے، ان پر مذکورہ قسم کے لوگوں کی توجہ نہیں جاتی بلکہ وہ ان مسائل کو کریدنے میں معروف ہیں جن میں آراء کا اختلاف اور دلائل میں پوشیدگی ہے۔ مثال کے طور پر اسلام کی اقتصادی تعلیمات کو لیجیے۔ آج اقتصادی موضوعات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ہر شخص معاشرہ کی خوشحالی و فارغ البالی کی تمناؤں کا اظہار کرتا ہے غریبوں کے ساتھ ہمدردی و تعاون کی باتیں ہوتی ہیں اور معاشرہ کے مجبور لوگوں کو ضمانتیں فراہم کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں لیکن اس سلسلہ میں اسلام نے جو اصول پیش کیے ہیں، اقتصادی گتھیوں کو جس طرح سلجھایا ہے اور باہمی ہمدردی و تعاون کے لیے جو خطوط متعین کیے ہیں ان کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔

صحابہ کرام کی زندگیوں سے ہمیں ان تعلیمات کو عملی جامہ پہنانے کے اسلوب کا علم ہوتا ہے۔ لیکن ہم ان واضح تعلیمات کو جن کا معاشرہ سخت محتاج ہے نظر انداز کرکے ان امور پر نظر رکھے ہوئے ہیں جن کا حل کرنا ہمارے بس سے باہر یا کم از کم مشکل ہے، یقیناً یہ فکر و نظر کا قصور اور دین برحق کی اہمیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔

اقتصادی نظام ہی کی طرح اسلام کا اخلاقی اور معاملاتی نظام بھی ہے۔ فکر آخرت، خدا ترسی اور تقویٰ شعاری کے جو اصول اسلام نے مقرر کیے ہیں۔ آج معاشرہ کو انھی کی ضرورت ہے۔ مگر افسوس ہے کہ دور رس نتائج کے حامل ان اصول و احکام پر جن سے معاشرہ کی اصلاح یقینی ہے، ہم توجہ نہیں کرتے اور نادر الوقوع مسائل کو جن کے سلسلہ میں نقطۂ نظر مختلف ہیں لے کر اسلامی نظام کی مناسب حال تشریح و تعبیر کی توقع رکھتے ہیں۔

... ...

سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی کے دور میں انسانی معاشرہ کو نت نئے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان مسائل کے پیش آنے کے بعد اسلام پر عمل کا جذبہ رکھنے والے یہ چاہتے ہیں کہ شریعت کی روشنی میں ان کا حل تلاش کیا جائے تاکہ لوگ آسانی کے ساتھ اسلام پر عمل کرسکیں۔

جن مسائل کا جواب کتاب و سنت یا اجماع و قیاس میں صراحۃً مل جائے ان پر عمل ضروری ہے۔

جن مسائل کا جواب نہ مل سکے ان کے لیے اجتہاد کا حکم ہے۔ مجتہد کے لیے کچھ ضروری شرائط ہیں اگر وہ کسی عالم دین میں موجود ہوں تو اس کو اجتہاد کا حق حاصل ہے۔ روز بروز پیش آنے والے مسائل کا کتاب وسنت کی روشنی میں حکم معلوم کرنا اجتہاد ہی کے ذریعہ ممکن ہے۔ اجتہاد صرف انھی مسائل میں ہوسکتا ہے، جن کا حکم شریعت سے معلوم نہیں، اگر حکم معلوم ہو تو پھر اجتہاد کی ضرورت ہی نہیں۔ یہ عین ممکن ہے کہ مجتہد اپنے اجتہاد کے اندر شریعت کے مقصد کو حاصل کرلے اور یہ بھی احتمال ہے کہ اجتہاد کے ذریعہ مسئلہ کا جو حکم اس نے متعین کیا ہے وہ شریعت کی منشا کے مطابق نہ ہو۔ بہر صورت مجتہد کسی بھی حال میں اجر سے محروم نہ ہوگا۔ البتہ پہلی صورت میں اس کو دوہرا اجر ملے گا اور دوسری صورت میں اس کو صرف ایک اجر ملے گا۔

ہندوستان میں جب سے پرسنل لا کا موضوع زیر بحث آیا ہے، مختلف تحریروں میں اس پہلو پر بھی اظہار خیال کیا گیا ہے کہ کیا حالات کی تبدیلی سے اسلامی شریعت کے احکام بھی بدل سکتے ہیں؟ اس موضوع پر علماء دین اور جدید تعلیم یافتہ دونوں طبقے کے لوگوں نے لکھا ہے۔ بعض تحریروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ لوگوں نے ذہن میں یہ تصور قائم کر لیا ہے کہ جن مسائل کے جوابات کتاب وسنت کی صریح عبارتوں میں موجود ہیں ان میں بھی تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ اسی تصور کی بنا پر یہ مطالبہ سامنے آتا رہتا ہے کہ اسلام کا فلاں حکم موجودہ حالات میں مناسب نہیں، اس لیے اس میں تبدیلی ہونی چاہیے۔

حالانکہ شریعت کا یہ ضابطہ ہے کہ غور وفکر کی گنجائش صرف انھی احکام میں ہے جو اجتہادی ہیں اور اس شرط کے ساتھ کہ شریعت کے عام مقصد اور اس کی روح کے خلاف کوئی فیصلہ نہ ہو، اگر کسی اجتہادی مسئلہ کا شریعت کے عام مقاصد سے تعارض ہو تو ایسے اجتہادی مسئلہ پر عمل کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

اس لیے ایسے نئے مسائل کا جن کے جواب میں ادلہ شرعیہ خاموش ہیں۔ اجتہاد کے ذریعہ حل تلاش کیا جائے اور ان شرائط کی رعایت کرتے ہوئے جن کا ذکر فن کی معتبر کتابوں میں موجود ہے۔

اسلامی تاریخ میں بعض ایسی مثالیں موجود ہیں جن سے آج لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ حالات وزمانہ کی تبدیلی سے شرعی احکام میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔ یہ خیال دقت پسندی سے عاری ہے۔ پیغمبر کے بعد شریعت کے کسی حکم میں کسی بھی وقت تبدیلی کا سوال نہیں۔ حکم وہی رہے گا۔ البتہ تبدیلی ہوگی تو فتوی میں ہو سکتی ہے نہ کہ حکم میں۔

اس سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعض فیصلوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کے فیصلوں سے یہ مدعا ثابت

نہیں ہو سکتا، حضرت عمر رضؓ کے مذکورہ فیصلوں سے متعلق امت کا رویہ کیا ہے، اس موقف سے ہم کیا نتائج اخذ کر سکتے ہیں اور خود حضرت عمر رضؓ نے بعد کے دور میں اپنے فیصلوں سے متعلق کیا تاثر دیا ۔۔۔ ۹۔ یہ سب ضروری سوالات ہیں جن کے جواب کے بغیر ان کے موقف سے کسی طرح کا استدلال صحیح نہیں۔

ہندوستان میں جب مسلم پرسنل لا میں مداخلت کا سوال اٹھا تو مداخلت کے حامی افراد نے یہ بھی کہا کہ متعدد مسلم حکومتوں نے اپنے پرسنل لا میں تبدیلی کرلی ہے۔ مثلاً مصر، شام اور لیبیا وغیرہ۔ اس لیے ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو اسے قبول کرلینا چاہیے۔

بات اگر پاس خاطر کی ہوتی تو ضرور مسلمان یہ مشورہ قبول کرلیتے لیکن یہاں تو دین و شریعت کا سوال ہے۔ جس میں کسی امتی کے لیے منصوص مسائل میں دم مارنے کی گنجائش نہیں۔ رہیں مسلم حکومتیں تو ان کے ایسے کام جو کسی شرعی حکم کے خلاف ہوں یا وہ کام جن پر کتاب وسنت سے دلیل نہ ہو ہم ماننے کے پابند نہیں۔ ہمارے سامنے اگر حکومتوں کے بجائے علماء اور دینی حلقوں کی آراء پیش کی جائیں تو ممکن ہے سند بن جائیں، لیکن حکومت کا موقف سند نہیں بن سکتا۔ البتہ اس کو ذکر کرکے جاہل عوام سے سیاسی مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اور یہ ہو رہا ہے۔

کسی قانون کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرنے یا کسی قانون میں تبدیلی کرنے کا سوال کب اور کیوں پیدا ہوتا ہے۔۔۔ اگر اس پر غور کرلیا جائے تو بہت سی الجھنیں دور ہو سکتی ہیں، عام انسانی قوانین کی طرح کیا اسلامی احکام بھی رد و تغیر کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ بات ان احکام کی ہے جو شرعی ادلہ سے ثابت ہوں، کسی مجتہد کے اجتہاد کا نتیجہ نہ ہوں۔

اس موقع پر میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے مصر کے نامور دبالغ نظر عالم مرحوم عبدالقادر عودہ کی کتاب التشریع الجنائی کے مطالعہ کی گزارش کروں گا جس میں اسلامی احکام پر بحث کرتے ہوئے اس دور کے ان انگریزی و فرنچ قوانین سے ان کا تقابل کیا گیا ہے، جن پر مصری عدالتوں میں اسلامی احکام کو چھوڑ کر عمل کیا جا رہا تھا، اس تقابل سے جو نتائج برآمد ہوئے وہ ان تمام لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہیں جو آج اسلامی احکام کی جدید تعبیر و تشریح یا ان میں مناسب حال تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ مذکورہ کتاب میں فاضل مصنف نے بڑی عرق ریزی سے اسلامی احکام و غیر اسلامی قوانین کی جزئیات کے مابین تقابل کرکے اسلامی احکام کی برتری و دوام کو ثابت کیا ہے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ جس طبقہ کو اس طرح کی تحقیقی کتابوں کے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے اس کے لیے زبان کا مسئلہ رکاوٹ بنتا ہے۔ کیونکہ مذکورہ نوعیت کی کتابیں بالعموم عربی میں ہوتی ہیں۔

مصر ہی کی ایک اور مثال عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی کی لہر جس طرح ہندوستان میں چلی تھی اسی طرح مصر میں بھی عوام کو یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی تھی کہ خاندانی منصوبہ بندی کے بغیر معاشرہ کی فلاح و بہبود ممکن نہیں۔ چونکہ آواز حکومت کی طرف سے اٹھائی گئی تھی۔ اس لیے علماء کے ایک طبقہ نے بھی ہمنوائی کی اور منصوبہ بندی کو شریعت میں جائز قرار دیا۔ لیکن دوسرے طبقہ نے جو اکثریت میں تھا، صاف طور پر اعلان کر دیا کہ اس طرح کا اقدام اسلام میں جائز نہیں اور نہ انسانی بہبود و خوشحالی سے اس کا ایسا تعلق ہے جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔

توجیہ و دلیل تو ہر طبقہ نے پیش کی تھی، لیکن منصوبہ بندی کے حامیوں کی طرف سے پیش کی جانے والی باتیں دلیل کی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔ پھر بھی بحث عرصہ تک چلتی رہی۔ اسی دوران اس مسئلہ میں ایک فیصلہ کن موڑ اس طرح پیدا ہوا کہ مصر کے ماہر اجتماعیات ڈاکٹر علی عبدالواحد وافی نے بعض رسالوں میں ایک مضمون شائع کیا، جس میں اعداد و شمار کے ذریعہ خاندانی منصوبہ بندی کو مصر کے لیے غیر ضروری بلکہ مضر قرار دیا۔ موصوف کا استدلال یہ تھا کہ منصوبہ بندی کے حامیان' افراد کی زیادتی کی بات کر رہے ہیں اور اسی بنیاد پر منصوبہ بندی کو رائج کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ مصری قوم کو ابھی مزید افرادی طاقت کی ضرورت ہے، اس کے بہت سے منصوبے محض افراد کی کمی کے باعث رکے ہوئے ہیں۔ موصوف نے اپنے مضمون میں مصری اخبار الاہرام سے ایسے اعداد و شمار اور خبروں کے اقتباسات پیش کیے، جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ مصر میں مختلف منصوبوں کی تکمیل کے لیے مزید افراد کی ضرورت ہے۔

مذکورہ اقتباسات اور اعداد و شمار کے بعد اس دلیل کی کوئی قیمت نہیں رہ جاتی، کہ افراد کی زیادتی کے باعث منصوبہ بندی ضروری ہے۔ ہمیں اس وقت اس دلیل یا دیگر موافق دلیلوں پر اظہار خیال کرنا مقصود نہیں، بلکہ صرف یہ عرض کرنا چاہتے ہیں کہ کس طرح ایک خلاف واقعہ بات کو پھیلا دیا جاتا ہے اور ہر آدمی اسے صحیح سمجھنے لگتا ہے۔ اگر ڈاکٹر صاحب موصوف نے اپنے مضمون کے ذریعہ مذکورہ حقیقت واضح نہ کی ہوتی تو بہت سے لوگ تاریکی میں رہتے۔ اسی طرح ان بہت سے دلائل کا حال ہے جنھیں اسلامی احکام میں تبدیلی کا مطالبہ کرنے والوں کی جانب سے پیش کیا جاتا ہے۔ لیکن ضرورت اس بات کی ہوتی ہے کہ موضوع کا مختلف حیثیتوں سے جائزہ لینے والا آدمی بابصیرت ہو۔

... ...

(باقی آئندہ)

دار الحدیث رحمانیہ دہلی

(مرحوم)

محمد فاروق اعظمی جلگاؤں

دار الحدیث رحمانیہ دہلی (مرحوم) آزادی سے پہلے متحدہ ہندوستان کا ایک ایسا واحد سلفی ادارہ تھا جسے اللہ تعالیٰ نے ایسی مقبولیت اور مرکزیت عطا کی تھی کہ ملک کے کونے کونے سے آلمہ پایان شوق اس چشمۂ علم کی طرف رُخ کرتے اور سیراب ہو کر نکلتے تھے۔ اس ادارہ نے بڑے بڑے صاحب فضل و کمال پیدا کیے ہیں جن کے بوریائے فقر کی بلندی، مسندِ شاہی سے کم نہ تھی، مگر افسوس کہ تقسیم ہند کے بعد علم و فن کا یہ مرکز غیروں کے غاصبانہ قبضہ میں چلا گیا اور تاریخ کا ایک دور مکمل ہو گیا۔ حیرت ہے کہ ایسے عظیم ادارہ کی کوئی باقاعدہ تاریخ مرتب نہ کی جا سکی اور نہ ہی اس کے علماء و فضلاء کا کوئی باقاعدہ تذکرہ ہی لکھا جا سکا[۱] جس سے آنے والی نسلیں اپنے اسلاف کے علمی کارناموں سے واقف ہوتیں۔ ماضی قریب میں علماء اہلحدیث نے جو گرانقدر علمی، تحقیقی، اصلاحی و تبلیغی خدمات انجام دی ہیں اور غیر شرعی رسم و رواج اور شرک و بدعت کے مٹانے میں جو اہم رول ادا کیا ہے وہ ہماری تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔ یہ حقیقت اس وقت اور سنگین اور دلخراش بن جاتی ہے، جب دوسرے تذکرہ نویس ہندوستان میں علمی و اصلاحی کارناموں کا تذکرہ کرتے وقت علماء اہلحدیث کی خدمات کا مکمل بلیک آؤٹ کر جاتے ہیں۔ اور تحریک اہلحدیث بالکل لوزائیدہ اور یتیم معلوم ہونے لگتی ہے۔ کاش ہمارے علماء و اکابرین کو

[۱] چند برس ہوئے مولوی بدر الزماں نیپالی سلفی نے (جو اب مدینہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں) اس موضوع پر کچھ کام کیا تھا اور غالباً اب بھی ان کا یہ شغل برقرار ہے۔ اللہ توفیق مزید دے۔ "ادارہ"

اس تلخ حقیقت کا احساس ہوا اور وہ اپنی تاریخ و تحریک کا موثر طریقہ سے تعارف کرانے کے لیے خود اپنے قلم کو جنبش دیں۔ جماعت کے کتنے ہی علماء و فضلاء ایسے گزرے ہیں جن کی علمی وجاہت کے سامنے آسمان کی بلندیاں سرنگوں ہیں، معمولی سی تحقیق و تفتیش سے درجنوں ایسے گوہر سطح آب پر لائے جا سکتے ہیں جو اپنی ذات سے ایک انجمن تھے اور جن کی تحریروں اور تقریروں نے اس بزم میں رزم اور رزم میں بزم کی شان قائم کر رکھی تھی۔

جب میں نے مدرسہ دار الحدیث رحمانیہ دہلی اور اس کے نامور فضلاء کے بارے میں کچھ مواد فراہم کرنے کی کوشش کی تو مجھے سخت دشواری ہوئی۔ اس سلسلہ میں میں نے محدث کبیر حضرۃ الشیخ مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی حفظہ اللہ سے اپنے ارادے کا اظہار کیا تو انھوں نے بڑی شفقت اور خندہ پیشانی سے میری رہنمائی فرمائی اور استفادہ کے لیے رسالہ محدث دہلی کی پرانی فائلیں بھی فراہم کر دیں۔ جس کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوئی کہ ماضی قریب میں جماعت کے بعض دردمندوں کو اس بات کی سخت تشویش تھی کہ اکابر علماء اہلحدیث ایک ایک کر کے اٹھتے جا رہے ہیں ان کی جگہ لینے والا کوئی نہیں ہے تعلیم و تعلم کے سلسلے ٹوٹ رہے ہیں اور ملک کے طول و عرض میں کوئی ایسی مثالی و معیاری سلفی درس گاہ نہیں جہاں باقاعدہ تعلیم و تربیت کا نظم ہو اور آنے والی نسلوں کو اپنے اسلاف کی نیابت اور عامۃ المسلمین کی قیادت کے لیے تیار کیا جا سکے۔ لہٰذا حافظ مولانا عبدالعزیز صاحب رحیم آبادی (مرحوم) نے دہلی کے رئیس کبیر جناب شیخ عبدالرحمن کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ شہر دہلی میں ایک ایسی مرکزی درس گاہ کا قیام عمل میں لایا جائے جو اس خلاء کو پُر کر سکے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس تجویز کے محرک مولانا ابراہیم صاحب سیالکوٹی تھے اولیت جس کو بھی حاصل ہو، یہ حقیقت ہے کہ اول روز ہی سے یہ دونوں حضرات اس تحریک کے حامی، موئید اور فعال رکن رہے اور اپنے تعاون و اشتراک سے اس تحریک کو تقویت پہنچاتے رہے۔

مدرسہ کے قیام کی تجویز گویا اک ندائے غیبی تھی جو حاجی شیخ عبدالرحمن صاحب کے قلب و جگر میں اتر گئی۔ آپ نے بسر و چشم اسے قبول فرمایا۔ بلا کسی تاخیر کے اسے عملی جامہ پہنانے کے لیے ہمہ تن مصروف و منہمک ہو گئے، چونکہ آپ دلی کے رؤسا اور شرفاء میں سے تھے اور حکام بالا تک رسائی اور اثر و رسوخ کافی گہرا تھا۔ لہٰذا مدرسہ اور مسجد کے لیے گورنمنٹ سے مفت زمین حاصل کر لی۔ اور اسی وقت تعمیری سلسلہ شروع ہو گیا۔ آپ کے بھائی شیخ عطاء الرحمن چونکہ آپ کے کاروبار میں برابر کے شریک تھے اس لیے ان دونوں کے مشترکہ سرمایہ سے دار الحدیث کی خوشنما عمارت ۱۳۳۹ھ مطابق ۱۹۲۱ء میں تقریباً ایک لاکھ کے کثیر سرمایہ سے بنکر تیار ہو گئی۔ افسوس کہ اس ادارہ نے ابھی

زندگی کا ایک سال بھی پورا نہیں کیا تھا کہ حاجی شیخ عبدالرحمٰن صاحب اس ادارہ کا سارا بوجھ اپنے لڑکے حاجی عبدالستار اور اپنے بھائی شیخ عطاء الرحمٰن کے سر ڈال کر راہیِ ملکِ عدم ہو گئے۔ مزید افسوس کہ حاجی عبدالستار صاحب بھی عین عالمِ شباب میں رحلت کر گئے اور ساری ذمہ داری شیخ عطاء الرحمٰن صاحب پر آ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بانیِ مدرسہ حاجی عبدالرحمٰن صاحب مرحوم کی ساری توانائیاں، صلاحیتیں، وسائل حتی کہ ان کی عمرِ عزیز اسی کارِ خیر کی منتظر تھی۔ ادھر مدرسہ کا قیام عمل میں آیا اُدھر آپ نے دعوتِ اجل کو لبیک کہا۔ اللہم اغفرلہ وارحمہ۔

دار الحدیث رحمانیہ دہلی ایک شخصی ادارہ تھا جس کے تمام اخراجات کے متکفل حاجی عبدالرحمٰن اور ان کے خاندان کے لوگ تھے۔ کسی عالم کو کسی قسم کا چندہ کرنے کے لیے نہ کہیں بھیجا جاتا تھا اور نہ اسے چندہ کی اجازت تھی۔ اس سے علماء کا وقار بھی قائم تھا اور ادارہ کی شان بھی باقی تھی۔ اسی لیے نظم و ضبط اور تعلیم و تدریس کا جو معیار قائم ہوا تھا وہ ایسا مثالی تھا جس کی نظیر اس وقت کے متحدہ ہندوستان میں نہیں ملتی تھی۔ اس ادارہ کو مثالی اور معیاری بنانے میں جہاں اس کے لائق اور محنتی اساتذہ کی شب و روز کی عرق ریزی شامل تھی وہیں اس کے مہتمم نے اسے پروان چڑھانے میں اپنا سب کچھ وقف کر دیا تھا۔

شیخ عطاء الرحمٰن صاحب مہتمم ادارہ کا یہ روزمرہ کا معمول تھا کہ صبح فجر سے قبل روزانہ پھاٹک حبش خاں سے مدرسہ رحمانیہ تک پیدل چل کر آتے اور ہاتھ میں ڈھیر سی ریزگاری لیتے آتے جسے فٹ پاتھ کے غریب غرباء اور حاجتمندوں کو رات کے اندھیرے میں تقسیم کر دیتے۔ بارہا ایسا بھی ہوتا کہ گلی کوچے کے بدنام اچکا اور جرائم پیشہ (جو رات کی تاریکی میں راہگیروں کو اپنا شکارِ خاص سمجھ کر اچک لیا کرتے تھے) سے بھی آمنا سامنا ہو جاتا تھا مگر کبھی بھی وہ ان سے تعرض نہ کرتے۔ بس اتنا کہتے "اچھا میاں جی ہیں کیا؟" اور پھر سر جھکائے ندامت اور شرمندگی سے دوسری طرف نکل جاتے۔ مہتمم صاحب موصوف کو ادارہ اور ادارے کے طلبہ اور اسٹاف سے اس قدر والہانہ لگاؤ تھا کہ اپنی زندگی اس کے لیے وقف کر دی تھی۔ صبح سویرے مدرسہ میں پہنچ کر طلباء کے دروازوں پر بہ نفس نفیس دستک دیتے اور نہایت محبت آمیز لہجے میں کہتے "اٹھو بیٹے نماز کا وقت ہو گیا ہے۔" پیار محبت اور دلسوزی کے یہ کلمات ان کے کانوں میں رس گھول دیتے۔ تمام لڑکے بیتابانہ اٹھ بیٹھتے اور نماز فجر کا روح پرور سماں دیکھنے کے قابل ہوتا۔ پھر صبح آٹھ بجے سے شام ۵ بجے تک مدرسہ کے پھاٹک کے پاس چارپائی ڈال کر پڑے رہتے اور ہر طرح کے نظم و نسق اور درس و تدریس کی نگرانی کیا کرتے۔ کیا مجال تھی کہ کوئی لیٹ آتا یا اساتذہ گھنٹی کے

ساتھ اپنے درس میں مشغول نہ ہوتے یا کوئی لڑکا طالب علم ادھر ادھر گھومتا نظر آتا۔ نگرانی کسی ڈکٹیٹر یا مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی نگرانی نہ تھی بلکہ ایک ایسے دل درد مند کا کرشمہ تھا جس کے چشم و ابرو کے اشارے پر مدرسہ کا ذرہ ذرہ حرکت میں آجاتا تھا۔ یہ موصوف کے اخلاص و ایثار اور للہیت کا ثمرہ تھا کہ ہر شخص سراپا علم و عمل بنا ہوا تھا۔

ادارہ میں طلبہ ملک کے گوشے گوشے سے آئے تھے۔ ان میں کم سن بھی ہوتے تھے اور باشعور بھی۔ لیکن وہ یہاں آکر اپنے ماں باپ، بھائی، بہن، دوست، احباب اور وطن عزیز کی محبت رکھتے تھے اور خود مہتمم صاحب ان سے اس طرح خوشدلی اور نرمی سے پیش آتے تھے کہ لڑکوں کو ان سے ایک باپ کی شفقت، جاں نثار بھائی کی محبت اور عزیز دوست کی رفاقت کا احساس بیک وقت محسوس ہوتا تھا۔ طلبہ و اساتذہ کے خورد و نوش اور رہائش کا بہترین انتظام فرماتے تھے۔ غریب و یتیم اور مسکین طلبہ کے ساتھ خصوصی محبت سے پیش آتے تھے۔ اور ان کو مختلف مراعات بہم پہنچاتے تھے۔ جاڑے کے زمانے میں گادی تکیہ اور دو دو لحاف ایک طالب علم کو دیئے جاتے تھے۔ مختلف قسم کے تحائف انعامات اور سہولیات سے ان کو اس طرح نوازا جاتا کہ وہ ہر طرح کی فکروں سے آزاد ہو کر صرف مدرسہ رحمانیہ کے ہو کر رہ جاتے اور پوری دلجمعی اور ذہنی یکسوئی سے تعلیم حاصل کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ دارالحدیث رحمانیہ نظم و نسق درس و تدریس، تعلیم و تربیت کا ایک مینار بن گیا تھا جس کی ضیا پاشی سے شرق و غرب اور شمال و جنوب سبھی جگمگا رہے تھے۔

حضرۃ الشیخ مولانا عبیداللہ صاحب رحمانی نے رسالہ "محدث" دہلی کے شعبان ۱۳۵۲ھ کا وہ شمارہ مجھے مطالعہ کے لیے بطور خاص عنایت فرمایا جس میں ان کے شاگرد رشید مولانا غفار حسن صاحب رحمانی عمر پوری نے دارالحدیث کی تاسیس و تعمیر اور تعلیم و تربیت کا ایک مختصر خاکہ سپرد قلم کیا ہے۔ اگرچہ یہ مضمون جامعہ کی طویل اور ٹھوس خدمات کے پیش نظر بہت مختصر ہے تاہم بہت اہم ہے۔ اسی مضمون میں مولانا موصوف نے اس وقت تک کے فارغ التحصیل رحمانی علماء و فضلاء کی ایک فہرست درج کی ہے جس میں متحدہ ہندوستان کے شمال و جنوب اور مشرق و مغرب کے مختلف صوبہ جات کے تحت ان کی درجہ بندی کی ہے اور آج کے علم و فضل، زہد و تقویٰ تصنیف و تالیف اور دیگر علمی مشاغل کا مختصر حال تحریر فرمایا ہے۔ جس وقت موصوف نے یہ مضمون لکھا تھا دارالحدیث اپنے پورے عروج و شباب پر تھا اور اس کے بعد مزید تیرہ سال تک یہ ادارہ پوری آن بان اور شان سے چلتا رہا یہاں تک کہ ۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کا حادثہ پیش آگیا اور دلی میں بھیانک

فسادات پھوٹ پڑے۔ مدرسہ کی عمارت فرقہ پرستوں کی نظر میں خار بنکر کھٹکنے لگی لہذا مہتمم مدرسہ کو دھمکی آمیز خون پر فون موصول ہونے شروع ہوئے کہ مدرسہ خالی کردیا جائے ورنہ اسے نذر آتش کردیا جائے گا۔ اور بم سے اڑا دیا جائے گا کچھ ایسے ناگزیر حالات پیدا ہوئے کہ مدرسہ بند کرنا پڑا اور اس کے چلانے والے کراچی منتقل ہو گئے۔ یہ ایسا دلدوز حادثہ تھا، جس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ مگر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ لائبریری کی ہزاروں اردو، عربی، اور فارسی کی نادر روزگار کتابوں کو کیوں کر بچایا جائے۔ آخر کار اس وقت جامعہ ملیہ کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین سے رابطہ قائم کرنے کے بعد ان تمام کتابوں کو وہاں منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ مولانا نذیر احمد صاحب رحمانی املوی (مرحوم) اور مولانا حکیم عبید اللہ رحمانی زائے بریلوی نے دل وجگر تھام کر نمناک نگاہوں سے ان تمام کتابوں کو ٹرک میں لاد لاد کر جامعہ ملیہ پہنچایا۔ خدا کے فضل سے اسلاف کی موتی جیسی کتابیں اب بھی محفوظ ہیں، مگر جن حالات میں مدرسہ کو بند کرنا پڑا اس کے تذکرہ سے کلیجہ منھ کو آتا ہے۔ مدرسہ کی عمارتیں آج بھی اپنے ماضی کی شان وشوکت پر آنسو بہا رہی ہیں اور عہد رفتہ کی داستانیں سنانے کے لیے کھڑی ہیں۔ جہاں صبح وشام قال اللہ، قال الرسول کی ایمان افروز صدائیں بلند ہوا کرتی تھیں اب وہاں جن من گن کا قومی ترانہ گایا جا رہا ہے۔ اب یہاں کچھ سرکاری قسم کے آفس اور اسکول چل رہے ہیں، یقیناً اس ادارہ کے در و دیوار ان نفوس قدسیہ کو یاد کر رہے ہوں گے، جنھوں نے اپنے خون پسینہ سے اس خاک کو زندگی اور رعنائی عطا کی تھی۔ اور جن کے دم قدم سے اس کے حسن کی عظمت میں چار چاند لگے تھے۔ انقلاب زمانہ کے ہاتھوں اب سب کچھ مٹ چکا ہے، چند یادگاریں اور یادیں باقی ہیں۔

مدرسہ رحمانیہ نے اپنی زندگی کی کل چھبیس یا ستائیس بہاریں دیکھیں۔ اس دوران میں سیکڑوں طالبانِ علم نے اپنی تشنگی بجھائی، اہلِ ذوق نے روشنی حاصل کی اور حق پسندوں نے حقیقت کا عرفان حاصل کیا۔ اس ادارہ نے صدہا ایسے صاحبِ کمال پیدا کیے، جنھوں نے اپنی تحقیق وتخلیق، تصنیف وتالیف، تدریس وتقریر سے لوگوں کے قلب کو گرمایا اور روح کو تڑپایا۔ ان میں سے بیشتر اپنا سفرِ حیات مکمل کرکے اپنے مولائے حقیقی سے جا ملے اور جو کچھ باقی ہیں وہ چراغِ سحری ہیں نہ جانے کب کوئی ہوا کا جھونکا آئے اور ان کی شمعِ حیات کو گل کر دے انھی میں سے استاذ الاساتذہ محدثِ کبیر حضرۃ الشیخ مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی (حفظہ اللہ) بھی ہیں۔ جن کی ذاتِ گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ نے اپنی تعلیم سے تدریس تک کے قریب پچیس سالہ ایام مدرسہ رحمانیہ کے علمی حرم میں گزارے ہیں، آج بھی وہاں کے شب و روز ان کی آنکھوں میں بسے ہوئے ہیں، جب میں نے ان سے

دریافت کیا کہ مدارس مذکور کا تعلیمی معیار اتنا بلند کیوں تھا اور وہاں سے ہر ذرہ آفتاب بن کر کیوں نکلتا تھا تو جواب تھا کہ وہاں کا نصاب نہایت عمدہ تھا۔ ہر طرح کے افراط و تفریط سے حتی الامکان احتراز کیا گیا تھا، نہ کتب ادب کی فراوانی نہ کتب منطق و فلسفہ کی بھرمار بلکہ ہر فن کے لیے حسب ضرورت مفید کتابیں منتخب کی گئی تھیں۔ مدرسہ کا نصاب سترہ[۱۴] فنون: نحو، صرف، منطق، ادب، حدیث، فقہ، فرائض، اصول فقہ، مناظرہ، اصول حدیث، ہندسہ، عقائد، تفسیر، فلسفہ، عروض، بلاغت۔ ۹ پر مشتمل تھا۔ حدیث کی طرف خاص توجہ دی جاتی تھی۔ دوسری جماعت سے آٹھویں جماعت تک ہر درجہ میں حدیث کی ایک یا دو کتابیں شامل نصاب ہوتی تھیں۔ جماعت پنجم سے لے کر ہشتم تک کے طلبہ کو اوقات مدرسہ میں عام گفتگو عربی میں کرنا لازمی ہوتا تھا، اس کے علاوہ اساتذہ کے انتخاب و تقرر میں مہتمم مدرسہ کی کوششیں بھی قابل ستائش تھیں۔ مخلص اور محنتی اساتذہ کو چن چن کر لایا گیا تھا جو طلباء کی تعلیم و تربیت کے لیے اپنے کو ہمہ تن وقف کیے ہوئے تھے۔ منطق و معقولات کے درس کے لیے بلا امتیاز حنفی، سلفی ملک کے گوشے گوشے سے منجھے ہوئے اساتذہ کو گرانقدر مشاہرہ پر رحمانیہ میں جمع کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ مولانا غلام یحییٰ صاحب مدرسہ الٰہیات کانپور سے بلائے گئے تھے۔ مولانا عبدالحلیم صاحب کو ضلع مردان پشاور سے بلایا گیا تھا۔ مولانا عبدالسلام صاحب آگرہ سے آئے تھے۔ اسی طرح مولانا عبدالرحمٰن صاحب لوالکی فتحپوری سے اور مولانا عبدالرزاق صاحب مدرسہ ضیاء العلوم دہلی سے لائے گئے تھے۔ بعض لائق و فائق اساتذہ کو مختلف علوم و فنون کے جید علماء کی خدمت میں مع مشاہرہ اور دیگر اخراجات کے بھیجا جاتا تھا تاکہ صحیح تربیت اور اچھی مہارت حاصل کر کے مدرسہ کو لوٹیں اور طلبہ کو فیض پہنچائیں۔

مدرسہ میں پڑھنے اور پڑھانے کا ایسا ماحول اور مزاج بنا ہوا تھا کہ طلبہ اور اساتذہ کو دوسرے مشاغل کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہ تھی اور نہ ہی انھیں اس کی اجازت تھی۔ حتی کہ دینی و تبلیغی اجلاس و اجتماعات میں بھی دونوں کی شرکت (باستثناء چند مخصوص حالات) سخت ممنوع تھی۔ نہ کسی استاذ کو اجازت تھی کہ وہ کسی جلسہ یا کانفرنس کی دعوت قبول کرے اور نہ ہی طلبہ کو لے اجتماعات میں جانے دیا جاتا تھا۔ اس میں کئی حکمتیں اور مصلحتیں تھیں اول یہ کہ طلبہ کا درس متاثر نہ ہو۔ عموماً اجلاس میں شرکت کی تیاری پھر سفر سے واپسی کے بعد تکان سفر اور اجلاس کا خمار باقی رہنا ایک فطری امر ہے جس سے فرائض منصبی کی ادائیگی میں فرق آتا ہے۔ اس نقصان سے لڑکے محفوظ رہتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اجلاس میں اعزاز و اکرام اور مالی منفعت کے مقابلہ میں وہ اپنے موجودہ پیشہ کو کمتر اور ہیچ نہ سمجھنے لگیں۔ تیسرے یہ کہ تدریسی اسٹاف کے درمیان رقابت اور حسد نہ پیدا ہو اور کوئی یہ گھٹیا سوچ نہ

نہ مجبور ہو کہ فلاں صاحب مزے سے تقریریں کرتے پھر رہے ہیں اور اپنا پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، بنا رہے ہیں اور ہم یہاں مدرسہ میں سڑ رہے ہیں۔ چوتھے یہ کہ اساتذہ پوری دلچسپی اور ذہنی یکسوئی سے اپنے سبق کی تیاری کے بعد کلاس میں جائیں، اسی طرح طلبہ کی شرکت بھی اس لیے ممنوع تھی کہ اجلاس میں شب بیداری کی وجہ سے صبح سبق میں جی نہیں لگے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اجلاس میں شرکت کے بہانے کچھ لڑکے کھیل تماشے یا سینما دیکھنے چلے جائیں اور ذہنی پراگندگی کا شکار ہوں۔ یہ چند چیزیں اگرچہ بظاہر بڑی معمولی اور ہلکی معلوم ہوتی ہیں مگر ایک ادارہ کی زندگی میں بڑی اہم ہیں۔ اس سے ادارہ کی ڈسپلن، تعلیمی معیار، تدریسی مشن اور اس کے تنظیمی امور کا اندازہ ہوتا ہے۔

جس زمانہ میں جامعہ رحمانیہ سراجِ منیر کی طرح علم کی ضیا پاشی کر رہا تھا پورے ملک میں سیاست کی تند و تیز آندھیاں چل رہی تھیں۔ تحریکِ آزادی پورے شباب پر تھی، ہر طرف تحریکوں اور ہلچلوں کا بازار گرم تھا۔ دلی جو تمام ہندوستان کا دل تھا دانایانِ سیاست اور اربابِ حکومت کی سیاسی سرگرمیوں کا نشیمن بنا ہوا تھا۔ جلسے، جلوس، تحریکیں، ہڑتالیں اور گھن گرج تقریریں یہاں کے گلی کوچوں کا معمول تھیں۔ بڑے بڑے دانائے روزگار رہنما جن کی ایک آواز پر پورا ہندوستان اٹھتا بیٹھتا تھا، یہاں کی گلیوں اور بازاروں کو اپنے سیاسی نظریات کی تبلیغ و اشاعت کے لیے جولانگاہ بنا رکھا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب ملک کے بٹوارے کا انتہائی نازک اور حساس مسئلہ ہر ایک ہندوستانی کے دل میں کچھ نہ کچھ نرم گرم گوشے رکھتا تھا۔ لیکن اس پُر آشوب دور میں بھی جامعہ رحمانیہ کا علمی قلعہ ہر طرح کے خارجی اثرات سے محفوظ تھا کسی کو سیاسی جلسوں میں شرکت کی اجازت نہ تھی نہ کسی قسم کی سیاسی گفتگو کی۔ طلبہ اور اساتذہ کے قلب و نظر کو ایسے سانچے میں ڈھال دیا گیا تھا کہ وہ باہر کے سیاسی ہنگاموں سے بے نیاز ہو کر اپنے مقصد کے حصول میں ہمہ تن مشغول تھے۔

یہ عظیم ادارہ اب تو ایک داستانِ پارینہ بن چکا ہے، مگر پھر بھی اس کی بہت سی اعلیٰ صحت مند تعلیمی سرگرمیاں ایسی ہیں جن سے ہمارے دینی ادارے اپنے لیے نشانِ راہ بنا سکتے ہیں۔"

قسط نمبر (۳)

شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب نجدیؒ

مولانا مدنیؒ کے موقف کے لیے مولانا نعمانی کی معذرت کی حقیقت ؟

مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی ۔ جامعہ فیض عام مئو

کسی شخصیت کے بارے میں اچھی یا بری رائے کی بنیاد اور مولانا مدنی کا ماخذ :

اس بارے میں محترم مولانا نعمانی دامت برکاتہ اصل سوال کا جواب تحریر کرنے سے پہلے تمہید میں لکھتے ہیں کہ

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ کسی شخصیت کے بارے میں اچھی یا بری رائے، اس سے متعلق معلومات اور اطلاعات کی بنا پر قائم کی جاتی ہے ، اور مختلف لوگوں کی معلومات اور اطلاعات کسی شخص کے بارے میں مختلف بھی ہو سکتی ہیں ، اس کی وجہ سے رایوں کا مختلف ہو جانا بھی قدرتی ہے ۔" (ص ۲۵)

مولانا کا یہ کہنا بلا شبہ صحیح ہے ، لیکن بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی ، بلکہ یہ دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے کہ اپنی اطلاعات و معلومات کا ماخذ کس نے کس چیز کو بنایا ہے یا کس نے مستند بنیاد پر رائے قائم کی ہے اور کس نے غیر مستند ذریعہ پر اعتماد کر لیا ہے اور کس حد تک اعتماد قبول کیا ہے ؟

مولانا مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے شیخ محمد بن عبد الوہاب کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے اصل اعتماد ۔ جیسا کہ خود انھوں نے اپنے اخباری رجوع میں صراحت کی ہے ۔ محض افواہوں اور شیخؒ کے مخالفین کے اقوال ، پر کیا ہے ، یعنی مستند ماخذ کی تلاش و تحقیق نہیں کی ہے ۔ حتیٰ کہ اپنے مرشد و مقتدیٰ شیخ المشائخ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی صائب و متوازن اور انتہائی محققانہ و مبصرانہ رائے کو بھی گویا اہمیت نہیں دی ، ورنہ انھوں نے تو نہایت وضاحت و صراحت کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ " شیخ محمد بن عبد الوہاب کے عقائد عمدہ تھے اور مذہب حنبلی تھا " حیرت ہے کہ شیخ المشائخ کی اس محققانہ رائے کے ہوتے ہوئے مولانا محترم نے " افواہوں

اور مخالفین کے اقوال " پر کیونکر اعتماد کیا، اس کی ضرورت اور اس میں مصلحت کیا تھی؟ کسی کے مخالفین کے اقوال اور افواہیں تو اس کے حالات و عقائد کے علم و معرفت کا بہر حال مستند اور قابلِ اعتماد ماخذ نہیں ہیں اور مولانا مدنی نے شیخ الاسلام کے بارے میں جو کچھ بے بنیاد باتیں لکھی ہیں وہ سب اسی غیر مستند ماخذ پر اعتماد کر کے لکھی ہیں۔ " ذاتی مطالعہ و تحقیق " کی بنیاد پر نہیں لکھی ہیں اور نہ لکھتے وقت اس کی ضرورت سمجھی ہے۔ آخر ایسا کیوں؟ محترم مولانا نعمانی مدظلہ نے اس موقف کو درست قرار دیتے ہوئے اس کی جو توجیہ فرمائی ہے وہ یہ ہے:

الشہاب الثاقب کی تالیف کا زمانہ و مقام اور اس کی فضا:

مولانا موصوف احمد رضا خاں بریلوی کی اکابر دیوبند کے خلاف تکفیری مہم اور " حسام الحرمین " کی فتنہ انگیزی اور اس کی تردید میں ان اکابر کی طرف سے تحریری بیانات اور رسالوں کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

" اس سلسلہ میں حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح نے بھی جو اس وقت مدینہ منورہ ہی میں مقیم تھے اور اللہ تعالیٰ کی توفیق و عنایت سے مسجد نبوی میں درس دیتے تھے۔ ایک رسالہ " حسام الحرمین " کی تردید میں لکھا، اسی کا نام " الشہاب الثاقب " ہے ، . . . . . . " مولانا نے " الشہاب الثاقب ۱۳۲۵ھ میں لکھی تھی۔ " (ص ۸۷، ۸۹)

مولانا نعمانی شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی جماعت کے بارے میں حرمین شریفین کی فضا بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

" یہ بات پہلے ذکر کی جا چکی ہے کہ مولانا مدنی کا قیام ۱۳۱۶ھ سے ۱۳۳۳ھ تک مسلسل ۱۷، ۱۸ سال مدینہ منورہ میں رہا۔ " (ص ۸۱، ۸۲) . . . . . . وہاں کے عوام بلکہ خواص بھی (الا من شاء اللہ) " وہابیوں " کو یہود و نصاریٰ اور ہنود و مجوس سے بھی بدتر سمجھتے تھے[1] . . . . . اور " وہابیوں " کے خلاف کیسی ہی غلط اور کتنی ہی لغو و بیہودہ اور ناقابلِ فہم بات کی جاتی بیچارے عوام ہی نہیں بلکہ خواص اور علماء کے ذہن بھی (الا من شاء اللہ) اس کو قبول کر لیتے تھے . . . . . . قدرتی طور پر مولانا کا ذہن بھی اس ماحول اور فضا سے پوری طرح متاثر تھا . . . " (ص ۸۲، ۸۴)

---

[1] اس مبالغے میں مولانا نعمانی کے اختراع پسند دماغ کی جھلک نمایاں ہے۔

مطلب یہ کہ "الشہاب الثاقب" میں مولانا مدنی مرحوم نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خلاف جو "خرافات و افتراءات" لکھی ہیں وہ سب مدینہ منورہ (جہاں وہ مقیم تھے) کی اس مسموم فضا سے متاثر ذہن کا عکس ہے، اس لیے انھوں نے شیخ اور ان کی جماعت اور ان کی دعوت کے خلاف سنگین الزامات لکھتے وقت اگر افواہوں پر (جسے مولانا نعمانی نے "عوامی تواتر" کا ظاہر فریب نام دیا ہے) اعتماد کیا اور شیخ کے حالات وعقائد کی تحقیق وتنقیح نہ کی اور نہ اس کی ضرورت سمجھی تو اس میں وہ بالکل معذور ہیں اور یہ موقف موضوع کی اہمیت ونزاکت کے پیش نظر بھی قطعی غیر ذمہ دارانہ نہیں ہے۔ آیئے ذرا حقائق کی روشنی میں مولانا نعمانی کے اس بیان کا جائزہ لیں۔

الشہاب الثاقب کی تالیف کے وقت مولانا مدنی ہندوستان ہی میں مقیم تھے نہ کہ مدینہ میں

مولانا نعمانی مدظلہ کی مذکورہ بالا تحریروں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ "مولانا مدنی کا مدینہ میں ۱۷، ۱۸ سال قیام مسلسل رہا" اور یہ کہ مولانا مرحوم "الشہاب الثاقب" کی تالیف کے وقت (۱۳۲۸ھ) مدینہ طیبہ ہی میں مقیم تھے۔ مگر یہ دونوں باتیں بلاشبہ غلط ہیں، مولانا مدنی قیام مدینہ منورہ کے دوران دو تین بار ہندوستان آئے تھے۔ حضرت احسان دانش صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"مدینے کے دوران قیام میں یعنی ۱۳۱۸ میں آپ ہندوستان تشریف لے آئے اور دو برس میں واپس مدینہ منورہ چلے گئے۔ پھر سات برس بعد دارالعلوم دیوبند میں مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوا اور دو سال ۱۳۲۹ھ تک درس دیا پھر مدینہ تشریف لے گئے۔ دو سال رہ کر پھر ہندوستان واپس ہو گئے ۱۳۳۵ھ میں شیخ الحدیث (مولانا محمود الحسن گنگوہی) کے ساتھ حجاز میں اسیر ہو کر مالٹا بھیجے گئے۔"[1]

ان سفروں کی تفصیلات خود مولانا مدنی مرحوم نے بھی اپنی خود نوشت سوانح "نقش حیات" میں بیان فرمائی ہے۔ اس میں اس بات کی وضاحت وصراحت ہے کہ مولانا کا سفر ہندوستان دوسری مرتبہ "شوال ۱۳۲۷ھ میں ہوا اور دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت مدرس تقرری ہوئی" اور یہ کہ دارالعلوم میں ایک عرصہ کے بعد ۱۶، ۱۷، ۱۸ اپریل ۱۹۱۰ء مطابق ۱۳۲۸ھ کو جو عظیم الشان جلسہ دستار بندی ہوا مولانا کی بھی اس میں دستار بندی ہوئی ..... اور پھر دو سال بعد ۱۳۲۹ھ میں مدینہ منورہ واپس تشریف لے گئے۔ ملاحظہ ہو "نقش حیات" ص ۱۳۸-۱۴۸

---

[1] ماہنامہ الرشید لاہور ۱۹۷۶ء / ۱۳۹۶ھ "دارالعلوم دیوبند نمبر" ص ۵۰۴

ان اقتباسات سے دو باتیں صاف طور پر معلوم ہوئیں اول یہ کہ مولانا مدنی رح کا قیام مدینہ منورہ میں مسلسل نہیں تھا اور دوم یہ کہ ۱۳۲۸ھ میں جو کہ "الشہاب الثاقب" کی تالیف کا سال ہے مولانا مدنی مدینہ منورہ میں نہیں بلکہ ہندوستان ہی میں مقیم تھے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ یہ کتاب یہیں لکھی گئی ہے۔

اس کا قرینہ بلکہ صراحت خود الشہاب الثاقب میں بھی موجود ہے۔ چنانچہ سبب تالیف بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

"۱۳۲۷ھ میں کہ یہ احقر اپنی لبعض ضروریات ذاتیہ سے وارد دیار ہندیہ ہوا تو دیکھا کہ مجموعۂ دشنام وتکفیر اکابر (یعنی "حسام الحرمین") مع ان مہروں کے طبع کیا ہوا چند جہلا ادھر ادھر لیے پھرتے ہیں۔ عام مسلمانوں کو اہل حق کی طرف سے ورغلاتے ہیں اور بدعقیدہ کر رہے ہیں ..... میں نے مدینہ ہی سے ارادہ کر لیا تھا کہ یہاں پر جو حالتیں "مجدد التضلیل" (یعنی احمد رضا خاں بریلوی) صاحب پر پیش آئی ہیں، ان کو اچھی طرح بیان کر کے مسلمانان اہل ہند پر ظاہر کر دوں ..... اب (یعنی ہندوستان وارد ہونے اور خانصاحب کی پروپیگنڈہ مہم دیکھنے کے بعد) مجھے لازم ہوا کہ ان کی کچی کچی حالت سچی سچی جو کچھ میں نے مشاہدہ کیا ہے یا معتبر ذرائع سے وہاں (یعنی مدینہ منورہ میں) سنا ہے، آپ حضرات سے گوش گزار کر کے ان کی افترا پردازیوں اور بہتانوں بندیوں پر مطلع کروں۔" (ص ۲۲ مطبوعہ کتب خانہ اعزازیہ دیوبند)

کیا یہ عبارت اس بات کی صریح دلیل نہیں ہے کہ "الشہاب الثاقب" ہندوستان ہی میں لکھی گئی ہے۔

انتہائی حیرت کی بات ہے کہ ان صراحتوں کے باوجود مولانا نعمانی نے عذر گناہ بدتر از گناہ کا محاورہ پورا کرتے ہوئے یہ جھوٹا اور غلط تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ مولانا مدنی الشہاب الثاقب کی تالیف کے وقت (یعنی ۱۳۲۸ھ میں بھی) مدینہ منورہ ہی میں مقیم تھے۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مولانا نعمانی کی یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ مولانا مدنی اس وقت ہندوستان ہی میں مقیم تھے اور انھوں نے یہ کتاب یہیں ہندوستان ہی میں تالیف فرمائی تھی۔

اس وقت شیخ کے بارے میں ہندوستان کی فضا:

یہ ثابت ہو جانے کے بعد دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ "الشہاب الثاقب" کی تالیف کے وقت (۱۳۲۸ھ / ۱۹۱۰ء) اگر حرمین شریفین وغیرہ کی فضا شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب رح کے خواہ کتنی ہی خلاف رہی ہو، لیکن وہابی

ایسے رجل رشید، اور مآخذ نایاب نہیں تھے جن کی طرف اگر بغرض تحقیق رجوع کیا جاتا تو جواب ملتا کہ "محمد بن عبدالوہاب کے عقائد اچھے تھے اور مذہب حنبلی تھا۔" بلکہ عالم اسلام کے مسلسل تغیرات اور اہل نجد سے کئی بار کے سابقہ نے اس وقت تک حجاز کی فضا بھی بہت کچھ بدل دی تھی۔ ———— رہا ہندوستان تو اس کی فضا تو بہرحال ایسی تھی کہ یہاں ۱۳۲۸ھ میں اور اس سے پہلے بھی بہت سے ایسے علماء اہل سنت وجماعت (اہل بدعت کو چھوڑیے کہ وہ قابل اعتبار وشمار نہیں) موجود تھے جو شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں نیک گمان رکھتے تھے، انھیں صحیح العقیدہ اور متبع کتاب وسنت سمجھتے اور لکھتے تھے۔ شیخ مشائخ دیوبند مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) کا مذکورہ فتویٰ کہ "محمد بن عبدالوہاب کے عقائد اچھے تھے اور مذہب حنبلی تھا۔" اور محدث و محقق کبیر مولانا محمد بشیر سہسوانی (م ۱۳۲۶ھ) کی تالیف اور نواب والاجاہ (م ۱۳۰۷ھ) (جن پر مولانا مدنیؒ نے بقول مولانا نعمانی صاحب اعتماد کیا ہے) کی وہ تحریریں جن کے اقتباسات ناظرین گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔ ان کی نشر واشاعت ہندوستان ہی کی فضا میں ہو رہی تھی اور اہل علم وتحقیق ان سے ناواقف نہیں تھے۔

اس عہد کے ولی کامل عارف باللہ حضرت مولانا عبدالجبار صاحب غزنوی (م ۱۳۳۱ھ) رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو حجاز و نجد میں شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کے ابناء واحفاد سے ملاقات کی اور وہاں سے ان لوگوں کی کتابیں لائے اور ان کی طباعت اور نشر واشاعت کا انتظام کیا۔[1]

شیخ الاسلام کی شاہکار تصنیف "کتاب التوحید" اور اس کا ترجمہ دونوں ۱۳۲۸ھ کے برسوں پہلے ہندوستان میں شائع ہو چکے تھے۔ ترجمہ مشہور اہلحدیث عالم وادیب مولانا عبدالحلیم شررؒ (م ۱۳۴۵ھ/۱۹۲۶ء) نے کیا تھا، جو اس کتاب کا غالباً سب سے پہلا ترجمہ ہے۔[2] اشاعت کا اہتمام مولانا تلطف حسین عظیم آبادی نے کیا تھا۔ مولانا نے لکھا ہے کہ میری بہت دنوں سے خواہش تھی کہ "کتاب التوحید" کا اصلی نسخہ شائع کروں اور مولوی فضل بدایونی جو جعلی کتاب التوحید چھاپ کر لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے اس کا جواب بھی ہو جائے۔[3]

---

[1] محمد بن عبدالوہاب (تالیف احمد عبدالغفور عطار) اردو ترجمہ از شیخ الحدیث مولانا ابو القاسم محمد عبدہ الفلاح، حرف آغاز از مترجم (ص ۷) شائع کردہ "ادارۃ العلوم الاثریہ" لاہور۔

[2] اس کا ایک دوسرا ترجمہ ممتاز عالم دین و محقق مولانا محمد بن یوسف سورتیؒ (م ۱۳۶۱ھ) کا کیا ہوا ہے جو مطبوعاً دستیاب ہے۔

[3] کتاب التوحید و ترجمہ کتاب التوحید مطبوعہ ۱۳۰۰ھ مطبع فاروقی دہلی۔

اسی طرح "کتاب التوحید" کی مشہور اور جامع شرح "فتح المجید" جس میں تمام مسئلوں پر سیر حاصل بحث ہے۔ اور ایک دوسری شرح "الدر النضید" ۱۳۱۱ھ (مطبع الفاروقی دہلی) میں اور ایک اور شرح "فتح اللہ الحمید" ۱۸۹۴ء (امرتسر) میں چھپ گئی تھیں۔[1]

نیز شیخ الاسلام کی حمایت و مدافعت اور ان کے مخالفین کی تردید میں بعض ضخیم اور محققانہ کتابیں شائع ہو چکی تھیں، جیسے محدث و محقق مولانا محمد بشیر سہسوانیؒ کی مشہور و مقبول کتاب "صیانۃ الانسان عن وسوسۃ الشیخ دحلان" (مطبوعہ ۱۸۹۰ء مطبع فاروقی دہلی) اور شیخ سلیمان بن سحمان نجدیؒ کی کتاب "البیان المبدی لشناعۃ المجدی" (مطبوعہ ۱۸۹۷ء امرتسر)۔[2] شیخ الاسلام کے خلاف غلط بیانیوں کی زیادہ اشاعت مکہ مکرمہ کے شیخ احمد زینی دحلان (م ۱۳۰۴ھ) کی کتابوں نے کی تھیں اور مخالفین کا بڑا ماخذ یہی تھیں۔ مذکورہ بالا کتابیں انھی مخالفین کے جواب اور ان کے اتہامات کی تردید میں ہیں۔ نیز ان کے اندر شیخ کے عقائد اور ان کی دعوت کے نیک اثرات و نتائج کا بھی تذکرہ ہے۔

اسی طرح شیخ کے ایک مخالف داؤد بن جرجیس بغدادی (م ۱۲۹۹ھ) کی کتاب "صلح الاخوان" کا جواب "منہاج التقدیس والتاسیس فی کشف شبہات داؤد بن جرجیس" جو شیخ عبداللطیف آل الشیخ (م ۱۳۰۲ھ) کا تالیف کردہ ہے۔ بمبئی میں ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا تھا۔[3]

غرض یہ سلسلہ اشاعت و حمایت ۱۳۲۸ھ یعنی "الشہاب الثاقب" کی تالیف سے مدتوں پہلے شروع ہو چکا تھا۔ جو پورے تسلسل کے ساتھ جاری رہا لیکن یہاں نہ اس سلسلہ کے تسلسل کو بیان کرنا ہے نہ ۱۳۲۸ھ تک شیخ الاسلام کے متعلق شائع شدہ کتب و رسائل کا استقصاء مقصود ہے۔ بلکہ صرف یہ دکھانا ہے کہ اس وقت شیخ الاسلام کے بارے میں ہندوستان کی فضا کیسی تھی؟ یکطرفہ مخالف تھی یا موافق بھی؟ تو اوپر جو کچھ بیان کیا گیا وہ یہ اندازہ کرلینے کے لیے ناکافی نہیں کہ اس وقت شیخ کے بارے میں ہندوستان کی فضا یکسر مخالفانہ نہیں تھی۔ بلکہ اگر ایک طرف ان کی مخالفت اور ان کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جا رہا تھا تو دوسری طرف علماء کرام کی ایک جماعت کی جانب سے ان کی موافقت اور حمایت و مدافعت اور ان کے مخالفین کی تردید بھی کی جا رہی تھی۔ یعنی فضا یہ نہیں تھی کہ صحیح العقیدہ علماء و خواص بھی عموماً شیخ کے خلاف پروپیگنڈے سے،

---

[1] محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم و بدنام مصلح ص ۱۴۳ [2] ایضاً ص ۱۹۸، [3] ایضاً ص ۱۹۷۔

متاثر اور اتنا متاثر رہے ہوں اور ہوتے چلے جاتے رہے ہوں کہ شیخ اور ان کے متبعین کے خلاف کیسی ہی غلط بات اور کتنی ہی لغو و بیہودہ اور ناقابل فہم بات کہی جاتی اس کو مولانا مدنی کی طرح بلا تحقیق قبول کر لیتے تھے۔ بلکہ واقعات کی شہادت یہ ہے کہ اس طرح کی غلط فہمیوں کی اشاعت کرنے اور اس میں مبتلا ہونے والوں کے پہلو بہ پہلو ان غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے والے اور شیخ کو صالح، متبع کتاب و سنت، داعی توحید اور قاطع شرک و بدعت سمجھنے اور بتانے والے اور اس کی اشاعت کرنے والے بھی کم نہیں تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ واضح اور دو ٹوک الفاظ میں یہ حقیقت سن لیجیے کہ اس وقت شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خلاف پروپیگنڈے کی مہم السی احمد رضا خاں اور ان کے پیشواؤں اور متبعین کی جماعت نے چلا رکھی تھی، جس کے جھوٹ کو بھسم کرنے کے لیے مولانا مدنی نے "شہاب ثاقب" کے نام سے ایک بھڑکتا ہوا شعلہ تیار کیا تھا، ورنہ علمائے اہلحدیث کرنے جن کے علمی اور تحقیقی کارناموں کی گونج اس وقت پورے ہندوستان میں سنائی دے رہی تھی شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں اصل حقائق کو اس طرح نکھار کر بے نقاب کر دیا تھا کہ کسی طالب حقیقت کے لیے بھٹکنے اور ٹھوکر کھانے کا سوال ہی باقی نہیں رہ گیا تھا۔ مگر ستم ظریفی دیکھیے کہ مولانا مدنی نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں ان رضا خانیوں کے بیان پر تو اعتماد کر لیا جن کا جھوٹ بھسم کرنے اٹھے تھے لیکن ان حقائق کو درخور اعتنا نہ سمجھا جنھیں علماء ثقات نے نکھار کر پیش کیا تھا۔ اور اس پر مزید ستم ظریفی یہ کہ ہمارے مولانا نعمانی صاحب ان سارے حقائق کو نظر انداز کر کے اس وقت کی فضا کا نقشہ اپنے اختراع پرداز ذہن کے بل بوتے پر کچھ اور ہی بتلا رہے ہیں۔

یعنی ۱۳۲۸ھ میں اور اس سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی علماء مسلک حق بلا شبہ بڑی تعداد میں موجود تھے جن کی تحقیقات اس کے بالکل برعکس تھیں جس کا مظاہرہ الشہاب الثاقب میں کیا گیا ہے۔ مزید برآں آل سعود کی نشاۃ ثانیہ حرمین کی طرف ان کی پیش قدمی اور حرمین پر تسلط کے بعد اصلاحی اقدامات کے سلسلے میں جن اکابر علماء نے آل سعود کی حمایت و وکالت کی اور مخالفین کے مقابل محاذ آرا ہوئے آیا وہ تمام اکابر و اہل علم اس سے پہلے شیخ الاسلام کے مخالف اور مولانا مدنی وغیرہ کی طرح غلط فہمیوں میں مبتلا رہے تھے اور اچانک ان کے خیالات میں تبدیلی آئی تھی اور شیخ کے ہمنوا و حامی بن گئے تھے؟ یا واقعہ یہ ہے کہ وہ حضرات پہلے ہی سے شیخ کے موافق اور حامی اور موید تھے؟ اگر وہ حامی و موید تھے تو مولانا مدنی نے ان کی حمایت و تائید کا سبب جاننے کی ضرورت کیوں نہیں سمجھی؟ کیا کسی ثقہ عالم کو یہ زیب دیتا ہے کہ پیش پا افتادہ حقائق کو نظر انداز کر کے سواد بافواہوں پھر

اپنی تالیف کی بنیاد رکھے۔؟

اہل علم یہ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ جماعت اہلحدیث شیخ الاسلام کے بارے میں شروع ہی سے مجموعی طور پر خوش گمان اور عمدہ خیالات کی حامل رہی ہے بعض علماء نے ایک دو مسئلے میں اپنے اختلاف کا اظہار ضرور کیا، لیکن ان اکا برنے بھی ۔ جہاں تک میرا علم و مطالعہ ہے ۔ شیخ کی طرف وہ خرافات و افتراءات منسوب نہیں کیں جو عموماً مخالفین کی کتابوں میں پائی جاتی ہیں یعنی انھوں نے شیخ کو بدعقیدہ، فاسق، مخالف اہل سنت و جماعت وغیرہ نہیں لکھا ہے۔ نواب صاحب کے خیالات تو آپ گزشتہ صفحات میں پڑھ ہی چکے ہیں۔

جماعت اہلحدیث کو اہل بدعت ہی نہیں اہل دیوبند بھی شیخ محمد بن عبدالوہاب کا پیرو قرار دیکر "وہابی" کہتے رہے اور کہتے رہتے ہیں۔ اس کی بنیاد سوا اس کے کہ اہلحدیث شروع سے شیخ کے ہم خیال و ہمنوا اور ہم اعتقاد رہے ہیں، اور کیا ہے۔ [1]

مسطورہ بالا تفصیلات سے یہ معلوم ہوا کہ مولانا مدنیؒ نے جس وقت "الشہاب الثاقب" لکھی اور اس میں شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کے خلاف بہت سی "خرافات وافتراءات" بلا تحقیق و ثوق کے ساتھ لکھ دیں اُس وقت یعنی ۱۳۲۸ھ میں نیز اس کے ماقبل و مابعد زمانوں میں شیخ الاسلام کے بارے میں ہندوستان کی فضا (جہاں الشہاب الثاقب کی تالیف کے وقت مولانا مدنی مقیم تھے) یکسر شیخ کے خلاف نہیں تھی۔ بلکہ ان کے بارے میں موافق و مخالف دونوں ہی قسم کی رائیں پائی جاتی تھیں اور مخالف رائے عموماً ان لوگوں کی تھی جو خود مولانا مدنی کی نظر میں بھی قابل اعتماد نہ تھے۔ یہ تھی شیخ کے بارے میں ہندوستان کی واقعی فضا۔ اس سے مولانا نعمانی بھی بلا شبہ بخوبی واقف ہیں۔ اگر ان کا اشہب قلم اس حقیقت کو بیان کرنا چاہتا تو زیادہ واضح، مفصل اور مدلل لکھتا لیکن اس صورت میں مشکل یہ ہوتی کہ مولانا مدنی مرحوم نے "الشہاب الثاقب" میں جو کچھ لکھا ہے، اسے قابل فہم قرار دینا آسان نہیں ہوتا۔ شاید اسی لیے مولانا نعمانی نے اس فضا کو شیخ محمد بن عبدالوہاب کے تقریباً یکطرفہ خلاف

---

[1] اور اہلحدیث کو جو "وہابیت" سے انکار رہا ہے اور آج بھی ہے تو اس معنی میں کہ "وہابی" یعنی شیخ محمد بن عبدالوہاب کے مقلد و پیرو نہیں۔ وہابیت بمعنی "تقلید محمد بن عبدالوہاب" سے برائت اور شیخ کے بارے میں خوش اعتقادی اور ان کی موافقت و حمایت دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ اہلحدیث بلا شبہ شیخ کیا کسی ایک امام کے بھی مقلد نہیں ہیں لیکن شیخ ممدوح کو قدر و عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور ان کو مجدد دین سمجھتے ہیں۔

اور تیرہ و تاریک دکھانے کی کوشش کی تاکہ مولانا مدنیؒ کی زیرِ بحث تحریروں کے لیے "معقول عذر" اور ان کی الزام تراشیوں کے لیے "وجہ جواز" فراہم ہو سکے۔ والعلم عند اللہ۔

تحقیق کی ضرورت :

جب شیخ الاسلام کے بارے میں ہندوستان کی فضا وہ تھی جو اوپر بیان کی گئی اور آپ کی شخصیت بہرحال ایک مختلف فیہ شخصیت تھی تو ایسی فضا اور ایسے ماحول میں موضوع کے متعلق اظہارِ رائے کرتے وقت مولانا مدنی کا محض افواہوں اور مخالفین کے اقوال اور ان کے یکطرفہ مخالفانہ بیان پر پورا اعتماد کر کے سارا وزن ان کی مخالفین کے حق میں ڈال دینا اور انتہائی بیہودہ الزامات کو پورے اطمینان و وثوق کے ساتھ شیخ پر عائد کر دینا اور ذاتی طور پر صحیح حالات کی تحقیق و جستجو نہ کرنا بلکہ اس کی ضرورت ہی نہ سمجھنا، درست نہیں کہا جا سکتا یہ بہرحال غیر معقول اور خلافِ اصول ہے کہ کسی مختلف فیہ شخصیت کے بارے میں صرف اس کے مخالفین کی باتوں پر کلی بھروسہ کر کے اس کے خلاف اطمینان کے ساتھ ناشائستہ رائے قائم کر لی جائے۔

غرض یہ کہ شیخ کے بارے میں مسطورہ بالا حالات اور موضوع کی اہمیت و نزاکت بہر صورت اس بات کی حتمی طور پر مقتضی تھی کہ ان کے مخالفین کی ہمنوائی و موافقت اور ان کی پروپیگنڈہ مہم میں شمولیت سے پہلے حقیقتِ حال کی تحقیق و تنقید مستند مآخذ سے کر لی جاتی۔ کسی شخص کے مخالفین کے اقوال یا افواہیں اس کے صحیح حالات و عقائد کی معرفت و علم کا قابلِ اطمینان و وثوق ماخذ ہرگز نہیں ہیں۔

مولانا مدنی مرحوم نے بعض مآخذ مثلاً مولانا رشید احمد گنگوہی کے فتاوی اور نواب صاحب مرحوم کی تحریروں کی طرف رجوع بھی کیا تو وہاں سے صرف وہی باتیں قبول فرمائیں جو شیخ کے خلاف تھیں اور جو کچھ ان کے حق میں تھا اسے شائستہ اعتنا و قبول نہیں سمجھا۔ جیسا کہ گزشتہ صفحات میں ناظرین ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

تحقیق کی گنجائش :

مولانا مدنی نے "الشہاب الثاقب" کی تالیف کے وقت اگر شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کے حالات و عقائد کی تحقیق و تنقیح کرنی چاہی ہوتی تو یہ ان کے لیے اس وقت ناممکن یا مشکل نہیں تھی۔ مذکورہ بالا مآخذ ان کی

نظر میں تھے اور خود شیخ کی کتاب "التوحید" اور اس کی شرح "فتح المجید" (جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے) ہندوستان میں بھی اس وقت شائع ہو چکی تھیں اور مولانا کی دسترس سے باہر نہیں تھیں۔ "الشہاب الثاقب" میں توسل کی بحث میں مولانا مرحوم کے اندازِ تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ "وہابیوں" کے متعدد رسائل موصوف کی نظر سے گزر چکے تھے، چنانچہ تحریر فرماتے ہیں:

"یہ مقدس اکابر (علماء دیوبند) ہمیشہ اولیاء کرام و انبیاء عظام سے توسل کرتے رہتے ہیں اور اپنے مخلصین کو اس کی ہدایت کرتے ہیں، جس کو وہابیہ مثل شرک ناجائز و حرام جانتے ہیں . . . وہابیہ کے متعدد رسائل اس بارے میں شائع ہو چکے ہیں جس میں وہ صراحۃً توسل از حضرت سرورِ کائنات علیہ السلام کو نیز توسل بالاولیاء الکرام کو منع کرتے ہیں، جس کا جی چاہے تحقیق کر لے۔"
(ص ۵۶، ۵۷)

اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا مرحوم پہلے ہی وہابیوں کے متعدد رسائل کا مطالعہ فرما چکے تھے اور ان سے وہابیوں کے نظریۂ توسل کی تحقیق کر چکے تھے۔ معلوم نہیں شیخ الاسلام اور ان کے اصحاب کے وہ کون سے رسائل مولانا کو دستیاب ہوئے تھے جن میں صرف توسل کا مسئلہ اس انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ جس سے فسق و بدعقیدگی اور انکارِ شفاعت وغیرہ کے جو الزامات وہابیوں پر لگائے جا رہے تھے ان کی نفی و تردید کا کوئی اشارہ نہیں مل سکتا تھا اور ان الزامات کو ان پر پورے وثوق کے ساتھ چسپاں کر دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ بہرحال مولانا نے جس طرح مسئلہ توسل کی تحقیق کر لی تھی ویسے ہی دوسرے مسائل کی بھی وہابیوں کے رسائل حاصل کر کے تحقیق و تنقیح کر لینی ناممکن نہیں تھی . . . . . "وہابیوں" کی دعوت کا مرکز نجد، ہندوستان سے دور سہی، مدینہ طیبہ سے بہت دور نہیں تھا، جہاں مولانا ایک عرصہ قیام پذیر رہے وہ اگر نجد تشریف نہیں لے جا سکتے تھے تو اہلِ نجد تو مدینہ منورہ آتے جاتے رہتے تھے اور مولانا کو ان سے ملاقات اور گفتگو کا موقع بھی ملتا تھا (جیسا کہ "الشہاب الثاقب" ص ۶۶ سے اشارہ ملتا ہے) ان "نجدی وہابیوں" سے ان کے شیخ کے حالات و عقائد معلوم کیے جا سکتے تھے، یا ان پر لگائے گئے الزامات کی تحقیق کی جا سکتی تھی۔ (جیسا کہ حضرۃ الامام عبدالجبار غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے حج کے موقع پر کیا تھا۔ کامر)

تحقیق کی ضرورت وگنجائش کے باوجود تحقیق نہ کرنا غلطی ہے :

مولانا نعمانی مدظلہ نے مولانا مدنی رح کا دفاع اور شہاب ثاقب کی تالیف کا پس منظر بیان کرتے ہوئے اس پر بہت زور دیا ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی رح نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں شہاب ثاقب میں جو کچھ لکھا ہے اس کی بنیاد ذاتی تحقیق ومطالعہ پر نہیں تھی۔ یعنی اس لیے مولانا مدنی کا موقف قابل فہم ہے اور انھیں دوش نہیں دیا جاسکتا ــــ مگر ناچیز اپنی خردگی اور علمی بے مایگی کے پورے احساس اور مولانا مدنی کے علمی مقام ونیک نیتی کے پورے اعتراف کے باوجود یہ عرض کرنے کی جرأت کرے گا کہ جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا "الشہاب الثاقب" کی تالیف کے وقت شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں جو فضا تھی کیا اس بات کی ضرورت تھی کہ ممدوح پر مخالفین کے لگائے گئے سنگین الزامات اور خرافات وافترارات کو قبول کرنے اور ان کو قطعیت کے ساتھ شیخ کی طرف منسوب کرنے سے پہلے ان کی تحقیق وتنقید کرلی جاتی، بلاشبہ اس کی ضرورت تھی اور یہ کام ناممکن بھی نہیں تھا۔ اس کے باوجود مولانا مدنی مرحوم نے ان بیہودہ الزامات کو درج کتاب کرتے وقت اور درج کرنے کے بعد بھی کوئی تحقیق نہ کی اور اس کی ضرورت بھی نہ سمجھی تو یہ بہرحال غلطی ہے اس موقف کو درست اور یکسر تسامح اور خطا سے خالی نہیں کہا جاسکتا۔

کسی معاملہ میں کسی بزرگ کی غلطی کو غلطی کہنا اس کی شان میں گستاخی وبے ادبی اور اس کی اہانت نہیں ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے معاملہ میں مولانا نعمانی حضرت قاری طیب صاحب رح کے اقدامات کو ان کی زندگی میں بھی غلط کہتے رہے اور آج (قاری صاحب کی وفات کے بعد) بھی غلط کہہ رہے ہیں ... غلطی تو کسی بھی انسان سے ہوسکتی ہے۔ یہ اس کی فطرت ہے۔ لیکن کسی غلطی کو بیجا تاویل وتوجیہ کے ذریعہ خواہ مخواہ درست اور صواب قرار دینے کی کوشش مناسب ومعقول نہیں ہے۔ وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ بالسوء۔

مولانا مدنی کے تحقیق نہ کرنے کی ایک وجہ :

شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں تحقیق کی ضرورت اور اس کے ممکن ہونے کے باوجود مولانا مدنی مرحوم کی یہ روش کہ نہ تحقیق کی اور نہ اس کی ضرورت سمجھی، اس کی وجوہ خواہ جو بھی ہوں۔ ایک وجہ خود مولانا نعمانی

کی زیرِ نظر کتاب سے سمجھ میں آتی ہے۔

اس کی توضیح یہ ہے کہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ (م ۱۳۵۲ھ) کی تقریرِ بخاری "فیض الباری" میں بھی ایک جگہ شیخ الاسلام کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کے متعلق "بہت سخت اور ناگوار و نامناسب الفاظ میں رائے ظاہر کی گئی ہے"، الفاظ یہ ہیں:

انہ کان رجلا بلیدا قلیل العلم فکان یتسارع الی الحکم بالکفر (ج ۱ ص ۱۷۰) یعنی محمد بن عبدالوہاب بیوقوف اور کم علم شخص تھا۔ اس لیے کفر کا حکم لگانے میں جلد بازی کرتا تھا۔)

محترم مولانا نعمانی کے نزدیک یہ الفاظ ان کے شیخ مولانا کشمیری کے نہیں ہو سکتے، کیوں ..... اس لیے کہ "آپ (یعنی مولانا کشمیری) کے تحقیقی مزاج سے یہ بات بہت ہی بعید ہے کہ کسی شخص کی کوئی تحریر و تصنیف دیکھے بغیر صرف مخالفانہ پروپیگنڈہ سے متاثر ہو کر اس کے لیے "بلید" اور "قلیل العلم" جیسے الفاظ استعمال فرمائیں۔"[1]
(ص ۱۲۵)

اس سے معلوم ہوا کہ مولانا مدنی مرحوم نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کی تحریر و تصنیف کو دیکھے بغیر جو "بلید و قلیل العلم" سے کہیں زیادہ نامناسب و ناگوار الفاظ شیخ کے بارے میں استعمال فرمائے اور ذاتی مطالعہ و تحقیق کی ضرورت انہیں نہیں سمجھی تو اس لیے کہ موصوف کا مزاج تحقیقی نہیں تھا۔

ناقابلِ فہم:

مولانا مسعود عالم ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب "محمد بن عبدالوہاب ایک مظلوم اور بدنام مصلح" کے

---

[1] واضح رہے کہ مولانا نعمانی کا یہ انکار یا استبعاد خلافِ واقعہ ہے۔ کشمیر ہی کے ایک واقف کار جناب ڈاکٹر سید محمد فاروق بخاری شعبہ عربی امر سنگھ کالج سرینگر لکھتے ہیں کہ:
"حضرت شاہ صاحب کی طرف اس موقف کے انتساب کی صحت میں شک کرنا ہمارے نزدیک درست نہیں۔"
(ماہنامہ معارف اعظم گڑھ اپریل ۱۹۸۳ء ص ۲۸۷ حاشیہ ۳)

ص ۱۵۷ کے حاشیہ میں اہلحدیث ہند اور اہل نجد کے مابین "تکفیر و قتال" کے مسئلہ میں اختلاف رائے کا ذکر کیا ہے اور جماعت اہلحدیث کے ایک قدیم رسالہ "اشاعۃ السنہ (شمارہ ۵ جلد ۱۶ سنہ ۱۳۰۱ھ - ۱۸۸۲ء) کے حوالہ سے اہلحدیثوں کا یہ موقف بیان کیا ہے۔

"اہلحدیث ہند وہابیہ نجد سے تکفیر و قتل اہل مخالفین میں مخالف ہیں۔"

محترم نعمانی صاحب اس حاشیہ کو اپنی کتاب کے ص ۱۳۶ میں نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اور یہ بات ناقابل فہم ہے کہ ان اکابر علماء اہلحدیث نے شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی جماعت کے علماء کی کتابیں نہ دیکھی ہوں۔"

جی ہاں! یہ بات یقیناً فہم شریف میں آنے والی نہیں کہ نجد سے دور دراز ملک ہندوستان کے اندر ۱۳۰۰ھ میں بعض علمائے اہلحدیث نے شیخ کی کتابیں نہ دیکھی ہوں۔ لیکن یہ بات یکدم قابل فہم ہے کہ نجد سے قریب ہی مدینہ منورہ میں (جہاں اہل نجد اور شیخ کی جماعت کے لوگ آتے رہتے تھے) ۱۳۰۰ھ میں نہیں بلکہ اس کے پچیس تیس برس بعد بھی ۱۳۲۸ھ میں مولانا مدنی نے جو مدینہ منورہ ہی میں مقیم تھے، شیخ اور ان کی جماعت کے علماء کی کتابیں نہ دیکھی ہوں۔ اس لیے علماء اہلحدیث مذکورہ بالا مسئلوں میں شیخ سے اختلاف کرنے میں معذور ہوں یا نہ ہوں مگر مولانا مدنی مرحوم شیخ کے بارے میں سخت نامناسب و ناگوار اور خلاف واقعہ باتیں پورے وثوق کے ساتھ لکھ دینے اور اس کی اشاعت کرنے میں بہرحال معذور ہیں۔ مولانا نعمانی صاحب! مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ۔ یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے؟ آپ کیسے فیصلے کر رہے ہیں؟۔

تعجب انگیز:

علامہ قاضی شوکانی یمنی رحمۃ اللہ علیہ، شیخ محمد بن عبدالوہاب کی دعوت اخلاص توحید و اتباع شریعت اور اس راستے میں ان کی جدوجہد اور اس کے مبارک اثرات کے معترف اور بڑے قدرداں ہیں، البتہ بعض امور کے متعلق ان کو صحیح اطلاعات نہیں مل سکیں، جس کے وہ خود بھی شاکی ہیں۔ مولانا نعمانی اس سلسلے میں ص ۲۰ پر لکھتے ہیں:

"وہ (قاضی شوکانی) شیخ محمد بن عبدالوہاب کے علاقہ اور مرکز دعوت نجد سے بہ نسبت علماء ہند

کے بہت قریب تھے۔ شیخ محمد بن عبدالوہاب، ان کے فرزندوں اور تلامذہ کی تصانیف کا ان تک نہ پہنچنا تعجب انگیز ہے۔"

جی ہاں! عرض ہے کہ جب بات قرب و بُعدِ مسافت ہی کی ہے تو کیا یمن نجد سے بہ نسبت مدینہ منورہ کے بھی زیادہ قریب ہے؟ یمن میں قاضی شوکانی تک شیخ وغیرہ کی کتابوں کا نہ پہنچنا تعجب انگیز ہے تو کیا مولانا مدنی تک، مدینہ طیبہ میں جو شیخ کے علاقہ اور مرکزِ دعوت (نجد) سے بہ نسبت یمن کے بہت زیادہ قریب ہے ان حضرات کی کتابوں کا نہ پہنچنا تعجب انگیز نہیں ہے؟

یہی دو رخی مولانا نعمانی صاحب نے شیخ دحلان کی (م ۱۳۰۴ھ) کے تعلق سے بھی برتی ہے۔ یعنی شیخ الاسلام کے خلاف شیخ دحلان کے انتہائی مخالفانہ اور افتراء پردازانہ رویہ کو بھی کسی جگہ ناقابلِ فہم اور حیرت انگیز قرار نہیں دیا ہے حالانکہ وہ مکہ مکرمہ کے رہنے والے تھے، کیا ان تک شیخ اور ان کے اصحاب کی کتابوں کا نہ پہنچنا حیرت انگیز نہیں ہے اور ان کا شیخ کی کتابوں کو نہ دیکھنا ناقابلِ فہم نہیں ہے؟

مولانا نعمانی مدظلہ نے اس پر بھی کہیں حیرت و تعجب کا اظہار نہیں کیا ہے کہ علامہ ابن عابدین شامی (صاحب رد المحتار حاشیہ در مختار) متوفی ۱۲۵۲ھ جو قاضی شوکانی متوفی ۱۲۵۰ھ کے معاصر ہیں اور نجد سے تقریباً قاضی صاحب ہی کی جتنی مسافت پر شام کے رہنے والے ہیں۔ انھوں نے بھی شیخ محمد بن عبدالوہاب کے متبعین کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ خوارج کے حکم میں ہیں۔ (جبکہ قاضی صاحب نے اس گمان کی تردید کی ہے) اور یہ کہ وہ اپنے مخالفین کو کافر و مباح الدم سمجھتے ہیں۔" انھی علامہ شامی کے بیان پر اعتماد کر کے مولانا رشید احمد گنگوہی مرحوم نے شروع میں شیخ اور ان کے اصحاب کے بارے میں سخت رائے ظاہر کی تھی۔

عجیب معاملہ ہے کہ شیخ محمد بن عبدالوہاب کے متعلق ہندوستان جیسے دور دراز ملک میں ابتدائی سنین میں بعض امور میں کچھ اہلحدیث لوگوں کو صحیح معلومات کا حاصل نہ ہونا تو ناقابلِ فہم اور تعجب انگیز ہو، لیکن انتہائی قریب رہنے اور بعد کے سنین میں ہونے کے باوجود حنفی علماء کو شیخ کے حالات کا علم نہ ہونا اور ان کی طرف سے شیخ کے خلاف یکسر ناروا مخالفانہ اور متجاہلانہ رویہ اختیار کرنا کسی درجہ میں ناقابلِ فہم اور باعثِ تعجب نہ ہو۔

کہیے مولانا نعمانی صاحب! یہ منطق آپ کے کس "باطنی کمال" کی آئینہ دار ہے؟

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند؟ ... (باقی آئندہ)

بزمِ طلبہ

انسان کی تخلیق بے مقصد نہیں

تحریر:- ڈاکٹر حامد محمود ترجمہ:- فضل اللہ محمد الیاس

انسان کی تخلیق بغیر کسی حکمت عملی اور بغیر کسی مقصد کے نہیں۔ کیوں کہ یہ چیز اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمتِ علیا اور اس کے کمالِ کاملہ کے منافی ہے کہ وہ کسی بھی چیز کو بغیر کسی مقصد کے پیدا کرے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی تخلیق اپنے ہاتھ سے کی ہے اور اسی پر بس نہیں کیا بلکہ فرشتوں کو ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کا سجدہ کرنے کا حکم دیا۔ زمین وآسمان کی چیزوں کو اس کے لیے مسخر کیا۔ بے شمار اور لاتعداد نعمتوں سے نوازا اور تمام موجودات ومخلوقات پر اسے فضیلت بخشی۔ لہٰذا یہ بعید از قیاس ہے کہ یہ تمام چیزیں بغیر کسی حکمت وغایت کے ہوں ورنہ یہ سارا کام بے کار اور لایعنی ثابت ہوگا۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات اس سے بالاتر ہے کہ وہ کسی شے کی تخلیق یوں ہی بے مقصد کرے۔ اللہ کا ارشاد ہے۔ اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيْمِ۔ (یعنی کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ہم نے تم کو فضول پیدا کیا ہے اور تم ہماری طرف نہیں لوٹو گے۔ پس خدا بادشاہِ برحق (ایسے بیہودہ خیال) سے بلند تر ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بڑے معزز تخت کا مالک ہے۔)

نیز فرمایا: اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًى۔ (کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بیکار چھوڑ دیا جائے گا۔)

درحقیقت اگر ہم تخلیق انسانی اور اس کی نفسی، جسمانی، روحانی اور عقلی تکوین میں اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کو بنظر غائر دیکھیں اور اس کے اندر غور کریں تو ہمارے لیے یہ حقیقت آشکارا ہو جائے گی کہ اس کے احساس کی تمام لہریں، دل کی تمام دھڑکنیں اور اس کے جسم کی تمام متحرک رگیں خدا کی اس تخلیق اور تکوین کی حکمت کے شواہد ہیں اور اس بات کے گواہ ہیں کہ اس کے اعضاء وجوارح۔ یوں ہی بیکار نہیں پیدا کیے گئے ہیں۔ چنانچہ اللہ نے آنکھ اس لیے دی ہے کہ اس کے ذریعہ دیکھا جا سکے۔

کان اس لیے دیے ہیں کہ اس سے سنا جا سکے۔ ناک اس لیے دی ہے کہ اس سے سونگھا جا سکے۔ اسی طرح ہاتھ کام کرنے کے لیے اور پاؤں چلنے پھرنے کے لیے دیے ہیں۔ غرضیکہ انسان کا کوئی عضو اور کوئی حس یوں ہی بلا وجہ نہیں پیدا کی گئی ہے۔ اسی لیے اللہ تبارک و تعالیٰ اپنی اس نعمت کا احسان جتاتے ہوئے فرماتا ہے: ـــــــ، أَلَمْ نَجْعَل لَّهُ عَيْنَيْنِ وَلِسَانًا وَشَفَتَيْنِ وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ۔ "۔ کیا ہم نے انسان کے لیے دو آنکھیں، ایک زبان اور دو ہونٹ نہیں بنائے اور اسے ہم نے دو راستے دکھائے۔"

جب یہ بات واضح ہو چکی کہ انسانی ترکیب اور فطرتِ انسانیہ میں ایک حکمت ہے اور اسی طرح یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے کہ انسانی احساسات اور اعضاء و جوارح یوں ہی پیدا نہیں کیے گئے ہیں بلکہ ہر ایک عضو اور حس کے پیچھے کوئی نہ کوئی حکمت ضرور پوشیدہ اور مضمر ہے۔ تو یہ بھی واضح ہو گیا کہ انسان وہی ہے جسے اللہ نے اپنے ہاتھ سے بنایا، اس کے اندر روح پھونکی، اس کی تصویر کشی بڑے اچھے انداز سے کی اور تمام اعضاء و جوارح اور احساسات و ادراکات کو مرکب کر کے ایک ذات بنایا۔ اور اسی کا نام انسان رکھا۔ جب انسان کے ہر عضو اور ہر حس کے پیچھے کوئی نہ کوئی حکمت ضرور پوشیدہ ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ انسان بھی کسی مقصد و غایت کے لیے پیدا کیا گیا ہو۔ کسی حکمت کے پیش نظر وجود میں لایا گیا ہو۔

اب سوال یہ ہے کہ اس کی تخلیق کی غایت کیا ہے؟ اس کے وجود میں کیا حکمت پوشیدہ ہے۔

انسان روئے زمین پر بطور خلیفہ:

قرآن شریف کے اندر اللہ تبارک و تعالیٰ نے تخلیق انسانی کی ایک حکمت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ انسان روئے زمین پر خلیفہ ہے وہ اس زمین کو آباد کرے اور اللہ کے منشا کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس لیے اللہ تبارک و تعالیٰ نے اس زمین کے اندر جو خزانے اور آمدنیاں چھپا رکھی ہیں وہ ان کے اندر تصرف کرے گا اور اللہ نے جو اسے ظاہری اور باطنی نعمتیں عطا کی ہیں۔ ان سے مستفید ہو گا۔ خلافت فی الارض کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے کچھ اصول اور پیغام دے کر انسان کو اس روئے زمین کا سردار بنایا ہے۔ اور اس پیغام کی کچھ ذمہ داریاں اور واجبات ہیں۔

اللہ قرآن شریف کے اندر فرماتا ہے: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً۔ یعنی جب اللہ نے فرشتوں سے کہا کہ میں روئے زمین پر خلیفہ اور جانشین بنانے والا ہوں۔ نیز فرمایا۔ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ۔ اور وہ تمھیں زمین میں خلیفہ بنائے گا تاکہ دیکھے کہ تم لوگ کیسے عمل کرتے ہو۔

نیز فرمایا ہے: " وَهُوَ الَّذِي جَعَلَكُمْ خَلَائِفَ الْأَرْضِ وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِيَبْلُوَكُمْ فِي مَا آتَاكُمْ إِنَّ رَبَّكَ سَرِيعُ الْعِقَابِ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَحِيمٌ " - یعنی اللہ نے تمہیں روئے زمین کا خلیفہ (آگے پیچھے آنے والا) بنایا اور تم میں سے بعض کو بعض پر فوقیت دی تاکہ جو چیز اس نے تمہیں دی ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے۔ بے شک تمہارا رب جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

مسئولیات خلافت:

یہ ہے وہ خلافت جس کے لیے اللہ نے انسان کو منتخب کیا اور بجائے فرشتوں کے انسانوں کو اس کا مستحق گردانا تاکہ وہ دنیا کو آباد کرے اور وہی کرے جسے اللہ چاہتا ہے۔ اور بغیر کسی استبداد اور سرکشی کے اس کی مشیئت کے آگے سر تسلیم خم کرے۔ ارشاد ربانی ہے کہ: " وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ " میں نے جن اور انسان کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔

خلافت برداری کے لیے وسائل عمل:

اللہ رب العزت نے انسان کی مدد بر معونت الٰہیہ کے ذریعہ کی اور اسے ان تمام وسائل اور اسباب سے نوازا جن سے اس کے پیغام کی ادائیگی ہو سکتی ہے اور خلافت کی ذمہ داریاں نبھائی جا سکتی ہیں۔ اس کے لیے ذیل میں چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں تاکہ حقیقت اُجاگر ہو سکے۔

زمین و آسمان کی ہر چیز کو اس کے لیے مسخر کیا۔ یعنی ایسے قوانین کا تابع کیا کہ ان سے انسان کی ضروریات پوری ہوں پھر اس کو ہر طرح کی ظاہری اور باطنی نعمتوں سے نوازا۔ ارشاد ربانی ہے۔ " أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ إِلَّا بِإِذْنِهِ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ " کیا تم نہیں دیکھتے کہ جو کچھ زمین کے اندر ہے۔ اللہ نے اسے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے اور کشتیاں سمندر میں اس کے حکم سے چلتی ہیں۔ اور اللہ آسمان کو زمین پر گرنے سے روکے ہوئے ہے۔ بے شک اللہ لوگوں کے حال پر بڑا مہربان اور رحیم ہے۔ نیز فرمایا: " وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنْبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَؤُلَاءِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ. قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا

اِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۔» اور آدم کو اللہ نے تمام چیزوں کا نام سکھایا پھر فرشتوں کے پاس پیش کرنے کے بعد کہا کہ تم مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ اگر تم واقعی سچے ہو۔ فرشتوں نے کہا تیری ذات پاک ہے، ہمیں صرف اس کا علم ہے جو تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ بے شک تو علیم و حکیم ہے۔

۲۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے روئے زمین پر انسان کے لیے اسباب حیات مہیا کیے۔ چنانچہ زمین کو ان کے واسطے بچھونا بنایا۔ « والارض فرشناها فنعم الماهدون ۔» اور زمین کو ہم نے بچھا دیا ہے، ہم کیسے اچھے بچھانے والے ہیں۔ اور اس کی سیرابی کے لیے پانی کا انتظام کیا، شکم سیری کے لیے کھانے کا انتظام کیا۔ اسی طرح آگ اور ہوا کا انتظام کیا۔ ارشادِ ربانی ہے: اللہ الذی خلق السموات والارض وانزل من السماء ماءً فاخرج بہ من الثمرات رزقا لکم۔ اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ آسمان سے بارش نازل کی اس کے ذریعہ تمھارے لیے رزق ثمرات مہیا کیا۔ نیز فرمایا۔ « ومن آیاتہ ان یرسل الریاح مبشرات ولیذیقکم من رحمتہ ولتجری الفلک بامرہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون ۔» اور یہ بھی اللہ کی نشانی ہے کہ وہ ہواؤں کو (بارش کی) خوشخبری دینے کے لیے بھیجتا ہے اور تاکہ تم کو اپنی رحمت کا مزہ چکھائے اور سمندروں میں کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تاکہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور تم شکر ادا کرو۔

اور اسی طرح اس کو نباتات وحیوانات سے نوازا اور ان سب کو انسان کے لیے مسخر کیا تاکہ لباس فراش اور حاجات زندگی حاصل کر سکے اور یہ سب چیزیں زمین اور جانوروں کے چمڑوں اور اون سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ چنانچہ فرمایا: « واللہ جعل لکم من بیوتکم سکنا وجعل لکم من جلود الانعام بیوتا تستخفونها یوم ظعنکم ویوم اقامتکم ومن اصوافها واوبارها واشعارها اثاثا ومتاعا الی حین ۔» اور اللہ نے تمھارے لیے تمھارے گھروں کو آرام کی جگہ بنایا اور تمھارے لیے چوپایوں کے چمڑے سے ایسے گھر (خیمے) بنائے جسے تم سفر میں اور اقامت کے وقت ہلکا سمجھتے ہو۔ اور چوپایوں کے اون اور روؤں اور بالوں سے تمھارے لیے سامان اور ایک وقت تک تمھارے گزارے کی صورت بنا دی ہے۔ اور اسی طرح اللہ نے اس انسان کے لیے تمام وسائل زندگی اور حاجاتِ حیات کو مسخر کیا۔ مثلاً دن رات کی گردش۔ یعنی خدا نے نہ ہمیشہ رات بنائی اور نہ ہمیشہ دن ہی بنایا۔ بلکہ آرام کے لیے رات بنائی اور معاش کے لیے دن بنایا۔ قل ارأیتم ان جعل اللہ علیکم اللیل سرمدا الی یوم القیامة۔ من الٰہ غیر اللہ یاتیکم بضیاء افلا تسمعون۔ قل ارأیتم ان جعل اللہ علیکم النهار سرمدا

الی یوم القیامۃ من الہ غیر اللہ یاتیکم بلیل تسکنون فیہ افلا تبصرون۔ یعنی آپ کہدیجیے کہ اگر خدا قیامت تک تمھارے اوپر رات ہی بنائے رکھے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو روشنی لا سکے ؟ کیا تم اس کو سنتے نہیں ؟ اور اگر خدا ہمیشہ دن ہی بنائے رکھے تو اس کے سوا کون معبود ہے جو تمھارے سکون کے لیے رات لا سکے ؟ کیا تم بصیرت اور سوجھ بوجھ نہیں رکھتے ۔ ؟

ان تمام وسائل و اسباب کے ذریعہ انسان اپنے پیغام و فرائض کی ادائیگی کر سکتا ہے اور خلافت کی ذمہ داریاں خوب اچھی طرح نبھا سکتا ہے ۔

خلافتِ ارضی انسان اور فرشتوں کے مابین :

اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرشتوں کے بجائے انسان کو روئے زمین کا خلیفہ بنایا اور اسی کو لائق و مناسب سمجھا۔ غالباً اس میں حکمت یہ ہے کہ اگر وہ فرشتوں کو خلیفہ اور جانشین بناتا تو روئے زمین اصلاح و تعمیر کے بجائے خراب و ویران ہو جاتی ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں اور نہ خورد و نوش کی انھیں حاجت ہی پڑتی ہے ۔ اور انھیں جب ان چیزوں کی ضرورت ہی نہیں تو وہ نہ کاشت کاری کرتے نہ زمین سے پیداوار نکالتے اور نہ نباتات وغیرہ کی اصلاح کرتے اور نہ انھیں بوتے ۔ اسی طرح ان کو ٹھنڈی اور گرمی سے بچنے کے لیے لباس کی ضرورت نہیں لہذا وہ نہ شہر تعمیر کرتے اور نہ مکانات بناتے ۔ لیکن اس کے برخلاف ۔ انسان ان تمام چیزوں کا کہیں زیادہ محتاج اور دست نگر ہے ، کیونکہ وہ کھاتا بھی ہے ، پیتا بھی ہے ۔ لہذا اسے کاشتکاری کرنی پڑتی ہے ۔ وہ سوتا بھی ہے اور آرام بھی کرتا ہے لہذا وہ گھر بنانے کا محتاج ہے اور شہر تعمیر کرتا ہے ۔ اس طرح انسان اللہ تبارک وتعالیٰ کی عطا کی ہوئی عقلی صلاحیتوں اور مذکورہ تمام امکانات اور وسائل علم و عمل کے ذریعہ زمین کی تعمیر بھی کر سکتا ہے اور کارِ خلافت بھی انجام دے سکتا ہے ۔ غالباً یہی وہ حکمت تھی جس کی بنا پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرشتوں کے بجائے انسان کو روئے زمین کا خلیفہ بنایا ۔ اللہ نے فرمایا : واذ قال ربک للملئکۃ انی جاعل فی الارض خلیفۃ قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء ونحن نسبح بحمدک ونقدس لک قال انی اعلم ما لا تعلمون وعلم آدم الاسماء کلھا ثم عرضھم علی الملئکۃ فقال انبئونی باسماء ھؤلاء ان کنتم صادقین قالوا سبحانک لا علم لنا الا ما علمتنا انک انت العلیم الحکیم ۔ قال یا آدم انبئھم باسمائھم

فلما انبأھم باسمائھم قال الم اقل لکم انی اعلم غیب السمٰوات والارض واعلم ماتبدون وماکنتم تکتمون ۔" یعنی اے محمد! آپ اس وقت کو یاد کیجیے۔ جب آپ کے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ فرشتوں نے کہا کہ کیا تو ایسے کو خلیفہ بنائے گا جو اس کے اندر فساد مچائے گا۔ اور خونریزیاں کرے گا، حالانکہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ اللہ نے کہا بیشک میں وہ بات جانتا ہوں جسے تم نہیں جانتے۔ اور اللہ نے آدم کو تمام چیزوں کا نام سکھلایا، پھر فرشتوں کے پاس پیش کرنے کے بعد کہا کہ تم مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ اگر تم واقعی سچے ہو۔ فرشتوں نے کہا کہ تیری ذات پاک ہے، ہمیں صرف اس کا علم ہے جو تو نے ہمیں سکھایا ہے بےشک تو علیم و حکیم ہے۔ اللہ نے کہا اے آدم انہیں فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ جب انھوں نے بتادیا تو خدا نے کہا کہ کیا میں نے تم سے کہا نہیں تھا کہ میں زمین و آسمان میں چھپی ہوئی چیزوں کی خبر رکھتا ہوں۔ اور تم جسے چھپاتے اور ظاہر کرتے ہو، اسے بھی جانتا ہوں۔

تب فرشتوں کے لیے یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ انسانوں کو خلیفہ بنانے میں خدا کی کیا حکمت ہے۔

•••

بقیہ ص ۱۳ کا:

امت کے ذمہ داروں کو وقت بے وقت اس طرف متوجہ کرتا ہوں۔ آج بھی اسی نفسیاتی دباؤ کے ماتحت یہ حروف لکھ رہا ہوں اللہ پاک میری اس کوشش کو قبول فرمائے۔ امت کے صالحین اس طرف متوجہ ہوں اور مجھے یسر و آسانی کے ساتھ دارِ آخرت کا ویزا مل جائے۔

" اللھم لا تقتلنی بغضبک ولاتھلکنی بعذابک وعافنی قبل ذالک "

(اے اللہ مجھے اپنے غضب سے قتل نہ کر اور اپنے عذاب سے ہلاک نہ کر اور اس سے پہلے ہی مجھے (ابتلائے حیات سے) عافیت دیدے۔

میں نے امتِ مسلمہ کی صحیح صف بندی کے لیے عمر بھر کوشش کی ہے اور اب جبکہ عملی کوشش سے معذور ہوچکا ہوں تو رات دن اس کے لیے دعائیں مصروف رہتا ہوں لہٰذا اس کے بدلے صالحین امت کا بھی فرض ہے کہ وہ میرے لیے ضرور دعائے مغفرت کریں۔

ھل جزاء الاحسان الا الاحسان " (احسان کا بدلہ احسان ہی ہے)،

•••

عالم اسلام





برونائی

دارالسلام

جزیرہ نمائے ملایا کے مشرق میں جزیرہ بورنیو ایک بڑا اور مشہور جزیرہ ہے۔ اس کا بڑا جنوبی حصہ (کالی منتان) انڈونیشیا میں شامل ہے اور چھوٹا شمالی حصہ ملائشیا کا جز ہے۔ اس کی مستطیل مغربی پٹی ریاست سراواک کہلاتی ہے اور مشرق کا ایک ٹکڑا ریاست صباح کے نام سے معروف ہے جس جگہ سراواک کی سرحد صباح سے ملتی ہے اس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا قطعہ زمین برونائی کے نام سے معروف ہے جس کی شمالی سرحد ساحل سمندر ہے اور بقیہ حصہ نیم بیضوی دائرے کی شکل میں سراواک سے گھرا ہوا ہے۔

اس سال یکم جنوری ۱۹۸۴ء کو اسے برطانوی استعمار سے آزادی حاصل ہوئی اور ۲۳ فروری کو بڑے تزک واحتشام سے جشن آزادی منایا گیا جس میں عالم اسلام کے متعدد اہم سربراہوں نے شرکت کی۔

اس جدید اسلامی مملکت کے سربراہ سلطان معز الدین سرمود احسن ہیں۔ ریاست کا رقبہ ۵۷۶۵ مربع کلومیٹر یعنی ۲۲۲۶ مربع میل ہے۔ یہ ہانگ کانگ سے پانچ گنا اور سنگاپور سے نو گنا بڑا ہے۔ آبادی دو لاکھ ہے، جن میں سے دو تہائی ملائی نسل کے ہیں بقیہ چینی وغیرہ۔ تھوڑے سے شیعہ اور بہائیوں کو چھوڑ کر باقی تمام تر آبادی اہلسنت مسلمانوں کی ہے۔ ۱۹۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق تقریباً سوا اکہتر فیصد باشندے تعلیمیافتہ ہیں۔ ۳۰ فیصد مزدور چینی نسل کے ہیں جو ہانگ کانگ اور سنگاپور سے آئے ہیں اور اب یہیں کی شہریت حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ باہر سے آنے والے یہ غیر مسلم ۲۳۰ افراد سالانہ کے اعتبار سے مسلمان ہوتے رہے ہیں۔

برونائی جاپان کے بعد ایشیا کی دوسری سب سے خوشحال مملکت ہے۔ حکومت فریضۂ حج کے لیے جانے والوں کو

مالی امداد دیتی ہے، جنازے کی تدفین اور مساجد کی تعمیر میں بھی حصہ لیتی ہے۔ یہاں ہر گھر میں کار ہے یعنی ہر چار آدمی پر ایک کار کا حساب پڑتا ہے۔ بنیادی آمدنی پٹرول، گیس، زیرے، لکڑی، اور مرچ مسالے کی ہے، ہوائی جہاز کا سلسلہ ہے مگر ریل نہیں ہے۔ تمام شہر بسوں اور سڑکوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ سرکاری آمدنی ۳۰ کھرب امریکی ڈالر ہے۔ ایک آدمی کی اوسط آمدنی ۲۲ ہزار ڈالر امریکی سالانہ ہے۔ فوج کی تعداد تقریباً چار ہزار ہے۔ تعلیم مفت ہے۔ اور طلبہ ہائی سکول کے بعد مزید تعلیم کے لیے باہر بھیج دیے جاتے ہیں۔ سب سے بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ حکام خصوصاً وزیر تعلیم اور وزیر صحت اسلام کے تعلق کو خاص اہمیت دیتے ہیں۔ اسلامی تحریکات کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اسلامی کاز کے لیے مملکت ان سے بہترین تعلقات استوار رکھے۔

مسلمانوں کے ساتھ کمیونسٹ روس کا رویہ:

روس نے افغانستان پر قبضہ کرکے وہاں جو بے پناہ انسانیت سوز اور ناقابلِ تصور مظالم کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے اس پر صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ بہت سے ایسے کمیونسٹ بھی چیخ پڑے ہیں جو کمیونزم کو انسانی مسائل کا ایک مفید حل سمجھ کر روس کے بڑے سرگرم حامی تھے۔ حال ہی میں بی بی سی لندن نے اپنے ایک نشریہ میں ایک عینی مشاہد کا انٹرویو نشر کیا ہے کہ وادی پنجشیر کے جس حصے میں روسی فوجیں داخل ہوئیں وہاں دیگر مظالم کے علاوہ یہ صدرجہ تکلیف دہ اقدام بھی کیا ہے کہ مسجدوں کو پاخانہ گھر بنالیا ہے اور قرآن مجید کے اوراق سے غلاظت پونچھتے ہیں۔

کمیونسٹوں کی یہ اسلام دشمنی درحقیقت ان کے وجود کا ایک اٹوٹ حصہ ہے۔ چند تاریخی حقائق کو ملاحظہ فرمایئے۔

- کمیونسٹوں نے ۱۹۲۱ء میں جزیرہ نمائے کریمیا (قرم) میں ایک لاکھ مسلمانوں کو قتل کیا۔ ساڑھے آٹھ سو مسجدیں ڈھادیں۔ اس کے بعد وہاں غلے اور خوراک پہنچنے پر ایسی پابندی لگادی کہ تین لاکھ بانوے ہزار مسلمان بھوکوں مر گئے۔ اس کے بعد بھی مسلمانوں کا مسلسل صفایا ہوتا رہا یہاں تک کہ وہاں پچاس لاکھ مسلمانوں میں سے صرف پانچ لاکھ مسلمان باقی بچے۔ پھر ان بچے کھچے مسلمانوں کو بھی اسٹالن نے جلاوطن کرکے سائبیریا کے نامعلوم مقامات پر بھیج دیا جہاں ان کا مکمل صفایا ہوگیا۔

• سٹالن نے قفقاز کے بھی سارے مسلمانوں کو جلا وطن کر کے سائبریا بھیجدیا۔ اور ایک مسلمان بھی باقی نہ رہا۔ وہاں کی ساری مسجدیں ڈھادیں۔ ایک مسجد بھی باقی نہ رہی۔ اگر کوئی مسجد ڈھائی نہ گئی تو اسے جانوروں کے اصطبل اور میل کو دا اور حرامکاری کے اڈوں میں تبدیل کر دیا۔

مغربی ترکستان میں ۱۹۱۹ء میں ساڑھے لاکھ مسلمان قتل کیے گئے اور ۱۹۳۴ء میں ایک لاکھ مارے گئے اور تین لاکھ کو سائبریا جلا وطن کر دیا گیا۔ پھر ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک کے عرصے میں پانچ لاکھ مسلمان یا تو مارے گئے یا سائبریا جلا وطن کیے گئے۔ اس کے بعد ۱۹۵۰ء میں سات ہزار مسلمانوں کو قتل کیا گیا۔ مردم شماری کی رو سے تنہا اسٹالن نے ایک کروڑ دس لاکھ مسلمانوں کو قتل کیا۔ اس طاغوت اکبر سے پہلے اور بعد کے روسی طاغوتوں کے ہاتھوں قتل ہونے والے مسلمانوں کی تعداد الگ ہے۔

اور ادھر چار یا پانچ سال کے عرصے میں افغانستان کے اندر مارے جانے والے مسلمانوں کی تعداد بارہ لاکھ سے اوپر ہو چکی ہے۔ مگر انسانیت کے خلاف اس مسلسل ظلم عظیم کے ٹھیکیداروں بلکہ تاجداروں کی زبانی سنیے۔ ماسکو سے ۱۹۶۷ء میں شائع ہونے والی کمیونسٹوں کی فلسفیانہ لغت میں لکھا ہے کہ:

"اسلام اجتماعی ظلم کو جائز قرار دیتا ہے لوگوں کو انقلابی جدوجہد سے روکتا ہے اور انھیں اخروی سعادت کے احمقانہ انتظار میں الجھائے رکھتا ہے۔" (نعوذ باللہ من ذلک)

کیا کہتے ہیں اس بگلا بھگتی کے!

یہاں یہ ذکر بھی بیجا نہ ہوگا کہ کمیونسٹ تحریک درحقیقت یہودی سکے کا دوسرا رُخ ہے۔ مارکس کا یہودی ہونا تو سبھی کو معلوم ہے۔ پھر جب روس میں کمیونسٹوں کی بالشویک تحریک چلی اور اس کی سات رکنی انقلابی کونسل بنی تو اس میں پانچ یہودی تھے یعنی لینن، ٹروسکی، کامینیف، سوکولنکوف، زینونیف۔ چھٹے شخص یعنی سٹالن کی بیوی یہودی تھی۔ صرف ساتواں شخص یعنی بینوف یہودی نہ تھا۔ پھر روس کی پہلی کمیونسٹ حکومت کے اسی فیصد ارکان یہودی تھے۔ اسٹالن کے دور میں کمیونسٹ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے ۵۹ ارکان میں سے ۵۶ ارکان یہودی تھے اور اب تک اسی طرح کا تناسب چل رہا ہے۔ سابق صدر روس برزنیف کی بیوی یہودی تھی موجودہ صدر اندروپوف کی بھی بیوی یہودی ہے۔ اس کے علاوہ مولوتوف، اندریہ اندرویاف مارشل فوروشیلوف اور نکولائی بولگانی کی بیویاں بالکل یہودی ہیں یعنی کریلا نیم چڑھا گیا ہے مسلمانوں کو ہوش میں آنا چاہیے۔ (المجتمع کویت ۱۰ جون ۱۹۸۴ء الرائد ۱۶ اگست ۱۹۸۳ء)

پاکستان میں اسلامی اجارہ داری کی کشمکش :

امیر جماعت اسلامی پاکستان، میاں طفیل محمد نے کویت کے ہفت روزہ المجتمع (۲۵ رشوال ۱۴۰۲ھ) کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں فرمایا ہے کہ صدر ضیاء الحق جس تصور کے تحت اسلامی شریعت نافذ کرنا چاہتے ہیں وہ اسلام کا ایک غلط اور ناقص تصور ہے کیونکہ وہ نماز روزہ .... وغیرہ وغیرہ کو اسلام سمجھتے ہیں ان کے نزدیک کسی ایسے اسلامی انقلاب کا تصور نہیں جس کے تحت ہر چھوٹے بڑے معاملے میں سماج میں اسلامی شریعت لاگو کی جائے، اس کے برخلاف جماعت اسلامی اور الاخوان المسلمون کے نزدیک اسلام کا ایک جامع تصور ہے اور یہ دونوں جماعتیں اقتصاد، معاملات، سیاست اور نکاح .... وغیرہ زندگی کے تمام دائروں میں اسلامی شریعت کا نفاذ ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک طرف اس ارشاد گرامی پر نظر رکھیے اور دوسری طرف جنرل ضیاء الحق کے اقدامات پر پاکستان میں زکوٰۃ کا نظام نافذ ہو چکا ہے۔ اقامت صلوٰۃ کی مہم جاری ہے۔ بینکوں کا سودی لین دین خاتمے کے قریب ہے یعنی اس سال کے آخر تک ختم ہو جائے گا۔ پورے ملکی قانون کو اسلامیانے کا عمل جاری ہے۔ شریعت بنچ اور قاضی عدالتیں قائم کر کے مقدمات کے فیصلے اسلام کے مطابق کیے جانے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ تعلیمی ڈھانچے میں بنیادی تبدیلی لادی گئی ہے۔ غرض زندگی کے ان تمام عملی میدانوں میں اسلام کے مطابق تبدیلی لائی جارہی ہے جن میں تبدیلی لانا حکومت کا کام ہے۔ مگر میاں طفیل محمد صاحب کی نظر میں یہ سب اسلام کا غلط تصور ہے۔ پھر صحیح تصور کیا ہے وہ میاں صاحب کے دماغ میں ہوگا۔ جو شاید خصوصیت کے ساتھ انھیں پر نازل ہوا ہے۔

ہو نہ گئے یہ کسی اور ہی اسلام کے بانی۔

میاں صاحب کا یہ بھی ارشاد ہے کہ ضیاء الحق اور ان کے رفقاء اسلامی شریعت سے واقف نہیں، اس لیے وہ نفاذ اسلام کی صلاحیت ہی نہیں رکھتے۔ بجا ارشاد ہوا مگر افسوس ہے کہ میاں صاحب نے اپنی واقفیت سے اسلامیانِ پاکستان کو ابتک نہیں نوازا یعنی پاکستان میں طے کیے جانے والے اسلامی قوانین میں سے کسی ایک کے متعلق بھی میاں صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ وہ اسلام کے خلاف ہے۔ (بقیہ ص ۵۶ پر)

ہماری نظر میں

(۱) حسن البیان فیما فی سیرۃ النعمان

تالیف : مولانا عبدالعزیز محدث رحیم آبادیؒ (متوفی ۱۳۳۸ھ/۱۹۱۹ء)

قیمت : بائیس روپئے طباعت : فوٹو آفسیٹ

پتہ : مولانا ثناء اللہ امرتسری اکیڈمی ۴۴۳۳ نئی سڑک دہلی ۶

یاد ہش بخیر مدت ہوئی مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے سوانح حیات پر "سیرۃ النعمان" کے نام سے ایک کتاب سپرد قلم کی تھی، لیکن جیسا کہ معروف ہے امام صاحب کی شخصیت کے بنیادی اجزائے ترکیبی میں بعض نازک اور حساس اجزاء کے نقص کا شدید احساس خود اکابر علماء حنفیہ کو بھی ہے مگر اس نقص کی غطا پوشی کے لیے ان علماء نے جو تدابیر اختیار کی ہیں وہ یقیناً بڑی عجیب اور مضحکہ خیز ہیں ۔ ایک تو امام صاحب کے فضائل و کمالات کے سلسلے میں دیو مالائی اور افسانوی واقعات تصنیف کیے گئے ہیں اور دوسرے اجلاء فقہاء و محدثین کو نہایت گھٹیا اور ناروا تنقید کا نشانہ بنا کر یہ تاثر دیا گیا کہ امام صاحب پر نقد و جرح کرنے والے خود کوتاہ بین ہیں مولانا شبلی مرحوم نے بھی اپنی محولہ کتاب میں ان دونوں ہی تدابیر کو خاصے بڑے پیمانے پر اختیار کیا تھا۔ صحیح بخاری کے تراجم ابواب کے دقائق اور بعض احادیث کے بعض خصوصی اجزاء جو مولانا مرحوم کی سمجھ میں نہ آسکے تھے، انھیں بنیاد بنا کر مولانا نے امام بخاری پر شدید حملے کیے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ امام بخاری فہم و درایت اور فقاہت و اجتہاد کی صلاحیتوں سے کورے تھے، پھر یہ جارحانہ رویہ تنہا امام بخاری ہی کے ساتھ نہ تھا بلکہ اکابر محدثین اور علمائے اصول پر بھی عموماً زباں درازی میں تامل نہ کیا گیا ۔

کتاب کی یہی خصوصیت تھی جس نے اس وقت کے ایک عبقری صفت عالم اور تحریک شہیدین کے چوٹی کے کارکن مولانا عبدالعزیز رحیم آبادی کو متوجہ کیا کہ وہ اس کا جائزہ لیں ۔ موصوف نے "حسن البیان" کے نام سے سیرۃ النعمان کا فاضلانہ تعاقب کیا محدثین کی جانب سے دفاع کا حق ادا کر دیا ۔ مولانا شبلی نعمانی کا

ہ عار تھا کہ انھوں نے اپنی کتاب مورخانہ، مجتہدانہ اور محدثانہ طرز پر لکھی ہے۔ مولانا رحیم آبادی نے نہایت ٹھوس
ہ اہد کی بنیاد پر ثابت کیا کہ مولانا شبلی کی تالیف ان تینوں خصوصیات سے عاری ہے اور انھوں نے ان
ذں میدانوں میں اتنی بڑی بڑی اور فاش غلطیاں کی ہیں کہ صحیح بخاری اور تاریخ فقہائے اسلام کا ایک
بتدی طالب علم بھی ورطۂ حیرت میں پڑ جائے گا۔ حد یہ ہے کہ مولانا شبلی نے امام صاحب کی ایک ایسی
سِ فقہی ترتیب دے ڈالی جس کے اراکین تشکیل مجلس کے وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور ایک دو
پیدا ہو چکے تھے وہ ابھی حدِ بلوغت کو نہ پہنچے تھے۔ خوشی کی بات ہے کہ جب حسن البیان منظرِ عام پر آئی تو
لانا شبلی نے اپنی غلطیاں تسلیم کر لیں اور سیرۃ النعمان کے اگلے ایڈیشن سے انھیں نکال دیا۔ اب اسے صرف
لے ایڈیشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

حسن البیان اگرچہ جواب و تردید میں لکھی گئی ہے مگر اس میں بہت سے بیش قیمت علمی مباحث، فقہاء
دثین کے تذکرے، مسائل کی تحقیق، اہل حدیث اور اہل الرائے کے مذاہب کا فرق اور فقہ حنفی کے پھیلنے کے
جہ اسباب وغیرہ پر بڑی جامع روشنی ڈالی گئی ہے۔ ان مباحث نے کتاب کی مثبت افادی حیثیت کو بہت
ھا دیا ہے اور یہ عوام و خواص کے استفادے کے لیے ایک نہایت درجہ مفید کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔

شروع میں مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی حفظہ اللہ کے قلم سے تقدیم اور مولانا رحیم آبادی کے مختصر
لاتِ زندگی ہیں۔ پھر فاضل جلیل مولانا اسماعیل صاحب گجرانوالہ مرحوم کے قلم سے ۳۹ صفحات کا ایک نہایت
ں اور قیمتی مقدمہ ہے۔ جو اپنے موضوع پر شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے۔ عنوان ہے "مسئلہ درایت و فقہ راوی
ناریخی و تحقیقی جائزہ"، یہ مقدمہ بذاتِ خود ایک مستقل تالیف کی حیثیت رکھتا ہے۔
طباعت اگرچہ فوٹو آفسیٹ ہے۔ لیکن مطلوبہ جاذبیت کسر رہ گئی۔ جو ذرا سی توجہ سے مکمل ہو سکتی تھی۔

۲) حدِ رجم کی شرعی حیثیت :

تالیف : حافظ صلاح الدین یوسف ایڈیٹر الاعتصام لاہور قیمت -/۵۰
ملنے کا پتہ : دار الدعوۃ السلفیہ، شیش محل روڈ لاہور پاکستان

اسلامی شریعت کی مقرر کردہ سزاؤں میں سے حدِ رجم ایک معروف اور مسلمہ سزا ہے، جو عرصہ دراز سے

اسلامی ممالک میں مجبوراً متروک ہے پچھلے دنوں جب پاکستان میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا غلغلہ بلند ہوا تو حدِ رجم کی مشروعیت بھی زیرِ بحث آئی۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کا وہ طبقہ جو تجدد کا شکار ہے اور ہر بات کو مغرب کی عینک سے دیکھنے کا عادی ہے۔ اسی طرح وہ طبقہ جو احادیثِ رسول کو حجتِ شرعی تسلیم نہیں کرتا اور قرآن مجید کی من مانی تفسیر کرنے پر مصر ہے ——— اور یہ بھی اصلاً متجددین ہی کے طبقے کا ایک حصہ ہے ——— ان دونوں کے نقطۂ نظر کے اسباب و وجوہ تو جانے اور سمجھے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان پر کوئی تعجب نہیں۔ البتہ ان لوگوں پر تعجب ہے جو مسائل کو خالص اسلامی بنیادوں پر حل کرنے کے قائل ہیں انھوں نے بھی حدِ رجم کی مشروعیت کا انکار کردیا، یا اسے ایسا رخ دیدیا کہ اس کا رد و اقرار سب برابر ہو کے رہ جائے۔ ان حضرات نے حدِ رجم کے واقعات اور ان سے متعلق احادیث کو لیے ایسے شبہات و مغالطات کا تختۂ مشق بنایا کہ اس جرأتِ رندانہ پر حیرت کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ برصغیر کے نہایت مشہور عالم مولانا امین احسن اصلاحی اسی صف میں آن کھڑے ہوئے ہیں۔

حافظ صلاح الدین یوسف صاحب نے ان حضرات کے شبہات و مغالطات اور تاویلات و تلبیسات کا پردہ بڑی خوبی سے چاک کیا ہے اور تمام گرد و غبار جھاڑ کر اس مسئلے کی مشروعیت کو نہایت محکم طریقے سے ثابت کیا ہے یہ مسئلہ ہمارے ملک کے اندر بھی بعض حلقوں میں زیرِ بحث بن چکا ہے۔ مثلاً شبان حق کو زیرِ تبصرہ کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے جو اپنے موضوع پر نہایت مفید ہے۔ شروع میں متکلم اسلام مولانا محمد حنیف صاحب ندوی کا ایک فاضلانہ اور پر مغز مقدمہ بھی شامل کیا گیا ہے۔ جس میں حدِ رجم کی عقلی و نقلی حیثیت اور اس کی شرعی اہمیت و نوعیت کو اختصار، جامعیت اور بڑی خوبی کے ساتھ اجاگر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے مفیدِ خلائق بنائے اور مولفین و ناشرین کو جزائے خیر عطا کرے۔

(۳) اسلامی خلفاء و ملوک اور تاریخ اسلام سے متعلق چند غلط فہمیوں کا ازالہ:

تالیف: حافظ صلاح الدین یوسف ..... ایڈیٹر الاعتصام لاہور

پتہ: دارالدعوۃ السلفیہ، شیش محل روڈ لاہور پاکستان

کچھ عرصے پاکستان میں ہمدرد فاؤنڈیشن کراچی کے زیرِ اہتمام وقت کے اہم موضوعات پر مذاکرۂ ملی منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ ربیع الاول ۱۴۰۴ھ میں اسی سلسلہ کا تیسرا مذاکرۂ ملی منعقد ہوا تھا۔ اس مذاکرہ کا

عنوان تھا۔ "اسلامی ریاست کا تصور"۔ زیر تبصرہ کتابچہ اسی مذاکرہ علمی میں پیش کیے گئے ایک مقالے کی کتابی شکل ہے۔

مقالے کا موضوع تو عنوان ہی سے ظاہر ہے پس منظر بھی اکثر لوگوں کو معلوم ہوگا کہ مولانا مودودی نے اسلامی ریاست کے موضوع کو اپنا خصوصی مرکزِ توجہ بنایا تھا۔ اور اس سلسلے میں بیشمار مضامین و مقالات اور شذرات و کلمات قلم بند فرمائے تھے وہ اسی کو اسلام کا مرکزی اور محوری نقطہ سمجھتے تھے اور اس لیے ان کی ہر بات کی تان اسی پر ٹوٹتی تھی۔ مولانا مودودی نے جدید فلسفہائے ریاست اور اصولِ حکمرانی کا اتنی گہرائی سے مطالعہ کیا تھا کہ یہ فلسفے ان کے نفسیاتی شعور کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ اس لیے جب انھوں نے اسلامی سیاسیات پر قلم اٹھایا تو شعوری یا غیر شعوری طور پر ریاست کے ان جدید فلسفوں کو اس میں سمو دینے کی کوشش کی۔ اس کے بعد ان کے نزدیک اسلامی ریاست و اصولِ حکمرانی کی جو شکل بنی اس کے پیشِ نظر خلفائے راشدین کی حکومت تک کو اسلامی کہنا مشکل نظر آنے لگا۔ بعد کی حکومتیں تو درکنار۔ مولانا نے اتنا کیا کہ کسی طرح کھینچ تان کر حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کی حکومتوں کو خالص اسلامی قرار دیدیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کو خلافت و ملوکیت کا ملغوبہ ٹھہرایا اور حضرت علیؓ کی خلافت کے لیے معذرتیں تلاش کیں۔ لیکن اس کے بعد سے ابتک کی اسلامی حکومتوں کو جاہلیت کا نمائندہ بتایا۔ مولانا کے اس افتادِ فکر سے اسلامی تاریخ کے روشن ابواب کا رخ تاباں جس طرح مخدوش و مجروح ہوتا ہے وہ ظاہر ہے اور مولانا نے اپنی کتاب "خلافت و ملوکیت" میں خود بھی اس کی ایک جھلک دکھادی ہے۔

ہونا یہ چاہیے تھا کہ مولانا کے خیالات کا دقت پسندی سے تجزیہ کرکے صحیح اور غلط کا امتیاز قائم کیا جاتا مگر ہوا یہ کہ اہلِ قلم کے ایک طبقے نے موصوف کے خیالات کو ایک مسلمہ اسلامی حقیقت باور کرانے کے لیے قلم کا سارا زور صرف کردیا۔ خدا جزائے خیر دے حافظ صلاح الدین یوسف کو کہ انھوں نے کہ اس زیر تبصرہ مقالے میں بڑی خوبی سے اس موضوع کا تجزیہ کیا ہے۔ "اسلامی اصولِ حکمرانی اور ملوکیت" کے سلسلے میں ایسے حقائق پیش کیے ہیں جن سے سابقہ خیالات کی غلطی خود بخود واضح ہوجاتی ہے۔ مقالے کی اہمیت کا اندازہ اس کے خاص خاص عنوانات سے کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً: اسلامی ریاست کی تشکیل کا صحیح طریقہ، خلافت و ملوکیت، قیصریت و کسرویت، خلافت راشدہ اور بعد کی حکومتوں میں فرق کی نوعیت، مطلوب و نامطلوب کی بحث،

ہمارا نقطۂ نظر اور اس کے ثمراتِ حسنہ، دورِ حاضر کے مفکرین کا نقطۂ نظر اور اس کے خطرناک نتائج، بگاڑ کے اسباب، موجودہ حالات میں کیا جمہوریت ہمارے لیے موزوں اور مناسب ہے؟

حافظ صلاح الدین صاحب ٹھوس فکر اور رواں قلم کے مالک ہیں، انھوں نے مولانا مودودی کی کتاب خلافت و ملوکیت کا نہایت مدلل مفصل اور سنجیدہ جائزہ لے کر مولانا مودودی کے نقطۂ نظر اور استدلال کی غلطی واضح کی ہے۔ زیر تبصرہ کتابچہ کو بڑی حد تک اس کے اصولی مباحث کا خلاصہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ کتابچہ اہل علم کے لیے بڑا مفید اور اصل مسئلے کے حل میں بڑا کارآمد ہے۔

(۴) ماہِ محرم اور موجودہ مسلمان :

تالیف حافظ صلاح الدین یوسف ، ایڈیٹر ہفت روزہ الاعتصام لاہور

صفحات : ۸۸ قیمت : ۹ روپیے

ملنے کا پتہ : جماعت غرباء اہلحدیث چوک مدینہ المدرسہ کالونی راوی روڈ لاہور، پاکستان۔

کربلا کا حادثہ اس حیثیت سے ایک نہایت دلدوز سانحہ ہے کہ اس میں جگر گوشۂ رسول حضرت حسین رضی اللہ عنہ مظلومانہ طور پر شہید کیے گئے۔ مگر اس سانحہ کے ساتھ ایک اور تکلیف دہ سانحہ وابستہ ہے کہ اس کی اصل حقیقت پر تہ در تہ اتنے دبیز پردے پڑ گئے کہ صحیح صورت حال کا سمجھنا سخت دشوار ہو گیا اور اس کے نتیجے میں امت کے مختلف طبقات کے درمیان نفرت و لعنت کی ایسی دیوار حائل ہو گئی کہ صدیوں پر صدیاں گزر جانے کے باوجود آج تک اسے ڈھایا نہ جا سکا۔ یعنی امت صرف خانوادۂ رسول کے ایک گوہر گرانمایہ ہی سے محروم نہیں ہوئی بلکہ خدا جانے اس حادثے کے نتیجے میں امت کے کتنی بڑی تعداد میں بدعت و ضلالت اور فتنہ و آفت سے دوچار ہوئی۔

اللہ کا بے پایاں فضل ہے کہ کچھ عرصے سے حق پسند و حقائق جو علماء مختلف پہلوؤں سے اصل حقیقت تک رسائی کی کوششوں میں مصروف ہیں اور انھوں نے بڑی حد تک حقائق کا چہرہ بے نقاب کر دیا ہے۔ پیش نظر کتاب اسی طرح کی ایک فاضلانہ کوشش و کاوش کی مظہر ہے۔ یہ درحقیقت کوئی مستقل تالیف نہیں ہے بلکہ مختلف اوقات میں لکھے گئے چند مضامین کا مجموعہ ہے۔ ابتدائی مضامین میں احترامِ صحابہ محرم کے

مسنون اعمال ۔ بدعتوں خصوصاً تعزیوں کی حرمت (وہ بھی احمد رضا خاں کے فتویٰ سے) نیز شیعی بدعتوں
ایجاد کی تاریخ وغیرہ بتائی گئی ہے ۔ اس کے بعد واقعہ کربلا کی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے بتلایا گیا ہے کہ یہ حق
معرکہ نہ تھا بلکہ عام معمول کے مطابق ایک حادثہ تھا ۔ اور اس کی بنیاد پر یزید کو سب وشتم کرنا درست نہیں ۔ ا
کے فسق وفجور کے متعلق جو کچھ مشہور ہے وہ محض افسانہ ہے ۔ پھر اسی سلسلے میں بعض سوالات کے جوابات
جس میں بڑی قیمتی معلومات آگئی ہیں ۔ اور اس معاملے کے بہت سارے پہلو اچھی طرح نکھر گئے ہیں ۔ اس ضمن
یزید کی مغفوریت کی بحث خاص قابلِ دید ہے ۔ آخیر میں زیر بحث موضوع سے متعلق منہاج السنہ سے امام ا
کی تحقیق کا جو نہایت نفیس اور اس باب میں فیصلہ کن ہے ، ترجمہ دیدیا گیا ہے ۔

واقعہ کربلا کے سلسلہ میں عبید اللہ ابن زیاد کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے اور مسلم بن عقیل کے سلسلہ میں اس کا جو رو
اس کی بنا پر یہ بات معقول بھی معلوم ہوتی ہے لیکن ایک پہلو یقیناً قابلِ غور ہے ۔ حضرت حسین جس را
سے مکے سے کوفہ گئے تھے اس میں کربلا نہیں پڑتا ۔ بلکہ کربلا کوفہ سے دمشق جانے والے راستہ پر پڑتا ہے ۔ پس اگ
کی شہادت اس طرح پیش آئی کہ انھوں نے کوفہ میں داخلہ کی کوشش کی تھی لیکن روکے گئے تھے ۔ پھر تین شا
کا مرحلہ آیا اور اس کے بعد گرفتاری کی کوشش کے جواب میں موصوف کی شہادت پیش آئی تو پھر یہ واقعہ کربلا
بجائے کہیں اور ہونا چاہیئے تھا ۔ کربلا میں شہید ہونے کے معنی تو یہ ہیں کہ ان کے دمشق جانے کی شرط مان
گئی تھی اور وہ کوفہ کے پاس سے دمشق کی جانب مڑ گئے اور دمشق ہی جاتے ہوئے شہید کر دیئے گیے ۔ نیز اگر ا
کی شہادت سرکاری فوج کے ہاتھوں ہوتی تو سوال یہ ہے کہ اس نے خطوط کے وہ تھیلے کیونکر جلا دیے جن سے
بغاوت رکھنے والے کوفیوں کا پتہ چل سکتا تھا ۔ اس سے تو اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ حضرت حسین رضؓ اور حکو
کی فوج و نمائندگان کے درمیان مصالحت ہو چکی تھی اور کوفہ کے جن خود غرض طالع آزماؤں نے حضرت
حسین کی خلافت کے زیر سایہ بڑے بڑے عہدوں اور مناصب کی توقعات تھیں رکھی تھیں ، جب انھوں
دیکھا کہ اس مصالحت کے نتیجہ میں ہمارا بھانڈا پھوٹ جائے گا تو انھوں نے خود بہ نفسِ نفیس یا اپنے آدمی کا
کو بھیج کر حضرت حسین کو راستے ہی میں شہید کرا دیا اور خطوط کے تھیلوں میں آگ لگوا دی کہ نہ ہمارے ناموں کا پتہ
گا نہ ہمارے خلاف کوئی کارروائی ہوگی ۔ گویا نہ رہے بانس نہ بجے بانسری ، ہمارا خیال ہے کہ مستند تاریخی مد
کی روشنی میں ان بنیادی تسعیحات کا حل تلاش کیا جائے تو غالباً واقعہ کی حقیقت اور نکھر جائے گی ۔

(۵) اہلحدیث اور اہلِ تقلید :

تالیف: حافظ صلاح الدین یوسف ایڈیٹر الاعتصام لاہور برائے اشاعت فنڈ   -/۵
ناشر: ادارہ الاعتصام شیش محل روڈ لاہور پاکستان

یہ رسالہ ایک حنفی مکتبِ فکر کے عالم کے بیجا حملوں کا جواب ہے، اس لیے اصلاً ایک تنقیدی رسالہ ہے، لیکن اس عین تنقید کے ضمن میں اہلحدیث اور اہلِ تقلید کے نقطۂ نظر کے مابین فرق کی خوب توضیح ہوگئی ہے۔ اور جماعت اہلحدیث اور مسلک اہلحدیث بے سروپا الزامات کی حقیقت بھی بین و آشکارا۔ فللہ الحمد والمنۃ اس طرح یہ کتابچہ بفضلہ تعالیٰ بقامتِ کہتر بقیمت بہتر کا مصداق ہے۔

بعض عنوانات: اہلحدیث فرقہ نہیں۔ تقلید و بدعت کا آغاز، تقلید و بدعت گمراہی ہے یا نہیں، اہلِ تقلید کا طرزِ عمل، قدامتِ اہلحدیث، کیا محدثین بھی مقلد تھے؟۔ اہلِ حدیث ہر دور میں رہے ہیں۔ عہدِ صحابہ و تابعین سے تقلید کا ثبوت؟ اہلِ تقلید کو امام ابن القیم کا چیلنج، شاہ ولی اللہ اور تقلید، علمائے احناف اور تنقیصِ ائمہ۔ تفقہ کا صحیح مفہوم، ظاہریت اور تفقہ سے عاری کون ہے؟ تفقہ، استنباطِ مسائل اور اہلحدیث مسلک اہلحدیث۔ قرآن و حدیث نے کس فقہ و رائے کی تعریف کی ہے، اہل الرائے کی وجہ تسمیہ۔

ان عنوانات سے اس رسالہ کی اہمیت معلوم کی جاسکتی ہے۔ رسالہ خواص و عوام دونوں کی توجہ اور استفادہ کے لائق ہے

بقیہ ۴۹ ص کا

ہم سمجھتے ہیں کہ اسلامی اجارہ داری کے یہ بلند بانگ دعوے محض ہوسِ اقتدار کی پیداوار ہیں۔ ورنہ میاں صاحب اگر واقعی چھوٹے بڑے ہر میدان میں اسلامی انقلاب لانا چاہتے ہیں تو ذرا اپنے اراکین شوریٰ کے چہرے اور پاؤں تو شرعی بنالیں اور اگر واقعی وہ اسلامی شریعت کو سمجھتے ہیں تو کم از کم اپنی مجلسِ شوریٰ کو قبر پرستوں سے تو پاک کرلیں۔ باقی رہا مکمل اسلامی انقلاب "تو دیدہ باید"

تشریف لائیے :

اسلامی کتابوں کے مطالعہ کے لئے مسلم لائبریری باری پورہ (کشمیر) میں تشریف لائیں۔ بشیر احمد سکریٹری اخوان اہلحدیث باری پورہ

پانچ روپئے میں حسب ذیل کتابیں وغیرہ حاصل کریں :

(۱) کیا عید میلاد النبی منانا جائز ھے ؟ (۲) شیخ عبد القادر جیلانی اور گیارھویں شریف (۳) رجب کے کونڈے پر ایک نظر (۴) ارباب تقلید شخصی سے ۲۴ سوالات (۵) زکاۃ کا اجتماعی نظام (٦) کتب حنفیہ سے آٹھ رکعت تراویح کا ثبوت (۷) حیاۃ النبی کا عقیدہ شرک کی جڑ ھے (۸) قربانی کے ایام کی تحقیق (۹) تیرہ ذی الحجہ تک قربانی کا ثبوت (۱۰) اصلی اہل سنت (۱۱) کیا اللہ کے سوا بھی کوئی مشکل کشا ھے۔ وغیرہ وغیرہ

پتہ : عبد النور راغب سابق ناظم نشر واشاعت جمعیۃ اہلحدیث بمبئی عظمی جامعۃ الرشاد غفور خان اسٹیٹ ایل، بی، ایس مارگ کرلا بمبئی **400070**

وفیات :

حسب ذیل حضرات کی وفات کی اطلاعات موصول ہوئی ھیں : (۱) مولانا محمد عنایت اللہ ندوی (حیدرآباد) (۲) مولانا صداقت حسین قاسمی شیخ الحدیث مدرسہ اصلاح المسلمین پٹنہ ۔ ۱۰ ستمبر ۸۴ء تین بجے شب (۳) نوجوان صالح محمد امین (ماموں زادہ محمد یوسف علی صاحب دینارا گجرات) ۲٦/ فروری ۸۴ء (۴) عبد الرحمان صاحب کوندو (سرینگر کشمیر) کی والدہ ماجدہ ٦/۷/ ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ کی درمیانی رات (۵) الحاج مجاھد الدین صاحب گدیانوی ۵/ اگست ۸۴ء اللہ مرحومین کی مغفرت فرمائے، ناظرین سے دعاء کی گزارش ھے۔

Reg. No. R. N. 40352/81

October MOHADDIS 1984

THE ISLAMIC CULTURAL & LITERARY MONTHLY MAGAZINE

AL-JAMIATUS SALAFIAH (AL-MARKAZIYAH) VARANASI (INDIA)

Published from Markazi Darul-Uloom

Printed by Abdul Waheed

At Salafiah Press, Reori Talab, Varanasi.

محدث

مرکزی دار العلوم بنارس کا دینی علمی اور ادبی ماہنامہ

برگ وبار

ترجمانِ سلفیت - ادبی اور اصلاحی

ماہنامہ

محدث

بنارس

جلد: ۳

شمارہ: ۱۱

صفر ۱۴۰۵ھ ● نومبر ۱۹۸۴ء

بدل اشتراک

سالانہ : ۲۵ روپے

ششماہی: ● روپے

فی پرچہ : ۲/۵۰ روپے

بیرون ملک سے سالانہ : ۱۵ ڈالر

ناشر: جامعہ سلفیہ بنارس

طابع: عبدالوحید

مطبع: سلفیہ پریس بنارس

کاتب: انور جمال

ترتیب

صفی الرحمن مبارکپوری

:- پتہ :-

خط و کتابت کے لیے : ایڈیٹر محدث، جامعہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس

بدل اشتراک کے لیے : مکتبہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس

→ MAKTABA SALAFIAH REORITALAB VARANASI-10

ٹیلی گرام: دار العلوم، وارانسی ● ٹیلی فون: ۶۳۵۰۷

مشورے

جلیل ساز

اپنے کعبہ کو تصور میں بسائے رکھیے
ہوگا طیبہ کا سفر آس لگائے رکھیے

دوزخِ جبر، گلستاں میں بدل سکتی ہے
سینہ سے عزمِ خلیلی کو لگائے رکھیے

تیرہ بختی کا تسلط ہے افق تا بہ افق
کعبۂ دل کے چراغوں کو جلائے رکھیے

مہدی آئیں گے، مسیحا بھی ضرور آئیں گے
قصر و ایوانِ امامت کو سجائے رکھیے

جھوٹ پنپے کہ بڑھے بغض و عداوت کا چلن
آپ ماحول صداقت کا بنائے رکھیے

ثبت ہیں جن پہ محمد کے صحابہ کے قدم
ان ہی راہوں پہ نظر اپنی جمائے رکھیے

آئے، آتی ہے جو بارود کی کالی آندھی
دہر میں امن کی قندیل جلائے رکھیے

حاصلِ کون و مکاں، اپنی متاعِ ایماں
عصرِ حاضر کے خداؤں سے بچائے رکھیے

غیر سے مہر و وفا، مہر و وفا سے دنیا
پہلوئے شر کو بہر طور دبائے رکھیے

بے حجابی کا یہ عالم ہے کہ تقویٰ لرزے
راہ چلیے تو نگاہوں کو جھکائے رکھیے

کس کا مسلک ہے صحیح کس کا عقیدہ ہے درست
فیصلہ اس کا قیامت پہ اٹھائے رکھیے

آپسی جنگ میں نقصان ہے بربادی ہے
مل کے رہنے کی فضا ساز بنائے رکھیے!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور عدم تشدّد

(گاندھیین انسٹی ٹیوٹ بنارس میں کی گئی تقریر کی تیسری قسط)

اب تک ہم نے ہنسا کے چند بڑے بڑے مذہبی اسباب بیان کیے تھے ۔ آئیے ! اب ایک دوسرا وجہیں بھی سنتے چلیں جس سے خاص ہمارے ملک کو سامنا ہے ۔ ہنسا کی ایک خاص وجہ ذات پات کا بھید اور اونچ نیچ ہے ۔ چنانچہ ہمارے ملک کا سماج جو چھوٹی بڑی اور اونچی نیچی ذات برادریوں میں بٹا ہوا ہے اسی کی وجہ ہے یہاں آئے دن چھوٹی ذات والوں کے مارے پیٹے جلانے ، قتل کیے جانے اور زندہ جلائے جانے کے واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور غالباً اسی سے متاثر ہوکر چند سال پہلے الہ آباد کی انٹرنیشنل ہنسا کانفرنس میں اپیل کی گئی تھی کہ ذات برادریوں کی اونچ نیچ اور باہمی چھوت چھات ختم کردی جائے ۔ مگر چونکہ سماج طبقات کی یہ تقسیم مذہبی (دھارمک) ہے اس لیے اس کا مٹانا سخت مشکل ہے اس کے لیے یا تو آدمی اپنا مذہب چھوڑ دے یا پھر مذہبی رہنما اپنے مذہب میں تبدیلی لانے کا اعلان کریں ۔ مگر یہ اعلان درحقیقت اس بات کا اعلان ہوگا کہ یہ خدائی مذہب نہ تھا بلکہ انسانوں کے اپنے تیار کردہ کچھ اصول و ضابطے تھے جنھیں مذہب کا تقدس دے کر نافذ کردیا گیا تھا ۔

اسلامی تعلیمات کو دیکھیے تو وہاں اس اونچ نیچ کا نام و نشان تک نہیں بلکہ مختلف سماجوں نے جو نیچا پیدا کردی تھی ، اسلام نے اسے برائی قرار دیتے ہوئے مٹایا اور مٹانے کی ترغیب دی ۔ اس باب میں اسلام

تعلیم قرآن کے الفاظ میں یہ ہے۔

یایها الناس انا خلقنا کم من ذکر وانثی وجعلنا کم شعوبا وقبائل لتعارفوا، ان اکرمکم عند الله اتقاکم ۰ (قرآن: سورۂ حجرات)

اے لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمھیں قبیلے اور گروہ بنایا تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ (ورنہ) تم میں سب سے زیادہ عزت والا اللہ کے نزدیک وہ ہے جو سب سے نیک ہو۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے۔

یایها الناس الا ان ربکم واحد وان اباکم واحد۔ الا لا فضل لعربی علی عجمی، ولا لعجمی علی عربی ولا لاحمر علی اسود ولا اسود علی احمر الا بالتقوی۔

لوگو! یاد رکھو! تمھارا رب بھی ایک ہے اور تمھارے باپ بھی ایک ہی ہیں۔ یاد رکھو کہ نہ عربی کو عجمی پر کوئی فضیلت ہے، نہ عجمی کو عربی پر، نہ گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر، مگر صرف تقویٰ کی بنیاد پر

(مسند احمد ۵/۱۱۴)

اس طرح کی ہدایات بہت ہیں، اور مختلف پیرائے میں مگر سب کو نقل کرنا مقصود نہیں۔ کہنا یہ ہے کہ اسلام کی تعلیم اونچ نیچ کے خلاف ہے اور اس اسلامی تعلیم کا اثر یہ ہے کہ آج اس ہندوستان اور اکا دکا جگہوں کو چھوڑ کر پوری دنیا میں مسلمانوں کے اندر اونچ نیچ کا کوئی تصور نہیں اور یہاں بھی اس کا جو تصور ہے وہ محض اونچ نیچ ماننے والوں کے پڑوس میں رہنے کی وجہ سے ہے اور وہ بھی صرف اتنا ہے کہ لوگ شادی بیاہ میں تھوڑی سی کنی کترا جاتے ہیں۔ ورنہ ایک ساتھ اٹھنے بیٹھنے، کھانے، پینے، کھیلنے کودنے، کاروبار کرنے، پڑھنے پڑھانے اور عبادت کرنے وغیرہ وغیرہ میں نہ کوئی تکلف ہے نہ ان معاملات میں اونچ نیچ یا چھوت چھات کا کوئی تصور ہے۔ اور اسی لیے مسلمانوں میں آپ کو اونچ نیچ کی لڑائی بھی نظر نہیں آئے گی جبکہ اسی ملک میں دوسرے لوگوں کی ذات برادریوں کا جھگڑا اتنا سخت ہے کہ اس کی وجہ سے پورے پورے گاؤں پھونک ڈالے گئے ہیں اور زندہ انسانوں اور جانوروں تک کو جلا دیا گیا ہے۔

...

ہمارے یہاں تشدد (ہنسا) کا ایک اور سماجی سبب تلک یعنی جہیز کا لین دین ہے اس کی وجہ سے ایک طرف

غریب گھرانوں کی لڑکیوں کی شادی میں جو غیر معمولی دیر ہوتی ہے، اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی آوارگی، اور اخلاقی بے راہ روی ہے تو دوسری طرف اس تلک کی وجہ سے تشدد کے واقعات بھی بکثرت ہوتے ہیں۔ جب داماد کو اس کی منشا کے مطابق جہیز نہیں ملتا تو وہ اور اس کے کنبے کے لوگ لڑکی کو ستانے کا سلسلہ شروع کرتے ہیں، جس سے تنگ آکر لڑکی کبھی تو خود ہی خودکشی کر لیتی ہے اور کبھی سسرال والے اسے جان سے مار ڈالتے ہیں۔ اور حد یہ ہے کہ اس معاملے میں زندہ جلنے یا جلانے کی وارداتیں بھی بڑی کثرت سے ہوتی ہیں۔ اخبارات میں آئے دن اس طرح کی خبریں دیکھنے میں آتی ہیں۔ تنہا دہلی میں تلک کے معاملہ پر روزانہ ایک عورت کی ہلاکت کا واقعہ پیش آتا ہے۔ حکومت نے ہر چند اس کے لیے قانین بنائے اور کوششیں کیں مگر یہ مصیبت ٹلتی نظر نہیں آتی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ سماجی تنظیمیں مسلمان عورتوں کی فرضی مظلومیت پر مگرمچھ کے آنسو بہا بہاکر اسلام کو بدنام کرنے کی جان توڑ کوشش کرتی ہیں مگر دوسروں کی آنکھ میں تنکے تلاش کرنے والی ان تنظیموں کو اپنی آنکھ کی موٹی سی لکڑی نظر نہیں آتی۔

قتل اور خودکشی کی بہت سی وارداتیں اس وجہ سے بھی ہوتی ہیں کہ ہندو سماج میں شادی ہو جانے کے بعد مرد اور عورت میں جدائی اور طلاق کا تصور نہیں ہے، اس لیے جب مرد عورت سے دامن چھڑانا چاہتا ہے تو اسے مار ڈالتا ہے اور جب عورت اپنے شوہر سے زچ ہو جاتی ہے تو خودکشی کر لیتی ہے اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شوہر ہی کو مار ڈالتی ہے۔

اسلام نے مسلمانوں کو ان دونوں معاملات میں جو تعلیمات دی ہیں وہ بڑی صاف اور سادہ ہیں، مرد اور عورت گواہوں یا مجمع کے سامنے صرف زبانی اقرار کے بعد شوہر اور بیوی ہو جاتے ہیں۔ اسلام نے دونوں میں سے کسی پر کوئی مالی ذمہ داری نہیں رکھی ہے۔ صرف شوہر پر مہر کے نام سے اس کی حیثیت کے مطابق ایک معمولی سی رقم عائد کی ہے، جسے وہ اپنی بیوی کو دے گا، اور اس مہر کے بارے میں بھی یہ گنجائش رکھی ہے کہ وہ حسب استطاعت چاہے تو فوراً ادا کر دے، چاہے تو زندگی میں کبھی بھی ادا کرے۔ پھر شادی کے بعد شوہر کی طرف سے کھانے کی جو دعوت کی جاتی ہے۔ اس کے لیے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ اپنے دو چار دوستوں کو کوئی چیز چند لقمے کھلا دے۔ بس یہ ہے اسلام کا حکم، اس کے بعد آدمی کی اپنی مرضی ہے کہ اس کے پاس مال و دولت ہے تو وہ اپنی حیثیت کے مطابق تھوڑا یا زیادہ کتنا خرچ کرے۔

اسی طرح اسلام نے اگرچہ اس بات کو بہت برا مانا ہے، بلکہ اجازت والی چیزوں میں سب سے زیادہ برا مانا ہے کہ شوہر بیوی کو طلاق دے۔ لیکن بہرحال اس کی گنجائش رکھی ہے کہ اگر مرد و عورت میں نباہ کی کوئی صورت نہ ہو تو ہر طرح سمجھنے سمجھانے اور دونوں خاندان کے لوگوں کی طرف سے زور اور دباؤ ڈالنے کے بعد آخری چارۂ کار کے طور پر شوہر طلاق دیدے، یا عورت خلع کرالے۔ یہ بات چاہے جتنی بری ہو لیکن قتل اور خودکشی سے تو بہرحال بری ہے۔ اس لیے طلاق کا قانون درحقیقت انسانیت پر اسلام کا احسانِ عظیم ہے اور دنیا کی وہ ساری قومیں جو طلاق کی قائل نہیں تھیں اب قائل ہوتی جارہی ہیں۔ مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ آج ان دونوں معاملات میں یعنی بیاہ و بیاہ اور طلاق کے معاملات میں مسلمانوں کا عمل ٹھیک ٹھیک اسلامی ہدایات و تعلیمات کے مطابق نہیں ہے، اس لیے اس کا پورا فائدہ بھی انھیں نہیں مل پا رہا ہے، پھر بھی دوسروں کے مقابل ان کا سماج بہت محفوظ ہے۔ اور ان میں آپ ان معاملات کی وجہ سے قتل اور خودکشی کی واردات ڈھونڈھنے سے بھی مشکل ہی پا سکیں گے۔

...

ہنسا (تشدد) کے اب تک جو اسباب ذکر کیے گئے ہیں ان کے علاوہ تشدد کے معاشی اور نفسیاتی اسباب بھی ہیں۔ نفسیاتی اسباب میں حسد، کینہ، عداوت، ظلم، تعدی اور طاقت کی نمائش کا ذوق وغیرہ وغیرہ ہیں۔ اور ان معاشی اور نفسیاتی اسباب کے بارے میں بھی اسلامی تعلیمات ہی سب سے زیادہ صحیح و معتدل اور ساری بیماریوں کا علاج ہیں۔ مگر ان سب پر گفتگو کی گنجائش نہیں۔ البتہ ہنسا اور تشدد کے تعلق سے مزید ایک بات کہہ کر گفتگو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ اور یہ بات ہے انفرادی تشدد کے بجائے اجتماعی تشدد کی۔ یعنی ملکوں اور قوموں کے درمیان جنگ و جدل کی۔

انسانی تاریخ کو کھنگالیے تو اندازہ ہوگا کہ جس طرح کے اسباب انفرادی تشدد کو جنم دیتے ہیں، اسی طرح کے اسباب سے جنگوں اور لڑائیوں کے بھی دروازے کھلتے ہیں۔ کوئی قوم کسی قوم سے بڑی بن کر رہنا چاہتی ہو اس کی خوبیوں پر حسد سے جلتی ہو اور اس کی خوشحالی اور بہترین پیداوار پر للچائی ہوئی نظر رکھتی ہو تو موقع تلاش کرکے اور بہانے پیدا کرکے اس پر حملہ آور ہوتی ہے۔ اور اسے مار کاٹ کر اور لوٹ کھسوٹ کر تباہ و برباد کر ڈالتی ہے۔ یہ بات اس وقت سے ہوتی آرہی ہے جب سے انسان کی تاریخ معلوم ہے اور اب تک ہو رہی ہے اور ہر طرح کے بین الاقوامی معاہدوں اور کوششوں کے باوجود اس کے کچھ آثار نظر نہیں آتے کہ اسے روکا جاسکے گا۔

۱۹۷۱ء کے آخیر میں بنگلا دیش کی جنگ ہوئی تو اقوام متحدہ کے ۱۰۴ ممالک نے ہندوستان کے اقدام کو غلط قرار دیتے ہوئے اس سرزمین کو خالی کر دینے کی قرارداد پاس کی۔ صرف چار ووٹ اس قرارداد کے خلاف گئے جس میں ایک خود ہندوستان کا تھا۔ ایک روس کا اور دو روس کے حاشیہ برداروں کا۔ پھر ہیگ کی عالمی عدالت نے بھی ہندوستانی اقدام کو غلط قرار دیتے ہوئے فیصلہ کیا کہ بنگلادیش کی تشکیل خلافِ قانون ہے۔ مگر ہندوستان نے ساری دنیا کے فیصلے کو ٹھکرا کر وہی کیا جو اسے کرنا تھا۔

اسی طرح روس نے افغانستان پر دھاندلی سے قبضہ کر لیا ہے۔ وہاں کے باشندے اپنی آزادی کے لیے موت و زندگی کی لڑائی لڑ رہے ہیں اور ساری دنیا ہر سال قرارداد پاس کرتی ہے کہ روس افغانستان سے نکل جائے مگر وہ سب کے فیصلوں کو روند کر افغانستان میں جما ہوا ہے۔ عربوں کی سرزمین پر طاقت کے زور سے اسرائیل کو بسایا گیا ہے۔ پھر وہ مدتوں سے اقوام متحدہ کی قراردادیں رد کر کے عربوں کی مزید زمینیں ہڑپ کیے ہوئے ہے، اور انھیں خالی کرنے پر آمادہ نہیں ہے۔

یہ تین مثالیں میں نے صرف اس مقصد کے لیے پیش کی ہیں کہ آج بھی دنیا میں "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" پر عمل ہو رہا ہے اور آپ یہ یقین رکھیے کہ آئندہ بھی اسی پر عمل ہوگا۔ مسلمانوں کو چھوڑ کر دنیا کی تاریخ میں آج تک کوئی ایسی قوم پیدا نہیں ہوئی جس نے طاقتور ہو کر کمزوروں کو لوٹنے کھسوٹنے اور قتل و غارت کرنے کے بجائے عدل و انصاف دیا ہو۔ یہ صرف مسلمان ہیں جو بین الاقوامی اسٹیج پر کھڑے ہو کر دنیا کی اور ساری قوموں کو مخاطب کر کے کہہ سکتے ہیں کہ

ہم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھالا تم کو
تم نے جب ہوش سنبھالا تو سنبھلنے نہ دیا۔

اس حقیقت کے پیش نظر اسلام نے مسلمانوں کو کبھی اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رکھا کہ دنیا سے جنگ ختم ہو سکتی ہے۔ اس لیے اسلام نے اس مفروضے کے چکر میں ڈالنے کے بجائے مسلمانوں کو جنگ کے لیے اصول اور ضابطے دیے کہ تباہی و بربادی کی یہ سب سے بڑی اور بڑی لعنت بھی انسانیت کی خدمت کا ذریعہ بن گئی یعنی جتنے اسباب کے تحت دنیا میں جنگ ہوا کرتی تھی اسلام نے مسلمانوں کو ان سب سے روک کر صرف دو ایسی مخصوص وجہوں کے تحت جنگ کی اجازت دی کہ اگر دنیا کی دوسری قومیں بھی طے کر لیں کہ صرف ان ہی دو وجہوں کی بنا پر جنگ کریں گی تو سرے سے جنگ ہی نہ ہوگی۔ اسلام کے نزدیک جنگ کی ایک وجہ یہ ہے کہ کوئی ملک یا قوم ان پر حملہ کر دے

ہو مسلمانوں کو اپنے بچاؤ کے لیے جنگ پر مجبور ہو جانا پڑے تو دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ کی راہ سے روکا جائے یعنی مسلمانوں کو اسلام پر عمل نہ کرنے دیا جائے ان کے مبلغین کو اسلام کی تبلیغ سے روک دیا جائے اور جو لوگ مسلمان ہونا چاہیں یا مسلمان ہو جائیں انھیں قتل و قید کرکے یا مار پیٹ کر اسلام سے دور رکھنے یا غیر مسلم بنانے کی کوشش کی جائے۔ ان دو وجہوں یعنی مسلمانوں پر حملہ یا اللہ کی راہ سے روکنے کے علاوہ اور کسی وجہ سے اسلام لڑائی کی اجازت نہیں دیتا پھر اِن دو صورتوں میں بھی اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ پہلے دوسرے فریق سے گفت و شنید کے ذریعہ معاملہ طے کرنے کی کوشش کی جائے اور ہتھیار کا سہارا صرف اس وقت لیا جائے جب کوئی چارۂ کار اس کے علاوہ نہ رہ جائے۔ پھر اگر جنگ چھڑ جائے تو دوران جنگ اور بعد از جنگ مسلمانوں کو ایسے ضابطوں کا پابند بنایا گیا ہے کہ جنگ کے معاملے میں اس سے بہتر ضابطہ کا تصور نہیں کیا جا سکتا یعنی مسلمانوں کو صرف لڑنے والوں سے لڑنے اور انھی کو مارنے کی اجازت ہے۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں، سادھوؤں، راہبوں اور غیر متعلق لوگوں پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں۔ مویشیوں، کھیتیوں، مکانات اور باغات وغیرہ کو جلانے، اجاڑنے اور تاخت و تاراج کرنے کی بھی قطعی ممانعت ہے۔ قیدیوں میں سے صرف ان لوگوں کو سزائے موت دیے جانے کا ثبوت ہے جو صرف سپاہی نہ تھے، بلکہ فساد کی جڑ اور جنگی مجرم تھے۔

پھر ان ساری پابندیوں اور احتیاط کے ساتھ بھی جنگ کی اجازت صرف اسی وقت تک کے لیے ہے جب تک کہ دوسرا فریق صلح کی طرف نہیں جھکتا اور جنگ ہی پر اڑا ہوا ہے۔ ورنہ جوں ہی دوسرا فریق صلح پر آمادہ ہو۔ اسلام جنگ بند کر دینے کا حکم دیتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے۔

وان جنحوا للسلم فاجنح لها و توکل علی اللہ۔ اگر وہ (یعنی مخالفین) صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی صلح کے لیے جھک جاؤ اور اللہ پر بھروسہ کرو۔

اس حکم کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے پوری طرح جنگ میں آئے ہوئے دشمنوں بلکہ غداروں تک کی بھی درخواست صلح فوراً منظور کر لی ہے۔ اور ہمیشہ نہایت فیاضی رعایت اور کشادہ دلی سے کام لیا ہے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ والوں سے صلح حدیبیہ کا واقعہ اور ہندوستان کے تعلق سے جے پال و انند پال کے لیے سبکتگین اور محمود غزنوی کی معافیاں اور رعایتیں اس کی واضح مثالیں ہیں۔

اسلامی قوانین جنگ کے متعلق ان مختصر اشارات سے یہ بات سمجھی جا سکتی ہے کہ اسلام کے نزدیک جنگ کا معاملہ

مذہب کے پھیلاؤ یا جارحیت سے تعلق نہیں رکھتا۔ بلکہ یہ خالصتہً بین الاقوامی امن وامان اور مذہبی خود مختاری و آزادیٔ فکر کے قیام سے تعلق رکھتا ہے۔ واقعات کی حتمی شہادت بھی یہی ہے۔ اسلام سے پہلے کا عرب لڑائیوں اور قتل و غارت کے لیے بہت مشہور ہے۔ میں اس سلسلے کا ایک واقعہ پیش کر رہا ہوں۔ اسلام کی آمد سے کچھ پہلے دو چچازاد قبیلوں بکر اور تغلب کے درمیان صرف اتنی سی بات پر جنگ چھڑ گئی کہ ایک قبیلے کے ایک آدمی کا اونٹ دوسرے قبیلے کے ایک آدمی کی چراگاہ میں چلا گیا تھا۔ پھر اس جنگ نے اس قدر طول پکڑا کہ وہ کر چالیس برس تک جنگ ہوتی رہی اور مجموعی طور پر فریقین کے کوئی ستر ہزار آدمی یعنی اوسطاً ہر قبیلے کے ۳۵ ۳۵ ہزار آدمی مارے گئے، لیکن پھر بھی کوئی قبیلہ دوسرے کے سامنے جھکنے اور اس سے صلح کرنے پر آمادہ نہ ہوا حالانکہ دونوں اصلاً ایک ہی قبیلے کی دو شاخ تھے۔

اب آپ ایک طرف عربوں کی یہ اکڑ اور ان کا یہ جنگجویانہ مزاج کو دیکھیے۔ اور دوسری طرف اسلامی جنگوں اور اسلام کے پھیلاؤ کو دیکھیے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں جنگ کے جتنے واقعات پیش آئے، ان سب میں مسلمان اور ان کے مخالفین دونوں کو ملا کر مجموعی طور پر جو لوگ قتل کیے گئے، ان کی تعداد صرف ۱۰۱۸ ہے ۲۵۹ مسلمان، ۷۵۹ غیر مسلم[1] لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے دور میں پورے عرب کے اندر اسلام پھیل گیا۔ یعنی شمال مغرب اور شمال مشرق میں شام و عراق کی سرحدوں سے لے کر بحر ہند، خلیج اور بحر قلزم کے سواحل تک ہر جگہ اسلام پھیل گیا اور اس پورے علاقے پر اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔ سوال یہ ہے کہ جس عرب کے صرف دو قبیلے اپنے ۳۵، ۳۵ ہزار آدمیوں کی جان گنوا کر بھی اپنے مخالف کے سامنے سر جھکانے پر تیار نہ ہو سکے۔ کیا اس پورے عرب کے سیکڑوں قبائل کے بارے میں یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ مجموعی طور پر ان سب کے صرف ۷۵۹ آدمیوں کو قتل کر کے انھیں ان کی مرضی کے خلاف ایک دوسرا دین و مذہب اختیار کرنے پر مجبور کر دیا گیا، ہرگز نہیں۔ اس لیے یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلام اپنے پھیلاؤ کی بنیاد اپنے سادہ اور سچے اصول خدا پرستی کی بہترین تعلیمات اور ہر طرح کے سماجی و معاشی اور معاشرتی عدل و انصاف اور اپنے مبلغین کی سچی تبلیغی

---

[1] غیر مسلم مقتولین کی تعداد غالباً اس لیے زیادہ تھی کہ وہ زیادہ تعداد میں شریک جنگ ہوتے تھے۔ چنانچہ جنگ بدر میں ۳۱۳ مسلمان تھے اور ایک ہزار غیر مسلم، جنگ احد میں ۷۰۰ مسلمان ۳۰۰۰ غیر مسلم، جنگ خندق میں تین ہزار مسلمان، دس ہزار غیر مسلم، جنگ موتہ میں تین ہزار مسلمان دو لاکھ غیر مسلم، جنگ ہوازن میں بارہ ہزار مسلمان اور چالیس ہزار غیر مسلم تھے۔

خدمات بند کر سکتا ہے۔ مگر اس مقصد کے لیے طاقت کا استعمال نہیں کرتا، بلکہ طاقت کا استعمال صرف اس وقت کرتا ہے جب کسی کی جارحیت ختم کرنی ہو۔ یا مذہب کے بارے میں لوگوں کی خود مختاری کے اندر کسی طاقت کی مداخلت بند کرانی ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بھی شخص جو حق و انصاف کا مطلب جانتا ہے وہ اسے نہ تو ظلم کہہ سکتا ہے نہ ہنسا (تشدد)۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تشدد کی اس خوفناک صورت یعنی جنگ کو کم سے کم کرنا ہو یا مٹانا ہو تو یہ کام ان اصولوں کا سہارا لیے بغیر ممکن نہیں، جنھیں اسلام نے اب سے چودہ سو برس پہلے طے کرکے جنگ کی بھٹی میں دہکتی ہوئی دنیا کو امن و امان کا گہوارہ بنا دیا تھا۔

... ...

اسلام اور اہنسا کے تعلق سے یہ چند گزارشات ہیں جنھیں وقت مقررہ کا لحاظ کرتے ہوئے میں نے اختصار سے پیش کیا تھا۔ اس کے بعد چائے نوشی کے لیے مجلس برخاست ہوگئی۔ پھر چند منٹ بعد سوال و جواب کے لیے دوبارہ مجلس منعقد ہوئی۔ سوال و جواب کی تفصیلات انشاء اللہ اگلی قسط میں پیش کی جائے گی۔

عالمی ادارۂ صحت کی آگاہی: سگریٹ نوشی کے نتائج:

عالمی ادارہ صحت نے اپنی ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ عورتوں کے امراض خصوصی کے ایک ماہر برطانوی ڈاکٹر نے بتایا ہے کہ حاملہ ماؤں کے سگریٹ وغیرہ پینے سے برطانیہ میں سالانہ ایک ہزار بچے ان کے پیٹ ہی میں ہلاک ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹری تجزیہ سے ثابت ہوا ہے کہ سگریٹ پینے والی عورتوں کے بچوں کا وزن سگریٹ نہ پینے والی عورتوں کے بچوں کے وزن سے پیدائش کے وقت اوسطاً دو سو گرام کم ہوتا ہے۔

مصری ڈاکٹر شریف عمر جو کینسر کے طبی اسکول میں ورموں کے آپریشن کے ماہر سرجن اور عالمی ادارہ صحت کے مشیر ہیں انھوں نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ سگریٹ پینے والوں کے بچے اپنی زندگی کے پہلے برس بہت بڑے پیمانے پر پھیپھڑے کی سوزش اور علن کا شکار ہوتے ہیں۔ سائنسی تحقیق سے یہ بھی انکشاف ہوتا ہے کہ سگریٹ پینے کی وجہ سے جس مادے سے کینسر پیدا ہوتا ہے وہ نال تک پہنچ جاتا ہے، اس کی وجہ سے بچے بھی اپنی عمر کے ابتدائی دس برسوں میں بسا اوقات کینسر کا شکار ہو جاتے ہیں

دشمنوں سے ہوشیار رہو!

فضیلۃ الشیخ عبدالرحمٰن یعقوب (فرانس)

یہ کامضمون جناب محمد یوسف علی محمد صاحب (دینارا، گجرات) نے روانہ کیا ہے موصوف
عتِ دین کے لیے دلِ دردمند رکھتے ہیں اور ہر ممکن تگ و دو بھی کرتے ہیں۔ ہم یہ مضمون
کے شکریہ کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

...   .

نے دین اسلام کی تکمیل کرنے کے لیے سب سے آخیر میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم الانبیاء
بناکر بھیجا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم
۔ محمد تمھارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول اور سب نبیوں کے ختم پر ہیں۔
یا: الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔
تمھارے لیے تمھارے دین کو مکمل کردیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کردی اور تمھارے لیے اسلام کو تمھارے
ت سے قبول کرلیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رفیق اعلیٰ جلت قدرتہ کی طرف اس وقت تک
کیا جب تک اس کے پیغام کی تبلیغ، امانت کی ادائیگی، امت کی خیر خواہی اور اس کے لیے جہاد کا حق
ادیا۔ آپ نے مسلمانوں کو صاف ستھرے راستے پر چھوڑا جس کی رات بھی دن کی طرح روشن ہے۔ اس سے
وہی انحراف کرے گا جو گمراہ ہوگا، جو شخص اس راستہ کو چھوڑے گا وہ ہلاک ہوگا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے
ا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ ذالکم
یلم لعلکم تتقون۔ اور یہ کہ یہ دین میرا راستہ ہے جو کہ مستقیم ہے، سو اس راہ پر چلو اور دوسری

راہوں پر مت چلو کہ وہ راہیں تمہیں اللہ کی راہ سے جدا کر دیں گی، اس کا تمہیں اللہ نے تاکیدی حکم دیا ہے۔ تاکہ تم (اس راہ کے خلاف کرنے سے) احتیاط رکھو۔ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے ہر قسم کا انتظام فرما دیا ہے۔ انہیں اس کشمکش میں مبتلا نہیں کیا کہ وہ اچھے اور برے کی تمیز میں بھٹکتے رہیں۔ قرآن مجید میں مجملاً یا مفصلاً اس کا بیان بھی فرما دیا۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ امت کی بہتری اور اس کی دائمی عزت اسی میں ہے کہ اللہ کے دین پر مضبوطی سے عمل پیرا ہو۔ ارشادِ نبوی ہے: ترکت فیکم ما ان تمسکتم بہ لن تضلوا بعدی ابدا کتاب اللہ وسنتی۔ یعنی میں تمہارے درمیان ایسی چیز چھوڑ کر جا رہا ہوں کہ اگر تم مضبوطی سے اس پر عمل پیرا ہو تو میری وفات کے بعد بھی گمراہ نہ ہوگے، وہ ہے اللہ کی کتاب اور میری سنت۔

اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے جن چیزوں کی نشاندہی فرمائی ہے، اس میں ایک یہ بھی ہے کہ اسلام اور مسلمانوں کے بہت سے دشمن ہیں اور ان کی دشمنی ہمیشہ رہے گی۔ قرآن مجید اور سنتِ نبوی کی روشنی میں ہم اپنے دشمنوں کی تعیین کر سکتے ہیں، جو لوگ مسلمان نہیں ہیں وہی ہمارے دشمن ہیں۔ گویا جو شخص اسلام کے دینِ حق ہونے پر ایمان نہیں رکھتا وہی اسلام کا دشمن ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔ لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین آمنوا الیہود والذین اشرکوا۔ تمام آدمیوں سے زیادہ مسلمانوں سے عداوت رکھنے والے آپ یہود اور مشرکین کو پائیں گے نیز ارشاد فرمایا ولن ترضیٰ عنک الیہود ولا النصاریٰ حتی تتبع ملتہم اور کبھی خوش نہ ہوں گے آپ سے یہ یہود اور نصاریٰ جب تک کہ آپ (اللہ نہ چاہے) ان کے مذہب کے بالکل پیرو نہ ہو جائیں۔ نیز ارشاد فرمایا: ما یود الذین کفروا من اہل الکتاب ولا المشرکین ان ینزل علیکم من خیر من ربکم۔ ذرا بھی پسند نہیں کرتے کافر لوگ خواہ ان اہل کتاب میں سے ہوں اور خواہ مشرکین میں سے، اس امر کو کہ تمہیں کسی طرح کی بہتری بھی نصیب ہو تمہارے پروردگار کی طرف سے۔

مذکورہ بالا آیات نے وضاحت کر دی کہ اللہ کے دین کے دشمن یہود نصاریٰ مشرکین اور وہ لوگ ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرتے ہیں، اور وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے وجود کے قائل نہیں ہیں جیسے کمیونسٹ اور سوشلسٹ وغیرہ۔ یہ اللہ پر اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر ایمان ہی نہیں لاتے اور وہ بت پرست ہیں جو آگ کی، گنگا کی یا پتھروں کی پوجا کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ہر جگہ ہر زمانہ میں مسلمانوں کے

دشمن مذکورہ صفات والے ہی ہیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی بھی وضاحت فرمادی تھی کہ خود مسلمانوں میں سے کچھ لوگ ایسے نکلیں گے جو بظاہر اسلام کا نام لیتے ہوں گے لیکن وہ حقیقت میں گمراہ مشرک اور اللہ کے دین کے دشمن ہوں گے۔ فرمایا افترقت الیہود علی احدی وسبعین فرقۃ و افترقت النصاریٰ علی ثنتین وسبعین فرقۃ وستفترق امتی علی ثلاث وّسبعین فرقۃ کلھم فی النار الا واحدۃ قیل من ھِیَ یا رسول اللہ قال من کان علی مثل ما انا علیہ الیوم واصحابی۔ یعنی یہود اکہتر فرقوں میں اور نصاریٰ بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے اور عنقریب میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی اور ایک کے سوا سب جہنم میں ہوں گے۔ کسی نے پوچھا کہ اس ایک سے کیا مراد ہے؟ تو فرمایا: جو اس طریقہ پر ہوگا جو آج میرا اور میرے صحابہ کا ہے۔

بیشک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا، مسلمانوں میں بہت سے فرقے ہیں اور ہر ایک کا دعویٰ ہے کہ وہ اسلام پر عمل پیرا ہے حالانکہ اسلام ان سے بری ہے۔ بہت سے اہل طرق، عام طور سے شیعہ اور خوارج اور بھی بہت سے لوگ ہیں جو اپنے آپ کو مسلم کہتے ہیں حالانکہ وہ اسلام اور سچے مسلمانوں کے دشمن ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتادیا ہے کہ دشمنان اسلام ہر ممکن طریقے سے اسلام اور مسلمانوں سے جنگ کرتے رہیں گے۔ ارشاد فرمایا: ولا یزالون یقاتلونکم حتی یردّوکم عن دینکم ان استطاعوا اور یہ کفار تمہارے ساتھ ہمیشہ جنگ رکھیں گے، اس غرض سے کہ اگر (اللہ نہ کرے) قابو پائیں تو تمہیں تمہارے دین اسلام سے پھیر دیں۔ نیز ارشاد فرمایا: یاایھا الذین اٰمنوا لا تتخذوا بطانۃ من دونکم لا یالونکم خبالا ودّوا ما عنتم قد بدت البغضاء من افواھھم وما تخفی صدورھم اکبر اے ایمان والو! اپنے سوا کسی کو صاحب خصوصیت مت بناؤ۔ وہ لوگ تمہارے ساتھ فساد کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھیں گے، تمہاری مضرت کی تمنا رکھتے ہیں واقعی بغض ان کے منہ سے ظاہر ہو پڑتا ہے اور جس قدر ان کے دلوں میں ہے وہ تو بہت کچھ ہے۔

ہر ممکن طریقے سے جنگ کرنے سے میری مراد یہ ہے کہ فکری اقتصادی، اجتماعی، سیاسی اور جنگی، ہر طرح سے یہ لوگ مسلمانوں کو مغلوب کرنا چاہتے ہیں اور حقیقت میں امت اسلامیہ کے ساتھ ان کا برتاؤ اور معاملہ اس بات کی بھی دلیل ہے۔ صلیبی اور یہودی حملے جو مسلمانوں کے ملکوں پر کیے گئے اور برابر جاری ہیں، یہود و نصاریٰ نے جو مختلف قسم کے کلب اور تحریکیں قائم کر رکھی ہیں جیسے ماسونی تحریک، روٹری کلب، لائنز کلب وغیرہ۔ نیز

فلسفت عیسائی مشنریں جو برابر کوشش کر رہی ہیں کہ مسلمانوں کو دین کی روشنی سے نکال کر گمراہی کی تاریکی میں ڈال دیں نیز یہ کہ ان دشمنانِ اسلام کے اعوان والانصار نے تمام اسلامی ملکوں کی مسلم سوسائٹیوں پر ایسے گمراہ کن طریقہ اور ایسے غلط تعلیمی نظام اور ذرائع ابلاغ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگرام مقرر کردیے ہیں، جن سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں۔ عالم اسلام کے تمام بنکوں میں سودی کاروبار اور ربا۔ بات بالکل واضح ہے کہ اس طرز کے بنکوں کا مشرق و مغرب کی اقتصادیات پر قبضہ ہے۔ اس کے علاوہ ثقافتی لحاظ سے دشمنانِ اسلام نے جو اپنے ہیرو تیار کیے ہیں اور ان میں سے اکثر کو اہم جگہوں پر لا کر رکھا ہے، تاکہ وہ مسلمانوں کی زندگی میں دین و دنیا کی تفریق کردیں اور اس سے بھی ان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے دین سے الگ رکھیں۔ بہر حال مذکورہ بالا چیزوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کفر و اسلام کا معرکہ ہر جگہ اور ہر زمانہ میں چلتا رہے گا۔

جب اللہ تعالیٰ نے خود ہمارے لیے وضاحت فرمادی کہ یہ لوگ ہمارے دشمن ہیں تو ہمیں حکم بھی دیا کہ ہم ان سے ہوشیار رہیں۔ ارشاد فرمایا: هم العدو فاحذرهم یعنی وہ دشمن ہیں پس ہوشیار رہو ان سے، نیز اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ بھی حکم دیا کہ اس کے راستہ میں جہاد کرتے ہوئے اپنے دین، زمین اور آبرو کی حفاظت کرتے ہوئے ان سے مقابلہ کے لیے تیار رہیں، ارشاد فرمایا: واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل ترهبون به عدو الله وعدوكم وآخرين من دونهم لا تعلمونهم الله يعلمهم۔ ان کافروں کے لیے جس قدر تم سے ہوسکے ہتھیار سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو اور اس کے ذریعے سے تم (اپنا) رعب جمائے رکھو ان پر جو کہ (کفر کی وجہ سے) اللہ کے دشمن ہیں اور تمہارے دشمن ہیں اور ان کے علاوہ دوسروں پر بھی جن کو تم بالیقین نہیں جانتے، ان کو اللہ ہی جانتا ہے۔"

نیز ارشاد فرمایا: الذين آمنوا يقاتلون في سبيل الله والذين كفروا يقاتلون في سبيل الطاغوت فقاتلوا أولياء الشيطان إن كيد الشيطان كان ضعيفا۔ جو لوگ پکے ایماندار ہیں وہ تو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں اور جو لوگ کافر ہیں وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں تو تم شیطان کے ساتھیوں سے جہاد کرو بیشک شیطانی تدبیر لچر اور کمزور ہوتی ہے۔ اسی طرح کی بہت سی آیتیں اور بھی ہیں جو ہر مسلمان پر ہر وقت اور ہر جگہ اللہ کے راستے میں جہاد کو فرض قرار دیتی ہیں۔

اسی طرح سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی جہاد کے بارے میں کئی حدیثوں میں مذکور ہیں۔

اس وقت ایک ہی حدیث پر اکتفا کرتا ہوں۔ ارشاد فرمایا: والجہاد ماض منذ بعثنی اللہ الی ان یقاتل آخر ہذہ الامۃ الدجال لا یبطلہ جور جائر و لا عدل عادل۔ (ابوداؤد و مشکوٰۃ ص ۱۸) یعنی جہاد، جنگِ دجال تک جاری رہے گا، نہ تو ظالم کا ظلم روک سکتا ہے اور نہ کسی عادل کا عدل و انصاف۔ (کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ جہاد کو منسوخ کر سکے، کیونکہ یہ دین کی ان ضروریات میں سے ہے جن پر امت کا اتفاق ہے

...

بڑے تعجب کی بات ہے کہ بہت سے لوگ مذکورہ بالا آیتوں کی روشنی میں یہ سمجھتے نہیں کہ مسلمان اور کافر کے درمیان تعلقات کیسے ہونے چاہئیں۔ جب آپ کسی سے کہتے ہیں کہ "کافروں سے ہوشیار رہنا" تو وہ الٹا اعتراض کرتا ہے کہ لکم دینکم ولی دین یعنی (اس بارے میں) آپ کا طریقہ آپ کے ساتھ ہے اور میرا معاملہ میں جانوں، نیز یہ کہتا ہے کہ دین الگ چیز ہے اور معاملات اس سے الگ ہیں، یہ ایک سچی بات ہے لیکن اس سے غلط فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ آپ قرآن مجید میں اس قسم کی آیات کو غور سے پڑھیں اور پھر خود ہی فیصلہ کر لیں کہ مسلمان کو کسی کافر سے حقیقی دوستی ہو سکتی ہے؟ حقیقی مومن اپنے دین کی خاطر زندہ رہتا ہے، اسی کی روشنی میں وہ کسی سے محبت کرتا ہے یا نفرت اور بغض رکھتا ہے، دین ہی کی خاطر وہ لڑتا بھی ہے اور اسی کی بنیاد پر صلح یا بیع و شراء کا معاملہ کرتا ہے، حقیقی مومن کسی حال میں بھی دین کی تعلیمات کو پس پشت نہیں ڈالتا اور نہ اس کی متعین کردہ حدود سے تجاوز کرتا ہے

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: یایہا الذین آمنوا لا تتخذوا الیہود والنصاری اولیاء بعضہم اولیاء بعض ومن یتولہم منکم فانہ منہم ان اللہ لا یہدی القوم الظالمین۔ اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو دوست مت بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، اور جو شخص تم میں سے ان کے ساتھ دوستی کرے گا بیشک وہ انہی میں سے ہوگا۔ یقیناً اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

نیز فرمایا: یایہا الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء تلقون الیہم بالمودۃ وقد کفروا بما جاءکم من الحق۔ اے ایمان والو! تم میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو دوست مت بناؤ کہ ان سے دوستی کا اظہار کرنے لگو حالانکہ تمہارے پاس جو دین حق آچکا ہے وہ اس کے منکر ہیں۔

اس قسم کی اور بہت سی آیتیں ہیں۔ اب سمجھ لیجئے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ دشمنانِ اسلام کے ساتھ [illegible] کے عین مطابق ہے کتنا بڑا بہتان ہے۔ الاساء ما یزرون لیکن خوب یاد رکھو کہ گناہ کر کے اسے [illegible]

... وہ برا بوجھ ہے۔"

ہمیں دشمنوں کے درمیان بھی فرق کرنا چاہیے۔ ایک طرف ایسا کافر ہے جس کی دشمنی ظاہر ہے اور وہ ہمیشہ آپ کے ساتھ حالت جنگ میں ہے، اس سے ہمیں ہوشیار رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ دوسری طرف کافر ہے لیکن وہ جنگ پر آمادہ نہیں ہے نہ ہی اس سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچ رہی ہے تو اس سے آپ صلح کے ساتھ معاملہ کریں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لاینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین انما ینھاکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولٰئک ھم الظالمون۔ اللہ تعالیٰ تمھیں ان کے ساتھ احسان و انصاف کا برتاؤ کرنے سے منع نہیں کرتا جو تم سے دین کے بارے میں نہیں لڑتے اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالتے، اللہ تعالیٰ انصاف کا برتاؤ کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔ صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے اللہ تمھیں منع کرتا ہے جو تم سے دین کے بارے میں لڑتے ہوں (خواہ بالفعل یا بالعزم) اور تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہو اور (اگر نکالا بھی نہ ہو لیکن) تمھارے نکالنے میں (نکالنے والوں کی) مدد کی ہو، اور جو شخص ایسے لوگوں سے دوستی کرے گا سو وہ گنہ گار ہوگا۔

...

اس وقت ہمارے دشمن اس بات پر متفق ہیں کہ اسلام کا خاتمہ کر دیا جائے، آپ دنیا کے نقشہ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ (۱) افغانستان میں کمیونسٹ روس کیا کر رہے ہیں۔ (۲) فلسطین، فلپائن اور اریٹیریا (ایتھوپیا) میں یہود و نصاریٰ کے کیا منصوبے ہیں۔ (۳) کئی ملکوں میں مشرکین کا کیا پروگرام ہے؟ اور اسی طرح دوسرے بہت سے اسلامی ملکوں میں دشمنان اسلام یا ان کے اعوان و انصار کیا کر رہے ہیں اور ہر جگہ کے مظلوم مسلمان اپنے دینی بھائیوں سے مدد کے طلب گار ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر۔ اور اگر وہ تم سے دین کے معاملہ میں مدد طلب کریں تو تمھارا فرض ہے کہ ان کی مدد کرو۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ ایک دوسرے کی مدد کریں، اللہ کے دین کو مضبوطی سے پکڑیں اور اللہ کے راستے میں جہاد کے جھنڈے کو بلند کریں، اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا تو معاملہ برعکس ہو جائے گا۔ فلیضحکوا قلیلاً ولیبکوا کثیرا جزاء بما کانوا یکسبون، پس چاہیے کہ ہنسیں کم اور روئیں زیادہ ان کے ہی اعمال کی سزا ہے۔ صلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین وسلم تسلیما کثیرا۔

ایک نقطۂ نظر

(تیسری اور آخری قسط)

دورِ حاضر میں اسلام کی تعبیر و تشریح

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری

ملت کے لیے یہ امر افسوس ناک ہے کہ اس کے مختلف طبقے ہم آہنگ نہ ہوں۔ ان میں ذہن و فکر اور رجحان و خیال کا تضاد پایا جائے اور ایک طبقہ دوسرے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھے۔ اگر ان طبقات میں فکری ہم آہنگی موجود رہے تو وہ بے اطمینانی جس کا اظہار اعظمی صاحب کے مکتوب میں کیا گیا ہے نہ پیدا ہو۔ ان طبقات میں باہمی اعتماد و احترام کے لیے ضروری ہے کہ دینی مقاصد کی اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے ہر طبقہ اپنی ذمہ داری اور اپنی صلاحیتوں کے مناسب کام پر توجہ دے اور دوسرے طبقے سے متعلق ذہن صاف رکھے۔ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے بڑا دکھ ہوتا ہے کہ امت کے جس طبقہ کو دانشور کہا جاتا ہے وہ علماء کے طبقے سے جسے دینی امور و مسائل میں ذمہ دار سمجھا جاتا ہے اکثر کٹا کٹا سا رہتا ہے اور کبھی کبھی دونوں میں نوک جھونک بھی ہو جاتی ہے۔ اس صورتحال میں دونوں کی زبان و میدانِ عمل کے اختلاف کا جس قدر دخل ہے اس سے زیادہ نقطۂ نظر کے اختلاف اور دینی مقاصد کی اہمیت و عظمت کے احساس و عدمِ احساس کا ہے۔ علماء کو دینی علوم سے واقفیت کے باعث دین کا ترجمان مانا جاتا ہے، لیکن اس کا یہ مفہوم نہیں کہ وہ دین کی ترجمانی کے باب میں اپنی طرف سے جو چاہیں کہیں، نہ ہی انھیں اپنی حیثیت کے تسلیم کرانے سے متعلق کسی طرح کا اختیار ہے، حتیٰ کہ دین کی تائید و تقویت کے لیے بھی اگر وہ کوئی قدم خلافِ انصاف اٹھانا چاہیں تو انھیں اس کی اجازت نہیں، لیکن لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ علماء بیجا طور پر مذہب کی وکالت کرتے ہیں۔

ابھی قریب کی بات ہے ایک شعری نشست میں حاضری کا اتفاق ہوا، زیادہ حاضرین باشعور و دانشور

بقہ سے تعلق رکھتے تھے ۔ ایک شاعر جو فنکار و دانشور دونوں شمار کیے جاتے ہیں ۔ اپنے ایک شعر کی
ہید میں کہنے لگے کہ جس طرح مختلف امور و حیثیات کا استحصال ہوتا ہے اسی طرح عقیدہ کا بھی استحصال
جاتا ہے ۔ موصوف کا یہ جملہ طنز تھا ان کے اوپر جو عقیدہ و مذہب کی حمایت میں کچھ بولتے ہیں ۔ کیونکہ آج
ج کو ماننے اور اس پر ایمان رکھنے کا مفہوم یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ انسان اپنی مرضی کے مطابق جن امور میں چاہے
ین کی باتوں پر عمل کرے اور جن امور میں چاہے دیگر احوال و قوانین کو ملا لے ۔ اب اگر کوئی دین کی ہر بات پر عمل کو
روری قرار دیتا ہے اور اس روشنی میں ہر شخص سے متعلق فیصلہ کرتا ہے تو اس کو استحصال کہا جاتا ہے ۔

دینی احکام کے مجموعہ پر عمل کا مطالبہ خود قرآن نے کیا ہے ، اس میں کسی کی رائے یا رجحان کا دخل نہیں ۔ اسی طرح
قیدہ و عمل کے باب میں دینی احکام کی پابندی کو انسان کے لیے معیار بنانے کا فیصلہ قرآن ہی کا ہے ، لہذا اس فیصلہ
ہر کلمہ گو مسلمان کو تسلیم کرنا چاہیے ۔ لیکن تعجب ہوتا ہے کہ ایسے دانشور مسلمان بھی ہمیں ملتے ہیں جن کا خیال ہے کہ
طل پرست ، حق پرست اور نیک ہونے کے لیے اس طریقہ کی پیروی ضروری نہیں جس کا ذکر علماء اسلام کرتے ہیں
لہ اس کے بغیر بھی ایک شخص مسلم ہو سکتا ہے ۔ اسی طرح دینی احکام پر گفتگو و فیصلہ کے لیے علماء کے طبقہ سے ہونا
ضروری نہیں ۔ بلکہ کوئی اہل علم ان احکام و مسائل پر اپنا فیصلہ یا رائے دے سکتا ہے ۔ اس طرح کے خیالات ہمیں
قلدہ باشعور افراد اور بالخصوص جامعہ ملیہ کے بعض اہل قلم کے یہاں صراحت کے ساتھ نظر آتے ہیں ۔

ہمیں کسی شخص کو باطل پرست یا مذہب سے دور سمجھنے کا کوئی حق نہیں ، نہ ہی ہم اس کے خواہاں ہیں
لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ایک بات کا اعلان خود قرآن کر رہا ہے تو پھر اس سے متعلق ہم کیا موقف اختیار کر
سکتے ہیں ۔ قرآن کریم کی متعدد آیات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا گیا ہے کہ شرک ایسا گناہ ہے
س کے بعد ہر طرح کے نیک اعمال ضائع ہو جاتے ہیں ۔ اب اگر کسی کو یہ اصرار ہو کہ وہ اسلام و کفر یا حق پرستی
باطل پرستی کا فیصلہ اپنے معیار سے کرے گا تو پھر ایسے شخص کے بارے میں ہم کیا کہہ سکتے ہیں ۔؟

ابھی چند روز پہلے کی بات ہے مسٹر محمودری پدرے نے مسلم پرسنل لا پر حملہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ کیرالا
ئی کورٹ کی ایک مسلم جج خاتون اور سعودی عرب کے شاہی خاندان کا ایک فرد یہ بات کہہ چکے ہیں کہ آج اس شریعت
عمل نہیں ہو سکتا جو حضرت محمد ﷺ کے زمانہ میں رائج تھی ۔

مسلمانوں کی طرف سے خواہ وہ دانشور ہوں یا غیر دانشور اس طرح کی وضاحتوں بلکہ جسارتوں کے بعد ایک

انسان کس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے؟ اور اسے کس طرح یہ یقین ہو سکتا ہے کہ اسلامی احکام کی مناسب حال تعبیر و تشریح کے مطالبہ کے پیچھے کوئی تعمیری و ناصحانہ جذبہ کارفرما ہے۔؟

... ...

سائنس و ٹکنالوجی کی ترقی کا دور جب آیا تو عام طور پر ذہنوں میں یہ تصور پیدا ہوا کہ سائنس کی اولین زد مذہب پر پڑے گی اور اس کے نظریات و تصورات انسانی ذہن کی اس ترقی و بلند پروازی کا ساتھ نہ دے سکیں گے۔ لیکن لوگ یہ بھول گئے کہ اسلام دینِ فطرت ہے اور اس نے قرآن کی متعدد آیات میں انسانوں کو غور و فکر کی دعوت دی ہے کائنات اور اس کے رموز کی عقدہ کشائی کی جانب اشارہ کیا ہے، آسمان و زمین کی تخلیق، رات و دن کی آمد و شد، سمندر کی موجوں کے درمیان چلنے والے جہاز، ہوا اور بارش کا نظام، ماں کے پیٹ میں بچے کی نشو و نما اور اس طرح کے متعدد مسائل کو انسانی ذہن و فکر کی جولانگاہ قرار دیا ہے۔ پھر یہ تصور کہ انسانی ذہن کی اختراعات و ایجادات اور سائنس کے میدان میں اس کی ترقی سے مذہب پر کسی طرح کی زد پڑے گی، یقیناً ایک طرح کی سادہ لوحی تھی۔

چنانچہ ایک وقت آیا جب یہ ثابت ہو گیا کہ اسلام اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں بلکہ سائنس کی ایجادات اور اس کی دریافتوں سے اسلام کی تائید ہوتی ہے۔ اور بہت سے مشکل مسائل کا سمجھنا اس کے ذریعہ آسان ہو جاتا ہے شروع میں یہ موضوع بڑا دلچسپ اور متعدد لکھنے والوں کی توجہ کا مرکز رہا۔ یورپ کے متعدد اہلِ قلم نے نصرانی مذہب کو سامنے رکھ کر سائنس اور مذہب کے باہمی تعلق پر کتابیں تصنیف کیں۔ اسی طرح مشرق میں علماءِ اسلام نے سائنس اور اسلام کے موضوع پر مختلف مولفات پیش کیں۔ یورپ کے بعض مصنفین نے توراۃ، انجیل اور قرآن کے مضامین کا سائنس کے تجربات و نظریات سے تقابل بھی کیا ہے۔

مذہب اور سائنس کے موضوع پر انگریزی کی دو کتابوں کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ اور ان کا عربی وغیرہ زبانوں میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے۔

ایک کتاب نیویارک اکاڈمی کے صدر کریسی موریسن کی تصنیف ہے جس کا عنوان ہے۔ انسان بذاتِ خود قائم نہیں۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ محمود صالح فلکی نے کیا ہے اور اس کا عنوان رکھا ہے۔ سائنس کی دعوتِ ایمان ہے۔

دوسری کتاب امریکہ کے تیس ماہر سائنسدانوں کے مقالات کا مجموعہ ہے۔ ہر مقالہ نگار نے اللہ کے وجود اور اس پر ایمان تک رسائی کے لیے اپنے تجربہ کو واضح کیا ہے۔ اس کتاب کا عربی ترجمہ دمرداش سرحان نے کیا ہے، اس کا عنوان ہے! سائنس کے دور میں تجلی الٰہی۔

اس موضوع پر عرب علماء کی تصنیفات میں درج ذیل قابل ذکر ہیں:

سنن اللہ فی الکائنات (سنت الٰہیہ اور کائنات) از ڈاکٹر محمد احمد الغمراوی۔ مع اللہ فی السماء (خدا کے ساتھ آسمان میں) از ڈاکٹر احمد ذکی۔ قصۃ الایمان (ایمان کی کہانی) از شیخ ندیم الجسر۔ بین الدین والعلم، (سائنس اور مذہب) از عبدالرزاق نوفل۔ اللہ والعلم الحدیث (اللہ اور جدید سائنس) از مصنف مذکور۔ مغربی مصنفین کی مذکورہ کتابوں میں مذہب اور سائنس کے مابین عدم تضاد کو واضح کرتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ سائنس کے نظریات سے مذہبی مسائل کی تائید ہوتی ہے اور انسان خدا کے وجود اور اس پر ایمان کی ضرورت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

عرب مصنفین کی کتابوں میں اسلام اور سائنس کے موضوع پر اظہار خیال کیا گیا ہے اور قرآن کریم میں کائنات سے متعلق جن حقائق کو ذکر کیا گیا ہے ان کی تشریح کرتے ہوئے یہ واضح کیا گیا ہے کہ ان حقائق سے متعلق اب تک سائنس نے کوئی نئی بات نہیں کہی ہے، بلکہ قرآن میں جو کچھ بتایا گیا ہے، سائنس نے اس کی تشریح وتوضیح کی ہے۔ اس طرح سائنس کی تشریحات سے ایسے گوشے واضح ہوئے ہیں جن کا تذکرہ قرآن نے عبرت ونصیحت کے لیے اجمالی طور پر کیا ہے۔ نباتات، حیوانات، انسانی تاریخ اور موت کے بعد دوسری زندگی سے متعلق قرآنی آیات میں جو وضاحتیں کی گئی ہیں ان کو آج کی علمی ترقی کی روشنی میں دیکھا جائے تو وحی الٰہی کے اعجاز وبرتری کا پتہ چلتا ہے۔

سائنس اور مذہب کے باہمی رشتے سے متعلق مذکورہ کوششیں کافی نہیں کہی جا سکتیں۔ خصوصاً جبکہ سائنس کے نظریات وتجربات روز بروز ترقی پذیر ہیں۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ایسے افراد جنکی مذہب و سائنس دونوں کے نظریات پر نظر ہو اپنی کوششوں سے یہ واضح کریں کہ سائنس کی تحقیقات سے مذہب کے اصول واحکام کس طرح ہم آہنگ ہیں اور سائنسداں کے لیے مذہب کو ماننا کس طرح آسان ہو چکا ہے۔

آج مذہبی طبقہ اور سائنس کے ماہرین کے مابین جو ایک طرح کا بعد نظر آتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی زبان سے ناواقف ہیں، اس سلسلہ میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ دوری زبان یا

رجحان و افکار کی دوری ہوتی تو آج کے دور میں جبکہ سارے عالم کی طنابیں کھنچ چکی ہیں، ختم ہو جاتی اور دونوں طبقے مجال کار علیحدہ علیحدہ ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو سمجھتے اور باہمی تعاون سے کام کرتے۔ لیکن دونوں طبقوں کا جو پس منظر ہے وہ انہیں اکٹھا نہیں ہونے دیتا۔ ان کے مابین کسی وقت جو خود ساختہ تضاد دکھا دیا گیا تھا اس کے اثرات آج بھی موجود ہیں، اس لیے دونوں ایک دوسرے سے قریب آنے کے لیے پیش قدمی نہیں کر پا رہے ہیں، لیکن اگر دونوں کو اس ذمہ داری کا احساس ہو جائے جو دین کی تبلیغ و اشاعت کے سلسلہ میں کلمہ پڑھنے کے بعد ہر مسلمان پر عائد ہو جاتی ہے تو یقیناً دونوں اپنے آپ کو ایک ہی فوج کے دو دستے تصور کریں گے اور ملت کی بہبود و سربلندی کے لیے اپنی ساری توجہ مرکوز کر دیں گے۔

...

معروضات کے اختتام پر ایک ایسی شخصیت کے بعض تاثرات و تجربات پیش کرنا مفید سمجھتا ہوں جسے مذہبی اور باشعور و جدید تعلیمیافتہ دونوں طبقے کے لوگ اپنا نمائندہ تسلیم کرتے ہیں۔ یہ شخصیت مصر کے معروف عالم محمد قطب کی ہے، جو اس وقت مکہ مکرمہ کی ام القریٰ یونیورسٹی میں تدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

موصوف ایک کٹر مذہبی خاندان کے فرد اور «فی ظلال القرآن» کے مصنف شہید سید قطب کے بھائی ہیں۔ ان دونوں بھائیوں نے مذہب و ادب کے میدان میں موجودہ نسل کی رہنمائی کے لیے جو کارنامے انجام دیے ہیں، انہیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مغرب کی مادی تہذیب اور اس کے ایمان و اخلاق سوز اثرات سے انسانیت کے تحفظ کے لیے ان کی کوششیں قابلِ فخر ہیں۔ مغرب نے علم و تحقیق اور موضوعیت و معروضیت وغیرہ ناموں سے اسلام کے خلاف تشکیک و تغلیط کی جو فضا قائم کر رکھی تھی اس کی حقیقت واضح کرنے میں ان کا کردار مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ اسلامی دعوت کی اشاعت کی راہ میں ان کا تجربہ طویل ہے اس لیے ان کے تاثرات کی بڑی وقعت ہے۔

محمد قطب کی ایک کتاب «شبہات حول الاسلام» کے نام سے معروف ہے، میرے سامنے اس کا سولہواں ایڈیشن ہے جو ۱۹۸۰ء میں شائع ہوا ہے، اس کا اردو ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ کتاب میں تقریباً سترہ جدید یا ایسے قدیم موضوعات پر اظہارِ خیال کیا گیا ہے جو جدید ذہن کے شکوک و شبہات کا محور ہیں۔ فاضل مصنف نے بڑی گہری نظر اور مومنانہ فراست سے ہر موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے اور ہر موضوع سے متعلق معروف و

معقول اعتراض کا تسلی بخش و مسکت جواب دیا ہے۔ یہ کتاب متدین نوجوانوں میں بیحد مقبول ہے اور تمام لوگوں کے لیے بہت زیادہ مفید ہے جو موجودہ دور میں اسلام سے متعلق شک و شبہ میں مبتلا ہیں یا ایسی ذہنیت رکھنے والوں سے ان کا سابقہ ہے۔

اس موقع پر کتاب کے موضوعات سے ہمیں بحث نہیں، بلکہ مقدمہ سے کچھ استفادہ مقصود ہے، کیونکہ اس میں مصنف نے اپنا ایک نقطۂ نظر پیش کیا ہے جو ہمارے موضوع سے متعلق اور اس سلسلہ میں فیصلہ کن ہے۔

ابھی ہم نے جس کتاب کا ذکر کیا ہے، اس کا موضوع یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کے جن پہلوؤں پر کسی طبقہ کو اعتراض ہے اس کو پیش کر کے اس کا جواب دیا جائے اور اس طرح مذہب اسلام کا دفاع ہو۔ یہ کام علماء نے اس وقت سے شروع کیا ہے، جب سے اسلام پر اعتراضات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور بظاہر یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسلام پر جو اعتراضات مختلف اوقات میں ہوتے رہتے ہیں ان کا جواب دیا جائے۔ مگر اس سلسلہ میں محمد قطب نے ایک پتے کی بات کہی ہے جسے ہم یہاں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

ان کا کہنا ہے کہ اپنی کتاب شبہات حول الاسلام کو میں اپنی تصنیفات کے دائرہ سے خارج کر کے اس کی اشاعت روک دینا چاہتا ہوں، کیونکہ اپنے جس نظریہ کی بنیاد پر میں نے یہ کتاب تصنیف کی تھی اس میں اب تبدیلی آگئی ہے، پہلے میں سوچا کرتا تھا کہ اسلام پر جو اعتراضات ہوتے ہیں ان کو بیان کر کے جواب دینا چاہیے، جس طرح قرآن کریم میں مخالفین اسلام کے شبہات کو بیان کر کے ان کی تردید کی گئی ہے۔

لیکن اب میرا موقف بدل گیا ہے، میں یہ سوچتا ہوں کہ مخالفین کے شبہات کو نقل کرنے کے بعد جواب دینے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم ان شبہات کو معقول و قابل توجہ سمجھتے ہیں، اسی لیے ان کا جواب دیتے ہیں، دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کا دین عیوب سے سلامتی کے سلسلہ میں ہماری کوششوں کا محتاج ہے۔

آگے لکھتے ہیں: دعوت کے میدان میں تجربہ سے یہ ثابت ہوا کہ شبہات کا جواب دینا دعوت کا صحیح طریقہ نہیں، بلکہ صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسلام کے حقائق کو مثبت طور پر لوگوں کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اعتراضات کے جواب کی جانب توجہ نہ دی جائے ہاں مذکورہ حقائق کی توضیح کے دوران ضمنی طور پر اگر کوئی بات قابل وضاحت محسوس ہو تو اس کی توضیح کر دینی چاہیے۔ قرآن کریم نے مخالفین کے سلسلہ میں یہی طریقہ اختیار کیا ہے

پرجوش نوجوان مخالفینِ اسلام کے ساتھ بحث و مباحثہ کا جو سلسلہ قائم کیے ہوئے ہیں وہ اتنی توجہ کا

مستحق نہیں، کیونکہ مخالفوں کی اکثریت کو حقیقت و معرفت کی جستجو نہیں ہے۔ بلکہ وہ صرف شبہات کو پھیلانا چاہتے ہیں، تاکہ لوگوں میں فتنہ ڈال سکیں۔

ایسے لوگوں کا صحیح جواب ان کے ساتھ بحث و مباحثہ نہیں بلکہ اس کے لیے مخلص مسلمانوں کی ایسی جماعت تیار کرنا مفید ہوگا جو اسلام کی حقیقت سمجھ کر عملی طور پر اس کی پابند ہو۔ یہ جماعت عملی نمونہ ہو ان تمام احکامات و تعلیمات کا جن کی دعوت اسلام نے دی ہے۔ اسلام کو عملی زندگی میں نافذ کرنا ہی اصل میں تبلیغ اسلام کا سب سے بڑا ذریعہ ہے

موصوف آگے لکھتے ہیں کہ اسی لیے میں اپنی کتاب شبہات حول الاسلام کو اپنی تصنیفات کے دائرہ سے خارج کرنا چاہتا ہوں، مگر مجبوری یہ ہے کہ اگر میں اسے شائع کرنے کی اجازت نہ بھی دوں تو ناشرین اس کو شائع کرتے رہیں گے کیونکہ اس کی مانگ دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔

آج جن لوگوں کو مثقف (Cultured) کہا جاتا ہے انھیں اسلام کے سلسلہ میں صرف انھی شبہات و اعتراضات کا علم ہے جسے اسلام کے مخالفین نے مغربی سماج کے توسط سے ہر جگہ پھیلا رکھا ہے اسی لیے وہ لوگ کبھی تو دین کو حکومت و سیاست سے اور کبھی علم و سائنس سے علیحدہ رکھنے کی بات کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اصل میں یہ نہیں سمجھ پاتے کہ یورپ میں نصرانیت کے نام پر جس مذہب کو رواج دیا جا رہا تھا اور جس کے ساتھ سائنس کے نظریات کا تصادم ہوا، اُس میں اور اِس مذہب اسلام میں کیا فرق ہے جس کی دعوت اہلِ اسلام پیش کرتے ہیں۔"

(مقدمہ کتاب الشبہات حول الاسلام از محمد قطب)

موجودہ دور میں جبکہ مغرب کے سامراجانہ نظام کی نوعیت بدل گئی ہے اور اس کے بہت سے عزائم و مقاصد کھل کر سامنے آچکے ہیں، ہمیں قوی امید ہے کہ مسلمانوں کا باشعور طبقہ اسلامی شریعت کی تنگ دامانی اور علماءِ اسلام کے جمود اور روایت پرستی کا شکوہ کرنے کے بجائے اپنی فکری و عملی کوششوں کے ذریعہ اسلام کی عملی ترجمانی کی مثالیں قائم کرے گا اور ثابت کرے گا کہ اسلام دین و دنیا دونوں کی بھلائی کا ضامن اور انسانیت کیلئے رحمت کا پیغام ہے۔

بقیہ ص ۱۳ کا: ... کے طویل عرصہ میں بھی نہ کر سکا قرآن نے چند ثانیہ میں کر دکھلایا تھا۔
امتِ مسلمہ کی کامیابی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے متاعِ گم گشتہ قرآن مجید کو سینے سے لگائے اور اس پر جادہ پیما ہو۔

اتفاق اور اتحاد کے زرّیں اصول

- ...را تمام انسان ایک ہی اصل سے ہیں۔
- لوگو! تمہارے اندر نسل اور وطن کے اختلاف کوئی جوہری چیز نہیں ہے، کیوں کہ اصل میں تم سب ایک ہی ہو۔
- لوگو! کنبوں اور قبیلوں کا یہ اختلاف محض جان پہچان کے لیے ہے۔ آپس کے بغض و عناد، ایک دوسرے پر تفاخر اور باہمی لڑائی جھگڑوں کے لیے نہیں ہے، اس اختلاف میں انسانی اصل کی وحدت (ایکتا) کو نہ بھولو۔
- لوگو! اگر تم میں کوئی حقیقی تفریق ہے تو وہ اخلاق اور اعمال کی نیکی اور بدی کی بنا پر ہے اس لیے
- لوگو! تقویٰ، پرہیزگاری اور دینِ الٰہی پر استقامت سے جم جاؤ۔
- لوگو! انصاف کرو اور انصاف پر قائم رہنے کی تبلیغ کرو۔
- لوگو! جو چیز اپنے لیے خود پسند نہیں رکھتے ہو وہ دوسروں کے لیے بھی مت چاہو۔
- لوگو! خود صبر سے کام لو، ایک دوسرے کو صبر کی تعلیم دو اور آپس میں ملے جلے رہو۔
- لوگو! باہمی خلش اور آویزش سے باز آجاؤ، ورنہ تمہارے اندر بزدلی آجائے گی اور تمہاری طاقت جاتی رہے گی۔
- لوگو! سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑلو اور آپس میں پھوٹ مت ڈالو۔
- لوگو! آپس کی ہمدردی میں بھائی بھائی بن کر رہو۔
- لوگو! بنی آدم کی مثال ایک جسم کے مختلف اعضاء کے مانند ہے جو پیدائش میں ایک ہی جوہر سے پیدا ہوئے ہیں۔ اگر خدانخواستہ بیماری یا کسی دوسری وجہ سے کسی ایک عضو میں بھی درد ہوجاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی دوسرے اعضاء بھی تکلیف اور بے چینی میں بے قرار ہوجاتے ہیں اور ان پر آرام اور سکون حرام ہوجاتا ہے۔

مرسلہ: عبدالسلام۔ بی ٹی ای۔ ایم اے
بھیلواڑہ۔ راجستھان

(آخری قسط)

شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ

کیا مولانا مدنی نے اپنی رائے سے رجوع کرلیا تھا؟

مولانا محفوظ الرحمٰن فیضی مدرس جامعہ فیض عام مئو

مولانا مدنی کا رجوع اور اس کی حقیقت :

مولانا حسین احمد مدنی مرحوم نے شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب رح کے متعلق "شہاب ثاقب" کے اندر جو بے سروپا باتیں لکھ دی تھیں ان سے ـــ جیساکہ مولانا نعمانی صاحب نے بیان فرمایا ہے ـــ تالیف کے کوئی تیرہ چودہ برس بعد ۱۹۲۵ء میں ایک اخباری بیان کے ذریعہ رجوع کرلیا تھا جو اس وقت مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے روزنامہ اخبار "زمیندار" میں شائع ہوا تھا۔ شیخ الاسلام کے بارے میں مولانا مدنی مرحوم نے مذکورہ کتاب میں جو کچھ لکھا تھا اسے اس بیان میں اپنی تحقیق سے تعبیر کیا ہے، مگر ایک ایسی تحقیق جس کی بنیاد محض افواہوں یا شیخ کے مخالفین کے اقوال پر تھی۔ مولانا مدنی کے نام نہاد اخباری رجوع کا متن ـــ جو مولانا نعمانی نے نقل کیا ہے ـــ درج ذیل ہے:

"مجھ کو اس امر کے اعلان کرنے میں ذرہ پس و پیش نہیں ہے کہ میری وہ تحقیق جس کو بخلاف اہل نجد، رجوم المذنبین، اور "الشہاب الثاقب" میں لکھ چکا ہوں اس کی بنا ان کی کسی تالیف و تصنیف پر نہ تھی بلکہ محض افواہوں یا ان کے مخالفین کے اقوال پر تھی، اب ان کی معتبر تالیف بتارہی ہے کہ ان کا خلاف اہل سنت والجماعت سے اس قدر نہیں ہے جیساکہ ان کی نسبت مشہور

کیا گیا ہے۔ بلکہ چند جزوی امور میں صرف اس درجہ تک ہے کہ جس کی وجہ سے ان کی تکفیر، تفسیق یا تضلیل نہیں کی جاسکتی، واللہ اعلم۔

(اعلی البیان ص ۹ بحوالہ روزنامہ زمیندار، لاہور مورخہ ۱۱ مئی ۱۹۲۵ء)

(واضح رہے کہ یہ اخباری بیان بالکل جعلی اور غلط ہے۔ (جس کی تفصیل ہم آگے بیان کریں گے۔)

البتہ مولانا النعمانی نے صرف یہی نہیں کہ اس بیان کو پورے وثوق کے ساتھ نقل کیا ہے بلکہ مولانا، ق کے رجوع کرنے کی وجہ اور اس کا پس منظر بھی وضاحت وتفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے :

جب ۱۹۲۴ء میں حرمین شریفین پر سلطان ابن سعود کا قبضہ ہوگیا اور انھوں نے اپنے دینی مسلک اور "وہابی حکومت" کی قدیم روایات کے مطابق سختی سے دینی اصلاحات نافذ کیں تو ہندوستان بھر کے قبوری مبتدعین کے تمام طبقوں نے متحد ہو کر یہاں ایک "جنگ عظیم" برپا کردی اور زور وشور کے ساتھ ملک گیر پیمانہ پر تحریک چلائی کہ چونکہ مکہ شریف اور مدینہ شریف پر نجدی وہابیوں کا قبضہ ہوگیا ہے اور وہ دنیا بھر کے کافروں سے بدتر قسم کے کافر ہیں، اس لیے جب تک ان کا قبضہ ہے، کوئی مسلمان حج کو نہ جائے۔ اس سلسلہ میں وہابیوں کے خلاف "الشہاب الثاقب" کی وہ عبارتیں بھی پیش کی جاتی تھیں جن کا پہلے ذکر کیا جاچکا ہے۔ اس طرح مسلمانوں کو حج سے روکنے کے لیے حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی عبارتیں اور ان کا نام بھی استعمال ہو رہا تھا، اس وقت لوگوں نے اس بارے میں مولانا سے سوالات کیے۔ تب آپ نے اس مسئلہ پر از سر نو غور کرنے کی ضرورت محسوس کی اور اس کے بعد آپ نے مندرجہ بالا اخباری بیان جاری کیا۔

الشہاب الثاقب کی تصنیف کا پس منظر :

مناسب ہوگا کہ ناظرین مولانا مدنی مرحوم کے مجوزہ نام نہاد اخباری رجوع کی حقیقت جاننے اور اس پر کوئی تبصرہ پڑھنے سے پہلے "الشہاب الثاقب" کی تصنیف کے اس پس منظر سے بھی واقف ہو جائیں اور اسے پیش نظر رکھیں جسے خود محترم مولانا نعمانی صاحب نے بیان فرمایا ہے۔ نیچے اس کا خلاصہ پیش کیا جارہا ہے۔

"اسی زمانہ میں ہندوستان کے قبوری مبتدعین کے گروہ اور قائد وامام مولوی احمد رضا خان بریلوی نے

جماعت علماء دیوبند کے اکابر مشائخ کی قطعی تکفیر کا فتویٰ تیار کیا اور ان کی طرف نہایت خبیث کافرانہ عقائد منسوب کیے اور ان کی بنا پر ان حضرات کو کافر قرار دیا اور یہ بھی لکھا کہ جو کوئی ان کے کفر و ارتداد میں شک و شبہ کرے وہ بھی ایسا ہی کافر و مرتد ہے۔ رضا خان نے یہ فتویٰ عربی زبان میں تیار کیا اور ہندوستانی عوام کی نگاہ میں اس کو زیادہ معتبر بنانے کے لیے ۱۳۲۲ھ میں حرمین شریفین کا سفر کیا اور وہاں کے بہت سے علماء کی اس فتویٰ پر پرجوش تصدیقات حاصل کرلیں۔ یہی فتویٰ علماء حرمین کی تصدیقات اور اردو ترجمہ کے ساتھ "حسام الحرمین" کے نام سے ہندوستان میں شائع کیا گیا اور یہاں کے قبوری بتدعین کی طرف سے پورے زور و شور کے ساتھ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ مکہ شریف اور مدینہ شریف کے علماء کرام اور مفتیان عظام نے بھی علماء دیوبند کے اکابر (مولانا نانوتوی اور مولانا گنگوہی وغیرہ) کو کافر و مرتد قرار دیا ہے اور فتویٰ دیا ہے کہ جو کوئی ان کو کافر نہ کہے یا ان کے کافر ہونے میں شک کرے وہ بھی کافر و مرتد و جہنمی ہے .... واقعہ یہ ہے کہ قبوریوں کی اس چال اور اس پروپیگنڈہ نے ہندوستان کے بیچارے عوام مسلمانوں کو جو حقیقت حال کو خود نہیں سمجھ سکتے تھے، سخت فتنہ میں مبتلا کر دیا تھا اور جماعت علماء دیوبند پر فرض ہو گیا تھا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان امتیوں کو فتنہ و گمراہی سے بچانے کے لیے مولوی احمد رضا خاں صاحب کے لگائے گئے ہوئے الزامات کی جواب دہی اور اپنے مسلک کی وضاحت کرے ...... اس سلسلہ میں اکابر علماء دیوبند کی طرف سے چند تحریری بیانات اور رسالے شائع ہوئے .... مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ...... "حسام الحرمین" کی تردید میں ایک رسالہ لکھا، اسی کا نام "الشہاب الثاقب" ہے۔ اس میں مولانا ممدوح نے پورے بسط و تفصیل کے ساتھ مولوی احمد رضا خاں صاحب کے الزامات و افتراءات کی تردید اور اپنے مشائخ علماء دیوبند کے عقائد و مسلک کی وضاحت کی ہے۔ اسی ضمن میں اس الزام کی بھی پوری تردید کی ہے کہ علماء دیوبند "وہابی" یعنی شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیرو ہیں۔[۱] اور شیخ اور علماء دیوبند کے عقائد و اعمال کے مابین فرق اور شیخ سے بے تعلقی بلکہ شدید غیظ و غضب اور وہابیت سے برات ظاہر کرتے ہوئے وہ کچھ لکھا ہے جسے ناظرین گزشتہ صفحات میں پڑھ آئے ہیں۔

یہ تھی وہ فضا اور ماحول جس میں "الشہاب الثاقب" جیسی جذباتی کتاب لکھی گئی۔ ناظرین غور فرمائیں کہ

---

[۱] مولانا نعمانی کی کتاب ص ۸۴ - ۸۶

ایسے جذباتی ماحول میں اور ایسے جذباتی موضوع پر جو کتاب لکھی گئی ہو اور وہ بھی ماوشما کے قلم سے نہیں بلکہ مرکز عقیدت دارالعلوم دیوبند کے استاد حدیث شیخ مدینہ حضرت مولانا حسین احمد مدنی جیسے بزرگ کے اثرانگیز قلم سے جو معرفت و سلوک کی منازل کو تیز رفتاری کے ساتھ طے کر کے آئندہ جلد ہی، قطب العالم، شیخ الاسلام و المسلمین کے بلند مقام پر فائز ہو گئے تھے اور جن کے ارادتمندوں کا حلقہ عرب و عجم میں پھیلا ہوا تھا اور جن سے علماء اور مشائخ اور عوام بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ تو وہ کتاب حلقہ دیوبند میں کس درجہ مقبول ہوئی ہوگی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی ہوگی۔ اور مجلسوں میں پڑھی گئی ہوگی ــــ اور کس طرح عوام و خواص کے ذہنوں کو اس نے شیخ محمد بن عبدالوہاب کے خلاف متاثر اور مسموم کیا ہوگا۔ نیز قبوری مبتدعین نے بھی اسے شیخ اور ان کی جماعت کے خلاف نفرت انگیزی اور پروپیگنڈہ مہم میں کتنا استعمال کیا ہوگا۔ یہ سب بیان کرنے کی حاجت نہیں ہے۔ عیاں راچہ بیاں۔

مولانا مدنی کے اخباری رجوع سے متعلق چند معروضات :

مذکورہ بالا صورتحال نگاہ میں ہو تو لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے اہم معاملے میں اور شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب کے خلاف بے شمار لوگوں کے ذہنوں میں شہاب ثاقب کی پیدا کردہ بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کے ازالہ اور اتنے دور رس نفرت انگیز اثرات کی تلافی اور ہمیشہ کے واسطے ان کی بندش بندی کے لیے کیا ایک مختصر سا اخباری بیان شائع کرا دینا کافی تھا؟ وہ بھی کسی موقر ماہنامہ میں نہیں (کہ مدت تک محفوظ رہتا اور لوگوں کی نظروں سے گزرتا رہتا۔) بلکہ ایک اردو روزنامہ میں ــــ کوئی اردو روزنامہ اخبار خواہ کتنا ہی کثیر الاشاعت سہی مگر اس کی زندگی ہی عموماً کیا ہوتی ہے؟ ہفتہ دس دن، مہینہ برس دن! اس کے بعد تلاش کیجیے تو شاید ہی مل جائے (کسی بڑی لائبریری میں بھی بمشکل تمام ہی ملے گا۔) اور جوں جوں مدت گزرتی جاتی ہے اس کے ملنے کی امید موہوم ہوتی جاتی ہے۔ اور اس میں شائع شدہ چیزیں اور بیانات نسیاً منسیا ہو جاتے ہیں۔

مولانا مدنی کا اخباری بیان کیسے اور کہاں ملا؟

چنانچہ مولانا مدنی کے زیر بحث اخباری بیان کا حال یہی ہوا۔ خود مولانا نعمانی مدظلہ لکھتے ہیں کہ "اس مضمون کے لکھتے وقت میری بڑی خواہش تھی کہ مجھے کہیں سے اس (اخباری بیان) کا پتہ چل جائے۔

لیکن امید نہیں تھی کہ ۵۰ – ۵۵ سال پہلے کا اخبار کا وہ پرچہ کہیں مل سکے گا۔" (ص ۸۱)

اور واقعی مولانا کو اس پرچہ کے بارے میں کہیں سے کوئی اطلاع نہیں مل سکی۔ مولانا حسین احمد مدنی رح کے عام معتقدین کیا خواص مریدین و خلفاء مجازین میں سے بھی کسی نے اس کے بارے میں کوئی پتہ نہیں دیا۔ بیان ملا بھی تو نقل در نقل صورت میں۔ چنانچہ مدراس کے مولانا مرحوم کے ایک شاگرد اور مسترشد مولانا شاہ صبغۃ اللہ بختیاری نے مولانا نعمانی کو اطلاع دی کہ مولانا مرحوم کا وہ بیان "زمیندار" لاہور کے حوالے سے مولوی حافظ عزیز الدین مراد آبادی کی تصنیف "اکمل البیان" میں بھی شائع ہوا تھا، مولانائے محترم کو اسی کتاب سے مولانا مدنی کا مطلوبہ اخباری بیان کسی طرح مل گیا۔

— یعنی یہ نہیں ہوا کہ مولانائے نعمانی کے زیر تبصرہ مضمون شائع ہوتے ہی علماء دیوبند یا مولانا مدنی کے منتسبین و متوسلین کی طرف سے مولانا نعمانی کو خطوط ملنے لگے ہوں کہ وہ بیان ہماری نظر سے بھی گزرا ہے اور ہماری جماعت کے فلاں فلاں پرچوں اور رسالوں میں بھی شائع ہوا تھا اور ہمارے فلاں عالم کی کتاب میں بھی منقول ہے اور فلاں صاحب کی کتاب میں موجود ہے — یہ کچھ بھی نہیں ہوا۔ جیسا کہ مولانا کی تحریر سے اندازہ ہوتا ہے۔

بلکہ وہ بیان دستیاب بھی ہوا تو کہاں؟ — ایک "اہلحدیث" عالم مولانا حافظ عزیز الدین مراد آبادی رحمۃ اللہ علیہ[1] کے یہاں، جنھوں نے اسے اپنے ایک مقالہ میں ضمناً درج کر لیا تھا۔ جو ایک بریلوی کی کتاب "اطیب البیان فی رد تقویۃ الایمان" کے جواب میں شائع ہوا تھا۔ وہ مقالہ کئی سال تک مشہور ہفتہ وار "اہلحدیث" امرتسر میں شائع ہوتا رہا اور پھر ایک "اہلحدیث" مکتبہ "المکتبۃ السلفیہ" لاہور سے کتابی شکل میں "اکمل البیان" کے نام سے شائع ہوا، محترم مولانا نعمانی نے مولانا مدنی رح کا بیان اسی سے نقل کیا ہے۔

اس تفصیل سے دو باتیں معلوم ہوئیں:

اس تفصیل سے دو باتیں نہایت واضح طور پر سامنے آئیں، اول یہ کہ مولانا مدنی رح کی مقبول تصنیف

---

[1] مولانا نعمانی صاحب نے اپنی کتاب میں نواب والا جاہ رح کے اہلحدیث ہونے کی بار بار صراحت کی ہے (حالانکہ یہ معلوم و مشہور چیز ہے) اسی طرح مولانا مسعود عالم ندوی رح کے نام کے ساتھ بھی "سلفی" بڑھانا نہیں بھولے ہیں، مگر مولانا مراد آبادی کے نام کے آگے پیچھے کوئی ایسا لقب نہیں لگایا ہے، جس سے ان کا اہلحدیث ہونا ظاہر ہو، خدا جانے اس میں کیا مصلحت تھی؟

۔ انقلاب انگلستان ۔ نے شیخ الاسلام محمد بن عبد الوہاب کے خلاف جو دور رس اور پائیدار مضر اثرات عوام و خواص کے ذہنوں میں پیوست کیے اس کے ازالہ کے لیے اردو روزنامہ میں ایک اخباری بیان کی اشاعت پر اکتفا کیا گیا۔ یعنی ایک ناپائیدار اور وقتی تدبیر اختیار کرنے کو کافی سمجھا گیا۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ حلقہ دیوبند نے مولانا مدنی مرحوم کے رجوع اور اخباری بیان کی تشہیر، اشاعت اور اس کی حفاظت اور آئندہ نسلوں تک اسے پہنچانے کی کوشش نہیں کی، یا اس کا وہ اہتمام نہیں کیا جس کی بہرحال ضرورت تھی، تاکہ اس کا فائدہ عمومی بھی ہوتا اور وہ محفوظ بھی ہو جاتا۔ اسی عدم اعتنا کا یہ نتیجہ ہے کہ عوام تو درکنار خواص کو بھی تو، اس کا آج علم نہیں ہے اور ثبوت میں پیش کرنے کے لیے ان کے پاس یہ بیان اپنے کسی ہفتہ وار یا ماہنامہ یا کتاب میں محفوظ نہیں ہے

مولانا مدنی نے اپنے خیالات سے رجوع نہیں کیا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا مدنی کے رجوع کا مذکورہ اخباری بیان محض افسانہ ہے جس کی کوئی اصلیت نہیں۔

سب سے پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ مولانا مدنی کے متوسلین اور عقیدتمندوں کا حلقہ آسام سے لے کر کراچی تک پھیلا ہوا تھا اور اس حلقے سے ہزاروں نہیں تو سیکڑوں اخبارات و رسائل ضرور شائع ہوتے تھے، جن میں سے بعض بعض بہت ہی زیادہ مقبول تھے اور اپنا نہایت وسیع حلقہ اشاعت رکھتے تھے، لیکن کیا یہ بات کسی عجوبہ روزگار سے کم ہوگی کہ مولانا مدنی کے اس بیان کو ان کے اس پورے حلقہ ارادت میں کہیں جگہ نہ ملی بلکہ جو اماں ملی تو کہاں ملی"؟ مولانا ظفر علی خاں کے اخبار "زمیندار" میں جو سیاسی طور پر مولانا کے نہایت سخت مخالف حریف اور اس طبقہ سیاست کے سرخیل تھے جن کا ترانہ بالآخر مولانا مدنی کے متعلق یہ ٹھہرا ہے۔ ~

عجم ہنوز نہ داند رموز دیں ورنہ | ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی ست!
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن ست | چہ بے خبر ز مقام محمد عربی ست!
بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست | اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست!

(یعنی عجم اب بھی دین کے اسرار نہیں جانتا۔ ورنہ دیوبند سے حسین احمد؟ یہ کیا بوالعجبی ہے۔ اس نے اسٹیج کے اوپر سے یہ راگ الاپا کہ قوم وطن سے ہے۔ وہ محمد عربی کے مقام سے کس قدر ناواقف ہے۔ اپنے آپ کو مصطفےٰ

صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا کر وہی سراپا دین ہیں، اگر وہاں تک نہ پہنچا یا تو سب کی سب بو الہبی ہے۔)

کیا یہ بات کسی طرح باور کی جا سکتی ہے کہ مولانا مدنی کا ایک اتنا اہم اور ذمہ دارانہ بیان صرف ایسے حریف کے یہاں شائع ہونے کا مستحق تھا اور مولانا کے متوسلین کے لیے درخور اعتنا نہ تھا۔

رجوع سے متعلق اس اخباری بیان کے افسانہ ہونے کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ "الشہاب الثاقب" مولانا مدنی کے مذکورہ نام نہاد اخباری رجوع کے بعد بھی شائع کی جاتی رہی اور انکی خرافات وافترا ات، کے ساتھ شائع کی جاتی رہی جن سے مولانا مرحوم نے اس بیان کے مطابق "رجوع" کر لیا تھا اور وہ اپنا کام کرتی رہی۔ اور آج تک اسی طرح اس کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ — مگر مجھے بلکہ مولانا نعمانی کو بھی نہیں معلوم کہ مولانا مدنی نے حین حیات یا ان کے مسترشدین ومتوسلین اور علماء دیوبند نے ان کے بعد ناشرین کو اس پر ٹوکا ہو اور یہ تاکید کی ہو کہ یہ کتاب "رجوع" سے متعلق اخباری بیان کو شامل کیے بغیر شائع نہ کی جائے — حد تو یہ ہے کہ محترم مولانا نعمانی صاحب نے بھی اس کی اسی طرح اشاعت پر نہ کسی تاسف کا اظہار کیا ہے نہ ناشرین کو یہ مشورہ ہی دیا ہے کہ کم از کم اب اس کی آئندہ اشاعتوں میں یہ اخباری بیان ضرور شامل کر لیا جائے تاکہ یہ کتاب شیخ کے بارے میں مزید غلط فہمی کا سبب نہ بننے پائے۔

حالانکہ بقول نعمانی صاحب مولانا مدنی مرحوم نے شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کے بارے میں اپنی سابقہ رائے سے رجوع کر لیا تھا اور ان کے نزدیک یہ محقق ہو گیا تھا کہ وہ باتیں جو انھوں نے شیخ کے بارے میں "الشہاب الثاقب" میں بالتحقیق لکھدی تھیں، بے بنیاد اور محض غلط تھیں، تو حق یہ تھا کہ کتاب کے اس حصہ پر نظر ثانی فرما کر اسے حذف کر دیتے۔ پوری کتاب کا معاملہ نہیں تھا، صرف چند صفحات کی بات تھی۔ مولانا کی معروف زندگی میں بھی اتنی فرصت نکل آنی کوئی مشکل نہیں تھی۔ یا پھر کسی لائق مسترشد کو حکم فرما دیتے اور وہ یہ کام بآسانی انجام دیدیتا، یا پھر کم از کم اس بیان کو جزو کتاب بنا دیتے اور ناشرین کو ہدایت فرما دیتے کہ کتاب کے ساتھ یہ بیان بھی ضرور شائع کیا جائے تاکہ اس کتاب کو پڑھنے والا کوئی بھی شخص نہ شیخ کے بارے میں کسی قسم کی بدگمانی میں مبتلا ہوتا، نہ مولانا ہی کے بارے میں اسے یہ غلط فہمی ہوتی کہ شیخ کے متعلق ان کو آخر تک گویا تحقیق نہیں ہو سکی اور شیخ کے صحیح حالات وعقائد کا علم نہ ہو سکا۔ آخر مولانا کے "رجوع" کرنے کا مقصد تو یہی رہا ہوگا کہ ان کی کتاب سے کوئی شخص شیخ کے عقائد وافکار کے بارے میں غلط فہمی کا شکار نہ ہو — ظاہر ہے یہ فریب کاری تو مقصود نہیں ہو سکتی۔

کہ رجوع کا نام بھی ہو جائے اور کتاب یوں ہی چھپتی رہے اور اپنا برا اثر دکھاتی رہے۔ سوال یہ ہے کہ پھر اس بیان کے فائدہ کو عمومی اور محفوظ بنانے کے لیے اخبار میں وقتی اشاعت کے ساتھ اس کو جزو کتاب بنا دینے میں کیا دشواری تھی۔ اور کون سی چیز اس سے مانع تھی؟

آئیے اب ان قرائن کی دنیا سے نکل کر حقائق اور امر واقعہ بھی ملاحظہ فرما لیجیے۔

۱۔ مولانا مدنی نے "نقش حیات" کے نام سے اپنی ایک خود نوشت سوانح عمری لکھی ہے۔ جو شیخ محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں سابقہ خیالات سے رجوع والے موضوعہ اخباری بیان کے ۲۸ برس بعد شائع ہوئی ہے اس کا مطالعہ فرمائیے تو واضح ہوگا کہ اس میں مولانا مدنی نے احمد رضا خاں بریلوی کے اتہامات کی تردید کرتے ہوئے الزام "وہابیت" سے اپنی اور اکابر دیوبند کی شدت کے ساتھ برأت ظاہر کی ہے اور اس ضمن میں "وہابیوں" اور "اکابر دیوبند" کے عقائد و اعمال میں فرق و اختلاف بیان کرتے ہوئے اس کتاب میں بھی "وہابیوں" کے بارے میں تقریباً وہی باتیں کہی ہیں جو شہاب ثاقب میں کہہ چکے ہیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

"یہ لوگ محمد بن عبدالوہاب نجدی کے پیرو تھے اور اپنے عقائد و اعمال میں نہایت سخت غالی تھے، انھوں نے اہالی حرمین پر بہت زیادہ تشددات کیے تھے اور اپنے مخالف عقائد و اعمال والوں کو بہت ستایا تھا۔ اس لیے اہل حرمین کو ان سے بہت زیادہ بغض و تنفر تھا، ...... اہل حجاز کو وہابیت سے اس قدر نفرت مظالم مذکورہ کی وجہ سے ہوگئی تھی کہ عیسائیت و یہودیت سے بھی اتنی نفرت نہ تھی ...

.... وہابیہ بارگاہ نبوت میں گستاخانہ کلمات استعمال کرتے رہتے ہیں .... (ص ۱۱۸-۱۲۱)

"الغرض وہابیہ کے عقائد و خیالات اور ان کے اعمال سے ان بزرگواروں یعنی اکابر دیوبند کو دور کا بھی تعلق نہیں ہے، اور نہ تھا۔ وہ (وہابیہ) مسلمانوں کو ذرا ذرا سی بات پر مشرک اور کافر قرار دیتے ہیں اور ان کے مال اور خون کو مباح جانتے ہیں اور جانتے تھے، جیسا کہ علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ نے ردالمحتار میں لکھا ہے۔ (ص ۱۲۳-۱۲۴)

غور کیجیے یہ فقرے وہابیوں کے بارے میں "الشہاب الثاقب" والے خیالات سے رجوع کی دلیل ہیں، یا ان پر قائم و برقرار رہنے کی۔؟

مولانا نے یہ اظہار رائے اہل نجد جن میں ظاہر ہے کہ سرفہرست شیخ اور اُن کے فاضل صاحبزادگان

و اولاد اور تلامذہ رہے ہوں گے۔) کی معتبر تالیف دیکھنے کے بعد کیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں تکفیر کے باب میں محترم مولانا نعمانی صاحب کی تحقیق نقل کردوں، مولانا تحریر فرماتے ہیں:

"اس عاجز نے شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کے فاضل فرزندوں اور تلامذہ کی جو تحریریں پڑھی ہیں اور اپنے امکان کی حد تک غور سے پڑھی ہیں ان کے مطالعہ سے راقم سطور نے یہ محسوس نہیں کیا کہ وہ تکفیر کے بارہ میں بے باک اور غیر محتاط ہیں۔ اگر ان کی بعض عبارتوں سے ایسا محسوس ہوتا ہے تو انہی کی دوسری عبارتیں اس کو صاف کردیتی ہیں۔ لیکن ان کے حلقہ کے بعض اور مصنفین کی تحریریں میں اس مسئلہ میں یقیناً کھلا ہوا غلو محسوس ہوتا ہے۔" (ص ۱۳۶)

مولانا مدنیؒ شیخؒ اور ان کے متبعین کے بارے میں چونکہ بلا تحقیق بہت سخت اور نفرت انگیز رائے ظاہر کر چکے تھے اس لیے اگر واقعۃً تحقیق کے بعد رجوع کر لیا تھا تو ضروری تھا کہ شیخ کے بارے میں مثبت انداز میں بھی کچھ کہا ہوتا اور ان کی بعض خوبیوں کا بھی ذکر کردیا ہوتا۔ مگر یہاں پچیسوں برس بعد بھی وہابیوں کے متعلق مولانا مدنی کے پاس جو کچھ ہے وہ محض حملے پر حملہ الزامات پر الزامات اور بدعقیدگی کے ثبوت پر ثبوت فراہم کرنے کی کوشش۔ کیا یہ سب اس بات کا یقین کرنے کے لیے کافی نہیں کہ مولانا مدنی نے اپنی شہاب ثاقب میں خیالات سے رجوع نہیں کیا تھا اور ان کی طرف رجوع کی نسبت محض افسانہ ہے۔

اگر اس سے بھی تسلی نہیں ہوتی تو آئیے اس بارے میں مولانا مدنیؒ کا اتنا زیادہ صریح بیان پڑھیے جس سے زیادہ صریح کوئی چیز نہیں ہوسکتی۔ مولانا مدنی سے لاہور کے ایک صاحب حافظ ریاض احمد قاسمی نے ایک سوال کیا تھا۔ یہ سوال مولانا مدنی کے جواب سمیت مکتوبات شیخ الاسلام ج ۲ ص ۳۴۴ میں شائع ہوا ہے۔ جواب ۴ ربیع الاول ۱۳۷۰ھ کو لکھا گیا ہے، یعنی مولانا مدنی کے رجوع والے مزعومہ اخباری بیان کے کوئی پچیس چھبیس برس بعد۔ سوال وجواب یہ ہے:

سوال: اب بھی آپ وہی مسلک رکھتے ہیں یا اس سے رجوع فرمایا ہے، جس کا آپ نے اپنی کتاب —— شہاب ثاقب —— میں اظہار کیا ہے؟ اور محمد بن عبدالوہاب کو آپ خارجی ہی تصور کرتے ہیں یا متبع سنت عالم۔ جیسا کہ آپ کے پیر و مرشد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے فتاویٰ رشیدیہ میں تحریر فرمایا ہے؟

جواب: اب بھی میرا مسلک وہی ہے جو اس کتاب میں ظاہر کیا گیا ہے اور وہی میرے اسلاف کرام کا ہے۔

…الوہاب اور اس کی جماعت کو میں نے نہیں بلکہ علامہ شامی رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب رد المحتار حاشیہ در مختار میں … نفی میں نہایت مستند اور مفتی بہ کتاب ہے جلد ثالث ص ۳۴۹ میں بھی لکھا ہے۔ صاحب رد المحتار علامہ شامی رحمۃ اللہ علیہ چونکہ اسی طرف کے رہنے والے اور اسی زمانہ کے ہیں۔ سنہ ۱۲۳۲ھ میں جبکہ محمد بن عبدالوہاب کی جماعت نے حجاز پر قبضہ اور تسلط کیا ہے وہ حج کے لیے مکہ معظمہ گئے ہیں جیسا کہ انھوں نے جلد اول ص ۴۶۷ میں تصریح کی ہے۔ پس وہ جس قدر محمد بن عبدالوہاب اور اس کی جماعت سے واقف ہیں دور دور کے رہنے والے اور زمانہ مابعد میں ہونے والے اتنے واقف نہیں ہو سکتے۔ حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ العزیز بہت بعد کے لوگوں میں ہندوستان کے باشندہ ہیں ان کو اس قدر اس جماعت کے احوال معلوم نہیں ہیں۔ چنانچہ فتاویٰ رشیدیہ ص ۴۶ میں اس کی تصریح فتویٰ میں موجود ہے اور ص ۸ میں جو عبارت اس کی تصحیح میں لکھی گئی ہے وہ محض سنی سنائی باتوں پر مبنی ہے، حضرت گنگوہی قدس سرہ العزیز اس کتاب شامی پر بہت زیادہ اعتماد فرماتے تھے۔ عموماً ان کے فتاویٰ اس کتاب سے ماخوذ ہیں۔" (مکتوبات شیخ الاسلام ج۲ ص ۴۴۳)

اس سوال و جواب کے علاوہ تقریباً انھی ایام میں یعنی ۲۶، ۲۷ رفروری ۱۹۵۲ء کے روزنامہ الجمعیۃ دہلی میں مولانا مدنی کا ایک بیان شائع ہوا جس کا عنوان تھا "ایمان و عمل میں رابطہ"۔ اس میں مولانا مدنی نے شیخ الاسلام محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمہ اللہ اور ان کے لاکھوں ماننے والوں کو گمراہ اور فرقۂ خوارج میں داخل کیا ہے۔

اب مولانا نعمانی صاحب ارشاد فرمائیں کہ مولانا مدنی کے موقف کے متعلق آیا اس اخباری بیان پر اعتماد کیا جائے جسے ان کے ایک مخالف اخبار زمیندار نے شائع کیا تھا، جو آلِ سعود کی حمایت کے جوش میں رطب و یابس تک کی پروا نہ کرتا تھا یا خود مولانا مدنی کے اس ذاتی بیان پر اعتماد کیا جائے جسے ان کے متوسلین و مسترشدین نے خود انھی کے حلقے اور انھی کے مکتوب کی شکل میں شائع کیا ہے اور جو مذکورہ اخباری بیان سے کئی چھبیس برس بعد کا ہے؟ اگر یہ مان لیا جائے کہ اخبار زمیندار میں شائع شدہ بیان واقعۃً مولانا مدنی ہی کا تھا تو پھر اس کی توجیہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ مولانا مدنی نے اس بیان کے ذریعہ مسلمانانِ ہند کو فریب دیا تھا۔ مولانا نعمانی ہی بتائیں کہ کیا وہ مولانا مدنی کو اس کارنامے سے ملوث تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں۔

طرفہ تماشہ ہے کہ زمیندار والے بیان میں مولانا مدنی لکھتے ہیں کہ میری سابقہ تحقیق کی بنیاد کسی تصنیف و تالیف پر نہ تھی بلکہ محض افواہوں اور مخالفین کے اقوال پر تھی مگر اپنے مکتوب گرامی میں اپنی تحقیق کی بنیاد علامہ شامی کے

ارشادات کو بتلاتے ہیں ۔ مولانا نعمانی ہی بتائیں کہ اس تضاد کا بھی کوئی حل ہے ۔

خلاصۂ بحث یہ کہ مولانا مدنی نے شہاب ثاقب کے نام سے شیخ محمد بن عبدالوہاب اور ان کی تحریک کے خلاف جن الزامات و افترا رات کا دفتر تیار کیا تھا اور ان کے بارے میں جو نہایت سخت اور بری رائے ظاہر کی تھی اس سے انھوں نے کبھی رجوع نہیں کیا بلکہ اخیر تک اسی پر قائم رہے اور اب حالات کا رخ پلٹنے کے بعد غالباً نوع بہ نوع مصلحتوں کے پیش نظر مولانا نعمانی نے وکیل صفائی بن کر مولانا مدوح کی صفائی میں جو کتاب تالیف فرمائی ہے وہ محض فریب کاری کا ایک شیش محل ہے ، اس میں حقائق کو اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے کہ نواب والا جاہ اور قاضی شوکانی جیسے پاکدامن اور بے داغ لوگوں کو مجرموں کی فہرست میں دکھلانے کی کوشش کی گئی ہے اور مولانا مدنی جن کا دامن محمد بن عبدالوہاب کے بارے میں غلطیوں ، غلط بیانوں ، الزام تراشیوں اور افترا پردازیوں کے جرائم سے داغ داغ ہے ، اس پر فرضی رجوع کا ملمع چڑھا کر اسے بے داغ بتانے اور جتانے کی کوشش کی گئی ہے ۔ محترم مولانا نعمانی صاحب !

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند ؟

...   .

ان سطور کی تسوید کے بعد مدرسے کی ایک ضرورت سے شبلی منزل اعظم گڈھ جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں میں نے دار المصنفین میں زیر بحث موضوع سے متعلق بعض کتابیں دیکھنے کی کوشش کی ، اس سلسلہ میں ایک رسالہ " جامع الشواہد فی اخراج الوہابیین عن المساجد " دیکھنے کا موقع ملا ۔ رسالے کا مقصد و موضوع تو نام ہی سے ظاہر ہے اور اس کے کچھ مندرجات کا علم حضرت مولانا نذیر احمد صاحب املوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور کتاب " اہلحدیث اور سیاست " کے ذریعہ پہلے ہی ہو چکا تھا ، لیکن براہ راست " استفادہ " کا موقع نہیں ملا تھا ۔ یہ رسالہ بظاہر ایک فرضی استفتاء کے جواب میں لکھا گیا ہے ۔ استفتاء یہ ہے :

سوال : کیا فرماتے ہیں علماء اہلسنت و جماعت اس امر میں کہ یہ گروہ غیر مقلدین ، اہلسنت و جماعت میں داخل ہے یا مثل اور فرقوں . . . . . کے اہلسنت سے خارج ہے ، (۲) ان کے ساتھ مخالطت اور مجالست اور ان کو اپنی مسجدوں میں آنے دینا درست ہے یا نہیں ۔ (۳) اور ان کے پیچھے نماز پڑھنی درست ہے یا نہیں ؟ بینوا توجروا ۔

مجیب (مفتی مولوی وصی احمد حنفی سورتی) جو خود ہی مستفتی بھی معلوم ہوتے ہیں، جواب میں "گروہ غیر مقلدین" کی مراد بھی متعین کر دی ہے کہ وہ جماعت اہلحدیث ہے، تحریر فرماتے ہیں:

الجواب: جواب سوال اول کا یہ ہے کہ فرقہ غیر مقلدین جن کی علامت ظاہری اس ملک میں آمین بالجہر یعنی آمین پکار کے کہنا، اور رفع الیدین اور نماز میں سینے پر ہاتھ باندھنا اور امام کے پیچھے الحمد پڑھنا ہے اہلسنت سے خارج ہیں اور مثل اور دیگر فرق ضالہ رافضی خارجی وغیرہم کے ہیں۔"

اس کے بعد مفتی صاحب نے اپنے دعاوی باطلہ کے ثبوت میں اپنے مزعومہ دلائل بیان کیے ہیں۔ اور جماعت اہلحدیث کی طرف جھوٹے عقائد اور غلط مسائل منسوب کر کے اس کی بنا پر فتوی صادر فرمایا ہے کہ "غیر مقلدوں (یعنی اہلحدیث) سے مخالطت اور مجالست کرنا اور ان کو اپنی خوشی سے اپنی مسجد میں آنے دینا شرعاً ممنوع ہے۔" اور یہ کہ "ان (غیر مقلدوں) کے پیچھے نماز درست نہیں۔"

اس رسالہ میں بہت سے علماء احناف کے فتوے ان کی مہر اور دستخط کے ساتھ موجود ہیں، صفحہ ۹ پہ جلی سرخی قائم کی گئی ہے۔ "مواہیر و دستخط علماء لودھیانہ و دیوبند" اس کے ذیل میں دیوبند اور لودھیانہ کے علماء کے فتوے درج ہیں، علماء دیوبند نے مذکورہ سوال کا جو جواب لکھا ہے اور جس عبارت پر دستخط کیے ہیں وہ یہ ہے۔

"عقائد اس جماعت کے جب خلاف جمہور ہیں بدعتی ہونا ظاہر اور مثل تجسیم اور تحلیل چار سے زیادہ ازدواج کے اور تجویز تقیہ اور برا کہنا سلف صالحین کا فسق یا کفر، تو اب نماز اور نکاح اور ذبیحہ میں ان کی احتیاط لازم ہے، جیسے روافض کے ساتھ احتیاط چاہیے۔

حررہ محمد یعقوب النانوتوی عفی عنہ، رشید احمد گنگوہی عفی عنہ، محمد محمود دیوبندی عفی عنہ، محمود حسن عفا عنہ، ابوالخیرات سید احمد عفی عنہ۔" (ص ۱۱)

یہ اکابر دیوبند کا فتوی ہے۔ کسی حوالے اور ثبوت کے بغیر چند عقائد اور مسائل کو پوری جماعت اہلحدیث کی طرف منسوب کر کے کہدیا گیا کہ یہ بدعتی ہیں، فاسق یا کافر ہیں، مثل روافض کے ہیں، ان کے ساتھ نماز پڑھنا، نکاح کرنا، ان کا ذبیحہ کھانا، ان سب باتوں میں احتیاط کرنا چاہیے۔

کیا جماعت اہلحدیث کے خلاف یہ سب باتیں (بالکل بے بنیاد ہونے کے باوجود) ایسی مشہور تھیں کہ ایک طرح کے عوامی تواتر کا درجہ ان کو حاصل ہو گیا تھا جس کے بعد ان کے بارے میں کسی تحقیق کی ضرورت نہیں تھی؟"

— ظاہر ہے کہ ایسا کہنا واقعہ نہیں بلکہ واقعہ کے بالکل خلاف ہوگا ۔ — تو اہلحدیثوں کے خلاف اکابر دیوبند کے اس قدر اشتعال انگیز فتویٰ کی آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہوگی ۔

شیخ الحدیث مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی دامت برکاتہ "ابراز اہلحدیث" (مطبوعہ پاکستان ۱۹۸۲ء) کے پیش لفظ میں تحریر فرماتے ہیں :

واضح رہے کہ رسالہ (جامع الشواہد، ۱۸۸۳ء / ۱۳۰۰ھ کے لگ بھگ صادق پور (عظیم آباد، پٹنہ) کے علاقہ میں اس زمانہ میں چھاپ کر عوام میں تقسیم کیا گیا تھا، جبکہ مجاہدین صادق پور کے ایک بقیۃ السلف اور صاحب علم و فضل فرد فرید مولانا عبدالرحیم صادق پوری رحمۃ اللہ علیہ جزائر انڈمان (کالا پانی) میں بیس سال کی قید فرنگ سے رہا ہو کر صادق پور اس پابندی کے ساتھ آئے تھے کہ وہ دو وقت روزانہ انگریزی تھانے میں اپنی حاضری لکھوائیں ۔ اس پر آشوب دور میں جبکہ "وہابی" (اہلحدیث) حکومت کے مظالم کا خاص ہدف تھے، مذکورہ بالا فتویٰ (ایک ایسے ہی رسالے کے ساتھ) انگریزی حکومت کی سرپرستی میں تقسیم کرایا گیا ۔ چنانچہ انگریزوں کا مقصد پورا ہوا کہ اس علاقہ (بہار وغیرہ) میں اہلحدیث کو جبراً مسجدوں سے نکالنے کی پوری کوشش کی گئی، جس سے مذہبی فسادات شروع ہو گئے اور نوبت عدالتوں میں مقدمات جانے تک پہنچ گئی، جن کی تفصیل ان روئدادوں میں موجود ہے جو اس سلسلے میں رسالوں کی شکل میں شائع ہو چکی ہیں ۔

مذکورہ فتویٰ میں وہابیوں (یعنی اہلحدیث) کی طرف جن عقائد اور مسائل کا انتساب کیا گیا ہے، چونکہ وہ سب الزامات غلط بیانی اور مغالطوں پر مبنی تھے، اس لیے جید اور فاضل علماء اہلحدیث نے ان کے مندرجہ ذیل مفصل جوابات تحریر فرمائے اور شائع کیے ۔

(۱) ابراز اہل الحدیث والقرآن مما فی جامع الشواہد من التہمۃ والبہتان ۔ تالیف مولانا حافظ عبداللہ محدث غازیپوری متوفی ۱۳۳۷ھ

(۲) صیانۃ المومنین عن تلبیس المبتدعین (تالیف عبداللہ میواتی، بھرت پور)

(۳) عمارۃ المساجد بہدم اساس جامع الشواہد، تالیف مولانا محمد سعید بنارسی متوفی ۱۳۲۲ھ ۔

(۴) جامع الفوائد تالیف مولانا عبیداللہ پائلوی متوفی ۱۳۱۰ھ مصنف کتاب تحفۃ الہند وغیرہ ۔

(۵) کاشف المکائد فی رد من منع عن المساجد ۔ (مولف کا نام نہ مل سکا ۔)

یہ پانچوں رسائل اس دور میں سعید المطابع بنارس سے شائع ہوئے تھے، ان میں ہر مولف نے اپنے انداز میں عجیب بے بنیاد الزامات کے جو "جامع الشواہد" میں اہلحدیث پر لگائے گئے تھے، مدلل طریقے سے جوابات دیئے اور ثابت کردیا کہ وہ سب خلاف واقعہ ہیں اور اس سلسلے میں بیان کردہ مغالطوں کی بڑی وضاحت سے قلعی کھول دی گئی۔ وللہ الحمد۔

مولانا بھوجیانی مدظلہ نے جس ایک اور رسالہ کی طرف اشارہ کیا ہے وہ غالباً مولانا محمد لدھیانوی کا رسالہ "انتظام المساجد باخراج اہل الفتن والمفاسد" ہے۔ کتب خانہ دار المصنفین (اعظم گڑھ) میں اسے بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ اس کے بھی کچھ اقتباسات مولانا الموی رحمۃ اللہ علیہ نے "اہلحدیث اور سیاست" میں نقل فرمائے ہیں۔ یہ رسالہ بھی جامع الشواہد ہی کی طرح "خرافات و افترا ات" سے پُر ہے اور انتہائی اشتعال انگیز ہے۔

ان رسالوں کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحریک اہلحدیث کو زک پہنچانے کے لیے اہل دیوبند نے اہلحدیثوں کے خلاف دیدہ و دانستہ جھوٹے الزامات اور پُر فریب افترارات کی ایک مہم چلا رکھی تھی۔ مولانا مدنی کی شہاب ثاقب اور اس کے بعد مولانا نعمانی کی زیر بحث کتاب دونوں اسی مہم کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حالات کی تبدیلی کے پیش نظر مولانا نعمانی نے اپنا انداز بدل لیا ہے، مگر ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت را می شناسم

فرمائیے اسے کیا کہیں؟ دینی مدارس کے طلبہ ہی نہیں مدرسین بھی بڑی شان بے نیازی سے بائیں ہاتھ میں کتابیں لیے آتے اور جاتے دکھائی پڑتے ہیں اور ان ہی میں وہ کتابیں بھی ہوتی ہیں جن میں لکھا ہوا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر کام دائیں ہاتھ سے یا دائیں طرف سے کرنا پسند کرتے تھے البتہ گندی چیزوں کے لیے بایاں ہاتھ استعمال کرتے تھے۔ فرمائیے علماء اور طلبہ کی اس روش کو کیا کہیں؟

سنت رسول سے عداوت، یا بغاوت یا شرارت یا جہالت یا حماقت؟

(سائل: ایک بندۂ خدا)

جواب: غفلت۔ (مجیب: دوسرا بندۂ خدا)

اُمّتِ مُسلمہ کی کامیابی کا راز ؟

عبدالسلام عالمیت چہارم

مے نوشی کے خلاف امریکہ کی جنگ اور اس جنگ میں اس کی شکست و ناکامی پر کم و بیش پچاس سال گزر چکے ہیں، شراب کے خلاف امریکہ کی یہ جنگ مسلسل چودہ سال تک جاری رہی۔ امریکہ نے جس کا آفتابِ علم نصف النہار پر پہنچا ہوا ہے، شراب کے خلاف وہ سب کچھ کر ڈالا جس کا تصور نا ممکن ہے۔ سینما، تصاویر، جرائد و مجلات اور دیگر ذرائع ابلاغ صرف اس لیے استعمال کیے کہ شراب کی ضرر رسانی امریکی قوم پر واضح کی جائے "، اندازہ کیا گیا ہے کہ تحریک کی ابتدا سے لے کر ۱۹۲۵ء تک نشر و اشاعت پر ساڑھے چھ کروڑ ڈالر صرف ہوئے اور شراب کے خلاف جس قدر لٹریچر شائع کیا گیا وہ تقریباً ۹ ارب صفحات پر مشتمل تھا۔

اس کے علاوہ قانون تحریم کی تنفیذ کے مصارف کا جس قدر بار گزشتہ چودہ سال میں امریکی قوم کو برداشت کرنا پڑا ہے اس کی مجموعی مقدار ۵۴ کروڑ پونڈ بتائی گئی ہے اور حال میں ممالک متحدہ امریکہ کے محکمۂ عدل نے جنوری ۱۹۲۵ء سے اکتوبر ۱۹۳۳ء تک کے جو اعداد و شمار شائع کیے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قانون کی تنفیذ کے سلسلہ میں دو سو آدمی مارے گئے ۵۳۴۳۳۵ قید کیے گئے ایک کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ کی مالیت کی املاک ضبط کی گئیں "، (تنقیحات ص ۴۶)

امریکہ کی یہ تحریک چودہ سال تک سرگرم عمل رہی لیکن "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کے مصداق امریکہ کی صورتحال خطرناک ہوتی گئی اور اس تحریک کا ردِ عمل یہ ہوا کہ امریکی قوم میخواری سے دست کشی پر کسی طرح راضی نہ ہوئی بلکہ دن بدن شراب سے اس کا لگاؤ بڑھتا گیا، اس کی دیوانگی اپنی انتہا کو پہنچ گئی۔ اجازت یافتہ میخانوں کے معطل ہوتے ہی ان سے کہیں زیادہ زیرِ شراب خانے وجود میں آ گئے، جنھوں نے نہایت ہی معقول

شراب تیار کرنی شروع کر دی، جس کے نتیجہ میں امراض میں روز افزوں اضافہ اور اموات کے تناسب میں زیادتی ہوتی گئی۔ بالآخر ۱۹۳۳ء کا وہ زمانہ آ پہنچا جب امریکہ عوام کے بیحد اصرار پر شراب کی خرید و فروخت، دوبارہ آزادی عطا کرنے حرام کو حلال ٹھہرانے اور اپنا قانون واپس لینے پر مجبور ہو گیا۔

یہ اس قوم کا حال ہے جو مریخ و قمر کے بعد سیاروں پر کمند ڈالنے کی فکر میں ہے جو زمانہ کی تہذیب یافتہ اور "روشن خیال" قوم تسلیم کی جاتی ہے اور چہار دانگ عالم میں جس کے علم و فن کا طوطی بول رہا ہے۔

اب ذرا پیچھے مڑ کر چودہ سو سال پہلے کی ان پڑھ علم و حکمت سے نا آشنا محض بدو قوم پر نظر ڈالیے جو شراب کی اتنی عاشق ہو کہ اس کی زبان بھی پیتے پیتے سیاہ ہو جائے۔ شراب کے ساتھ اس کے لگاؤ اور محبت کی اس سے بڑھ کر دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کے ہاں شراب کے ڈھائی سو سے زیادہ نام پائے جاتے ہوں۔

شراب کی اس رسیا قوم کو سب سے پہلے اس کے مضرات سے آگاہ کیا جاتا ہے، پھر تحریم خمر کا دوسرا مرحلہ آتا ہے، جس میں بحالتِ نماز شراب ناجائز قرار دی گئی۔ اب تیسرا اور آخری حکم نازل ہوتا ہے کہ:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ○ إِنَّمَا يُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُوقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَعَنِ الصَّلَاةِ فَهَلْ أَنْتُمْ مُنْتَهُونَ

(المائدۃ - پ ۷)

مسلمانو! شراب نوشی اور جوے بازی اور بت پرستی اور تیر (یعنی تیروں سے قسمت معلوم کرنا) شیطانی کام ہیں پس تم ان سے بچتے رہو تاکہ تم کامیاب ہو۔ شیطان یہی چاہتا ہے کہ شراب نوشی اور قمار بازی کی وجہ سے تم میں باہمی عداوت اور بغض ڈالے اور یادِ الٰہی اور نماز سے تم کو غافل کر دے، تو کیا تم باز آ رہے ہو؟

اس حکم کا سننا تھا کہ جام و سبو توڑ دیے گئے مدینہ کی گلی کوچوں میں شراب کے نالے بہہ پڑے اور سب کی کایا پلٹ ہو گئی۔

مادہ پرست امریکہ اور قرآن مجید کی اس آیت کریمہ میں بہت بڑا فرق ہے۔ یہاں نہ تو ڈالر خرچ کرنے پڑے نہ شراب کے خلاف کوئی پروپیگنڈہ کیا گیا نہ حکومت کی مدد کی ضرورت پڑی نہ جرائد و مجلات، ریڈیو اور سینما کا استعمال ہوا نہ لوگوں کو داخلِ زنداں ہونا پڑا نہ کسی سے جرمانہ وصول کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی

اور نہ ہی کسی کا خون ہوا، فقط خالق کی جانب سے ایک حکم تھا اور سب کی پیشانی اس کے آگے خم تھی۔

علوم و فنون کی اس گرم بازاری میں آج بھی مسلمانوں کی خاکستر میں وہ چنگاری موجود ہے جو ان کے سرد دلوں کو دوبارہ گرما سکتی ہے، آج بھی ان کے پاس وہ خزانۂ عامرہ اور دولت و ثروت سے لبریز کان موجود ہے جو ان کے دامن بے نوا کو لعل و گہر سے بھر سکتی ہے۔ وہ اپنی جلو میں ایک ایسا گرانقدر سرمایہ رکھتے ہیں جو بزدل کو شیر دل اور پتھر کو لعل و گوہر میں تبدیل کر سکتا ہے۔ ؎

بگیر از ساغرش آں لالہ رنگے   کہ تاثیرش دہد لعلے بہ سنگے
غزالے را دے شیرے بہ بخشد   بشوید داغ از پشتِ پلنگے

وہ ہے قرآن کی برق آسا تعلیمات ایمان و یقین کا بیش بہا خزانہ اور ایمانی تربیت کی گرانمایہ کان۔

آج امتِ مسلمہ کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کو پس پشت ڈال کر دوسروں کے پیچھے اس لیے دوڑ رہی ہے کہ ان کی تعلیمات سے اپنی مصیبتوں کا حل اور اپنے مرض کا علاج تلاش کرے۔ اپنے پاس بہترین غذا کے ہوتے ہوئے بھی وہ پس خوردہ خوانِ دیگراں کے لیے ہاتھ پھیلائے کھڑی ہے اسے قرآنی تعلیمات پر اعتماد نہیں اس کے نزدیک قرآن کی حیثیت صرف اتنی رہ گئی ... ہے کہ اسے ریشمی جزدانوں میں لپیٹ کر زینتِ محراب بنایا جائے ؎

برہمن از بتاں طاقِ خود آراست
تو قرآں را سرِ طاق نہادی؟

اس کی آشفتہ سری اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ وہ غیروں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی ہے وہ دنیا کی قیادت کرنے کے بجائے دوسروں کی قیادت و سربراہی قبول کرنے کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتی ہے حالانکہ دنیا کا کوئی ازم کوئی دین اور کوئی مذہب قافلۂ انسانیت کی قیادت کا بارِ گراں اپنے دوشِ ناتواں پر رکھنے کی تاب نہیں رکھتا۔ اگر اس بوجھ کو وہ اپنے کندھے پر رکھ بھی لے تو وہ کندھا چور چور ہو جائے گا اور کاروانِ انسانیت منزلِ مقصود سے بھٹک کر کسی اور منزل ہا راستے پر ہوگا۔ اس قافلے کی قیادت کا کام اگر کوئی سرانجام دے سکتا ہے تو وہ صرف اور صرف ایمان و یقین کی لازوال قوت اور قرآن مجید کی غیر فانی طاقت ہے، جس نے آج سے چودہ سو برس پہلے انسانیت کی کایا پلٹ دی تھی۔ امریکہ جو کام چودہ برس کے (بقیہ ص ۲۳ پر)

مولانا سید اسماعیل رائیدرگ

مولوی محمد انور سلفی

آپ علامہ ثناء اللہ امرتسریؒ کے شاگرد رشید اور امرتسر کے مدرسہ غزنویہ کے فیض یافتہ ہیں۔ آپ کی پیدائش ۱۸۹۵ء میں رائیدرگ کے ایک علمی خاندان میں ہوئی۔ آپکے والد محترم جناب سید عبداللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی رائیدرگ میں پہلے اہل حدیث تھے اور آپ ہی کی کدو کاوش سے مذہب اہلحدیث رائیدرگ کے اطراف و نواح میں پھیلا۔ آپ نے اپنے لڑکے کو سلفی عالم بنانے کی ٹھان لی۔ ابتدائی کتابیں پڑھانے کے بعد آپ کو کرنول روانہ کیا۔ جہاں آپنے شمس العلماء مولانا محمد عمر صاحب کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اسکے بعد آپ کی علمی پیاس آپ کو امرتسر کے مدرسہ غزنویہ کی طرف کھینچ لے گئی وہاں آپنے علامہ عبداللہ غزنویؒ اور علامہ ثناء اللہ امرتسریؒ وغیرہ اجلہ علماء اہلحدیث سے علمی و عملی فیض حاصل کیا۔

فراغت کے بعد اپنے آبائی وطن رائیدرگ چلے آئے اور مذہب اہلحدیث کی تبلیغ میں ہمہ تن مصروف ہوگئے۔

آپ کو اسی دوران معلوم ہوا کہ صوبہ کرناٹک کے ضلع کاروار مقام سرسی میں ایک مقبول نامی بدعتی آیا ہوا ہے جو اہلحدیث علماء و عوام کو ہر دم گالیاں بکتار ہتا ہے اور علمائے اہلحدیث کو دعوت الی الشیطان کے کارندے اور منافقوں کا سردار کہتا ہے اور جس کی پیشانی پر سجدے کا مقدس نشان ہو اس کو شیطان اور جس کا پائجامہ ٹخنے سے اوپر ہو اسے دجال کہتا ہے۔ اس شخص کی وجہ سے اخوان اہلحدیث سرسی کا عرصۂ حیات تنگ ہو رہا تھا۔ اور بریلوی حضرات اہلحدیثوں سے کہتے کہ اگر ہمت ہو تو اپنے کسی عالم کو بلاؤ۔ بدقسمتی سے کوئی عالم اس وقت نہیں تھا اور مولانا عبداللہ ہری ہری جو کہ کافی مشہور عالم تھے اپنی کسی پریشانی کی وجہ سے نہ جا سکے۔ جوں ہی آپ کو اس بات کا پتہ چلا تو جماعتی غیرت نے آپ کو سرسی جانے پر آمادہ کیا۔ آپنے سرسی پہنچنے کے فوراً بعد ایک خط عربی میں مقبول احمد کو لکھا جس میں مناظرے کے چیلنج کا جواب تھا اور لکھا تھا کہ فوراً جواب لکھ دیں۔ مقبول احمد چونکہ جاہل تھا عربی سے ناآشنا عربی خط دیکھ کر دنگ رہ گیا اور قاصد سے کہا کہ بعد میں آنا جواب لے جانا۔ جب دوسری مرتبہ قاصد پہنچا تو کہا کہ کیا قرض ہے، جو وصول کرنے کے لیے چلے آئے ہو؟ اور اسکے بعد سرسی سے ایک ٹرک جو ہاویری جا رہا تھا اس پر سوار ہو کر بھاگ گیا۔ جب بریلویوں کو اپنی اہانت کا احساس ہوا تو مقبول احمد کو ہاویری جا کر پکڑ لائے اور مناظرے کا انتظام کیا اور ایک ہندو وکیل کو ثالث مقرر کیا گیا۔ مولانا نے سب سے پہلے اپنے موضوع کو یعنی آمین، رفع یدین اور سجدے کے داغ کی فضیلت اور ازالہ

زمین پر گھسیٹ کر چلنے کی مذمت کو قرآن و حدیث کی روشنی میں بیان فرمایا، پھر جج نے مقبول احمد سے کہا کہ آپ اپنے دلائل کو بیان کیجیے۔ تو اس نے دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھا کر تمام اہل سری سے کہا کہ آپ لوگوں سے معافی طلب کرتا ہوں۔ بس مجھ کو آپ لوگ ایک شیطان سمجھیے میں نے آپ لوگوں کے پاکیزہ معاشرے میں فساد پھیلایا اور اب میں ہمیشہ کے لیے یہاں سے رخصت ہوتا ہوں، پھر وہ باوری چلا گیا جہاں ذلت سے مر گیا۔

آپ تقریباً دو سال تک سری میں رہے، پھر آپ کو معلوم ہوا کہ رائیدرگ کے اہلحدیث مقلدوں کے ظلم و ستم سے تنگ آچکے ہیں حتیٰ کہ مساجد میں داخل ہونے سے بھی ممانعت کر دی گئی ہے تو آپ رائیدرگ چلے آئے۔ جہاں پر آپ اہلحدیثوں کو نماز پڑھنے کی اجازت ہائیکورٹ سے لے آئے۔ اس پر مقلدین بہت بگڑے حتیٰ کہ آپکے قتل کے درپے ہو گئے لیکن خدا نے آپ کو اس سے محفوظ رکھا۔

آپنے رائیدرگ میں ہی ۱۹۲۶ء میں جامعہ محمدیہ کی بنیاد رکھی جس سے اب تک ہزاروں طالبانِ علوم دینیہ فیض یاب ہو کر ہندوستان کے چپہ چپہ میں پھیل گئے ہیں پھر آپنے یاڈٹا بیڑی والوں کی مدد سے مسجد اہلحدیث بنوائی جس سے اہلحدیث مقلدین کے شر سے محفوظ ہو گئے۔

مولانا کے ذاتی اوصاف

مولانا خوش اخلاق، فیاض اور بڑے مہمان نواز اور اسلام کے پرجوش مبلغ تھے، دینی حمیت و غیرت حد درجہ تھی اور سلفی دعوت کو ہر جگہ اور ہر مکتب فکر کے لوگوں میں عام کرنا چاہتے تھے۔ بلا کے ذہین تھے۔ مطالعہ کا شوق بے حد تھا۔ آپنے بیماری کے دوران طلبہ کو ماہانہ وظیفہ پر اخبار اور عربی کتب سنانے پر متقرر فرمایا تھا اور اہل علم کے قدردان اور مہمانانِ رسول پر کافی مہربان تھے، کہا کرتے تھے ؎

کوئی سید کوئی اسماعیل نکل آئے عجب کیا ہے انہیں بچوں میں ثناء اللہ نکل آئے۔

بیماری اور وفات

آپ اٹھارہ یا بیس سال پہلے فالج کے حملے سے بیمار ہو گئے اور صاحب فراش ہو گئے آپ بستر پر کھڑے نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہی زیادہ دیر تک بیٹھ سکتے تھے۔ لیکن کبھی بھی حرف شکایت زبان پر نہ لائے بلکہ ہمیشہ صابر و شاکر رہتے۔ آپ دو تین سال سے کچھ زیادہ کمزور ہوتے جا رہے تھے اور انتقال سے چند دن پہلے تو بے حد کمزور ہو گئے تھے، بات کرنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ افسوس کہ علم و ہنر کا یہ آفتاب ۱۶ ربیع الآخر بروز دوشنبہ بمطابق ۳۱ جنوری ۱۹۸۳ء رائیدرگ کی پہاڑی کے دامن میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

عالم اسلام

ایران پر جنگ کے اثرات

"اسلامی" ایران کی "یہودی" اسرائیل سے گہری دوستی

ستمبر ۸۴ء میں ایران عراق جنگ کے چار سال پورے ہو گئے، اور پانچویں برس کی ابتدا ہو گئی۔ یہ جنگ اپنے اسباب و محرکات سے لے کر واقعات و مقاصد تک اتنی وسیع الاطراف ہے کہ اسے ایک مضمون تو درکنار ایک کتاب میں منضبط کرنا بھی سخت مشکل ہے۔ آغازِ جنگ کے صرف پانچ دن بعد عراق نے اعلان کیا تھا کہ جنگ بندی کر دی جائے اور گفتگو کی میز پر اختلافات حل کر لیے جائیں، مگر ایران نے اسے ٹھکرا دیا اور جنگ جاری رہی۔ اس وقت ایران شکست خوردہ تھا، اس لیے گفتگو سے اس کا انکار معقولیت پر مبنی دکھائی دے رہا تھا۔ مگر برسوں کی تگ و دو کے باوجود جب صلح کے آثار دکھائی نہ دیے تو عراق نے پیچھے ہٹ کر ایک طویل المیعاد جنگ کے لیے اپنے مستقل مورچے بنا لیے۔ ایران نے اس "پسپائی" کو ہزیمت سمجھ کر صلح کی تمام کوششوں کو ٹھکراتے ہوئے شمال و جنوب کے محاذوں پر نہایت زبردست اور شدید حملے کیے) اور یہ عین اس وقت کیے جب اسرائیل لبنان پر قیامت توڑ رہا تھا (اور اس کے ساتھ ہی دوسرے خلیجی ممالک کو ایسی دھمکیاں دیں کہ گویا وہ چاہتا تھا کہ کوئی ملک اسرائیل کی طرف توجہ نہ کر سکے۔ بہرحال عراقی فوجوں نے ان حملوں کو اس بری طرح ناکام بنایا کہ میدانِ جنگ میں پڑی ہوئی ایرانیوں کی بے گور و کفن لاشوں کو گننا ناممکن ہو گیا، اور رفتہ رفتہ ایرانیوں کے حوصلے جواب دینے لگے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ باقاعدہ ایرانی فوج کے تمام عقلاء الرجال اس بے فائدہ اور لغو جنگ کو بند کر دینا چاہتے ہیں۔ حکمرانوں کا ایک طبقہ بھی اس سے بیزار ہو چکا ہے اور ایرانی عوام کی بے چینی جہازوں کے اغوا اور قتل کی خفیہ وارداتوں سے واضح ہے۔

مگر جن لوگوں کے ہاتھ میں فیصلے کی زمام ہے ان کا اور پاسداران انقلاب کا جی ابھی آسودہ نہیں ہوا ہے۔

ویسے ان چار برسوں میں ایران کے حالات اس حد تک بگڑ گئے ہیں کہ اب جنگ کو مزید جاری رکھنے کے لیے اس پہلو سے بھی کوئی جواز باقی نہیں رہ گیا ہے۔ ایران غذائی قلت کا اس حد تک شکار ہے کہ اسے پچھتر فیصد سامان خوراک باہر سے درآمد کرنا پڑتا ہے۔ درآمدات پر ۲۵ ارب ڈالر خرچ کرنے پڑتے ہیں، جبکہ برآمدات سے حاصل ہونے والی کل رقم صرف ۲۱ ارب ڈالر ہے یعنی تنہا اس خلانے میں ۴ ارب ڈالر سالانہ کا خسارہ ہوتا ہے۔ تیل کی پیداوار کا حال یہ ہے کہ وہ اب صرف ایک تہائی رہ گئی ہے پہلے روزانہ اٹھارہ لاکھ پیپے تیل پیدا ہوتا تھا اور اب یہ پیداوار صرف ۶ لاکھ پیپے رہ گئی ہے اور عراق نے جزیرہ خرج کی جو ناکہ بندی شروع کی ہے اور جس کے کامیاب ہونے کے آثار ظاہر ہیں، اس ناکہ بندی کے مکمل ہونے کے بعد اتنی پیداوار کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔

عسکری اعتبار سے ایران کی آدھی فوجی تنصیبات ختم ہو چکی ہیں، میدانی جنگ کی صلاحیت بھی سکڑ اور سمٹ کر بہت تھوڑی رہ گئی ہے اور ہتھیاروں کی جگہ افراد سے پُر کرنی پڑ رہی ہے۔ فضائی صلاحیت تو گویا جواب دے گئی ہے، عراق پر فضائی حملے کی جرأت نہیں ہوتی۔ تیل بردار جہازوں پر خفیہ حملے ضرور کیے لیکن سعودیہ نے جب دو جہاز مار گرائے تب سے اس طرف بھی توجہ کی جرأت گھٹ گئی، سیاسی طور پر انتشار اور بے دلی کی فضا عام ہے اور خود حکمراں طبقے میں پھوٹ پڑی ہوئی ہے۔

ان سب کے باوجود جن لوگوں کے ہاتھ میں فیصلے کی زمام ہے وہ جنگ جاری رکھنے پر مصر نظر آرہے ہیں ..... عام تاثر یہ ہے کہ ان حضرات کو اندیشہ ہے کہ اگر ہم نے جنگ ختم کر دی تو فوج اور عوام خود ہم پر پلٹ پڑیں گے اور ہمیں مجرموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا جائے گا۔ واللہ اعلم۔

بہر حال ایک طرف حالات یہ ہیں دوسری طرف ایران کچھ اور فسادات کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اس نے کئی برس سے یہ تحریک چلا رکھی ہے کہ حجاز سے سعودی عرب کی حکومت کو — جسے ایران طاغوت کی حکومت کہتا ہے — ختم کر کے وہاں عالم اسلام کی ایک مشترکہ حکومت قائم کی جائے۔ لیبیا کے کرنل قذافی صاحب بھی یہی نعرہ بلند کر رہے ہیں۔ تاہم اگرچہ سعودی عرب کا دست نگر ہونے کے باعث اس طرح کی کوئی بات زبان پر لانے سے باز ہے، لیکن اس کے بھی حکمراں اسی کردار اور انداز فکر کے ہیں، جگہ جگہ ایرانی لابی بھی اسی طرح کی آواز اٹھا رہی ہے۔ ابھی پاکستان کے بریلوی حضرات نے بھی اس کی تائید میں ایک اجتماع کیا اور اس میں جماعت اسلامی رحم مخیمن کی امانت

پر پہلے ہی ایمان لا چکی ہے) کے ذمہ دار رکن نے بھی شرکت کی، اس اجتماع میں مذکورہ بالا تجویز کے علاوہ یہ بھی طے کیا گیا کہ ترکی دور کے تعمیر کیے ہوئے قبروں کے قبے جنھیں سعودی عرب نے منہدم کر ڈالا ہے، پھر سے تعمیر کیے جائیں۔

ایران اپنی تباہ حالی کے باوجود یہ سب کیوں کر رہا ہے، اس کے بارے میں معلوم نہیں دوسرے لوگ کیا تصور رکھتے ہیں، ہمیں جہاں تک معلوم ہے، اس کا سبب ایران کا شیعہ مذہب اور اس کا نسلی غرور ہے۔ شیعہ مذہب کا بنیادی تصور ہی یہ ہے کہ اہل سنت کو نقصان پہنچانا کار ثواب ہے، خواہ اس میں خود اپنی ہی تباہی کیوں نہ ہو۔ البتہ اپنی تباہی سے بچنے کے لیے تقیہ (یعنی بظاہر دوست اور در پردہ دشمن) کا راستہ اپنانا چاہیے۔ یعنی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنی مقصد براری کرنی چاہیے، چنانچہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ایک طرف تو ایران حج کے موقع پر مکہ اور مدینہ میں امریکہ اور اسرائیل کے خلاف نعرے لگاتا ہے۔ (حالانکہ یہ نعرہ امریکہ اور اسرائیل کی سرحد پر لگانا چاہیے۔) اور دوسری طرف امریکہ اور اسرائیل سے ہتھیار لے کر جنگ لڑ رہا ہے۔ بلکہ غیر جانبدار ذرائع کا یہ بھی کہنا ہے کہ وسط ۸۲ء میں ایران نے عراق پر جو بڑے بڑے حملے کیے تھے وہ یہودی کمانڈروں کے ترتیب دیے ہوئے تھے۔ واللہ اعلم

یہود اور دوسرے اسلام دشمنوں سے دوستی شیعہ تاریخ کا ایک دائمی اور مستقل باب ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس مذہب کی پیداوار ہی یہود و مجوس کے تہذیبی ازدواج سے ہوئی ہے، اس لیے ایران کی موجودہ حکومت سب سے زیادہ یہود پر اعتماد کرتی ہے۔ البتہ اس راہ میں اس نے تقیہ کا لباس پہن رکھا ہے۔ شیعہ اور یہود یا ایران اور اسرائیل کے اس باہمی اعتماد اور پس پردہ تعلقات کا پتہ ہتھیاروں کے اس لین دین سے چلتا ہے جس کے بعض بعض واقعات کا انکشاف متفرق اوقات میں ہو گیا ہے۔ یہاں ہم چند واقعات کی نشاندہی کیے دیتے ہیں، تاکہ اصل حقائق سمجھے جا سکیں۔

جہاں تک ہمیں معلوم ہے اسرائیل کے ساتھ ایران کی انقلابی حکومت کے گہرے تعلقات اور ہتھیاروں کے لین دین پر پہلی بار عالمی پیمانے کا شور اس وقت اٹھا جب روس نے ۱۹۸۱ء میں ارجنٹائن کا ایک جہاز آرمینیا کے علاقے پر پرواز کرتے ہوئے مار گرایا۔ یہ جہاز اسرائیل کی طرف سے ایران کے لیے ہتھیار لا رہا تھا اس کے بعد وقتاً فوقتاً اس طرح کے واقعات اخباروں میں آتے رہے ہم نے ان واقعات کو تو محفوظ نہ کیا، البتہ

ارجنٹائن جہاز کے واقعہ کے تعلق سے عالمی اخبارات میں جو انکشافات ہوئے تھے اس کا ایک خلاصہ عراقی وزارت خارجہ نے مرتب کر دیا تھا۔ ہم عراقی وزارت کے تبصروں کو علیحدہ کر کے اخبارات کی رپورٹ پیش کر رہے ہیں۔ پہلے اصل خبر۔
۱۸ر جولائی ۱۹۸۱ء (سنیچر) کو ارجنٹائن کے ایک تجارتی ہوائی جہاز سی ایل ۔ ۴۴ کو روس کی ریاست آرمینیا کے شہر یریوان سے پرواز کے دوران گرا یا گیا۔ یہ جہاز تل ابیب اور تہران کے درمیان تیسری پرواز پر تھا جب کہ اسے نو پروازیں مزید مکمل کرنی تھیں۔ اس جہاز میں امریکی ساخت کے ہتھیار اور ہتھیاروں کے پرزے لدے ہوئے تھے، جن کی سپلائی اسرائیل کی جانب سے عمل میں آرہی تھی۔

اس واقعہ کے ایک ماہ بعد ۲۰ر اگست ۱۹۸۱ء کو امریکی ٹی وی ادارے، اے بی سی نے "نائٹ لائن" نامی پروگرام میں سابق ایرانی صدر ابو الحسن بنی صدر کا ایک بیان ٹیلی کاسٹ کیا، جس میں بنی صدر نے کہا اسرائیل عرصہ دراز سے ایران کو امریکی ساخت کے ہتھیار اور اسلحہ فروخت کر رہا ہے اور یہ ہتھیار اور پرزے ان کی ذاتی نگرانی میں خمینی کی اجازت سے درآمد ہوتے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ انھوں نے کئی بار ایرانی "ملاؤں" سے یہ بات کہی کہ اسرائیل سے ہتھیاروں کی تجارت کے بجائے عراق سے صلح کر لی جائے۔ مگر انھوں نے ایک مسلمان ملک سے صلح کی بات کرنے کے بجائے اسرائیل سے تجارتی تعلقات کو ترجیح دی۔

پھر ۲۸ر اگست ۱۹۸۱ء (جمعہ) کو قبرص کے ایک سرکاری ترجمان نے نکوسیا میں اعلان کیا کہ ۷ر اگست ۱۹۸۱ء کو ارجنٹائن کا جہاز سی ایل ۔ ۴۴ معمول کے مطابق ایک پرواز کے دوران لارناکا ہوائی اڈے پر تیل لینے کے لیے تھوڑی دیر ٹھہرا۔ ترجمان نے مزید بتایا کہ (۱) ۱۱ر اگست ۱۹۸۱ء کو یہی جہاز تل ابیب سے تہران کی ایک روزہ واپسی کی پرواز پر لارناکا اترا تھا۔ اس میں پچاس بڑے ڈبے رکھے ہوئے تھے، جن کا مجموعی وزن ۶۷۵۰ کلوگرام تھا۔ جہاز کا کپتان مسٹر میکفرٹی تھا (۲) پھر ۱۲ر اگست ۱۹۸۱ء کو ایک اور جہاز تہران سے تل ابیب کی پرواز کے دوران لارناکا کے ہوائی اڈے پر اترا۔ اس کا کپتان مسٹر کورڈیرو تھا (۳) پھر ۱۳ر اگست ۱۹۸۱ء کو تیسرا جہاز لارناکا ہوائی اڈے پر اترا۔ یہ جہاز علی الصبح تل ابیب سے تہران جا رہا تھا۔ یہ جہاز تہران میں ایک روزہ قیام کے بعد اگلی صبح تل ابیب واپس چلا گیا۔ اس بار بھی جہاز کی کپتانی مسٹر کورڈیرو کے ذمے تھی۔

بیانات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ایرانی قیادت نے عراق کے خلاف کی جانے والی کارروائی میں ان خفیہ اطلاعات سے بھی استفادہ کیا جو اسے اسرائیل نے فراہم کی تھیں اور انھی بیانات سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ

امریکی یرغمالیوں کی رہائی کے بدلے امریکہ نے منجمد ایرانی سرمائے کا انجماد ختم کیا تھا، اس میں سے بیشتر رقم اسرائیلی اسلحے کی سپلائی کے عوض تل ابیب پہنچی۔ عالمی اخبارات کی خبروں اور تبصروں سے بھی ایران کے مذہبی پیشواؤں اور تل ابیب کے یہودیوں کے درمیان گٹھ جوڑ کا پتہ چلتا ہے۔ بطور مثال:

۱۲ر اکتوبر ۱۹۸۰ء کو پیرس کے رسالے "ارذیک ایزی" نے تہران سے بھیجے گئے ایک تفصیلی مراسلے میں یہ بات شائع کی کہ اسرائیل کے جنگی ماہرین کا ایک وفد تین روزہ دورے پر ایران آیا ہے، جو ایرانی جنگی ضروریات کا جائزہ لے رہا ہے۔ یہ وفد اسلحے اور امریکی ہتھیاروں کے فاضل پرزوں کی فراہمی کے بارے میں بات چیت بھی کرے گا۔

۲ر نومبر ۱۹۸۰ء کو برطانوی اخبار "آبزرور" نے تہران سے ایک مکتوب میں لکھا کہ اسرائیل نے عراق کے خلاف لڑنے کے لیے اسلحہ کی ایک بہت بڑی کھیپ تہران روانہ کی ہے۔ اس میں فاضل پرزوں کی بھاری تعداد بھی شامل ہے۔ یہ اسلحے چاہ بہار، بندر عباس اور آبادان کی بندرگاہوں پر اتارے گئے۔

۳ر نومبر ۱۹۸۰ء کو جرمن روزنامے "ڈی ویلٹ" نے لکھا کہ اسرائیل نے ایران کو ایف۔۴ طیاروں کے فاضل پرزوں کی معقول تعداد فراہم کی ہے۔ یہ سپلائی سمندر کے راستے ہوئی اور نامعلوم مدت تک جاری رہے گی۔ ایران کو ان پرزوں کی قیمت کی ادائیگی میں سہولت دینے کی خاطر امریکہ بہت جلد اپنے یہاں منجمد ایرانی سرمائے سے پابندی ختم کر رہا ہے۔

پیرس سے شائع ہونے والے عربی رسالے "الوطن العربی" نے ۵ر نومبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں فرانسیسی رسالے "دی سی ڈی" نے ۱۱ر نومبر ۱۹۸۰ء کی اشاعت میں اور پیرس کے رسالے "جون افریق" میں بھی اسلحہ کی لین دین کے سلسلے میں اسرائیل اور ایران کے درمیان گٹھ جوڑ کا انکشاف کیا گیا ہے۔ الوطن العربی نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ اسلحہ کی فراہمی بلجیم کے ایک تجارتی سمندری جہاز کے ذریعہ عمل میں آ رہی ہے۔ نیز ایران و اسرائیل کے درمیان اسلحہ کی یہ تجارت کافی عرصہ سے جاری ہے۔ اور نامعلوم مدت تک جاری رہے گی۔ "جون افریق" نے یہ انکشاف کیا ہے کہ اسرائیلی جہاز ہتھیار لے کر ہالینڈ کی بندرگاہ پر آتے ہیں۔ اور وہاں سے یہ اسلحہ ایرانی بندرگاہوں کو بھیجا جاتا ہے۔

کویت کے اخبار "السیاسۃ" نے ۳۱ر مارچ ۱۹۸۱ء کو پیرس کے باخبر ذرائع کے حوالے سے لکھا کہ اسرائیل نے ۶، ایف ۱۵ جنگی جہاز مکمل مرمت اور سروس کے بعد حال ہی میں ایران کے حوالے کیے ہیں۔ مرمت کا یہ معاوضہ

ایک یورپین ملک کی دلالی سے عمل میں آیا تھا۔

۱۵ جولائی ۱۹۸۱ء کو امریکی ٹی وی ادارے سی بی ایس نے یہ خبر نشر کی کہ اسرائیل اور ایران میں اسلحہ کی سپلائی کا معاہدہ طویل عرصہ سے موجود ہے۔ اس کی مالیت پہلے مرحلہ میں ایک کروڑ ڈالر ہے۔ جو بعد کے مرحلوں میں دس کروڑ ساٹھ لاکھ ڈالر ہو جائے گی۔ اسرائیل نے ۱۲ جولائی ۱۹۸۱ء سے برسٹل قسم کے برطانوی ساخت کے طیاروں کے ذریعہ ایران کو اسلحہ اور فاضل پرزوں کی سپلائی کے لیے ایک ہوائی پل قائم کر رکھا ہے۔

۲۱ جولائی ۱۹۸۱ء کو اسرائیلی رسالے "معاریف" نے یہ خبر شائع کی کہ ایرانی حکومت نے دوست ممالک کے توسط سے اور براہ راست اسرائیل کو ہتھیاروں اور فاضل پرزوں کی ایک فہرست مہیا کی ہے، جن کی موجودہ جنگ میں ایران کو ضرورت ہے۔

۲۴ جولائی ۱۹۸۱ء کو ارجنٹائن کے اخبارات "کرونیشا" اور "لا برنیا" نے اپنی حکومت کے باخبر ذرائع کے حوالے سے یہ خبر نشر کی کہ روس نے ارجنٹائن کا جو طیارہ مار گرایا تھا وہ سی ایل ۴۴ سے اسلحہ لے کر تہران جا رہا تھا۔

۲۶ جولائی ۱۹۸۱ء کو لندن کے اخبار "سنڈے ٹائمز" نے اس واقعے کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا تھا کہ اسلحہ لے جانے کی ذمہ داری جس شخص کو سونپی گئی تھی اس کا نام مک فرنی تھا۔ بعد میں اس کے ساتھ ایک اسرائیلی یہودی سٹیورٹ اور ایک سوئس دلال آندریس جینی بھی شامل ہو گئے۔ انھوں نے ۱۲، ۱۴ اور ۱۰ جولائی کو اسلحہ کی مختلف کھیپیں تہران کے حوالے کیں۔ جبکہ چوتھی کھیپ روس نے گرا لی۔

جینی کا بیان ہے کہ اسرائیلی حکام کی خواہش تھی کہ تمام اسلحے جلد از جلد ایران پہنچا دیے جائیں تاکہ عراق پر ایران کو بالادستی حاصل ہو سکے۔ البتہ یہ نہیں معلوم کہ ایران کو کب تک اور کتنا ہتھیار اسرائیل فراہم کرے گا۔ جینی نے یہ بھی کہا کہ ایران کے مذہبی پیشوا زور دیتے رہے ہیں کہ ایران و اسرائیل کے درمیان اسلحہ بردار طیاروں کی آمد و رفت کے لیے قبرص کا ہوائی اڈہ لارنکا استعمال کیا جائے کہ یہ محفوظ بھی ہے اور سریع ترین بھی۔ جینی کو خدشہ ہے کہ قبرص میں مقیم فلسطینیوں کو اس کا پتہ چل گیا ہوگا۔ اور انھی کی مخبری پر روس نے طیارہ گرایا ہوگا۔

۲۷ جولائی ۱۹۸۱ء کو فرانسیسی اخبار "لا مگارو" نے اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے ایک طویل تحقیقی مقالے میں بتایا کہ خمینی نے خفیہ طور پر لندن کے ایک ایسے تجارتی ادارہ سے رابطہ قائم کر لیا تھا جو اسرائیل سے اسلحہ کی خرید کے سلسلے میں خاصا بدنام ہے۔ یہ ادارہ خمینی کی ہدایت پر اسرائیلیوں سے اسلحہ خرید کر مختلف راستوں سے [illegible]

پہنچا تا رہا ہے۔ ابھی تاریخ کو ایک جرمن رسالے ڈیر شپیگل نے ایک مقالے میں انکشاف کیا کہ ایک یہودی فرم نے اسرائیل کے دارالحکومت سے ایران کے دارالحکومت تک اسلحہ کی فراہمی کا ذمہ لے رکھا ہے۔ یہ اسلحے مختلف یوروپی دارالحکومتوں سے ہوکر تہران جایا کریں گے۔

سوئٹزرلینڈ کے اخبار ٹریبون ڈولوزان نے ۲۹ جولائی ۱۹۸۱ء کو تہران سے ایک مراسلے میں کہا کہ ایران کو اسرائیلی اسلحے کی سپلائی زیورچ میں مقیم ایک سوئس دلال کے ذریعہ عمل میں آرہی ہے۔ "ایران کے لیے اسرائیلی اسلحہ" کے عنوان سے ایک مراسلے میں اس اخبار نے لکھا کہ اسلحے کی یہ ترسیل قانون کے عین مطابق ہے مگر اخلاقی طور سے بری بات یہ ہوئی کہ تمام دنیا کو اس خفیہ سودے میں سوئس حکومت اور ایک باشندے کے ملوث ہونے کا علم ہوگیا جو باعث بدنامی ہے۔

امریکی ٹیلی ویژن نے ۲۰ اگست ۱۹۸۱ء سے تین روز تک ایک طویل رپورٹ میں اس بات کے دستاویزی ثبوت پیش کیے کہ اسرائیل کافی عرصہ سے ایران کو اسلحہ فراہم کررہا ہے جو کئی دلالوں کے ذریعہ مختلف راستوں سے ایران پہنچتا ہے۔ ایران نے کسی ایک دلال یا ایک ملک پر انحصار نہیں کیا ہے۔ اس رپورٹ میں انگریز اور سوئس دلالوں سمیت اور بھی متعدد نام بتلائے اور دستاویزات بھی دکھائیں۔ یہ بھی انکشاف کیا کہ بعض صورتوں میں زیورچ میں مقیم اسرائیلی فوجی اتاشی نے اسرائیل و ایران کے درمیان رابطے کے فرائض انجام دیے۔ اس رپورٹ میں یہ بھی بتایا گیا کہ امریکہ نے جو ایرانی اثاثے منجمد کیے تھے ان میں سے ایک بڑی رقم اب اسرائیلی اسلحہ اور فاضل پرزوں کے بدلے یہودیوں کے پاس پہنچ گئی ہے۔

اس ٹیلی ویژن نے یہ انکشاف بھی کیا کہ عراق و ایران جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی ستمبر ۸۰ ۱۹ء میں ایک فرانسیسی ماہر جنگ نے تہران کا دورہ کرکے ایرانی جنگی ماہرین سے مذاکرات کیے، پھر جب اسی ستمبر ۸۰ء میں جنگ چھڑ گئی تو ایرانی وزارت جنگ نے فوراً دو فرانسیسی فوجی ماہرین کو تہران بلایا۔ یہ دونوں یہودی تھے۔ انھوں نے ایران کی بری، بحری اور ہوائی ضروریات جنگ کا تخمینہ لگا کر بتایا کہ ایران کے ایف ۴ لڑاکا طیاروں کی بڑی تعداد کو فوری سروس اور اوور ہالنگ کی ضرورت ہے۔ پھر فوراً ہی ان یہودی ماہرین نے پیرس کے اسرائیلی سفارت خانے سے رابطہ قائم کیا، اور اسرائیل نے جنوبی فرانس کے ایک ہوائی اڈے پر آواز سے تیز رفتار طیاروں کے ۲۵۰ فاضل پرزے اور پچاس اسکارپین ٹینک ایران کے حوالے کردیے اور اس کی قیمت کی ادائیگی میں مدد

دینے کے لیے امریکہ نے اپنے یرغمالیوں کے عوض منجمد ایرانی اثاثے واگزار کر دیے، اسرائیل نے اطالوی بندرگاہ سے ایم ۔ ۴۸ ٹینکوں کے فاضل پرزے بھی ایران کو فراہم کیے۔ اسرائیلی اسلحہ کا ایک حصہ بندرگاں سے بھی فراہم کیا گیا۔ ٹیل دیژہ لندنے یہن اللکوڈ الہ کے اس ایرانی چیک کی فوٹو اسٹیٹ کاپی بھی دکھائی جو ایک قسط کے طور پر زیورچ میں مقیم اسرائیلی فوجی آتاشی کے حوالے کیا گیا تھا۔

ٹیلیویژن نے اس وقت کے اسرائیلی وزیر اعظم مناحم بیگن کا ایک انٹرویو بھی نشر کیا تھا جس میں بیگن نے اسرائیل کی طرف سے ایران کو اسلحہ کی فراہمی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا کہ وہ اسرائیلی قوانین کے مطابق اس سودے کی تفصیلات نہ بتانے پر مجبور ہیں۔ اس کے بعد ہی سابق ایرانی صدر ابوالحسن بنی صدر کا وہ انٹرویو نشر کیا گیا جس میں انھوں نے بتایا کہ وہ بارہا ایرانی ملاؤں پر زور دے چکے ہیں کہ اسرائیل سے اسلحے کی خریداری کے بجائے عراق سے صلح کر لی جائے۔ مگر وہ اس کے لیے تیار نہیں۔

امریکی ٹیلیویژن نے اس پروگرام میں سابق امریکی صدر کے پریس سکریٹری جوڈی پاول کا بھی ایک انٹرویو نشر کیا جس میں جوڈی پاول نے اعتراف کیا کہ ایران کو اسرائیلی ہتھیاروں اور فاضل پرزوں کی فراہمی کا معاہدہ سابق امریکی صدر کارٹر کے دور میں پوری احتیاط اور رازداری سے کیا گیا تھا۔ اسرائیل کی عرب (بلکہ اسلام) دشمنی کے پیش نظر کارٹر نے اسرائیل کو مشورہ دیا کہ عربوں کے خلاف ایران کی ہر ممکن مدد کی جائے اور ایران کے مذہبی پیشواؤں کو امریکہ کے اس ہمدردانہ طرز عمل کا جوں ہی علم ہوا وہ فوراً ہی امریکی یرغمالیوں کو رہا کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

ان بیانات اور واقعات سے ایران کی مسلم دشمن اور یہود دوست ذہنیت کا بہت واضح نقشہ سامنے آتا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر ایران کا ایک شخص رازداری کی کوشش کرتا ہے تو دوسرا شخص بھانڈا پھوڑ دیتا ہے چنانچہ ارجنٹائن کا جو جہاز گرایا گیا تھا ۲۶ر جولائی کو ایرانی وزارت خارجہ نے سرے سے اس کے گرائے جانے ہی کا انکار کر دیا اور کہا کہ یہ من گھڑت خبر ہے جو اسلامی انقلاب کو بدنام کرنے کی ایک سازش کے طور پر انقلاب دشمنوں نے گھڑی ہے۔ مگر اس کے بعد قومی امور کے ایرانی وزیر جناب بہزاد نبوی نے اخبار نویسوں سے خطاب کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ روس نے طیارہ گرایا ہے، مگر اس طیارہ میں اسلحہ نہیں تھا۔ اور یہ تل ابیب سے تہران نہیں آ رہا تھا بلکہ تہران سے واپس جا رہا تھا۔ ۲۸ر جولائی ۱۹۸۱ء کو ایرانی پارلیمنٹ کے اسپیکر اور دوازمی صفاجیٹ حجۃ الاسلام ہاشمی رفسنجانی نے تہران ریڈیو اور روزنامہ کیہان کو ایک انٹرویو میں بتایا کہ ارجنٹائنی طیارے کو واقعی روس نے گرایا ہے۔

یہ طیارہ اسلحہ لیکر ایران آتا رہا ہے مگر جب اسے گرایا گیا تو اس میں اسلحہ نہیں تھا اور وہ تہران سے واپس جا رہا تھا۔ البتہ ہاشمی رفسنجانی نے یہ نہیں بتایا کہ طیارہ کہاں سے آیا تھا اور کہاں واپس جا رہا تھا۔

پھر ۱۹ اگست ۱۹۸۱ء کو بیروت میں مقیم ایرانی ناظم الامور محسن الموسوی نے ایک اخباری بیان میں کہا کہ ایران اپنی ضروریات کا تمام اسلحہ کھلے بازار سے خریدتا ہے اور پھر اسے آئس لینڈ سے ارجنٹائن کے طیاروں میں قبرص کے راستہ تہران بھیجدیتا ہے۔ گرایا جانے والا طیارہ بھی اسی قسم کی پرواز پر تھا۔

پھر ۲۳ اگست ۱۹۸۱ء کو ایران کی سرکاری خبررساں ایجنسی نے وزیر خارجہ حسین موسوی کے حوالے سے یہ اقرار کیا کہ ایران نے اسرائیل سے اسلحہ کی خریداری کی ہے۔ مگر اس سودے بازی کی ذمہ داری سابق صدر ابوالحسن بنی صدر کے سر ڈال دی۔

کہنے کو تو وزیر خارجہ نے اس کی ذمہ داری سابق صدر پر ڈال دی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اسرائیل سے یہ گٹھ جوڑ ایران کا مستقل پالیسی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد بھی ایران کے متعلق اس قسم کی خبریں آتی رہیں جسے ہم نے بروقت قلمبند اور مرتب نہ کیا اس لیے اب انھیں پیش کرنا مشکل ہے۔ البتہ قریب کی ایک دو خبریں درج کی جا رہی ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ یہ تعلق اب تک برقرار ہے۔ کویت کا ہفت روزہ البلاغ اپنی ۸ر جنوری ۸۲ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:

"چند دن پہلے قبرص کے ایک بحری جہاز نے یونان سے اسمگل کیے ہوئے ذخائر لیکر جعلی دستاویزات کی مدد سے نہر سویز عبور کرنا چاہا، مگر مصری پولیس نے اس پر قبضہ کر لیا۔ پولیس نے ایک یونانی کو بھی گرفتار کیا جو جہاز سے پہلے یہ اطمینان حاصل کرنے کے لیے مصر پہنچا تھا کہ جہاز نہر سویز سے بے خطر گزر جائے گا۔ مصری حکام کا بیان ہے کہ اس جہاز کی طرف سے جو کاغذات پیش کیے گئے تھے اس میں بتایا گیا تھا کہ یہ عام قسم کے سامان اور کچھ لوہے لکڑ لے کر جدہ جا رہا ہے، لیکن مصری حکام کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ ہتھیار اور دھماکہ خیز مادے لے کر جا رہا ہے۔ چنانچہ جب سامان کی چیکنگ کی گئی تو اس میں عام سامان کی بجائے مختلف قسم کے کوئی دس ہزار ٹن فوجی ساز وسامان برآمد ہوئے۔ پھر جہاز کے کپتان سے پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے اقرار کیا کہ یہ سامان یونان سے اسمگل کر کے لایا جا رہا ہے اور ایران کے ساحلی شہر بندر عباس لے جایا جا رہا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ اسی جہاز کے ذریعہ ایران کو ہتھیار اسمگل کرنے کی کارروائی اس سے پہلے بھی بارہا کر چکا ہے۔"

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ اس واقعہ کی تکنیک ٹھیک ویسی ہی ہے جیسی اس سے پہلے کے اسرائیلی اسلحہ کی فراہمی کی رہ چکی ہے۔ اب آیئے اس سے بھی زیادہ قریب کا واقعہ لیجیے! الامن البلاغ نے اپنی ۱۵ / مارچ ۸۴ء کی اشاعت میں یہ انکشاف شائع کیا ہے:

"فرانس پریس نے مغربی جرمنی کے اخبار اسٹرن کے حوالہ سے بیان کیا ہے اسرائیل روزانہ ایران کو اسلحہ سپلائی کر رہا ہے، جس میں شاہ کے زمانہ کے قدیم ہتھیاروں کے لیے فالتو پرزوں کی سپلائی بھی شامل ہے۔ اخبار نے لکھا ہے کہ روزانہ ایک ٹرانسپورٹ اسرائیلی طیارہ صحرائے نقب کے ایک جنگی ہوائی اڈے سے رات کی تاریکی میں اڑتا ہے اور ملک شام کی فضا سے پوری آزادی کے ساتھ گزرتا ہوا طہران پہنچتا ہے۔ اخبار نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ اسرائیلی دار الحکومت تل ابیب میں نمکین پانی کو صاف کرنے کی ایک کمپنی ہے، جس نے پچھلے دنوں ۱۳۵ ملین ڈالر (یعنی ایک ارب تیس کروڑ پچاس لاکھ روپیے) کے لائسنس یزرائیل اور دستی بم ایرانی حکمرانوں کے حوالے کیے ہیں۔"

ہمیں اس پر اعتراض نہیں کہ کوئی برسرپیکار ملک ہتھیار کیوں خریدتا ہے۔ لیکن آپ ہی فیصلہ کیجیے کہ جب اسلامی انقلاب کا دعویدار ملک ایک دوسرے مسلمان ملک کو تہس نہس کرنے کے لیے اسلام کے ازلی اور سخت ترین دشمنوں سے پینگیں بڑھائے اور مسلمانوں سے صلح کی تمام کوششوں کو یکسر مسترد کر کے خونخوار یہودیوں اور صلیبی عیسائیوں کی گود میں جا بیٹھے تو اس ملک کا انقلاب کہاں تک اسلامی ہوگا اور اس سے مسلمانوں کے لیے خیر کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ جو لوگ ایران کے نام نہاد اسلامی انقلاب پر خوشی سے ناچتے رہتے ہیں، انھیں ایران کی اس اسلام دشمنی پر بھی نظر ڈال لینی چاہیے۔ واللہ یہدی من یشاء

... ...

اسرائیلی وزیر دفاع نے اعتراف کیا ہے کہ جنگ لبنان

"ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا" کے ذریعہ امریکہ اور اسرائیل اپنے مقاصد حاصل کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ حکومت اسرائیل نے یہ بھی اعلان کیا ہے کہ وہ جنوبی لبنان سے اپنے فوجی ہٹا رہا ہے۔ یعنی واپسی کی اس کارروائی کا تعلق برسوں سے نہیں مہینوں سے ہے۔ اس سلسلے میں اسرائیل نے اپنی سابقہ شرائط کا بھی اعادہ نہیں کیا ہے۔ درحقیقت جنوبی لبنان میں اسرائیلی گشتی دستوں پر لبنانی مسلمانوں کا کامیاب [illegible] تقریباً روزانہ کا معمول بن گیا ہے، جس کا یہودی فوجیوں پر نہایت برا اعصابی رد عمل ہو رہا ہے۔ امریکہ بھی اپنے سفارت خانہ کی دوسری تباہی کے بعد پست ہو چکا ہے۔ ان بین الاقوامی لٹیروں سے مسلمان اسی راہ سے نمٹ سکتے ہیں۔

ہماری نظر میں

مولانا شمس الحق عظیم آبادی: حیات اور خدمات

تالیف: محمد عزیر   تقدیم: مولانا محمد عطاء اللہ حنیف بھوجیانی،   قیمت: ۳۵ روپے (پاکستانی)
صفحات: ۳۴۴   کتابت طباعت: دیدہ زیب اور معیاری،   کاغذ: عمدہ نفیس،
پتہ: علمی اکیڈمی ۶۶۷/۹ دستگیر کالونی، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی پاکستان۔

مرحوم مولانا شمس الحق ڈیانوی (عظیم آبادی) ہندوستان کی علمی تاریخ کی ان قدآور شخصیتوں میں سے تھے جن کی نظیریں خال خال ہی وجود میں آتی ہیں۔ پیش نظر کتاب میں استاد محترم مولانا شمس الحق صاحب حفظہ اللہ کے صاحبزادے شیخ محمد عزیر (دراسات علیا ام القریٰ یونیورسٹی مکہ مکرمہ) نے مولانا ڈیانوی کے حالات و سوانح اور ان کے علمی کارناموں کو بڑی جامعیت اور دلآویزی کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ شیخ محمد عزیر تحقیقی مزاج اور ستھرا ذوقِ تالیف رکھتے ہیں، جس کی جھلک پوری کتاب میں نمایاں ہے۔ موصوف نے مولانا ڈیانوی کی سوانح کے علاوہ شروع میں ایک مبسوط مقدمہ بھی سپرد قلم کیا ہے، جو ان کے ذوقِ تحقیق و جستجو کا شاہکار ہے۔ اس مقدمے میں، جماعت اہلحدیث کی تاریخ کا اجمالی ذکر کرتے ہوئے جماعت اہلحدیث کے علمی و اصلاحی کارناموں پر جس جامعیت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور بہت سے گم گشتہ اوراق کو جس طرح نہاں خانوں سے نکال کر منظر عام پر لایا گیا ہے وہ انتہائی قابلِ قدر ہے۔

کتاب کے آخر میں مولانا ڈیانوی کے چند تاریخی خطوط، پھر شجرۂ سند اور شجرۂ اولاد و احفاد پیش کر کے بڑا بیش قیمت اضافہ کر دیا گیا ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مولانا ڈیانوی مرحوم کے جواں عزم و جواں ہمت پڑپوتے جناب عبدالرقیب صاحب نے مولانا کی تمام تالیفات کو جدید اصولِ تحقیق کے مطابق نہایت بلند معیار کے ساتھ سلسلہ وار منظر عام پر لانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اللہ توفیق ارزانی فرمائے۔ آمین۔ پیش نظر کتاب بھی جدید اسلوب کے مطابق بہت اچھے معیار پر شائع کی گئی ہے۔ البتہ پاکستان میں کتابت کے لیے اس سے اچھے معیار کی گنجائش تھی، علاوہ ازیں ہمارے نقطۂ نظر سے چند اور باتیں بھی لائقِ توجہ ہیں۔

ص ۳ پر اقتباس مؤلف کی طرف سے نہیں ہے، اس لیے مرتب کو اپنا نام دینا موزوں تھا۔
ختم مقدمہ کے بعد اصل کتاب شروع کرتے ہوئے ص ۷ پر ایک مستقل عنوان چاہیے۔

ص ۵۲ "دونوں مرتبہ دہلی میں میاں صاحب کے پاس قیام کی مدت تقریباً ڈھائی سال رہی۔" اس عبارت سے یہ متبادر ہوتا ہے کہ موصوف ہر بار ڈھائی ڈھائی برس مقیم رہے۔ حالانکہ یہ مقصود نہیں۔ اس لیے عبارت کچھ یوں ہونی چاہیے۔ "دہلی میں میاں صاحب کے پاس دونوں مرتبہ کے قیام کی مجموعی مدت تقریباً ڈھائی سال رہی۔"

ص ۵۳ سطر ۱۲ کا لفظ اول "میں" کے بجائے "کو" ہونا چاہیے۔ ص ۷۱ سطر ۱۶ للذہبی کے بدلے لاہبی کتابت کی ذرا زیادہ واضح غلطی ہے۔

ص ۱۰۹ "برادر خورد" یہ رائج الوقت املا صحیح نہیں۔ صحیح املا خُرد (بمعنی چھوٹا) ہے۔

ص ۱۲۵ شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسحاق کے درمیان خط اتصال چھوٹ گیا ہے۔

ص ۸۳ پر التحقیقات العلی کا ذکر ہے۔ اس کی ایک اشاعت فیصل آباد پاکستان سے ۱۹۸۷ء میں مولانا مبارکپوری کے رسالہ نور الابصار اور مولانا مولا بخش بڑاکری کے رسالہ التجمیع فی القری کے ہمراہ ہوئی ہے۔

ص ۲۹، ۳۰ تسہیل القاری کے ص ۲ سے واضح ہے کہ ترمذی کا ترجمہ بھی نواب وحید الزماں نے کیا ہے نیز تسہیل محض صحیح بخاری کا اردو ترجمہ ہی نہیں ہے بلکہ اس میں فتح الباری اور ارشاد الساری کے تمام مضامین، (باستثنائے تحقیقات لفظی ابھی ......) درج ہیں، نیز تحقیقات مسائل فقہی میں نیل الاوطار کے اکثر مطالب و مضامین بھی اس میں درج ہیں اور ہر کتاب کے اخیر میں بقیہ صحاح ستہ کی وہ احادیث بھی درج ہیں جو صحیح بخاری میں مروی نہیں ہیں۔ (تسہیل ص ۳)

مجموعۃ الرسائل فی الجمعہ یعنی

(۱) نور الابصار تالیف: مولانا محمد عبدالرحمٰن مبارکپوریؒ
(۲) التجمیع فی القری بنقض ما فی اوثق العری تالیف: مولانا مولا بخش بڑاکری
(۳) التحقیقات العلی فی فرضیۃ الجمعۃ فی القری تالیف: مولانا محمد شمس الحق عظیم آبادی
ناشر: جمعیۃ شبان اہلحدیث خالد آباد فیصل آباد پاکستان

تحریک اہلحدیث نے جہاں بہت سی غیر اسلامی رسوم مٹائیں اور اسلامی فرائض وسنن کا احیاء کیا وہیں

دیہاتوں میں اقامت جمعہ بھی اسی کا ایک اہم کارنامہ ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے احناف اور خصوصاً ان کا دیوبندی طبقہ دیہات میں جمعہ کا قائل نہیں۔ اس کے نتیجے میں پہلے دونوں فریقین میں کافی بحث ہو چکی ہے چنانچہ جب مولانا میاں صاحب سید نذیر حسینؒ نے دیہات میں جمعہ کی فرضیت کے مسئلہ پر ایک مدلل فتویٰ صادر فرمایا مگر علمائے احناف اسے برداشت نہ کر سکے۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے اس کے رد میں اوثق العریٰ کے نام سے ایک رسالہ لکھا۔ اس کے جواب میاں صاحب کے تین شاگردوں نے لکھا۔

(۱) کسر العری باقامۃ الجمعہ فی القریٰ (از مولانا محمد سعید بنارسی)

(۲) ہدایۃ الوریٰ الی اقامۃ الجمعہ فی القریٰ (از مولانا ابوالمکارم محمد علی مئوی)

(۳) التجمیع فی القریٰ بنقض ما فی اوثق العریٰ (از مولانا ابو عبداللہ مولا بخش براکری)

ان تینوں کے جواب میں مولانا محمود حسن دیوبندی مرحوم نے احسن القریٰ فی توضیح ما فی اوثق العریٰ کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھی، جس کے جواب میں مولانا حافظ محمد عبدالرحمٰن بقا غازیپوری نے "سر محی یری فی بحث الجمعۃ فی القریٰ" کے نام سے بڑے معرکے کی علمی اور مدلل کتاب لکھی۔

مولانا بقا کی اس کتاب کا جواب تو علماء احناف سے نہ بن پڑا لیکن اس موضوع پر طبع آزمائی کا سلسلہ بند بھی نہ ہوا۔ چنانچہ مولانا ظہیر احسن شوق نیموی نے "جامع الآثار فی اختصاص الجمعہ بالامصار" کے نام سے ایک رسالہ تالیف کیا جس کے جواب میں مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارکپوری نے نور الابصار اور مولانا ابوالمکارم محمد علی مئویؒ نے "المذہب المختار فی الرد علی جامع الآثار" نام کے رسالے تالیف کیے۔ اس موضوع پر مولانا شمس الحق صاحب محدث عظیم آبادی نے بھی دو رسالے تالیف کیے تھے۔ زیر تبصرہ کتاب انہی تالیفات میں سے تین رسالوں کا مجموعہ ہے۔ ان میں سب سے مفصل رسالہ مولانا مبارکپوری کا ہے جس میں مولانا نیموی کے سارے دلائل کے تار و پود بکھیر کر نہایت قوی دلائل سے ثابت کیا گیا ہے کہ دیہات و شہر ہر جگہ اقامت جمعہ درست ہے۔ دوسرے اور تیسرے رسالے قدرے مختصر ہیں مگر نہایت فاضلانہ مباحث پر مشتمل ہیں۔ افسوس ہے کہ آجکل تبلیغی جماعت نے دیہات میں جمعہ بند کرنے کی مہم پھر چلا رکھی ہے۔ ضرورت ہے کہ مسلمانوں کو بڑے پیمانے پر اس اسلامی فرض سے آگاہ کیا جائے اور اس اسلامی شعار کو مٹنے سے بچایا جائے۔

مدارس عربیہ کے طلبہ کی انجمنوں کے جدید انتخابات:

(۱) انجمن طلبہ مدرسہ تنظیم العلوم، شب نگر (لال ناٹی) ضلع مرشد آباد، بنگال۔ صدر: مولانا عبد الستار سلفی، نائب: مولانا سیف الاسلام سلفی، ناظم: محمد ریاض الدین، نائب: محمد ضمیر الدین، ناظم مالیات: مولانا عبد الحلیم مظاہری، محاسب: مولانا منظر الاسلام مظاہری ناظم دار الاخبار: عبد الواجد۔

(۲) نادی تعلیم البیان مدرسہ دار التعلیم مبارکپور ضلع اعظم گڈھ یو پی، صدر: محمد ساجد بندوی، نائب: تقی الدین مبارکپوری، سکریٹری: فاروق اعظم مبارکپوری، نائب: ازہر مبارکپوری، معتمد خطابۃ: امام الدین گونڈوی ونعیم الرحمان لھیاوی، معاون: محمد اسلم حسین آبادی ومحمد یعقوب مبارکپوری، خازن: محمد ارشد بندوی، لائبریرین: محمد ارشاد بستوی، فضل الرحمن حسین آبادی، مقصود اختر مئوی، مجلس شوری: محمد شاھنواز بہاری، محمد ساجد انصاری، محمد حسان مبارکپوری۔

(۳) نادی الاصلاح جامعۃ السید نذیر حسین دھلی: صدر: معراج ربانی نائب: سلمان احمد، ناظم: شمیم اختر، نائب: ناصر الدین، امین خطابت عربی: محبوب عالم، اردو: شکیل احمد، نائبین: ابو الکلام وعبد الاحد، امین مکتبہ: محمد طیب، نائبین: عبد الحی وابو الوفاء، امین دار الاخبار: عبد الوھاب، نائب: عبد المبین، خازن: حماد احمد، محاسب: اظہار احمد، مدیر صحافت: محمد عارف، نائب: امیر الدین، ممبران: محمد عیسی، سرور احمد، عطاء الرحمان قمر جاوید۔

افتتاح درس بخاری:

جامعہ سراج العلوم بھوجپور ضلع غازی آباد (یو پی) میں ایک خصوصی تقریب کے اندر ۱۱/ اگست ۸۴ء کو صحیح بخاری کے درس کا افتتاح ہوا اس موقع پر متعدد اہم تقاریر بھی ہوئیں۔

Reg. No. R. N. 40352/81

November **MOHADDIS** 1984

THE ISLAMIC CULTURAL & LITERARY MONTHLY MAGAZINE

AL-JAMIATUS SALAFIAH (AL-MARKAZIYAH) VARANASI (INDIA)

Published from Markazi Darul-Uloom

Printed by Abdul Waheed

At Salafiah Press, Reori Talab, Varanasi.

محدث

مرکزی دار العلوم بنارس کا دینی علمی اور ادبی ماہنامہ

برگ وبار

صفحہ

ماہنامہ

محدث

بنارس

شمارہ: ۱۲ | جلد: ۳

ربیع الاول ۱۴۰۵ھ ● دسمبر ۱۹۸۴ء

بدل اشتراک

سالانہ: ۲۵ روپیے

ششماہی: ۱۳ روپیے

فی پرچہ: ۲/۵۰ روپیے

بیرون ملک سالانہ: ۱۵ ڈالر

ترتیب

صفی الرحمن مبارکپوری

ناشر: جامعہ سلفیہ بنارس

طابع: عبدالوحید

مطبع: سلفیہ پریس بنارس

کاتب: انور جمال

پتہ:-

خط و کتابت کے لیے: ایڈیٹر محدث، جامعہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس

بدل اشتراک کے لیے: مکتبہ سلفیہ ریوڑی تالاب بنارس

MAKTABA SALAFIAH REORITALAB VARANASI-10

ٹیلی فون: ۶۲۵۰۷۷

ہوا کے ہاتھ خنجر ہو گئے ہیں!

(مئوناتھ بھنجن کے انسانیت سوز المیے کا تاثر نامہ)

فضا ابن فیضی



جو شاہیں تھے کبوتر ہو گئے ہیں
ہوا کے ہاتھ خنجر ہو گئے ہیں

وہ موسم ہے کہ ہنستے بولتے لوگ
تباہی کا مقدر ہو گئے ہیں

دھوئیں کی شام شعلے کا سویرا
یہ کیا لمحوں کے تیور ہو گئے ہیں

گھر آنگن پیاس سے بہرے ہیں لیکن
گلی کوچے سمندر ہو گئے ہیں

پشیماں ہیں اڑائیں بھرنے والے
شکستہ سارے شہپر ہو گئے ہیں

نشیمن ہیں کہ افسوں گاہِ آشوب
پرندے گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں

جنھیں سونپی گئی عقدہ کشائی
وہ ناخن بڑھ کے نشتر ہو گئے ہیں

شفق چہروں پہ لکھتا ہے لہو کون
کہ سب زخموں کا محضر ہو گئے ہیں

چٹختی ہڈیاں ادھڑے ہوئے گوشت
عجب ماحول و منظر ہو گئے ہیں۔

بدن پر گہرے سناٹے کی چادر
نفس سینے کے باہر ہو گئے ہیں

اب ان آنکھوں کو رکھ آؤں کہیں اور
مہکتے خواب پتھر ہو گئے ہیں

سلگتے ہیں کچھ آئینوں میں جوہر
کچھ آئینے مکدر ہو گئے ہیں

گھٹی چیخوں میں ڈوبی ہیں اذانیں
صحیفے خون میں تر ہو گئے ہیں

ہمکتے تھے جہاں معصوم بچے
وہ گھر، نوحوں کا دفتر ہو گئے ہیں

یہی پیوند اب سرمایہ اپنا
کسی مفلس کی چادر ہو گئے ہیں

نہیں ہمت کہ چاکِ جسم دیکھیں
بہت دیوار میں در ہو گئے ہیں

فضا ہم پر جو گزری ہے نہ پوچھو
ہزیمت خوردہ لشکر ہو گئے ہیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور عدم تشدد

سوال و جواب

گاندھین انسٹی ٹیوٹ بنارس میں مذکورہ موضوع پر جو تقریر کی گئی تھی۔ پچھلی تین قسطوں میں وہ پوری تقریر بعض اضافی توضیحات سمیت پیش کی جا چکی ہے۔ تقریر کے خاتمے پر چائے نوشی کی خاطر چند منٹ کے لیے مجلس برخاست ہوئی اور پھر دوبارہ منعقد ہو گئی تو سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا۔ کاشی ودیا پیٹھ (کاشی یونیورسٹی) کے وائس چانسلر جناب راجہ رام شاستری صدر مجلس تھے۔ سب سے پہلے انھی نے سوال کیا۔ ان کا سوال یہ تھا:

س: آپ کی تقریر سے یہ معلوم ہوا کہ اگر کسی پر ظلم و تشدد ہو یا اسے قتل کر دیا جائے تو اسلام اس کو یا اس کے اولیاء کو پورا پورا بدلہ دلانے کا ذمہ دار ہے۔ البتہ اگر وہ خود چاہیں تو اپنی آزاد مرضی سے مجرم کو معاف کر سکتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے مجرم کو معاف کر دینا بہتر ہے یا بدلہ لینا بہتر ہے، یا دونوں برابر ہے؟ اور اسی ضمن میں دوسرا سوال یہ ہے کہ جو شخص بدلہ لیتا ہے اور جو شخص معاف کر دیتا ہے، وہ دونوں برابر ہیں یا کسی کا درجہ دوسرے سے بلند ہے؟ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کی وضاحت کریں۔

ج: مجرم کو معاف کر دینا بہتر ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ ولئن صبرتم لھو خیر للصٰبرین (سورہ نحل: ۱۲۶) اگر تم بدلہ لو تو ویسا ہی بدلہ لو جیسا تشدد تم پر کیا گیا ہے اور اگر تم صبر کر لو تو یقیناً یہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔ البتہ اس موقع پر حکومت اور سماج کو یہ لحاظ رکھنا ہوگا کہ معافی کے نتیجے میں مجرم کے اندر جرم اور ظلم کی جرأت و جسارت اور نہ بڑھ جائے۔ اگر اس کا اندیشہ اور ایسی علامات پائی جائیں تو اگرچہ مجرم سے انتقام نہیں لیا جائے گا لیکن کوئی ایسی سزا (مثلاً قید) دی جائے گی یا کوئی

[illegible] پابندی کا انتظام کیا جائے گا کہ دوبارہ جرم کا امکان کم سے کم رہ جائے۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ معاف کر دینے والے کا درجہ بدلہ لینے والے سے بہتر ہے۔ یہ دنیا میں بھی اس کے معزز اور شریف النفس ہونے کی علامت ہے اور آخرت میں بھی بلندیٔ درجات کا ذریعہ ہے۔

صدر مجلس کے ان دو سوالوں کے بعد مجلس کے ایک مسلمان ممبر نے سوال پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے تاریخ کی بھول بھلیوں " سے نکل کر معروضی انداز سے گفتگو کی بات کئی بار دہرائی اور اسلام کے ابتدائی دور کے بعض حادثات کی طرف بھی اشارے کیے مگر انھوں نے کوئی متعین سوال نہیں کیا، اس لیے میں نے ان سے عرض کیا کہ وہ اپنے سوالات یا اعتراضات متعین فرما دیں تو میں ان کا جواب دوں مگر اتنے میں ایک تیسرے صاحب نے جن کا اسم گرامی متل تھا اپنے سوالات پیش کر دیے۔ یہ سوالات جہاں تک اندازہ ہوا مسلمان ممبر کی پیش کی ہوئی باتوں پر مبنی تھے۔ البتہ اس میں متل صاحب کے اپنے تبصرے بھی شامل تھے۔ اس لیے اب انھی کے سوالات پیش کیے جا رہے ہیں۔

متل صاحب کا ارشاد تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عرب ابتدا ہی سے خونخوار تھے، اور اسلام اپنی تعلیمات کے ذریعہ ان کی اس فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکا۔ محمد صاحب کے زمانے میں جو جنگیں ہوئیں ان میں تو خیر ان کا مقابلہ دوسرے مذاہب کے لوگوں سے تھا، لیکن ان کے بعد جب پورا عرب مسلمان تھا تب بھی ان میں باہم لڑائیاں ہوتی رہیں۔ دوسرے اور تیسرے خلیفہ کو شہید کیا گیا۔ حضرت علی اور معاویہ میں جنگ رہی اور خود پیغمبر صاحب کے نواسے حضرت حسین کو کربلا میں قتل کر دیا گیا۔

جواب: اسلامی دور میں جو کچھ پیش آیا وہ عربوں کی خونخواری نہیں بلکہ فطری سادگی، انسانیت نوازی اور اصول پسندی کی دلیل ہے۔ دوسرے خلیفہ کسی مسلمان یا عرب کے ہاتھ سے نہیں بلکہ ایک غیر مسلم ایرانی کے ہاتھ سے مارے گئے تھے، اگر ان میں فطری سادگی کے بجائے بادشاہوں جیسی ٹیپ ٹاپ ہوتی اور باڈی گارڈ کا انتظام و اہتمام ہوتا تو شاید اس کی نوبت ہی نہ آتی۔ پھر یہ واقعہ انفرادی اور شخصی تھا، اس میں زیادہ سے زیادہ جو شبہ کیا جا سکتا ہے وہ یہ کہ اس میں مدینہ کے اندر موجود ایرانیوں کی پس پردہ سازش رہی ہو۔ مگر بہر حال یہ خونخواری کسی مسلمان نے نہیں، بلکہ غیر مسلم نے کی تھی۔

تیسرے خلیفہ کی شہادت کا بھی کئی پہلو قابل غور ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ واقعے کی اصل صورت آپ کے سامنے

رکھ دوں ۔ ایران میں اسلام کی آمد سے پہلے زمیندارانہ اور جاگیردارانہ نظام کے ظلم و جبر کا یہ حال تھا کہ کسان اور کاشتکار تو نانِ شبینہ کو ترستے تھے ۔ مگر معمولی معمولی زمیندار لاکھوں روپے کے ہیرے جواہرات کا تاج پہنے بغیر گھر سے باہر نہ نکلتے تھے ۔ اس لوٹ کھسوٹ کی فضا میں جب اسلامی فوجوں نے ایران فتح کیا تو اسلامی تعلیمات کی سادگی ، انصاف مساوات اور مسلمانوں کا شریفانہ برتاؤ دیکھ کر ' ایرانی عوام فوج در فوج مسلمان ہو گئے ۔ اس لہر کو دیکھ کر زمینداروں اور جاگیرداروں نے محسوس کیا کہ اگر ہم حلقہ بگوشِ اسلام نہ ہوئے تو ہماری رعایا اور عوام تو درکنار ہمارے غلاموں کے برابر بھی نہ رہ جائے گی ۔ کیونکہ ایرانی عوام ہمارے قبضے سے آزاد ہو کر اور انصاف کے سایے میں آکر ہم سے سخت نفرت کریں گے ۔ لہذا انھوں نے بھی بظاہر اسلام قبول کر لیا ۔ مگر ان بڑے لوگوں کی ایک خاصی تعداد ایسی تھی جو اسلام کو اپنے لیے باعثِ رسوائی سمجھ رہی تھی اور دو بدو جنگ میں ناکام ہونے کے سبب کوئی پس پردہ تحریک چلانے اور اسلامی نظام کو تلپٹ کر دینے کی تدبیر سوچ رہی تھی ۔ اور یہی اندازِ فکر یہودیوں کا بھی تھا ۔ ان دونوں گروہ کے چالباز لوگوں نے مل کر مجرموں اور حکومت کے ستائے ہوئے بد معاشوں کو اندر ہی اندر تیار کرنا شروع کیا ۔ پھر خاندانِ رسالت کی محبت کا لبادہ اوڑھ کر سادہ لوح مسلمانوں کو اپنے دام میں پھانسا ، اس کے بعد خلیفۃ المسلمین کے خلاف جھوٹے اور غلط الزامات کی تشہیر شروع کی ، جس سے بہت سے اچھے دیندار و تقویٰ شعار اور سوجھ بوجھ رکھنے والے مسلمان بھی متاثر ہو گئے ۔ ان سب نے دارالحکومت مدینہ کی طرف احتجاجی مارچ کیا اور خلیفۃ المسلمین کے خلاف اپنے الزامات کی فہرست پیش کی ۔ خلیفہ نے ان الزامات کا جواب دیا تو معلوم ہوا کہ ان کی کوئی اصل نہیں ، اس کے بعد سارے مجمع نے مطمئن ہو کر واپسی کی راہ لی ۔ مگر سازشیوں نے کچھ دور جا کر اپنے خاص خاص آدمیوں کے قتل کے حکم کی جھوٹی دستاویز پیش کر کے مجمع کو پھر بھڑکایا اور اس نے واپس آکر خلیفہ کا مکان گھیر لیا ۔ گفتگو کے بعد ایک بار پھر واضح ہو گیا کہ الزام جھوٹا اور بناوٹی ہے ۔ لیکن سازشیوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھا کر خلیفۃ المسلمین کو شہید کر دیا ۔

اس مختصر توضیح سے سمجھا جا سکتا ہے کہ تیسرے خلیفہ کی شہادت بھی عربوں یا مسلمانوں کی خونخواری کی علامت نہیں ، کیونکہ یہ یہودیوں اور ایرانیوں کی سازش کا نتیجہ تھی ۔ دورِ جاہلیت میں عرب جس طرح کے خونخوار تھے اگر اسلام کے بعد بھی ان کی وہی کیفیت رہی ہوتی تو مدینہ میں سرے سے کوئی شخص ایسی نیت سے قدم رکھنے کی جرأت ہی نہ کر سکتا تھا ۔ اور خدانخواستہ وہاں پہنچ جاتا تو اتنا بڑا جرم کرنے کے بعد زندہ بچ کر جا نہ سکتا تھا ۔ لیکن اس کے برعکس اتنا کچھ ہو جانے کے باوجود مدینہ کی فوج حرکت میں نہیں آئی ، کیونکہ جب تک تیسرے خلیفہ زندہ تھے انھوں نے کارروائی کی اجازت نہ

دی تھی۔ اور جب شہید کر دیئے گئے تو نئے خلیفہ کے برسر اقتدار آنے اور ان کا فیصلہ صادر ہونے کی منتظر رہی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں نے اسلام لانے کے بعد دور جاہلیت کے جذبۂ خونخواری کو ایک دم ابھار پھینکا تھا۔[1]

پھر حضرت علیؓ اور ان کے مخالفین کا جھگڑا بھی اسی بنیاد پر تھا۔ تیسرے خلیفہ کے قاتل ان کے لشکر میں شامل تھے۔ مخالفین کا مطالبہ تھا کہ ان سے قصاص لیں اور حضرت علیؓ کا خیال تھا کہ ابھی حالات سازگار نہیں ہیں اس پر مخالفین نے ان کی حکومت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور حضرت علیؓ نے انھیں باغی قرار دے کر فوج کشی کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے میں اور اس کے بعد ہونے والی جنگ میں بھی سازشیوں کا پورا پورا ہاتھ تھا۔

اس توضیح سے بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ خونخواری یا لوٹ کھسوٹ کی جنگ نہ تھی بلکہ اصولوں اور آدرشوں کی جنگ تھی پھر اس جنگ کی بھی کیفیت یہ تھی کہ نہ کسی فریق نے دوسرے کا ساز و سامان لوٹا نہ کسی زخمی پر تلوار اٹھائی، نہ کسی واپس جانے والے کا پیچھا کیا۔ بلکہ حالت یہ تھی کہ اگر دونوں فریق کے بیچ میں عین لڑائی کے دوران کوئی غیر متعلق یا نہتا آدمی کھڑا ہوا تو اس پر کسی بھی فریق نے ہاتھ نہ اٹھایا۔

اب آپ ایک طرف دورِ جاہلیت کا نقشہ ملاحظہ فرمایئے کہ انھوں نے مذہبی طور پر چار مہینے حرام کے مان رکھے تھے (جسے اسلام نے بھی برقرار رکھا)۔ ان مہینوں میں وہ اِدھر اُدھر آمد و رفت اور تجارت وغیرہ کر کے اپنی سال بھر کی ضروریات جمع کر لیتے تھے۔ باقی آٹھ مہینے کیفیت یہ رہتی تھی کہ ہر قبیلے کا ایک علاقہ ہوتا تھا، وہ اپنی آبادی کے اس علاقے سے باہر نہیں نکل سکتے تھے باہر قدم رکھتے ہی دوسرے قبیلے کے لوگ اسے لوٹ لیتے اور قتل کر ڈالتے بلکہ اپنی آبادی کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی کوئی قبیلہ محفوظ نہ رہتا تھا۔ دوسرا قبیلہ جوں ہی یہ محسوس کرتا کہ ہم اسے ہرا سکتے ہیں اس پر حملہ کر دیتا۔ اور عورتوں، بچوں اور بوڑھوں جوانوں میں تمیز کیے بغیر جس کو پاتا قتل کر ڈالتا اور جو کچھ پاتا لوٹ لیتا۔

ایک طرف جاہلیت کی یہ لوٹ کھسوٹ اور قتل و غارت دیکھیے اور دوسری طرف اسلامی جنگوں کا حال دیکھیے کہ وہاں میدانِ جنگ سے باہر جنگ کا کوئی اثر نہیں۔ ایک عورت تن تنہا اونٹ پر بیٹھ کر عراق سے مکہ آتی اور جاتی مگر اس پر کوئی چوں کرنے والا نہ تھا۔ پوری دنیائے اسلام میں کہیں کسی کو جان یا مال کا خطرہ نہ تھا اور خود میدانِ جنگ میں بھی صرف فوجیں ایک دوسرے سے لڑ رہی تھیں۔ غیر متعلق آدمی اگر دونوں فوجوں کے بیچ سے گزر جائے تو بھی اسے کوئی کچھ کہنے والا نہ تھا۔ آپ سوچیے کہ اسلامی دور کی ان لڑائیوں کو جاہلی دور کی لوٹ کھسوٹ سے کیا تعلق؟

---

[1] اب اندرا گاندھی کے قتل پر ہندوستان میں بھڑکنے والے ہنگامہ سے اس کا موازنہ کیا جا سکتا ہے۔ منہ

یہ خالص اصولوں کی جنگ تھی اور وہ خالص غارت گری۔

۱۳۹۹ھ / ۱۹۷۹ء کے حج کے بعد محرم ۱۴۰۰ھ میں سعودی حکومت سے بغاوت کرکے جن لوگوں نے خانہ کعبہ پر قبضہ کیا تھا، ان کے ساتھ ہونے والی جنگ کا بھی ٹھیک یہی نقشہ تھا۔ باغیوں اور سعودی فوج کے مورچوں کے درمیان جو میدان تھا اس میں غیر فوجی لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ عام لوگ اس میدان سے گزر کر مسجد حرام کی باہری دیوار میں لگی ہوئی بڑی بڑی جالیوں کے راستے مسجد حرام میں گھس جاتے تھے اور اپنے آدمیوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر اسی راستے سے واپس بھی آجاتے تھے۔ مگر ان پر نہ سعودی فوج گولی چلاتی تھی نہ باغی۔ کئی افراد اس وقت بھی آئے گئے جب باغی مسلسل گولیاں چلا رہے تھے۔ مگر انھوں نے کسی بے وردی انسان کو نشانہ نہیں بنایا۔[1]

حضرت حسینؓ کی شہادت بھی اسی طرح کے سیاسی طالع آزماؤں کی سازش کا نتیجہ ہے، جنھوں نے محض مکر و فریب کے لیے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اور چالباز اتنے تھے کہ خود حضرت حسینؓ کو شہید کرکے یزید کو بدنام کر دیا، جس سے عام مسلمان آج تک متاثر ہیں ان حقائق پر نظر رکھنے کے بعد یہ تو کہا جا سکتا ہے کہ مسلمان حکمراں پس پردہ سازشوں کو بر وقت پکڑ نہ سکے۔ جن سے بہت سے خطرناک حادثوں نے جنم لیا، مگر اس کا دوش اسلام کو نہیں دیا جا سکتا۔ نہ ان خونریزیوں کو اسلامی تعلیم کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ ہاں ان اندوہناک واقعات کے دوران انسانیت و شرافت جو کچھ پائی گئی وہ البتہ اسلامی تعلیم کا نتیجہ تھی۔

...

میری ان گزارشات کا تعلق متل صاحب کے اصل سوال اور گفتگو کے مرکزی نقطے سے تھا۔ متل صاحب نے ضمناً اور بھی کئی باتیں ایسی کہی تھیں جو غلط فہمی پر مبنی تھیں، میرا ارادہ تھا کہ اس اصل سوال کا جواب مکمل ہو چکنے کے بعد باقی ضمنی باتوں کے متعلق بھی اصل حقائق بھی پیش کروں گا۔ مگر چونکہ وقت ختم ہو چکا تھا اس لیے جناب راجہ رام شاستری صاحب نے آخری کلمات کہے۔ انھوں نے بہت صفائی کے ساتھ کہا کہ اب تک ہمیں صرف ایک بات بتائی جاتی تھی اور ہمارے سامنے تصویر کا صرف ایک رخ آتا تھا اور ظاہر ہے کہ جب ایک ہی بات بتائی جائے تو دوسری بات ذہن میں آئے گی کیسے؟ مگر آج مولانا نے تصویر کا دوسرا رخ پیش کر دیا ہے اور بڑی صفائی اور وضاحت سے پیش کر دیا ہے۔ اس لیے اس پہلو پر واقعۃً غور کرنے کی ضرورت ہے۔

[1] یہ ٹکڑا اسلامی جنگ کی نوعیت سمجھنے کے لیے بعد میں بڑھا دیا گیا ہے۔

آیات و انوار

مشاہدہ اور اس کی اہمیت

پروفیسر محمد معین فاروقی شعبہ حیوانیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ أَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ۖ قَالَ أَوَلَمْ تُؤْمِن ۖ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِن لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ۖ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ۚ وَاعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۔ (۲ : ۲۶۰)

مندرجہ بالا مکالمے میں ایک جلیل القدر نبی کی جانب سے جس سوال کی پیشکش کی گئی اور اس کے جواب میں خالق کائنات نے جو تجویز رکھی اگر اس پر غور کیا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجسس کی جو صفت انسان کو ودیعت کی ہے اس کا کماحقہ اظہار ہو رہا ہے۔ ایمان و یقین محکم کے اعتراف کے باوجود مشاہدہ پر اصرار کا پہلو نمایاں ہے، زور اس بات پر ہے کہ مردے کو زندہ ہوتے دیکھ کر نہ صرف عقل مطمئن ہوگی بلکہ قلبی کیفیت میں سکون اور ٹھہراؤ بھی پیدا ہوگا۔ اس جذبۂ شوق اور فطری تقاضے کا احترام کرتے ہوئے رب العزت نے جو تجویز رکھی وہ آیات فی الآفاق کی گرہ کشائی کے لیے اساسی اہمیت رکھتی ہے۔

نفس مضمون کی بحث سے قبل لفظ مشاہدہ کی وضاحت کر دینا ضروری ہے۔ اس لفظ کا اطلاق نہ صرف دنیا کی ان اشیاء پر ہوتا ہے جو مادی صفات سے متصف ہوتی ہیں بلکہ ان پر بھی ہوتا ہے جو بذات خود مادہ نہیں ہوتیں، مثلاً کسی چیز کا رنگ یا وزن ہونا۔ اس کے علاوہ غیر عنصری عالم جو بظاہر نظروں سے پوشیدہ ہیں مگر قوت متخیلہ کے ذریعہ جبکہ ظاہری حواس معطل ہو جاتے ہیں، ان سے رابطہ قائم کر کے وجود پذیر واقعات

کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے، مثلاً عالم رویا میں مردوں کو دیکھنا اور ان سے گفتگو کرنا یا جیسے عالم ملکوت سے ملائکہ کا مشہود ہونا، بعض صوفیا کے نزدیک یہ عالم اوقات بیداری میں بھی مکشوف ہوتا ہے جس کو وہ دیدارِ انوارِ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں فی الوقت اس قسم کے واقعات اور کشفی معاملات جو عام انسانوں سے تعلق نہیں رکھتے اور نہ ان کو سمجھنے کے لیے ان میں صلاحیت ہوتی ہے اور اگر بلاتخصیص ان کو عوام میں پھیلایا جائے تو گمراہی کے اسباب بھی پیدا ہو سکتے ہیں ان سب سے صرفِ نظر کر کے ان حوادث و واقعات پر اکتفا کیا جائے گا جو مادی اشیاء سے متعلق ہیں اور جن کو اپنی استطاعت کے مطابق دیکھنے اور سمجھنے کے لیے با ضابطہ قرآن حکیم میں غور و فکر کی عمومی دعوت ہے ۔

اللہ کی کائنات ایک کھلی ہوئی ضخیم کتاب کے مانند ہے جو اس کے افعال سے مزین ہے ۔ اس کے اوراق علوم کائنات کے مختلف ابواب پر مشتمل ہیں، یہ کتاب کسی زبان کی محتاج نہیں بلکہ چشم بصیرت ہی سے اس کی ورق گردانی کی جا سکتی ہے ۔ مادہ اس کا جوہر ہے جس کو انواع و اقسام کی شکلیں دیکر طول و عرض میں بکھیر اگیا ہے سارے جاندار و بے جان اسی مادہ کے مرہون منت ہیں، کائنات وحدتِ کل کا ایک پرتو ہے جو مقررہ قوانین کے تحت رواں دواں ہے ۔ (وحدتِ کل سے صوفیا کے اصطلاحی معنی مراد نہیں ہیں بلکہ مشہور مسلم سائنسداں کا وہ نظریہ ہے جو کائنات کی وحدت کے اثبات میں پیش کیا گیا ہے ۔) کائنات کی ہر چیز اسی وحدت سے منسلک ہے اور ہمہ وقت اسی کی تسبیح میں رطب اللسان ہے، یہی اس کا مقدر، یہی اس کی ابتدا اور یہی انتہا ہے ۔ ابن آدم ہی کو صرف جزوی خود مختاری عطا کی گئی ہے وہ چاہے تو اس رشتہ کو منقطع کر دے یا استوار کرے، سزا و جزا کا نظام اسی پر منحصر ہے ۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت بندوں پر سایہ فگن ہے وہ ہر قصور معاف کر سکتا ہے صرف اپنی ذات و صفات میں کسی کی شرکت گوارا نہیں کرتا ۔ اپنی وحدت کے ثبوت میں عقلِ انسانی کے لیے طرح طرح کے دلائل پیش کرتا ہے ان سے جو اعراض کرنے والوں کا شمار عاقلوں میں نہیں کیا جاتا ۔ کائنات کی ہر چیز "کَیْفَ خُلِقَتْ" کی داعی ہے وہ اپنی معرفت کی طالب ہے ۔ بر زبانِ خلق اس کا دعویٰ ہے کہ معرفتِ الٰہی کی یہی پہلی منزل ہے وہ چاہتی ہے کہ انسان اس کے کل پرزے جدا جدا کر کے صانع کی مدح سرائی میں مشغول ہو جس نے اس کو ترتیب دے کر لاجواب بنا دیا، اسی تشریح میں انسانوں کی مادی ترقی کا راز پوشیدہ تھا ۔ اسی فعل سے فاعل کی عظمت کا اندازہ کیا جا سکتا تھا ۔ مگر حیرت ان لوگوں پر ہے جو خلق کی آواز پر لبیک نہیں کہتے، گونگے، بیل کی طرح دیکھ تو سکتے ہیں مگر کفرانِ نعمت پر مائل ہیں

تا کہ یہ با وجود اپنی بصارت اور عقل سے کام نہیں لیتے۔ روز جزا جب نعمتوں کا حساب لیا جائے گا تو معاملہ ہوگا کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ اٰيَةٍ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝

قاری کی تلاوت کا کمال یہ ہے کہ مضمون کے مطابق تاثر کا اظہار ہو۔ واعظ اپنی سحر بیانی سے سامعین کے شعور کو بیدار کر دے، استاد اپنے شاگردوں کو خلق کی ان پر پیچ وادیوں تک پہنچا دے، اگر مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہوں تو شکست کے اعتراف ہی سے اصلاح کی امید کی جا سکتی ہے۔

علامہ طنطاوی کے اعداد و شمار کے مطابق قرآن حکیم میں ۷۵۰ آیات آفاقی مظاہر پر غور و فکر کی ترغیب کے واسطے موجود ہیں اور ان کے مقابل صرف ۱۵۰ آیات شرعی احکامات اور فرائض سے متعلق ہیں۔ اس عددی تفاوت سے ثانی الذکر کی اہمیت پر آنچ نہیں آتی بلکہ ایمان کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ ایمان ہی عمل کا سرچشمہ ہے، یہ جتنا قوی ہوگا اسی نسبت سے عمل کے چشمے پھوٹ نکلیں گے۔ ایمان ہی کی تقویت کے لیے یہ مقدس راہ قرآن نے تجویز کی تھی، خود رسول اکرم کی زندگی میں معراج کا واقعہ اسی بات کی دلیل ہے کہ کامل تربیت اور اعلیٰ ترین مقام پر فائز ہونے کے باوجود بشری تقاضوں کی رعایت کی بنا پر رب العزت نے اس بات کی ضرورت سمجھی کہ اپنے حبیب کو اس نظام کا بھی مشاہدہ کروائے جو عام انسانوں سے مخفی رکھا گیا تھا تاکہ عینی شہادت کے بعد اس جامعیت اور خود اعتمادی کے ساتھ جب آپ ان ماوراء حقائق کا تذکرہ فرمائیں تو ختم نبوت سے قیامت تک یہ الفاظ ہی لوگوں کے یقین و ایمان کی کفالت کر سکیں۔ یہی سبب رہا ہوگا کہ بیدار ہو کر شب کی تاریکی میں جب بھی سر مبارک بلند ہوتا تو خلا کی وسعت اور تاروں کی جھلملاہٹ سد راہ نہ ہوتی بلکہ اس کے پرے جا کر رکتا ہو اور تخیل کے سہارے پر عالم ملکوت کے عجائب جگمگا اٹھتے ہوں گے، پھر جس والہانہ کیفیت سے آپ یہ آیات تلاوت فرماتے ہوں گے اس کیفیت کا اندازہ لگانا ہمارے تصور سے بعید ہے۔

اِنَّ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِى الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ (۳:۱۹۱)

کوہ طور کا واقعہ اسی حقیقت کا غماز ہے۔

یہ تو رہی انبیاء کی سنت، اب عوام کے لیے کس قسم کے شواہد کی تلقین کی گئی ہے، ملاحظہ ہو۔

علمی اعتبار سے انسانوں کو چار طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول وہ جنھوں نے علوم کائنات ہی کو اپنی فکر کا مرکز بنایا اور ساری عمر اسی کی تحقیق اور تنقید کے لیے وقف کر دی، مخلوقات کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے نئے نئے تجربے کیے، ایجادیں کیں، بعض نے اپنی جان تک کی بازی لگا دی، اپنی کاوشوں سے قدرت کے اسرار کا پتہ لگایا اور دنیا والوں کو ایک "نئی تہذیب" سے متعارف کیا جس کی بنیادیں صدیوں پہلے ہمارے اسلاف قائم کر چکے تھے۔ آج اس تہذیب کے روشن اور تاریک پہلو ہمارے سامنے ہیں، دوسرا طبقہ ان عالموں کا ہے جو دینی علوم کے ماہر ہیں، یہ لوگ اس تہذیب نو سے متاثر ضرور ہیں مگر براہِ راست ان علوم سے واسطہ نہیں رکھتے۔ تیسرا طبقہ وہ ہے جو خواندگی کی حدود سے تجاوز نہیں کرتا اور چوتھا عامیوں کا وہ گروہ ہے جو علمی نقطۂ نظر سے معصوم ہے نمبر ا اور ۲ کے حضرات خواص سے تعلق رکھتے ہیں، معاشرے کی عنان انھی کے ہاتھوں میں ہے۔

ایک خوش آیند بات یہ ہے کہ طبقۂ اول میں ایک مختصر سا ایسا گروہ بھی شامل ہے جس نے پچھلے چند برسوں میں کلام اللہ سے غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ یہ وہ مسلم نوجوان ہیں جو برصغیر ہند و پاک کے علاوہ ترقی یافتہ ممالک میں سرگرم عمل ہیں۔ ان کے کئی مراکز ان ملکوں میں قائم ہیں جو وقتاً فوقتاً تعلیم قرآن پر چھوٹی بڑی کانفرنس اور سیمینار منعقد کرتے ہیں اور نئے طرز کے جریدے شائع کرتے رہتے ہیں ان کے عزائم سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ دنیوی اور اُخروی حسنات کے طالب ہیں اور یہی قرآنی دعا ان کی تعمیر کا سنگِ بنیاد معلوم ہوتی ہے۔ شاید امتِ مسلمہ کے جمود اور انحطاط کا سوگ منانے والوں کے آنسو پونچھنے کے لیے یہ طبقہ اٹھا ہے۔ دینی حلقوں سے ان کے اشتراک کی ضرورت ہے۔

قرآن مجید سے دلچسپی کی دیگر وجوہ کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ کلام اللہ میں ان کو اپنے علمی ذوق کے مطابق دلچسپ اشارے ملتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۖ نُّسْقِيكُم مِّمَّا فِي بُطُونِهِ مِن بَيْنِ فَرْثٍ وَدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَائِغًا لِّلشَّارِبِينَ ۝ (۱۶ : ۶۶)

اس آیتِ کریمہ میں مویشیوں کی غذا، خون، اور دودھ کے باہمی تعلق کا کلیہ بیان کر کے تحقیق کے لیے خطوط تو متعین کر دیے مگر تفصیلات کا کام انسانوں پر چھوڑ دیا گیا تاکہ تحقیق اور تجربہ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے حسنِ تدبیر

اور احسن تقویم کا مشاہدہ کیا جاسکے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس حقیقت کا انکشاف اس دور میں کیا گیا، جبکہ جانوروں کے فعلیاتی نظام کے متعلق معلومات تقریباً نہیں کے برابر تھی، اگرچہ سرمایہ تھا بھی تو وہ سارے کا سارا حکیم جالینوس کے طبی نظریات پر مبنی تھا۔ یونان کا یہ حکیم دوسری صدی عیسوی میں روم میں طبابت کرتا تھا۔ طبی دنیا میں اس کے تصورات صدیوں تک مستند مانے جاتے رہے۔ غذا اور دورانِ خون سے متعلق اس کا نقشہ دیکھنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے نظریات میں توہم کا عنصر غالب تھا وہ ہیولیٰ اور مجرد روح کا قائل تھا، اس کے باوجود تقریباً سترہویں صدی تک اس کے خیالات عوام میں مقبول رہے۔ قرآن مجید کے اس اعلان کے بعد آٹھویں صدی سے تحقیق کے باب کھلنا شروع ہوئے اور ابن سینا اور رازی جیسی شخصیتیں اس کام پر لگ گئیں، ۱۲۴۲ء میں ابن النفیس نے پھیپھڑوں میں دورانِ خون کا پتہ لگایا اور اس کے کئی صدیوں کے بعد ۱۶۲۸ء میں ہاروے نے مکمل طور پر دورانِ خون کا نظام دریافت کیا۔ آج اس نظام کا کیمیائی پس منظر ہمارے علم میں ہے، بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے اور بہت کچھ اب بھی جاننا باقی ہے۔ طوالت کے خوف سے تفصیلات میں نہیں جایا جاسکتا، البتہ ماہرین کے نقطۂ نظر سے یہ بات پوری ذمہ داری کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ مویشیوں کے جسم میں کیمیائی عملیات کا یہ حیرت انگیز سلسلہ کسی کرشمہ سے کم نہیں، کیمیائی اجزاء کے بالترتیب باہمی عمل سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ بے جان عناصر بھی کسی نہ کسی قسم کے شعور سے مکلف ہیں جس کے باعث ان کا ذرہ ذرہ قوانینِ قدرت کی پابندی پر مجبور ہے۔ اس ضمن میں ایک بات اور بھی قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ خالقِ کائنات نے اشیاء کی تشکیل میں جو ترتیب (ڈیزائن) تجویز فرمائی وہ اپنی جگہ بے مثل ہے۔ جسم کے اعضاء و جوارح بلکہ ہر ہر رگ و ریشہ جس شکل میں ہے اور جس مقام پر قائم ہے اسی پر جسم کی پوری کارکردگی کا انحصار ہے۔ ذرا سی تبدیلی سے نظام میں تغیر پیدا ہو سکتا ہے۔

امریکہ میں ہر سال ہزاروں باشندے لقوے کا شکار ہو جاتے ہیں، یہ بیماری چہرے کے اعصاب سے متعلق ہے۔ معیاری سرجری سے اس مرض میں جزوی افاقہ تو ہو جاتا ہے مگر یہ کیفیت پھر بھی باقی رہتی ہے کہ اگر مریض آنکھ کھولے یا بند کرے تو بغیر شعوری طور پر منہ بھی کھلتا اور بند ہوتا رہتا ہے۔ حال ہی میں نیویارک کے پلاسٹک سرجری کے ماہر مائیکل زاکس نے علاج کا ایک اور طریقہ دریافت کیا۔ وہ یہ ہے کہ چہرے کا وہ پٹھا جو اوپر اور نیچے کے جبڑے سے جڑا ہوا ہے، اس کو نیچے سے جدا کر کے دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، اس کا ایک حصہ منہ سے اوپر اور دوسرا حصہ منہ سے نیچے اپنے اصل مقام سے ذرا ہٹا کر ہڈی سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ چہرے کی اعصابی ڈور جس کی شاخیں آنکھ اور

منھ تک پھیلی رہتی ہیں اس میں پیوند لگا کر درست کیا جاتا ہے ، اس ترکیب سے شکل و صورت کچھ اصل سے مشابہ تو ہو جاتی ہے مگر یہ نقص پھر بھی باقی رہتا ہے کہ اگر مریض کسی چیز کو چبانے کی کوشش کرے تو غیر ارادی طور پر مسکراتا نظر آتا ہے ۔ زاکس کا خیال ہے کہ چہرے کے پٹھوں کی تقریباً دو سال مسلسل ورزش کے بعد ان پر کسی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے ، مگر پھر بھی اس قطع و برید سے مریض ہمیشہ کے لیے اپنی قدرتی نقل و حرکت سے محروم ہو جاتا ہے

کائناتی نظام پر غور و فکر ، تجزیہ اور تجربہ کے بعد انسان کبھی ایسے نتائج بھی اخذ کرتا ہے جو قرآن مجید کی بعض آیات کو سمجھنے میں ممد و مددگار ثابت ہوتے ہیں ۔

کیمبرج یونیورسٹی کے ریاضیاتی طبعیات کے معروف پروفیسر ڈگلس ہارٹری ، جنھوں نے لوہے کے ایٹم کی ساخت پر کام کیا ہے ، ان کا خیال ہے کہ کسی بھی ریاضی کے فارمولے کی مدد سے ایٹمی الیکٹرانوں کے باہمی تعلق کو ظاہر نہیں کیا جا سکتا اور اگر اس تعلق کو عددی نقطۂ نظر سے تختیوں کی شکل میں چھاپنے کی کوشش کی جائے تو بقول ان کے :

"پورے شمسی نظام میں اس قدر مادہ نہیں ہے جو ان تختیوں کی طباعت کے لیے کافی ہو اور اگر کوئی صورت نکل بھی آئے تو اول یہ تختیاں اس قدر ضخیم ہوں گی کہ ان کو کوئی استعمال نہیں کر سکتا اور دوم یہ کہ یہ معلومات صرف ایک ہی ایٹم کی ایک مخصوص حالت کی ترجمان ہوں گی ۔"

ذرا ان الفاظ کو ذہن میں رکھیے اور پھر قرآن حکیم کی اس عبارت پر غور فرمائیے کہ کس طرح انسانی مشاہدات لامحدود سفر میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں ۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ٥ (۱۸ : ۱۰۹)

کائناتی نظام پر غور و فکر کی تعلیم سے یہی مقصود تھا کہ اللہ کی مخلوق کا حق ادا کیا جائے ، مشاہدہ کے ذریعہ ان کی ساخت و صفات کے متعلق خصوصی معلومات حاصل کی جائے ، پھر ان حقائق کو ترتیب دیکر عمومی نتائج اخذ کیے جائیں ان کو ایک لڑی میں پرونے کے لیے جو نظریات قائم کیے جائیں ، ان کا عنوان اللہ کی عظمت کا اعتراف ہو ۔ ان نظریات میں اتنی لچک بھی ہو کہ اگر اس سے بہتر کوئی نظریہ سامنے آئے تو اس کو قبول کرنے میں قباحت محسوس نہ ہو بشرطیکہ بنیادی عقائد سے ان کا تصادم نہ ہوتا ہو ۔ علمی ترقی کا یہی راز ہے کہ نئے نئے خیالات سے اس کی آبیاری

(باقی ص ۱۷ پر)

حضرت عثمان کا تاریخ اسلام میں مقام

صوفی نذیر احمد کاشمیری

گزشتہ دوسو برس سے عالمگیر جمہوری فضا میں تاریخ انسانی پر جو نظر ثانی کی جارہی ہے اور جس کی نمایاں ترین خصوصیت نوعِ انسانی کی عالمگیری ہے۔ اس نے ایک تاریخی اضطرار کے طور پر ساری تاریخ انسانی کی تدوینِ جدید کی طرف مفکرین کو متوجہ کردیا ہے۔ اور مسلمانوں میں اس کا اثر شیعہ فرقے نے لیا ہے۔

اس سلسلے میں سر آغا خاں مرحوم، جسٹس امیر علی مرحوم نے تاریخ اسلامی کو سنبھالا دینے میں نمایاں کام کیا ہے ایران کے خمینی صاحب نے بھی تاریخِ اسلام کو اپنے اردگرد لپیٹ کر اسلام کو جو نئی شکل دینے کی کوشش کی ہے، اس سے ایک طرف تو یہ تاثر ابھرتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی تحریک کو وحدت انسانی کی شاہراہ سے ہٹا کر تفرقہ اور نسلی امتیاز کی راہ پر جو شیعہ ازم نے ڈالدیا تھا۔ اس غلطی کا خمینی صاحب پورا کفارہ کردیں اور اسلامی دعوت کو پھر سے نوعِ اسلامی کی وحدت کی راہ پر ڈال دیں، لیکن دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اسلام کے نمایاں خدوخال کو مدھم کرتے ہوئے بنی فاطمہ کے خونی تقدس کی طرف مسلمانوں اور کائناتِ انسانی کو متوجہ کریں جو ایک تاریخی حادثہ ہوگا[1] اس حیثیت سے اسلام، یہودیت اور برہمن ازم میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ ٹھیک اسی موقف کو واضح کرنے کے لیے راقم نے صدر کا عنوان اختیار کیا ہے۔ اگر حضرت عثمان کے معاملے میں صحیح طریقہ اختیار کرلیا گیا تو پھر آئندہ کی تاریخ کے سارے الجھاوے صاف ہوتے جائیں گے۔ تاریخ اسلام میں جہاں جہاں کجی آئی ہے وہ نمایاں ہوتی جائے گی اور صراطِ مستقیم کا دینی تصور اپنی جگہ قائم رہتا نظر آئے گا۔ تاریخ اسلامی کے سلسلے کا وہ زریں الجزوہ طائفہ عالیہ مہیا کرتا ہے جو حسب فرمان رسول اللہ ہمیشہ سے ہمیشہ تک حق پر قائم رہے گا اور ان کے طریقِ عمل کی تاباہی کو کوئی مخالف نقصان نہ پہنچا سکے گا۔

---

[1] افسوس کہ ایران کا موجودہ کردار اسی حادثے کو جنم دینے کیلئے کوشاں ہے۔ "ادارہ"

اب عنوان کے متعلق چند غیر مشکوک حقائق عرض کیے جاتے ہیں۔ حضرت عثمان کی خدمات کا تقابل شیخین کے مقابل نہیں کیا جا رہا ہے۔ اس لیے کہ ساری امت کا اور خود حضرت عثمان کا شیخین کی افضلیت پر اتفاق ہے۔ جھگڑا تو اس وقت شروع ہوتا ہے جب حضرت عثمان اور حضرت علی کا سوال سامنے آتا ہے، جہاں ایک طرف تو صاف وشفاف دینی خدمات و ایثار کا ریکارڈ ہے اور دوسری طرف شرافت کی ساری بنیاد خونی رابطے کو بنایا جاتا ہے

عبدالمطلب کے فوت ہونے کے بعد رسول اللہ کی کفالت ابوطالب کے ذمہ آئی اور اس کی حالت یہ تھی رسول اللہ کو اپنی گزر بسر اور کسی حد تک ابوطالب کی گزر بسر کے لیے مکے والوں کی بکریاں چرانی پڑتی تھیں۔ لہذا مادی طور پر رسول اللہ نہیں بلکہ خود ابوطالب رسول اللہ کے دست نگر تھے۔

پھر جب رسول اللہ نے حضرت خدیجہ سے نکاح کر لیا تو ابوطالب نے حضرت علی کی کفالت ان کے ذمہ ڈال دی اور جب رسول اللہ کی بعثت ہوئی تو ابوطالب نے ذاتی طور پر اسے قبول نہیں کیا اور مرتے دم تک قبول نہیں کیا مگر حضرت علیؓ کے لیے رسالت محمدی کا اقرار کرنے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہ تھا لہذا وہ کھلے بندوں اسلام

لائے، اس میں انھیں کوئی مادی نقصان اٹھانا نہیں پڑا

مگر حضرت عثمان جب اسلام لائے تو انھیں کنبے میں وہ پرسٹیج حاصل نہیں رہا جو انھیں پہلے حاصل تھا۔ اور شاید کاروبار کا بھی نقصان ہوا ہوگا۔ اب حضرت علی کی اور حضرت عثمان کی خدمات کا تقابل شروع ہو رہا ہے اور وہ بڑا فرق دکھاتا ہے۔

پھر دوسرے مرحلے پر حضرت عثمان شاید ایک حضرت ابوبکر کو چھوڑ کر غربائے اسلام کو ظالم اہل کفر کے استبداد سے نجات دلانے میں سب سے آگے تھے۔ اور اسلام کی تبلیغ و افزائش میں حضرت عثمان کی مالی خدمات بھی آخری وقت تک ایسی رہیں کہ حضرت علی تو کیا شاید ہی صحابہ میں کوئی ان سے زیادہ خدمات کا دعویٰ کر سکے۔

خونی رشتہ:۔ حضرت عثمان کے عقد نکاح میں حضرت رسول اللہ کی دو صاحبزادیاں آئیں۔ جب دوسری بھی فوت ہوگئیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمنا ظاہر کی کہ اگر آپ کی تیسری صاحبزادی بھی ہوتیں تو آپ انھیں بھی حضرت عثمان کی زوجیت میں دے دیتے۔ پھر یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ اپنی صاحبزادیوں کے سلسلے میں رسول اللہ ایک دفعہ بھی حضرت عثمان سے ناراض نہیں ہوئے۔ مگر جب حضرت علی نے حضرت فاطمہ کی موجودگی میں دوسری شادی کا خیال ظاہر کیا تو رسول اللہ اس پر اس درجہ برہم ہوئے کہ فرمایا کہ فاطمہ تو میرے گوشت کا ٹکڑا ہے، جو شخص

ـسے ناراض کرے گا وہ مجھے ناراض کرے گا۔

حضرت عثمان کو حضرت علی کے مقابل دو ہجرتیں کرنی پڑیں

پھر ان کی شہادت بھی حسن حالات میں ہوئی۔ بنو فاطمہ اور حضرت علی کی شہادت کو اس کے برابر قرار دینا محض سینہ زوری ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی خانہ جنگی سے بچنے کے لیے فوجوں کو باغیوں کے خلاف تلوار اٹھانے سے روک دیا۔ یہ بات حضرت علی یا ان کے خانوادے میں کہاں پائی جاتی ہے، سوائے حضرت حسن کے جنھوں نے مسلمانوں میں خون خرابے کو روکنے کے لیے خلافت کے دعوے سے دست برداری دیدی۔

خمینی صاحب اور علمائے شیعہ کو تاریخ کے ان اٹل واقعات کو تسلیم کرتے ہوئے تاریخ اسلام کی طہارت کو بحال کرنا چاہیے اور اس اعتراف حق کے بعد انشاء اللہ آئندہ کے ادوار میں وہ تمام اہلسنت کی طرح عالمگیر داعیِ اسلام اور عالمگیر محافظِ اسلام ہوں گے۔ ورنہ ماضی کی شیعہ تاریخ تو صرف یہ ہے کہ انھوں نے بار بار اسلامی سلطنتوں کو زیر و بالا کیا۔ بڑے بڑے دشمنانِ اسلام سے سازباز کی اور مسلمانوں کی فتح کو شکست سے بدلنے کی کوشش کی اس میں دو جذبے کام کرتے تھے۔ ایک تو زرتشتی ایران کی سلطنت کا اسلام کے ہاتھوں خاتمہ اور دوسرا عبداللہ بن ابی سے شروع ہو کر اور عبداللہ بن سبا سے ہوتے ہوئے آج تک کی یہودی سازش، جس نے بنو فاطمہ کو اپنے اعتماد میں لے کر اسلام کی عالمگیری کو چاروں طرف سے روکنے کی کوشش کی جو آج تک جاری ہے اور خطرہ ہے کہ خمینی صاحب ملت اسلامیہ کے عالمگیر مفاد سے ہم آہنگ ہونے کے بجائے یہود سے ہم آہنگ ہو کر امت اسلامیہ کو اس سے بھی بڑا نقصان پہنچائیں جو نقصان ابن علقمی و نصیر الدین طوسی نے امت کو پہنچایا تھا۔ اور نتیجہ میں رسوائی کے سوا کچھ نہ ملا تھا۔

ایک عظیم فرق: اہل سنت کا تصور دین حضرت ابراہیم کی تعلیم کی تفصیلی شکل معلوم ہوتی ہے۔ وہی اظہار و تبیان اور توحید خالص جو حضرت ابراہیم کے ہاں ملتی ہے اہلسنت کا شعار ہے۔ لیکن جہاں تک شیعہ ازم کا تعلق ہے اس میں اعتدال و وسط کا تصور ناپید ہے اور یہود و نصاریٰ کی طرح نسلی امتیاز اور سرتیت و خفا کا سلسلہ محسوس ہوتا ہے اور صرف شخصیت پرستی کا ایک تسلسل دکھائی دیتا ہے۔ شیعیت مستقبل کی طرف رخ کرکے چلنے کے بجائے ماضی کی طرف رخ کرکے چلتی ہے اور نتیجہ میں برہمنوں کی طرح کا ایک نسلی مذہب محسوس ہوتی ہے، جس میں تبلیغ کے دائرے کو وسعت دے کر سارے عالم انسانی کو ایک سلسلۂ اخوت بنانے کے سارے

امکانات معدوم ہیں۔ ادھر اسلام کا سارا خطاب "یاایہاالناس" اے کائنات انسانی سے ہوتا ہے اور اسی پر "ملک الناس، الٰہ الناس" پران کا خاتمہ ہوتا ہے۔

اگر اسلام کو عالمگیر ہونا ہے (اور اس کو منوائے مذہب انسانیت کے کوئی تحفظ کائنات انسانی کے لیے باکردار اور عالمی نہیں بنا سکتی) تو شیعہ ازم کو یہودیت و عیسائیت کی ساری مشابہت کو ختم کرکے پھر سے ملت ابراہیمی کی صفائی و طہارت و ظاہر و باطن کی یکسانی و مطابقت اختیار کرنا ہوگی۔

سفر کی حالت میں ہوں، امن سے بیٹھنے کی بھی کوئی صورت نہیں ہے، اس لیے میں ان واقعات کو ظاہر کرنے کے لیے مجبور محض ہوگیا ہوں۔ اللہ پاک علمائے امت کی ایک عالمگیر مجلس مشاورت منعقد کرنے کا سامان فرمائے جو اسلام کو پھر سے "اے کائنات انسانی میں تم سب کی طرف اس خدا کا رسول ہوں جو تمام آسمانوں اور زمین کا مالک ہے۔" کے مقام پر لے آئے۔

شیعہ علماء خاصکر خمینی گروپ نے احیائے امت و جدید تنظیم امت کا آغاز تو کیا ہے مگر اس کا راستہ اتنا ناہموار ہے کہ وہ کچھ کرنے کے بجائے الٹا ایک عالمگیر تفرقے کو جنم دے سکتا ہے۔

خدا اسے اس ہلاکت سے بچائے اور علماء سنت کو بھی آمادہ کردے کہ وہ انفرادی مرکزیتوں کو تحلیل کرتے ہوئے عالمگیر طور پر "امرہم شوریٰ بینہم" کو زندہ کرتے ہوئے دین و امت کو ایک عالمگیر قوت بنانے پر آمادہ ہوجائیں۔ اس قدرے بے ترتیب سی تحریر کو رسالہ محدث کے مدیر شہیر کو بھیج رہا ہوں۔ اللہ کرے وہ اسے مربوط شکل دے کر شائع کردیں۔

فقیر نذیر احمد

(نوٹ: یہ مضمون جوں کا توں شائع کردیا گیا ہے۔ مدیر)

ص ۱۳ کا بقیہ:- ہوتی رہے۔ قرون وسطیٰ میں اگر طبی دنیا حکیم جالینوس کے نظریات کو حرف آخر مان کر مطمئن ہوگئی ہوتی تو آج طبی ذہن مفلوج ہوکر رہ جاتا۔ یہی فکری تہذیب جمود کی رجحانات کا سدباب کرسکتی ہے اور یہی علم اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی لازوال قوت تخلیق کے اثبات میں بطور دلیل پیش کیا جا سکتا ہے۔

(پہلی قسط)

دشمنانِ اسلام کے منصوبے

مولانا عبدالرقیب سلفی ۔ فاضل مدینہ یونیورسٹی ۔

اسلام پوری دنیائے انسانیت کا مذہب ہے، حق و صداقت کا علمبردار، امن و سلامتی کا پیغامبر، انسانی اخوت و بھائی چارگی کا پرچار اس کا شیوہ ہے ۔ محبت و مساوات اس کی تعلیم ہے ، ظلم و ستم، قتل و غارت گری، نفرت عداوت، ذلت و حقارت اس کی تعلیمات سے خارج ہیں ، تمام نیکیوں، خوبیوں اور بھلائیوں کا سرچشمہ ہے، انسانی صلاح و فلاح کا ضامن ہے ۔ انسانیت کی ترقی و عروج اس کا مقصد ہے ۔ اور یہ سب اسلام کی ایسی خوبیاں اور رعنائیاں ہیں جن سے مسلمان اپنی ناواقفیت ، بے عملی اور بد عملی کی وجہ سے الگ تھلگ اور بے زار ہیں اور دشمنانِ اسلام جو انسانیت کی راہ کے رہزن، شر و فساد کے عادی، جرم و زیادتی کے خوگر ہیں اور انسانیت دشمنی جن کی فطرتِ ثانیہ ہے وہ اسلام کو اپنی راہ کا پہاڑ اور مقصد کا دشمن خیال کر کے اس کو مٹانے کی تدبیریں کر رہے ہیں ، تحریکیں چلا رہے ہیں اور لوگوں کو اس کی تعلیمات سے دور کرنے اور دور رکھنے کی مسلسل تگ و دو جاری ہے ، مسلمانوں کی صف میں نفاق انتشار اور اختلاف پھیلانے کی متواصل کامیاب جد و جہد ہو رہی ہیں اور ان کی زندگی کو اسلام اور قرآن سے خالی اور عاری کرنے کی نئی نئی ترکیبیں اور اسکیمیں تیار ہو رہی ہیں ، جن کو بروئے کار لاکر اسلام اور مسلمانوں کے مابین عداوت پیدا کی جا رہی ہے ۔ دین دشمن پروگراموں کو نافذ کرنے کے لیے ملت فروشوں سے کام لیا جا رہا ہے ، جس کی وجہ سے نہ صرف عالم اسلام بلکہ پوری دنیائے انسانیت تباہی و بربادی کے کنارے کھڑی ہے ۔ اشتراکیت، صلیبیت ، صہیونیت اور استعماریت ، انسانیت یا اسلام کا جنازہ دھوم دھام سے نکالنے کے لیے جن خطرناک منصوبوں پر عمل کر رہی ہے اور کرنا چاہتی ہے ، اس کی ایک ہلکی سی جھلک ہم آنے والی سطروں میں پیش کر رہے ہیں ۔ جسے عالم عرب کے بہت سارے رسائل و جرائد اور تصانیف ، خفیہ دستاویزوں کی مدد سے ترتیب دے کر شائع کر چکے ہیں

سب سے پہلے اشتراکی منصوبے کی جھلک ملاحظہ فرمائیے۔

اشتراکی منصوبے: اسلام دینِ فطرت ہے، فطری تقاضے اس کی تعلیمات اور اصول و مبادیات میں پوری طرح ملحوظ اور موجود ہیں۔ اشتراکیت اسلام کی ضد ہے۔ مارکس اور لینن کے مذہب میں فطری جذبات وخیالات اور رجحانات صرف روٹی، کپڑا، مکان اور جنس کی حد تک محدود ہیں، غریبوں، مسکینوں اور مزدوروں کے جذبات و تصورات کو ابھارنا اور ان سے کھلواڑ کرنا، اس کا شاندار محبوب مشغلہ ہے۔ اشتراکیت میں فطری رجحان ومیلان کی صحیح خطوط پر رہنمائی، نشوونما اور طبعی ضروریاتِ زندگی کی تکمیل کے لیے راہیں ہموار کرنا تو دور کی بات ہے، اسے تو اس کا موقع دینا بھی گوارا نہیں ہے بلکہ اسے کچل دینا اور ذہن و دماغ سے اس طرح کی باتوں کو کھرچ دینا، اس کی تعلیم و تربیت کا بنیادی عنصر ہے، اس صورتحال کے پیش نظر اشتراکی نظریات کا، اسلام کی فطری تعلیمات سے تصادم ایک لازمی اور یقینی بات ہے۔ اور اشتراکیت کی طرف سے اسلامی اصول و عقائد اور اخلاق و عادات کو ملیامیٹ کرکے اپنے ملحدانہ افکار و نظریات کو عوام پر لادنے کی سازش بالکل قرین قیاس اور قریب عقل ہے۔ چنانچہ آئے دن ان لوگوں کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کے جو منصوبے ماسکو میں تیار ہوتے ہیں، وہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، بلکہ ایک واقعی حقیقت بن چکے ہیں، جسے ہر شخص اپنی آنکھوں سے مسلم ممالک میں اشتراکی اخبارات و رسائل میں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پروگرام میں تعلیم و تربیت کی منزلوں میں، اسکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں ریسرچ اور تحقیق کے اداروں میں دیکھ رہا ہے اور کمیونسٹ لیڈروں، اسکالروں اور اناؤنسروں کی زبانی اپنے کانوں سے سن رہا ہے۔ یہ ان کے بعض وسائل و ذرائع کا تذکرہ ہے، جنھیں بروئے کار لاکر اپنے منصوبے کو عملی شکل دیتے ہیں، ورنہ پوری اشتراکی مشنری اسلامی اخلاق و اقدار کو مٹانے کے لیے پوری دلجمعی کے ساتھ کام کررہی ہے، اپنی کارکردگی کا جائزہ لے رہی ہے قتل کے لیے لائحہ عمل مرتب کررہی ہے۔ ذیل کی سطریں ناپاک اشتراکی ارادے اور منصوبے سے پردہ ہٹاتی ہیں اور مسلمانوں کو دعوتِ فکر دیتی ہیں۔

اسلامی تحریکات پر نظر رکھنے والی اشتراکی کمیٹی نے مسلمانوں کو دینِ حق "اسلام" سے برگشتہ کرنے کی جو کوشش کی ہے اس کا اس نے ایک پچاس سالہ جائزہ لیا ہے اور اپنی خاطرخواہ کامیابی نہ ہونے کا اعتراف کیا ہے، جس پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک روسی رسالہ "سائنس اور مذہب" نے جنوری ۷۴ء کے شمارہ میں لکھا ہے کہ اشتراکیت کو روس میں داخل ہوئے تقریباً پچاس سال بیت چکے ہیں اور عالم اسلام میں اسلام کی پسپائی کے لیے زبردست

قوت صرف کر رہی ہے، پھر بھی ہم لوگوں کو روس کے مسلم علاقے میں داخلی چیلنجوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لینن کے قوانین مسلم رگ و خون میں سرایت نہیں کر سکے ہیں۔

دین سے نبرد آزما قوتوں کی بیداری کے باوجود اسلام برابر اپنی روشنی پھیلا رہا ہے اور قوت کے ساتھ ابھر رہا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ مسلم علاقے میں نئی نسل نے لاکھوں کی تعداد میں اسلام کو گلے لگا لیا ہے اور وہ اس کی تعلیمات کا کھلم کھلا مظاہرہ کر رہی ہے، جبکہ قائدینِ جماعت اور منکرینِ مذہب روسی مسلم علاقے میں بیداریٔ اسلام کے خطرے سے غافل نہیں ہیں۔ جس کی طرف "اشتراکی تعلیمی انسائیکلو پیڈیا" میں اشارہ موجود ہے، کہ اسلام رجعت پسند ادیان میں سب سے خطرناک دین ہے جو غریبوں کو لوٹنے والی قوت جاگیرداری اور سرمایہ داری کی خدمت کے لیے انتہائی کوشش صرف کرتا ہے اور ہر قسم کا تعاون پیش کرتا ہے۔ یہ ایک جامد دین ہے۔ تہذیب و ترقی کا بڑا دشمن ہے، اشتراکیت کا زبردست مخالف ہے اور آزادی کی تحریکوں کا مقابل ہے۔ دستاویز کے اندر لکھا ہے کہ اسلام کو مٹانے کے لیے خود اسلام کو بطور آلہ استعمال کرنا چاہیے، جس پر عمل کرنے کے لیے ہماری درج ذیل قراردادیں ہیں۔

۱۔ ایک معین مدت کے لیے اسلام کے ساتھ صلح کر لی جائے اور نرمی کا رویہ اپنایا جائے، یہاں تک کہ ہم غالب آ جائیں اور عرب قوم کو اشتراکیت کے اندر جذب کر لیں۔

۲۔ دینی علماء اور دیندار حکام کی شہرت کو مجروح کیا جائے اور انہیں استعماریت اور صہیونیت کی ایجنٹی کے اتہام سے متہم کیا جائے۔

۳۔ اشتراکی تعلیم و تدریس کو اسکولوں، کالجوں اور مدرسوں میں ہر سطح پر عام کیا جائے، اسلام کی مزاحمت کی جائے اس کا محاصرہ کیا جائے، یہاں تک کہ اشتراکیت کو ڈرانے اور دھمکانے والی قوت کا خاتمہ ہو جائے۔

۴۔ اندرونِ ملک کسی دینی تحریک کو خواہ کتنی ہی کمزور ہو ابھرنے اور پنپنے کا موقع نہ دیا جائے بلکہ اس کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کی جائیں اور بیدار مغزی کے ساتھ دینی جذبات و خیالات کو مٹانے کے لیے کام کیا جائے اور ہر داعیِ دین کو بغیر کسی نرمی اور مروت کے سختی کے ساتھ پیٹا جائے خواہ اس وجہ سے اس کی موت ہی کیوں نہ ہو جائے۔

۵۔ ہم لوگوں کی نظر سے یہ بات اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ دین سماج کی تعمیر میں خطرناک رول ادا کر چکا ہے اس لیے ہر جگہ ہر طرف اس کا محاصرہ اور اس پر اتہام لگانا ضروری ہے اور اسلام دشمن اسلوب کے ذریعہ لوگوں کو اس سے نفرت دلانا ضروری ہے۔

۶۔ ملحد ادیبوں اور انشا پردازوں کی ہمت افزائی کی جائے، دین، دینی شعور، دینی قلب و ذہن اور دینی طبقہ پران کو حملہ آور ہونے کی مکمل آزادی دی جائے اور قلب و ذہن میں یہ بات پیوست کرنے کی کھلی چھوٹ دی جائے کہ اسلام اپنا دور پورا کر چکا ہے، یہی واقعی بات ہے، آج صرف اس کی ظاہری عبادتیں، نماز، روزہ، حج اور بیاہ و طلاق باقی رہ گئی ہیں اور یہ عبادتیں بھی جلد ہی اشتراکی نظام کی تابع بن جائیں گی۔

۷۔ قوموں کے مابین دینی رابطہ بالکل ختم کر دیا جائے اور اسلامی تعلقات کی جگہ پر اشتراکی تعلقات استوار کیے جائیں اس لیے کہ اسلام ہماری عالمی اشتراکیت کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔

۸۔ دین اور دینی تعلقات مسجدوں اور کنیسوں کو ختم کرنے سے ختم نہیں ہوں گے۔ اس لیے کہ دین کی جگہ دل ہے، عبادت گاہیں دین کی ایک ظاہری اور خارجی شکل ہیں اور مقصد دینی خمیر اور ضمیر کا خاتمہ ہے۔ اگر ہم نے اشتراکی حکومت و قیادت اور تسلط حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر لی اور ان قصوں، ڈراموں، تقریروں، رسالوں، اخباروں، اور کتابوں کو عام کرنے میں کامیاب ہو گئے جو الحاد کی ترویج کرتے ہیں، الحاد کی دعوت دیتے ہیں، دین اور دیندار لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں، سائنس کی دعوت دیتے ہیں۔ اور اسی کو غالب معبود تسلیم کرتے ہیں تو پھر کسی مومن انسان کے قلب و ضمیر سے دین کا خاتمہ کوئی مشکل کام نہیں ہو گا۔

۹۔ دینی افکار سے جنگ کی جائے اور سائنسی افکار و نظریات کے ذریعہ دینی رجحان کو ختم کیا جائے

۱۰۔ عوام کو اس پرفریب چال کے ذریعہ بہانا جائے کہ محمد و مسیح کیونسٹ تھے، کمیونسٹوں کے امام تھے۔ خود فقیر و محتاج تھے اور فقیر و محتاج گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ اور ان کے ماننے والے بھی غریب تھے۔ دولت جمع کرنے والے امیروں جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے ان لوگوں نے جنگ کی، ان پر حملہ آور ہوئے۔ اور یہی تصویر ہم لوگ دیگر تمام انبیاء و رسل کی لوگوں کے سامنے پیش کر سکتے ہیں اور ان سے ممکن حد تک روحانی تقدس وحی اور معجزات کو دور کر سکتے ہیں جس کی وجہ سے یہ لوگ ایک عام آدمی بن جائیں گے اور ہمارے لیے اس دائرہ کو ختم کرنا آسان ہو جائے گا جو ان لوگوں نے اپنی ذات کے لیے بنا رکھا ہے یا ان کے پاگل معتقدین نے اس کو ایجاد کر لیا ہے۔

۱۱۔ قرآن، توریت اور انجیل میں قصے موجود ہیں۔ عوام کی اشتراکیت میں دلچسپی بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تاریخی اور مادی تفسیر و تعبیر کی جائے۔ جیسا کہ یوسف کا واقعہ ہے اس کی مادی اور تاریخی توضیح ممکن ہے جو جزئیات اس واقعہ میں موجود ہیں ان سے عوامی شعور کو سرمایہ داری، جاگیرداری، شریف عورتوں اور ...

حاکموں کے خلاف ڈھالنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔

۱۱۔ تمام دینی قوتوں کو اشتراکی نظام کے تابع بنایا جائے اور بتدریج ان قوتوں کو وجود بخشنے والی قوت سے خالی کر دیا جائے۔

۱۳۔ عوام کو اشتراکی علامات و شعائر کا پابند بنایا جائے، ان کو سوچنے کی مہلت نہ دی جائے، شجاعت و قومیت کے ترانے، قومی گیت، فوجی امور یا گروہی تنظیموں، مذہبی لکچروں، پیداوار اور معیشت کی سطح بلند کرنے میں ان کو بھلائے رکھا جائے، معاشی پستی بھوک مری، محتاجی اور بیماری کی ذمہ داری، رجعیت، استعماریت، صیہونیت جاگیرداری اور دینداری کے کندھے پر ڈال دی جائے۔

۱۴۔ دین کے عیوب اور نقائص کو ظاہر کر کے دین اور روحانیت کی قدر و قیمت گھٹائی جائے۔

۱۵۔ شب و روز صبح و شام برابر انقلاب کا نعرہ لگایا جائے اور یہ بتایا جائے کہ انقلاب ہی قوموں کا پہلا اور آخری نجات دہندہ ہے اور اشتراکیت کی شان میں یہ قصیدہ خوانی کی جائے کہ اشتراکیت ہی میں غریب اور مفلس قوم کی جنت موعود ہے۔

۱۶۔ لادینی افکار و نظریات کی اشاعت کی جائے بلکہ ہر وہ فکر عام کی جائے جس سے دینی شعور اور دینی عقیدے میں کمزوری پیدا ہوتی ہے اور ملکوں میں دینداروں پر اعتماد کمزور اور متزلزل ہوتا ہے۔

۱۷۔ دین کو منہدم کرنے کے لیے دین کو استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ نہ اس میں کوئی حرج ہے کہ لوگوں کو گمراہ کرنے کے لیے اور دھوکہ دینے کے لیے کمیونسٹ لیڈران کچھ دینی جماعتی فرائض و واجبات کو ادا کر لیا کریں، بشرطیکہ اس میں وقت زیادہ نہ لگایا جائے اس لیے کہ انقلابی قوتوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ خلاف باطن کوئی ایسی حرکت ظاہر نہ کریں مگر اسی مقدار میں جتنی کہ ضروری ہے اور دین کی پٹائی کے لیے وقت اور راہ کو مختصر کرنا ضروری ہے۔ انقلاب سب سے پہلے پرانی قدروں، تمام دینی ورثوں اور ترکوں کو ختم کرنے کے لیے ہونا چاہیے۔

۱۸۔ یہ اعلان کیا جائے کہ علمبرداران کمیونزم صحیح دین پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ کہ اس غلط دین پر عقیدہ نہیں رکھتے ہیں جسے لوگ جہالت کی وجہ سے مانتے ہیں اور صحیح دین اشتراکیت ہے۔ غلط اور ناقص دین افیون سے جو قوموں کو ایک خاص طبقہ کی خدمت کے لیے بدمست بنا دیتا ہے، فقیروں، درویشوں اور دینی علماء کے تمام عیوب اور نقائص کو بذات خود دین سے جوڑ دیا جائے۔ الحاد کی نشر و اشاعت کی جائے اور یہ ثابت کیا جائے

کہ دین خرافات ہے اور خرافات ناقص دین کے اندر ہوتی ہیں، صحیح دین کے اندر نہیں ہوتی ہے، جس کا نام اشتراکیت ہے۔

۱۹۔ اشتراکیت اپنے اغراض و مقاصد کے حصول و تکمیل کے لیے جس اسلام کی تائید کرتی ہے اس کو صحیح دین سے موسوم کیا جائے۔ اسی طرح اس کو انقلابی دین، ترقی پسند دین اور مستقبل کے دین کے نام سے موسوم کیا جائے۔ تاکہ جس دین کو محمد لے کر آئے ہیں اس کو اس کی تمام خصوصیات و نشانات سے کامل طور پر خالی اور عاری کر دیا جائے اور صرف نام باقی رہ جائے اس لیے کہ بہت ہی کم عرب ایسے ہیں جو اپنی طبیعت سے مسلمان ہیں۔ لہٰذا ان کو برائے نام مسلمان ہونا چاہیے اور برائے کام کیمونسٹ ہونا چاہیے یہاں تک کہ لفظی اسلام بھی پگھل کر ختم ہو جائے۔ جیسا کہ معنوی اسلام پگھل کر ختم ہو چکا ہے۔

۲۰۔ لینن کی تعلیم اور اس کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے کیمونسٹ پارٹی کو دین کا سخت مخالف ہونا چاہیے اور موت کے بعد ملنے والی جنت الفردوس کے خیال و نظریہ کے خلاف اس جنت الفردوس کے ذریعہ جنگ کرنی چاہیے۔ جسے علمی اشتراکیت اور اجتماعی عدالت بنانا چاہتی ہے اور جو حقیقی فردوس ہے اور جب دین کے ساتھ صلح اور اس کی تائید ضروری ہو تو لازم ہے کہ یہ معاملہ ایک وقت تک کے لیے ہو اور تائید احتیاط کے ساتھ اس بنیاد پر ہو کہ دین کو مٹانے کے لیے دین کی تائید اور اس سے مصالحت پیدا کی جا رہی ہے۔

۲۱۔ اسلام کے ساتھ اہتمام کا پہلا مقصد یہ ہے کہ اسلام کو توڑنے کا کام اسلام سے لیا جائے اور دوسرا مقصد یہ ہے کہ اسلامی دنیا میں مسلم قوموں کے درمیان داخل ہونے کے لیے اسلام کو استعمال کیا جائے۔ عربی اسلامی دنیا میں اگرچہ رجعت پسند قوتیں بیدار ہیں لیکن ہم نے جو پلان بنایا ہے وہ جلد ہی ان قوتوں کو کمزور بنا دے گا۔ یہاں تک کہ ان کے تحفظ کی بنیادی قوتوں کو ان کی خصوصیات سمیت خالی کر دے گا اور یہ مرور ایام کے ساتھ ہی پگھل کر خود بخود دم توڑ دے گی۔

۲۲۔ اسلامی تعلیمات کی صفائی ستھرائی کے پردہ میں اسلام کا اس طرح خاتمہ کیا جا سکتا ہے کہ اسے اشتراکیت سے بدل دیا جائے گا۔

خطرناک راز: پورے عالم عرب میں ہمارے رضاکار بڑی محنت و جانفشانی کے ساتھ کام کر رہے ہیں اور وزارت کی کرسیوں، سرکاری اداروں، سرکاری اور غیر سرکاری کمپنیوں اور ایجنسیوں کے اندر کلیدی

ہدے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، اور ہماری تعلیم و ہدایت کے مطابق اشتراکی غلبہ کے لیے جدوجہد کر رہے
ہا۔ اگرچہ یہ انفرادی کوشش ہے مگر ان عہدوں تک پہنچ جانا کامیاب کارنامے ہیں۔ اس لیے کہ افراد کی باہم آمیزش
ے ملاقاتیں اجتماعی صورت میں بدل جاتی ہیں اور مرور ایام کے ساتھ ہمارے اعوان و انصار کی تعداد میں اضافہ ہوگا۔
ہ بلند مناصب اور عہدے تک پہنچ کر انقلابی تحریک کے لیے فضا ساز گار بنانے میں موثر رول ادا کریں گے اور
ماری تعلیم و ہدایت کے مطابق ایسے ذمہ دار آفیسران اور وزراء بنائے جائیں گے جو بظاہر رجعت پسند دشمن اشتراکیت
در حکام کے مخلص ہوں گے۔ جن کی وجہ سے حکمرانوں کو ان کے اخلاص میں کوئی شک و شبہ نہ ہوگا اور یہ لوگ اس کے
ں پردہ امن و سکون، بیدار مغزی اور احتیاط کے ساتھ جو چاہیں گے کریں گے۔ اور ان پر کسی طرح کا شک و
بہ نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ یہ لوگ ان ذمہ داروں کے پیچھے چھپے ہوں گے۔

...

یہ ہے مختصر طور پر کمیونسٹوں کا پروگرام جو اپنی دینی عداوت، اور مسلم دشمنی کی وجہ سے اسلامی معاشرے
یں لادینیت اور گمراہی پھیلا کر اسلام اور مسلمانوں کا مکمل صفایا کرنا چاہتے ہیں، اشتراکیت کا ارادہ ہے کہ ہر
سلم دل سے اس عقیدے کو کہ "میرا رب اللہ ہے، میرے نبی اور رسول محمدؐ ہیں، اور میرا دین اسلام ہے"
تم کر کے اس کی جگہ ان کے دلوں میں کفر و ضلالت اور الحاد کو بسا دیا جائے۔

ص ۳۹ کا بقیہ:

بہترین اسوہ ہے، اس شخص کے لیے جو اللہ اور آخرت کے دن کی امید رکھتا ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے یہاں مقبولیت اور آخرت کی کامیابی جو تزکیہ نفس کا اصل مطلوب ہے رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم کی پیروی میں ہے، لہٰذا عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، سارے میدانوں میں کتاب و سنت سے ثابت شدہ
چیزوں کو اپنانا اور اسی پر عمل کرنا چاہیے۔ اس پر عمل پیرا ہونے کی صورت میں ہی جنت کی خوشخبری ہے ورنہ عذاب
کی دھمکی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَأَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوَىٰ
فَإِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوَىٰ (جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اور نفس کو خواہش سے روکا تو جنت اس کا
ٹھکانہ ہے)۔ اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا۔ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۔ یعنی خواہشات کی
اتباع مت کرو ورنہ وہ تمہیں اللہ کے راستے سے گمراہ کر دے گی۔ اور معلوم ہے کہ اللہ کی راہ سے بھٹک جانے کا انجام تباہی
اور عذاب ہے۔ اللہ ہمیں پاک نفسی کی راہ پر چلائے اور اپنے انعامات سے مالا مال کرے۔ آمین۔

ہندوستان عربوں کی نظر میں

ابو علی اثری

جناب مالک رام ایم اے کے نام اور ان کی علمی و ادبی خدمات سے سارا زمانہ واقف ہے۔ ان کے قلم سے متعدد بلندپایہ کتابیں نکل چکی ہیں، جن میں "ذکر غالب" اور "تذکرۂ تلامذۂ غالب" کو بڑی شہرت حاصل ہے اور وہ اردو کے تمام ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ ماہرینِ غالبیات میں ان کا بھی شمار ہے۔ انھوں نے دیوان غالب بھی ایڈٹ کر کے شائع کیا ہے۔ ان کا اسلامیات کا مطالعہ بھی بہت وسیع ہے۔ ان کی کتاب "عورت اور اسلام" اسی مطالعے کا نتیجہ ہے۔ جس میں قرآن کی آیات اور احادیث کی روشنی میں عورت کے مرتبہ، اس کے حقوق، اس کے فرائض اور اس کی ذمہ داریوں کو بڑے دلنشیں انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کتاب پر بڑے بڑے علماء نے انھیں داد دی ہے۔ انھیں ابتدائے طالب علمی میں اردو کے جن اربابِ قلم اور مصنفین سے عقیدت پیدا ہوئی ان میں ایک مولانا سید سلیمان ندوی بھی تھے۔ سید صاحب کی مشہور کتاب "عرب و ہند کے تعلقات" شائع ہوئی تو مالک رام گورنمنٹ کالج لاہور میں پڑھ رہے تھے ان کے زیرِ درس مضامین میں ایک اختیاری مضمون عربی بھی تھا، اور اس میں لکھنے پڑھنے کا بہت اچھا ذوق پیدا ہو گیا تھا۔ وہ کتاب وہاں پہنچی تو اس کو انھوں نے بڑے ذوق و شوق سے پڑھا، لیکن اس سے سیری نہیں ہوئی اور ان کا جی چاہا کہ کاش یہ کتاب اتنی ہی اور بھی ہوتی۔ کتاب کے ایک حصہ سے وہ بہت ہی متاثر ہوئے اور وہی سید صاحب سے ملاقات کی تقریب بن گیا۔ سید صاحب نے اس میں ایک جگہ لکھا تھا۔

" ہندوستان کی تاریخ کے سلسلہ میں اب تک صرف فارسی مآخذ سے فائدہ اٹھایا جاتا رہا ہے، عربی کے مآخذ سے یا تو بے اعتنائی برتی گئی یا وہ عربی کتابوں میں اتنے منتشر تھے کہ ان سے فائدہ اٹھانے

کی مستقبل اور تاریخ کے اسکالروں کو ہمت نہ ہو سکی، اس لیے ضرورت ہے کہ عربی تاریخوں، جغرافیہ کی کتابوں اور سفرناموں کے ان تمام بکھرے ہوئے اقتباسات کو اکٹھا کر لیا جائے جو ہندوستان کی تاریخ کے کسی نہ کسی پہلو سے متعلق ہیں اور جن سے ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کے مذہبی، سیاسی، تمدنی اور معاشرتی حالات اور رسم و رواج پر روشنی پڑتی ہے تاکہ محققین ہندوستان کی تاریخ لکھتے وقت عربی کے ان مآخذ سے بھی فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ مآخذ فارسی مآخذ سے کہیں زیادہ اہم ہیں، ان سے استفادہ کیے بغیر اس ملک کی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی۔"

لائق طالب علم نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا کہ یہ کام ضرور ہو جانا چاہیے۔ جس طرح الیٹ نے اپنی تاریخ کی تمام جلدوں میں فارسی مآخذ کا انگریزی میں ترجمہ کر دیا ہے، اسی طرح عربی مآخذ کو اردو میں منتقل کر دیا جائے، انھوں نے اسی وقت سید صاحب کو خط لکھا کہ اس قسم کی کتابوں کی ایک فہرست بھیج دیں، سید صاحب نے بیس کتابوں کی فہرست بھیج دی، اور انھوں نے کام شروع کر دیا۔ ابھی وہ فتوح البلدان بلاذری ——— المتوفی ۲۷۹ھ/۸۹۲ء کے ہندوستان سے متعلق قصہ کا ترجمہ کر رہے تھے کہ ان کو کہیں سے تیسری صدی کے ایک عرب سیاح سلیمان سیرافی[1] تاجر المتوفی

---

[1] سلیمان سیرافی عراق کا ملک التجار تھا۔ پہلا عرب سیاح ہے، جس نے اپنا سفرنامہ تیسری صدی ہجری کے شروع میں لکھا تھا۔ فرانسیسی مستشرق رینالڈ نے اس کو فرنچ ترجمہ اور حواشی کے ساتھ بھی تقطیع پر ۱۸۴۵ء میں سلسلۃ التواریخ کے نام سے شائع کیا ہے۔ یہ گوہر نایاب دار المصنفین کے خزانۂ کتب میں بحمد اللہ موجود ہے۔ سید صاحب کو اس کتاب سے بیحد دلچسپی تھی اور برابر اس کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ عرب جغرافیہ نویسوں پر دار المصنفین کے قیام کے زمانہ میں وہ عربی میں ایک کتاب بھی لکھ رہے تھے۔ اگر مکمل ہو گئی ہوتی تو وہ بھی ان کی اور محققانہ کتابوں کی طرح قابلِ قدر علمی یادگار ہوتی۔ اس کا کچھ حصہ "الضیاء" لکھنؤ میں چھپا تھا جو انھی کی سرپرستی اور نگرانی میں مولانا مسعود عالم ندوی کی ادارت میں نکلتا تھا اور بعد کو ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ سید صاحب کو سیر و سوانح و تاریخ کے ساتھ جغرافیہ کا بھی بہت اچھا ذوق تھا، جس کا مظہر ان کی مایہ ناز کتاب ارض القرآن ہے۔ جس کے اسلوبِ تحریر کے مہدی افادی الاقتصادی جیسے صاحبِ طرز ادیب انشا پرداز بھی مداح تھے۔ اس کے لکھنے میں سید صاحب نے جدید عصری اکتشافات سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔ مجھے تو سب سے زیادہ اس کا نام پسند ہے کہ نام معلوم ہو جانے سے ہی اس کے اندر کے مباحث اور مضامین کا اندازہ ہو جاتا ہے، اس کا نام سید صاحب جغرافیۂ عرب بھی رکھ سکتے تھے ←

کا سفر نامہ ہاتھ آگیا۔ انھوں نے اس کو چھوڑ کر اس کا ترجمہ کر ڈالا۔ لیکن افسوس کہ وہ بوجوہ یہ کام جاری نہ رکھ سکے۔ تعلیم سے فارغ ہوئے تو غم روزگار میں مبتلا ہوگئے۔ پھر اس کا خیال ہی جاتا رہا۔ ان تمام باتوں کا اظہار انھوں نے سید صاحب سے متعلق اپنے مضمون "نقوش و تاثرات" میں کیا ہے جو معارف کے سلیمان نمبر میں شائع ہوا ہے۔

سید صاحب کو خود بھی عرب و ہند کے تعلقات کے دوران میں ان عربی مآخذ کے جمع کرنے کا خیال پیدا ہوگیا تھا۔ اور اس کا اظہار وہ برابر اپنے رفقا سے زبانی اور خطوط کے ذریعہ بھی کرتے رہے، لیکن ان کو اپنی گوناگوں علمی، تعلیمی اور ملی و قومی سرگرمیوں کی وجہ سے اس کام کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ اور پھر آخر عمر میں ان کی صحت بھی خراب ہوگئی اور پھر پاکستان جانے کے دو تین برس کے بعد ان کا انتقال بھی ہوگیا اور اس طرح کے بہت سے کاموں کی حسرت وہ اپنے ساتھ لے گئے۔

دارالمصنفین کے رفقاء کو سید صاحب کے انتقال کے بعد سب سے پہلے اسی کام کی تکمیل کا خیال پیدا ہوا اور اس کو دارالمصنفین کے ایک سرگرم رفیق مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے سپرد کیا گیا، انھوں نے نہایت محنت اور عرق ریزی سے

← لیکن اس کے بجائے اپنے اعلیٰ ذوق کی بنا پر ارض القرآن رکھا۔ اس کو انھوں نے اپنے استاذ مولانا شبلی کی فرمائش پر بطور خاص سیرت کے مقدمہ کے لکھا تھا لیکن وہ مقدمہ بڑھتے بڑھتے کتاب بن گیا اور وہ اتنا پھیلا کہ اس کے دو حصے کرنے پڑے، مگر یہ دونوں ہی حصے ان کی تلاش و تحقیق کے مظہر اور ان کے قلم کے شاہکار ہیں۔ یہ کتاب تو اصلاً جغرافیہ کی کتاب لیکن ہمارے عربی زبان و ادب کے استاد مولانا عبدالرحمٰن نگرامی ندوی فرطِ عقیدت سے اس کو ادبی کتاب سمجھتے تھے اور اس کے ایک ایک فقرے اور جملے کو پڑھ کر جھومتے تھے۔ سید صاحب اپنی کتابوں بلکہ مضامین میں بھی لفظی آرائش و زیبائش کے بجائے تحقیق و استناد اور معنویت پر زیادہ زور دیتے تھے اور مولانا شبلی دونوں کا خیال رکھتے تھے اس لیے ان کی ہر کتاب زیادہ سے زیادہ تحقیقی بھی ہے اور ادبی بھی۔ وہ خشک سے خشک مضمون کو اپنی انشاپردازی سے پُرلطف، بہترین و پرکشش بنا دیتے تھے۔ وہ تحقیق کا پورا حق بھی ادا کرتے تھے اور زبان و اسلوب کی لطافت اور شستگی کو بھی قائم رکھتے تھے۔ مگر سید صاحب کے پیش نظر صرف تحقیق ہوتی تھی، خواہ زبان اور اسلوب دلکش ہو یا نہ ہو۔ اس کی پروا نہیں کرتے تھے۔ اس لیے ان کی ہر کتاب میں خواہ وہ کسی موضوع پر ہو تحقیق زیادہ اور ادبیت اور انشاپردازی برائے نام ہے۔ اس طرح سے ان کا اسلوب مولانا شبلی سے بہت مختلف ہو گیا ہے۔ ان دونوں بزرگوں کی کتابوں کے مطالعہ کے وقت اس فرق کو ملحوظ رکھنا چاہیے، اور غالباً ارباب نظر اس کو ملحوظ رکھتے بھی ہیں۔

تیسری صدی ہجری سے نویں صدی ہجری تک جتنے عرب مورخ، جغرافیہ داں اور سیاح گزرے ہیں۔ ان سب کی کتابوں اور سفر ناموں سے ہندوستان کی تاریخ سے متعلق سارا مواد سنہ وار اکٹھا کیا اور پھر اس کا نہایت سلیس اور عام فہم اردو میں ترجمہ کیا، لیکن یہ تمام اقتباسات اور ان کے ترجمے ایک جلد میں نہیں آسکتے تھے اس لیے ان کو دو جلدوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ پہلی جلد میں تیسری صدی ہجری سے پانچویں صدی ہجری تک کے عرب مورخین، عرب جغرافیہ داں اور عرب سیاحوں مثلاً جاحظ، ابن خرداذبہ، سلیمان تاجر، ابوزید حسن سیرافی، بلاذری، یعقوبی، ابن فقیہ ہمدانی، ابن رستہ، بزرگ بن شہریار، مسعودی، مطہر مقدسی، اصطخری، بشاری مقدسی کی کتابوں کے اقتباسات اور ان کا ترجمہ ہے۔ اور دوسری جلد میں ابن ندیم، عبدالقادر بغدادی، قاضی صاعد اندلسی، عبدالکریم شہرستانی، قاضی رشید بن زبیر[1] شریف الادریسی کی کتابوں کے اقتباسات ہیں۔

شروع میں ہر مصنف کا مختصر حال بھی مع سنہ پیدائش اور سنہ وفات کے لکھ دیا گیا ہے۔ ان دونوں جلدوں میں ایک طرف عربی کا اقتباس ہے اور دوسری طرف اس کا ترجمہ ہے۔ عربی عبارت میں جہاں کوئی لفظ یا کوئی نامانوس اصطلاح یا غیر متعارف قوم یا ایسے شخص کا نام آگیا ہے جس سے امتداد زمانہ کی وجہ سے لوگ ناواقف ہو گئے ہیں، فٹ نوٹ میں اس کی تشریح کر دی گئی ہے۔ بعض بعض جگہ مزید تفہیم و تسہیل کے لیے حواشی بھی لکھ دیے گئے ہیں۔ اس طرح اس کتاب کی اہمیت، افادیت اور قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔ اس نے محققین اور ہندوستان کی تاریخ پر کام کرنے والوں کو اصل مآخذ کی طرف مراجعت کرنے سے بے نیاز کر دیا ہے۔

---

[1] قاضی رشید بن زبیر پانچویں صدی کے ممتاز عالم اور کئی اہم کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی تصانیف میں ایک کتاب، کتاب الذخائر والتحف بھی ہے جسے حال ہی میں ڈاکٹر حمید اللہ نے شائع کیا ہے۔ قاضی رشید آل بویہ کے معروف حکمران ابو کالیجار کے دربار سے وابستہ رہے۔ پھر فاطمیین مصر کے پاس چلے گئے یہ کتاب انہی کے زیر سایہ مصر میں لکھی اس میں عرب حکمرانوں کے ہندوستان و چین کے حکمرانوں کے تعلقات اور ان کے باہمی ہدایا و تحائف کے تبادلہ کی بڑی ہی دلچسپ تفصیلات ہیں۔

یاد آتا ہے کہ عرب و ہند کے تعلقات کی تاریخ کے مشہور اسپشلسٹ قاضی اطہر مبارکپوری نے شاید معارف میں ایک مضمون لکھ کر اس کتاب کا اور اس کے فاضل مصنف قاضی رشید کا تعارف کرایا ہے، ان کا یہ مضمون اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں ہے۔

اس میں قاضی رشید اور شریف الادریسی کے حالات اور ان کی کتابوں کے ہندوستان کی تاریخ سے متعلق اقتباسات اور ان کا ترجمہ مولانا حبیب اللہ صاحب ندوی سابق رفیق دارالمصنفین کے قلم سے ہے۔ جس کا ذکر مولانا شاہ معین الدین ندوی نے دیباچہ میں خاص طور سے کیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ مفید کتاب دارالمصنفین کے دو لائق رفقاء کی مشترک کوششوں کا نتیجہ ہے اور نظر ثانی خود مولانا شاہ معین الدین ندوی نے کی ہے۔ پھر بھی عربی ترجمہ میں کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ جن کی طرف لکھنؤ یونیورسٹی کے جناب وحید مرزا نے اپنے انگریزی تبصرہ میں جو اسلامک کلچر حیدرآباد میں شائع ہوا تھا توجہ دلائی تھی۔ جن کی ان شاء اللہ اس کے دوسرے ایڈیشن میں اصلاح کر دی جائے گی۔

ایلیٹ کی مشہور تاریخ کے طرز کی اردو میں یہ پہلی کتاب ہے لیکن ایلیٹ اور اس میں فرق یہ ہے کہ ایلیٹ میں اصل ماخذ اور کتابوں کے اقتباسات نہیں ہیں۔ ان کے انگریزی ترجمے ہیں جو محل نظر بھی ہو سکتے ہیں۔ دارالمصنفین کی اس کتاب میں اردو ترجمے کے ساتھ ان کتابوں کے اصل اقتباسات بھی دیدیے گئے ہیں۔ اس لیے اس کو ایلیٹ کے مقابلہ میں علانیہ فوقیت حاصل ہو گئی ہے۔ کتاب کا نام "ہندوستان عربوں کی نظر میں" ہے۔

عموماً غیر مسلم مورخین ہندوستان سے مسلمانوں کے تعلق کا آغاز محمود غزنوی سے بہت زیادہ آگے بڑھے تو محمد بن قاسم کے حملۂ سندھ سے کرتے ہیں، جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کا تعلق تمام تر فاتحانہ اور حملہ آورانہ رہا ہے۔ اس سے پہلے نہ ان کے اس ملک سے تعلقات تھے نہ ان کا کوئی گروہ ہندوستان آیا نہ انھوں نے اس ملک کو بنانے اور سنوارنے میں کوئی حصہ لیا۔ اس کی اس قدر تکرار کی گئی اور اس کو اتنا دہرایا گیا کہ وہ تاریخ کا ایک مسلّم واقعہ بن گیا۔ اب تاریخ کے کسی طالب علم سے سوال کیجیے تو وہ بے ساختہ یہی جواب دے گا کہ مسلمان محمود غزنوی کی سرکردگی میں ہندوستان کو لوٹنے اور سومنات کو توڑنے، برباد کرنے اور اس کی ساری دولت کو جو نامعلوم مدت سے بطور نذر عقیدت کے جمع ہوتی چلی آرہی تھی اور جو کروڑوں اور اربوں تک پہنچ گئی تھی۔ سمیٹنے کے لیے آئے تھے۔ یا پھر وہ فوجی حیثیت سے سندھ میں داخل ہوئے تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے اپنی منظم حکومت قائم کر لی، حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے

لہ حملہ آورانہ حیثیت سے سندھ میں بھی داخلہ کا ایک خاص سبب تھا، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا اور آگے بھی آرہا ہے کہ عربوں کے جو قافلے بحری راستوں سے جنوبی ہندوستان کے ساحل پر آئے اور آباد ہو گئے۔ اسی طرح لنکا میں بھی کچھ عرب تاجر آباد ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک تاجر کا انتقال ہو گیا، تو لنکا کے راجہ نے متوفی تاجر کے اہل وعیال کو جن میں عورتیں بھی تھیں، جہاز کے ذریعہ ان کے وطن عرب بھجوا دیا اور تعلیم کے لیے قیمتی ہدایا و تحائف بھی ساتھ کر دیے

ہندوستان عربوں کی نظر میں سے آپ کو معلوم ہو گا کہ محمود غزنوی کا ہندوستان پر بار بار حملہ آور ہونا، فتح سندھ سے بھی بہت پہلے مسلمان عربوں کے بہت سے قافلے مختلف راستوں سے ہندوستان میں داخل ہوئے اور انھوں نے رفتہ رفتہ یہاں کی بسنے والی قوموں سے ہر قسم کے علمی وتجارتی ومعاشرتی وتمدنی تعلقات پیدا کر لیے۔ اور ان کی بڑی بڑی آبادیاں جنوبی ہندوستان یعنی مدراس وکیرالا میں قائم ہو گئیں۔ بعض بعض جگہ دس دس ہزار کی تعداد میں آباد ہو گئے جہاں انھوں نے مسجدیں تعمیر کیں۔ اپنا دینی وملی نظام قائم کیا۔ اور اس وقت کے راجاؤں اور ہندو حکمرانوں سے بڑے وسیع تعلقات پیدا کر لیے۔ اس کے نتیجہ میں ان راجاؤں اور ہندو حکمرانوں نے بھی ان کے ساتھ بڑی رعایتیں کیں ان کے مذہبی شعائر اور ان کے رسوم وآئین کا بڑا احترام ملحوظ رکھا اور ہر طرح کی آزادی ان کو دی، اور رفتہ رفتہ وہ یہاں کی آبادی کا ایک اہم جزو بن گئے۔ اور یہاں کی ہر چیز سے ان کا غیر معمولی تعلق پیدا ہو گیا۔ یہ ساری معلومات عرب مورخوں، عرب سیاحوں اور عرب جغرافیہ نویسوں کی کتابوں میں جستہ جستہ ملتے ہیں اور ان سے اس دور کی بہت

← یہ ولید بن عبد الملک اموی کی خلافت کا زمانہ تھا۔ اس جہاز میں کچھ حاجی بھی تھے جو حج اور زیارت حرمین شریفین کے لیے اس میں سوار ہو گئے تھے۔ یہ جہاز لنکا سے سندھ پہنچا تو بحری قزاقوں نے اس پر حملہ کر کے سارا سامان لوٹ لیا۔ اور عرب عورتوں کو گرفتار کر لیا۔ ایک عورت نے غائبانہ یا حجاج المدد پکار کر فریاد کی۔ حجاج کو یہ خبر پہنچی تو وہ بہت متاثر ہوا اور ایک قاصد کے ذریعہ کہلوا دیا کہ میں آیا۔ پہلے سندھ کے راجہ داہر کو لکھا کہ عرب عورتوں کو واپس کرا دو اس نے یہ کہہ کر مجبوری کا اظہار کیا کہ یہ سندھ کے بحری قزاقوں کا کام ہے۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ حجاج نے اس کے بعد اپنے بہادر بھتیجے محمد بن قاسم کو جو فارس کا حاکم تھا۔ چھ ہزار سپاہیوں کے ساتھ سندھ روانہ کیا کہ وہاں پہنچ کر عورتوں کی مدد کرے اور ان کو ان بحری قزاقوں سے رہا کرائے۔ رفتہ رفتہ اس نے پورا سندھ فتح کر لیا اور اپنی باقاعدہ حکومت قائم کر لی۔ اس حکومت سے ہندو رعایا اتنی خوش تھی کہ محمد بن قاسم جیسے عادل اور انصاف پرور حکمراں کا بت بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی۔ یہ واقعہ پیش نہ آیا ہوتا تو سندھ پر ابھی حملہ نہ ہوا ہوتا۔

(ابو علی)

بحری قزاقوں کی بات بعد کا افسانہ ہے، جہازوں کو سندھ کی فوج نے لوٹا تھا۔ گرفتار شدگان سرکاری قید میں تھے۔ راجہ داہر نے جواب میں معذرت نہیں کی تھی بلکہ چیلنج آمیز جملہ کہا تھا۔

(محدث)

مستند تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ مسلمان تو درحقیقت اس کے بعد فاتحانہ اور کشورکشایانہ حیثیت سے ہندوستان میں آئے اور انھوں نے یہاں اپنی حکومت قائم کی جو ۱۹۴۷ء تک کسی نہ کسی شکل میں باقی رہی اور ہندوستان کو ایسا بنایا سنوارا کہ وہ جنت نشان اور رشک ارم بن گیا۔ جن کی یادگاروں سے ملک کا ایک ایک چپہ معمور ہے۔ جن کی شوکت وہیبت کا اندازہ جامع مسجد دہلی، لال قلعہ، قطب مینار، ہمایوں کا مقبرہ، قلعہ آگرہ، تاج محل، فتح پور سیکری اور سکندرہ کے محلات، لاہور کی جہانگیری مسجد، شالامار باغ اور کشمیر کے باغات، اور دوسرے شہروں کے تاریخی آثار و مشاہد سے ہوتا ہے۔

• • •

شہر آشوب

ابوہشام اعظمی

مئوناتھ بھنجن

اے خدائے جہاں صاحبِ کن فکاں
تیرے الطاف ہیں بے حد و بے گماں
ہے کڑا امتحاں
الاماں الاماں

دربدر کو بکو ہے لہو ہی لہو
ماتمِ کربلا، چار سو، چار سو
دھار خوں کی رواں
نالیاں نالیاں

ظلم کی آندھیاں گولیاں لاٹھیاں
ہر طرف ہر جگہ شورِ آہ و فغاں
قہر کی بجلیاں
آشیاں آشیاں

لُٹ گئیں مسجدیں مٹ گئیں حرمتیں
پاک قرآں کی آیتیں سورتیں
جس پہ ہر مسلماں
نوحہ خواں نوحہ خواں

سائز ننگ ساڑیاں ہار اور بالیاں
نذرِ رہزن ہوئیں موٹریں، گاڑیاں
برگ و بر سے عیاں
قہر کی داستاں

دست و بازو دیا توڑ کر رکھ دیے
بھوک سے پیاس سے کتنے مر کھپ گئے
لاغر و ناتواں
سب میں مشقِ سناں

پابجولاں چلے قافلے قافلے
ظلم سہتے ہوئے مرحلے مرحلے
سوئے زنداں رواں
پیر و خرد و کلاں

ہوگی کب پُرفشاں رحمتِ بے کراں
ہے جہنم کدہ شہرِ جنت نشاں
الاماں الاماں
اے خدائے جہاں

قسط نمبر ۴

اس سلسلے کی پچھلی تین قسطیں محدث فروری، اپریل اور مئی ۱۹۸۴ء کے شماروں میں علی الترتیب شائع ہو چکی ہیں۔

مولانا امرتسری اور ان کی تصنیفی خدمات

(در ردِ بدعات و تقلید)

مولانا محمد مستقیم سلفی۔ استاذ جامعہ سلفیہ)

(۱) **تحریکِ وہابیت پر ایک نظر** (اردو) صفحات ۴۲ طبع اول ۱۹۲۵ء مطبع برقی آفتاب پریس امرتسر
اس رسالہ میں سلسلہ وہابیت اور اس کے داعی شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی رحمۃ اللہ علیہ کے مختصر حالات اور علماء عاقبہ جات کی بابت فتاوی درج ہیں۔ یہ کتاب تحریک وہابیت پر اعتراض کرنے والوں کے لیے دندان شکن جواب کی حیثیت رکھتی ہے۔

(۲) **پیر جماعت علی شاہ کی قیادت** (اردو) صفحات ۸۰ طبع اول ۱۹۳۶ء مطبع اہلحدیث امرتسر۔
انگریزوں کے دور میں جب مسجد شہید گنج لاہور کا قضیہ ابھرا تو حالات کی نزاکت دیکھ کر پیر جماعت علی شاہ صاحب کو مسلم کاز کا امیر بنا دیا گیا تھا۔ اس کتاب میں پیر صاحب کے امیر بننے کے بعد جتنی کارروائیاں شروع سے آخر تک ہوئی ہیں سب کو قلم بند کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ پیر صاحب نہ عالم ہیں نہ صوفی، نہ فقیہ نہ محدث نہ واقف شریعت، نہ ماہر سیاست۔ مسلمانوں نے جلدی اور بے خبری میں ان کو اپنا امیر بنا کر مسجد شہید گنج، سول نافرمانی کا اعلان کر دیا جس کی وجہ سے مسلمانوں کو طرح طرح کی پریشانیاں اٹھانی پڑیں۔

(۳) **فتوحاتِ اہلحدیث** (اردو) صفحات ۲۰ طبع اول ۱۹۰۵ء مطبع اہلحدیث امرتسر
ہندوستان میں مدتوں یہ فضا قائم رہی (اور کہیں کہیں اب بھی ہے) کہ اہلحدیثوں کو مسجد سے نکال دیا جاتا تھا

اور انھیں طرح طرح سے ستایا جاتا تھا۔ اس معاملے میں بہت سے مقدمات بھی قائم ہوئے۔ یہ رسالہ ان مقدمات پر مشتمل ہے جنکی ڈگری چیف کورٹ، ہائی کورٹ اور پریوی کونسل ولایت سے اہلحدیث کے حق میں ہوئی تھی، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے سچ فرمایا ہے۔ لا تزال طائفة من امتی منصورین علی الحق لا یضرھم من خذلھم (الحدیث) میری امت کا ایک گروہ برابر حق پر رہتے ہوئے مدد یافتہ ہوگا، ان کے مخالف انھیں ضرر نہ پہنچا سکیں گے۔

(۴) **علم غیب کا فیصلہ** (اردو) صفحات ۲۴ طبع اول ۱۹۰۳ء/۱۳۲۱ھ مطبع اہلحدیث امرتسر

یہ رسالہ اس مناظرہ کی روداد پر مشتمل ہے جو مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری اور مولوی عبدالصمد کے مابین ذیل کے دو عناوین پر ہوا تھا۔

(۱) سوائے خدا کے کسی مخلوق کو علم غیب نہیں نہ ذاتی نہ وہبی نہ کسبی (۲) تقلید شخصی شرک فی الرسالت ہے۔

اس میں دو حکم یعنی مولانا ابوعبیدہ احمد اللہ صاحب امرتسری اور مولانا ابومحمد عبدالحق صاحب دہلوی کے فیصلے بھی درج ہیں۔ دونوں حکم نے متفقہ طور پر مولانا امرتسری کو غالب اور ان کے استدلال کو صحیح تسلیم کیا ہے۔

(۵) **تکذیب المکفرین** (اردو) صفحات ۲۰ طبع اول ۱۹۲۲ء مطبع برقی پریس روزبازار امرتسر

یہ رسالہ قاضی فضل احمد لدھیانوی اور ملا ملتانی وزیرآبادی کے رسالہ "عقائد کفریہ وہابیہ" کا (جس میں ۵۰ مسئلوں کو درج کرکے اہلحدیثوں پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا ہے) معقول اور مدلل جواب ہے۔

(۶) **مسئلہ حجاز پر نظر** (اردو) صفحات ۲۰، طبع اول ۱۹۲۵ء مطبع برقی پریس ہال بازار امرتسر۔

انجمن "حزب الاحناف" کی جانب سے ایک رسالہ بنام "اثبات بنا رقبہ جات" شائع ہوا جس کے مصنف مولوی نعیم الدین اور مولوی دیدار علی صاحبان تھے اس میں ابن سعود سلطان نجد پر ایسی ایسی تہمتیں لگائی گئی تھیں کہ الامان والحفیظ۔ مولانا امرتسری نے اپنی اس کتاب میں مذہبی وسیاسی دونوں حیثیتوں سے مسئلہ حجاز پر بحث کرکے ثابت کیا کہ حجاز (مکہ و مدینہ اور اس کا علاقہ) کی خدمت کے لیے بہترین خادم سلطان عبدالعزیز بن سعود ہیں۔

(۷) **فقہ اور فقیہ** (اردو) صفحات ۲۰ طبع اول محرم ۱۳۴۴ھ/۱۹۲۵ء

اس میں فقہ کی جامع ومانع تعریف، فقیہ کی تعریف، محدث کی تعریف، مقلد اور فقیہ میں امتیاز اور اصول فقہ کی تعریف کرتے ہوئے اجماع وقیاس وشروط قیاس اور تقلید کی بحث اور اس کے نتائج وتعریفات کو اچھی طرح واضح

کیا گیا ہے۔ بقول علامہ عبدالرحمٰن محدث مبارکپوری "یہ (حب باتیں) اس قابل ہیں کہ آب زر سے لکھی جائیں اور ازبر رکھی جائیں" یہ کتاب دراصل رسالہ "فیض" کے ایک مضمون بعنوان "الفقہ اور الفقیہ" کے جواب میں لکھی گئی ہے

(۸) **شمع توحید**[1] (اردو) صفحات ۶۶ طبع اول ۱۹۳۸ء مطبع ثنائی برقی پریس ہال بازار امرتسر۔

اس کتاب میں بدلائل قرآن و احادیث صحیحہ یہ ثابت کیا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو سے تھے نہ عالم الغیب نہ حاجت روا اور نہ مشکل کشا بلکہ آپ انسان تھے۔ آپ کا امتیاز یہ تھا کہ آپ کے پاس وحی آتی تھی۔

(۹) **نورِ توحید** (اردو) صفحات ۵۶ طبع اول ۱۹۳۸ء مطبع ثنائی برقی پریس ہال بازار امرتسر

شمع توحید کے جواب میں طائفہ غالیہ کی طرف سے ایک چھوٹا سا ٹریکٹ موسومہ "پروانہ تنقید" نکلا تھا۔ یہ رسالہ اسی کا جواب ہے اس نورِ توحید میں منطقی طور سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ توحید باری تعالیٰ جس طرح قرآن شریف میں موجود ہے اور اس پر یقین رکھنا ہر کلمہ گو مسلمان کا فرض ہے۔ شانِ رسالت محمدیہ بھی بالکل اسی طرح قرآن مجید میں مذکور ہے اس پر بھی یقین رکھنا فرض ہے۔ اور ان دونوں عقیدوں میں کمی بیشی کرنا کفر ہے۔

(۱۰) **تقلید شخصی و سلفی** (اردو) صفحات ۵۶ طبع اول ۱۳۳۹ھ/۱۹۲۱ء مطبع لال اسٹیم لاہور۔

---

[1] اس کا پس منظر یہ ہے کہ بعض حنفیوں نے جو پیر جماعت علی شاہ سے ارادت رکھتے تھے ۲/۳ نومبر ۱۹۳۷ء کو ایک جلسہ کیا، جلسے کا نام "عرس امام اعظم" رکھا مگر حملہ سارا اہل توحید (یعنی اہلحدیثوں) پر تھا، مسائل اعتقادیہ میں یہ بیان کیا گیا کہ (۱) خدا اور رسول ایک ہیں (۲) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عالم الغیب ہیں (۳) حاجت روا ہیں (۴) مشکل کشا ہیں (۵) وہابی کو مارنے سے نجات ہوتی ہے، ایک جوتا مارنے سے ایک حور ملتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان غلط خیالات کی تردید کے لیے جماعت اہلحدیث نے ۴ نومبر ۱۹۳۷ء کو جلسے کا اعلان کیا۔ مولانا امرتسری جلسہ گاہ پہنچ کر سواری سے اترے ہی تھے کہ ایک نوجوان مسمی قمر بیگ ابن نعمت بیگ نے ایک تیز دھار دار ہتھیار سے یا رسول اللہ کا نعرہ لگاتے ہوئے مولانا پر قاتلانہ حملہ کیا، جس سے سر پر سخت زخم آیا اور ایک زخم ناک پر بائیں آنکھ کے متصل لگا، حملہ آور اپنے ہمراہیوں کی کوشش سے فرار ہوگیا۔ جمعیت اہلحدیث نے یہ تجویز پاس کی کہ اس واقعہ کی یادگار میں ایک رسالہ لکھا جائے جس میں عقائدِ فاسدہ کی تردید ہو چنانچہ شفا پانے کے بعد مولانا نے خود یہ رسالہ تصنیف کیا۔

(ماخوذ از دیباچہ کتاب شمع توحید)

یہ کتاب دراصل رسالہ "حقیقۃ الفقہ" مصنفہ مولوی انوار اللہ صاحب اور رسالہ "الاقتصاد" مصنفہ مولانا اشرف علی تھانوی کے جواب میں لکھی گئی ہے۔ اس میں علمائے دیوبند و سہارنپور کے وہ خطوط بھی شائع کیے گئے ہیں جو تقلید شخصی کے متعلق شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری کے پاس لکھے گئے تھے۔

اس کتاب میں مسئلہ تقلید کی تعریف کرتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ علمائے سلف میں کوئی عالم کسی عالم کا مقلد نہ تھا ہر ایک عالم اپنے علم کے مطابق عمل کرتا تھا۔ امام ابوحنیفہ کے شاگرد بھی خود امام ممدوح کے مقلد نہ تھے بلکہ فروع اور اصول دونوں میں اپنے فہم کے مطابق ان سے اختلاف رائے رکھتے تھے، لہٰذا کسی عالم یا جاہل پر کسی دوسرے عالم یا مجتہد یا محدث کی تقلید فرض یا واجب نہیں ہے بلکہ خدا اور رسول کے احکام کی پابندی فرض اور ضروری ہے۔

(۱۱) **اجتہاد و تقلید** (اردو) صفحات ۸۰ طبع ثالث ستمبر ۱۹۲۵ء/۱۳۴۴ھ مطبع لال اسٹیم لاہور۔

اس رسالہ کو سات فصلوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلی چار فصلوں میں علی الترتیب یہ امور بیان کیے گئے ہیں۔ (۱) مجتہد اور اجتہاد (۲) اجتہاد اور اس کا طریق (۳) قیاس (۴) مجتہد کی تعریف اور اس کے شرائط۔ اخیر کی تین فصلوں یعنی پانچویں سے ساتویں تک میں علی الترتیب یہ مضمون بیان کیے گئے ہیں (۵) تقلید (۶) تفسیر اور حدیث (۷) ادلہ اربعہ اور اصول خمسہ اور اس کے ساتھ ہی اکابر علماء کرام کی تصدیقات بھی پیش کی گئی ہیں۔

(۱۲) **آمین، رفع یدین** (اردو) صفحات ۱۶ طبع اول ۱۹۲۱ء/۱۳۴۰ھ مطبع روز بازار امرتسر۔

اس مختصر رسالہ میں آمین و رفع یدین دونوں مسئلوں کا ثبوت احادیث رسول کردگار و اقوال صحابہ کبار اور فتاویٰ علمائے احناف سے ایسا دیا گیا ہے کہ مخالفین کو بھی انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر لاجواب ہے۔

(۱۳) **علم الفقہ ج اول** (اردو) صفحات ۴۴ طبع اول ۱۹۱۳ء/۱۳۳۱ھ مطبع روز بازار اسٹیم امرتسر

اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ علم فقہ محض ایک شخص کی رائے کا نتیجہ ہے یا کسی ایک کی بے دلیل ہے یا مدلل، اس میں جو کچھ ترقی ہوئی ہے، ایک ہی زمانہ میں ہو کر رہ گئی ہے یا مختلف زمانوں میں ہوئی اور ہوگی؟ اس میں ان باتوں پر کافی و شافی روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۱۴) **تنقید تقلید** (اردو) صفحات ۶۰، طبع اول ۱۳۴۶ھ/۱۹۲۷ء مطبع آفتاب برقی پریس دہلی۔

یہ کتاب اس مناظرہ پر مشتمل ہے جو مولانا ثناء اللہ صاحب امرتسری اور مولوی سید مرتضیٰ حسن دیوبندی کے مابین مسئلہ "وجوب تقلید شخصی" پر ہوا تھا۔ یہ مضمون اخبار اہلحدیث مورخہ ۶ رمئی ۲۷ء میں چھپ چکا ہے۔

(۱۵) **شریعت اور طریقت** (اردو) صفحات ۱۶ طبع سوم ۱۹۲۵ء مطبع برقی پریس روز بازار ہال امرتسر
اس رسالہ میں شریعت اور تصوف کی تحقیق کی گئی ہے، قرآن و حدیث اور اقوال بزرگان سے محبت کا معنی اور اللہ و رسول اللہ و اولیاء اللہ سے محبت کرنے کے مراتب واضح کیے گئے ہیں۔

(۱۶) **تقلید شخصی** (اردو) صفحات ۴۴ طبع جنوری ۱۹۳۹ء مطبع ثنائی برقی پریس ہال بازار امرتسر
یہ رسالہ مولوی محمد شریف صاحب کوٹلی کے اس فتوے کے جواب میں ہے جسے کوٹلی صاحب نے مندرجہ ذیل سوال کے جواب میں دیا تھا۔

سوالات یہ ہیں: (۱) مذاہب اربعہ والائمہ اربعہ کا ثبوت قرآن و حدیث سے نہیں نہ اس کی ضرورت تھی نہ اب ہے (۲) مذاہب اربعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ تھے (۳) ایک[1] دین کی بجائے چار بنانے کی کیا حاجت (۴) ہمارا دین اسلام ہے اور ہم مسلمان پھر حنفی، شافعی، کہلانا کیوں؟
اس رسالہ کے اخیر میں مولوی محمد شریف صاحب کوٹلی کے رسالہ "مناکحت وہابیہ" کا جواب بھی درج ہے۔ جس میں کوٹلی صاحب نے وہابیوں (اہلحدیثوں) کے یہاں شادی بیاہ کرنے کو ناجائز قرار دیا ہے۔

آپ اس نوجوان کے والد ہیں جس نے مولانا امرتسری پر قاتلانہ حملہ ہونے کی خبر ان لفظوں میں دی تھی کہ "توہین آمیز کلمات (آنحضرت کو بشر رسول کہنے) کا بہترین جواب آپ کو کل ملے گا۔ (اخبار الفقیہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۳۴ء ص ۴ کالم ۱) اس لیے یہ رسالہ بھی یادگار حملہ کا تیسرا نمبر ہے۔ (مقدمہ تقلید شخصی)

[1] اس تیسرے سوال کا جواب مع جواب الجواب ناظرین کے لیے پیش کیا جا رہا ہے کوٹلی صاحب فرماتے ہیں کہ "یہ کہنا دین ایک ہے، اس کے چار دین کیوں کیسے سراسر غلط فہمی ہے کیونکہ دین چاروں کا ایک ہی ہے۔ یہ اعتراض دین اور مذہب کے نہ سمجھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ دین تو اسلام ہے اور مذہب طریق عمل کا نام ہے۔ اسلام ایک جنس ہے اس کے تحت میں کئی انواع ہیں حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، شیعہ، خارجی، مرجیہ وغیرہم۔ جیسے حیوان ایک جنس ہے جس کے تحت میں کئی انواع ہیں۔ انسان، بقر، غنم، ابل وغیرہ۔ پس انسان کو صرف حیوان کہنا۔ اگرچہ انسان بھی حیوان ہے دوسرے انواع سے ممتاز نہیں کرتا تاوقتیکہ اسے ناطق نہ کہا جائے۔ اسی طرح حنفی اگرچہ مسلمان ہے لیکن اس کو صرف مسلمان کہنا دوسرے انواع (شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہم) سے ممتاز نہیں کرتا تاوقتیکہ اسے حنفی نہ کہا جائے۔ پس حنفی، شافعی کہلانا اس لیے ہے کہ دوسرے انواع سے ممتاز ہو ←

جواب الجواب من جانب مولانا ثناء اللہ رح: یہ نمبر خاص اہل علم کے قابل توجہ ہے۔ آپ (کوٹلی صاحب) اسلام کو بمنزلہ جنس کے کہتے ہیں اور مذاہب اربعہ کو انواع۔

مولوی صاحب سنیے! جنس بحیثیت جنسیت ماہیت متقررہ نہیں ہوتی، جب تک کہ اس کے ساتھ فصل مقوم نہ ملے۔ کیا آپ کو معلوم نہیں کہ حیوان بحیثیت حیوان کہیں متحقق نہیں جب تک کہ اس کے ساتھ فصول مقومہ نہ ملیں پس اگر اسلام ایک جنس ہے تو وہ حنفیت اور شافعیت سے پہلے متحقق تھا یا نہیں؟ اگر تھا اور یقیناً تھا تو اسلام جنس نہ ہوا اگر نہیں تھا تو ائمہ اربعہ سے شروع ہوا، آنحضرت صلعم سے نہیں ہوا۔ جس کا لازمی نتیجہ آپکو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ خلافتِ راشدہ بلکہ ولادتِ ائمہ اربعہ بھی اسلام سے پہلے کی ہیں، کیونکہ ان اوقات میں حنفیت شافعیت وغیرہ نہ تھی۔

ایک اور طرح سے: عرض یہ ہے کہ جنس کی تعریف اہلِ منطق کے نزدیک یہ ہے۔ ہو المقول علی الکثیرۃ المختلفۃ الحقائق۔ اور نوع کی تعریف یہ ہے: ہو المقول علی الکثیرۃ المتفقۃ الحقائق۔ پھر جنس اور نوع دونوں ایک کیسے ہوئیں؟ جبکہ ان دونوں کی تعریفات متبائن ہیں۔ وجوہ مذکورہ کو ملحوظ رکھ کر بتایئے کہ آپنے سائل کے سوال کو پختہ کر دیا ہے یا جواب دیا ہے۔ (تقلید شخصی ص ۹)

بقیہ ص ۵۶ کا: لوگوں کے اشتیاق کا یہ عالم رہتا تھا کہ آگے جگہ لینے اور قریب سے خطبہ سننے کے لیے دو دو گھنٹے پہلے جا کر مناسب جگہ پر قبضہ کر لیا کرتے تھے۔ موصوف اپنی تقریر میں عام فہم استعارات اور تشبیہیں وغیرہ اس بے تکلفی اور کثرت سے استعمال کرتے تھے کہ آپ کا اسلوب کشمیر کے فطری اور قدرتی حسن کا عکاس بن جایا کرتا تھا۔ جس کی لطافت و جاذبیت اور دلآویزی سے سامعین مسحور رہا کرتے تھے۔

مرحوم نے اپنی زندگی کا ایک طویل عرصہ جمعیت اہلحدیث کے ناظم اعلیٰ اور پھر صدر کی حیثیت سے گزارا اور اس کے بعد تادم واپسیں جمعیۃ کے سرپرست رہے۔ کشمیر کی وزارت عظمیٰ سے بخشی غلام محمد کی معزولی کے بعد ۱۹۶۴ء میں موئے مبارک کے چوری کے نام پر جو سنگین سیاسی بحران اٹھ کھڑا ہوا تھا، اس میں بھی آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور سیاسی قیادت و رہنمائی بھی کی تھی۔ چنانچہ آپ نو سیاسی جماعتوں کے اس فورم کے صدر منتخب کیے گئے تھے جو احتجاجی تحریک چلا رہی تھیں اور اس جرأت رندانہ کے صلہ میں دیگر سیاسی رہنماؤں سمیت آپ کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔ موصوف کچھ دنوں سے جمعیۃ اہلحدیث کشمیر کی مرکزی دینی درسگاہ "الکلیۃ السلفیہ" سری نگر میں درس بھی دیا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے تمام حسنات و اعمالِ حسنہ کو شرف قبول بخشے اور تمام لغزشوں سے درگزر فرماتے ہوئے کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین۔

تزکیۂ نفس اور اس کی ضرورت

عبد السمیع محمد ہارون انصاری عالم ثالث

چھٹی صدی عیسوی میں صحرائے عرب کی ان پڑھ اور ناخواندہ قوم کی حالت نہایت ہی ناگفتہ بہ اور ابتر تھی وہ دینی اخلاقی، معاشی، معاشرتی ہر اعتبار سے پستی کی انتہا کو پہونچے ہوئے تھے۔ فاسد خیالات اور توہمات ان کا عقیدہ تھا مٹی کے خود ساختہ دیوی اور دیوتاؤں کے آگے جھکنا اور سجدہ کرنا ان کا دین تھا وہ اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کو اپنا حاجت روا اور مشکل کشا سمجھتے تھے اور سب سے بڑھکر یہ کہ خود اس قوم کا اپنا نفس معبود اعظم تھا۔ وہ ہوس پرستی اور اتباع نفس میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس ظلمت وجہالت اور تاریکی کے ماحول میں خدا نے اپنے آخری نبی امی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو انھیں عرب میں سے مبعوث فرمایا تاکہ بنی نوع انسان کو ضلالت وگمراہی کے غار عمیق سے نکال کر راہ ہدایت اور صراطِ مستقیم پر لگائیں اور اس کے نفوس وقلوب کا تزکیہ کرکے اس کو اس کا حقیقی مقام عطا کریں اور انسان کو انسان کی بندگی سے نکال کر خدا کا بندہ بنائیں۔ اللہ کا ارشاد ہے: هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَةَ وَاِنْ کَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝ (جمعہ۔ آیت ۲) وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں ان ہی کے اندر سے ایک پیغمبر بھیجا جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھکر سناتے ہیں اور ان کو (عقائدِ باطلہ، اعمالِ قبیحہ، اور اخلاقِ ذمیمہ) سے پاک کرتے ہیں اور ان کو دانشمندی (کی باتیں) سکھاتے ہیں اور یہ لوگ یقیناً (آپ کی بعثت سے) پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔ یعنی آپؐ کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ آپ گمراہ نفوس کا تزکیہ کریں اور انھیں راہِ راست پر لگائیں یاد رہے کہ یہ بات آپ کے ساتھ مخصوص نہ تھی بلکہ از آدم تا ایں دم جتنے انبیاء ورسل اس دنیا میں مبعوث ہوئے سب کی بعثت کا مقصدِ اولین یہی تزکیۂ نفس، تہذیب اعمال اور تصفیۂ باطن تھا۔

در حقیقت تزکیۂ نفس ہی پر حیاتِ انسانی کی فلاح و بہبود کا دارومدار ہے اور یہی نجاح و کامرانی کا مرکزی ستون اور اس کا اصل منبع ہے۔ اگر نفس کو یونہی اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو اس سے نیکی و بھلائی کا صدور اور اعمالِ صالحہ کا وجود نہ ہوگا لیکن اگر اس کی اصلاح اور اس کا تزکیہ کر دیا جائے تو فلاح و کامیابی اس کا استقبال کرے گی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا ۔ (یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس (نفس) کو پاک کر لیا اور وہ نامراد ہوا جس نے اس کو فجور سے ملوث کیا۔) ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا۔ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ ۔ یعنی جس نے پاکیزگی اختیار کی وہ فلاح پا گیا۔

ان آیات میں قرآن نے بالکل واضح اور دو ٹوک الفاظ میں بیان کیا ہے کہ نجات یا ہلاکت کا دارومدار نفس انسانی کی صفائی اور گندگی پر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تزکیۂ نفس سارے اعمال و عبادات اور ایمانیات و عقائد کو محیط ہے۔ زکوٰۃ کے متعلق اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیتے ہوئے فرمایا کہ: خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا ۔ آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجیے اور اس کے ذریعہ انہیں پاک و صاف کیجیے۔ یعنی زکوٰۃ تطہیرِ باطن اور تزکیۂ نفس کا ذریعہ ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ بخل و حرص نفس کا خاصہ ہے اور یہ اخلاق سب سے زیادہ قبیح اور مضر رساں ہے۔ اس لیے کہ جس کی طبیعت میں بخل و حرص ہوگا وہ مال و دولت کا غلام ہو جائے گا اور طرح طرح کی ذلیل و رذیل اور اخلاق و انسانیت کے معیار سے گری ہوئی حرکتیں کرے گا۔ اس کے برخلاف ادائیگی زکوٰۃ سے نفس کا بخل اور اس کی حرص ختم ہو جاتی ہے اور انسان بخل سے تعلق رکھنے والی گراوٹوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قرآن کے اندر تقویٰ اور احسان و اخلاص کو اپنانے کی جو تاکید بار بار آئی ہے ان سب کا حاصل بھی تزکیۂ نفس اور اتباعِ ہوا و ہوس سے تحفظ ہے بلکہ اسلام میں جتنے بھی اعمال و عبادات کا حکم ہے۔ سب کا حاصل یہی تزکیۂ نفس ہے۔

اس لیے تزکیۂ نفس کی خاطر شرعی اعمال و احکام کے دائرے سے آگے بڑھ کر مجاہدے اور ریاضت کی کوئی نئی ترکیب ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں کیونکہ خدا نے جس رسول کو تزکیۂ نفس کا معلم بنا کر بھیجا تھا اس سے بڑھ کر کون سی ہستی اور کون سی شخصیت مزکی اور مصفی ہو سکتی ہے۔ اس لیے تزکیہ کا صحیح طریقہ وہی ہے جو ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھلایا یعنی آپ کے نقشِ قدم پر چلنا اور آپ کو اسوہ بنانا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة لمن كان يرجوا الله واليوم الآخر ۔ تمہارے لیے رسول اللہ میں

(باقی صفحہ ۲ پر)

ہماری نظر میں:

تالیف : مولانا محمد صاحب جوناگڑھی رح

آداب قبور (فرمان محمدی)

ناشر: ادارہ دار الحدیث موتی مسجد پھول چورا ہا علی گڑھ

مؤلف کی شخصیت محتاج تعارف نہیں۔ انھوں نے ہندوستان کی سرزمین سے بدعت کی جڑ اکھیڑنے اور اس کے در و بام پر سنت کا علم لہرانے کی جو بے پایاں خدمات انجام دی ہیں وہ تاریخ کا ایک ناقابل فراموش باب ہیں۔ پیش نظر کتاب میں مولانا نے جو کچھ قلمبند فرمایا ہے اس کا اندازہ ذیلی عنوانات سے لگایا جاسکتا ہے جو یہ ہیں۔ اولیاء اللہ سے محبت، طریقہ محبت، بزرگوں کی توہین سے بچو، عرس، میلے اور ستر ہویں کا حکم قبر کی زیارت کا مسنون طریقہ، مردوں کے نہ سننے پر امام ابوحنیفہؒ کا واقعہ، قبروں پر سجدہ و طواف کرنا وغیرہ، حاجت روا اور مشکل کشا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

اخیر میں ناشر نے توحید کے موضوع پر مولانا خرم علی بلہوری (م ۱۲۶۰ھ/ ۱۸۴۴ء) اور مولانا حالی مرحوم کی مشہور نظمیں بھی چھاپ دی ہیں۔

کتابچہ اس لائق ہے کہ اسے بڑی سے بڑی تعداد میں عام مسلمانوں تک پہنچایا جائے تاکہ وہ شرک و بدعت کی تاریکیوں سے نکل کر موحد اور متبع سنت بن سکیں۔ یہ دین متین کی اہم اور مبارک خدمت ہوگی۔

محفل میلاد تاریخ کے آئینہ میں:

پتہ :- معرفت مکتبہ سلفیہ، ریوڑی تالاب، بنارس

۸ صفحات کا یہ مختصر سا کتابچہ اپنے موضوع پر بڑا مفید اور معلوماتی ہے۔ اس میں سب سے پہلے اہم تاریخی حوالوں سے بتایا گیا ہے کہ محفل میلاد کا موجد شہر اربل کا گورنر ابو سعید کوکبوری ابن ابوالحسن علی بن بکتگین ترکمانی ہے اور اس نے ۶۰۴ھ میں مجلس میلاد کی رسم ایجاد کی، پھر اس بدعت کی تائید میں روایتیں گھڑنے والے اس شخص کی حالت بیان کی گئی ہے جو گورنر اربل کا پہلا مؤید تھا۔ اور جسے ابن دحیہ کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد کتب حدیث اور اصول شریعت کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے کہ مجلس میلاد بدعت ہے۔ پھر شافعی، مالکی، حنبلی اور حنفی مذہب کے اکابر علماء کے حوالوں سے دکھلایا گیا ہے کہ وہ بھی اسے بدعت مانتے ہیں۔ اخیر میں محفل میلاد کے اندر کیے جانے والے قیام کی خرابی احادیث کی روشنی میں بیان کی گئی ہے۔ کتابچہ مطالعہ کے لائق ہے۔

تصورِ آخرت: عقل کی روشنی میں

عبدالعزیز بستوی ع۴، جامعہ سلفیہ

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتام زندگی ٭ یہ ہے شام زندگی صبحِ دوام زندگی۔

اسلام امن وشانتی اور اصلاح وسدھار کا ضامن مذہب ہے جس میں انسانی فطرت اور اس کے مزاج وحالات کی کامل رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے۔ اس کے کچھ ایسے بنیادی اور اساسی عقیدے اور تصورات ہیں، جن کے ماننے اور رو بہ عمل لانے ہی میں دینی اور دنیاوی صلاح وفلاح مضمر ہے۔ ان میں اہم ترین عقیدہ توحید رسالت اور آخرت کا ہے۔ اسلام میں ان کی کیا اہمیت ہے، اس کے لیے بس اتنا کافی ہے کہ کوئی شخص انھیں مانے بغیر مسلمان نہیں ہو سکتا آخرت کا مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد ایک ایسے عالم کا وجود ہوگا، جس میں عالم فانی کی ساری کارگزاریوں کا حساب وکتاب لیا جائے گا۔ باز پرس ہوگی اور اچھے برے اعمال کے مطابق جزا وسزا دی جائے گی۔ اچھی جزا جنت کی شکل میں اور بری جزا جہنم کی شکل میں۔

تصورِ آخرت کی صداقت وحقانیت کے لیے موجودہ انسانی دنیا میں جزا وسزا کا تصور اور اس کا عملی التزام (خواہ اس کی شکل کوئی بھی ہو) بڑی ٹھوس دلیل فراہم کرتا ہے مگر جو لوگ مذہب بیزار ہیں اور دنیاوی زندگی میں ہر طرح کے اصولوں اور ضابطوں سے آزاد رہنا چاہتے ہیں وہ بار بار اس لغویات کو دہراتے ہیں کہ موت کے بعد کوئی زندگی نہیں حساب وکتاب نہیں شعور واحساس نہیں۔ لیکن یہ نظریہ محض خود فریبی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ

موت اک زندگی کا وقفہ ہے ٭ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

اللہ رب العزت نے کائنات کو پیدا کیا، اس میں غیر معمولی معنویت ودیعت فرمائی اور انسان کو اس میں طرح طرح کے تصرفات کی صلاحیت عطا فرمائی۔ لہٰذا یہ بات اصول اور ضابطے کی ہے کہ ان تصرفات پر انسان کی باز پرس ہو اور اس کی جزا وسزا کا کچھ اسی طرح کا نظام ہو، جس طرح کا نظام حکومتوں اور سلطنتوں کی زیر نگرانی قائم عدالتوں

اوران سے صادر ہونے والے جزا و سزا کے فیصلوں کی شکل میں رائج ہے، خواہ یہ حکومتیں فوجی ہوں یا جمہوری، ملکیت کے رنگ ڈھنگ کی ہوں یا اشتراکی طرز کی ٹھیک اسی انسانی فطرت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حساب وکتاب کے لیے ایک دن کا انتخاب کیا ہے جسے یوم آخرت کہا جاتا ہے، اس دن انسان کو دنیاوی عدالتوں کی طرح صرف شرانگیزی اورامن کشی پر سزا نہیں ملے گی بلکہ اصحاب صدق وصفا اورانسانیت کے لیے سوز و درد رکھنے والے بندوں کو خوب خوب نعمتوں سے نوازا بھی جائے گا۔ اس تمثیل سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ تصور آخرت کوئی ایسا تصور اور عقیدہ نہیں جو فہم سے بالاتر اور فطرت کے تقاضوں سے ماوراء ہو۔

منکرین آخرت کہتے ہیں کہ جب دنیا ہی میں سزاؤں کے لیے عدالتیں قائم ہیں تو کسی اور عدالت کی حاجت نہیں بلکہ اس کے بعد کسی اور عدالت کا قائم کرنا انصاف کے بجائے ظلم ہے، لیکن اس کا جواب خود ہمارے معاشرہ اور سماج اور ملک وملت کی زبان دے رہی ہے۔ ہمارے اردگرد پیش آنے والے واقعات اس اعتراض کی تردید وتکذیب کے لیے کافی ہیں۔ آج کتنے ہی مجرمین ہیں جو خونریز وسفاک ہیں، عزت وآبرو کے لیٹرے ہیں، بدمعاش اور شرپسند ہیں اور حکومت وانسانیت کے باغی ہیں لیکن ہر طرح کی سزاؤں سے آزاد دندناتے پھر رہے ہیں۔ عدالت انھیں سزا دینے کی ہمت نہیں کرتی۔ مقدمات چلتے ہیں تو وکیل صفائی کی جرحیں اور ہتھکنڈے ان کی گلوخلاصی اور برأت کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ بہت سی دفعات کی گرفت ہی میں وہ نہیں آتے اور بسا اوقات جج اور مجرم کی قربت اور ملی بھگت سزا کی تخفیف بلکہ تنسیخ کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ کبھی شہادت کی عدم فراہمی سے عدالت سزا عائد نہیں کرپاتی، پھر ان مجرموں کو تو اپنی جگہ چھوڑیے ذرا بازیگران سیاست اور لیڈران ملک وملت کی فریب کاری، رشوت ستانی اور عیاری وچالبازی پر نظر ڈالیے۔ آپ دیکھیں گے۔ امن وشانتی عدل ومساوات اور مکمل انصاف کے پرفریب نعروں کے پردوں میں کتنے انسانیت سوز اورامن فروش بھیانک چہرے سرگرم عمل ہیں۔ چونکہ یہ خود قانون ساز ہیں اس لیے قانون کی گرفت سے بالاتر ہیں۔ تو عقل یہ بات قبول کر سکتی ہے کہ ان مذکورہ مجرموں اور لیڈروں کو ان کی مجرمانہ بداعمالیوں اور مکارانہ حرکتوں پر کوئی سزا نہیں ملنی چاہیے۔؟

اب سوال یہ ہے کہ جب دنیا میں انھیں ان کے کرتوت کی سزا نہیں ملتی تو اس کے سوا کیا چارۂ کار رہ جاتا ہے کہ آخرت کی آمد تسلیم کیا جائے جہاں ہر شخص کو ایک علیم وخبیر ہستی اس کے کرتوت کی ٹھیک ٹھیک سزا دے گی۔ اور وہاں کسی قسم کا حیلہ و فریب کام نہ دے سکے گا۔

اسے اس پہلو سے بھی سوچیے کہ بحیثیت انسان ہر ایک کو تحفظ جان و مال کا یکساں حق حاصل ہے تخلیق انسانیت میں یکسانیت اور ہم آہنگی نمایاں بھی ہے۔ مگر تاریخ اور واقعات کے صفحات پر چنگیز و ہلاکو و ہٹلر جیسے بے شمار سفاک نظر آتے ہیں جنھوں نے اپنے جیسے ایک دو ہم جنسوں کو نہیں بلکہ لاکھوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب سارے انسانوں کی جانی و مالی حالت یکساں ہے تو کیا اس جہان فانی میں انھیں لاکھوں مرتبہ قتل کیا جاسکتا ہے؟ ہرگز نہیں کیوں کہ اس دنیا میں صرف ایک ہی زندگی اور ایک ہی موت ہے۔ لہٰذا باقتضائے عقل کوئی ایسی زندگی ضرور ہونی چاہیے جس میں خونریزوں اور سفاکوں کو خلق خدا پر ان کے ظلم و تعدی کی پوری پوری سزا دی جاسکے۔ اور یہی زندگی آخرت کی زندگی ہے۔

ابھی ۱۹۸۰ء کی بات ہے کہ لندن کی ایک عدالت میں ایک ایسے شخص کا مقدمہ پیش ہوا جس نے متعدد افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ جج نے صریح لفظوں میں کہہ دیا کہ اگر اسے قتل کیا جائے تو صرف ایک مقتول کی سزا ہو سکتی ہے اور اگر اسے جیل کی کال کوٹھری میں ڈال دیا جائے تو یہ چند روزہ زندگی اس کی سزا کے لیے ناکافی ہے۔

اسی طرح کچھ ارباب خلوص اور انسانیت کے خیر اندیش ہوتے ہیں جن کے دلوں میں بندگان خدا اور مخلوق ایزدی کے لیے اچھے جذبات موجیں مارتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ کتنے ہیں جو اسی راہ محبوب میں دیوانہ وار فنا اور قربان ہو جاتے ہیں، لیکن ان ارباب صدق و صفا کی مخلصانہ خدمات کا صلہ اور انعام یہاں کسی بھی حکومت یا کسی بھی ادارے سے نہیں ملتا۔ جب کہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ انھیں ان کی پرخلوص قربانیوں کا صلہ ملے۔

لہٰذا یوم جزا و سزا کا تصور فطری حقیقت ہے اور جنت و جہنم کا تصور عین انسانی تقاضہ ہے۔

اور اب جبکہ فطرت کا ذکر آ گیا ہے تو آئیے اس پر بھی تھوڑا سا غور کریں کہ تصور آخرت فطرت انسانی کے مطابق ہے یا نہیں؟ انسانی فطرت سہل اور آرام پسند واقع ہوئی ہے۔ مگر اسے ایسی دنیا اور ایسی فضا ملی ہے۔ جہاں طول و تنگ و دو ہے اور غموم و ہموم کی لہریں ہیں۔ اس لیے فطرت چاہتی ہے کہ کوئی آرامگاہ ہو جہاں وہ ہر طرح کے غم و الم اور فکر و تردد سے آزاد ہو کر نہایت پرسکون لمحات گزار سکے اور ایسی آرام گاہ صرف دار آخرت ہی ہو سکتی ہے۔ سچ کہا غالب نے ؎

قید حیات و بند غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟

منکرین آخرت کا یہ عجیب تضاد ہے کہ وہ ایک زندگی کو تسلیم کرتے ہیں مگر اس زندگی کے بعد دوبارہ زندہ ہونے اور حساب وکتاب سے دوچار ہونے کو خلاف عقل اور محال قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ جس نے ایک بار وجود اور زندگی عطا کی وہ دوبارہ زندگی دینے پر بدرجۂ اولیٰ قادر ہے۔

عقیدۂ آخرت کو مسترد کرنے کے لیے بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ حساب وکتاب میں اعمال کا وزن خلاف عقل ہے اور اعمال میں تصویر کا رنگ آنا فہم سے بعید تر ہے۔ مگر اس اعتراض کو موجودہ وقت اور جدید سائنس نے باطل کر دیا ہے۔ آج حرارت و برودت کا وزن ہو رہا ہے۔ تاریک سے تاریک تر مقام میں کیے گئے فعل کے بعد وہاں کے مجرموں کی تصویر لینے میں سائنس کی مشین کارآمد ہے تو کیا قدرت اعمال کا وزن کرنے اور اس کی تصویر لینے پر قادر نہیں؟ یقیناً قادر ہے۔

آج سائنس کی تحقیق یہ ہے کہ سارے ملفوظات فضا میں موجود ہیں اور انھیں خاص قسم کے ٹیپ ریکارڈر سے ٹیپ کیا جا سکتا ہے۔ اس سے عقلی طور پر اطمینان ہوتا ہے کہ یقیناً قدرت نے انسانی اعمال وافعال اور اقوال کو منضبط کرنے کا انتظام کر رکھا ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے۔ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ۔ یعنی انسان جو کچھ بھی بولتا ہے اس کے پاس ایک نگراں ہے۔

ان تمام تفصیلات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ آخرت کا تصور فطرت اور عقلی ضرورت کے عین مطابق ہے جس کا اعتراف دنیا مختلف انداز سے کرتی ہے۔

نہیں زمانہ ابھی جس کے سوز سے خالی: فلسطینی جہاں جانباز و سرفروش جنگجو ہیں وہیں ماہر ٹیکنیشین بھی ہیں۔ وہ جب لبنان میں موجود تھے تو اپنے کارخانوں میں بندوقیں، ریوالور اور کیٹوشیا طرز کی میزائلیں بناتے تھے اور میزائل گراؤنڈ کے اڈے بھی انھوں نے خود ہی بنائے تھے۔ اب جنگی طیارے بنانے کی باری تھی کہ جنگ لبنان چھڑ گئی اور انھیں بیروت خالی کرنا پڑا۔ بیروت سے نکل کر انھوں نے مختلف ملکوں اور شہروں میں اپنے قدم جما لیے ہیں اور ان کی صنعت جس مقام تک پہنچ چکی تھی وہاں سے آگے بڑھ رہی ہے۔ یاسر عرفات نے تونس کے اخبار الرای کو انٹرویو دیتے ہوئے انکشاف کیا ہے کہ فلسطینیوں کا جنگی طیارہ تکمیل کے آخری مرحلے سے گزر رہا ہے۔ (المجتمع کویت ۳۳/ اکتوبر ۱۹۸۲ء)

انٹرویو

ڈاکٹر عبدالباری صاحب
صدر جمعیۃ اہلحدیث بنگلہ دیش سے انٹرویو

از محمود الحسن ناظم ندوۃ الطلبہ جامعہ سلفیہ بنارس

۲۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کی شام کو جناب ڈاکٹر عبدالباری صاحب حفظہ اللہ جامعہ سلفیہ کے ایک قدیم فارغ مولانا عبدالمتین سلفی (فاضل مدینہ یونیورسٹی و مبعوث دارالافتاء برائے بنگلہ دیش) کی معیت میں تشریف لائے۔ آپ نے سری لنکا میں ہونے والی اسلامی ممالک کے نمائندوں کی کانفرنس میں شرکت کے بعد یہاں کا رخ کیا تھا۔ آپ کا یہ پرائیویٹ سفر تھا۔ ۲۲ اکتوبر کی صبح کو جامعہ کے دارالضیافہ میں میں نے مہمان موصوف سے ایک مختصر سا انٹرویو لینے کی خواہش ظاہر کی۔ میں جناب ڈاکٹر صاحب کا بہت شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میرے سوالات کا جواب دینے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اور ساتھ ہی ساتھ میں جناب مولانا عبدالمتین صاحب سلفی مدنی کا بھی بہت شکر گزار ہوں کہ مولانا نے اس سلسلے میں میری مدد کی۔ یہ انٹرویو انگریزی میں لیا گیا تھا۔ ترجمہ پیش خدمت ہے

س:۔ آپ کا اسم گرامی جاننا چاہوں گا؟۔

ج:۔ مجھے عبدالباری کہتے ہیں۔

س:۔ آپ کا آبائی وطن؟ ج:۔ دیناجپور، بنگلہ دیش

س:۔ آپ کے کتنے بھائی بہن ہیں؟ ج:۔ میرے دو بھائی اور چھ بہنیں ہیں۔

س:۔ کیا والدین بقید حیات ہیں؟ ج:۔ صرف والدہ ماجدہ کا سایہ سر پر ہے اور والد محترم بہت پہلے اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔

س:۔ آپ کی اپنی فیملی کتنے افراد پر مشتمل ہے؟ ج:۔ دو لڑکے اور چار لڑکیاں ہیں۔

س:۔ ابتدائی تعلیم آپ نے کہاں حاصل کی؟ ج سب سے پہلے دیناجپور مدرسہ نورالہدیٰ میں۔

پھر اسلامک کالج لوگاؤں ضلع راج شاہی میں اور اس کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہا۔ اور پھر آکسفورڈ یونیورسٹی انگلینڈ سے ڈاکٹریٹ کیا۔

س:۔ آپ نے کس موضوع پر پی ایچ۔ڈی۔ کی؟

ج:۔ اسلامک ہسٹری اور وہابک مومنٹ میرا موضوع رہا۔

س:۔ کسی موضوع سے خاص طور پر لگاؤ ہے یا کہ جملہ فنون کی طرف یکساں میلان ہے؟

ج:۔ اسلامی تاریخ اور صحافت سے مجھے خاص دلچسپی رہی ہے اور ایم۔اے۔ (عربی) میں نے فرسٹ کلاس پاس کیا اور ۱۹۶۹ء میں جنرل یحییٰ خان نے مجھے Best Teacher (عمدہ استاد) کا گولڈ میڈل (تمغہ التفنا) دیا تھا۔

س:۔ موجود مصروفیات کیا ہیں؟

ج:۔ مختلف اوقات میں مختلف کالجوں میں میں نے درس و تدریس کا کام انجام دیا اور فی الوقت چیئرمین آف دی یو۔جی۔سی آف بنگلہ دیش ہوں اور ساتھ ہی ساتھ جمعیۃ اہلحدیث بنگلہ دیش کا صدر بھی ہوں۔ اور اس سے پہلے راجشاہی یونیورسٹی کا وائس چانسلر رہ چکا ہوں۔

س:۔ ہندوستان تشریف لانے کا کوئی خاص مقصد؟

ج:۔ سری لنکا میں ہونے والی مسلم ممالک کے نمائندوں کی کانفرنس میں شرکت کے بعد میں پرائیویٹ سفر کر کے ہندوستان اس غرض سے آیا کہ یہاں کے دینی مدارس کا مشاہدہ کرسکوں۔ چنانچہ آپ کے جامعہ سلفیہ پہونچنے کا موقع ہاتھ آیا۔ اور یہاں آنے سے پہلے دہلی میں میں نے جمعیۃ اہلحدیث کے سلسلے میں گفتگو کی اور خاص طور سے اس بات پر زور دیا کہ جمعیۃ اہلحدیث بنگلہ دیش اور جمعیۃ اہلحدیث ہند کے مابین تعلقات کی کڑی کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا جائے۔

س:۔ کیا آپ جامعہ سلفیہ اور ہم طلبہ کے بارے میں کچھ کہنا چاہیں گے؟

ج۔ موجودہ زمانے میں ہر چہار جانب امنڈتے ہوئے خلفشار اور اضطرابی ماحول کو صرف اسلام ہی امن و سلامتی کا ماحول دے سکتا ہے کیونکہ دنیا کے تمام ازم انسان کے بنائے ہوئے ہیں اور چونکہ انسان ناقص العقل ہے لہٰذا اس کا تیار کردہ ازم بھی بدیہی طور پر ناقص ہوگا اور رہی بات دیگر آسمانی ازموں کی

تو ان کے اندر بہت زیادہ تلبیس اور تدلیس ہو چکی ہے۔ اس طرح صرف اسلام ہی ہے جو کہ خدا ساختہ ازم ہے، اور یہی اس خلفشار کو مٹا سکتا ہے۔

جامعہ سلفیہ کا مقصد وجود صرف یہ ہے کہ اس سے ساری دنیا میں امن و سلامتی کا پیغام پہنچے اور اسلام کا بول بالا ہو۔ میری آواز یہ ہے کہ تمام طلبہ کو چاہیے کہ وہ اسلام کو اچھی طرح سمجھیں نیز اس پر عمل کرکے اوروں کو اس کی دعوت دیں۔ ہماری یہ دلی خواہش ہے کہ آپ طلبہ حضرات جماعت اہلحدیث کو ہر طرح سے فروغ دیں گے۔

س:۔ میرا آخری سوال تھا کہ آئندہ کب تک آپ یہاں تشریف لائیں گے؟

ج:۔ میرے اس سوال پر جناب ڈاکٹر صاحب ہنس پڑے اور فرمایا۔ واللہ اعلم

تقریر کا خلاصہ

۲۲ر اکتوبر ۱۹۸۳ء ہی کو جامعہ سلفیہ کی جامع مسجد میں جناب ڈاکٹر صاحب موصوف کے اعزاز میں طلبہ و اساتذہ کا ایک اجتماع منعقد ہوا۔ سب سے پہلے حافظ محمد ایمن صاحب نے قرآن پاک کی تلاوت کی، پھر جامعہ کے ریکٹر جناب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن صاحب ازہری نے مہمان محترم کا مختصر تعارف کراتے ہوئے جامعہ کا بھی اجمالی تعارف کرایا۔ اس کے بعد مہمان معزز اسٹیج پر تشریف لائے اور حمد و صلوٰۃ کے بعد اراکین، اساتذہ کرام اور طلبائے جامعہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تبلیغ دین و اشاعت اسلام کو اس ادارے کا مقصد عظیم بتلایا اور ساتھ ہی ساتھ تالیفی و تصنیفی میدان میں بھی آگے بڑھنے کی ترغیب دلائی۔ اور ہندو پاک کے بٹوارے کے باوجود تمام مسلمانوں کو باہم بھائی گردانتے ہوئے ایک ہو کر مختلف علوم سیکھ کر اشاعت دین کرنے کی بات کہی اور فرمایا کہ بنگلہ دیش کے اندر ایک ایسی یونیورسٹی کا انعقاد کیا جا رہا ہے، جس میں دینی علوم کے ساتھ ساتھ عصری علوم کی بھی تعلیم دی جائے گی۔ موصوف نے فرمایا کہ آپ لوگوں کے تعلیمی و تبلیغی کام کو دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی اور امید ہے کہ آپ لوگ ترقی کے مراحل طے کریں گے۔ اس کے بعد دعائیہ کلمات کے ساتھ مہمان موصوف نے اپنی تقریر ختم کی۔ ماسٹر محمد طارق صاحب استاذ انگریزی جامعہ سلفیہ نے اردو میں خلاصہ ترجمہ پیش کیا۔

آخر میں جناب ڈاکٹر مقتدیٰ حسن صاحب ازہری نے دوبارہ جملہ اراکین، اساتذہ کرام، اور طلبائے جامعہ سلفیہ کی طرف سے مہمان موصوف کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہوئے پروگرام کے اختتام کا اعلان کیا

عالم اسلام

بلجیم میں مسلمانوں کے حالات

عبد المبین ندوی دار المصنفین اعظم گڈھ۔

زیر نظر مضمون ابو ظہبی سے شائع ہونے والے عربی ماہنامہ "منارالاسلام" اگست وستمبر ۸۳ء کے مشترکہ شمارہ میں شائع شدہ مضمون "المسلمون فی بلجیکا" کی تلخیص ہے۔ جسے ڈاکٹر عبدالمجید وافی صاحب نے انٹرویو کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس تلخیص میں قارئین "محدث" وہاں کے دینی ثقافتی حالات کا مطالعہ فرمائیں گے۔ مزید برآں اس مضمون سے وہاں کے مسلمانوں کو درپیش مشکلات کی تصویر سامنے ابھر کر آئی ہے۔ عبدالمبین ندوی

یورپ کے صنعتی ممالک جدید آلات اور ٹکنالوجی میں بہت آگے ہیں اور اسی بنیاد پر انھوں نے معاشرتی اور تہذیبی میدان میں غیر معمولی ترقی کی ہے۔

صنعتوں کی ترقی کا راز

واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے معدنیات میں نئی نئی تحقیقات کی ہیں جس کی بنا پر ان کی صنعت میں ترقی ہوئی۔ لیکن ان کی ترقی کا بڑا سبب مزدوروں کا ہنرمند ہاتھ بھی ہے، جس نے مغربی اقوام کو صنعت وحرفت کے میدان میں نمایاں کر کے صف اول میں لا کھڑا کیا ہے۔ لیکن وہاں کے ہنرمند اور مزدور طبقہ کی اجرت نہایت معمولی ہے اور صریحی طور پر ان کے ساتھ زیادتی کی جاتی ہے

پردیسی مسلمان

ان مزدوروں کا بڑا طبقہ پردیسی مسلمانوں پر مشتمل ہے، جو جرمنی، فرانس، ہالینڈ، بلجیم اور اٹلی میں پیداوار کے لیے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ ان کی کارکردگی اور فنی مہارت کا اعتراف ہر کسی کو ہے

ذیل میں ان مہاجر مسلمان مزدوروں کے دو نمائندوں مرزوق مونا اور عبدالعزیز یاعوقی سے لیے گئے انٹرویو

کی تلخیص پیش کی جا رہی ہے ۔ یہ دونوں مسلمان بھائی بلجیم میں ۵ لاکھ مسلمان مہاجرین کے درمیان کام کرتے ہیں ۔ اول الذکر وہاں ہجرت کے ۲۰ سال گزار چکے ہیں اور ثانی الذکر کے دس سال گزر رہے ہیں ۔

عبدالمجید دانی صاحب نے ان سے پہلا سوال یہ کیا کہ آپ نے شمالی بلجیم میں یورپ کا خنک و خوشگوار موسم چھوڑ کر اس گرمی میں خلیج کی طرف کیسے زحمت کی ؟

فی سبیل اللہ

انھوں نے کہا کہ اللہ کے راستہ میں ، پھر اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ مہاجرانہ زندگی میں ہمیں جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ۔ اس کے پیش نظر اپنے بچوں کی اسلامی تعلیم اور اپنی دینی واقفیت کے لیے ہمیں معلمین کی سخت ضرورت ہے ، کیونکہ دین سے اپنے رشتہ کے قیام اور اس کی حفاظت کے سلسلہ میں ہماری کوششیں نسبتاً محدود معلومات ناقص ہیں ۔ پھر بھی ہم مغربی تہذیب اور معاشرہ کے سامنے سرنگوں نہیں ہیں ۔ اہل مغرب کے نزدیک اخلاقی قدروں کی کوئی اہمیت نہیں ، مفاد پرستی ، نفع خوری ، عریانی ، لذت اندوزی ان کا مطمح نظر ہے ۔ حرص و ہوس کی بندگی انھیں جس طرف چاہتی ہے لے جاتی ہے ۔ مگر ہم اپنی اولاد کی پوری نگرانی و حفاظت کرتے ہیں ، اسی کی خاطر ہمیں یہاں کا قصد کرنا پڑا ہے ۔

مسجدیں ہی ہم سب کی اجتماع گاہ ہیں

مسجدیں ہی ہم سب کے ملنے ، اپنے مقصد ولقب العین سے واقف ہونے اور اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کی جگہ ہے ۔ یہاں صرف مراکشی ہی نہیں ترکی ، البانی ، تیونسی ، الجزائری بھی اکٹھا ہوتے ہیں ، مقصد کی یکسانیت نے ہم سب کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا ہے ۔ اگرچہ ہماری مسجدیں اسلامی ملکوں کی مساجد کی طرح پرشکوہ و پرعظمت نہیں بلکہ کرایہ کے چند کمرے ہیں جن میں سے بعض نماز کے لیے اور بعض بچے اور بچیوں کے حفظ قرآن اور ابتدائی عربی تعلیم کے لیے مخصوص ہیں ۔

برو کسل کی مسجد

اس کے بعد ڈاکٹر عبدالمجید دانی صاحب نے کہا کہ وہاں تو کوئی ثقافتی سینٹر بھی ہے ؟ جو مسجد بروکسل کے نام سے مشہور ہے ۔ آپ کی تگ و دو کے تئیں اس مرکز کا کیا رول ہے ؟

استاذ مرزوق : بلجیم میں اس طرح کی مساجد کی مجموعی تعداد تقریباً ۵۰ ہے صرف بروکسل میں ، جہاں کبھی کبھی اسلامی سیمینار اور کانفرنسیں منعقد ہوا کرتی ہیں ۔ ۸۰ مسجدیں ہیں ۔ بروکسل مسجد ایک قابل قدر یادگار مرکز ہے ۔ اس کی بنیاد ۱۹۳۰ء کے بعد کی دہائی میں پڑی ہے مگر جلد ہی کمزوری آگئی ۔ پھر ۱۹۶۶ء میں دوبارہ اس کی ترمیم و اصلاح

کا سنگ بنیاد رکھا گیا ہوا۔ اسی موقع پر شاہ فیصل مرحوم کا بلجیم کا دورہ ہوا تھا۔ وہاں کے مسلمانوں نے تعاون کی درخواست کی مرحوم نے ۴۰ لاکھ ڈالر کی رقم منظور کی، پھر بلجیم کے مسلمانوں کے تعاون کو شامل کر کے مجموعی رقم ۵۰ لاکھ ہوگئی۔ بعض مسلم ممالک کے سفراء نے بھی حصہ لیا اور ٹیونس کی حکومت نے علوینی صاحب کو امام اور ڈائرکٹر بنا کر بھیجا۔ جواب بھی ہیں۔ بلجیم کی حکومت نے اس مرکز کی خدمات اور کارکردگی کا اعتراف کیا ہے۔ اس مرکز کا افتتاح شاہ خالد مرحوم کی تشریف آوری کے موقع پر ہوا اس وقت بلجیم کی حکومت نے اپنے وزیر تعلیمات کے جو ہدایات و احکامات دیے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے۔ اب اس مرکز کی حیثیت ایک اسلامی میوزیم کی ہوگئی ہے۔

مرکز بروکسل کی ذمہ داریاں

ڈاکٹر عبدالمجید واقی صاحب نے جناب عبدالعزیز یاغوتی صاحب سے سوال کیا کہ شادی بیاہ، مردوں کی تجہیز و تکفین اور میراث کے احکام کا نفاذ کون کرتا ہے؟ علاوہ ازیں بلجیم کے عام معاشرہ کے لیے مرکز کی اہم سرگرمیاں مثلاً اسلام کی صحیح صورت حال سے لوگوں کو روشناس کرانا، مختلف موضوعات پر لیکچر اور علمی و ثقافتی سیمینار منعقد کرانے کی ذمہ داری کون سنبھالتا ہے۔

عبدالعزیز صاحب: مرکز نہ تو ہماری جمعیت کے ساتھ کوئی تعاون کرتا ہے نہ یہاں کے مسلمانوں کے عزم و حوصلہ بڑھانے کے لیے ہماری جو سرگرمیاں ہیں ان سے کوئی تعلق رکھتا ہے۔ ان کی توجہ عیدین اور رمضان تک محدود دیکھ کر ہم نے اپنے آپ پر اعتماد کیا اور محلہ کی مسجدوں کے اندر اجتماعی سرگرمیاں تیز کر دیں۔

حکومت کا اعتراف

اچھا اب سوال یہ ہے کہ حکومت بلجیم نے مہاجر مسلمانوں کے بچے اور بچیوں کی تعلیم کا سرکاری مدارس میں کیا انتظام کیا ہے؟

عبدالعزیز صاحب: بلجیم کی حکومت مہاجر مسلمان بچوں کو اسلامی تعلیم دلانے کا حق تسلیم کرتی ہے مگر مکمل مالی تعاون دینے اور ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس لیے مسلم سفارت خانے ہی اس بڑی ذمہ داری کو سنبھالے ہوئے ہیں۔

دونوں صاحبان نے بتایا کہ فرانسیسی زبان ذریعہ تعلیم ہے اور یہ اقدام مرکز کے ڈائرکٹر علوینی صاحب کی خوشامدانہ روش کی وجہ سے ہوا ہے۔ ورنہ اس ملک کے دوسرے عربی مدارس میں عربی زبان میں درس دینے کا اہتمام ہے اور اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوئی۔ انھوں نے بتایا کہ ہم اس کمی کو اپنی مسجدوں اور جمعیتوں میں حفظ قرآن مجید اور عربی کی تعلیم کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، جس کے لیے بڑی جدوجہد درکار ہے اور اس کے لیے ہمیں معلمین کی بھی ضرورت ہے۔ پھر ترکی، البانیہ اور عرب بھائیوں کا مشترکہ تعاون بھی چاہیے، خاص کر تعلیم قرآن مجید کے لیے۔ ویسے ترکی البانیہ

کے لوگ اپنی توجہ ترکی زبان کی تعلیم پر رکھتے ہیں اور آپس میں تعاون و اشتراک کے باوجود ابھی وہ جمعہ کی نماز ہمارے ساتھ ادا نہیں کرتے بلکہ وہ اپنی مسجدوں میں اپنے امام کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور ترکی زبان میں خطبہ سننے کے عادی ہیں

پیچھے دھکیلنے کی کوشش

جناب مرزوق صاحب نے بتایا کہ حکومت بلجیم اسلام اور مسلم دشمن تحریکوں کے اکسانے پر ہمیں پسماندہ بنانا چاہتی ہے ۔ چنانچہ ابھی حال ہی میں نائب وزیر اعظم نے ایک قانون پاس کیا ہے ، جس کی رو سے سب کے لیے ہے مگر اس کا خاص نشانہ مسلمان ہیں ۔ قانون یہ ہے کہ دینی تعلیم سے استفادہ کا حق صرف بلجیم کے شہریوں کا ہے اور وہ لوگ جن کے پاس یہاں کی شہریت نہیں ہے ۔ وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے ۔ نیز اجتماعی ضمانت اور شہری حقوق کا مستحق وہی شخص ہوگا جس کی آمدنی یا تنخواہ کا ساٹھ فیصد کمپنیوں اور کارخانوں کے مقفل ہونے کی صورت میں بھی حاصل ہوتا رہے ۔ یا کم از کم اس حیثیت کا ہے کہ وہ خود ملازم رکھ سکے اور نکال سکے اور اپنے متعلقین کا علاج و معالجہ بھی کرا سکے ۔

اس کے ساتھ ایک قانون یہ بھی ہے کہ جس شخص نے پانچ سال سے کم بلجیم میں گزارے ہیں وہ مستقل ملازم ہونے بھی مذکورہ مراعات کا مستحق نہیں ۔

سفارتی مشکلات کا سامنا

اس اعلان کے بعد عرب سفراء اور تارکین وطن کے نمائندے بڑی تعداد میں بروکسل عرب لیگ یونیورسٹی میں اکٹھا ہوئے اور نائب وزیر اعظم و وزیر انصاف سے سخت احتجاج کرتے ہوئے حکومت سے تجارتی ، صنعتی اور اقتصادی تعلقات منقطع کر لینے کی دھمکی دی ۔ جس کے بعد قانون کو وقتی طور پر موقوف کر دیا گیا ہے ۔ اس سے بلجیم میں اسلامی احساس کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے ۔

سوچی سمجھی سازشیں اور منظم حملے

مگر اب مسلمانوں کے خلاف اور حکومت کی تائید میں صحافتی حملے شروع ہو گئے ہیں مسلمانوں کی اپنی تنظیم اور مساجد میں ان کے آپس برتاؤ کو مسخ کر کے پیش کیا جا رہا ہے اور ان پر جہاد کے نام سے بغاوت کی دعوت کا اتہام لگایا جا رہا ہے ۔ ان صحافتی حملوں کا اثر صرف یہی نہیں کہ مسجدوں تک پہنچا ہے بلکہ یہ حملے صلیبی اور صہیونی تحریک کی شکل اختیار کر چکے ہیں اور اس کے اثرات کارخانوں اور ملازمین کی سوسائٹی ، ان کے کیمپ اور انجمنوں تک پہنچ چکے ہیں ۔

بعض مد مقابل تنظیمیں

لیکن مشکل یہ ہے کہ عرب اور اسلامی نام رکھنے والے بعض اسلام دشمن مارکسٹ ملے نے بھی مسلمانوں پر تعصب اور تخریب کاری کا الزام لگایا ہے اور کہا ہے کہ ان سے

ث کا خطرہ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دوسرے مزدوروں کے برتاؤ اور امتیازی سلوک کی شدت اور ان کے
دن اور تنظیمات میں جھڑپیں روز بروز بڑھتی جا رہی ہیں، جس کی وجہ سے مسلمان بعض خصوصی مراعات سے
م رہتے ہیں۔

یکر متعاون تحریکیں

اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کے لیے بظاہر مختلف لیکن متحد المقاصد تحریکیں یعنی ایک طرف صہیونیت، صلیبی ادارے، دائمیکن اور عالمی مجلس
ں، اور دوسری طرف عالمی کمیونزم ایک ہو جاتے ہیں اور حکومت الگ تھلگ تماشہ دیکھتی ہے۔ لیکن جب مسلم
ظیمیں باہمی تعاون سے کچھ کرنا چاہیں تو تعصب کی بنا پر حکومت کا رویہ مسلمانوں کے حق میں نہایت ناروا ہوتا ہے۔
اللہ کی مدد و حمایت ہی ہمیں محفوظ رکھتی ہے

لی مشکلات

بلجیم میں ابتدا ہی سے مالی مشکلات کا بھی سامنا ہے۔ باہمی تعاون سے کرایہ پر مسجد اور مدرسی کمرے لے لیے گئے ہیں پھر انھیں حکومت سے رجسٹریشن کرایا گیا ہے کہ یہ جمعیت کی خاص ملکیت ہے
ن منتقلہ کا بھی رجسٹریشن کرا لیا گیا ہے لیکن اسی اثنا میں ملازمین اپنے وطن واپس کیے جا رہے ہیں۔ یورپ کے عام
نعتی بحران اور کساد بازاری کی وجہ سے بعض کارخانوں میں ملازمین کی تخفیف کر دی گئی ہے۔ بعض کارخانے مقفل
کر دیے گئے ہیں اور ۶۰ فیصدی تنخواہ پانے والے معطل ملازمین کے لیے مساجد اور تنظیمات کا مالی بار برداشت کرنا
مخ طور سے دشوار رہے۔

سلامی دینی کمیٹی

ان تمام مشکلات اور دشواریوں کے باوجود مہاجرین نے بلجیم میں "اسلامی دینی کمیٹی" کی بنیاد رکھ کر اپنی سرگرمیوں کو آگے بڑھایا ہے اور اس کی رکنیت کا دروازہ تمام
سلامی عناصر کے لیے وا رکھا ہے

۱۔ مسلمانوں کے عقیدہ کی طرف سے دفاع اور بلجیم میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ۔

۲۔ قرآنی تہذیب و ثقافت کی نشو و نما اور ترویج۔ مسلمان بچوں میں خصوصاً اور افراد اور مساجد کی تنظیمات کے لیے عموماً۔

۳۔ بلجیم کے اندر موجود مسلمانوں میں اسلامی عقیدہ کی اشاعت و تعارف۔

مذکورہ کمیٹی رجسٹرڈ ہے اور اس کے لیے سات منزلہ عمارت خرید کر معمولی ترمیم کے بعد اپنے حسب ضرورت بنا لیا ہے،
س میں دو بڑے ہال ہیں ایک نماز کے لیے اور ایک لکچر کے لیے پھر حفظ قرآن اور عربی تعلیم کے درجات ہیں۔

بقیہ ص ۵۵ پر

مئوناتھ بھنجن کا فساد

۶ر اکتوبر ۱۹۸۴ء کو مئوناتھ بھنجن میں ہندو مسلم فساد کا بہانہ کھڑا کر کے پی اے سی نے جس بربریت اور درندگی کا مظاہرہ کیا۔ الفاظ اور جملوں کے ذریعہ اس کی تصویر کشی ممکن نہیں۔ پورے شہر پر تیرہ دن کا اور خاص خاص مسلم محلوں پر ۲۱ دن کا نہایت سخت لگاتار اور بلا توقف کرفیو جو حقیقت میں مسلمانوں کی ناکہ بندی تھی، یہ بتا دینے کے لیے کافی ہے کہ تقریباً ایک لاکھ کی آبادی جو روزانہ اپنی ضرورت کی اشیاء خرید کر پکاتی کھاتی ہے اسے بھوک اور پیاس کے کتنے سخت دور سے گزرنا پڑا۔ مزید بربریت یہ کہ گھروں میں جانے والی پائپ لائینس توڑ کر پانی کی سپلائی کاٹ دی گئی۔ شاہدین کا بیان ہے کہ لوگوں کو بھوک کے سبب گھروں میں موجود درخت کے پتے چبانے پڑے۔ ایک بدحال بلکتے ہوئے بچے سے ایک ڈاکٹر نے رونے کی وجہ پوچھی تو بتایا کہ دو دن سے پانی کا ایک قطرہ نہیں ملا ہے۔ اس نے بالٹی میں پانی بھر کر وہاں پہنچانا چاہا تو پی اے سی کے ظالم درندوں نے اسے چھین کر زمین پر بہا دیا۔ ان ظالموں کی لوٹ مار کا یہ عالم تھا کہ دروازے توڑ توڑ کر گھروں میں گھسے اور نقدی اور زیورات سے لے کر غلے اور کپڑے بلکہ دروازے اور کھڑکیوں تک جو کچھ ہو سکا اٹھا لے گئے اور جسے اٹھا نہ سکتے تھے اسے توڑ پھوڑ ڈالا یا جلا دیا۔ بُنائی کے کارخانے، سائزنگ مشینیں، موٹر کاریں، اسکوٹر، کولڈ اسٹوریج، کیمیکل ورکس کے آلات، تعمیراتی لکڑیاں، سیمنٹ دوسرے ساز و سامان غرض جو کچھ ممکن تھا دل کھول کر لوٹا یا توڑا پھوڑا جلایا اور تباہ و برباد کیا۔ لوٹ اور تباہی کی یہ مقدار کئی کروڑ ہے۔

پی اے سی نے اس لوٹ کھسوٹ کے علاوہ دارو گیر اور تشدد کا نہایت ہولناک بازار گرم کیا۔ گرفتار شدگان کے تلوے، پنڈلی، بازو، ران، پیٹھ، پہلو اور سر پر اس قدر بید اور لاٹھیاں برسائی گئیں کہ ان کے لیے اٹھنا بیٹھنا ناممکن ہو گیا، کئی جان بحق ہو گئے، کتنوں کی ہڈیاں پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ شہر کے اندر بھی مسلمان بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو زد و کوب کیا گیا۔ جوانوں کے ہاتھ پاؤں توڑ ڈالے گئے۔ رات کی تاریکی میں دلدوز چیخیں داستانِ بربریت سناتی ہیں۔

مکانات جلائے گئے، مساجد کے پنکھے، گھڑیاں، جانمازیں اور دوسرے سازوسامان لوٹ لئے گئے۔ قرآن کی بے حرمتی کی گئی دو جوانوں کو علی الاعلان پکڑ کر گولی ماردی گئی اور مڈبھیڑ کا افسانہ شائع کردیا گیا۔ بہت سے جوان لاپتہ ہیں اور ان کا حشر نامعلوم۔ بھوک کی شدت سے بڑوں نے سسک سسک کر اور بچوں نے بلک بلک کر دم توڑ دیئے اور جو زندہ رہے وہ زندہ درگور، روشنی اور دوا سے محروم مریضوں اور زچہ بچہ کی تباہی الگ رہی، گھروں میں پاخانوں کی سڑاند اور کیڑوں کا طوفان مچا رہا۔ یاں پاس گزرنے والوں کے ساتھ بھی درندگی برتی گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ اعظم گڈھ کے مسلمان دشمن ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور مئو میں مامور پی اے سی کی فرعونیت اور ہٹلر شاہی رعونت ناقابل بیان ہے۔ اور قلم ان کی بربریت کی تصویر کشی سے قاصر ہے۔ مگر ہم یہ سب کچھ کسی شکوے یا فریاد کی غرض سے نہیں لکھ رہے ہیں۔ مسلمان کا یہ کام نہیں کہ وہ کاسۂ گدائی لے کر رحم و کرم کی بھیک مانگے اور ذلت و اہانت کی زندگی پر قناعت کرے۔ وہ اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتا ہے۔ اور اپنی قوت بازو سے حالات کا رخ بدل کر رکھ دیتا ہے۔ اس لیے اس خونچکاں داستان کی طرف چند سطروں میں اس لیے اشارہ کردیا گیا ہے تاکہ اب تک جن مسلمانوں کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے وہ بھی حقائق کو ایک نظر دیکھ لیں۔ انھیں معلوم ہوجائے کہ ان کے خلاف کیسے کیسے عزائم ہیں اور کن کن اطراف سے ہیں۔ اور اس کی روشنی میں انھیں کیا تدبیریں اور حکمت عملیاں اختیار کرنی چاہئیں اور یاد رکھیں کہ اگر اب بھی غفلت و بے حسی برقرار رہی تو پھر اس مرض کا کوئی علاج نہ ہوسکے گا۔ اللہ اپنی بے پایاں توفیق سے نوازے۔ یا پاک پروردگار! ؏

عزائم کو سینوں میں بیدار کردے نگاہِ مسلماں کو تلوار کردے

⁂ ⁂ ⁂

اندرا گاندھی کا قتل

امرتسر گولڈن ٹمپل کے واقعہ کے بعد جیسا کہ مبصرین کو توقع تھی اندرا گاندھی ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء کو گولیوں کا نشانہ بنادی گئیں۔ ان کے قتل پر ایک طرف اگر غم و اندوہ کا طوفان برپا تھا تو دوسری طرف گھی کے چراغ جل رہے تھے اور ایک تیسرا گروہ انتقام کے پردے میں لوٹ مار اور قتل و غارت کا سیلاب بنا ہوا تھا۔ یہ تینوں طرز عمل درحقیقت اندرا گاندھی کی سیاسی قیادت اور اجتماعی رہنمائی کے مختلف زاویوں اور ان کے ردعمل کی عکاسی کرتے تھے۔ ان کا دور لوگوں کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ اور ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ان کے چند برسوں میں یہ دیکھا گیا کہ فرقہ پرستی کو کھلی چھوٹ بلکہ سرپرستی حاصل

ہوتی جا رہی تھی۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے معاملات کو پرورش پا کر بڑا جرم اختیار کرنے کا بلا وجہ موقع دیا جا رہا تھا۔ اور مختلف مسائل کا حل معقولیت کے بجائے جذبات سے کھیل کی بنیاد پر کیا جا رہا تھا جس کی لپیٹ میں عبادت خانے بھی آ رہے تھے۔ اور یہی روش جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس لیے یہ واقعہ جہاں ایک بہت بڑا المیہ ہے وہیں قدرت کی طرف سے ایک زبردست سامانِ عبرت بھی ہے جو پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔ ع

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اس واقعہ نے جمہوریت کی عظمت اور متحدہ قومیت کے شیش محل کو بھی چور کر دیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ نظام عالم کی کامیابی عدل و انصاف، اخلاقی شرافت، کشادہ دلی اور احترامِ انسانیت پر موقوف ہے جس کی تعلیم مذہب کا ایک جزو لاینفک ہے اور جمہوریت و سوشلزم کے نعرے اپنے اندر کوئی مغز نہیں رکھتے۔ بلکہ صرف طالع آزماؤں کی ہڑبونگ کو جنم دیتے اور اکثریت کے لیے ظلم و بربریت کا راستہ ہموار کرتے ہیں۔

اس موقع پر علمائے دیوبند کا جو کردار سامنے آیا ہے وہ بھی بلا تبصرہ پیش خدمت ہے۔

اور یہ علمائے دیوبند ہے۔ ٹی وی کی "برکت" نے اب "درونِ خانہ" کو "چاردانگ عالم" بنا دیا ہے۔ اس لیے اب راز "سربستہ" نہیں رہ جاتے۔ اندرا گاندھی کی میت تین مورتی بھون میں رکھی تھی۔ چار عدد علماء دیوبند کا ایک ڈیلیگیشن (وفد) تشریف لایا اور سرہانے سے پوری میت کا ایک عدد طواف کر کے اپنی مقررہ جگہ بیٹھ گیا پھر غالباً اندرا گاندھی کی "روح پر فتوح" کے "ایصالِ ثواب" کے لیے قرآن مجید کی چند "سیکولر آیات" کی تلاوت فرمائی۔

کاش ان ملت فروشوں کو یَوْمَ یُخْزِی اللّٰہُ الْفَاسِقِیْنَ۔ یاد آتا۔ یا کم از کم امت اسلامیہ کے عوام فقہی گروہ بندی سے بالاتر ہو کر ایسے لوگوں کا محاسبہ کر سکتے۔ ●●●

ص ۵۲ کا بقیہ: اور ایک کمرہ لائبریری کے لیے ہے، اسے روشنی بجلی کے تمام سازوسامان سے لیس کر دیا گیا ہے۔ اس میں تقریباً پچاس ساٹھ لاکھ ڈالر کے اخراجات کا تخمینہ ہے، جسے مخیر حضرات کے عطیات سے جمع کیا جا رہا ہے۔ یہ دورہ بھی اسی مالیاتی جدوجہد سے متعلق ہے۔ ہمیں پوری توقع ہے کہ اس نیک کام میں خدا ہماری مدد ضرور فرمائے گا۔ اور ہزار رکاوٹوں کے باوجود بلجیم میں اسلام کا مستقبل یقیناً مایوس کن نہیں ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

◎◎ حافظ فتحی اللہ کو پیارے ◎◎

جملہ قارئین محــدث کو انتہائی افسوس کے ساتھ یہ خبر دی جا رہی ہے کہ جامعہ اسلامیہ مدینــہ منورہ کے فاضل اور حرم مکی کے سابق مدرس الشیخ حافظ فتحی محـمد ۲/ صفر المظفر ۱۴۰۵ ھ کو اس دار فانی سے رحلت فرما گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حافظ صاحب مرحوم کی شخصیت اہل علم اور بالخصوص اہل حدیث حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہے، مرحوم ایک طویل عرصے سے حــرم مکی میں مستقل طور پر مقیم تھے اور دین کی بلند پایہ کتب کے نہ صرف خازن تھے بلکہ اہل علم اور اسلامی مدارس وتنظیمات کو ھدیۃ دیتے رہتے تھے۔ اور اسطرح عالم اسلام کے اکثر علماء و طلبہ ان کے احسان مند تھے۔ حافظ صاحب مرحوم گوناگوں خوبیوں کے مالک تھے۔ جامعہ سلفیہ اور ادارہ محدث کی دعا ہے کہ اللہ تعالی انکی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں اعلی مقام نصیب فرمائے اور احباب ومتعلقین کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین۔

◎◎ سانحہ ارتحال ◎◎

۱۷/ اکتوبر ۸۴ء بروز بدھ شام ۵ بجے جمعیۃ اہلحدیث راجستھان کے سرگرم رکن جناب ٹھیکیدار مولانا عبد الجبار صاحب کیکڑی ضلع اجمیر تعمیری کام کے دوران اچانک حرکت قلب بند ہو جانے سے انتقال کر گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس حادثۂ جانکاہ سے راجستھان کی جمیعۃ اہلحدیث کو سخت ترین نقصان پہنچا ہے، دعا ہے بار الہ مرحوم کو جنت الفردوس میں بہترین جگہ عطا فرمائے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے آمین ثم آمین، ناظرین سے نماز جنازہ غائبانہ اور دعائے مغفرت کی درخواست ہے۔

غمزدہ

عبد السلام (ٹی ٹی ای)

واراکین جمعیت اہلحدیث، گامنڈی، بھیلواڑہ، راجستھان

Reg. No. R N. 40352/81

December **MOHADDIS** 1984

THE ISLAMIC CULTURAL & LITERARY MONTHLY MAGAZINE

AL-JAMIATUS SALAFIAH (AL-MARKAZIYAH) VARANASI (INDIA)

Published from Markazi Darul-Uloom

Printed by Abdul Waheed

At Salafiah Press, Reori Talab. Varanasi